بابا صاحبا

اشفاق احمد

بابا صاحبا

اشفاق احمد

بانو قدسیہ کی کتابیں

راجہ گدھ
حاصل گھاٹ
توجہ کی طالب
ناقابلِ ذکر
چہار چمن
دوسرا دروازہ
امر بیل
بازگشت
مردِ ابریشم
سامانِ وجود
شہرِ بے مثال
ایک دن
فٹ پاتھ کی گھاس
پُروا
موم کی گلیاں

کچھ اور نہیں
آدھی بات
دست بستہ
آتشِ زیرپا
تماثیل
سدھراں
آسے پاسے
دوسرا قدم
حوّا کے نام
سورج مکھی
پیا نام کا دیا
لگن اپنی اپنی
پھر اچانک یوں ہوا
چھوٹا شہر بڑے لوگ

Rs. 1200.00

www.sang-e-meel.com
ISBN-10:969-35-2172-2
ISBN-13:978-969-35-2172-6

اشفاق احمد کی کتابیں

- سفر در سفر
- صُبحانے فسانے
- ایک ہی بولی (پہلکاری)
- ایک محبت سو افسانے
- ایک محبت سو ڈرامے: ٹی وی سیریز
- من چلے کا سودا
- شاہلا کوٹ
- حیرت کدہ
- سفر مینا
- طلسم ہوش افزا (سائنس فکشن)
- وداعِ جنگ
- گڈریا (اُجلے پھول)
- ننگے پاؤں
- بند گلی (ڈرامے)
- کھیل تماشا
- اُچے بُرج لہوردے
- ٹاہلی تھلے
- توتا کہانی
- اور ڈرامے
- مہمان سرائے
- کھٹیا وٹیا
- زاویہ
- زاویہ ۲
- زاویہ ۳
- گلدان (تلقین شاہ)
- حسرتِ تعمیر (تلقین شاہ)
- جنگ بجنگ (تلقین شاہ)
- دھینگا مشتی (تلقین شاہ)
- شورا شوری (تلقین شاہ)
- ڈھنڈورا (تلقین شاہ)
- آشیانے (تلقین شاہ)
- پڑاؤ (تلقین شاہ)
- آسودگی (تلقین شاہ)
- بندۂ زمانہ (تلقین شاہ)
- زنجیرِ تعلق (تلقین شاہ)
- ذکرِ شہاب (یادنامہ قدرت اللہ شہاب مرحوم)
- عرضِ مصنف
- شہرِ آرزو
- ایک اور دستک

بابا صاحبا

اشفاق احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

370 Ashfaq Ahmad
Baba Sahba / Ashfaq Ahmad.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2010.
668pp.
1. Urdu Literature - Mysticism.
I. Title.

2010

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2172-2
ISBN-13: 978-969-35-2172-6

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

''بابا صاحبا.....ایک واجبی سا تعارف''

''بابا صاحبا'' ایک مختلف قسم کا ادب ہے جو آسانی سے تحریر میں نہیں آ سکتا۔ اس ادب پارے پر خاں صاحب کی یادوں کی برسات موسلا دھار نہیں بلکہ رات کے پچھلے پہر بوندا باندی کی صورت ادھ کُھلے دریچوں پر جھنکار بن کر توجہ طلب رہتی ہے۔

یاد کا بھی کچھ کراماتی سلسلہ ہے۔ عام طور پر ایسے واقعات اور حالات آدمی کی یاد میں رہ جاتے ہیں جن کا تعلق ناکامی، ٹریجڈی، احساس کمتری اور احساس جرم سے ہوتا ہے۔ خوشی کے واقعات قوس قزح کی طرح انسان کے ذہنی اُفق پر ابھرتے ہیں اور پھر جلد محو ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی سو فیصد والا اصول نہیں بلکہ ان ہی یادوں کی رنگارنگی سے، ان کے جداگانہ تجربے سے زندگی کا تار و پود بنتا ہے ــــــ میں نے خاں صاحب کے ساتھ رہ کر دیکھا کہ ان ہی یادوں نے اُن کی تلاش کے راستے کھولے۔ وہ اپنی ناکامیوں سے جاننا چاہتے تھے کہ انسان کا اصل مقصد کیا ہے؟ ــــــ وہ یہاں کیوں ہے اور کیا حاصل کرنا چاہتا ہے ــــــ

اس تلاش کے سلسلے میں ہی وہ بابوں کے پیچھے بھاگے۔ کبھی افسانے لکھے، کبھی ڈرامے، کبھی زاویے میں جا سر نکالا۔ عام انسان اپنی تلاش کو اپنی ذات پر سوار نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے معنی تلاش کرنے پر بضد نہیں ہوا کرتا ــــــ لیکن خاں صاحب کی یادیں سوہانِ روح تھیں۔ وہ اُس تلاش کو چھوڑ نہیں سکتے تھے جس نے اُن کا شانتی سے سونا، جاگنا حرام کر دیا تھا۔

میں تو اُن کے قریب رہنے کے ناطے آپ کو تھوڑا سا جھانک کر اندازے لگا کر ہی بتا سکتی ہوں۔ سالم پورے اشفاق احمد کا سراغ شاید آپ کو ''بابا صاحبا'' سے حاصل ہو ــــــ تو سفر جاری کیجئے ــــــ آپ بھی شاید کچھ نہ کچھ تلاش کر لیں!

دعائیں......

بانو قدسیہ
داستان سرائے

07-07-2008

(1)

کوئی خاص بات نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی ارادہ یا اہتمام تھا۔ نہ ہی کوئی باقاعدہ پروگرام تھا۔ بس ایسے ہی ایک چالو سی بات ہو رہی تھی جو پھیلتے پھیلتے یہاں تک پھیل گئی۔ جس طرح کسی پرانے پن کو دھوتے ہوئے اور اس کے اندر کی دبیز سیاہی کو فلش کرتے ہوئے اس سیاہی کا کوئی قطرہ پانی کی سطح پر گر جاتا ہے اور پھر پھیلتے پھیلتے، رگیں چھوڑتے، ترمرے بناتے، رنگ بدلتے دور تک پھیل جاتا ہے ایسے ہی میرے ساتھ ہوا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا جیسے پانی کی سطح دھبہ وصول کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوتی یا گاڑھی تیلیا پرانی سیاہی کا قطرہ باہر نکلنے پر رضا مند نہیں ہوتا لیکن نکل آتا ہے اور سطح آب پر پھیل جاتا ہے، کچھ ایسی ہی مجھ پر گزری اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس نرغے میں آ گیا۔

ہم روم کی درس گاہ میں اپنی اپنی کلاسیں پڑھا کر سٹاف روم میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ دانیلو نے روحانیات پر بات شروع کر دی۔ پروفیسر رام سنگھ تومر نے اس میں دو چار آڑی ترچھی پچریں لگائیں لیکن دانیلو کی گفتگو میں جھول بڑھتے ہی گئے۔ اس کی بات کا بافتہ معلومات کے فریم میں اچھی طرح سے تن نہ سکا۔ اتیو نے کہا "تم سے زیادہ روحانیت کے بارے میں تو میں جانتا ہوں لیکن یہ فضول کھیل ہے۔ ہمارے جاپان نے اس کی صندوقچی بند کر دی ہے۔ صرف اس کو سیل کرنا باقی رہ گیا ہے، لاکھ کی پکی مہر لگا کر۔ سو وہ بھی ایک دن ہو جائے گا۔"

اس گفتگو میں کوئی سات آٹھ لوگ شریک تھے: دانیلو، پروفیسر تومر، پروفیسر اتیو، آنا لوکرچو، ستی مردیاتی، سوریو ہڈرویو، لوچانا گابریلی، ایدا اور ایک سڑیل سا جاپانی پروفیسر جس کے ساتھ میری کبھی بھی نہ بنی اور ہم نے ایک دوسرے کو مکمل طور پر رد کر کے صرف معمولی سی علیک سلیک رکھی۔

آنا کہنے لگی "تم مشرق سے آئے ہو اور بڑی دلچسپ گفتگو کرتے ہو اور تمہارے پاس بے شمار رنگ برنگی کہانیاں ہیں، کیا تمہارے پاس وزڈم آف دی ایسٹ بھی ہے؟"

میں نے احمقوں کی طرح چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو ایدا کہنے لگی "تم یوگا جانتے ہو؟"

ستی مردیاتی نے کہا "یوگا تو کوئی بھی جان سکتا ہے لیکن جو بات آنا پوچھ رہی ہے، وہ یوگا سے بڑی ہے۔ بہت

بڑے پھیلاؤ والی۔ اس میں سب کچھ آ جاتا ہے۔"

ایدا کہنے لگی۔ "تم بھی تو وہیں سے آئی ہو۔ کیا تمہارے انڈونیشیا میں یہ چیز نہیں ہے؟"

"ضرور ہے اور بالکل ہے۔" پروفیسر تومر نے کہا "انڈیا کا سارا فلسفہ، ساری ویدانت سارا یوگا، پورے کا پورا اور اپنی اصل حالت میں انڈونیشیا میں موجود ہے۔ ستی مردیاتی کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ یہ اس کا کلچرل ورثہ ہے۔"

میں نے اردو میں کہا "اوئے رام سنگھ یہ سالا سارا فلسفہ تیرے پاس بھی تو ہوگا۔ تو ہندو بھی ہے اور ہندوستانی بھی۔ تیرے پاس بھی تو ویدانت کے کچھ پتے ہوں گے۔ وہ نکال، دکھا سب کو۔" آنا اپنی چمکدار عینک کے پیچھے گول گول دیدے گھما کر کہنے لگا۔ "اٹالین پلیز اٹالین۔ اٹالین میں بات کریں تا کہ سب کی سمجھ میں آئے۔ یہ فاؤل ہے اور ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

سب نے اٹالین اٹالین کا نعرہ لگایا اور پروفیسر رام سنگھ تومر میری بات کا جواب دینے سے آزاد ہو گیا۔

یہ سن ترپن کی بات ہے۔ مہینہ اکتوبر کا ہے اور تاریخ مجھے اب یاد نہیں رہی۔

لوچانا سب لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ وہ جو وہاں بیٹھی تھی، صرف انہیں میں سے نہیں بلکہ یونیورسٹی کی دوسری لڑکیوں میں بھی سب سے افضل تھی۔ اس کے جسم کی حسین ترین چیز اس کا قد تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کے قد کو جس مقام پر آ کر رک جانا چاہیے، لوچانا کا قد ٹھیک اس مقام پر پہنچ کر رگ گیا تھا۔ اس کی ناک صوفیہ لورین کی ناک جیسی حالانکہ صوفیہ ابھی پیدا بھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ان ہسپانوی لڑکیوں جیسی تھیں جو چہرے پہ سیاہ جالی کا جھرمٹ ڈال کر "اولے" ناچا کرتی ہیں اور جن کی آنکھیں سیاہ جالی کے پیچھے کالی روشنی کے لٹوؤں کی طرح جگمگایا کرتی ہیں۔

ہم سب دل ہی دل میں لوچانا کے عاشق تھے اور دوسری لڑکیاں ہمارے اس رویے کی شدید مزاحمت کرتی تھیں۔ ان ساری خوبیوں کے باوجود لوچانا ذرا سی احمق تھی۔ ہوا بھرا احمق۔ وہ بھولپن کی اس حد پر کھڑی تھی جہاں سے ذرا آگے حماقت کی وادی شروع ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں تو فارمیلسی کی لکیر کے اندر تھے لیکن لمبا قد ہونے کی وجہ سے کئی مرتبہ اس کا اوپر کا دھڑ آگے کو جھک جاتا تھا جس سے دیکھنے والے کو کبھی کبھی شک سا پڑ جاتا تھا کہ لوچانا گابریلی سادہ لوح لڑکی ہے۔ وہ سادہ لوح ضرور تھی لیکن اس کے پاؤں ہمیشہ سمجھداری کی کریس کے اندر رہتے تھے۔ اس لیے کوئی بھی آج تک اسے سٹمپ نہیں کر سکا تھا۔

جرمن پروفیسر کہنے لگا کہ یہ روحانیت دراصل ایک قسم کی ذہنی کجروی ہے۔ مشرق کے لوگوں نے اس نفسیاتی بیماری کو عزت عطا کر کے ایک قابل تلاش تحقیق میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ست رو قوموں اور پژمردہ معاشروں کا کسب ہے جس میں وہ کمال حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمارے جرمنی میں ایسی ایبریشن آپ کو کہیں بھی نظر نہیں آئے گی۔

گو اس کی بات کافی وزنی تھی لیکن کسی نے اس کو پسند نہ کیا اور ہم پھر دانیلو کی بات سننے پر مجبور ہو گئے۔ دانیلو نے ارضیات میں ایم اے کیا تھا لیکن چند برس میتھین گیس کمپنی میں کام کرنے کے بعد وہ پروفیسر توچی کے گروہ میں شامل

ہو گیا تھا۔ اس کو آثار قدیمہ کی کھدائی کا ایسا چسکا پڑا کہ وہ گیس اور آئل فیلڈ کی کھدائیوں سے منہ موڑ کر بے آباد جگہوں سے پرانی ہڈیاں اور ڈھانچے نکالنے پر مامور ہو گیا تھا۔ حال ہی میں وہ پروفیسر توچی کے ساتھ تبت کے دورے سے لوٹا تھا اور ان کی مہم وہاں سے تاریخی نوادرات کے اٹھارہ بڑے بکسے لے کر لوٹی تھی۔

پروفیسر توچی ہم سب کے باس تھے۔ وہ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے صدر تھے۔ ہم سب کی جان ان کی مٹھی میں تھی اور ان کی جان ان کی سیکرٹری فرانچیسکا کی مٹھی میں تھی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ پر فرانچیسکا کی خوشامد اور اس کی جھوٹی چکی میں مصروف رہتے تھے۔ میں نے اس کی ماں کو دو مرتبہ لاہور سے عطر حنا منگوا کر دیا تھا اور اس نے پروفیسر توچی سے کہہ کر میری تنخواہ بھی بڑھوا دی تھی۔ گو سب کچھ ملا جلا کر کل اسی روپے کا اضافہ ہوا تھا لیکن اس زمانے میں اسی روپے بھی بہت تھے۔

تو یہ جو دانیلو تھا اور جو توچی صاحب کی مہم میں ابھی ابھی تبت سے لوٹا تھا، اس کو روحانیت سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے تبتی زبان کے دو منتر بھی سیکھ لیے تھے جن کا وہ وقت بے وقت جاپ کرتا رہتا تھا۔

علم روحانیت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا بہت جلد اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ چند کتابیں چار مہینے تک باقاعدگی کے ساتھ پڑھنے کے بعد کوئی شخص بھی اس علم کی اچھی خاصی جان کاری پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کو اگر کسی ٹرینڈ پیر کی ایک مہینے کی ٹیوشن مل جائے تو وہ اس فن میں طاق ہو جاتا ہے۔ اس حد تک ماہر کہ وہ اپنا ایک چھوٹا سا انڈی پینڈنٹ تکیہ چلا سکتا ہے اور اس کے گرد سو سوا سو مرید بھی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ آگے اس کی زبان کی مٹھاس اور حسن سلوک کا کمال ہے۔ سال گزرنے سے پہلے پہلے اس کے پاس مریدوں اور چاہنے والا ایک جم غفیر اکٹھا ہو جاتا ہے جن میں سے اچھی خاصی تعداد ان کی ہوتی ہے جو ملک سے باہر آباد ہوتے ہیں اور جو ہوائی ٹکٹ بھیج کر اپنے مرشد کو پاس بلاتے رہتے ہیں...... دوسرے سارے کام مشکل ہیں۔ گنا چھیلنے، گنڈیریاں کاٹنے اور ٹھنڈی گنڈیریوں کی ریڑھی لگانے کا فن دس گیارہ مہینے سے کم کی مدت میں نہیں آتا۔ کالے سنگھاڑے، سفید پیٹرے اور پیلی مکئی کے دانے بھوننے کا علم بھی سال بھر کی مدت مانگتا ہے۔ انگریزی، دھات کاری، قفل سازی، گداگری، گورکنی، دکانداری، چوب کاری، تیر اندازی، آتش بازی، پہلوانی، جیب تراشی اور ویلڈنگ وغیرہ کا کام سیکھنے پر سالہا سال لگ جاتے ہیں لیکن پھر بھی اس میں مہارت پیدا نہیں ہوتی۔ ہر روز دھوکا کھانے اور ہر وقت پھسل جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے لیکن روحانیت کا کاروبار پہلے ہی دن سے جمنا شروع ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی گاہکی پھیلنے لگتی ہے۔ اس میں نمبر دو کا کاروبار اصل سے بھی اہم ہو جاتا ہے اور نقل حقیقت سے بڑھ کر مشہور ہو جاتی ہے...... لیکن......!

یہ کاروبار ہمیشہ ہی بے ایمانی، بدنیتی یا عیاری مکاری پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک عجیب طلسم گل بکاؤلی پوشیدہ ہے کہ اس علم کو ہی امر واقعہ اور اصلیت سمجھ لیا جاتا ہے۔ یوں تو دوسرے بھی کئی علوم ایسے ہیں جن کو امر واقعی سمجھ کر لوگ پکے سودے کر لیتے ہیں لیکن ان کی حقیقت جلد سامنے آ جاتی ہے۔ مثلاً وکالت کا علم ہے کہ سائل محض علم کو ہی اصل سمجھ کر اور اسے حق مان کر اس کا سودا کر لیتا ہے یا طب کا علم ہے کہ مریض اس علم سے متاثر ہو کر ہی جان طبیب کے حوالے کر دیتا ہے لیکن یہ اور ان جیسے اور بہت سے علوم جب آزمائش کی بھٹی چڑھتے ہیں تو ان کی فوراً پڑتال ہو جاتی ہے۔ علم وکالت

کی عدالت میں جانچ پڑتال ہو جاتی ہے اور علم طب کا بیمارستان میں ٹیسٹ ہو جاتا ہے لیکن روحانی علم کی پرکھ کسی مقام پر بھی نہیں ہو پاتی۔ نہ بیچنے والے کے مقام پر نہ خریدنے والے کے موقع محل پر۔ دونوں ہی اپنی اپنی بد پر راضی رہتے ہیں۔ بیچنے والا یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں واقعی سانپے کا تیل بیچ رہا ہوں اور اس کے پاس سانپا نہیں ہوتا اور خریدنے والا یہ دیکھتا رہتا ہے کہ میں تیل کی شیشی بھروا کر رسی سے لٹکا کر خود گھر لے جا رہا ہوں۔ دونوں کے پاس تیل نہیں ہوتا۔ تیل کا علم سانپے کی قسمیں، تیل نکالنے کے طریقے، شیشی بھرنے کے اصول اور لینے دینے کے طور طریقے ہوتے ہیں، تیل نہیں ہوتا!

روح اور روحانیت کا کسب کرنے والے اور باطن کے سفر کے اسرار بتانے والے شاذ و نادر ہی عیار، مکار یا بد دیانت لوگ ہوتے ہیں۔ جو لوگ بنا دیکھے بھالے ان پر الزام دھرتے ہیں وہ زیادتی کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے کبھی ان کو دور سے بھی نہیں دیکھا، وہ خوانخواہ ان پر بہتان دھرتے ہیں جو کبھی ان سے ملے ہی نہیں، وہ ان کے کچے چٹھے چھاپ چھاپ کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

روح اور روحانیت کی دنیا کا چرچا کرنے والے اگر کبھی کسی کوتاہی کے ذمہ دار ٹھہرائے جا سکتے ہیں تو وہ صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ وہ ایسی دوائی کا پرچہ ترکیب استعمال بانٹ رہے ہوتے ہیں جس کو نہ تو انہوں نے کبھی استعمال کیا ہوتا ہے اور نہ ہی کبھی اس کی شیشی دیکھی ہوتی ہے۔ ان کے پاس صرف اس دوا کا علم ہوتا ہے...... ڈھیروں ڈھیر...... بے پناہ...... فراواں علم...... کثیر علم...... بسیار علم بلکہ کسی حد تک زائد علم لیکن انہوں نے یہ دوا دیکھی نہیں ہوتی نہ چکھ کر، نہ سونگھ کر نہ چھو کر نہ پی کر...... وہ بڑی محبت، بے حد ایمانداری، بے پناہ عقیدت اور بے پایاں لگن کے ساتھ اس کیفیت کا تذکرہ کرتے ہیں جو ان کا حال نہیں ہوتی۔ اس جذبے کا ذکر کرتے ہیں جو ان پر کبھی طاری ہوا نہیں ہوتا۔ اس حالت کا بیان کرتے ہیں جس کے پاس پھٹکے نہیں ہوتے۔ اس عالم کا نقشہ کھینچتے ہیں جس سے گزرے نہیں ہوتے اور اس روش کی کہانی سناتے ہیں جس پر کبھی قدم نہیں رکھا ہوتا۔ لیکن وہ جھوٹے نہیں ہوتے، اس رنگ ڈھنگ اس وضع قطع اور اس طور طریقے کے پجاری ضرور ہوتے ہیں۔ آگے پجاری کی قسمت کہ ساری عمر پجاری رہتا ہے یا غلبہ حال کی وادی میں اتر مندر کی حدود سے دور نکل جاتا ہے۔

یہی حال اس وقت دانیلو کا تھا۔ وہ روحانیت کے بارے میں ٹھیک ٹھیک باتیں کر رہا تھا۔ اسے بدھ کا مارگ معلوم تھا لیکن وہ اس راستے کا مسافر نہیں تھا۔ گودڑی کی مختلف قسمیں جانتا تھا لیکن صوفی نہیں تھا۔

ستی مردیاتی سوریوہڈویو نے میری طرف محبت سے دیکھ کر عقیدت بھری آواز میں کہا ''اشفاق! ان کو بتاؤ ناں کچھ۔ دانش مشرق کے بارے میں۔ ہماری روحانیت کے بارے میں، ہمارے مذہب کے بارے میں...... تم شرماتے کیوں ہو؟''

میں نے کہا ''میں شرما نہیں رہا ستی، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ واقعی کچھ معلوم نہیں۔ اگر کچھ معلوم ہوتا تو میں ضرور کرتا۔ مجھے نہ اپنے مذہب کا کوئی علم ہے نہ روحانیت کا۔ نہ مشرق کا، نہ دانش کا۔ میں تو ایک پڑھا لکھا شخص ہوں اور پڑھے لکھے لوگوں کا ایسی چیزوں سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔''

میں اور ستی کوئی ایک سال سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے لیکن وہ ایسی

بیوقوف تھی کہ اس نے اپنے بارے میں مجھے تفصیل سے کچھ نہیں بتایا تھا (اور اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو میں نے بھی تفصیل سے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔) ہم دونوں اپنے بارے میں حال ہی کے حوالے سے بات کرتے تھے اور روم ہی کی زندگی کی تفصیلات بیان کرتے رہتے تھے۔ اپنے اپنے ماضی کے بارے میں ہمیں صرف اتنا معلوم تھا کہ ستی انڈونیشیا کی رہنے والی تھی اور میں پاکستان کا...... وہ تو کوئی ایک مہینہ پہلے جب میرے اپارٹمنٹ میں ٹافی نما سفید برفی، کھوپرے کی مٹھائی اور موٹے آٹے کا لجلجا حلوہ سا لے کر آئی تو میں نے رکابی سے رومال اٹھا کر پوچھا، یہ سب کیا ہے تو وہ اپنی غریبی اور غریب الوطنی سے خجل سی ہو کر سر جھکائے بولی ''آج ہماری کرسمس ہے اور یہ میں تمہارے لیے تحفے کے طور پر لائی ہوں۔''

''کرسمس!'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

تو ستی نے بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر کہا ''یہاں کی کرسمس نہیں، انڈونیشیا کی کرسمس! میرے ملک کی کرسمس۔ ہم اس کو عیدالفطری کہتے ہیں۔''

''عیدالفطری!'' میں نے یقین اور بے یقینی کے درمیانی لحن سے پکار کر کہا۔

اس نے کہا ''ہاں عیدالفطری! ہم پورا ایک مہینہ بھوکے رہتے ہیں۔ دن بھر نہ کھاتے نہ پیتے ہیں۔ نہ سموک کرتے ہیں۔ پھر شام کو سورج غروب ہونے پر یہ عہد ختم کر دیتے ہیں۔ اگلے دن پھر بھوکے!''

میں نے ستی کی رکابی اور رکابی کے معمورات کی پروا کیے بغیر اسے گھٹ کے جپھی ڈال لی اور اس کے سر کو بوسہ دے کر اونچے اونچے عیدالفطری، عیدالفطری مبارک کہنا شروع کر دیا۔ وہ جواب میں مبارک کے بجائے کچھ اور کہتی تھی لیکن اس کا مطلب یہی تھا۔ ہماری اس عید ملن سے اس کی رکابی کا آدھا سامان فرش پر گر گیا۔ اس نے رکابی میز پر رکھ دی اور میرے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو بوسہ دے کر درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔

میرا اسلام ستی مردیاتی سوریوہڈویو کے مقابلے میں کافی کمزور تھا۔ اس لیے اس کے درود شریف کے مقابلے میں میں نے پوری الحمد شریف سنا کر اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت بہم کیا۔ میں تو اسے التحیات بھی سنانے لگا تھا لیکن میرے ہونٹوں پر اس نے اپنی چھوٹی سی انگلی رکھ کر مجھے یقین دلا دیا کہ اس نے میرے مسلمان ہونے کو تسلیم کر لیا ہے۔

جب ہم عیدالفطر کی شیرینی کھا چکے تو میں نے کہا ''تم بھی کمال کی احمق لڑکی ہو کہ مجھے آج تک بتایا ہی نہیں تم مسلمان ہو!''

اس نے ہنس کر کہا ''تمہارے پاس پوچھنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا جو میں بتاتی۔''

میں نے کہا ''اور میں پوچھ بھی کیسے سکتا تھا۔ جس لڑکی کا نام ستی مردیاتی سوریوہڈویو ہو وہ مسلمان کس طرح سے ہو سکتی ہے بھلا؟''

اس نے میری اس احمقانہ بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مسکراتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی...... اور اب جو اس نے کہا کہ اشفاق! ان کو بتاؤ ناں کچھ، دانش مشرق کے بارے میں۔ ہماری روحانیت اور ہمارے مذہب کے بارے میں، تم شرماتے کیوں ہو؟ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان سارے لوگوں کہ پتہ چل جائے کہ ہم مسلمانوں نے بھی روحانیت کے

بارے میں بڑے ہفت خواں طے کیے ہیں اور ہم نے بھی اس سلسلے میں بڑے معرکے مارے ہیں۔

لیکن اس وقت صرف دانیلو علم روحانی کی گہرائیوں سے واقف تھا کہ اس نے ایک مہینہ پہلے تبت میں اس گیان کا مطالعہ شروع کیا تھا اور اس وقت وہ ہم سب کے کان کاٹ رہا تھا۔ ہم سب اس کے سامنے نالائق چوہوں کی طرح بیٹھے تھے اور اس کی ہر بات پر سر ڈھیلا سا کیے جا رہے تھے۔

میں بھی چونکہ بول بچن کی دنیا میں اپنی طرزِ خاص کا ایک نرالا بادشاہ تھا اور میں نے بہت ہی تھوڑی مدت میں اطالوی زبان پر کمال کی دسترس حاصل کر لی تھی۔ اس لیے لوچانا کو افسوس ہو رہا تھا کہ ایک گھامڑ قسم کا دانیلو جو حقیقت میں صرف پروفیسر توچی کا پٹھو تھا، وہ تو بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا اور میں جو خاص مشرق سے، ہڑپہ اور ٹیکسلا سے اٹھ کر اٹلی آیا تھا، میں خاموش تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے شُشکار کر کہا "تم یوگا تو جانتے ہو، پھر بتاتے کیوں نہیں ہو؟ لوگ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔ تم جو اچھی طرح سے کر کے دکھا سکتے ہو، اس کے بارے میں بھی گنگ ہو...... اٹھو!"

لوچانا "اٹھو" کہہ کر کھڑی ہوگئی اور اس کے ساتھ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرا خیال تھا، مجلس برخاست ہوگئی اور سب کو چھٹی ہوگئی ہے اور اب ہم آزاد ہیں لیکن یوں نہیں ہوا تھا۔ سادہ لوح لوچانا ہم سب کو اٹھا کر نیچے بیس منٹ میں لے گئی جہاں کچھ پرانے صوفے، کچھ لوہے کی اور کچھ لکڑی کی کرسیاں، پرانی وضع کے میز، ان پر ناکارہ ٹائپ اور سائیکلوسٹائل مشینیں گرد سے اٹی پڑی تھیں۔ کچھ پرانے قالین اور لپٹی ہوئی سرخ پٹیاں کونوں میں کھڑی تھیں۔ کچھ ایسا اگڑم بگڑم پرانا سامان پڑا تھا جو کانووکیشن کے دنوں میں دوبارہ پینٹ کر کے اور بنا سجا کے سینٹ ہال میں کھڑا کر دیا جاتا...... چونکہ نشستوں پر کافی گرد جمی تھی، اس لیے ہم سب ایک نیم دائرے کی شکل میں کھڑے تھے اور لوچانا کے اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔

لوچانا نے کہا "اب اشفاق تم کو یوگا کا ایک مفید آسن بتائے گا جس سے ہمارے علم و گیان کی ابتداء ہوگی اور جس کو ہم گیان کا مرکزی نقطہ مان کر اپنے روحانی سفر کی ابتداء کریں گے۔"

کئی مرتبہ آدمی ایسے عجیب طریقے پر پھنستا ہے کہ پھر ساری عمر اس کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے اور وہ انہونی تلیوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر گمنامی کی حالت میں فوت ہو جاتا ہے۔ میں نے لوچانا کو مرعوب کرنے اور اس پر ٹھرک جھاڑنے کے لیے اسے یوگا کا ایک آسن بتایا تھا اور اسے جسمانی طور پر قریب لانے کی کوشش کی تھی، اس کمبخت نے اسے سچ جان کر بھری محفل میں راز کی بات اونچی آواز میں کر دی۔ میں اس وقت اپنے ساتھیوں کے نیم دائرے والے کٹہرے میں ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

جب میں نویں جماعت کا طالب علم تھا، اس وقت ہمارے بڑے بھائی جان نے بنگلور کے ایک یوگی سے یوگا کی ایک کتاب منگوائی تھی۔ اس میں یوگا کے آسنوں کی ڈھیر ساری تصویریں تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر ہم سارے بہن بھائی خوب ہنسا کرتے تھے اور بھائی جان کا مذاق اڑایا کرتے تھے...... بھائی جان دری پر بیٹھ کر اور کتاب کھول کر سامنے کی دیوار کے سہارے کھڑی کر کے یوگا کے آسن بنانے کی کوشش کیا کرتے لیکن ان کی کوئی کل سیدھی نہ بیٹھتی تھی۔ جس قدر ہم اس کتاب کی تصویروں پر ہنسا کرتے، کچھ اس سے زیادہ ہمیں بھائی جان کی لڑھکنیوں، ڈگمگ ڈولیوں اور بے وزنیوں پر

ہنسی آیا کرتی۔ چند ہفتوں بعد انہوں نے یہ مشقیں بند کر دیں اور یوگا کو تیاگ کر میسمریزم کا کام شروع کر دیا۔

اس کتاب میں یوگا کا ایک آسن تھا کہ یوگی جی کرسی کی پشت کے دونوں کناروں پر ہاتھ رکھے اپنے پیٹ کو اندر کھینچ کر اس میں سینے کی کوڑی سے لے کر ناف کے نیچے تک ایک رسہ سا ابھار رہے ہیں۔ یہ رسہ جو ناف کے قریب تو قدرے موٹا ہے لیکن نیچے جاتے ہوئے پھر ستواں ہوگیا ہے۔ اب آگے چونکہ یوگی جی کا جانگیہ آ جاتا تھا، اس لیے پتہ نہیں چلتا تھا کہ رسہ نیچے کہاں تک پہنچتا ہے اور وہاں کس طرح سے ختم ہوتا ہے اور پھر کیا ہوتا ہے!

میں نے وہ کتاب سامنے رکھ کر، کرسی کی پشت کے دونوں کناروں پر ہاتھ رکھ کر ایک ہچکا پیٹ کے اندر جو مارا تو گھٹنے کھل گئے۔ ٹانگیں پھیل گئیں اور پیٹ بجائے اندر جانے کے آگے کو پھول گیا۔ بڑی مایوسی ہوئی۔ کچھ جسمانی تکلیف بھی ہوئی، ساتھ شرمندگی کا احساس ہوا اور میں نے وہ مشق آٹھ دس مرتبہ کی کوشش کے بعد ترک کر دی۔

کوئی ایک مہینہ بعد جب گھر والوں کے لیے چھت کا پنکھا کھینچنے کی میری باری تھی اور میں بوریئے پر لیٹ کر پاؤں میں پنکھے کا رسہ پھنسا کر، چارپائیوں پر سوئے ہوئے گھر والوں کو پنکھا کر رہا تھا تو مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا...... رسے میں پھنسے پاؤں کی ستواں ٹانگ کی ہر "کھینچ" اور ہر "ڈھیل" کے ساتھ میرے پیٹ کے اندر کا مسل بنتا تھا۔ تنتا تھا، پھولتا تھا اور پھر پیٹ میں مدغم ہو جاتا تھا۔ یہی وہ مسل تھا جو یوگی جی نے پیٹ کی کوکھیں اندر کھینچ کر اور سانس روک کر ابھارا تھا اور ایک موٹے رسے کی طرح سینے سے نیچے تک الف بنا کر ساکت کر دیا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر کتاب نکالی۔ تصویر کو غور سے دیکھا اور کرسی کی پشت کے کناروں پر صرف ہاتھ رکھنے کے بجائے ان دونوں کناروں کو اندر کی طرف زور سے دبایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے پیٹ میں دائیں جانب کی کوکھ اندر کو دب گئی ہے۔ اس کامیابی نے میرے اندر ایک عجیب طرح کی خود اعتمادی پیدا کر دی لیکن میری کوشش کے باوصف پیٹ کی بائیں کوکھ اندر کو نہ گئی اور پیٹ بدستور توبے کی طرح پھولا ہی رہا۔ کوئی آدھ پون گھنٹے کی لگاتار کوشش کے بعد جب میں بالکل ہف گیا اور میں نے ہر طرح کا جتن بند کر دیا تو مجھے اپنی ناکامی پر بڑا افسوس ہوا۔ اس افسوس نے مجھے کرسی کی پشت پر کہنیاں ٹیک کے نیم رکوع کی حالت میں کھڑا کر دیا اور میں بڑی دیر تک اسی طرح سے کھڑا رکھا۔ پھر اچانک مجھے ایک زور کی ہچکی آئی۔ صرف ایک ہچکی! اور مجھے یوں لگا جیسے میرے پیٹ کے اندر رسہ پیدا ہو کر پھر پیٹ کے ملغوبے میں تحلیل ہوگیا ہے۔

گو میں کمرے میں بھونچکا سا کھڑا تھا لیکن پیٹ کے رسے کا جھٹکا ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ ایک دُکھن سی تھی جو شاید اسی جھٹکے کی بدولت پیدا ہوگئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر کرسی کی پشت کے کناروں کو دبایا اور میرے پیٹ میں یوگی کا رسہ پیدا ہوگیا۔ عین یوگی کی طرح...... پیٹ کی دونوں کوکھوں کے درمیان مضبوط اور ستواں رسہ۔ جو ناف پر آ کر ذرا موٹا ہو گیا تھا لیکن پھر لپٹ کر نیچے کو چلا گیا تھا۔ میں نے خوشی کا ایک نعرہ مارا اور بڑی آپا کے کمرے سے ان کا شیشہ لینے چلا گیا۔

شیشہ سامنے رکھ کر جب میں نے اپنے رسے کو غور سے دیکھا تو وہ یوگی جی کی تصویر والے رسے سے بھی زیادہ مضبوط، زیادہ چکنا اور زیادہ جوان تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے، بالکل برہنہ ہو کر اپنا رسہ بنا کر دیکھا تو میری حیرانی کی

کوئی حد نہ رہی کہ وہ سینے کی کوڑی سے چل کر بہت ہی نیچے پہنچ گیا تھا بلکہ کسی حد تک اس سے بھی نیچے پہنچ گیا تھا۔

کئی سال بعد اس بھولے بسرے رسے کو جب میں نے لوچانا کے گھر پھر سے بنا کر دکھایا تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وقت کم تھا، مجھے یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ میرا اسکوٹر مس کرتا تھا لیکن لوچانا اپنے گھر میں ایک مہایوگی کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اپنی سہیلیوں اور اپنی چھوٹی بہن کو آنکھوں دیکھا حال بتانا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے جلدی سے کوٹ اتارے بغیر اپنی قمیض پتلون سے کھینچ کر ٹھوڑی تلے دبائی اور نیم عریاں پیٹ پر رسے کا ہیولا سا بنا کے لوچانا کو یقین دلایا کہ میں صرف علم ہی نہیں عمل بھی ہوں۔ گفتار ہی نہیں کردار بھی ہوں۔ بات ہی نہیں ہوت بھی ہوں!

ان دنوں ہمارے روم میں آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کا بڑا چرچا تھا۔ ہم جو سائنس کے شعبے سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے تھے، ہر اس بحث میں گھسے رہتے تھے جہاں آئن سٹائن کا یا اضافیت کا مذکور ہوتا۔ اخباروں اور رسالوں میں اسی نظریئے پر وضاحتی مضمون شائع ہو رہے تھے۔ خوبصورت رنگین تصویریں اور چارٹ چھپ رہے تھے۔ گھروں میں اس کا تذکرہ تھا۔ ہسپتالوں، بارروموں، درسگاہوں اور کلیساؤں میں اس کا ذکر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ لوچانا نے پیٹ کے رسے کا ذکر بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ نظریۂ اضافیت اور پیٹ کا رسہ اس عہد کی دو بڑی ڈسکوریاں ہیں جن پر انسانیت جتنا بھی فخر کر سکے کم ہے!

یہ اسی رسہ گیری کا شاخسانہ تھا جس نے مجھے یونیورسٹی کے بیس منٹ میں محتسبوں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا دیا۔ میں نے ٹائی اتاری، کوٹ اتارا، قمیض اور بنیان اتاری۔ پھر پتلون کی پیٹی ڈھیلی کر کے اسے انڈرویئر کی حد تک نیچے کھسکایا اور دونوں ہاتھ گھٹنوں سے چھواتے ہوئے ایک ہچکے کے ساتھ باطنی رسہ جو ابھارا تو سب نے بے اختیار ہو کر تالیاں بجائیں۔ لچانا نے اپنا سر فخر سے اونچا اٹھا لیا۔ رام سنگھ تو مرغصے اور نفرت سے بھنا اٹھا اور اس کا چہرہ کردودھ سے اور بھی سنولا گیا۔

میرے سارے ساتھی، دوست، ہمعصر اور لنگوٹیے لندن میں تھے اور مجھے روم کا حکم ہو گیا تھا۔ اس عبور دریائے شور کی سزا کی سب سے کٹھن منزل یہاں کی زبان تھی۔ لندن چلے جانے والے تو پہلے ہی سے انگریزی زبان اور انگریزی محاورے سے مانوس تھے۔ اک ذرا سی مشکل ان کو لینڈ لیڈی کے طور طریقوں سے واقفیت حاصل کرنے کی تھی، سو دو چار لینڈ لیڈیاں تبدیل کر کے سارے مسئلے حل ہو جاتے تھے لیکن جس دیس میں ایک بھی اپنا گرائیں اور وطنی نہ ہو، بات سمجھ میں نہ آتی ہو۔ کھانے پینے کی چیزوں سے حرام حلال کا خوف بندھا ہو اور سفارتخانے کا عملہ آپ کو اپنانے پر مائل نہ ہو، وہاں کوئی دیر تک کس طرح سے زندہ رہ سکتا ہے!

لیکن روم ایک ابدی شہر ہے۔ چتّا تیرنا اور اٹرنل سٹی، اس میں رہتے ہوئے کوئی مر نہیں سکتا۔ میں مرا تو نہیں لیکن ایسا زندہ بھی نہ رہا۔ جس طرح پاکستان کے لوگ آدھی صدی گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہی چلے آتے ہیں اور زندہ ہی کہلاتے ہیں اور مردم شماری میں ان کا نام حاضر مال میں ہی درج ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال میرا تھا۔ کھانے پینے کی آسانی تھی، رونے پیٹنے بکنے بڑبڑانے کی آزادی تھی۔ گھر والوں کا خوف نہ تھا۔ معاشرے میں ڈوبنے مرنے تباہ ہونے کی فکر نہ

تھی کہ اپنا نہ تھا۔ لیٹر ٹو دی ایڈیٹر لکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ نہ ملک اپنا تھا نہ اس کی سیاست۔ مہ رخوں سے اختلاط کے لیے مصوری سیکھ لی تھی اور ان کے گھر کھلا آنا جانا ہو گیا تھا۔ میری مصوری چونکہ خطوں اور رنگوں کی مصوری نہ تھی، باتوں کی اور کہن سخن کی مصوری تھی، اس لیے میں نے اسی بول بچن میں مہ رخوں کے والدین کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ہر کامرانی اور کارنمایاں سے منہ موڑ کر سارا زور زبان سیکھنے پر لگا دیا تھا اور روزمرہ کی گرفت کے لیے صرف گفتگو کی زبان پر زور دیا تھا۔

عام ضرب الامثال، محاورے، چالو تشبیہیں، فحش استعارے اور گندی گالیاں گفتگو کی کڑی کمان سے نکل کر ٹھیک نشانے پر بیٹھتی تھیں اور بات بات پر تالی بج جاتی تھی لیکن اتنے خوبصورت شہر کی ایسی شاندار تاریخ میں اتنے سارے نمائشی آثار کے اندر رہتے ہوئے بھی میں دل زندہ نہیں تھا۔ ایک اداسی کی کیفیت ہر وقت طاری رہتی اور ہر لحہ بھاگ جانے کو جی چاہتا۔

اس بے چینی کے عالم میں پوری ٹولی نے ''وزڈم آف دی ایسٹ'' کا شوشہ چھوڑ دیا۔ اب مجھے اس کا کوئی پتہ نہ تھا اور سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا گیا۔ میں نے اپنے گاؤں میں لوگوں کو ہیر پڑھتے ضرور سنا تھا اور بابے نورے تیلی سے یہ بھی سنا تھا کہ یہ سارا معرفت کا کلام ہے لیکن مجھے نہ معرفت کا علم تھا نہ کلام کا نہ ہیر کا نہ وارث شاہ کا۔ سارے علاقے میں لے دے کے ایک مزار تھا۔ بابا میر منگ کا مزار۔ وہاں شام کے وقت ایک دیا جلتا کچھ موٹے مشٹنڈے بھنگ گھوٹ کے مٹی کے پیالوں میں ٹھنڈائی پیا کرتے یا پھر سال کے سال وہاں کہیں سے قوال آ کر قوالی کرتے اور مسلسل تین دن تک چوکی بھر کر واپس چلے جاتے۔

ہمارا سارا گھرانہ سرسید کا عاشق تھا، اس لیے ہم ہر وقت ترقی، فارغ البالی اور خوشحالی کی باتیں کیا کرتے۔ پیری مریدی، عرس میلے، ڈھول دھمال اور قبر پرستی ہمارے گھرانے میں غلط اور لفنگ بازی سمجھی جاتی تھی۔ میری دونوں آپائیں اس کے سخت خلاف تھیں اور نماز، روزے، حج، زکوٰۃ کے علاوہ ہر دوسری چیز کو بدعت سمجھتی تھیں۔ بڑی آپا تہذیب النسواں، عصمت، بنات، اور زیب النساء کی باقاعدہ قلمکار تھیں اور ان کی ڈاک گھر میں سب سے زیادہ آتی تھی۔ میری والدہ اس ڈاک ڈیلیوری میں کبھی کبھی تھوڑی سی تاخیر بھی کر دیتی تھیں تاکہ بیٹیاں باورچی خانے میں ماں کا ہاتھ بٹا سکیں لیکن اباجی کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ وہ آزادیٔ نسواں کے زبردست حامی تھے اور اپنی بیٹیوں کو آلو چھیلتے، پیاز کترتے یا بگھار لگاتے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر کسی عورت کا نام لے کر یہ کہا کرتے تھے کہ میری بیٹیاں تو سروجنی نائیڈو بنیں گی۔ پھر جب ترکی سے ایک اور مشہور خاتون ہندوستان آئی تو اباجی سروجنی نائیڈو کے ساتھ ساتھ اُس کا نام بھی لینے لگے۔ میری ماں کو یہ دونوں نام زہر لگتے تھے لیکن وہ ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتی تھیں۔ آزادیٔ نسواں والے گھر میں میری ماں کی حالت روٹی پکانے والی ایک ملازمہ کی سی تھی۔

ہمارے قصبے کے قصائیوں کے گھر اچانک ایک ایسا لڑکا پیدا ہو گیا تھا جس کا بدن ڈنٹھل کی طرح نازک، آنکھیں سیاہ، رنگت سفید اور ناک نوکیلی تھی۔ وہ لمبے چھینٹے والے ریشمی کرتے پہنتا تھا اور تہمد کے بجائے لٹھے کی شلوار زیب تن کر کے باہر نکلتا تھا۔ سکول تو وہ آٹھویں جماعت کے بعد چھوڑ گیا تھا لیکن اپنے ساتھ سکول کی ایک علت مستقل طور پر گھر

لے گیا تھا۔ اس نے اچانک اردو بولنا شروع کر دی تھی جس سے اس کے گھر والے شرمندہ شرمندہ سے رہتے تھے۔ جس قصبے میں تحصیلدار، تھانیدار حتیٰ کہ ہیڈ ماسٹر نے بھی کبھی اردو نہ بولی ہو، وہاں قصائیوں کا ایک لڑکا ٹھیک دہلوی لکھنوی انداز میں یہ زبان بولنے لگے، اس علاقے کے لوگوں کے لیے تو یہ مر جانے کا مقام تھا۔

''مجھے'' میرے بڑے بھائی کا کلاس فیلو تھا اور اس کا ہمارے گھر آنا جانا بھی تھا لیکن بہت کم۔ قصبے کے لوگوں نے اس کا نام ''مجھے'' اس لیے رکھ دیا تھا کہ وہ ''مینوں'' کے بجائے مجھے کہا کرتا۔ مجھے کا لفظ چونکہ گاؤں والوں نے پہلی مرتبہ سنا تھا، اس لیے ان کو اس کا صوتی تاثر اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے صدیق کا نام ''مجھے'' رکھ دیا۔ وہ اسی نام پر بولتا تھا، اسی نام سے پکارا جاتا تھا اور اسی نام سے مشہور تھا۔

مجھے کو ٹوکرا لگا کے چڑیاں پکڑنے، اخباروں پر رنگ میں انگلی ڈبو کے بھتنے بنانے اور پکا راگ گانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ ہر گانے کو ایسے گاتا جیسے ملیریئے کا مریض گا رہا ہو اور تیز بخار کی وجہ سے اس کی تھرتھری چھوٹی ہوئی ہو۔ گانے کو کنپا کنپا کر گانے سے اس میں واقعی پکے راگ کا انگ پیدا ہو جاتا اور ہم چھوٹوں کے علاوہ کئی بڑے بوڑھے بھی اس کے فن کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے۔

''مجھے'' ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتا۔ غمناک نظمیں پڑھتا اور موتیے کا ہار کلائی سے لپیٹ کے رکھتا۔ میری ادبی، معاشرتی اور ثقافتی ٹریننگ ''مجھے'' کی معیت میں ہوئی اور میں اسی کو اپنا ہیرو مان کر دانش کی قلمرو میں داخل ہوا۔ وہاں سے نکل کر میں سیدھا روم آ گیا اور اب روم میں میرے ساتھی مجھے ''دانشِ مشرق'' پر گفتگو کی ایک سیریل پر اکسا رہے تھے اور یہ توقع کرتے تھے کہ میں اپنے بول بچن کے زور پر ان کے سوکھے ذہنوں اور پژمردہ روح کی جھولیاں بھر دوں گا۔ انہیں مشقت سے نکال کر آسانیاں عطا کر دوں گا اور انہیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آؤں گا۔

اب روم سے بھاگ کر میں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا کہ میری نوکری روم میں تھی اور وہاں سفارش وغیرہ نہیں چلتی..... لیکن خدا جب کسی کی مدد کرنے پہ آتا ہے تو لامعلوم سے کوئی سبب پیدا کر دیتا ہے اور نہ ہونے میں سے ہونا نکال دیتا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ولایت میں علوم شرقیہ کی لائبریریاں ملاحظہ کرنے کو آئے تو روما کی لائبریریوں کے لیے انہوں نے پورا ایک ہفتہ مختص کیا۔ اللہ کیا مسبب الاسباب ہے کہ اس نے بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا آدمی میری مدد کو روانہ فرما دیا۔

علامہ علاؤالدین صدیقی سے میری یوں بھی نیازمندی تھی کہ وہ لاہور میں ہمارے سانجھی دیوار کے ہمسائے تھے اور ہماری مسجد میں جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمارے اتنے قریبی تعلقات تھے کہ ہم نے سانجھی دیوار کے جھگڑے میں ایک دوسرے پر مقدمے کر دیئے تھے۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔ میرے ابا جی اپنی ہٹ کے پکے تھے، اس لیے جھگڑا بڑا طول کھینچ گیا تھا۔ ان قریبی تعلقات کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے...... اس مقدمے بازی میں میری والدہ نے خفیہ طور پر دخل دے کر معاملہ اور آگے بڑھا دیا۔ وہ ایک لمبی سی چادر لے کر علامہ علاؤالدین صدیقی کے گھر چلی گئیں اور انہی کے ڈرائنگ روم میں ان کی پیشی کرا لی۔ علامہ صاحب سر جھکا کر میری والدہ کے سامنے بیٹھے رہے اور جی جی کرتے رہے۔ اماں نے کہا ''علاؤالدین تم اپنے ابا جی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو اور ان کے مزاج کو خوب سمجھتے ہو۔ پھر تم نے اس دیوار کے تین انچ ادھر یا چار انچ ادھر ہونے پر کیا مقدمے بازی شروع کر رکھی ہے!'' علامہ صاحب نے سر کو مزید جھکا کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ''اماں جی جو آپ کا حکم ہوگا، اسی طرح سے ہوگا۔''

ہم تو علامہ صاحب کے ساتھ کھڑکا کے مقدمہ لڑتے رہے لیکن وہ بیچ میں سے دم دبا کر بھاگ گئے۔

جب وہ روما کی لائبریریاں دیکھنے ہمارے شہر آئے تو میں نے ان کے ہوٹل سے انہیں اچک لیا۔ اس وقت میرے پاس ایک نیا لمبریتا سکوٹر تھا جسے میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ جھلا جھلا کے چلایا کرتا تھا اور اس پر اپنے محلے کے آوارہ گرد لڑکوں کے ساتھ مل کر لوک گیتوں کی تانیں اُڑایا کرتا تھا۔ لمبریتا چاہے دائیں انڈیل کے چلتا چاہے بائیں، اس کے پائیدان کی رگڑ سے پرانی رومن سڑکوں پر چنگاریاں ضرور اڑا کرتی۔ یہ میری شام کے بعد کی زندگی تھی۔ صبح کے وقت یونیورسٹی میں اور بعد دوپہر ریڈیو روم میں ایک ایک بڑی سنجیدہ اور پروقار زندگی کا چلن قائم تھا۔

علامہ صاحب نے پہلے تو سکوٹر پر بیٹھنے سے انکار کر دیا لیکن جب میں نے ان کو ٹرام اور بس کے ٹکٹ اور ٹیکسی کے کرائے بتائے تو انہوں نے میری بات مان لی اور سکوٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا ''اشفاق میاں! سکوٹر لوہے اور ربڑ کا امتزاج ہے اور بے جان چیزیں کسی کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔ اس لیے ذرا آہستہ ہی چلانا۔''

ریڈیو سے فارغ ہو کر میں علامہ صاحب کو سیدھا ساحل سمندر پر لے گیا جہاں غسل آفتابی کی عاشق ہزاروں ریت پر اوندھی سیدھی لیٹی تھیں۔ اوستیا کا ساحل پاپا کی نگری کے قریب ہونے کی وجہ سے سخت قسم کی اخلاقی اقدار کا پابند تھا۔ یہاں ہر عورت کو کم از کم دو ٹکڑوں کا لباس پہن کر سن بیدنگ کی اجازت تھی لیکن کچھ شوخ و شنگ لڑکیاں ریت پر اوندھی لیٹ کر اپنے اوپر کا پٹہ کھول کر اس کے دونوں بند دائیں بائیں ریت پر ڈال دیتی تھیں۔

علامہ صاحب نے اس لعنتی انبوہ پر دور دور تک نظر دوڑائی اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھے مخاطب کر کے بولے ''اشفاق! یہ تہذیب اپنی ہی خنجر سے بہت جلد خودکشی کرنے والی ہے۔ تم دیکھو گے کہ ایسے معاشروں کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور تاریخ دان ان کے بارے میں اسی طرح سے بتایا کریں گے جس طرح آسمانی کتابیں عاد و ثمود کے بارے میں بیان کرتی ہیں۔'' انہوں نے چاروں طرف پھر نظر دوڑائی اور مجھ سے پوچھنے لگے۔ ''کیا تم ہر روز یہاں آتے ہو؟''

میں نے کہا ''ہر روز تو نہیں علامہ صاحب۔ البتہ جب کبھی وقت ملتا ہے تو میں اکثر شہر کے پر شور ہنگاموں سے اکتا کر سکون کی جستجو میں بیٹھ جاتا ہوں یہاں آ کر۔''

''یہاں آ کر سکون ملتا ہے؟'' انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے کہا ''سر سکون حاصل کرنے کے اپنے اپنے طور طریقے ہیں۔ افریقی لوگوں کو جنگلوں، دریاؤں، صحراؤں میں گھومنے سے سکون ملتا ہے۔ ہم لوگوں کو یادِ خدا سے تسکین قلب حاصل ہوتی ہے۔ اسکیموؤں کو برف پر پھسلنے میں آنند ملتا ہے۔ ان کو دھوپ میں بیٹھنے اور بدن کھولنے سے راحت ملتی ہے۔''

پھر مجھے اچانک یادِ خدا سے یاد آیا کہ مجھے تو علامہ صاحب سے مشرق کی اس دانش کے بارے میں استفسار کرنا ہے جو ہمارے خطے کا مخصوص علم ہے اور جس میں پیروں، پیغمبروں، ولیوں، صوفیوں اور سنیاسیوں کا بڑا حصہ ہے۔

علامہ صاحب نے کہا "یہ ہے تو درست لیکن اب اس علم کا دور نہیں رہا۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے پاکستان بنایا ہے اور اب اس کو ترقی دے کر بامِ عروج تک پہنچانا ہے۔ یہ ترقی پرانے علوم اور مشرق کی دانش سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے اپنے پرانے، سوکھے پیڑ پر ایک نیا پیوند لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ پیوند سائنس اور ٹیکنالوجی کا پیوند ہے جس کے باندھنے کو مغرب کے علومِ اقتصادی کی رسی درکار ہوگی۔ جس پسماندہ ملک نے یہ راز پالیا، وہ تو تر گیا اور جو اپنی پرانی طرز پر اڑا رہا، اس کا نام و نشان اس کرۂ ارض سے مٹ گیا۔ اب سوچ لو اور فیصلہ کرلو کہ تم کو کیا کرنا ہے۔"

میں نے کہا "سر میں تو اس غرض سے یہاں آیا ہوں کہ اسی ترقی کو واپس اپنے وطن لے جا کر اس کا پیوند لگانے کا خواہشمند ہوں لیکن یہاں کے کچھ پڑھے لکھے لوگ ایسے ہیں جو میری جان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"کیوں!" انہوں نے چونک کر کہا اور میری وجہ سے کچھ پریشان سے ہوگئے۔

"یہاں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ مشرق کے پاس خوشگوار اور خورسند زندگی بسر کرنے کا ایک نسخہ کیمیا ہے جس سے انسان اپنی تینوں منزلوں کو ایک سا روشن کرسکتا ہے اور ایک سا توازن عطا کرسکتا ہے۔"

علامہ صاحب میری یہ بات سن کر فکرمند سے ہوگئے۔ انہوں نے اپنے اردگرد برہنہ اور نیم برہنہ عورتوں کے کھیتوں اور کھلیانوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا "اس بیچاری مخلوق کا کیا بن سکتا ہے جو لوگ مذہب سے اور اخلاق سے اس قدر دور ہو جائیں، اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں، ان کی رہنمائی کون کرسکتا ہے؟"

"یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ اہلِ مشرق اپنی دانشِ پارینہ کے زور پر ہماری مدد کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس راز کو اخفا میں نہ رکھیں اور بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے اسے عام کردیں...... کیا ہمارے پاس واقعی کوئی ایسا راز ہے علامہ صاحب!"

"ہمارا دین......" انہوں نے جمعہ والے جوش خطابت سے کہا۔ "ہمارا مذہب، ہمارے خدا کا فرمان جو ان کے نبیوں کے ذریعے ان تک بھی پہنچا لیکن انہوں نے اس میں تحریف کرلی۔ اس کی شکل بدل ڈالی اور اب یہ پوچھتے ہیں...... ہمیں وہ راز بتاؤ اور اس بھید کی تفصیلات......"

میں نے علامہ صاحب کی بات کاٹتے ہوئے بڑے ادب سے درخواست کی کہ "کیا ہم اپنے دین کے ذریعے انسانیت کے اس بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا؟"

"وعدہ کبھی یکطرفہ نہیں ہوتا اشفاق میاں!" انہوں نے سر جھٹک کر کہا۔ "اس میں دونوں طرف سے کچھ اقرار و اثبات ہوتے ہیں۔ آپ لوگوں نے عمل سے انحراف کر کے زبانی اسلام کو پکڑ لیا۔ اسے ڈھیل دینے کے بجائے طنابیں کھینچ لیں۔ اب تم ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے ہو اور یہ سمجھنے سے قاصر ہو کہ ایسی افتاد تم پر کیوں پڑی اور اس کا اصل ذمہ دار کون ہے؟"

علامہ صاحب کی گفتگو چونکہ مذہب کا موڑ کاٹ گئی تھی، اس لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ اب بات جمعہ والے خطبے کا رنگ اختیار کرلے گی۔ اسی لیے بہتر یہی ہے کہ موضوع بدل دیا جائے۔ میں نے کہا "علامہ صاحب یہ ہزاروں عورتیں جو اس طرح پرے جما کر لیٹی ہیں، دراصل اپنا رنگ تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ یہ اپنے گورے رنگ کو سانولے میں اور سانولے کو کالے میں ڈھالنا چاہتی ہیں۔ وقتی طور پر تو ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے لیکن مہینے دو مہینے بعد وہی بدقسمت سفید رنگ لوٹ کر آ جاتا ہے اور یہ کمبخت پھر گوری نشوح ہو جاتی ہے۔ ان کا کیا کریں؟"

وہ میری یہ دردمند درخواست سن کر ہنس پڑے اور ہاتھ کو عجیب انداز میں جھٹک کر بولے۔ "تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کام! انہیں موج کرنے اور بلّے لوٹنے دے۔ تو قاضی بن کران کے لیے کیوں دبلا ہو رہا ہے۔ دیکھ تو سہی کیا دنیا و مافیہا سے بے فکر لیٹی ہیں کہ اپنے ستر تک کا ہوش نہیں۔" پھر انہوں نے اپنی نظروں کا ٹیلی شاٹ چین کر کے ان کے ستروں کا معائنہ کیا اور کہا "ان بدنصیبوں کا معاملہ تو بے حیائی کی حدود سے بھی آگے نکل گیا ہے۔"...... یہ ان دنوں کی بات ہے جب "زمیندار" اور "انقلاب" کے بند ہو جانے کے بعد نئے پاکستان کے اردو اخباروں نے ولایت کی نیم برہنہ ماڈلوں کی لمبی لمبی تصویریں شائع کر کے ان پر "بے حیائی کے مجسّے" "انسانیت کی تذلیل" اور "بداخلاقی کے پرچم" وغیرہ کے عنوانات دینے شروع کردیئے تھے۔ جس اخبار میں بداخلاقی کے ایسے پرچموں کی تعداد زیادہ ہوتی، اس اخبار کی اشاعت بھی اسی نسبت سے بڑھ جاتی۔

جانے سے پہلے روما کے چامپینو ایئرپورٹ پر علامہ علاؤالدین صدیقی صاحب نے تصوف اور رہبانیت کو ملا جلا کر ایک تفصیلی لیکچر دیا اور مجھے یقین دلا دیا کہ تصوف اور روحانیت بے معنی اور لایعنی سوچ ہے جسے بادشاہوں، بے عملوں، بددیانتوں اور کاہلوں نے ایک طرف اور ملنگوں، نشیوں، بھنگڑوں اور بدفکروں نے دوسری طرف اپنی مطلب براریوں کے لیے وضع کر کے لوگوں کو احمق بنا رکھا تھا۔ جب بھی بنا رکھا تھا اور آج بھی بنا رکھا ہے۔

پھر انہوں نے بڑی محبت سے چمکار کر کہا "تم نے ایسی واہیات باتوں میں دخل نہیں دینا۔ ایسے اداروں کا ممبر نہیں بننا۔ تھیاسوفی، میڈی ٹیشن، یوگا یا سپر چوئلزم وغیرہ کے لیکچرز میں شمولیت نہیں کرنی اور اس قسم کے سیمینارز اٹینڈ نہیں کرنے۔ بس......! اپنے ایمان پر نظر رکھنی ہے اور ساری توجہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر مرکوز کر کے اپنے لیے اور اپنے وطن کے لیے مستقبل کی راہیں روشن کرتے چلنا ہے...... اس کے علاوہ تمہارا یہاں آنے کا اور کوئی مقصد نہیں۔ اگر تم نے میرے اس کہے سے روگردانی کی تو میں جا کر ڈاکٹر صاحب سے شکایت کردوں گا اور تم کو فوراً واپس بلا لیا جائے گا۔"

---

(2)

علامہ صاحب تو یہ دھمکی دے کر چلے گئے لیکن میں ان کے چلے جانے کے بعد کچھ زیادہ ہی ڈر گیا۔ اس زمانے کے ابا جی واقعی ابا جی ہوتے تھے اور اپنے بچوں کے دوست نہیں کہلاتے تھے۔ بڑی محبت، بڑی شفقت والے اور غایت درجہ کے عاشق قسم کے ابے لیکن اپنے اور بچوں کے درمیان ایک فاصلہ رکھ کر زندگی بسر کرتے تھے۔ جب ابا جی نے "ہاں" کر دی تو اس کا مطلب "ہاں" ہوتا تھا اور جب "نہ" کر دیا تو پورا "ناں نہ" بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ! ہماری تہذیبی روایت میں ماں سے محبت کا سلسلہ اس وقت سے چلا آ رہا ہے جب ابا لوگ سخت ہوتے تھے اور مئی جون کے سورج کی طرح دہکتے تھے۔ مائیں زندگی کے جھلسے ہوئے ریگستان کی پھواریں تھیں۔ بچے کو ذرا سا تکلیف میں دیکھا، ساری کی ساری نثار ہو گئیں۔ شبنم کی سی ٹھنڈک ہو گئی۔ زندگی کے نخلستان میں اور کئی چشمے پیدا ہو گئے۔ رنگا رنگ پرندے دل بہلانے کو آ گئے۔

لیکن جب کسی آدمی سے علم کے اظہار کو کہا جاتا ہے اور سننے والے نیم دائرے کی شکل میں اس کے سامنے بیٹھ کر علم کی بھیک مانگنے کو جھولیاں پھیلاتے ہیں تو پھر علم والے سے رہا نہیں جاتا۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اظہار کرتا ہے اور پھر کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ کئی مرتبہ یوں بھی ہوا کہ سننے والے اٹھ کر چلے بھی گئے۔ اپنی بیزاری کا اظہار بھی کر گئے لیکن کہنے والا کہتا چلا گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ شراب کا نشہ چھوٹ جاتا ہے، ہیروئن کی لت ختم ہو جاتی ہے۔ چور چوری چھوڑ دیتا ہے لیکن سنانے والا سنانے سے نہیں رُک سکتا۔ منبر پر ہو، مشاعرے میں ہو، اسمبلی میں گھس جائے، سلامتی کونسل میں پہنچ جائے، بولنے والا بولے گا اور دبا کے بولے گا۔ مہاراجہ پٹیالہ تو بجلی کی پٹی لگانے کے باوجود اوندھے منہ گر کر ہانپنے لگتا تھا مگر اپنی دانش کا اظہار کرنے والا نہ کبھی تھکتا ہے نہ ہانپتا ہے نہ اس کو اونگھ آتی ہے نہ اس کی آواز گرتی ہے، نہ تھکاوٹ کے آثار نظر آتے ہیں۔ بس کہے چلا جاتا ہے، بتائے جاتا ہے، بولے جاتا ہے۔

مجھے میرے ساتھیوں نے، دوستوں نے، ہم کاروں اور شاگردوں نے سامنے بٹھا کر اپنا نیم دائرہ بنا لیا تھا تو میں کیا کرتا؟ ساتھ ہی موضوع کچھ ایسا تھا کہ جس میں کہیں سے بھی پکڑے جانے کا احتمال نہ تھا۔ وہ لوگ مشرق کے بارے میں بہت کم جانتے تھے اور میں حسن اتفاق سے ان سے بھی کم جانتا تھا لیکن خطرہ یوں نہیں تھا کہ میں مشرق کا خاص سومناتی

تھا اور میرے اندر جوٹل بجتا تھا، اس کی گونج اور گھمکار صرف میرے پاس تھی۔ وہ سن سکتے تھے، سنا نہ سکتے تھے۔ نچ سکتے تھے بجا نہ سکتے تھے!

جب لڑکیوں نے فاختاؤں کی سی آواز نکال کر کہا "سینور پروفیسورے! آپ سُری رمز ہم سے چھپا رہے ہیں اور دیا کی پوتھی گپتا رہے ہیں تو میں نے اپنی چھپن چھپائی کے انداز نہفتہ میں اور اضافہ کر دیا اور اپنے بدن کے اشاروں سے ان پر واضح کر دیا کہ اس میں بہت ساری مشکلات ہیں۔ بتانے کی مشکل، سمجھنے کی مشکل، ابلاغ کی مشکل اور آخر میں مشکل کی مشکل۔ جب آدمی کے پاس کچھ نہ ہو، کھیسہ خالی ہو، روح خالی اور بدن بے حضور ہو تو اسے پکڑے جانے کے خوف سے کئی مرتبہ خود جھر آہٹ کر کے اپنا کاسہ خالی دکھانا پڑتا ہے۔ اس سے نہ صرف بھرم نہیں کھلتا بلکہ تالی بھی بجتی ہے اور بڑے زور کی بجتی ہے۔

مجھے یونیورسٹی لائبریری سے، انگریزی زبان میں، اپنشد پر ایک بڑی اچھی کتاب مل گئی۔ اس میں ترجمے کے ساتھ ساتھ وضاحتی نوٹ بھی تھے۔ رگ وید پر ایک طویل مقالہ تھا لیکن باوجود اس کے کہ رگ وید میرے اپنے علاقے، میرے ملک پاکستان میں رقم ہوا تھا، وہ میرا کام نہیں دیتا تھا۔

ایش اپنشد میں لکھا تھا "ذات ہر جگہ ہے، ہر مقام پر ہے۔ نہ اس کا کوئی جسم ہے نہ ہی اس کی کوئی چھب ہے۔ کامل، سراسر، عاقل، دانا، علیم مطلق، درخشاں، ماورائے زمان و مکان جوازلی جلوس میں ہر عہد اور ہر زمان کو اس کا فرض اور ماموریت عطا کرتا ہے۔"

کین اپنشد کہتا ہے "وہ جو کہتا ہے کہ روح شناخت میں نہیں آتی۔ بھید سے واقف ہے۔ پر وہ جس کا خیال ہے کہ وہ جانتا ہے، گمراہ ہے، مورکھ ہے! نادان یہ سمجھتا ہے کہ روح بدھی میں ہے، گیان ہے لیکن گیانی سمجھتا ہے کہ وہ بدّیا سے آگے کی چیز ہے۔ روح سے شناسائی وحی اور الہام کے زور پر تو ہو سکتی ہے اور کسی طرح سے نہیں اور جو اپنی زندگی میں اس کو پا گیا، وہ حق سے اور حقیقت سے آشنا ہو گیا۔"

یہاں مجھے رہ رہ کر قرآن کا فرمان یاد آتا ہے "کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا ایک امر ہے۔" لیکن میں اس کا ذکر کرنے سے جان بوجھ کر اجتناب کرتا تھا کہ وہ قرآن کا حوالہ سن کر بدک جائیں گے اور تجسس کی ساری راہیں چھوڑ کر واپس اپنی پتھروں والی رومن روڈ پر آ جائیں گے۔

ولایت میں سکالرشپ کے علاوہ تقابلی مذاہب پر جس قدر مواد شائع ہوتا ہے، اسی میں اسلام کا ذکر واجبی سا ہوتا ہے، صرف تاریخ کے حوالے سے۔ قرآن کا اشارہ ایک سطر میں اور حضور ﷺ کا حوالہ بالکل مفقود۔ وہ لوگ بدھ مت، جین مت، ہندو دھرم، پارسی مذہب اور سکھ پنتھ کے مقابلے میں اس کو ایک باقاعدہ مذہب قرار نہیں دیتے۔ بس ایک لڑاکے سے گروہ کے دور حرب و ضرب کا تذکرہ کر کے آگے گزر جاتے ہیں۔

مجھے محنت تو کافی کرنی پڑتی تھی اور میں نے رات کو اپنی نیند کا ایک گھنٹہ بھی کم کر دیا تھا لیکن یہ درس کافی مفید ثابت ہو رہے تھے۔ سننے والوں کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ سنانے والے کو بڑا لطف آ رہا تھا۔ شمع میرے

سامنے تھی اور میں جھوم جھوم کر غزلے، دوغزلے اور سہ غزلے سنا رہا تھا۔ اک سلسلہ گفتگو تھا جو ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بات خود بخود آگے بڑھتی چلی جاتی تھی۔

بات میں بھی اللہ نے کیا جادو رکھا ہے کہ جب ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو پھر بڑھتی، پھیلتی، لپکتی جاتی ہے۔ رکنے لگتی ہے تو کنی کاٹ کر ایک اور رُخ پر نکل جاتی ہے۔ پھر کھلا میدان ہوتا ہے اور بات ہوتی ہے۔ تکلم ہوتا ہے اور بیان ہوتا ہے۔ بیان فوک مواصلات کی پرانی گاڑی پر بھی ٹھیک چلتا ہے اور بلٹ ٹرین کی تیز رفتاری کا مقابلہ بھی کرتا ہے۔ بی ایم ڈبلیو کی کھڑکی سے ہاتھ لہراتا بھی گزرتا ہے اور سطح آب سے اوپر اٹھ کر ہوور کرافٹ کی شان میں بھی چلتا ہے لیکن سب سے ملائم، بے تکان اور رواں گفتگو برف کی سلیج کی چال چلتی ہے۔ نرم نرم!! نرم!!!

میری کتابوں سے چرائی ہوئی باتوں سے وہ سب لوگ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اچھی طرح سے پہچان لیا کہ میں مشرق کی سرّی رمز کو چھپا رہا تھا اور اب میں نے بقدرِ توفیق اسے کھولنا شروع کر دیا ہے۔

آہستہ آہستہ اس سوانگ کا مجھ پر ایک عجیب سا اثر ہونے لگا۔ بھرا تو میں نے بہروپ تھا اور وہ بھی ان لوگوں کے دباؤ میں آ کر مگر وہ بہروپ ایک عجیب سا روپ اختیار کرنے لگا۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تو کچھ ایسی ہی کیفیت میری ہوگئی۔ اس جھوٹے ناٹک کا میری سچی زندگی پر ایک عجیب طرح کا اثر پڑنے لگا۔ زمین سے اکھڑے ہوئے پاؤں نہ سچ کی زمین پر پڑتے تھے نہ جھوٹ کے فرش پر اترتے تھے۔ سارا کچھ پاٹے خان کی پتلی کی طرح ہوا میں معلّق ہو گیا تھا۔

اب مجھے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں یہ جھوٹا ڈرامہ بیک سٹیج سے نکل کر سچ کے بھرپور اکھاڑے میں ہی نہ جا نکلے کیونکہ......

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شاہی بھنگی تھا۔ وہ جو پاخانہ صاف کرنے کے لیے محل میں گیا تو اتفاقاً اس کی نظر شہزادی پر پڑ گئی اور وہ بھنگی ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا مگر اپنے کمینہ پن اور شہزادی کے علو مرتبہ کو دیکھ کر کہ یہ وصل تو ناممکن ہے، ناامید ہو گیا!

مرض عشق نے جب غلبہ کیا تو وہ بہت بیمار ہو گیا اور بجائے بھنگی کے اس بھنگی کی عورت پاخانہ کمانے لگی۔ کشش دل کا اثر مشہور ہے۔ شہزادی کے دل میں بھی اس کا اثر ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اس بھنگی کی عورت سے شہزادی کہنے لگی کہ ''اب تیرا خاوند کیوں نہیں آتا؟'' اس نے کہا ''وہ بیمار ہے۔''

شہزادی نے کہا ''ہم شاہی طبیب اس کے معالجے کے واسطے بھیج دیں؟ اس کو کیا بیماری ہے؟''

بھنگن شہزادی کا یہ سوال سن کر خاموش رہی لیکن جب شہزادی نے بہت اصرار کیا اور بھنگن کو سخت دھمکی دی کہ بتلا اس کو کیا بیماری ہے؟ تو بھنگن نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور اگر جان کی امان ملے تو عرض کروں؟

شہزادی نے امان دی تو اس نے کہا ''حضور! اصل بات تو یہ ہے کہ بیماری اسے کچھ نہیں۔ وہ حضور کو دیکھ کر آپ کا عاشق ہو گیا ہے لیکن اب چونکہ دوبارہ دیدار ممکن نہیں، اس لیے غم سے لاچار ہو کر قریب المرگ ہو گیا ہے اور چند ہی روز

میں اس دنیا سے کوچ کیا چاہتا ہے۔''

شہزادی نے کہا ''یہ اختیاری بات نہیں لیکن اگر میرے دیکھنے سے اس کی جان بچ جائے تو میرا کوئی نقصان نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ میرا مرتبہ مجھے اس کے سامنے آنے سے مانع ہے کیونکہ اس سے میری، بادشاہ سلامت کی اور ساری سلطنت کی بدنامی ہوگی۔ البتہ ایک ترکیب بتاتی ہوں۔ اگر وہ اس پر عمل کرے تو شاید مجھے دیکھ سکے اور اس کی جان بچ جائے۔''

بھنگن نے ہاتھ باندھ کر کہا ''آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ جو آپ فرمائیں گی وہی ہماری زندگی کا کارن بن جائے گا۔''

شہزادی بولی ''ترکیب یہ ہے کہ وہ فقیرانہ شکل بنا کر دریا کے کنارے بیٹھ جائے اور رات کو تُو اسے روٹی وغیرہ کھلا دیا کر۔ وہ تمام دن اللہ تعالیٰ کا نام لیتا رہے اور آنکھیں بند کر کے اللہ اللہ کرتا رہے اور کسی طرح کا خیال اپنے دل میں نہ رکھے۔ بس ایک ہی طرف لو لگا کر بیٹھا رہے۔ اگر کوئی اس کو نقدی یا کھانے کی کوئی چیز نذر کرے تو ہرگز نہ لے۔ لوگ یہ چیزیں وہاں چھوڑ جائیں تو مطلق توجہ نہ کرے اور اگر کوئی یہ چیزیں اٹھا کر لے جائے تو اس کو منع نہ کرے۔ چند روز میں جب اس کی شہرت دور دور تک ہو جائے تو امیر غریب، متعدی سپاہی، وزیر سالار سب اس کی زیارت کو جائیں گے۔ پھر بادشاہ بھی جائے گا اور جب بادشاہ ان کی زیارت کر کے لوٹ آئیں گے تو میں بھی ان سے اجازت لے کر اس کے پاس چلی جاؤں گی۔ اسے اپنے درس دکھاؤں گی۔ یوں اسے ملنے اور بات چیت کرنے کا خوب موقع مل جائے گا۔''

بھنگن نے ہاتھ جوڑ کر اور سیس نوا کر شہزادی کا شکریہ ادا کیا اور گھر آ کر یہ بات بھنگی کو سنائی۔ بھنگی کی ویران دنیا میں بہار آ گئی۔ اسی وقت ایک بوریا اٹھا کر دریا کنارے جا بیٹھا اور نام خدا میں مشغول ہو گیا۔ پھر ایسی حالت بنالی کہ اگر کوئی نذر دیتا تو اس کی طرف توجہ نہ کرتا اور جو کوئی رکھ جاتا اور دوسرا اٹھا لے جاتا تو اسے منع نہ کرتا۔ رفتہ رفتہ عام شہر میں اس کی شہرت ہو گئی۔ لوگ اس کے پاس آنے لگے اور نذریں وغیرہ بھی لانے لگے مگر اس نے کسی کی طرف دھیان نہیں کیا اور اللہ اللہ کرتا رہا۔

ہوتے ہوتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو اس کا حال دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا کہ کیا واقعی وہ فقیر سچا ہے اور دنیا سے بے تعلق ہے۔

وزیر حکم پاتے ہی سیدھا دریا کنارے پہنچا اور جا کر فقیر کو نذر پیش کی۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی۔ نہ اس کی طرف دیکھا، نہ اس سے کوئی بات کی۔ بس اسی طرح آنکھیں موندے اللہ سے لو لگائے بیٹھا رہا۔

وزیر نے یہ حال بادشاہ کو سنایا کہ واقعی اس کا رنگ ایسا ہی ہے کہ دنیا کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ لوگوں کی بات کا جواب نہیں دیتا۔ ذات میں گم بیٹھا ہوا ہے۔

اگلے روز بادشاہ خود گیا۔ نذر نیاز دی، سلام کیا لیکن فقیر ملتفت نہ ہوا، اسی طرح بیٹھا جاپ کرتا رہا۔

رات کو شہزادی نے پوچھا ''سنا ہے آج آپ کسی فقیر کے پاس تشریف لے گئے تھے، اس کو کیسا پایا؟''

بادشاہ نے کہا ''وہ فقیر بہت ہی سچا اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہے۔کوئی مادی یا دنیاوی غرض اس کو چھو تک نہیں گئی۔ہمیں فخر ہے کہ ہماری مملکت میں اللہ کے کسی نیک بندے نے قیام فرمایا اور ہماری قلمرو کی عزت افزائی کی۔''

شہزادی نے عرض کیا ''اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں بھی اس کی زیارت نہ کرلوں؟''

بادشاہ نے کہا ''بالکل ٹھیک ہے۔ جب دل چاہے، ان کو سلام کرآنا اور ان کی خدمت میں کوئی نذر بھی لے جانا۔شاید تمہاری نذر قبول کرلیں۔''

شہزادی نے اس کی عورت بھنگن کو بلا کر کہا کہ ''اس سے کہہ دینا کہ میں کل صبح آؤں گی۔اور اپنے دیدار کے شربت سے تم کو سیر کردوں گی۔کل تمہاری برسوں کی دلی مراد برآئے گی اور حسرت دیدار پوری ہوجائے گی۔''

اس بھنگن نے جا کر اپنے گھر والے کو یہ مژدہ سنایا کہ جس کے لیے تو کئی سال سے بہروپ بھر کر بیٹھا ہے، وہ خود چل کر تیرے پاس آرہی ہے اور تیرے سامنے بیٹھ کر اپنا موہنا مکھڑا خود تجھ دکھلا رہی ہے۔

بھنگی خوشی کی یہ خبر سن کر تڑپ کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔

جب ہوش میں آیا تو دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا، میں نے یہ کام آج تک جھوٹ موٹ محض ایک نفسانی غرض کے لیے کیا تھا اور اس کا ایسا مثبت نتیجہ سامنے آگیا۔جب اس کے نام میں اس قدر تاثیر ہے کہ میرے جیسے ناچیز اور حقیر کے پاس بڑے سے بڑے مرتبے اور اعلیٰ رتبے والے بادشاہ کو بھیج دیا تو اگر میں سچے دل سے اس کا نام لوں، پھر معلوم نہیں اس سے بھی زیادہ اور کیسی کیسی نعمتیں ملیں۔

اس خیال کے آتے ہی وہ زارزار رونے لگا اور اپنے پہلے ارادے سے نہایت عاجزی کے ساتھ توبہ کرکے اس نے دعا کی کہ خداوندا مجھے اپنا دیدار دکھا دے۔جب تیرے نام میں اتنا اثر ہے کہ بادشاہ اور وزیر اور شہر کے امراء و رؤسا میرے بوریئے پر آنے لگے تو خبر نہیں تو خود کس قدر سوہنا ہوگا اور جب میں نے جھوٹ موٹ مکر و فریب سے تیرا نام لیا تو ملک کے بادشاہ کو میرے پاس بھیج کر میری عزت افزائی کرادی تو اب جب کہ میں سچے دل سے تجھے پکارتا ہوں تو ایسا رحیم و کریم ہے کہ خود بھی ضرور ہی میرے پاس آجائے گا اور مجھے اپنا دیدار دکھا دے گا۔اسی طرح تمام رات روتا رہا اور گریہ وزاری کرتا رہا۔

جب پچھلی رات ہوئی تو اس کی عجز و زاری بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوگئی اور فرش سے عرش تک اس کو انکشاف ہوگیا اور بہشت کی حوریں اس کو دکھائی دینے لگیں۔دیکھتے دیکھتے ایسا معاملہ پلٹا کہ پہلے یوں تھا، پھر یوں ہوگیا۔

صبح کو جب شہزادی اس کے پاس پہنچی تو وہ مطلق اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔حوران بہشت اس کی طرف نظر اٹھا کر زیارت کررہی تھیں اور تجلیاتِ ذاتِ الٰہی اس پر وارد ہورہی تھی اور وہ مشاہدۂ حق میں مستغرق ہوا جارہا تھا۔

باندیوں نے اس کا کندھا ہلا کر کہا ''مملکت کی شہزادی تشریف لائی ہیں اور یہاں تمہارے سامنے بیٹھی ہیں۔ان کے ساتھ کچھ بات چیت کرو اور مدعا اپنے منصوبے کا بیان کرو۔''

اس نے بڑی دیر کے بعد جواب دیا کہ ''اب مجھے شہزادی کی کچھ پروا نہیں، شہزادی سے ہزار ہا درجہ حسین و جمیل حوریں اس وقت میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہیں اور میں محوِ نظارہ آرام سے اس حسن لافانی سے لطف اندوز ہورہا ہوں۔''

شہزادی نے یہ سن کر کھینچ کر ایک طمانچہ اس کے منہ پر مارا اور کہا ''بے وفا! بے ایمان! تیری مرشد تو میں ہوں اور تو حوروں اور بہشت کے تماشے میں مشغول ہوا بیٹھا ہے۔خود تو وہاں تک چلا گیا اور میں یہیں رہ گئی۔مجھ کو بھی تو اپنے ساتھ یہ تماشے دکھلا اور مجھے بھی اس دنیا کی سیر کرا۔''

اس نے شہزادی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے واصل بہ حق ہوگیا۔وہ بدنصیب روتی پیٹتی نالہ و شیون کرتی اپنی باندیوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں واپس محل کو روانہ ہوگئی۔

سو اللہ کا نام لینا ہر طرح سے فائدہ ہی فائدہ رکھتا ہے۔چاہے جھوٹ ہو چاہے سچ۔اس کام میں کبھی جھوٹا بھی سچا ہوجاتا ہے۔

جھوٹے کھیڈوں سچا ہو
سچا تے کوئی ورلا ای ہو

میں تو اس وقت ایک جھوٹا نام دھاری بھی نہیں تھا۔بس دوستوں یاروں کے ساتھ ایک لیلا رچا رکھی تھی اور اس کے مزے لے رہا تھا۔اگر یہ جھوٹی کھیڈ ہوتی شاید کبھی اس کا کوئی سچا انعام بھی مل جاتا لیکن میں تو کھیل سے بہت پرے تھا۔نہ کھلاڑی تھا نہ تماشائی۔بس اس علاقے کا باشندہ تھا جہاں بہت سی کھیلیں کھیلی جارہی تھیں۔

روما کے چار بڑے گرجوں میں سے ایک سانتا ماریا مجودے میرے مرکزی دفتر ''ازمیو'' سے بہت ہی قریب تھا۔یونیورسٹی جاتے ہوئے ریڈیو سٹیشن پہنچنے کے لیے ریلوے سٹیشن جانے کے لیے، اٹھاسی نمبر اور سولہ نمبر کی بس پکڑنے کے لیے، سانتا ماریا مجودے کے اس پہلو سے یا اُس پہلو سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔انہی دنوں میرے دل میں خیال آیا کہ باہر سے گزرنے کے بجائے کیوں نہ اندر سے گزر جایا کروں۔فاصلہ بھی قطع ہوگا۔سر پر مسلسل چھت بھی ملے گی اور روح کو بالیدگی بھی حاصل ہوگی۔

گرجے کے اندر سے گزرتے ہوئے، پرانے بزرگوں، صوفیوں، راہبوں کی شیشے کے بکسوں میں رکھی ہوئی حنوط شدہ میتوں کے سامنے رکتے ہوئے، اعتراف کے چوبی ڈربوں کے سامنے دوزانو گنہگاروں کو آہستہ آہستہ دھیمی آواز میں اعتراف گناہ کرتے ہوئے اور تنگ و تاریک ڈربے کے اندر چھپے ہوئے پادری کو اپنے خیالوں میں اجالتے ہوئے جب میں تین چار مرتبہ گرجے کے اندر سے گزرتا تھا تو میرا سارا وجود ایک جھنجھناتی ہوئی جھانجھ بن جاتا تھا۔اس مسلسل ارتعاش اور تواتر کی آمد و رفت سے پہلے میرے بدن میں، پھر ذہن میں اور آخر میں روح کے اندر کچھ عجیب سی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔

مجھے اندیشہ لاحق ہوگیا کہ اگر یہ سب کچھ اسی طرح ہوتا رہا تو میں عیسائی ہوجاؤں گا اور کیتھولک مذہب اختیار کرلوں گا۔

لوگوں کا عشائے ربانی کی ادائیگی میں ایک ساتھ مل کر حمد گانا، کمرہ بھر سائز کے بڑے بڑے آرگن کا بجنا، رنگدار شیشوں سے باہر کی روشنی کا اندر داخل ہونا، مریم اور یسوع کے مجسّموں میں حرکت کے آثار پیدا ہونا، مُر کی خوشبو سے

سارے کلیسا کا دھیمے دھیمے مہکتے جانا اور خوبصورت اطالوی لڑکیوں کا سفید سفید گھٹنوں کے بل ہو کر رنگا رنگ ریشمی سکارف سروں پر باندھ کر اعترافی ڈربوں کے سامنے اپنے احوال بیان کرنا، دل و دماغ کو اور روح و بدن کو کچے دھاگوں سے باندھ کر دہیں کیل دیتا تھا۔

میرے اندر ایک بہت بڑی تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی۔ آخر عیسائیت بھی تو خدا ہی کا عطا کردہ ایک مذہب ہے۔ اہل کتاب کا خدا بڑی کریمی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کا جس قدر تفصیلی تذکرہ قرآن پاک میں موجود ہے، انجیل میں بھی نہیں۔ پھر اسلام اور عیسائیت ایک ہی ندی کے دو کنارے ہیں، ان میں بظاہر کوئی خاص فرق بھی نہیں۔

اصل میں سیاہ و سفید لبادوں میں ملبوس پادری اور ڈھکے ہوئے سروں والی گوری چٹی ننوں کی تقدیس نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں اپنا کنارہ چھوڑ کر دوسرے کنارے کی طرف زقند لگانے پر تیار ہو گیا۔ مجھے ان راہبوں کے حسن لباس اور حسن سلوک نے گھائل کر دیا تھا اور میں صبح و شام ایک ہی بات سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ یہ کتنے بڑے لوگ ہیں جو اپنا وچن نبھانے کو شادی نہیں کرتے اور ساری زندگی ازدواجی ملاپ کا لطف اٹھائے بغیر گزار دیتے ہیں۔

میرے ساتھ اردو سیکشن میں پادری سانتاریلی بھی کام کرتے تھے۔ وہ ویٹکن کی طرف سے اردو براڈکاسٹ پر مامور تھے۔ بھاری بھر کم وجود، گورا رنگ، صحت مندی کے شہابی خون نے ان کے سارے بدن پر کیسر سا مل رکھا تھا۔ آستینیں چڑھا کر کام کرتے تو سونے جیسے بازو ڈنک مارتے۔ بوٹ اتار کر سامنے کی کرسی پر پاؤں پھیلاتے تو خون کے دباؤ سے پشت پا شنگرفی ہو جاتی۔ سگریٹ پیتے تو صفائی کے ساتھ، سگار سلگاتے تو سلیقے اور سلوک کے ساتھ۔ سارا سگار سلگ کر خاکستر ہو جاتا مگر راکھ زمین پر نہ گرتی۔

پنجابی بہت اچھی بولتے تھے مگر اردو پر دسترس ذرا کم تھی۔ گرامر کے اصول خوب جانتے تھے مگر ادائیگی کے وقت رکتے تھے۔ ہفتے میں ایک مرتبہ پوری اردو ٹرانسمیشن ان کی ذمہ داری تھی۔ نبھا تو لیتے مگر سٹوڈیو کی سرخ بتی آ جانے پر کافی نروس ہو جاتے اور پھر آخر وقت تک ویسے ہی رہتے۔

میرا ان کا گہرا یارانہ تھا۔ تھے بھی شریک کار، ہمارا کمرہ بھی سانجھا تھا۔ کام بھی ایک سا تھا اور زیادہ وقت بھی ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا تھا۔ کہتے تھے جب میں پہلی مرتبہ ملتان مشن کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملتان پہنچا تو سٹیشن پر مجھے لینے کے لیے کوئی بھی موجود نہ تھا۔ مشن والوں کو میرا تار نہیں مل سکا تھا اور میں پلیٹ فارم پر کچھ بوکھلایا سا کھڑا تھا۔ اتنے میں کسی نے زور سے میرا نام لے کر آواز لگائی سانتریلی...... سانتریلی...... تو میں نے تقریباً اتنی ہی اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''میں یہاں ہوں، اس بنچ کے پاس!'' لیکن پانچ، سات، دس منٹ گزرنے پر کوئی بھی نہ آیا تو گھبرا سا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی نے اونچی آواز میں مجھے پکارا ''سانتریلی...... سانتریلی......'' تو میں نے پھر ویسے ہی ایڑیاں اوپر اٹھا کر جواب دیا۔ ''میں یہاں ہوں...... میں یہاں ہوں...... میں سانتریلی بول رہا ہوں...... آپ کہاں ہیں؟'' لیکن بجائے اس کے کہ کوئی میری طرف آتا۔ ہاتھ ہلا کر مجھے بلاتا یا میری طرف رجوع کرتا۔ اس نے پھر میرا نام لے کر زور سے پکارا سانتریلی...... سانتریلی......

پادری سانتریلی نے کہا ''اب نیا ملک، نئے لوگ۔ ایک عجیب طرح کا ریلوے سٹیشن۔ مقامی زبان سے ناآشنائی لیکن مجھے پکارنے والا میرا صحیح نام لے کر پکار رہا ہے اور اونچی آواز میں بلکہ بہت ہی اونچی آواز میں مجھے مخاطب کر رہا ہے۔ بلا تو رہا ہے مگر نظر نہیں آتا، دکھائی نہیں دیتا۔'' کہنے لگے، میں نے اس غیب کی آواز کو روحانیت کا ایک اچھا شگون سمجھا اور خوش خوش ملتان ریلوے سٹیشن سے باہر نکل آیا...... چند دن بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرے نام ''سانتریلی'' کی غیب سے آنے والی آواز دراصل پلیٹ فارم کی ایک ریڑھی سے آ رہی تھی جہاں ایک تنومند ریڑھی فروش اونچی آواز میں صدا لگا رہا تھا ''سنترے لوؤ...... سنترے لوؤ'' اور دور سے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہو ''سانتریلی...... سانتریلی!!''

جن دنوں سانتا ماریا مجودے کے گرجے کے اندر سے بار بار گزرنے پر میری روحانی طلب میں اضافہ ہو گیا اور میں اہل کتاب اور ان کے راہبوں، گوشہ نشین مرشدوں، تارک الدنیا پادریوں کے گہرے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ کیا لوگ تھے اور کس سلیقے اور سلوک کے ساتھ روحانیت کے سمندر میں تیرتے پھرتے تھے اور لہروں سے جھگڑتے نہیں تھے۔

ایک روز پادری سانتریلی نے کہا ''اشفاق! کام کر کے تھک گئے اور مائیک پر بول بول کر بیزار ہو گئے۔ اب اس بھگل زندگی میں کچھ سیر و تفریح بھی ہونی چاہیے۔''

میں نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے کہا ''کل پکنک پر نہ چلیں؟ یہاں سے اٹھائیس کلومیٹر دور ایک اٹھتا ہوا سا میدان ہے۔ وہاں زیتون کے درختوں کے لمبے سلسلے میں ایک چشمہ اور چھوٹا سا سبزہ زار ہے۔ بڑی پاکیزہ فضا اور رومانی ماحول ہے۔ بہت ہی کم لوگ اس مقام سے واقف ہیں اور جو واقف ہیں وہ ادھر آتے نہیں ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو کل وہاں چلیں۔''

میں نے کہا ''اور ریڈیو ٹرانسمیشن کا کیا بنے گا؟''

بولے ''چار بجے تمہاری ٹرانسمیشن ختم ہو جائے گی۔ گرمیوں کے دن میں سورج سات بجے غروب ہوتا ہے۔ تین گھنٹے میں ہم قطب شمالی سے واپس آ سکتے ہیں۔ تم ریڈیو سے سیدھے کلوسٹیم کے پاس وئیا آپیا والی سائڈ کے بس سٹاپ پر پہنچ جانا۔ میں تمہارا انتظر ہوں گا۔ ہنستے کھیلتے چل پڑیں گے اور پکنک منا کر چلے آئیں گے۔''

میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو انہوں نے کہا ''بس تمہارے ذمے صرف پہنچنا ہے۔ کھانے پینے کا سامان میں لاؤں گا جس میں تمہارے پسندیدہ مشروب کافی ایسپریسو کی پوری سپلائی ہو گی۔ گھاس پر بچھانے کی ایک پھولدار چادر بھی میرے پاس ہے۔ آج تک کبھی استعمال ہی نہیں ہوئی، وہ بھی لاؤں گا۔ بڑا مزا رہے گا۔''

گرمیوں میں دوپہر کے وقت روم کی سڑکیں سنسان ہوتی ہیں۔ لوگ قیلولہ کرتے ہیں اور سڑکوں پر ٹریفک کا رش نہیں ہوتا۔ اس عرصے میں کمیٹی کے کارندے، فائر بریگیڈ کے بڑے بڑے سپوز پائپ لگا کر ساری سڑکیں دھوتے ہیں اور سارا ماحول شبنمیں سا ہو جاتا ہے۔ اصل میں ''ٹھنڈی سڑک'' روم میں ہوتی ہے یہاں نہیں۔ یہ سلسلہ شام کے چار بجے تک رہتا ہے اور اس کے بعد ٹریفک کی یورش دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔

ریڈیو ٹرانسمیشن ختم ہوتے ہی میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا سٹوڈیو سے نیچے اترا اور سکوٹر فل سپیڈ پر دوڑاتا، جھلاتا، موڑ کاٹتا بس سٹاپ پر پہنچ گیا۔ پادری سانتریلی اپنے نیلے جرمن سکوٹر پر میرا انتظار کر رہے تھے اور ان کے کیریئر پر ایک بڑی سی ٹوکری بندھی تھی۔ انہوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا ''کمال کر دیا، بڑی جلدی پہنچ گئے!''

میں نے کہا ''سڑکیں ویران تھیں، ٹینکی پٹرول سے بھری تھی۔ سکوٹر کل ہی سروس ہو کر آیا تھا۔ میں نے کلی دبا دی اور اپنے اندازے سے بھی پہلے یہاں پہنچ گیا۔''

انہوں نے مسکرا کر ٹوکری کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اس میں ساری چیزیں تقریباً میری مرضی اور میری پسند کی ہیں اور جو سینڈوچز پادری صاحب نے خود تیار کیے ہیں، ان میں بھی ایک چھتا کاویئار کا دیا ہے، گو چھتا بہت برلا ہے اور کاویئار بھی دوسرے درجے کی ہے، یعنی ایرانی نہیں۔

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا ''اب چلیں پادری جی، پھر بڑی دیر ہو جائے گی۔ اٹھائیس کلومیٹر کافی ہوتے ہیں۔''

انہوں نے مسکرا کر کہا ''بس ابھی چلتے ہیں، دس پندرہ منٹ کے اندر......'' پھر وہ ذرا سا آگے ہو کر بسوں کو آتے جاتے دیکھنے لگے اور وقت گزرنے کے احساس سے ذرا سے بے چین بھی ہو گئے۔

میں بس سٹاپ شیلٹر سے ڈھو لگا کر سگریٹ پینے لگا۔

جب چھتیس نمبر کی بس چھوں چھوں کر کے اپنے دروازے کھولتی، بس سٹاپ پر آ کر رکی تو پادری جی بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھے اور سواریاں اترنے والے دروازے کے پاس باادب کھڑے ہو گئے۔ اندر سے پرس جھلاتی اور پورے دہانے سے مسکراتی ان کی کوجینا برآمد ہوئی۔

پادری سانتریلی کی کوجینا کو میں نے پہلے بھی تین چار مرتبہ دیکھا تھا لیکن اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا چہرہ ساہیوال کی بکری اور کاٹھیاواڑی گھوڑی کے چہروں کا امتزاج تھا اور اس کے بال ہر وقت جڑے جڑے سے رہتے تھے۔ بات تو ٹھیک ٹھاک کرتی تھی مگر ہر فقرے کے آخر میں ایک ایسا جھلار تھا جس سے انداز ہوتا تھا کہ دماغی توازن ہے تو ٹھیک مگر کبھی کبھی ٹھونگا مار جاتا ہے۔ ہنستی بہت تھی اور یوں لگتا تھا کہ اگر اس قدر ہنستی ہے تو پھنستی بھی ضرور ہوگی!

پادری صاحب کی کزن مجھے کچھ زیادہ پسند نہ آئی لیکن میں نے اپنے چہرے پر کسی قسم کے اظہار کے آثار پیدا ہونے نہیں دیے۔ بس پادری صاحب اور ان کی کزن کے درمیان مسکراتا ہی رہا...... لیکن ایک مرتبہ جب وہ بھر گرمیوں میں پادری جی سے ملنے ہمارے دفتر آئی تو میں اس کے صوفیہ لورین والے بدن کی ساخت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اب تک تو میں اسے سمور کی پٹی والے لمبے کوٹ میں ہی دیکھتا رہا تھا مگر اب جو وہ کینچلی اتار کر آئی تو میں نے اس کی ساری صوری خامیوں کے باوجود صدقِ دل سے اسے معاف کر دیا اور کرسی کھینچ کر قریب سے اس سے باتیں کرنے لگا۔

اب وہی گرمیوں والی کوجینا ہلکا سا ہاتھ ہلاتی بس سے برآمد ہوئی اور میرے ساتھ مصافحہ کر کے اس روز کی گرمی کا ذکر کرنے لگی جو واقعی معمول سے زیادہ تھی۔ پادری جی نے قریب آ کر کہا ''میں نے سوچا اوریانا کو بھی پکنک پر لے چلیں۔ اس لیے میں نے اسے بھی فون کر دیا۔ سارا دن گھر پڑی رہتی ہے۔ پہلے پینٹنگ کیا کرتی تھی، اب اس نے وہ بھی

چھوڑ دی ہے۔ کچھ دن ایک سکول میں ملازمت کی تھی لیکن بچے پڑھانا اس کو پسند نہیں آیا۔ اس لیے اب گھر پڑی رہتی ہے اور بور ہوا کرتی ہے۔''

میں نے کہا ''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ ہمیں بھی کمپنی ہو جائے گی اور دسترخوان بچھانے اور اس پر قرینے سے چیزیں لگانے اور آخر میں پس خوردہ سامان کو سگھڑاپے سے سمیٹنے کے لیے ایک خاتون بھی میسر آ جائے گی۔ یوں تو ساری دنیا ہی عورت کے دم قدم سے آباد ہے لیکن پکنک تو اسکے بغیر سج ہی نہیں سکتی۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو اپنی کوجینا کو بھی مدعو کر لیا۔''

پادری صاحب کی کزن اپنے پرس کو جھلاتی رہی اور میری باتوں پر شکریہ شکریہ کی پچر لگاتی اپنے بڑے سے چہرے کو اور بڑا کرتی رہی۔ پادری جی نے کہا ''اب چلنا چاہیے، نہیں تو اور دیر ہو جائے گی۔''

میں نے پائلٹ جیسا انگوٹھا اٹھا کر کہا ''حاضر۔ تیار'' اور ٹانگ گھما کر اپنے سکوٹر پر بیٹھ گیا۔ پادری جی نے کہا ''اوریانا تمہارے پیچھے بیٹھے گی۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے جی، مجھے معلوم ہے۔''

کوئی تارک الدنیا، مرتاض پادری کسی بھی صورت میں کسی اکیلی عورت کے ساتھ اکیلا کوئی رابطہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کو درمیان میں تلوار رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ طعن اغیار کا نشانہ بھی بن جاتا ہے اور اس کی جواب طلبی بھی ہو جاتی ہے۔

پادری جی کی کوجینا میرے ساتھ، میرے سکوٹر پر میرے پیچھے بیٹھی تھی اور ہم طرارے بھرتے چلے جا رہے تھے۔ پادری جی اپنا سکوٹر ہم سے دور دور رکھ کر چلتے تھے حالانکہ اس خوف کی اب چنداں ضرورت نہ تھی۔ عورت تو میرے ساتھ تھی اور پادری صاحب کا اس سے کوئی علاقہ نہ تھا لیکن وہ پھر بھی الگ الگ سے جا رہے تھے۔

اونچی زمین اور زیتون کے لامتناہی درختوں کی جدولوں میں ہمیں ایسے مقام کی تلاش تھی جو بالکل الگ تھلگ ہو اور دور سڑک سے گزرتی ہوئی کوئی سواری یا سوار نظر نہ آئے۔ ہم دور سے آنے والے کو دیکھ سکیں لیکن کوئی ہمیں قریب سے آ کر بھی نہ دیکھ سکے۔ جلد ہی ایسی جگہ کا انتخاب ہو گیا اور ہم نے سکوٹر سے سامان اتارنا شروع کر دیا۔

جب ہم تینوں نے اپنے اپنے سینڈوچ کو پہلی دندی کاٹی تو پادری جی نے مجھ سے پنجابی میں کہا ''میں اک خاص وجہ پاروں اوریانا نوں ایتھے بلایا اے ہئی ایندھے نال اوہ نبیڑا نبیڑیے جیہڑا ایدھی ماں تے مامے نے ساڈے گل پایا ہوئیا اے۔''

مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ پادری صاحب کا اپنی کوجینا سے یا اس کی ماں اور ماموں سے کوئی جھگڑا ہے۔ انہوں نے پہلے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ اس کے نبیڑنے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

جب میں نے ان سے اس جھگڑے کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے کہا ''نیپلز کے قریب ایک گاؤں میں ہمارا ایک جدی مکان ہے۔ مکان کیا ہے ایک بڑی سی قدیم حویلی ہے جو میرے پڑدادا نے اٹھارہویں صدی کے شروع میں بنائی

تھی۔ وہ حویلی چلتے چلتے کسی طرح سے اوریانا کی ماں اور اس کے باپ کے قبضے میں آ گئی۔ ہم سب، اس حویلی کے اصل اور جائز وارث، اپنے اپنے کاموں سے ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس تاریخی مکان کو بغیر کسی کرائے یا معاوضے کے اوریانا کے باپ کی نگہداشت میں دے دیا۔ جب تک تو وہ زندہ رہا، اس حویلی کی سہ ماہی رپورٹ کاربن پیپر رکھ کر ہم سب کو بھیجتا رہا لیکن جب وہ فوت ہوا تو میری اس کوجینا کی ماں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس بلا لیا اور بلڈنگ کی نگہداشت اس کے حوالے کر دی۔ اس نے ہماری حویلی میں شکمی کرایہ دار بٹھا لیے اور اندر صحن میں نیل کی ایک بھٹی لگا لی۔ اب وہ اس سے کافی پیسہ کما رہا ہے اور ہماری جائیداد کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی ماہ بہ ماہ یافت سے ہم کو کوئی حصہ نہیں دیتا۔ اب اس جائیداد کے دوسرے وارثوں نے مقدمے کے کاغذات تیار کر لیے ہیں، صرف میں نے انہیں مقدمہ دائر کرنے سے روکا ہوا ہے۔''

''اور اس کی ماں؟ آپ کی کوجینا کی، وہ کیا کہتی ہے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''اس نے کیا کہنا ہے۔'' پادری صاحب نے کہا ''وہ اپنے بھائی کے پیچھے لگی ہوئی ہے، جو کچھ وہ کہتا ہے اسی پر عمل کرتی ہے لیکن آج میں اس سے فیصلہ کر کے چھوڑوں گا۔'' انہوں نے قدرے غصے سے کہا ''یا تو وہ ہماری حویلی سے کنارہ کش ہو جائیں گے نہیں تو ہم ان پر نالش کر دیں گے۔''

میں نے ہاتھ ہلا کر کہا ''ناں ناں پادری صاحب ایسے نہ کرنا، اس سے دلوں میں جستے پڑ جاتے ہیں اور معاملات ہمیشہ کے لیے خراب ہو جاتے ہیں۔''

ہماری گفتگو میں گرمجوشی کا ذرا تیز عنصر دیکھ کر پادری صاحب کی کوجینا نے گھبرا کر کہا ''تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو اور کس زبان میں کر رہے ہو؟''

پادری جی نے کہا ''ہم مذہب کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں اور پنجابی میں کر رہے ہیں۔ اشفاق یسوع مسیح کو خداوند پاک کا بیٹا نہیں سمجھتا اور میں اس کو سمجھا رہا ہوں۔ قائل کر رہا ہوں کہ حضرت مریم یسوع کی والدہ تھیں اور خداوند قدوس اس کے والد تھے۔''

اس نے کسی قدر حیرت سے میری جانب دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا ''تم بھی کیسے گدھے ہو جو ایک حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو!''

پھر ہم کھانے پینے اور موج میلہ کرنے لگے۔ میں نے اور اوریانا نے بہت اونچی آواز میں ایک ڈوئٹ گایا جو ان دنوں بہت ہی مقبول تھا اور جس کے توے دکانوں پر پہنچتے ہی بک جاتے تھے۔ ہمارے گانے اور شور مچانے کے دوران پادری جی بالکل خاموش رہے۔ ان کو ایسے ہلے گلے اور دھینگا مشتی میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے وہ لک چھپ کر اور کپڑے تبدیل کر کے ایسی محفلوں میں ضرور شریک ہو جاتے ہیں!

جب میں تھرموس سے گرم گرم ایسپریو کی دوسری پیالی نکال رہا تھا تو پادری جی اٹھ کر کھڑے ہو گئے انہوں نے اپنی کوجینا سے کہا ''اوریانا ذرا میرے ساتھ ادھر چلو، تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔'' اوریانا اٹھ کر کھڑی تو ہو گئی لیکن

نے میری طرف اشارہ کر کے کہا ''اس کے سامنے نہیں کر سکتے یہ ضروری بات۔''

''نہیں! بالکل نہیں۔'' انہوں نے غصے سے پیر پٹخ کر کہا ''یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے اور ہمارا خاندانی تنازعہ اس میں نہ تو کسی کو شریک کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے سامنے اظہار کیا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اوریانا نے آہستگی سے کہا اور وہ دونوں زیتون کے خط کشیدہ پیڑوں کے پیچھے چلے گئے!

گھریلو ڈرامے بھی عجیب دو رُخے ہوتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے کھیلے نہیں جاتے۔ لوگوں کو دکھائے نہیں جاتے۔ ان کی الجھنیں اور پیشیاں پردہ میں ظہور پذیر ہوتی ہیں سب کے سامنے نہیں۔ لیکن انہی گھریلو معاملات میں الجھے ہوئے لوگ جب ایک ایک کر کے اپنے دوستوں یاروں، ہمنواؤں اور ہمدردوں سے ملتے ہیں تو تمام واقعات بلا کم و کاست ان کے سامنے پیش کر کے ان سے سہارے کے متمنی ہوتے ہیں۔ لوگ عملی طور پر تو کوئی مدد نہیں کرتے البتہ ان کے پاس ''ہائے ہائے'' ''توبہ توبہ'' ''تھوتھو'' ''صریح زیادتی'' ''ظلمو ظلم'' ''لعنت لعنت'' ''شیم شیم'' کی چھوٹی چھوٹی پیڑھیاں ہوتی ہیں جنہیں وہ متعلقہ شخص کے سامنے بچھا کر اس کے بیان کو مناسب پیڑھی پر بٹھائے جاتے ہیں۔ لوگ ان سہاروں کو عملی مدد کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ عملی مدد میں تو کوئی نہ کوئی غلطی بھی ہو جاتی ہے، زبانی تھاپڑے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔

جب بہت دیر ہو گئی تو مجھے ذرا سی پریشانی لاحق ہوئی۔ میں نے پکنک کا سامان اکٹھا کر کے اپنی دانش کے مطابق پیک کیا اور پھر اسے ٹوکری میں ڈال کر اوپر پھولدار چادر کی گدی جما دی۔ ٹوکری گود میں چھوڑ کر میں ان کی تلاش میں نکلا تو مجھے کچھ زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔

پادری صاحب ایک کھال میں اپنی کوجینا کو لٹا کر اسے پرات کے آٹے کی طرح گوندھ رہے تھے اور اس پر دونوں ہاتھوں کے مکے چلا رہے تھے۔ پادری میرا یار تھا اور میں حویلی کے معاملے میں پورا پورا اس کے ساتھ تھا لیکن دیوانی معاملے میں کسی کے ساتھ فوجداری کرنا اور اس پر جسمانی تشدد کر کے اپنی راہ پر لگانا مجھے پسند نہ تھا۔ میں اوریانا کو اس بھاری [illegible] دھوتو سے بچانے کے لیے آگے بڑھا تو مجھے فوراً پلٹ کر بجلی کی سی تیزی سے اس پکنک مقام پر پہنچ جانا پڑا جہاں میں ٹوکری پیک کر کے چھوڑ آیا تھا۔ میرے اندر مہینوں کی جمع شدہ خالص رومانی گیس جسم کے ساتوں سوراخوں سے لیک ہونے لگی اور جب وہ دونوں واپس میرے پاس پہنچے تو میں ویسا ہی تو دے کا تو دہ بیٹھا تھا جیسا سانتا ماریا مجودے کے اندر گزرنے سے پہلے ہوا کرتا تھا بلکہ اس سے بھی ڈل، بے جان اور غیر ذی روح!

(3)

چھبیس برس کے ایک ناتجربہ کار نوجوان پر جب اس قسم کی افتاد پڑتی ہے تو اس کے دوہی نتیجے برآمد ہوتے ہیں یا تو وہ بے راہ رو ہو کر عمر بھر کے لیے بھٹک جاتا ہے یا پھر اس میں بے یقینی، بے اعتمادی اور بے عملی کی ایسی پنیری لگ جاتی ہے جس سے ہر مشکل موسم میں حزن وملال، خوف وہراس اور تشویش ومخاصمت کی ناقابل برداشت فصلیں تیار ہونے لگ جاتی ہیں۔ ایسے اکھڑے اور بدکے ہوئے بچھیرے سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے تھان پر کھڑے کھڑے کانپ کانپ کے جان دے دیتے ہیں۔

ایسا تو کوئی مہلک حادثہ یا جان لیوا واقعہ نہیں گزرا تھا لیکن میرا اپنے بڑوں اور پاکیزہ ہستیوں پر سے ایمان اٹھ گیا تھا۔ وطن سے دور، گھر سے دور، اپنے عزیز واقارب سے دور، ساتویں منزل پر اکیلے کمرے میں رہتے ہوئے مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ گھر والے بھی جھوٹے ہیں، باہر والے بھی مکار ہیں، پاکستان بھی دھوکا ہے، ولایت بھی فراڈ ہے۔ ساری دنیا دغاباز ہے اور ہر شخص جعلساز ہے۔ دین، مذہب، تصوف، روحانیت سب انسانی ہتھکنڈے ہیں جو اس نے اپنی فریب کاریوں کے لیے تیار کر کے رکھے ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت پڑتی ہے اور جب جب موقع آتا ہے، انسان اپنا کام دکھا جاتا ہے اور ہر کام پر جھوٹے دعوؤں کی مہر لگا جاتا ہے۔

وہ محفلیں اور وہ نشستیں جو ہم ہفتہ میں دو بار بڑے انہماک سے جمایا کرتے تھے، میری وجہ سے بے قاعدگی کا شکار ہو گئیں۔ لوچانا کو مجھ سے ایک بھرپور شکایت یہ تھی کہ میں مزاجاً ایک محفل کش آدمی تھا۔ رونق میلے میں حاضر تو ضرور ہوتا تھا لیکن اس کا حصہ نہیں بنتا تھا۔ جدھر کو سب کا رُخ ہوتا، اس سے دوسری طرف منہ کر کے بیٹھتا تھا اور اپنا آپ پورے کا پورا دوستوں کے حوالے نہیں کرتا تھا۔ ایدا اور آنا کہتی تھیں، ہم عورت ہو کر اپنا آپ پورے کا پورا یاروں کے حوالے کر دیتی ہیں، تم مرد ہو کر اس قدر حسابی کتابی ہو، کیا ہو گیا ہے؟

اب اگر میں ان کو بتاتا کہ کیا ہو گیا ہے تو وہ سب لوگ مجھی پر ہنستے۔ مجھی کو ناسمجھ، پسماندہ اور پینڈو گردانتے اور میری ذہنی اور فکری پستی پر تنقید کرتے۔ لیکن اس میں میرا ابھی کوئی قصور نہیں تھا۔ میری تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی

کہ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ امید ضرور تھی کہ میرا یہ عارضہ آہستہ آہستہ دور ہو جائے گا اور طویل صحبت کی بنا پر مجھ میں یہاں کی توانائیاں در آئیں گی اور میں موجودہ تقاضوں کے مطابق روبہ صحت ہو جاؤں گا لیکن ابھی وہ وقت دور تھا۔ کافی دور اور مجھے صبح وشام ایسے انجکشن کی ضرورت تھی جو ویدانت، روحانیت، تصوف وغیرہ کے جالوں کو ذہن سے صاف کر کے مجھے ایک نارمل انسان بنا سکے۔

اب سوچتا ہوں تو اس معمولی سے واقعے پر ڈھیر ساری ہنسی آتی ہے۔ کچھ بھی نہیں تھا اور میں نے کیسا رائی کا پربت بنا لیا تھا۔ لیکن شاید اس کی ایک وجہ تھی۔ میں اپنوں سے دور تھا اور اس قدر اکیلا تھا کہ تنہائی نے مجھے خوفزدہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ دفتر میں، یونیورسٹی میں اور ریڈیو پر تو اچھا وقت گزر جاتا لیکن اس کے بعد کی طویل مدت اور تنہائی کا وقت اور لمبی راتیں کافی مشکل سے گزرتیں۔

پادری سانتریلی کا واقعہ بالکل خوانخواہ، اپنی مرضی سے اور بلاشرکت غیرے میری جان کا عذاب بن گیا تھا۔ وہ بات جس سے مجھے لطف اندوز ہونا چاہیے تھا، مزا لینا چاہیے تھا۔ جسے ادھر ادھر سنا کر داد طلب کرنی چاہیے تھی، وہ الٹا میرے گلے کی پھانس بن گیا تھا۔ ویسے اسے بننا بھی چاہیے تھا کہ ہم ایک اور وزڈم میں پلے بڑھے تھے اور ہم نے ایک اور تناظر میں اب تک کی زندگی بسر کی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہمارے قصبے مکتسر میں گھڑ سوار پولیس کا ایک دستہ سوڈھی کرپال سنگھ کی حویلی میں آکر متمکن ہوا۔ ہم سکول کے بڑے لڑکے گھوڑوں کو دیکھنے کے لیے حویلی کے بڑے دروازے پر جمع ہو گئے۔ بارہ خوبصورت، صحت مند اور چمکدار گھوڑے اپنے اپنے تھان پر بندھے تھے اور ان کے منہ پر خوراک کے بھاری توبڑے چڑھے تھے۔ جب وہ اپنے سر جھٹک کر اور تھتھنیاں توبڑے کی دیواروں سے مار کر اپنے راتب کو اندر ہی اندر منہ میں پکڑتے تو ان کی آنکھوں میں اطمینان کی ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ جاتی۔

گھوڑا اور ہاتھی دو ایسی شاہی سواریاں ہیں کہ انسان اگر ان کو گھنٹوں دیکھتا رہے تو اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ سال کے سال جب ہمارے ماگھی کے میلے پر بڑا سرکس آتا تو ہم سکول جانے کے بجائے بڑے تنبو کے پیچھے ان چھولداریوں میں پہنچ جاتے جہاں گھوڑے بندھے ہوتے اور ان کے بالکل ساتھ، ایک پردے کی اوٹ شیروں، باگھوں اور بگھیروں کے بدبودار پنجرے ہوتے۔

ہاتھی باہر کھلے میں کھڑے سوکھی چری، کماد کے آک اور درختوں کے جھاڑ اپنے اپنے زانوؤں پر چھٹرک جھٹک کر نظر آنے والے مونہوں میں ڈال رہے ہوتے۔ ان کے اگلے پیروں میں لوہے کے بڑے بڑے کڑے موٹے موٹے سنگلوں سے ویلڈ کیے ہوتے اور یہ سنگل زمین میں گہری گڑی بلیوں اور لوہے کے کھونٹوں سے بندھے ہوتے۔ ہر شخص جو ان ہاتھیوں کا نظارہ کرنے لحہ بھر کو بھی وہاں رکتا وہ قریب کھڑے آدمی سے یہ ضرور کہتا کہ ہاتھی بھائی جو ہر لقمہ جھاڑ جھٹک کر منہ میں ڈالتے ہیں تو چیونٹی سے خوفزدہ ہیں۔ اتنے بڑے جانور کو اک ذرا سی چیونٹی آن واحد میں ڈھیر کر سکتی ہے۔ وہ سونڈ کے راستے ہاتھی کے دماغ میں پہنچ کر ایک ایسے مقام پر کاٹتی ہے جو ہاتھی کا نازک ترین مقام ہے اور جہاں ہیرامن طوطے کی

طرح اس کی جان ہوتی ہے۔ چیونٹی کی پہلی دندی کاٹنے سے ہی ہاتھی ایک چیخ مارتا ہے اور دھاڑ کر زمین پر گر جاتا ہے۔ دوسرا سانس نہیں لیتا اور اس کی لاش زہر سے پھولنے لگتی ہے۔ ہاتھی کے اتنے بڑے دماغ پر اس کے نازک ترین حصے کا صرف چیونٹی کو علم ہے اور چیونٹی کو دیکھ لیجئے، نظر ہی نہیں آتی۔ اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔

ہم سکول کے لڑکے سارا سارا دن ہاتھیوں کے قریب اس آس میں کھڑے رہتے کہ شاید ہاتھی اگلا لقمہ زانو پر مار کر جھاڑنا اور جھٹکنا بھول جائے۔ اس کے اندر چیونٹی ہو اور چیونٹی سونڈ کے اندر چلتی چلتی اس کے دماغ میں پہنچ جائے اور اس مقامِ مخصوص پر کاٹے جہاں ذرا سی دنتی کٹنے سے ہاتھی دھاڑ کر گرتا ہے...... لیکن ایسا کبھی ہوا۔ میں نے اور میرے سکول کے دوستوں نے کوئی دس سال تک، ہر میلے پر، اس واردات کا انتظار کیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ ہاتھی آتے رہے اور جاتے رہے۔ کئی مرتبہ چیونٹیوں کے بھون کے پاس بھی بندھتے رہے لیکن ہماری حسرت کسی صورت بھی پوری نہ ہوسکی۔ کوئی چیونٹی ہاتھی کے دماغ میں مقامِ مخصوص تک نہ پہنچ سکی۔ اس کی کھردری جلد میں اتر کر دانے دنکے اور ریشے کترے ضرور نکال لاتی رہیں اور اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ ضرور پالتی رہیں۔

ہاتھی عجیب الخلقت، قوی الجثہ اور عظیم الہیت ضرور تھے لیکن انہوں نے کبھی مجھے زیادہ دیر تک اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ مجھے گھوڑے زیادہ پسند تھے۔ ان کے جسموں اور ان کے دانے کی خوشبو، قطار میں بندھے ہوؤں کا ایک مجموعی ڈسپلن۔ پھر ہر ایک کا اپنا اپنا ٹھاٹھ اور اپنی اپنی شخصیت۔ ہر ایک کا اپنا انداز اور اپنا نخرہ۔ مختلف قد، مختلف لون، مختلف چہرے، خوبصورت بدن، معتبر وجود، شہزادیوں کا حسن اور ماڈل گرلز کی سی دعوت نظارہ۔ چڑھے ہوئے پٹھے، جھولتی ہوئی ایال اور پھرتی ہوئی کنوتیاں، ساغر سم، لمبی گاچی، ستا ہوا چہرہ، ہر وقت مستعد، ہر گھڑی تیار اور ہر لمحہ باملاحظہ ہوشیار۔

گھوڑے اور انسان کا تعلق بڑا پرانا ہے۔ میرا اور گھوڑے کا رشتہ بھی بڑا پرانا ہے۔ ہم نے کئی جنگیں جیتی ہیں۔ کئی معرکے سر کیے ہیں، کئی میدان مارے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھی اور ایک دوسرے کے غمخوار ہیں۔ ہم دو مختلف (SPECIES) ہیں لیکن ہماری سائیکی ایک ہے۔ تاریخ کے لمبے دور میں ہم نے جسمانی، روحانی اور اخلاقی طور پر ایک دوسرے کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ انسانوں نے گھوڑے کی خاطر سفید فام محبوباؤں اور سیاہ چشم باندیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وسیع سلطنتوں اور شاداب علاقوں کو منظور نظر گھوڑوں کی خاطر چھوڑ دیا۔ گھوڑوں نے اپنے بستے رستے جنگلوں، پہاڑوں اور ہری بھری گھاٹیوں میں اپنی دل و جان سے پیاری گابھن ماداؤں کا ساتھ چھوڑ کر شہسواروں کی سنگت اختیار کر لی تھی۔ جنگلوں میں اپنے یاروں سے یاری نبھائی تھی۔ اتہاسی پنڈت کہتے ہیں کہ سنسار میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں، سورماؤں کے مقابلے میں گھوڑے زیادہ مارے گئے۔ تیری جے ہو تیرے انوراگیوں کی جے ہو!

پنجاب میں جب کوئی علاقہ جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ بن جاتا تھا اور اس کے گرد ونواح میں جرائم تیزی سے پھیلنے لگتے تھے تو انگریز سرکار وہاں گھڑسوار پولیس کا ایسا خصوصی دستہ تعین کر دیتی تھی جو متاثرہ علاقوں میں راؤنڈ کر کے یا تو جرائم پیشہ لوگوں کو وہاں سے بھگا دیتا یا ان کو اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیتا۔ گھڑسواروں کے اس دستے کو "دُرلی جتھہ" کہہ کر پکارتے تھے اور اس کے سارے جوان میانوالی کے پٹھان یا اعوان ہوتے تھے۔ خوبصورت سیاہ داڑھیوں اور تیل لگے پٹوں

والے سپاہی۔ ہیڈ کانسٹیبل اور حوالدار۔ گھڑسواری کی وجہ سے یہ لوگ خاکی برجس پہنتے تھے۔ پنڈلیوں پر سیاہ چمڑے کے مضبوط ولایتی گارٹر، بدن پر ٹول نے موٹی اور زین سے قدرے پتلی پوری آستینوں کی خاکی قمیص، کمر پر کالی سیاہ لس لس کرتی پیٹی، پیٹی کے آنکڑے میں پھنسی ہوئی ولایتی وسل، سر پر طرے دار پگڑی اور پاؤں میں موٹے چمڑے کے سیاہ بوٹ، کندھے سے گزرتی ہوئی چمڑے کی ایک براؤن پیٹی تھری ناٹ تھری گولیوں سے بھری ہوئی۔ اسی پیٹی کے آخر میں خاکی رنگ کی ڈوری، انگریزوں کے آٹھے جیسے سلیقے کے ساتھ لپٹی ہوئی، مضبوط اور کافی لمبی۔

زین کے پیچھے سفر میں کام آنے والی ضرورت کی مختصر سی چیزوں کا پٹھو اور زین کے بائیں جانب پتھر جیسے مضبوط چمڑے کی ایک کھلی سی میان۔ اس میں نال کے بل کھڑی تھری ناٹ تھری کی رائفل، دستہ باہر باقی ساری رائفل مستور۔ کاٹھی کی دائیں طرف سوار کی پیٹھ کے پیچھے، ایک مضبوط سے ہک میں فٹ نیلگوں سپات کی ہتھکڑی!

گھوڑے کے منہ میں سیدھی راڈ کا دہانہ، ٹھوڑی پیچھے سفید دھات کی موٹی زنجیر، دہانے میں ریشم جیسے چمڑے کی ڈبل راس، چاندی جیسی رکابیں اور سوار کے فل بوٹ پر چاندی جیسی سیدھی مہمیز، کسی ستارے پھرکی کٹارے کے بغیر۔

کیل کانٹے سے لیس، سجے سجائے بارہ بھاری بھرکم تھارو بریڈ گھوڑے ڈُلکی چال کی ٹاپ دیتے جرائم نگر کا رُخ کرتے تو سارے علاقے میں اونچی آواز میں خبر پھیل جاتی "دُرلی جتھہ آ گیا! دُرلی جتھہ آ گیا۔" بھاگنے والے بھاگ جاتے، چھپنے والے چھپ جاتے۔ سفید پوش نمبردار استقبال کے لیے باہر نکل کر گاؤں کے دہانے پر کھڑے ہو جاتے۔ عورتیں دُرلی جتھہ کے جمال کا نظارہ کرنے چھتوں پر چڑھ جاتیں۔ لڑکے بالے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ بھاگنے کے لیے دو رویہ کھڑے ہو جاتے۔

درلی جتھہ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ایک ایک راؤنڈ رفل کا چلاتا اور پھر کہنے سنے، بولے چالے بغیر گاؤں کے اندر گھوم کر ان آماجگاہوں کی طرف نکل جاتا جہاں اس کے خیال میں ڈکیت، بدمعاش، رہزن اور ہتھیا چاری چھپے ہوتے لیکن ان کے آنے سے پہلے ایسی ساری آماجگاہیں سنسان اور ویران پڑی ہوتیں۔

درلی جتھہ کے لوگ جس جگہ قیام کرتے تھے وہاں کسی سے ملتے نہیں تھے۔ روسائے شہر، والیان جاگیر، صاحبان جائیداد، علاقے پرگنے کے دوسرے لوگ ان کے ساتھ بات چیت کرنے، میل جول بڑھانے اور ربط باہمی پیدا کرنے کے بڑے خواہش مند ہوتے مگر یہ ان کو سلام سلام کر کے ہاتھ ہلاتے، مسکراتے گزر جاتے، گھوڑا روک کر بات نہ کرتے۔ تھانے کی نفری اور درلی جتھہ کے جوانوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دونوں ایک ہی محکمے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ہی ایس پی کے ماتحت تھے۔ ایک ہی جگہ سے ان کی تنخواہیں آتی تھیں۔ ایک سی ڈیوٹی تھی مگر درلی جتھہ کا حوالدار نہ تو تھانے جاتا تھا اور نہ کبھی تھانیدار سے ملتا تھا۔ بس ایک پہلی تاریخ کی مجبوری تھی کہ ان کی تنخواہ کی تھیلی خزانے کا فوطے دار سر بمہر کر کے تھانے بھجواتا تھا اور حوالدار صاحب کو وہ تھیلی اسی تھانے سے آ کر لینا پڑتی تھی جس علاقے میں ان کا جتھہ قیام پذیر ہوتا تھا۔ چونکہ درلی جتھہ کا واحد مقصد علاقے میں امن قائم کرنا ہوتا تھا۔ ایف آئی آر کاٹنا اور ضمنیاں بھرنا نہیں ہوتا تھا، اس لیے ان پر ہر قسم کی رشوت کے دروازے آپ سے آپ بند تھے۔ اس

لیے جتھے کے سارے جوان شام کو گھڑے بینجو پر میانوالی موسیقی کی دھنیں بجایا کرتے تھے جو پشتو، سرائیکی اور پنجابی کے امتزاجی حسن سے مالا مال ہوتی تھیں۔

جس درلی جتھے نے میری روح اور میرے دل کے سویدا پر اپنا بھرپور وار کیا، اس کا حوالدار سیاہ پٹوں اور چھوٹی سی کالی داڑھی والا ایک دراز قد نوجوان سمند خان نیازی تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے سات آٹھ سال بڑا ہوگا۔ تقریباً میرے جتنا ہی پڑھا ہوگا اور کچھ میرے جیسے حالات و واقعات سے گزرا ہوگا لیکن ایک نہایت ہی ذمہ دار پوسٹ پر ہونے اور بارہ منہ زور جوانوں کو کمانڈ کرنے کی وجہ سے اس میں مقدونیہ کے سکندر جیسا حسن پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جابر نہیں تھا مگر تھوڑی ضرورت سے زیادہ اوپر اٹھا کر چلتا تھا۔ متکبر نہیں تھا لیکن کم آمیز اور کم گو تھا۔ نامرد نہیں تھا لیکن عورتوں کی طرف گردن گھما کر نہیں دیکھتا تھا۔ مجھے تو اس نے بالکل ہی مار دیا!

مجھے کیا ہمارے شہر کے سارے بزرگوں پر سمند خان نے ایسا وار کیا کہ کوئی بھی جانبر نہ ہو سکا۔ بڑے بڑے کلغیوں والے سوڈھی سردار تھے۔ روپ وان مان گھرانہ تھا۔ پھر لمبی چوڑی جاگیروں اور پرگنوں والے بیدی سردار تھے۔ اس علاقے کے جدی پشتی مالک لیکن سب سمند خان نیازی سے ہاتھ ملانے، سلام کرنے اور فتح بلانے میں پہل کرتے تھے۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے ہاتھ ملا کر اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔ غور سے بات سنتا لیکن جواب دینے میں ہمیشہ کسر نفسی سے کام لیتا۔ ''ہاں جی'' ''ناں جی'' کہہ کر بات ختم کر دیتا۔ ڈاچیوں پر چڑھتی اور بہلیوں سے نکلتی سردار زادیوں نے کبھی کسی سے ذکر تو نہیں کیا لیکن اپنی نوکرانیوں کی زبانی سمند خان اور اس کے درلی جتھے کے بہت سے قصے سن کر انہیں گھول کے پی رکھا تھا۔ میرا خیال ہے اتنی باتیں شہرزاد کے زمانے میں الف لیلہ کی بھی نہ ہوتی ہوں گی جتنے قصے ہمارے شہر مکستر میں درلی جتھے کے ہوتے تھے۔

میں آٹھویں پاس کر کے نویں جماعت میں داخل ہو گیا تھا اور میں نے اپنے طور پر ایک مرتبہ ''سرمایہ اردو'' ساری ختم کر لی تھی۔ حصہ نظم کی بہت سی چیزیں مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں اور میں اردو اور فارسی کے آخری پیریڈ چھوڑ کر کرپال سنگھ کی حویلی پر گھوڑے دیکھنے آ جاتا تھا۔ حوالدار سمند خان نیازی کے دو سپاہی اسحاق خان اور سربلند خان میرے واقف بن گئے تھے۔ یہ دونوں پنوں خیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بڑے عالی حوصلہ اور دلیر سپاہی تھے۔ تیجا سنگھ ڈاکو کے ڈیرے کی چھت پر انہی دونوں جوانوں نے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر تیجے کو اپنے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا تھا۔ ڈاکوؤں نے چھت کے نیچے سے گولیاں چلا کر ان دونوں کو زخمی بھی کیا لیکن یہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور پھونس کے گٹھے اور سوکھی جوار کے پولے آگ لگا لگا کر روشندان کے اندر پھینکتے رہے۔

سمند خان نے اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت ڈیرے کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور وہ اپنے ہر نعرے کے ساتھ گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔ گھیرے کی تنگی اور دھوئیں کی شدت سے تنگ آ کر تیجے ڈاکو نے اپنے چاروں ساتھیوں کی معیت میں ہتھیار ڈال دیے۔

جب درلی جتھے کے سوار ان پانچوں ڈاکوؤں کو الٹی ہتھکڑی لگا کر گاؤں سے باہر ان کو اپنی حویلی پر لے جا رہے تھے تو تیجے ڈاکو نے منہ اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں حوالدار سمند خان سے کہا ''اوئے پٹھاناں! کیسے ہم کو معافی مل سکتی ہے؟''

حوالدار نے گھوڑا روک کر کہا ''ماں کے جنے اور سورمے مرد کے اس وعدے پر کہ آئندہ مخلوق خدا کو تنگ نہیں کرے گا اور واہگورو اکال پرکھ کے نام پر سنتوں کی زندگی بسر کرے گا۔''

تیجا سنگھ ڈکیت نے کہا ''میں وعدہ کرتا ہوں اور یہ ایک مرد کا دوسرے مرد سے وعدہ ہے۔ ایک دھرتی سوار منکھ کا گھڑ سوار منکھ کے ساتھ۔''

مقدونیہ کے شہزادے نے پورا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ''سلطان خان تیجا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی ہتھکڑیاں کھول دو اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے کرنا چاہیے۔''

ڈاکوؤں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ حوالدار سمند خان گھوڑے سے نیچے اترا۔ ہر ایک سے بغلگیر ہو کر ان کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا ''میں بات اس لیے دہرا کر پکی نہیں کروں گا کہ یہ مردوں کا مردوں سے اور دلیروں کا دلیروں سے وعدہ ہے۔ وقت ملے تو ہمارے ڈیرے ضرور آنا۔''

درلی جتھہ چلا گیا تو پانچوں ڈاکو بڑی شان سے گاؤں میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے دھڑا دھڑ اپنے دروازے بند کر لیے اور کواڑوں کی جھریوں سے سنسان گلیوں کو دیکھنے لگے۔ ڈاکوؤں نے اپنی پگڑیاں اتار کر گلے میں ڈال لیں اور ہاتھ باندھ کر اونچے چوباروں کے سامنے سر جھکا کر بولے ''ہم توبہ کرنے اور پنت میل کے لیے آپ کے دوارے آئے ہیں۔ جو کوئی دروازہ کھول کر ہم تریہاؤں کو پانی پلائے گا واہگورو اس کا بھلا کرے گا۔''

کرپو نے گاگر اٹھا کر اپنے ایجنا جیسے کولہے پر رکھی اور بھڑا کر چھن سے دروازہ کھول کر نکل گئی۔ اس کا باپو کھلے دروازے میں کھڑا سر پیٹتا رہ گیا کہ ''ہائے میری کرپو گئی۔ میری کرپو اٹھ گئی۔ کرپو چلی گئی۔''

ڈاکوؤں نے نیم دائرے کی شکل میں زمین پر گھٹنے ٹیک دیئے اور پیاسے لبوں سے اوک لگا کر انتظار کرنے لگے۔ کرپو باری باری پانی کی دھار ہر اوک میں اتارتی گئی اور ان کے نفی میں سر ہلانے پر گاگر کا منہ اٹھا لیتی رہی۔

ڈاکوؤں نے کہا ''بی بی! واہگورو تیرا ست جگوں میں بھلا کرے۔ مان وڈیائیاں ارپن کرے۔ تیرے نام کی کلا جگے۔''

جب کرپو خالی گاگر لے کر واپس اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اس کے باپو کے دروازہ بند کرتے ہی سارے گاؤں کے باسیوں نے اپنے دروازے کھول دیئے۔

یہ جو مقدونیہ کا شہزادہ ہمارے شہر میں آیا تھا تو اس پر صرف عورتیں ہی غش نہ تھیں بلکہ بڑے بڑے بزرگ مرد بھی اس کو بڑا مان دیتے تھے اور اس کے قریب ہو کر بیٹھنے کی خواہش کرتے تھے مگر ان سب کو مقامی لوگوں سے زیادہ اپنے گھوڑے پسند تھے۔ بیٹھ کر باتیں کرنے کے بجائے دوش پسند تھی اور گھومنے پھرنے کے بجائے ورد وظیفہ پسند تھا۔ درلی جتھہ بھی عجیب تھا اور درلی جتھے کے جوان بھی عجیب تھے۔ جس طرح درلی جتھہ ایک صبح کسی لامعلوم سے برآمد ہو گیا تھا، اسی طرح ایک روز اپنا مشن پورا کر کے اسے واپس بھی چلے جانا تھا۔ کسی ناشناختہ اور ناشناس مقام کی طرف...... میرے خیال

میں درلی جتھہ ایک حقیقت نہیں تھا، مائیتھالوجی تھی!

بارہ کے بارہ گھوڑوں کے الگ الگ نام تھے۔ کسی کا دلبر، کسی کا بجلی، کسی کا جوگی، کسی کا ہیرا مگر سمند خان کے کالے سیاہ شبرنگ گھوڑے کا نام دوسروں سے مختلف تھا۔ کاغذوں میں اس کا نام ہچ فورڈ (Hitch ford) تھا اور وہ تھارو بریڈ کی اس فیملی سے تعلق رکھتا تھا جس کے آباؤاجداد آسٹریلیا کھیت کے تھے لیکن پھر نقل مکانی کر کے آئرلینڈ آ گئے تھے۔ سمند خان نے اسے کبھی بھی اس کے اصل نام سے نہیں پکارا تھا ہمیشہ ''ہے گھوڑا'' کہہ کر آواز دیتا اور ہمیشہ اسی نام پر ہچ فورڈ ہنہنا کر اسے جواب دیتا۔

دورویہ تھانوں پر بندھے منہ زور اور مستعد گھوڑے ابلق، ابرص، چینے، سرنگ، کمیت اور شرغے بادامی گھوڑے نہیں تھے، حسن کے مجسّمے تھے۔ ہر جوان اپنے اپنے گھوڑے کے کھریرے، مالش، صفائی اور سنگار کا ذمہ دار تھا لیکن اپنے والے کے ساتھ ساتھ اس کی نظر دوسرے گھوڑوں پر بھی ہوتی۔ درلی جتھے کے گھوڑے تھان پر ننگے بدن نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ ہر ایک جسم پر نیلے رنگ کا بال پوش یا خاکی کپڑے کا جھول ہوتا۔ کہتے ہیں آنکھ کتنی بھی پاک کیوں نہ ہو گھوڑے کو سب سے پہلے نظر لگتی ہے۔ اس کے بعد بچے کو، پھر دلہن کو اور اس کے بعد پہلوان کو۔ سب کو اپنا آپ ڈھانپ کر اور بچا کر رکھنا چاہیے۔

جب حوالدار سمند خان نیازی گھڑ معائنے کے لیے ہر گھوڑے کے پاس جا کر اس کے پٹھے پر گونجدار تھپکی دیتا اور پھر اس کی گردن چھو کر ہاتھ کی تھپک سے سہلاتا تو گھاس سے منہ اٹھا کر کنڈا کر کے گردن کو قوس نما بنا لیتا۔ ہر گھوڑے کو پتہ تھا کہ حوالدار صاحب اس کے سوار کے باس ہیں اور یہ سارا میلہ انہی کے دم قدم سے ہے۔

شام کو سارے گھوڑوں کی آنکھ سے اوجھل، حویلی کی ڈیوڑھی میں جب حوالدار صاحب مغرب کی نماز پڑھتے تو دعا مانگنے کے بعد چوکی سے اٹھ کر اونچی اور گونجدار میں لہرا کر کہتے:

والعدیت ضَبحاًo فاتمورِیٔت قدحاo ..... قسم ہے ان فرآٹے بھرتے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی
قسم ہے ان کی (جو سموں سے ٹاپ مار کر) چنگاریاں چھوڑتے ہیں
اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں۔
اور اس سے ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار کر دیتے ہیں۔
اور یکایک دشمن کے دل بادل میں جا گھستے ہیںo

یہاں رک کر حوالدار صاحب فرش پر زور کا پاؤں مارتے اور ہاتھوں سے لپکتی تالی بجا کر اونچی آواز میں کہتے ''ہے گھوڑا'' تو بارہ کے بارہ گھوڑے اپنے دائیں سموں سے زمین کھدیڑ کر اس زور سے ہنہناتے کہ پورے شہر کے گھر لوٹے ہوئے پرندے ایک مرتبہ پھڑ پھڑا کر پھر گھونسلوں سے نکل جاتے۔ حوالدار صاحب تالی بجا کر کہے جاتے ''ہے گھوڑا'' ''پاکباز گھوڑا'' ''معصوم گھوڑا'' ''سرشار گھوڑا'' ..... پھر وہ اچانک خاموش ہو کر کھلے چپلوں سے پاؤں نکال کر دوبارہ چوکی پر بیٹھ جاتے۔ ساری فضا خاموش ہو جاتی اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر جلال کے چٹیل سلسلے سے جمال کی وادی میں داخل ہو کر

ایک اور ہی لحن میں پکار کر کہتے:

انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے
اور بے شک وہ خود بھی اپنی اس بات کو خوب جانتا ہے۔
اور بلاشبہ وہ مال سے سخت محبت کرنے والا ہے۔
کیا نہیں جانتے اس وقت کو جب قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے
اور سینوں کے سب راز ظاہر کر دیے جائیں گے
بے شک ان کا رب اس دن ان کے حال سے خوب واقف ہوگا۔

آخری آیت پر نوجوان سمند خان نیازی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہنے لگتے۔ حالانکہ نہ وہ مال سے محبت کرتا تھا، نہ اس کے پاس مال تھا اور نہ ہی اس کے سینے میں کوئی مخفی راز تھا۔ وہ بس اپنے خدا کی بات سے اور اپنے اللہ کے خوف سے روتا تھا اور اپنی چھوٹی سی سیاہ داڑھی کو آنسوؤں سے بھگوتا تھا۔

جس طرح دنیا بھر کے ٹورسٹ بکنگھم پیلس پر گارڈز کی تبدیلی کا سماں دیکھنے آتے ہیں، اسی طرح میرے قصبے کے ڈھیر سارے لوگ مغرب کے وقت حویلی کرپال سنگھ کے دراز ے پر جمع ہو جاتے اور اس فیتہ کرم ادھیائے کا انتظار کرتے جس کی گونج بڑی سہادنی تھی۔

سمند خان نیازی دراصل گھوڑے کو انسان ہی کا ایک روپ سمجھتا تھا۔ ایک باوفا اور جاں نثار انسان کا روپ۔ ایسا انسان جو سواری نہ ہونے کے باوجود غزوات میں شریک ہوا اور یکایک دشمن کے دل بادل میں گھس گیا۔ حوالدار سمند خان کہتا تھا جس طرح ایک شہسوار گھوڑے کے بغیر شہسوار نہیں کہلا سکتا، اسی طرح ایک گھوڑا بھی سوار کے بغیر گھوڑا نہیں ہوتا۔ ایک جانور ہوتا ہے۔ جنگلی جانور، چراگاہوں کا چرندیا۔ ایک بے قابو عفریت جس کے پاس اپنی بے راہ روی کے خلاف کھچی ہوئی راس یا پٹی چھوڑ لگام نہ ہو۔ وہ بندہ کیا جو اپنی جبلت کے منہ میں کانٹے دار دہانہ دے کر گردن توڑ راس نہ کھینچ سکے اور وہ گھوڑا ہی کیا جو ''ہے گھوڑا'' کا کاشن سن کر انہی قدموں پر نہ رک جائے۔

ایک روز صبح کے وقت حوالدار صاحب اپنے ہچ فورڈ کی ببری کر کے ہتی چڑھائے اس کی مالش کر رہے تھے کہ میں سکول جاتا ہوا رک کر ان کے گھوڑے کو دیکھنے لگا۔ حوالدار صاحب نے اپنے محبوب کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے والے کی طرح پیار بھری نظروں سے دیکھا تو میں نے ان کا قرب اور خوشنودی حاصل کرنے کو انہی کی طرح تالی بجا کر ویسی ہی اونچی آواز میں کہا:

پیکاں میں یا کنوتیاں ہنگام دار و گیر
حلقے سے یوں نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر
چالاکیاں بھی عفیف بھی، غربت بھی جنگ بھی
بالادری براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی.....!

حوالدار صاحب نے داد دینے کے انداز میں زرہ پھینک کر "ہے گھوڑا" کہا تو پچ فورڈ والیوم کاشن کو جان کر اور مالک کو قریب پا کر ہلکے سے ہنہنایا اور گردن گھما کر اپنا بوتھا مالک کے مونڈھے پر رکھ دیا۔ حوالدار صاحب نے میری طرف دیکھ کر جواب میں کہا:

دونوں کنوتیاں ہیں کہ پیکان تیر ہیں
چاروں سم اس کے غیرت بدر منیر ہیں
آنکھوں پہ کیجئے جو نظر بے نظیر ہیں
بال ایسے جس کے پیچ میں ہریاں اسیر ہیں
سرعت میں اس سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو......!

یہ کہہ کر انہوں نے پچ فورڈ کے کلے پر بوسہ دیا اور اس کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سارے کا سارا بوسکی کا تھان ہے۔"

اب ادھر تو درلی جتھہ کا حسین وجمیل لیڈر اپنے ساتھیوں سمیت ہوا کے گھوڑے پہ اپنے گھوڑے چڑھا چاروں کھونٹ دوشی مارتا تھا اور ادھر قدرت نے اس کے لیے ایک ایسا پھندہ تیار کر دیا تھا جس سے بچ کر نکل جانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

گلالی نامی ایک باوریانی تھی جس نے اپنی پسند سے متو باورئے سے شادی کی اور ایک ہفتے بعد اسے چھوڑ دیا۔ متو لمبے قد اور مضبوط بدن کا باوریا تھا۔ بہت لم ٹنگا اور تیز رفتار جیسے افریقہ کے شکاری ہوتے ہیں۔ جب بلا پکڑنے اور خرگوش کا شکار کرنے کے لیے وہ اپنے دونوں حجازی کتے ایک ساتھ چھوڑتا اور خود بھی ان کے پیچھے بھاگتا تو تینوں تقریباً برابر کی دوڑ میں بڑھتے تھے۔

باورئیے قبیلے کے مرد کہتے ہیں کہ متو نے ہر روز ایک جنگلی بلا پکڑ کر لانے اور اپنے ہاتھ سے اس کے تکے بنا کر گلالی کو کھلانے کا وعدہ کیا تھا اور اس لیے گلالی نے شادی کی ہامی بھری تھی لیکن کماد کٹ گئے تھے اور جنگلی بلے نیائیوں میں چلے گئے تھے۔ نیائیوں میں انگل انگل پانی کھڑا تھا۔ شکاری کتے وہاں چھوٹ کرنے سے گھبراتے تھے۔ اس لیے بلے پکڑے نہیں جاتے تھے۔ متو اپنے وعدے سے مجبور اً پھر گیا تھا اور گلالی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

مگر اس قبیلے کی عورتیں کچھ اور کہانی سناتی تھیں۔ یہ کہانی انہوں نے اُڑتی اُڑتی گلالی کی ایک سہیلی مایا سے سنی تھی کہ جس طرح کینٹھے والا سردار گلالی سے ناکام ہو کر کیکر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تھا اور گلالی اس کا بوتا بھگا کر اپنی بستی میں لے آئی تھی، اسی طرح متو گلالی سے ہار گیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

گلالی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے اندھے تائے کے ساتھ اس کی جھگی میں رہتی تھی۔ دن کو شہر کے لڑکے بالوں کے ساتھ ٹھٹھا ٹھول اور مسخری مخول کر کے شام کو لوٹتے ہوئے سردار باگھ سنگھ کی کمر اور رانیں دبا کر اس سے دو روپے

لے آتی۔ دونوں کا بڑا اچھا گزارا ہو جاتا۔ تائے اور گلالی کا نہیں، گلالی اور باگھ سنگھ کا۔ وہ بڑا سردار تھا اور بڑی عمر کا تھا۔ پیٹ بڑا ہونے کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتا تھا۔ ڈیوڑھی میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اندر باہر کا نظارہ کیا کرتا۔ گلالی اس کے قدموں میں بیٹھ کر ہی اسے دب گھٹ آتی تھی۔ زیادہ دیر نہیں، بس دو منٹ ہی کافی ہوتے۔

اس کی قوم کے دوسرے مرد عورتیں تو سانولی، کالی، خاکی اور سفیدی مائل تھیں لیکن گلالی کا رنگ سرخ تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چہرہ کندھے بھی سرخ تھے۔ خونی وباؤ کی وجہ سے نہیں، جلد کی رنگت ہی ایسی تھی۔ اگر ہمارے قصبے میں کوئی انتھروپولوجی کا ماہر ہوتا تو وہ گلالی کا رشتہ ریڈ انڈین سے جوڑ کر اسے انڈونیشیا کے کسی جزیرے سے برآمد کر کے لونڈی غلاموں کی قریبی منڈی میں ضرور پہنچا دیتا۔ وہ پیدا تو باوریوں کے گھرانے میں ہوئی تھی لیکن اس کے کسی پرکھ کے جینز ریڈ انڈین قبیلے سے چلے آتے تھے۔ بال بھی ویسے ستواں، لمبے اور لینکی اور آنکھیں بھی کالی سیاہ، اتری ہوئی باولی جیسی!

گلالی کے قبیلے کی عورتیں اپنے بالوں کی تین تین سو مینڈھیاں کر کے چوٹی میں سینکڑوں کوڑیاں اور منکے گوندھا کرتی تھیں۔ بازوؤں میں ہاتھی دانت کا چوڑا، سر پر چونک، ناک میں بلاک، کانوں میں بالیاں، ماتھے پر ٹیکا اور ننگے پاؤں میں چاندی کی آرسیاں پہن کر بازار آیا کرتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں گلالی کانوں میں نیلے ٹاپس، آنکھوں میں سرمہ، ٹھوڑی پر بندیا، کھڑے کالر کی مردانہ قمیص، کبھی نیلی ٹول کی، کبھی خاکی ٹول کی، گریبان کا اوپر کا بٹن بند، نیچے کے کھلے، ذرا سا سر جھکا کر بیٹھتی تو گریبان چھٹے کی طرح کھل جاتا۔

بازار کے لوگ کھڑے ہو کر دیکھتے۔ کھڑے ہوؤں کو دیکھ کر دوسرے بھی آ جاتے۔ ایک جمگھٹا سا لگ جاتا۔ ہر ایک کو نظروں سے بھر دیتی مگر شریر کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ اس کے پری وار کی ساری عورتیں گھاگھرے پہنتی تھیں اور گھونگھٹ نکال کر چلتی تھیں۔ گلالی بال کھلے چھوڑ کر بغیر اوڑھنی کے چلتی تھی لیکن ٹانگیں ڈھانپ کے رکھتی تھی۔ پتلون نما ایک پاجامہ سا پہنتی تھی جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی جیبیں ہوتیں۔

بڑے مردوں نے اسے ڈور پر لگانے کی کوشش کی مگر وہ سب کو غچہ دے گئی۔ ایک مرتبہ جاٹوں کے لڑکے اسے اٹھا کر بھی لے گئے مگر وہ ان کے انڈکوش دبا کر اور ان کی چیخیں نکلوا کر ہنستی ہنستی لمبی مسافت پیدل طے کر کے واپس آ گئی۔ سیٹھوں کے بیٹوں نے پیسوں کا لالچ دے کر اسے جب ساتھ لپٹانا چاہا مگر وہ دھکا دے کر اگلی گلی میں نکل جاتی۔ چھوٹے تھانیدار نے اس کے خلاف پرچہ کاٹ کر حوالات میں بند کر دیا تو علاقے کے لونڈوں نے تھانے کے سامنے دھرنا دے دیا۔ انگریزی ایس پی کو تار بھجوا دیا تو چھوٹے تھانیدار نے یہ ضمنی بھر کر اسے چھوڑ دیا کہ "غلطی سے گرفتار کر لی۔ اس کا آشنا بھاگ گیا۔ جو مطلوب تھا اور جس کے پاس آدھ سیر کچی افیون تھی۔" گورا ایس پی فرتھ نیون تفتیش کو آیا تو اس نے گلالی کی کلف لگی نیلی ٹول کی قمیص کے چھٹے میں جھانک کر کہا "میرے ساتھ ضلع چلو گی، تمہیں تعلیم دلوائیں گے۔" تو گلالی نے کہا "میرا تایا بوڑھا ہے اور اندھا ہے، میرے بنا وہ مر جائے گا۔" ایس پی فرتھ نے کہا "اس کو بھی ہم ساتھ لے چلیں گے۔ لائن میں رہے گا۔ سپاہی لوگ اس کی خدمت کریں گے۔"

گلالی نے کہا "سیدھی بات یہ ہے صاحب بہادر کہ تمہیں میرے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے اندر سانپ کا

کھلا زہر ہے، میں وش کنیا ہوں۔"

صاحب بہادر نے اس کا مطلب پچھوایا تو پتہ چلا کہ اگر وش کنیا خود اپنا دیہہ اور بھگ کھول کر بلائے تو اس کا اثر نہیں کرتا، شریر پھلواری بن جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی زبردستی کرے تو وش کنیا اُسے ڈس لیتی ہے۔

شام کو جب مغرب کے وقت لوگ سمند خان کی قرأت سننے حویلی کے پھاٹک پر جمع ہوتے تھے تو ان میں ا[س] ایک نئے تماشائی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ مردوں والے کپڑے پہننے والی گلالی کا!

دوسرے ہی روز ایک عجیب حادثہ ہوا کہ سمند خان کے سورۃ العادیات شروع کرتے ہی جمال خان سوار ہا[نپتا] آیا کہ میرا گھوڑا اگاڑی توڑ کر پیش گاہ میں طوفان اٹھائے پھرتا ہے اور اندیشہ ہے کہ دوسرے گھوڑوں کو زدوکوب کرے گا اپنا نقصان بھی کرے گا۔ مجھ سے تو قابو میں نہیں آتا، اسحاق اور شبیر خان بھی اسے تو بڑا دکھا کر پکڑنے کی کوشش کر چکے لیکن وہ توجہ ہی نہیں کرتا۔ آپ ذرا اسے آ کر دیکھیں کہ کیا کریں۔

حوالدار سمند خان اپنی چوکی سے چیتے کی طرح اچھلا اور شیر کی طرح دھاڑا "بے گھوڑا" اور اندر وگن کی طرز لپکا۔ اس کے پیچھے ہڑبونگ دیکھنے کو باہر کے تماشائی بھی اندر آ گئے۔ ان میں گلالی بھی تھی۔

جمال خان کا گلدار سبزہ سواٹن وزنی اگلی دونوں ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھا کر دونوں سم زمین پر مارتا تو پاگل پن سے ہنہناتا تھا اور قریبی گھوڑوں کی گردن پر خون آلود دانتوں کے گہرے زخم لگاتا تھا۔ حوالدار سمند خان نے خوفناک آواز کی تالی بجا کر غضبناک آواز میں نعرہ مارا:

"بے گھوڑا"

"سوٗر کا بچہ"

بدلگام

بداندیش...... یہودی!

اس جھڑکی کے سنتے ہی تھان کا تڑا۔ شور پشت اور طوفان مجسم سبزہ گھوڑا انہی قدموں پر رک گیا۔ دائیں سم سے زمین کھدیڑ کر ہنہنایا اور گردن کنڈا کر کے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر اس کے کلے پر تین تھپڑ مار اور غصے سے تھرا کر کہا "اوئے بدبختا۔ بدلگاما، یاروں کے ساتھ رہ کر بے یاری کرتے ہو۔ لعنت ہو تم پر یہودی!"

ڈیل گرے گھوڑا اپنے کرتوتوں پر شرمندہ سا کھڑا تھا اور اس کے سانس تک کی آواز معدوم ہو گئی تھی۔ سمند خا[ن] نے کہا "جمال خان، سبزے کے اگاڑی کے ساتھ ساتھ آج پچھاڑی بھی ڈال دو، اس کی یہی سزا ہے۔"

گلالی نے بلڑ بار چیخم دھاڑ گھوڑے کو سر جھکائے دیکھا تو دل میں کہا "بس! سارے سنسار میں ایک یہی آ[دمی] ہے جو مجھے نتھ ڈال سکتا ہے......" اس کے بعد وہ درلی جتھہ کی حویلی پر پھر نہیں آئی۔ ادھر ادھر سے پوچھ لیتی تھی لیکن وہا[ں] جاتی نہیں تھی۔

اس رات جب حوالدار سمند خان اپنے سیاہ پٹوں میں کنگھی کر کے سونے لگا تو گھوڑے کی شورش کے

اپنے دل کی ہلچل سے گھبرا گیا۔ لیٹا، پھر اٹھ بیٹھا۔ گھڑے سے پانی پیا۔ وگن میں جا کر گھوڑوں پر نگہ ڈالی، واپس آ کر پھر لیٹ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے مردانہ نیلی قمیص میں ملبوس ایک قدیم بوی لڑکی کھڑی تھی جس کی اصل زادو بوم یہی علاقہ تھی اور وہی اصل میں اس سرزمین کی مالک تھی۔ سمند خان نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیر کر سورۃ الناس پڑھی لیکن وہ اسی طرح کھڑی مسکراتی رہی۔ پہلے تو اس نے گلالی کی موجودگی کو بڑے غیر سنجیدہ انداز میں لیا لیکن جب وہ پسر کر سرہانے بیٹھ گئی تو سمند خان نے بالوں سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ تین چار زور کے دھپے اس کی کمر میں مارے اور زچ ہو کر کہا "دفع ہو جا کافر چشم یہودی! تیری راہ اور میری راہ اور تیرا میرا کیا واسطہ۔" پھر جو اس نے لڑکی کی گردن کے پیچھے ہاتھ رکھ کر اسے دھکا دیا تو وہ گھٹنوں کے بل گری اور دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر گردن گھما کر اسے دیکھنے لگی۔ سمند خان اپنے سینے پر نیت کے سے ہاتھ باندھے اس طرح سرو قد کھڑا رہا تو گلالی زمین سے اٹھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آگے کو چلی گئی۔ پھر اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اسے اس طرح سے چلتا کر کے اور اپنا پنڈ چھڑا کے سمند خان تکیہ پر سر رکھ کر اطمینان کی نیند سو گیا۔ رات بھر وہ اپنے بیچ فورڈ پر سوار ایسے ایسے گلستانوں اور کوہستانوں کی سیر کرتا کراتا رہا جہاں فلموں والے جا کر ڈوئٹ ریکارڈ کیا کرتے تھے۔

صبح عادت کے مطابق عین فجر کے وقت اس کی آنکھ تو کھل گئی مگر وہ نماز کے لیے اٹھا نہیں، یہی سوچ کر پھر سو گیا کہ اب ظہر کے وقت نہا دھو کر قضا ہی پڑھ لوں گا۔

انسان کی فطرت اور سرشت میں بے شمار کمزوریاں اس کے خیال اور نیت کے دامن میں کنڈے کانٹے سول اور شوک کی طرح اتری ہوتی ہیں۔ کسی اجاڑ کھیت یا خودرو جھنکاڑ سے گزرتے ہوئے پوہلی بھکھڑے، پُھکنڈے گوکرو آپ سے آپ جسم اور جامے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح بے آباد فلسفے اور بے بنیاد فکر یا اندیشے پروانوں اور بھنبیریوں کی طرح دانش و دانائی کی شمع سے لپٹ جاتے ہیں۔ کانٹوں اور سوتوں سے تو بدن چھڑائے بھی جا سکتے ہیں لیکن خوف و غیبت کی جکڑ بندیوں سے ذہن آزاد نہیں کرائے جا سکتے۔ اب چونکہ سارے اعضا و جوارح پر انہی اذہان کا قبضہ ہوتا ہے، اس لیے پاگل منوا پورے کے پورے "میں" کو بھی پاگل کر دیتا ہے۔ پھر بدن منفی رخ ہی مانگتا ہے۔ شر کی طرف ہی رجوع کرتا ہے۔ خیر کو چھوڑ کر غیر ہی کو اپناتا ہے۔ کوئی اختیار نہیں رہتا!

جس روز سفید رنگ والا سمند خان اپنے شب رنگ بیچ فورڈ پر سوار ایک موقع ملاحظہ کر کے آ رہا تھا تو سرکنڈوں کے انبوہ میں ایک سیلانی حرکت ہوئی۔ سمند خان نے کرچ کے دستے پر ہاتھ رکھ کر سرکنڈوں کی طرف دیکھا۔ ایک حملہ آور بجلی کی سی تیزی سے ابھرا اور سمند خان کے گھوڑے تک ابھر آیا۔ باگ پر تو اس کا ہاتھ نہ پڑ سکا البتہ اس نے کالے گھوڑے کی رکاب کو مضبوطی سے تھام لیا۔ یہ گلالی تھی، جس کے کالر کا اوپر کا بٹن بھی آج بند نہیں تھا۔

"کیا چاہتی ہو؟" سمند خان نے کڑک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں نے کیا چاہنا ہے...... ہم لوگ چاہنے کے نہیں ہوتے حوالدار صاحب، بیٹھ رہنے کے لیے [...] کے بجا ہوتے ہیں۔"

''کہاں بیٹھ رہنے کے لیے ہوتے ہیں۔'' سمندخان کچھ گڑبڑا سا گیا تو گھوڑے نے ہلکی سی پشنک مار کر اگلا
سے راستہ کھد یڑا کہ چلو اب چلیں۔ حویلی کافی دور ہے...... تو گلالی نے کہا ''ہم انتظاری لوگ ہیں حوالدار صاحب اور انتظار
کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ باراتوں کے باہر جھوٹا کھانا سمیٹنے کو۔ سردارنیوں کی اترن لینے کو۔ جاگیردار کے فار
ہونے کو۔ جیلوں کے باہر اپنے قیدیوں سے ملاقات کرنے کو...... ہم نیچ اور ڈشٹ لوگ ہیں حوالدار جی، اس لیے ہم کو
انتظار کرنا پڑتا ہے۔''

حوالدار نے نہ تو پہلے کبھی ایسی بات سنی تھی اور نہ ہی کسی عورت کے اس قدر قریب ہو کر گفتگو کی تھی۔ وہ بوکھلا
گیا، پیچ فورڈ کسمسایا۔ اپنی مرضی سے ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ سمندخان نے راس ہلکے سے کھینچ کر اسے روکا
ٹھہرو ابھی بات ختم ہونے دو۔

لیکن بات بھی کبھی ختم ہوئی ہے۔ وہ بات جو اماں حوا اور بابا آدم نے جب شروع کی تھی، وہ ہوتی ہواتی اور چلتے
چلاتی وہاں سے یہاں تک پہنچ گئی ہے لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وہی بات تھی جو ایک گھڑسوار پہلی مرتبہ ایک زمین باسی
کر رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ بات آج سے اتنا عرصہ پہلے کہاں چھپی رہی اور کیوں چھپی رہی۔

گلالی نے کہا ''ہمارا کوئی سہایک نہیں مالک نہیں میت میلی کوئی مددگار نہیں۔ ہم بے بس اور اُپ مانت لوگ!
اور ہزاروں سال سے انتظار کر رہے ہیں۔''

حوالدار نے کہا ''میری رکاب تو چھوڑ، دفع ہو نی۔''

تو گلالی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھی اس پر رکھ لیا اور کہنے لگی ''بڑی مشکل سے اس آنکڑے کو ہاتھ آیا
ہے۔ اب نہیں چھوڑوں گی۔ چھوڑوں گی تو وچن لے کر چھوڑوں گی کہ ایک بار مجھ سے ملو گے۔ الگ میں، ایکانت میں!
بیٹھک۔ لمبی بات!''

''کہاں؟'' سمندخان کا سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ گھوڑا اور بے چین ہو گیا۔

''کھنڈر خرابے میں'' گلالی نے خوش ہو کر کہا ''تیری ڈیوڑھی کے پیچھے۔''

''کب؟'' سمندخان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''شام ڈھلے، سورج چھپنے سے ذرا پہلے۔'' گلالی نے چہرہ اور اوپر اٹھا کر کہا ''جب سوار تمہارے گھوڑوں کو
راتب دیتے ہیں۔''

''اچھا'' لیکن یہ اچھا ٹھیک سے گلالی نے سنا نہیں کہ سمندخان کا مشکی بہت گھبرا گیا تھا اور راس کھنچی ہونے کی
وجہ سے پچھلی دونوں ٹانگوں پر گھوم کر زمین پر قوسیں سی لگا رہا تھا۔ سمندخان نے اس کی گردن تھپتھپا کر اونچی آواز مگر محبت
بھرے لہجے میں ''ہے گھوڑا'' کہا مگر پیچ فورڈ نے ہنہنا کر اس کا جواب نہیں دیا۔ گھوڑے کی نظر کافی کمزور ہوتی ہے، وہ
زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتا لیکن وہ آہٹ سے اور خوشبو سے اور سب سے بڑھ کر اپنے کشف سے دور، بہت دور بلکہ بہت
ہی دور تک دیکھ لیتا ہے۔ جو بات اس کو پسند نہ آئے، اس سے بڑی جلدی گھبرا جاتا ہے اور اپنی ناخوشی کا اظہار نتھنوں

ہوا بھر کے اور پورے زور سے ''پھرڑ'' کر کے کرتا ہے لیکن اس کے بعد کوئی ہڑتال نہیں کرتا، گرفتاری نہیں دیتا، مرن برت
نہیں رکھتا، دھرنا نہیں دیتا۔ گھوڑا اغازی مرد ہوتا ہے، سیاسی ہتھکنڈے نہیں جانتا۔

حوالدار سمندخان کا شبرنگ مشکی بھی زور سے پھنکارا اور اس معاہدے کے خلاف احتجاج کر کے چپ چاپ
کھڑا ہو گیا۔ اس پھنکار میں سمندخان کی ''اچھا'' ڈوب گئی لیکن گلالی نے محبوب کے چہرے کی خوش رنگی سے پہچان لیا کہ
مان گیا ہے۔

گھوڑے کو سب سے زیادہ ہتک اس وقت محسوس ہوتی ہے اور اپنے ساتھیوں کی نظر میں سب سے بڑھ کر ذلیل
اس وقت ہوتا ہے جب اس کا سوار کوئی سفلی حرکت کرے یا کسی مقام پر گھٹنی لڑ کر اپنے فرمایہ اور شکست خوردہ ہونے کا
ثبوت دے۔ گھوڑا خود شکست کھا جائے، اس کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جس قدر خفت اس کو اپنے سوار کی ہزیمت اور پسپائی
سے ہوتی ہے۔ اس لیے پرانے وقتوں کی جنگوں میں جب بادشاہوں کے درمیان فتح اور جنگ کے معاہدے طے پاتے تو
جنگی گھوڑوں سے پرے الگ مقامات پر طے ہوتے تھے کہ شکست خوردہ فوج کے گھوڑوں کو شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے
کہ ہمارا بادشاہ یا ہمارا سپہ سالار گلے میں پٹکا ڈال کے دست بستہ دوسرے خسرو گیتی پناہ کے سامنے کیوں حاضر ہو گیا ہے!

جنگ میں دونوں طرف کے گھوڑے ایک سی طاقت، ایک سی جرأت ایک سی توانائی سے لڑتے ہیں۔ ان کے
یہاں آگہی نہ ہونے کی وجہ سے فتح و شکست کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ بس نبرد آزمائی اور حرب و پیکار کا ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس
لیے جنگ کے خاتمے پر اگر کوئی ان کے سواروں سے بے لحاظی یا بے مروتی کرے تو ان سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ اپنے
اپنے سوار کو کبھی بھی شکست آشنا نہیں سمجھتے!

کہتے ہیں جب سکندر نے پورس کو میدانِ جنگ میں شکست فاش دی تھی تو اس نے اپنے گھوڑے سے اتر کر سوار
پورس کے سامنے جا کر اور چہرہ اوپر اٹھا کر پوچھا تھا ''آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟'' یونانی جنگ باز دونوں طرفوں
کے گھوڑوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ وہ میدانِ جنگ میں ان کو پتہ نہیں چلنے دیتے کہ کون ہارا اور کون جیتا اور کون کس کے
آگے سرنگوں ہوا۔

پیچ فورڈ کو حوالدار سمندخان کا راستے میں رکنا، ایک غیر عورت سے باتیں کرنا۔ اس سے مرعوب ہونا۔ پھر دو
مرتبہ بے خیالی میں بغیر کسی ضرورت کے لگام کو جھٹک کر پٹی چھوڑنا، واپسی پر زین سے ڈھلک کر بیٹھنا جیسے شہسوار نہ ہو کوئی
بیمار ہو، گھوڑے نے گلالی کی بو کو پسند نہیں کیا تھا۔ اس لیے کھلے قدم پھینکتا ہوا جلد حویلی پہنچ گیا۔

خوش انداز اور خوش اطوار راکب کے پاس ابھی بڑا وقت تھا۔ کل شام کے آنے تک ابھی اس کے پاس پوری
رات اور پورا دن پڑا تھا۔ وہ اس وقفے میں چلنت سی تیل مالش کر کے ہلکی سی ایکسرسائز کر سکتا تھا۔ گرم پانی سے نہا سکتا تھا۔
دو مرتبہ لباس تبدیل کر سکتا تھا۔ صبح عطر گلاب استعمال کر کے شام کو عطر شمامۃ العنبر کی پھریری اپنے پٹوں میں اڑس سکتا تھا۔
خط بنوا سکتا تھا۔ نئے سرے سے ناخن تراش کر ان پر کیوڑے کا پھاہا پھیر سکتا تھا۔ پاؤں کی تھیلیوں پر ویزلین مل کر انہیں ملائم
کر سکتا تھا۔

گواس میں کوئی واضح اور بین تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اس کے ماتحت ساتھی محسوس کر رہے تھے
حوالدار آئینہ کی صورت سا ہو کر الٹ گیا ہے۔ محسوس تو خیر نہیں کر رہے تھے، انہیں اپنی نگاہوں پر اور اپنے آپ پر شک
گزرنے لگا تھا۔ گھوڑوں کے ساتھ رہ کر اور گھڑسواری کر کر کے شہسواروں میں بھی کشف کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے
پورا کشف نہیں ہوتا، کشف کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس لیے ساری عمر مشکوک سا رہتا ہے۔

سمند خان نے دوپہر کے وقت مجیب خان کے سرنگ پر زین ڈالی اور تھوڑی دیر کو باہر نکل گیا۔ شہر کی حد سے
میل بھر پرے ایک کافی پرانا کھنڈر تھا جس کے ایک حصے پر چماروں کے بھوتوں کا قبضہ تھا اور دوسرے حصے پر شودروں
بھوت براجمان تھا۔ ایک عرصے سے کسی شخص کو اس کے اندر جھانک کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ راہگیر شام کے وقت
یہاں سے کنی کترا کر نکلتے تھے۔ جو بھی گزرتا تھا، ٹولی بنائے گزرتا تھا، اکیلا دوکیلا نہیں۔

کہتے ہیں یہ اصل میں شیر شاہ سوری کی ایک سرائے تھی جو مغلوں کے عہد میں تاراج ہوگئی۔ پانچ چھ صدیوں
بارشوں اور تیز دھوپوں نے ہزار ہا قسم کے خودرو پودے اور بے شمار جڑی بوٹیاں پیدا کیں۔ یہاں سانپوں کی ان گنت
بانبیاں بنیں، سینکڑوں قسم کے سانپوں نے یہاں جنم لیے اور پھر وہ اس کھنڈر کو ویران چھوڑ کر چلے گئے۔ سکھوں کے زمانے
میں جب چوتھی مسل کا اس علاقے پر تصرف ہوا تو انہوں نے اس کھنڈر کی مرمت کرا کے اسے آباد کیا۔ شام کے وقت یہ
کے سرداروں کے لیے کلب کا کام دیتا تھا اور یہاں صبح گئے تک شراب کی محفلیں جمتی تھیں۔ مجرے کے لیے وقت کی تخصیص
نہیں تھی۔ دن پر رات برابر چلتا تھا۔ ناچنے والیوں کے جوتے بدلتے رہتے تھے لیکن گھنگھروں کی جھنکار کبھی ختم نہ ہوتی تھی۔

سمند خان نے سرنگ کو آگے بڑھا کر کھنڈر کی دراڑ میں سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے جھاڑ جھنکاڑ میں پتھر کے
چوکور ستون پڑے تھے۔ تخت پوش جتنے لمبے مگر چوڑائی میں اس سے آدھے۔ ساری چھتیں اڑ چکی تھیں مگر طاقچوں
کے نشان ابھی باقی تھے۔ بہت سی دیواریں اپنی پوری مضبوطی کے ساتھ گھیرا ڈال کے کھڑی تھیں۔ باقی میں کریک آ
تھے۔ زمین پر زہریلی ناگ پھنیاں اُگی ہوئی تھیں اور دیواروں کے شگافوں میں سرسبز پیپل کے پیڑ تھے جو کافی بڑے
گئے تھے۔

اس نے گھوڑے سے اتر کر اس کو آخری سرے سے پکڑے پکڑے اندر قدم رکھ کر دیکھا تو اسے جنگلی نیولے
ایک مختصر سا کنبہ دکھائی دیا۔ ان کے قریب ہی بڑے سے اپلے جیسا ایک کچھوا سر منہ بند کیے پڑا تھا۔ وہ یہاں کا باسی نہیں
کسی طرف سے گھومتا پھرتا غلطی سے ادھر آ گیا تھا۔ ایک کونے میں آک کے بڑے بڑے پودے تھے۔ انہی کے ساتھ
بیری کا ایک عمر رسیدہ درخت بھی کھڑا تھا۔

سمند خان نے کارخاص کے ایک سپاہی کی طرح اس مقام کا جائزہ لیا اور تیسری ڈیوڑھی کو غور سے دیکھا۔ اکر
کی ابھی ایک چوتھائی چھت باقی تھی اور اس چھت کے نیچے کا فرش روئیدگی سے بھی پاک تھا۔ وہ موقع معائنہ کر کے کھنڈر
ہیئت اور گلالی کی ذہانت سے بہت مرعوب ہوا۔ واردات جسمانی کے لیے اس سے اچھا اور کوئی مقام نہ تھا۔

ہیں جذب ہو جاتی ہیں۔ عین اسی طرح سمند خان کے ذہن میں مختلف خیالات کی لہریں آتی رہیں اور اس کو
پریشان کرتی رہیں۔ کچھ تو پھر سے آنے کے لیے واپس لوٹ جاتی تھیں اور کچھ اس کے ذہن میں وہیں جذب ہو
جاتی تھیں۔ وہ انسان کی اسی ازلی دبدھا میں پھنسا ہوا تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ مانوں یا نہ مانوں، کروں یا نہ
کروں...... لیکن کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو رہا تھا اور لہریں آ جا رہی تھیں۔ جذب ہو رہی تھیں۔ چٹانوں سے ٹکرا رہی
تھیں۔ ساحل پر پہنچے بغیر ہی واپس جا رہی تھیں۔

شام سے پہلے اس نے نہا دھو کر اپنی نسواری رنگ کا ریشمی کرتہ نکالا۔ لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی شلوار پہنی۔ ٹائی
والے سیاہ پمپوں کو پالش کر کے چمکایا۔ پٹوں میں کنگھی کی۔ چھوٹی سی سیاہ داڑھی کو عطر حنا سے چپڑا۔ ڈولتے وجود کو سہارا
دینے کے لیے ہاتھ میں جوکیوں والا چھوٹا ہنٹر پکڑا۔ ہنٹر کے گول بھاری سرے کو نیچے لٹکایا اور پتلے سرے کو ہاتھ میں پکڑ کر
اپنی مخملی گیند کو رانوں اور پنڈلیوں پر مارتا اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔

باوجود اس کے کہ سمند خان ورلی جتھے میں تھا اور اس نے کئی چور پکڑے تھے مگر آج پہلی مرتبہ اس کے اپنے اندر
ناسور کا حلول ہوا۔ وہ جو چوروں چکاروں کو گرفتار کرنے پر مامور تھا، اس وقت خود ایک صاحب حال بزرگ چور کی طرح مقام
واردات کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جب وہ ڈوگروں کی پتی میں سے گزرا، اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے رک کر
سوچا کہ مغرب کی جماعت تو اذان کے ساتھ ہی کھڑی ہو جاتی ہے، کیوں نہ تین فرض پڑھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو جاؤں
لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وضو کرنے، منہ سر پونچھنے اور جماعت کھڑی ہونے تک انتظار کرنے میں اُدھر کا وقت نہ رہ
جائے۔ کسی کے ساتھ وعدہ کر کے اسے انتظار کروانا بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔ اس پر بھی بڑی سخت وعید آئی ہے۔ کیوں نہ
پہلے وہ فرض نپٹا لوں...... باوجود اس کے کہ یہ ساری باتیں سوچتے ہوئے اس کی رفتار سست پڑی اور اس کی رفتار میں کمی آئی
لیکن جب مسجد کے محاذ میں آیا تو اس کے قریب سے ناک سیدھ سیدھا نکل گیا۔

کھنڈر سے کوئی آدھ فرلانگ کی دوری پر اسے خیال آیا کہ شاید وہ وقت سے پہلے پہنچ گیا ہے۔ اس نے اپنی
رفتار سست کردی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس نے سامنے کی ٹوٹی دیوار سے دیکھا۔ جھاڑ جھنکار
لیٹے ہوئے چوکور ستون پر گلالی کھڑی تھی اور لمبے لمبے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی موجودگی کا کاشن دے رہی تھی۔

مقدونیہ کے خوبصورت شہزادے، میانوالی کے بیٹے اور ورلی جتھہ کے حوالدار نے کہا ''یہ میرا حق ہے خدایا۔ میری
جبلت میری سرشت میری فطرت کا حق ہے۔ جب آلن پر آئی ہوئی گھوڑی پر گھوڑا لپکتا ہے۔ کبوتری کے گرد کبوتر ناچتا ہے،
اگر ہرنی کی طرف ہرن اور شیرنی کی طرف شیر جست بھرتا ہے تو انسان پر کیوں پابندی ہے؟ انسان کو کیوں منا ہی ہے۔ انسان کو
کیوں روکا ہے...... اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔'' یہ میرا نفس ہے خدایا۔ میرا وجود ہے۔ میرا سراپا ہے۔ میں اس کا
بندار ہوں۔ قرضدار ہوں۔ یہ میرا تقاضا ہے۔ میرا اصرار ہے۔ میں اس کو کیسے چھوڑ دوں۔ کیوں چھوڑ دوں۔ کس کے
جس طرح سمندر سے لہریں آ آ کر ساحلی ریت پر پھیل جاتی ہیں، کچھ واپس چلی جاتی ہیں، کچھ ریت ہارے چھوڑ دوں کہ میں اس کا ناظر اور نگہبان ہوں۔ اس کا قرار دل ہوں، اس کا باز پرس ہوں۔

گلابی کھنڈر کی بڑی دراڑ میں کھڑی تھی اور اس کے بدن پر اس کی محبوب مردانہ قمیص نہیں تھی۔ اب ریڈانڈ
قبیلوں کی تو قسم نہیں دی جا سکتی لیکن ہمارے اس علاقے میں، پنجاب کے صوبے اور وادیٔ سندھ کے دیس میں کسی نے
ایسا ریڈش براؤن بدن نہیں دیکھا تھا۔ سمند خان تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور نیزہ بازی کی اس جھپٹ میں جب
عین اس کی شست میں تھا، اس نے زور کا نعرہ مارا "ہے گھوڑا"

سور کا بچہ

نمک حرام......

بدبخت......

بے ناشکرا...... یہودی

پھر سوار نے پوری راسیں کھینچ کر اس کا سر کندھوں سے ملا دیا۔ کاٹنے دار قزقی نے اس کی باچھیں چیر دیا
جب اس کی راسیں اور کھنچیں اور زبان کٹی تو اس نے بے بس ہو کر ایک نعرہ اور مارا "ہے گھوڑا" اور ہنٹر کے موٹے کوڑے
دو طرفہ مار سے اس کا سارا بدن درد یلا ہو گیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور شہوت، رغبت، طلب، ضرورت، مدمستی اور
آشا کے رن میں فرانے بھرتے سرپٹ گھوڑے کی طرح حملہ آور ہو گیا۔

وہ اپنے قدموں سے چنگاریاں چھوڑ رہا تھا۔

ہر طرف گرد و غبار ہی گرد و غبار تھا۔

وہ گھمسان کے رن میں اور اس کے دل بادل میں گھس گیا تھا

اور اپنے وجود کے دشمنوں پر یلغار کر رہا تھا۔

تھکا ہارا، زخموں سے چور اور اپنے آپ سے شرمندہ جب مقدونیہ کا شہزادہ اور میانوالی کا بیٹا کچا سا ہو کر
پاؤں حویلی کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اس کا شبرنگ گھوڑا اپنے فتح مند مالک کی آہٹ پہچان کر زور سے ہنہنایا کہ
ثابت و سالم لوٹ آیا ہے۔ دلدل کے جانشین کو یہ فرمان بخوبی یاد تھا کہ "جو میرے بندے ہیں، ان پر تجھ کو کچھ قدرت نہ
کہ ان کو گناہ میں ڈال سکے۔"

سیاہ رات جیسے مشکی گھوڑے نے شکرانے کے طور پر اپنی تھوتھنی پوری اوپر اٹھا دی اور بدن سونت کر کھڑا ہو گیا
روم کے اندر، میرے کمرے کی کھلی کھڑکی میں ایک زور کا کڑکا ہوا اور خوفناک دھماکے کے ساتھ ایک
گونجی "ہے گھوڑا" میں بستر سے اچھل کر فرش پر گر گیا۔ میرے سامنے، میرے کمرے میں میری کرسی پر حوالدار سمند
بیٹھے تھے اور ان کے پاؤں میں کرخت چپلوں کے بجائے کڈلیدر کے سبک سے سلیپر تھے۔ میں نے خوفزدہ نظروں
ان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرائے اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگے "کیا ہو گیا بھائی، اتنی چھوٹی سی بات پر گھبرا گئے
ایسی بے معنی بات پر جس کا تمہاری ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اٹھو...... شاباش ایسے نہیں کیا کرتے۔ اتنی خود
اور ایسی خود الفتی کوئی اچھی بات نہیں۔ ابھی تو بڑا لمبا سفر پڑا ہے...... اٹھو شاباش...... بستر پر لیٹو۔"

انہوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے فرش سے اٹھایا۔ بستر پر لٹایا اور پھر مجھے کمبل اوڑھا کر اسی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں کوشش
کے باوجود ان سے کوئی بات نہ کر سکا اور انہیں اسی طرح دیکھتے دیکھتے سو گیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو میرے کمرے کا انداز ویسا نہ تھا جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ کھڑکی اور طرف
تھی۔ کرسی کا رخ میز کی طرف تھا۔ میز دائیں کونے میں تھی۔ میری وارڈ روب میرے بستر کے سرہانے تھی اور میرا تیل کا
چولہا لوہے کے سٹول پر تھا۔ خواب میں یہ ترتیب اس طرح سے نہیں تھی، کچھ اور ہی سیٹنگ تھی۔

میں نے ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کھول کر دو تین بڑے بڑے چھپاکے مار کر منہ دھویا اور اسی طرح گیلا چہرہ لے کر
کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ شہر ابھی ٹھیک طرح سے جاگا نہیں تھا۔ صرف اخبار، ڈبل روٹی، گراساں، کافی، دودھ کی سپلائی
کی چھوٹی بڑی گاڑیاں گھوم رہی تھیں۔

---

(4)

رات کے بارہ بجے مجھے پروفیسر باؤسانی نے فون کر کے کہا، غالب کا یہ شعر سنا ہے؟

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا!
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

میں نے کہا، سنا تو ہے، پر اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ کہاں سنا تھا اور کس سیاق میں سنا تھا۔ باؤسانی بولا ''یار جس دن مغرب غزل سے متعارف ہوا اور اس کا تصور کلی یورپ کے لوگوں کی فکر کا حصہ بنا تو وہ واقعہ نظریہ اضافیت کی تھیوری سے بھی مبہوت کن ثابت ہوگا۔ ذرا سوچو دو مصرعوں کے اندر اک جہان معنی کو سربمہر کر دینا اور پھر قاری کو سند باد جہازی کی ساری دانش عطا کر کے اپنے خزانوں کی تلاش کے لیے خود ہی ملٹی پل ویزا دے دینا یہ غزل ہی کی ساحری ہو سکتی ہے۔''

میں کچھ کہنے لگا تو میری بات کاٹ کر بولا ''یہ جو غزل ہے ناں یہ علی بابا کے گھرانے کی مرجینا ہے۔ جو صرف ان مکانوں پر کاٹے لگاتی ہے جہاں محرم اسرار لوگ آباد ہیں۔''

باؤسانی ان دنوں غالبؔ اور میر دردؔ کی دنیاؤں میں ڈوبا ہوا تھا اور فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ کدھر کی چوٹ کھائے اور کدھر کی بچائے۔

پھر اس نے غزل کو درمیان ہی میں چھوڑ کر کہا ''میں نے سنا ہے، ان دنوں تم تصوف پر لیکچر دے رہے ہو اور یوگا بھی سکھا رہے ہو؟''

میں نے کہا ''تم سے کس نے کہا؟''

بولا ''مجھے لوچانا نے بتایا۔ پھر گرگانوں بھی کہہ رہا تھا کہ تم نے اس سے ایسٹ اینڈ ویسٹ کے پرانے پرچے مانگے تھے۔''

میں کچھ گھبرا گیا تو باؤسانی بولا ''تم نے عوارف المعارف دیکھی ہے؟''

میں اس کتاب کا نام پہلی مرتبہ سن رہا تھا اور فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ باؤسانی کو کیا جواب دوں۔ مان جاؤں کہ

نہیں دیکھی یا کہہ دوں کہ دیکھی ہے مگر میں اس کے مندرجات سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا مشاہدہ کچھ اور ہے۔

باؤسانی کا دماغ بہت تیزی سے حرکت کرتا تھا اور وہ زیادہ رُک کر نہیں سوچتا تھا۔ پوچھنے لگا ''تم وجودی ہو کہ شہودی؟''

میں نے کہا ''یار تم بہت تیز بولتے ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پھر میرا فون بھی کئی دن سے خراب ہے۔ آواز ٹھیک شروع ہوتی ہے لیکن پھر ڈوب جاتی ہے۔''

اس نے کہا ''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم وحدت الوجودی ہو یا وحدت الشہودی؟''

میں پھر خاموش رہا تو جلدی سے بولا ''صوفیوں کے بڑے گروہ کے مقلد ہو یا حضرت مجدد الف ثانی کے پیرو ہو......'' ساتھ ہی اس نے کہا ''ہائے ہائے حضرت مجدد سے مظہر جان جاناں کا ایک شعر یاد آیا'' پھر بجلی کی سی تیزی سے ان کا شعر سنایا، ساتھ ہی پوچھنے لگا ''کیسا ہے؟ دل پہ وار کیا کہ جگر پہ؟''

میں بھلا اس بات کا کیا جواب دیتا لیکن پھر خود ہی حضرت مظہر جان جاناں کے حوالے سے مسئلہ تناسخ کی باتیں کرنے لگا۔ وہاں سے اسے روزنامہ ''ایل میساجیرو'' میں شائع ہونے والا پٹنہ کا آواگون کا قصہ یاد آ گیا۔ الف سے لے کر یے تک سارا مجھے سنایا اور پھر میری رائے طلب کی۔ میں نے کہا ''کل یونیورسٹی میں تم سے ملوں گا تو اس پر روشنی ڈالوں گا۔ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے بارے میں علامہ اقبال نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔''

حضرت علامہ کا نام سن کر اس نے کہا ''یہ ہے تو پھر میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کہا ''خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے، ایلسا کو گاڑی چلانے میں دقت ہوگی۔ اسے سوتے سے اٹھاؤ گے۔ یہ شرط آدمیت نہیں، کل تم سے تفصیلی ملاقات ہوگی، جب تک کے لیے خدا حافظ۔''

میں نے فون بند کر دیا تو اس نے بھی کر ہی دیا ہوگا۔

سارس بڑا نیک اور پاکیزہ سا پرندہ ہے۔ دھلا دھلایا۔ اجلا سا جانور۔ دنیا اور دنیا کے جھمیلوں سے پرے لمبی ٹانگیں، لمبی چونچ، چپ چاپ، خاموش بھگت سا پنچھی ہے لیکن بھگت لوگ عام طور پر جھوٹے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے مکتسر میں کئی بھگتوں کو دیکھا تھا۔ سبھی جھوٹے لوگ تھے۔ سارس بھی مجھے بہت ہی جھوٹا پرندہ لگتا ہے۔ میرے سامنے جب بھی کوئی جھوٹ مجسم ہو آتا ہے یا کوئی جھوٹ پکڑا جاتا ہے تو ہمیشہ وہ ایک پشیمان سے سارس کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میرے حساب سے جھوٹ کی لومڑی، کوے، لگڑ بگڑ یا بندر میں تجسیم ہونی چاہیے مگر ایسے نہیں ہوتا۔ ہمیشہ سارس ہی سامنے آتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر اجمل سے اس کی وجہ پوچھی تھی تو انہوں نے بتایا تھا کہ سارس خود تو شاید جھوٹا نہیں ہوتا مگر اس کے گلے میں ولایت والوں نے اتنا بڑا جھوٹ ڈال دیا کہ وہ حاملہ عورتوں کے گھروں میں نومولود بچے لے کر جاتا ہے۔ اس وجہ سے شاید آپ کے لاشعور میں یہ تصور جاگزیں ہو گیا ہے۔

ان دنوں میری حالت ایک جھوٹے سارس کی سی تھی۔ پتہ کچھ نہیں تھا اور میں لوگوں کے گھروں میں روحانی معلومات کے بچے ڈیلور کر رہا تھا۔ روحانیت کا ذکر کرنے والوں کا رخ کذب کی طرف ضرور ہوتا ہے، گو وہ سچ کہتے ہیں! دوسرے دن باؤسانی نے مجھے بائیالوجی میوزیم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر ایک سیر حاصل لیکچر

دیا۔ وحدت الوجود کا تو کچھ کچھ سرا میرے ہاتھ آ گیا لیکن وحدت الشہود کا خانہ بالکل خالی رہا۔

حوالدار صاحب سے خواب میں ملاقات ہونے پر اور ان کا آگے جھک کر میرا ہاتھ پکڑنے کے بعد مجھ میں ایک عجیب طرح کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا یا میں نے ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تو مجھے صرف سنگ مرمر کے فرش سے اٹھنے میں مدد ملی لیکن جب دو دن گزر گئے اور تیسرا دن طلوع ہوا تو مجھ پر ہاتھ میں ہاتھ دینے کا مفہوم ایک اور ہی طرز میں نمایاں ہوا۔ وہ جو چھوٹی چھوٹی خود نمائیوں اور خود ستائیوں کے شگوفے کھلنے لگے تھے، ان پر رندہ پھر گیا اور میری ذات ابھرے بدن کی ایک مضبوط اور قابل اعتماد اکائی بن گئی۔

لیکن حوالدار صاحب کے خواب میں آنے اور میرے بیعت کرنے اور مجھے فرش سے اٹھا کر بستر پر بٹھانے کا شاید یہ مقصد نہیں تھا، وہ اس سے ورے کسی اور معاملے کے لیے آئے تھے لیکن خوابوں کی چونکہ فی الواقع کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور ان کے کوئی حتمی معنی نہیں ہوتے اور یہ صرف دبی ہوئی خواہشات کے مظہر ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو سنجیدگی سے بھی نہیں لیا جا سکتا۔ یہ تو انسانی زندگی کے معنی آفریں مگر بعید از قیاس اشارے ہوتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ اس لیے سنجیدہ لوگ انہیں قابل توجہ نہیں سمجھتے۔

انہیں دنوں کراچی کا ایک رائٹر روم آیا۔ میں اس سے متعارف تو نہیں تھا، البتہ اسے بڑی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ میں نے تجریدی آرٹ، مائیکل اینجلو اور پیرس کے "پلاس پگال" پر اس کے بے حد خیال انگیز مضمون پڑھے تھے۔ اس کو انگریزی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا اور اس کا انداز تحریر بڑا خوشگوار اور مانوس قسم کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آپ کو آپ کا کوئی بہت ہی بے تکلف دوست اپنا مضمون سنا رہا ہوں۔ اس کے مضمون ڈان کے سنڈے ایڈیشن میں چھپتے تھے مگر کبھی کبھی۔

اس نے آتے ہی مجھے یونیورسٹی فون کیا تو پتہ چلا کہ میں ہوں تو سہی لیکن فون سے بہت دور ہوں، آ نہیں سکتا۔ شام کے وقت اس نے ریڈیو سٹیشن فون کیا تو میں نکل چکا تھا۔ عشاء کے وقت وہ پوچھتا پچھاتا میرے گھر پہنچ گیا۔ میرا کمرہ چھٹی منزل پر تھا اور اس عمارت میں ابھی لفٹ نہیں لگی تھی۔ ایک سو بائیس سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے میں کچھ دیر چچا فیوریتی کی کافی بار میں بیٹھ کر گپ لڑاتا تھا اور آخر میں ناشتے کا سامان لے کر اوپر چلا جاتا تھا۔

چچا فیوریتی سچا فاشسٹ، اٹلی کا عاشق اور مسولینی کا دیوانہ تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی مارگریتا بھی بار میں کام کرتی تھی مگر ان مانے جی کے ساتھ۔ دونوں کے درمیان ازدواجی محبت میں کچھ کمی تھی، اس لیے دونوں ہر وقت دبی زبان میں ایک دوسرے سے جھگڑتے سے رہتے تھے۔ ہم کو تو ہر وقت قریب رہنے کی وجہ سے اس اکھاڑے کا علم تھا لیکن محلے سے باہر کے گاہکوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ جھگڑ رہے ہیں۔ مارگریتا اطالوی عورتوں کی طرح قدرے موٹی اور عمر میں کافی چھوٹی تھی لیکن شکل کی بڑی خوبصورت تھی۔ ذرا سی کاہل، بہت زیادہ باتونی اور کافی حد تک دل پھینک تھی۔ گاہک کو جلدی بھی ہوتی تو بھی اسے باتوں میں لگا کر اپنا دل پشوری کر لیتی تھی۔

فیوریتی کی کافی بار کے ایک کونے میں چھ کرسیاں ہمارے لیے مخصوص تھیں جہاں ہر وقت اس کے یاروں اور واقف کاروں کا جمگھٹا رہتا۔ ہفتے کی شام ہم رات کے بارہ ایک بجے تک یہاں بیٹھ کر گپ لگاتے اور محلے کے لوگوں اور

ناموجود ساتھیوں کی دل بھر کے چغلیاں کرتے۔ ہم سب کی رنگ لیڈر ریتا تھی جو باقاعدہ دھوبن تو نہیں تھی مگر ہم سب لوگوں کے کپڑے دھو کر دیتی تھی اور اسی آمدنی پر اس کی گزر بسر تھی۔ وہ مارگریتا کو اور مارگریتا اس کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی لیکن چونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھیں، اس لیے اچھی نبھ رہی تھی اور وقت گزر رہا تھا۔ سینور واندی ہم سب کا بزرگ دوست تھا۔ عمر بیاسی سال سے اوپر تھی۔ وجع المفاصل کا مریض تھا۔ گرمیوں میں لمبا کوٹ پہن کر اور اونی مفلر گلے میں ڈال کر چلتا۔ منہ میں انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنا کر بڑے زور سے سیٹی بجاتا اور ساتھ سینے پر ہاتھ مار کر کہتا "جوانی...... جوانی...... جوانی" اس کے لمبے کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک نوجوان لڑکی کی نیوڈ تصویر ہوتی تھی جو اس نے کسی اخبار سے کاٹ کر کارڈ پر چپکائی ہوئی تھی۔

سینور واندی جب کبھی بس میں یا ٹرام میں سفر کرتا اور بس کنڈیکٹر اسے سینئر سٹیزن خیال کر کے ٹکٹ نہ دیتا تو وہ چلتی بس میں کنڈیکٹر کو روک کر منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی بجایا اور جیب سے تصویر نکال کر اس کی ناک کے سامنے کر کے اونچی آواز میں کہتا "جوانی، محبت، محبت جوانی...... ٹکٹ بوڑھے لوگوں کو معاف ہے عاشقوں کو نہیں...... لاکلوسیئم کی ایک ٹکٹ دے۔" کنڈیکٹر ہنس کر اسے ٹکٹ کاٹ دیتا...... سینور واندی پاؤں میں بڑے بڑے گٹھے ہونے کی وجہ سے ہمیشہ بغیر تسموں کے فلیٹ بوٹ پہنتا تھا۔ جہاں جہاں اس کے گٹھے بہت زیادہ تکلیف دیتے تھے، وہاں اس نے بلیڈ سے جوتوں کا کینوس کاٹ کر موکھے بنائے ہوتے تھے۔ نظر بے حد کمزور ہونے اور گٹھیا کی شدید تکلیف کی بنا پر پاؤں گھسیٹ کر چلتا تھا لیکن ہر راہ چلتے کو روک کر اور اس کا کندھا ہلا کر کہتا تھا۔ "بیاسی برس کا ہوں اور پانی کے ذائقے سے ناواقف ہوں۔ ہمیشہ شراب پی ہے، اچھی شراب پی ہے اور اچھے انگریزوں کی پی ہے۔"

اسی روز ہماری فل ڈریس چنڈال چوکڑی کافی بار میں جمع تھی اور جور جو تر کھان نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ "پروفیسر! پاکستان میں گندی سے گندی گالی کیا ہوتی ہے؟" تو میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا تھا "ایک منٹ ٹھہرو، مجھے گالیاں تو سب آتی ہیں لیکن مجھ سے ان کا ترجمہ ٹھیک سے نہیں ہو رہا۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جو میں نے ابھی تک اطالوی میں جانے ہی نہیں، سیکھے ہی نہیں۔"

مارگریتا کہنے لگی "تم ان کا قریبی مفہوم بیان کر دو، ہم جوڑ جاڑ کے ان کا ترجمہ کر لیں گے۔"

میں کچھ شرما گیا اور سر ہلا کر بولا "چھوڑو دفع کرو۔ یہ بھی کوئی پوچھنے بتانے والی بات ہے۔ پھر کبھی سہی۔"

جور جو نے کہا "حد ہو گئی پروفیسر! تم تو جوان نن کی طرح شرما رہے ہو۔ یہاں کوئی غیر تھوڑی ہے، سب گھر کے آدمی ہیں۔"

میں نے چہرہ اٹھا کر بے بسی سے چاچا فیوریتی کی طرف دیکھا کہ وہ ایک سنجیدہ فاشسٹ تھا اور مہذب مسولینی کا عاشق تھا لیکن اس نے بھی مجھے سہارا نہ دیا اور خوش دلی کے ساتھ بولا "بتاؤ بتاؤ یہ تو علم کی بات ہے۔ انفرمیشن کی بات ہے۔ اس سے تو کسی ملک کے کلچر کی نشاندہی ہوتی ہے۔"

میں پھر بھی ذرا کسمسایا اور بولنے میں متامل ہوا تو ریتا نے منہ کے آگے موٹھ لگا کر اونچی آواز میں کہا "پچھلے

منہ...... کیا ہوگیا ہے؟ مرے کیوں جاتے ہو؟ پوپ مارے گا؟'' پھر اس نے پوپ کو ایک گندی سی گالی دی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ''شاباش شاباش...... تُو...... تُو...... چلو چلو''

میں نے کہا ''ہت تیری ماں کی......''

مارگریتا نے کہا ''شاباش شاباش، بتاؤ بتاؤ۔''

میں نے کہا ''بتا تو دیا ہے۔ اسی طرح بہن کی گالی ہوتی ہے لیکن وہ عام طور پر اس سے شارٹ ہوتی ہے! بہن......'' سب حیران سے منہ کھول کر میری طرف دیکھنے لگے۔ سینور داندی نے کہا ''ہم گالی کو پوچھ رہے ہیں، گندی گالی کو اور تم مرد عورت کے جسمانی تعلقات کی بات کر رہے ہو۔ گالی بتاؤ گالی۔''

میں نے چیخ کر کہا ''یہی گالی ہے اور نہایت گندی گالی ہے۔ ہمارے یہاں اس پر قتل ہو جاتے ہیں، خون خرابے ہو جاتے ہیں۔''

سب طوطے سے بن کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ جملہ ایک گالی کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک جنسی فعل ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے اور ابد تک باقاعدگی سے ہوتا چلا جائے گا، اس میں گالی والی کونسی بات ہے۔

وہ اماں وڈھی سینور ابساچا جو صبح سے شام تک کونے میں بیٹھ کر کراس ورڈ معمے بھرا کرتی تھی، اخبار سے نظریں اٹھا کر بولی ''پروفیسر! ہم گالی کو پوچھ رہے ہیں، گندی اور غلیظ گالی کو اور تم اس عمل کو بتا رہے ہو۔ انسان، حیوان، جانور بلکہ ہر جاندار کی تخلیق کا ذریعہ ہے اور جس سے ہر ایک کی نسل اپنی طے شدہ رفتار کے مطابق آگے بڑھ رہی ہے۔'' سینور ابساچا نے اپنی عمر کے بیالیس سال کراس ورڈ پزل حل کرنے میں گزارے تھے جس سے اس کا علم سمندروں کی طرح وسیع اور گہرا ہو گیا تھا۔ وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی لیکن جورجو ترکھان نے اسے روک دیا۔

جب میں اپنے یاروں کے اس گروہ کی کم عقلی سے ضیق میں آ گیا تو میں نے چڑ کر کہا ''ہمارے یہاں تو بس اسی قسم کی گندی گالیاں ہوتی ہیں۔ تمہارے پاس ان سے کوئی بہتر نمونہ ہو تو پیش کرو ورنہ بکواس بند کرو۔''

فیوریتی نے اپنے کاؤنٹر پر گیلا کپڑا پھیرتے ہوئے کہا ''رینا تا تم بتاؤ۔ تم تو تھڑے پر بیٹھ کر ارد گرد کی عورتوں کو گندی گالیاں دیتی رہتی ہو۔''

رینا تا نے گھبرا کر اور شرما کر کہا ''وہ وقت اور تھا اور اس وقت تو جنگ کا سارا بوجھ اٹلی پر آ گیا تھا۔ نہ کھانے کو کچھ ملتا تھا نہ پہننے کو، گالیاں تو دینی ہی تھیں۔''

سینور داندی نے کہا ''اوئے رینا تا سچ مچ گالیاں تھوڑی دینی ہیں، صرف بتانا ہی ہے کہ پروفیسر کو علم ہو جائے، ہمارے یہاں کیسی کیسی خوفناک غلیظ گالیاں ہیں۔''

''تو تم کیوں نہیں بتا دیتے، نوجوان بڈھے!'' رینا تا نے چڑ کر کہا ''سارے میری جان کو آتے ہیں اور کبھی مجھ سے زیادہ گند بکتے رہے ہیں۔''

''تو چلو پھر دفع کرو'' مارگریتا بولی۔ ''نہیں بتانا تو نہ سہی، یہ کونسا نصابی سوال ہے کہ نہ ہوا تو فیل ہو جاؤ گے یا سکول سے نکال دیئے جاؤ گے...... بس ٹھیک ہے۔''

''بس ٹھیک نہیں ناں......'' جورجو چڑ کر بولا۔ ''پروفیسر نے اپنی بات بتا دی ہے تو وعدے کے مطابق ہم کو بھی بتانی چاہیے۔ اسی وجہ سے تو ہم دنیا بھر میں بدنام ہیں کہ اطالوی لوگ جھوٹے بہت ہیں۔''

میں نے ان کی گرمی گفتار کم کرنے کے لیے بڑے سجاؤ کے ساتھ کہا ''چلو کوئی بات نہیں، پھر کبھی سہی۔ یہ کونسی ایسی ضروری انفرمیشن ہے جو مجھے آج ہی ملنی چاہیے اور اسی وقت ملنی چاہیے۔ بس ٹھیک ہے۔''

سینور ابساچا نے اپنا اخبار سمیٹ کر رینا تا کو حکم دیا ''رینا تا! اٹھو اور پروفیسر کو ابھی اور اسی وقت ایک گندی گالی دے کر بتاؤ کہ ہمارے یہاں کس قسم کی گالیوں کو فحش ترین سمجھا جاتا ہے اور ٹرک ڈرائیوروں کو کیوں گندا سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوسرے ٹرک کو کراس کرتے ہوئے ایسی گالیاں ضرور دیتے ہیں۔''

رینا تا چونکہ وقت بے وقت سینور ابساچا سے ادھار لیتی رہتی تھی اور ہر وقت اس کی دین دار تھی، اس لیے وہ سینورا کا حکم ٹال نہ سکی اور کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے اپنی سکرٹ کے گرڈل کو ذرا سا کس کر کہا ''ہائے اللہ میں کس طرح سے، بغیر کسی وجہ کے اپنی زبان گندی کروں اور دوزخ کا سامان سمیٹوں!''

سب نے میزیں بجا کر اور آواز ملا کر اونچے سُروں میں کہا ''کوئی بات نہیں، کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی نہیں پکڑتا اور نہ ہی تمہارے کھاتے میں یہ گناہ کے طور پر لکھے جانا ہے...... چلو شاباش یہ خدمت کا کام ہے۔''

رینا تا نے کہا ''سنو پروفیسر! جب ہم لوگ بہت ہی غصے میں آ جاتے ہیں اور ہمیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا اور ہم مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں ''اوبے..........'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی کہ کوئی اندر تو نہیں آ رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی نہیں آ رہا تو اس نے کھنکار کر اور گلا صاف کر کے کہا ''برا نہ ماننا پروفیسر! میں صرف بتانے کو بتا رہی ہوں...... میرا اس سے وہ مطلب ہرگز نہیں ہے جو اس گالی میں بند ہے...... یہ صرف انفرمیشن کے طور پر کہہ رہی ہوں...... اس کی مرتکب نہیں ہوں۔''

لیکن جب اس نے دائیں ہاتھ کی ساری انگلیاں جوڑ کر ایک ٹھوکا سا بنایا اور اسے سارس کی چونچ کی طرح حملہ آوری پر تیار کیا تو ایک دم رک گئی۔ اپنی سکرٹ سے دونوں ہاتھ پونچھ کر سامنے دروازے کی طرف چلی، دروازے سے سر نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ سارا علاقہ روشن تھا اور بازار اپنے پورے جوبن پر تھا۔ اس نے کافی بار کا دروازہ اچھی طرح سے بند کیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتی واپس اپنی جگہ پہنچی اور ہاتھ کی انگلیوں کا ٹھوکا پھر سے بنا کر اونچی آواز میں بولی ''اوَوا!...... وامور تیا تسا تو۔''

سب لوگوں نے یہ سنتے ہی اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور شیم شیم کے انداز میں سر جھکا لیے۔

رینا تا نے کہا ''مجھے معاف کرنا پروفیسر میں نے ایک گندی بات کی اور سب کے سامنے کی۔''

میں ہکا بکا کرسی پر بیٹھ گیا اور یہ سوچ رہا تھا کہ چونکہ میری اطالوی ابھی کمزور ہے، اس لیے میں نے اس فقرے کا

غلط ترجمہ کیا ہے۔ دوبارہ غور کیا تو پھر وہی مطلب نکلا...... تیسری مرتبہ ہر لفظ کے لاحقے اور سابقے ذہن کے چمٹے میں پکڑ کر جھاڑے اور پھٹکارے تو پھر بھی وہی معنی وارد ہوئے۔

میں نے کہا" بھی اس کا مطلب تو میرے حساب سے یہ نکلتا ہے کہ" جا اور جا کے قتل ہو۔ مرجا؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا" بالکل ٹھیک ہے، یہی تو مطلب ہے۔ ایک جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے، زندہ و پائندہ شخص سے یہ کہنا کہ مرجا! قتل ہو جا!! اس سے بڑی گالی اور کیا ہوگی۔ اس سے غلیظ بددعا اور کیا ہوگی اور اس سے گندی گالی اور کہاں ہوگی!!"...... میں نے ان سے تو نہیں کہا البتہ دل میں یہ ضرور سوچا کہ اس سے زیادہ پیار بھرا جملہ کہ" دفع ہو، مر پرے" اور اس سے بڑھ کر تعلق افزا فقرہ کہ" اوئے مریں اک پان تو لگا، الائچی سپاری" اور اس سے بڑھ کر دعائیہ اظہار اور کیا ہوگا "نی مرجانیئے! اب اور نہ بڑھتی جا۔ لڑکیوں پر اتنا قد ہی ٹھیک ہوتا ہے۔"

میں اس" گندی" اور" غلیظ" گالی کے سیاق و سباق پر غور ہی کر رہا تھا کہ سامنے بند دروازے کے شیشے پر دستک ہوئی۔ کافی بار کے اندر ہم سب یہ گندی گالی سن کر مفلوج سے ہو کر بیٹھ رہے تھے اور کسی کو بھی دروازہ کھولنا یاد نہ رہا تھا۔ میں چونکہ اس گالی سے لطف لے رہا تھا اور چاق و چوبند تھا، اس لیے میں نے ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے کراچی کا وہی آرٹ کریٹک کھڑا تھا جس نے انگریزی میں مضمون لکھے تھے اور جس کا میں زبردست قسم کا فین ہوں۔ میں نے مصافحہ کرنے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ بے تکلف دوستوں کی طرح میرے ساتھ لپٹ گیا اور میری کمر پر محبت بھرے دھپے مارنے لگا۔ میرے لیے اس سے بڑا عزت افزائی کا اور کیا مقام ہو سکتا تھا۔ میں نے بھی بے تکلف ہونے کے شوق میں دو تین جوابی دھپے مارے لیکن بہت ہی ہلکے اور بالکل نامعلوم قسم کے۔ پھر میں نے دروازہ اچھی طرح سے کھول کر اسے اندر بلا لیا اور اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کرایا۔ کسی نے بھی اس کو پسند نہ کیا!

اصل میں وہ ذرا متکبر اور گھمنڈی سا نوجوان تھا اور انگریزی کا نولیندہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا۔ پھر اس کا لباس بھی ایسا شوخ اور بھڑکیلا تھا کہ اطالوی لوگ اس کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔

کہنے لگا" میں کل رات کا آیا ہوا ہوں اور اس وقت سے آپ کو فون کر رہا ہوں لیکن آپ دستیاب ہی نہیں ہوتے۔"

میں نے کہا" مجھے آپ کے فون کا علم ہوا تھا لیکن آپ نے کوئی نمبر نہیں چھوڑا تھا اس لیے میں آپ سے رابطہ نہ کر سکا۔"

اس نے کہا" میں صرف کل کا دن اور کل رات یہاں ہوں۔ پھر مجھے پیرس چلے جانا ہے۔ وہاں" لوتر یک سینٹر" میں میرا ایک لیکچر ہے۔ ایک ہفتہ قیام کے بعد میرا اصل ٹھکانہ لندن کا ہے۔ وہاں ایک مہینہ قیام کے بعد میری واپسی سیدھی کراچی، واپسی پر کہیں نہیں رکوں گا۔ وطن واپس جا کر آلائشوں کے جالے اتاروں گا۔"

میں ان کی بے تکلف باتیں سن کو محظوظ ہوتا رہا اور ان سے مرعوب ہوتا رہا۔ بڑے دبنگ کریٹک تھے اور کھل کے بات کرتے تھے۔ ملک کے بڑے بڑے لوگ ان کے دوست تھے اور وہ سارے سیاستدانوں کو قریب سے جانتے تھے۔ فن اور فنکار کی باتیں کرتے کرتے اچانک میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھ کر بولے" میں آپ کو صبح سے اس لیے تلاش کر رہا تھا کہ میرے ساتھ چل کر مجھے یہاں کا کوئی بروتھل دکھائیں، وہاں کی لڑکیوں سے ملائیں اور اس ماحول سے متعارف کرائیں۔"

بروتھل کا نام سن کر میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے نہ تو اس کے بارے میں کچھ سنا تھا، نہ پڑھا تھا، نہ ہی ہماری گفتگو میں کبھی اس کا ذکر آیا تھا۔ حالانکہ ہم نے فیوریتی کی کافی بار میں بیٹھ کر طرح طرح کی بکواس کی تھی اور رنگ رنگ کے مضمون باندھے تھے۔ یورپ کے قحبہ خانوں کے سلسلے میں میرا جو بھی علمی مشاہدہ تھا، وہ" یاما" ناول کے اردو ترجمے، مولانا نیاز فتح پوری کی کتاب" ترغیبات جنسی" عابد علی عابد صاحب کے پیری لوئی کے ترجمے اور بہت بچپن میں سٹریز آف کورٹس آف پیرس کے تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم سے اخذ کردہ تھا۔ اس کے سوا مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔

انہوں نے میرے جواب دینے سے پہلے کہا" ابھی چلتے ہیں اور پھر واپسی پر کسی اچھے سے اطالوی ریستوران میں کھانا کھاتے ہیں۔ آخر میں میں آپ کو ٹیکسی پر یہاں چھوڑ کر اپنے ہوٹل چلا جاؤں گا۔"

میں نے کہا" لیکن میں تو ایسی کوئی جگہ نہیں جانتا اور نہ ہی میرے خیال میں اٹلی میں ایسی کوئی جگہیں ہیں۔"

انہوں نے میرے کندھے پر زور کا ہاتھ مار کر کہا" اوہ کم آن اشفاق! کیسی باتیں کرتے ہو۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اٹلی کے قحبہ خانے تو ساری دنیا میں مشہور ہو چکے ہیں۔ اب یا تو تم بنتے ہو یا مجھے چکر دے رہے ہو۔"

جلد ہی انہوں نے مجھے تو اور تم کہہ کر پکارنا شروع کر دیا لیکن میں ان کے رعب علم کے آگے ان سے بے تکلف نہ ہو سکا۔ ان کے علم کا سارا رعب انگریزی جاننے کی وجہ سے تھا کہ وہ انگریزی میں مضمون لکھ لیتے تھے اور انگریزی میں گفتگو بھی کر لیتے تھے۔

میں نے ان کی سوالیہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوبارہ عرض کیا کہ" اگر ایسے کوئی مقامات ہیں بھی تو مجھے ان کا علم نہیں۔ میں نے کبھی ادھر توجہ نہیں دی۔ یہ میرا موضوع نہیں۔"

انہوں نے خفگی کے انداز میں کہا" اگر یہ تمہارا موضوع نہیں تو یہاں کرنے کیا آئے تھے؟ کسی اور حقدار کو آنے دیتے جو اس موضوع سے کچھ فائدہ اٹھاتا۔"

ان کی اس جھڑکی سے میں گھبرا سا گیا اور شرمندگی سے مسکرانے لگا لیکن وہ مجھے چھوڑنے والے اور معاف کرنے والے نہیں تھے۔ میرے دوستوں کی طرف اشارہ کر کے بولے" ان لوگوں سے پوچھو، یہ سارے لفنگے نظر آتے ہیں۔ ان کو ضرور معلوم ہوگا۔"

میں نے جور جور کھان سے پوچھا" کیوں جور جو! یہاں کوئی قحبہ خانے ہیں، ہمارے روم میں۔" اس نے ڈکار لینے کے انداز میں خاصی اونچی آواز میں کہا" بہت۔" اور پھر فخر سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

بڈھے واندی نے کہا" میرے ساتھ چلو، میں تمہیں دکھاتا ہوں۔ میری تو کئی لڑکیاں پکی داشتائیں رہ چکی ہیں۔ اب بھی ملتی رہتی ہیں۔"

میرے مہمان نے کانٹا میری پیالی پر مارتے ہوئے بے چینی کے ساتھ پوچھا۔" کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں؟"

میں نے کہا" جی کہہ تو رہے ہیں کہ اس شہر میں چند بروتھل ہیں لیکن ان کے صحیح مقام ان کو معلوم نہیں۔"" تو پھر

کہیں اور سے پوچھو۔ کسی اور سے دریافت کرو۔" انہوں نے بے چینی سے کہا "اشفاق صاحب! آرٹ اور لٹریچر کے طالب علم کو ایسے سارے مقامات کا علم ہونا چاہیے۔"

مجھ میں بڑے آدمیوں سے مرعوب ہونے کا بڑا ملکہ ہے اور میں ہر بڑے آدمی سے فوراً متاثر ہو کر اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہوں۔ میں پاکستان کے ان کروڑوں انسانوں میں سے ہوں جو اپنی عاجزی، فروتنی، کمتری اور بیچارگی کے زور پر بڑے بڑے متکبر، گھمنڈی، خود پرست اور خود بین فرعونوں کو جنم دیتے ہیں اور ان کے جلوسوں کے آگے ناچتے گاتے "آوے ای آوے" کے نعرے مارتے جاتے ہیں۔ ہمیں صاحبان حیثیت سے کچھ مطلوب نہیں ہوتا نہ ہی ہم ان سے کسی رعایت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف ان کے گن گانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور انہیں جتلائے بغیر ساری زندگی ان کے گن گا کر ختم ہو جاتے ہیں۔

"تو پھر؟" انہوں نے ذرا رعب سے پوچھا تو میں گھبرا گیا کہ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ میں نے کہا "آپ ذرا ٹھہریے، میں ان سے مزید کچھ پوچھ کر بتاتا ہوں۔"

میرے استفسار پر سینورا ایسا چانے بتایا کہ ہمارے یہاں فحاشی کے منظور شدہ اڈے کسی مخصوص مقام پر نہیں ہوتے، ہر علاقے میں اپنا اپنا ایک کاسینو ہوتا ہے۔

"اگر کوئی علاقہ بڑا ہو تو وہاں دو دو تین تین بھی ہوتے ہیں۔" جورجو نے کہا۔

فیوریتی نے کہا "جب میں نے یہاں آ کر یہ کافی بار کھولی ہے تو یہاں بھی ایک کاسینو ہوتا تھا لیکن پھر پادریوں نے دینکن کی قربت کی وجہ سے بند کروا دیا کہ جو طالب علم دینیات پڑھنے آتے ہیں، وہ بھی وہاں گھس جاتے ہیں۔"

رینا تا بولی "یہ کاسینو ہیں تو روم میں جگہ جگہ لیکن ہمارے قریب ترین علاقے "تراس تیورے" میں تین ہیں اور تینوں ہی بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔" وہ اپنے علاقے کے اڈوں پر ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے لوگ فٹ بال یا باسکٹ بال کی قومی ٹیموں پر فخر کیا کرتے ہیں۔

میں نے کہا "تراس تیورے میں کہاں ہیں؟"

رینا تا نے کہا "قلعہ سانتا نجلو کے ساتھ والے بڑے راستے سے داخل ہو کر جہاں گلیوں کے دوشاخے پر بلی اور خرگوش والا چھوٹا فوارہ ہے، وہاں دائیں ہاتھ کی گلی میں ہے۔"

میں نے کہا "اس گلی میں تو کاپو رہتا ہے۔"

"بس بس بس" رینا تڑپ کر بولی۔ "کاپو کے گھر سے چار گھر چھوڑ کر پانچواں گھر بروتھل ہے۔ بڑا مشہور ہے، دور دور سے لڑکیاں آتی ہیں۔"

میرے مہمان نے بھاری گرجدار آواز میں پوچھا "کیا بتا رہے ہیں۔" تو میں نے کہا "ابھی بحث کر رہے ہیں۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔"

"عجیب واہیات لوگ ہیں کہ ابھی تک ڈسکس ہی کر رہے ہیں۔" انہوں نے ناراض ہو کر کہا "ان سے کہو جلدی کسی نتیجے پر پہنچ کر تمہیں مطلع کریں۔"

میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا "لیکن اس گھر کا پتہ کیسے چلتا ہے؟" تو فیوریتی نے کہا "باہر ایک سرخ بتی لگی ہوتی ہے پروفیسر...... جیسے وکٹوریہ گاڑی کی بتی نہیں ہوتی بالکل اسی شکل و صورت کی لیکن اس میں سفید شیشے کے بجائے سرخ شیشہ لگا ہوتا ہے اور اس سے سرخ روشنی ہی برآمد ہوتی ہے۔"

اب تک میں اپنے اس ناخواندہ مہمان سے تھوڑا سا زچ ہو چکا تھا، اس لیے میں نے کافی بار کے لیٹر ہیڈ سے ایک ورق پھاڑ کر انہیں بتایا کہ "میں اس کاغذ پر آپ کو کاسینو تک پہنچنے کا نقشہ بنا دیتا ہوں، آپ کہیں سے بھی ٹیکسی پکڑ کر وہاں جا سکتے ہیں۔ پھر یہاں سے تو وہ علاقہ بہت ہی قریب ہے۔ جلدی سے پہنچ جائیں گے اور بھاڑا بھی کم ہو گا۔"

انہوں نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور ہنس کر کہا "جان من! آپ کے بغیر تو میں یہاں ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اطالوی کون بولے گا اور راستے کون پوچھے گا۔ مجھے تو ٹھیک یو کی اطالوی بھی معلوم نہیں...... آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"میں آپ کے ساتھ کاسینو جاؤں؟" میں نے چیخ کر کہا "یہ ناممکن ہے۔"

"تو پھر میں یہاں بیٹھا ہوں۔ نہ میں یہاں سے اٹھوں گا، نہ یہ بار بند ہونے دوں گا اور نہ ہی آپ کو جانے کی اجازت دوں گا...... اپنے یار، مالک دکان بذا کو بتلا دیجیے۔"

مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا انسان آیا یا نہیں، لیکن میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو ایسی پچویشن سے پالا ضرور پڑا ہو گا۔ آپ کسی گھنے جنگل میں پھنس کر گم ہو گئے ہوں گے۔ مخالف سمت سے آنے والے کسی خونخوار جلوس کی جلادی ٹکڑی میں الجھ گئے ہوں گے۔ کسی وحشی جانور سے گھر کر دوزانو ہو گئے ہوں گے۔ آپ کا سامان چلا گیا ہو گا لیکن پلیٹ فارم پر سرپٹ بھاگنے کے باوجود آپ گاڑی نہیں پکڑ سکے ہوں گے۔ آپ نیزہ بردار وحشی آدم خوروں کے نرغے میں آ کر اپنی پوری طاقت سے چیخ رہے ہوں گے لیکن آپ کی آواز برآمد ہونے کے بجائے خاموشی سے واپس جا رہی ہو گی اور آپ کے بیوی بچے بیس فٹ کے فاصلے پر بیٹھے پکنک منا رہے ہوں گے۔

میری صورتحال ان ساری صورتوں سے زیادہ کربناک تھی اور میں نے اس بک بک سے برآمد ہونے کا ایک سیدھا سا فیصلہ کر لیا تھا کہ سکوٹر پر انہیں پیچھے بٹھا کر لے جاؤں گا اور کاسینو کے دروازے پر سرخ بتی کے نیچے چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔

لیکن یوں نہ ہو سکا۔ جب ہم کاسینو کے دروازے پر پہنچے تو ایک بڈھے دربان نے دروازہ کھول کر گھبراہٹ میں کہا "جلدی جلدی جلدی...... سرکاری وقت ختم ہو رہا ہے، لاسٹ کال! لاسٹ کال!! لاسٹ کال!!!"

پتہ نہیں اس کا مطلب کیا تھا لیکن جب میرا مہمان اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ میں بھی تھا۔

یوں تو روم کے سبھی گھر پرانے ہیں۔ سولہویں سترہویں صدی کے قدیم مسکن لیکن یہ گھر ان سے بھی پرانا تھا۔ دروازے کے عین سامنے پہلی منزل کو جانے والی سیڑھیاں تھیں اور بائیں ہاتھ سنگ مرمر کا ایک کھلا اور روشن صحن تھا۔ ایک

ملازمہ ربڑ کے جوتے پہنے اس فرش کو وائپر سے دھو رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر کام روک دیا اور مسکرا کر بڑی میٹھی آواز میں اطالوی میں کہا "جی آئیاں نوں سوہنا جی آئیاں نوں...... بھلی کری آئیو بھلی کری آئیو" پھر اس نے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا "اوپرا! اوپرا! اوپرا!"...... اور ہم گھبرائے، شرمائے، چور سے بنے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میرے مہمان کا بھی کچھ میرے جیسا ہی حال تھا۔ جس بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کرکے وہ کافی بار سے چلا تھا، وہ ساری ختم ہو گئی تھی اور اب وہ ایک بھیگے ہوئے چوزے کی طرح سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ وہ جواں سال کسرتی بدن پھونک نکلے تین دن کے باسی غبارے جیسا ہو گیا تھا اور اس کا خوبصورت، خوشبودار چہرہ، درخت میں پھندہ لگا کر خودکشی کرنے والے ہیجڑے جیسا ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی شکل تو نہیں دیکھی لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ میرا سارا چہرہ پکاسو کی تصویر کی طرح مسخ ہو کر جھلسی ہوئی سری جیسا ہو گیا ہے اور ناک اپنی جگہ سے کھسک کر بائیں گال پر آ گئی ہے۔ دونوں کان ایک ہی سائیڈ پر اوپر نیچے ہو کر پہلے کے مقابلے میں زیادہ حساس ہو گئے ہیں اور آنکھیں دو دو کے جوڑوں میں تقسیم ہو کر چار بھی ہو گئی ہیں اور چوکس بھی ہو گئی ہیں۔ مجھے صرف ایک ہی خوف تھا کہ اگر میرے سفارت خانے کو پتہ چل گیا اور انہوں نے میرے اباجی کو ساری صورتحال کی اطلاع دے دی اور پاکستان کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں کدھر گیا تھا تو میری وطن واپسی ہمیشہ کے لیے مخدوش ہو جائے گی اور میں یہیں کہیں ہوٹلوں، ریستورانوں کے سامنے پرانی وائلن بجاتا ہوا بھیک مانگ مانگ کر فوت ہو جاؤں گا۔ اگر کسی نے کاسینو سے باہر نکلتے وقت مجھے دیکھ لیا اور میری رپورٹ میرے ایسٹ پاکستان کے بنگالی نژاد سفیر صاحب کو کر دی تو وہ اس صدمے کو سہار نہیں سکیں گے اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے فوت ہو جائیں گے۔ میرے سفیر صاحب مجھے بہت ہی نیک، شریف، نمازی اور پاکیزہ روح کا نوجوان سمجھتے تھے۔ وہ ہر مہینے میرے سگریٹوں کا کوٹہ، چاکلیٹ کے پیکٹ اور میرے خط اپنے ہاتھ سے پاکستانی ٹکٹ لگا کر سفارتی تھیلے سے کراچی بھیجا کرتے تھے۔

پھر میرا ایک پکا اور پاکیزہ وعدہ بانو سے بھی تھا جسے میں سٹیشن پر روتے دھوتے چھوڑ آیا تھا......!

اوپر کی منزل بڑی اچھی، خوبصورت، بارنو ساختہ اور کئی کمروں پر مشتمل تھی۔ کمروں کے سامنے کیٹ واک تھی اور اس کے پیچھے بڑی مضبوط ریلنگ تھی۔ نیچے سنگ مرمر کا فرش تھا جس پر صفائی والی عورت ٹاکی مار رہی تھی۔

سیڑھیوں کی فلائٹ پر، ادھیڑ عمر کی ایک عورت اپنے کاؤنٹر کے اندر کیش رجسٹر رکھے، کرسی پر بیٹھی جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر خوش آمدید خوش آمدید کہا اور کمروں کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرکے کہا "تشریف رکھیے، جو کمرہ بھی خالی ہے وہاں تشریف رکھیے۔"

پہلے اور دوسرے کمرے میں صوفوں پر اکا دکا لوگ بیٹھے تھے لیکن تیسرا کمرہ خالی تھا۔ ہم دونوں بھیگی بلی بنے صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ جو بڑا شیر ببر بن کر بڑھ بڑھ کے باتیں کرکے آیا تھا، اس وقت اپنی سٹی گم کرا کے بیٹھا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

سامنے کی دیوار پر شیشے کے فریم میں سرکاری مہروں اور رسیدی ٹکٹوں والا ایک نوٹس لگا تھا۔ عین اس طرح کا

نوٹس جیسا ہمارے یہاں دکانوں پر لگا ہوتا ہے کہ "بدھ کے روز چھٹی ہوگی۔ ملازموں کی تعداد تین ہے۔ مالک دکان کا نام اللہ دتہ ولد نور دین ہے۔ ملازموں کو ہر ہفتے منگل کے روز تنخواہ دی جاتی ہے۔ اوقات کار یہ ہیں......" وغیرہ وغیرہ

میں اٹھ کر وہ نوٹس پڑھنے لگا۔ لکھا تھا "اس کاسینو پر تشریف لانے والے مہمانان گرامی کی خدمت میں سلام پہنچے...... یہ راحت کدہ کارپوریشن نے آپ کی خوش طبعی اور خوش وقتی کا سامان بہم کرنے کے لیے وضع کیا ہے۔ اس راحت کدے میں خدمت کرنے والی لڑکیوں کو ان کے قد بت، وضع قطع، شکل و صورت اور عمر اور ساخت جسمانی کے طے شدہ معیار کے مطابق چنا گیا ہے۔ ان سب کا باقاعدہ ہفتہ وار طبی معائنہ ہوتا ہے اور انہیں معمولی سے اضمحلال پر لے آف کرکے ان کا ورمال کیا جاتا ہے۔ مہربانی فرما کر آپ بھی صحت جسمانی کے اصولوں کا خیال رکھیے اور اسی تسکین افزا ماحول میں ڈسپلن کے اصولوں پر کاربند رہیے...... یہ جنت ارضی آپ کی اور صرف آپ کی لذت کشی کے لیے ہے۔ اس میں کسی قسم کا خلل نہ پیدا ہونے دیجیے۔"

جب میں یہ نوٹس پڑھ چکا تو میرے مہمان نے مریل آواز میں پوچھا "کیا ہے؟" اور ابھی میں نے اس کی بات کا جواب دینے کو منہ کھولا ہی تھا کہ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

چار خوبصورت گورے بدنوں اور سنہرے بالوں والیاں نوجوان لڑکیاں، مادرزاد برہنہ "بونا سیرا! بونا سیرا" کہتی ہوئی ہمارے کمرے میں آ کر صوفوں پر بیٹھ گئیں۔ ان سب نے اپنی برہنگی چھپانے کو بہت اعلیٰ ڈیزائن کے اونچی ایڑھی والے شوز پہن رکھے تھے، باقی کچھ نہیں تھا۔ ایک لڑکی جس کے بال کالے سیاہ تھے، اس نے گلے میں اودے رنگ کا ایک مخملی پٹہ ڈالا ہوا تھا جس کے سامنے ہیرے کا ایک چھوٹا سا ریزہ ونکلیں مار رہا تھا......

میرے مہمان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے اس کے زانو پر زور سے ہاتھ مار کر پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہو؟" تو اس نے کپکپائی ہوئی انگریزی میں کہا "اس سے پوچھو، یہ بتائے گا۔ اسے پتہ ہے۔ میں اطالوی نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "ہم ہندوستانی ہیں اور سیر و تفریح کے لیے اٹلی آئے ہیں۔"

"آگرہ۔ آگرہ" اس کی ساتھی نے تڑپ کر پوچھا "تاج محل والے آگرے سے؟"

میں نے کہا "نہیں، ہم دلی کے رہنے والے ہیں اور دلی سے آئے ہیں۔ وہاں بھی قطب صاحب کی لاٹ ہے۔" لیکن وہ میری بات ٹھیک نہ سمجھ سکی۔ یونہی ہاں ہاں کرتی رہی۔

میرے مہمان نے اسی لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اس سے کہو کہ تم بہت خوبصورت ہو۔" میں نے حکم کی تعمیل کی تو اس لڑکی نے ہاتھ ذرا سا اونچا کرکے "شکریہ" کہا۔ میں نے کہا "میرا شکریہ نہیں، اس کا شکریہ ادا کرو جس نے تمہیں یہ کامپلی منٹ دیا ہے۔" اس نے میرے مہمان کی کمر میں زور کا دھموکا مار کر کہا "یہ تو بولتا ہی نہیں، اس سے کیا بات کروں۔"

میں نے کہا "تم مستقل طور پر یہیں رہتی ہو، اس گھر میں؟"

تو وہ چاروں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور نفی میں سر ہلانے لگیں۔ میں نے کہا "یہاں نہیں رہتی ہو؟" تو کالے بالوں والی بولی "ہمیں یہ بتانے کا حکم نہیں ہے۔"

’’اور اگر ہم بتا بھی دیں تو اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔‘‘ نیلی آنکھوں والی لڑکی نے کہا ’’ہم صرف رات کے وقت یہاں ہوتی ہیں اور ناموں کے بجائے نمبروں سے پہچانی جاتی ہیں۔‘‘

پھر اس لڑکی نے جس نے میرے مہمان کی کمر میں دھموکا مارا تھا، کچھ متجسس سی ہو کر مجھ سے پوچھا ’’تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے تھے؟‘‘

’’کونسا سوال؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’یہی......‘‘ اس نے بچوں کی طرح چہرہ ہلا کر کہا ’’تم مستقل طور پر یہیں رہتی ہو؟ اس گھر میں؟‘‘

’’اوہ۔‘‘ میں نے ایک جج کی طرح سنجیدہ ہو کر کہا ’’وہ میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تم چاروں کا لہجہ فرق فرق ہے اور تم میں سے کوئی بھی رومن تلفظ کے ساتھ اطالوی نہیں بولتی ہو۔‘‘

وہ چاروں ایک لحہ کے لیے خاموش ہو گئیں تو میرے مہمان نے پوچھا ’’تم نے کیا کہا؟‘‘

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، ایک لڑکی بولی ’’تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم روما کی نہیں ہیں۔‘‘

’’لیکن کہاں کی ہیں؟‘‘ دوسری بولی۔ ’’یہ ہم نہیں بتائیں گی۔‘‘

میں نے کہا ’’یار تو تم تورین کی ہو یا جنیوا کی اور اگر ان دونوں شہروں میں سے کسی کی بھی نہیں ہو تو نارتھ کی ضرور ہو...... تمہاری بولی میں اطالیہ کی روح نہیں ہے۔ تم لوگ باتیں کر سکتے ہو۔ ایک دوسرے کی گفتگو سمجھ سکتے ہو لیکن تمہاری باتوں میں روح نہیں ہوتی۔ سری رمز نہیں ہوتی۔‘‘

میں کیا کرتا اور کس طرح سے ان کے ساتھ پورا اترتا۔ وہ شخص جو اتنی ہلا شیری کے ساتھ مجھے یہاں لایا تھا، اب منہ میں گھنگھنیاں ڈالے احمقوں کی طرح مسکرا رہا تھا۔

تھوڑی دیر تو میں ان کے ساتھ زبان کی باتیں کرتا رہا اور روما کے تلفظ کے گن گنواتا رہا۔ لیکن اچانک کالے بالوں والی کو خیال آیا کہ یہ تو بھک منگے سے شوقین ہیں۔ ان کے پاس ہے کچھ نہیں، مفتا مفت نظارہ بازی کرنے آئے ہیں۔ دو چار ٹکڑیاں دیکھ کر ایسے ہی واپس چلے جائیں گے۔

اس کمبخت نے یہ خیال اپنے ذہن تک محدود نہ رکھا بلکہ ترجمہ کر کے سب کے سامنے پیش کر دیا۔ چاروں ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئیں تو میرے مہمان نے گھبرا کر پوچھا ’’کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ جا کیوں رہی ہیں؟‘‘

میں نے وجہ بیان کی تو اس نے ہکلا کر کہا ’’ان سے پوچھو یہاں کا طریقہ کار کیا ہے؟ اور یہ کس طرح سے خصوصی توجہ دیتی ہیں؟‘‘

میں نے اس فقرے کا عین اسی طرح سے ترجمہ کر کے پوچھا تو نیلی آنکھوں والی لڑکی نے کہا ’’پانچ ہزار لیرے فی محبت۔ ہم میں سے جو بھی پسند آئے، اسے ساتھ لے لیجئے۔‘‘

’’خالی پانچ ہزار لیرے نہیں‘‘ سیاہ بالوں والی لڑکی نے کہا ’’اس کے ساتھ ٹپ بھی دینا پڑے گی۔‘‘

’’وہ اپنی مرضی اور حیثیت کے مطابق۔‘‘ چوتھی نے کہا۔

میرے مہمان نے کہا ’’پانچ ہزار لیرے تو پچیس روپے پاکستانی ہو گئے۔ ان سے کہو، کچھ کم کریں۔‘‘

میں نے حسب ارشاد اس کا بھی ترجمہ کر دیا۔

کالے بالوں والی نے میرے مہمان کے سر میں کس کے چپیڑ ماری اور ساتھ ایک ایسا فقرہ کہا جس کا ترجمہ نہ میں اس وقت کر سکا نہ آگے کبھی کروں گا۔ پھر وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھیں اور انڈین لوگوں کے خلاف بکتی جھکتی یہ کہتی کمرے سے باہر نکل گئیں کہ ان لوگوں کو لذت، راحت اور خوش باشی سے کیا کام۔ یہ تو ایک ایک آنہ لے کر سال بھر کیلوں والے بستر پر لیٹ کے گزار دیتے ہیں۔

وہ جس تیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں اس سے دگنی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئیں۔ میرے مہمان نے کہا ’’حد ہو گئی یار۔ اس میں ناراضگی کی کیا بات تھی بھلا۔ دنیا کی ساری مارکیٹوں میں بھاؤ تاؤ ہوتے ہیں، پھر انہوں نے کیوں برا مانا۔‘‘

میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مہمان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ’’اب چلیں، کافی دیر ہو گئی ہے اور مجھے صبح سویرے یونیورسٹی بھی جانا ہے۔‘‘

انہوں نے کہا ’’تھوڑی دیر کے لیے رکو اور دوسرے گروپ سے بات کر لینے دو۔ دوسرے گروپ کی لڑکیاں بھی ابھی آتی ہی ہوں گی۔‘‘

میں نے کہا ’’ٹھیک ہے، آپ بیٹھیں۔ میں چلتا ہوں...... نیچے اتر کر آپ کو کوئی ٹیکسی مل جائے گی جو آپ کو ہوٹل چھوڑ دے گی...... آپ کا ہوٹل یہاں سے کوئی زیادہ دور نہیں۔‘‘

انہوں نے کہا ’’حد ہو گئی یار۔ آدھا گھنٹہ اور نہیں رک سکتے۔‘‘

میں نے کہا ’’سوری! مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں...... اور یہاں رکنا مناسب بھی نہیں سمجھتا۔‘‘

یہ کہہ کر میں چلنے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ تیار ہو گئے۔ منہ سے تو کچھ نہیں بولے، البتہ ایک پھنکار سی مار کر اپنی ناخوشی کا اظہار کر دیا۔

جب ہم سیڑھیوں پر اس کیش رجسٹر والی عورت کے قریب سے گزرے تو اس نے کہا ’’آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو کوئی لڑکی پسند نہ آئی۔ اب آپ اگلے ہفتے ضرور تشریف لائیے گا۔ اگلے بدھ ’’ریجو کالا بریا‘‘ لڑکیوں کے دو گروپ آ رہے ہیں۔ ان سے مل کر آپ بہت خوش ہوں گے۔‘‘

میں نے بڑی شرافت اور محبت کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی ’’اگر آپ دو ہفتے ٹھہر کر آئیں تو آپ کی ملاقات سسلی کے ایک کھلنڈرے مگر جیلس گروہ سے ہوگی۔ تفصیلی خط آ چکا ہے۔ ساری لڑکیاں کالے بالوں اور سیاہ آنکھوں والی ہیں۔ سب میں عرب خون ہے اور یہ پڈگری اس وقت سے چل رہی ہے جب صقلیہ پر عربوں کی حکومت تھی...... یہ دیکھئے،‘‘ اس نے دراز سے ایک لمبا سا لفافہ نکال کر دکھایا ’’فوٹو اور کوائف آ چکے ہیں اور ڈیٹ بھی آ چکی ہے۔ ٹھیک دو ہفتے بعد۔‘‘

وہ یہ بات پرانی انارکلی کے بساطی کی طرح دہرا رہی تھی کہ بلٹی آ چکی ہے، مال دو ہفتے تک پہنچ جائے گا۔ سواری

گاڑی سے آرہی ہے۔

میرے مہمان نے پوچھا ''یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

میں نے کہا ''کچھ نہیں، آپ میرے پیچھے پیچھے آجائیں!''

اگلی صبح جب وہ پیرس جانے لگے تو میں انہیں سٹیشن پر چھوڑنے گیا۔ مجھ سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔ کھڑکی میں سے سر نکال کر بولے ''تم کو پیرس سے خط لکھوں گا اور پوری تفصیلات سے آگاہ کروں گا...... واپسی پر اگر موقع ملا تو پھر تمہارے روم آؤں گا اور زیادہ دن ٹھہروں گا۔ یہ تو واقعی ابدی شہر ہے۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

ان کے پاس چونکہ ٹریولرز چیک تھے جو انہوں نے تڑوائے نہیں تھے، اس لیے سفر خرچ کے طور پر راستے کے لیے انہیں اطالوی رقم کی ضرورت تھی، میرے پاس اس وقت صرف پچاس ہزار لیرے تھے جو میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ کہنے لگے ''یا تو میں لوٹتے ہوئے تمہیں یہ رقم دے جاؤں گا یا پاکستان سے بینک ڈرافٹ بنوا کر بھجوا دوں گا۔ فکر نہ کرنا۔''

میں نے کہا ''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اس میں فکر کی کیا بات ہے بھلا!''

جب میں مرکزی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور میرا دفتر ابھی 36/جی گلبرگ میں تھا تو پاکستان سے ایوب آمریت کا دور ختم ہو گیا اور بھٹو صاحب جمہوریت کی سنہری صبح لے کر سیاست کے افق پر نمودار ہو گئے۔ ان کے عہد میں میرے یہی مہمان میرے افسر بن کر اسلام آباد تعینات ہو گئے۔ انہوں نے چارج لیتے ہی سب سے پہلے میری پیشی کر لی اور مجھے اپنے پی اے کے پاس دو گھنٹے انتظار کرانے کے بعد شرف باریابی بخشا۔

اپنے دورِ حکومت میں انہوں نے مجھے بہت کھڑکایا اور قدم قدم پر ذلیل کی۔ جب بھی لاہور دورے پر تشریف لاتے تھے، مجھے ایئرپورٹ پہنچ کر ان کا سواگت کرنا پڑتا۔ آتے ہی اپنا بریف کیس اور کندھے کا تھیلا مجھے تھما دیتے۔ گرمی کا موسم ہوتا تو ایک جھڑکی سی دے کر کہتے ''آج گرمی بہت ہے...... کیوں ہے؟'' میں کہتا ''سر! بس ابھی ہوئی ہے۔ گھنٹہ بھر پہلے تو بڑا خوشگوار موسم تھا۔''

سردی ہوتی تو مجھے طعنہ سا دے کر کہتے ''تمہارے یہاں سردی بہت ہے۔'' میں کہتا ''بس سر اسی سال ہوئی ہے۔ پچھلے سال، انہیں دنوں میں بڑا خوشگوار موسم تھا۔''

ان کی وجہ سے میں نے انٹرکونٹی نینٹل کا سوئیٹ بھی دیکھا جس میں ایک ساتھ دو تین کمرے تھے۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنج الگ تھا اور چھوٹا سا کچن ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں تھا جہاں باورچی کے سونے کا بیڈ بھی لگا ہوا تھا۔ وہ جب بھی لاہور تشریف لاتے اسی سوئیٹ میں ٹھہرا کرتے۔ میں نیچے لاؤنج میں بیٹھ کر اس بات کا انتظار کیا کرتا کہ صاحب کو اچانک کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔ وہ نیچے کاؤنٹر پر فون کر کے مجھے اوپر بلا کر اور کام سمجھا کر پھر نیچے بھیج دیا کرتے! جس جگہ دورے پر جاتے مجھے بھی ان کی اردل میں جانا پڑتا اور صبح صبح ان کے ٹھکانے پر پہنچ کر حاضری دینا پڑتی۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے لاہور سے حیدرآباد طلب فرمایا، میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا لیکن ان کی خدمت خاطر

اور معیت میں اتنا وقت گزر گیا کہ مجھے شب بسری کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ مل سکی اور میں نے وہ رات حیدرآباد کے ریلوے سٹیشن کی بنچ پر بیٹھ کے گزار دی۔

جب میرے یہ مہمان آرٹ کریٹک، انگریزی زبان کے مضمون نگار اور مجھ سے پچاس ہزار لیرے ادھار لے کر پیرس روانہ ہو گئے تو مجھے خیال آیا کہ میں نے تو ابھی لینڈ لیڈی کو کمرے کا کرایہ نہیں دیا۔ رینا تا کی دھلائی اور فیوریتی کے دودھ کا بل ادا نہیں کیا، یہ سب کچھ کیسے ہو گا اور یہ کمی کس طرح سے پوری ہو گی۔ تو مجھے باؤسانی کی بیوی ایلسا کا خیال آ گیا جو ہر مشکل وقت میں ایک اچھی فلمی بھابھی کی طرح میرے کام آیا کرتی تھی۔ میں نے فون کر کے اسے اپنے مہمان کی ساری رام کہانی مع اس کی روزمرہ کمینگیوں کے سنائی اور اس نے جواب میں ہنس کر کہا ''کوئی بات ہی نہیں...... تم فکر ہی نہ کرو۔'' اس ساری رام کہانی سے میں نے کاسینو جانے کا واقعہ سنسر کر دیا تھا۔ ایلسا بہت ہی پرانی وضع، پرانے خیالات اور پرانی اقدار کی خاتون تھیں۔ اگر اس کو اس واقعے کا علم ہو جاتا تو اس نے فوراً ایک تفصیلی خط میرے گھر والوں کو لکھ دینا تھا کہ اس کو انگریزی میں خط لکھنے کا بڑا شوق تھا اور کوئی مکتوب الیہ اسے دستیاب نہیں تھا۔

پروفیسر باؤسانی ان دنوں ''جاوید نامہ'' کا اطالوی ترجمہ مکمل کر چکا تھا اور اس پر نظرِ ثانی کر رہا تھا۔ مجھے اس کے مددگار کے طور پر فارسی متن پڑھنا ہوتا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی اطالوی عبارت ملاتا جاتا تھا۔ فارسی میں نے بی اے تک پڑھی تھی لیکن اس پر اردو، انگریزی جیسی دسترس نہ تھی۔ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کے لیے میں اگلے روز کی پروف ریڈنگ کے مطابق رات کو جاوید نامہ کے پانچ سات صفحے پڑھ کر سوتا تا کہ الفاظ و معانی اور تلفظ کے سلسلے میں ایک غیر ملکی کے سامنے کسی قسم کی شرمندگی نہ ہو۔ یہ کام بڑے انہماک سے ہوتا تھا اور اس کے لیے رات گئے تک جاگنا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امریکہ کا ایک جرنی مین کسی تجارتی ادارے کا ایجنٹ اپنی ٹوٹی ٹانگ لے کر کسی ڈاکٹر کے پاس گیا اور اپنے اچانک حادثے کا نتیجہ اس کے سامنے پیش کیا۔ ٹانگ کی ہڈی گھٹنے سے نیچے دو مقام پر ٹوٹی ہوئی تھی اور دونوں میں گرین وڈ فریکچر کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنے ماتحتوں کو فوری سرجری کی تیاری کا حکم دیا اور مریض کو درد روکنے کا ایک بھاری ٹیکہ دے کر پوچھا، یہ حادثہ کس وقت پیش آیا؟ مریض نے کہا، ڈاکٹر صاحب یہ حادثہ پندرہ برس پہلے پیش آیا تھا لیکن میں اس کے خوفناک نتائج سے واقف نہ تھا۔

ڈاکٹر نے حیران ہو کر مریض کی طرف دیکھا اور کہا ''بھائی میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کی یہ ٹانگ کب ٹوٹی؟''

مریض نے کہا ''وہی تو عرض کر رہا ہوں کہ یہ حادثہ مجھے پندرہ برس پہلے پیش آیا۔ اس وقت میں جوان تھا اور مجھے اس کا احساس نہیں تھا لیکن اب جب مجھ میں برداشت کا مادہ نہیں رہا تو میں چیختا چلاتا آپ کی خدمت میں پہنچ گیا ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگے اور مکمل طور پر خاموش ہو گئے۔

مریض نے کہا ''ڈاکٹر صاحب آج سے پندرہ برس پہلے میں اپنی مصنوعات کی فروخت کے سلسلے میں کیلی فورنیا کے ایک دور دراز علاقے میں گھوم رہا تھا اور اپنے شیڈول سے زیادہ دیر وہاں رک گیا تھا۔ آرڈر تیزی سے بک ہو رہے

تھے۔ ہر روز کمپنی سے فون پر رابطہ رہتا تھا۔ میرے کمیشن کی رقم تاش کی سروں کی طرح جمع ہو رہی تھی اور میں اپنی کارکردگی پر بہت خوش تھا۔

ایک روز شام کے وقت جب میں ایک گاؤں سے کافی سارے آرڈر بک کر کے قریبی شہر کی طرف روانہ ہوا تو آسمان پر گہری سرمئی گھٹا کا ایک بادل جمع ہوا۔ بجلی چمکی اور آناً فاناً بارش ہونے لگی۔ میں نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور گاڑی کی تیزی کے ساتھ بارش بھی تیز ہو گئی۔ ہوا کے تند و تیز جھونکے میری گاڑی کو سڑک سے اٹھا اٹھا کر سائیڈوں کی طرف پھینک رہے تھے اور شدید اندھیرے کی وجہ سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا...... اچانک موٹے موٹے اولے پڑنے لگے اور میں نے محسوس کیا کہ میری گاڑی پر ڈینٹ پڑ رہے ہیں۔ ان کی تو خیر مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ البتہ کسی بھی لمحے اپنی ونڈسکرین ٹوٹ جانے کا شدید خدشہ لاحق تھا۔

میں ابھی گاڑی روک کر کسی درخت کے نیچے پناہ لینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ پانچ سات سو گز کے فاصلے پر مجھے ایک چھوٹا سا مکان دکھائی دیا جس کی بتیاں اچانک روشن ہوئی تھیں۔ میں نے گاڑی اس مکان کے پہلو میں ایک درخت کے نیچے روکی اور پناہ لینے کے لیے اس گھر کا دروازہ بجایا۔ تھوڑی دیر بعد ادھیڑ عمر کا ایک کسان سگار پیتا ہوا باہر نکلا اور میرے ساتھ بڑی ہمدردی سے پیش آیا۔ اس نے میرے سوال کرنے سے پہلے ہی کہا "سر آئی ایم سوری ہمارے پاس شب بسری کے لیے کوئی علیحدہ کمرہ تو نہیں ہے البتہ ہمارے بارن کے ساتھ کوٹھڑی ہے جس میں معمولی وضع کا ایک بستر ہے اور دیوار کے ساتھ پانی کی ایک ٹونٹی ہے...... میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "مجھے منظور ہے اور میں آپ کی مہمان نوازی کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ مجھے وہ کوٹھڑی دکھا دیجیے۔"

"آپ یقین کریں ڈاکٹر صاحب وہ کوٹھڑی ایک اچھی خاصی صاف ستھری کوٹھڑی تھی اور اس کے اندر لگا ہوا بستر کسی سرائے خانے کے بستر سے بہت ہی بہتر تھا...... اس کسان نے مجھے وہاں لے جا کر لٹایا۔ بتی کا سوئچ بتایا۔ طوفان تھمنے پر کھڑکی کھولنے کا طریق سمجھایا اور ایک سگار اور ماچس کی پوری ڈبیا میرے سرہانے رکھ کر شب بخیر کہہ کر چلا تو میں نے یہ کہہ کر اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا کہ صاحب میں تو تمبا کو نوشی کرتا ہی نہیں، مجھے سگار اور ماچس کی ضرورت نہیں۔ میں نے جواب میں شب بخیر کہا اور کوٹ پتلون اور جوتے اتار کر بستر میں گھس گیا۔ وہ جو ایک ان ہونا سا خوف میرے دل و دماغ پر طاری تھا، آن واحد میں معدوم ہو گیا اور میں تکیے پر سر رکھ کر گہری نیند سو گیا۔"

آدھی رات کے وقت ٹارچ ہاتھ میں لیے کوئی شخص میری کوٹھڑی میں داخل ہوا اور آ کر میری چارپائی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور غور سے اس خوفناک شے کو دیکھنے لگا۔ وہ کسان کی دراز قد اور جواں سال بیٹی تھی جس نے شب خوابی کا سلکی لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ میری چارپائی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور بڑے مشفقانہ انداز میں بولی "آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" میں نے کہا "آپ لوگوں نے تو پہلے ہی مجھ پر اس قدر مہربانی کی ہے اور ایسی جگہ فراہم کر کے دی ہے کہ اس کے بعد مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں رہی۔"

اس نے کہا "کوئی کمبل، کوئی چادر۔"

میں نے کہا "بالکل نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے میں بڑے سکون میں ہوں۔"

اس نے کہا "ایسے موسم میں بعض اوقات بستر بہت ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور جب تک وہ گرم نہ ہو، ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔"

میں نے کہا "میرے پاس تو پہلے ہی دو کمبل ہیں اور میں نے دونوں جوڑ کر لیے ہوئے ہیں۔ اب واقعی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

اس نے کہا "کوئی لکی کافی وغیرہ، کوئی سینڈوچ یا بسکٹ؟"

میں نے کہا "اس وقت میں بالکل پر باش ہوں، کسی بھی شے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی ٹارچ بجھا کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر رک کر اس نے ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "آپ یقین نہیں کریں گے ڈاکٹر صاحب کہ کوئی گھنٹہ بھر بعد وہ پھر میری کوٹھڑی میں آ گئی۔ اس نے اپنا شب خوابی کا لباس اتار رکھا تھا اور محض ایک چادر اپنے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پھر اسی تپاک اور ویسی ہی محبت سے کہا "آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔" میں نے کہا "بالکل نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں بڑے مزے میں ہوں۔" اس نے کہا "میرے خیال میں یہ بستر آپ کے لیے ٹھیک نہیں اور اس کوٹھڑی کا ماحول بھی تنگ و تاریک ہے۔ آپ میرے کمرے میں آ کر سو جائیں۔" میں نے کہا "آپ کی توجہ اور آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ لیکن میں یہاں بہت ہی کمفرٹیبل ہوں۔ گھر سے بھی زیادہ آرام میں ہوں۔" کہنے لگی "کسی خاص چیز کی ضرورت ہو، کوئی ایسی چیز جسے آپ مہمان کی حیثیت سے مانگتے ہوئے شرماتے ہوں......" میں نے کہا "بالکل نہیں۔ میں تو بلکہ بہت ہی بے تکلفی کا وقت گزار رہا ہوں اور آپ لوگوں کی میزبانی کا شکرگزار ہوں۔"

اس نے اپنی ٹارچ بجھائی اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

یہ کہہ کر ٹوٹی ٹانگ والے مریض نے ڈاکٹر صاحب کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "کل شام، ڈاکٹر صاحب! جب میں اپنے گھر کی ڈھلواں چھت پر چڑھ کر انٹینا کا رخ سیدھا کر رہا تھا تو اچانک مجھے پندرہ برس پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے مجھے اس نوجوان لڑکی کی بات سمجھ میں آئی اور میرے بدن نے ایک جھنجھنی سی لی۔ اس جھنجھناہٹ سے میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور چھت سے پھسل کر باہر کی سڑک پر جا گرا...... ٹانگ کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ اب ڈاکٹر صاحب یہ حادثہ تو پندرہ برس پرانا ہے لیکن اس کی ضرب شدید کا نتیجہ کل برآمد ہوا ہے۔"

اپنے مہمان کے چلے جانے پر ٹھیک چار دن بعد میں رات کے بارہ بجے جاوید نامہ کے تقابل موازنے کے لیے فارسی کا متن دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک نعرہ مار کر میں بستر سے اچھلا اور فرش پر گر گیا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں کیسے اونچے مقام سے ہو آیا تھا اور میں نے بولتے چالتے بدنوں کے زندہ ناچ گانے میں کس قدر قریب سے شرکت کی تھی۔

ساتویں جماعت میں ہمارے گروپ کا ایک اور نالائق لڑکا پورن اپنے پھوپھا کے عبادتی گھنگے سے ایک تصویر

اڑالایا تھا۔ یہ تصویر ایک برہنہ عورت کی تھی جسے اس کے پھوپھانے گنگا صاحب کی جلد اور جلد پر چڑھے ہوئے خاکی کاغذ کے درمیان چھپا رکھا تھا۔ ڈرل کے پیریڈ میں ہم سب نے اس تصویر کو باری باری دیکھا اور اپنی اس اکتشافی مہم پر بہت مسرور ہوئے۔ وہ میلے سے گندے کارڈ پر گھسے ہوئے بلاک کی چھپی تصویر تھی جہاں ایک پرانی وضع کی آرام کرسی پر ایک بڑی عمر کی برہنہ خاتون بیٹھی تھی۔ یہ اس قدر گھسے ہوئے بلاک کی تصویر تھی کہ اسے نہایت غور سے دیکھنے کے بعد تصور کے زور پر معنی پہنانے پڑتے تھے۔ ورنہ حقیقت میں یہ ایک کھلی ہوئی چھتی، برف جمانے والی مشین، بھینس کے چہرے اور ٹوٹے ہوئے تانپورے سے ملتی جلتی تصویر تھی۔ پورن کہتا تھا یہ ایک نیوڈ تصویر ہے جو اس کے پھوپھانے شادی سے پہلے کی سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔ ہمیں پورن کا حکم ذہن میں رکھ کر اسے دیکھنا پڑتا تھا تو وہ واقعی ایک نیوڈ تصویر ہی نظر آتی تھی ورنہ حقیقت میں وہ مغلیہ دور کے جھروکے درشن کا ایک طاقچہ سی تھی۔

وہ جو نیم دائرے میں بیٹھ کر روحانی اسباق کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا اور جس میں سکشا لینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، اب ایک مقام پر آ کر رک گیا تھا۔ پہلے تو پادری ساسترلی کی دوں فطرتی نے مجھے انسان سے مایوس کر دیا تھا، اب مجھے میرے اندر کے چور نے مشکیں باندھ کر آگے لگایا ہوا تھا۔ انسان کی گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کو دیکھ کر میں نے بھی اپنی قدروں کی گریز شروع کر دی تھی۔

اس سوا سال کی مدت میں مجھے تو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کاسینو میرے گھر سے اس قدر قریب ہے اور اس کا ثمر اس قدر سہل الحصول ہے۔ پھر اس پر کچھ خاص رقم بھی خرچ نہیں ہوتی۔ کسی مشکل روٹین کا بھی سامنا نہیں ہوتا۔ کسی کی خوشامد درآمد بھی نہیں۔ کہیں سے کوئی سفارشی چٹھی بھی نہیں لینی ہوتی۔ بس ایک مرتبہ حوصلہ کر کے چلے جانا ہوتا ہے اور پھر آمد و رفت میں آسانی ہو جاتی ہے۔

اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے مجھے رہ رہ کر ان لڑکیوں کا خیال ستانے لگا جو جزیرہ سسلی سے آنے والی تھیں جن کے بال سیاہ اور آنکھیں ہرنوں جیسی کالی تھیں۔ پر وہ ان سنہرے بالوں والی مرتد اہل کتاب لڑکیوں کے مقابلے میں میرے مسلک کے قریب تھیں۔ ان میں عرب خون تھا۔ وہ مسلمان حکمرانوں کی اولاد تھیں اور اس حوالے سے میرے قریبی رشتہ دار کی بیٹیاں تھیں۔ میں نے ان کی طرف رجوع کرتے ہوئے یہ محسوس کیا گویا میں اپنی عم زادوں سے ملنے جا رہا ہوں اور ان سے پرانے رشتوں کی لڑیاں تلاش کرنے جا رہا ہوں جو ایک عرصہ ہوا ہم دونوں سے ٹوٹ کر وقت کی وادیوں میں گم ہو گئی تھیں۔

ایک شام میں گھر سے نکل تو پڑا لیکن کاسٹیل کا چکر کاٹ کر سینٹ پیٹر کے راستے واپس آ گیا۔ میں اپنے سکوٹر پر وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کوئی میرے سکوٹر کو وہاں دیکھ کر اور اس کا نمبر پڑھ کر اندازہ لگائے گا کہ میں اندر ہوں۔ پھر وہ یونیورسٹی کے ریکٹر سے اور پاکستانی سفیر سے بہ یک وقت میری شکایت کر دے گا اور میری نوکری ختم کر دی جائے گی۔ کوئی پتہ تھوڑی چلتا ہے، انسان کے ساتھ سو دوست سو دشمن ہوتے ہیں، ہر کوئی اعتبار کے قابل تو نہیں ہوتا۔

میں نے سکوٹر واپس لا کر گھر چھوڑ دیا اور بس پکڑ کر تراس تیورے کے پل پر پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ مقام، وہ

مقام محبوب اور مقام مجبور بس اتنی دور ہی ہے جتنا لیاقت باغ پنڈی سے یا پرانی انار کلی لاہور سے گورنمنٹ کالج یا ایلفنس سٹریٹ کے ایک سرے سے دوسرا سرا۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے کئی چھوٹی بڑی گلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر چھوٹے فوارے والا ترا ہا آتا ہے۔

کوٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے، کندھے آگے نکالے۔ کمر میں خُب ڈالے، گلے میں بھی دانہ اور لعاب سپستاں کا گولا سا اٹکائے، من من کے قدم اٹھاتا میں اس گلی کی طرف چلا جا رہا تھا جہاں میرے ہم مسلک اور ہم مذہب لوگوں کو ہرگز نہیں جانا چاہیے لیکن اس وقت کوئی میرے ساتھ ساتھ، میری بائیں طرف، میرے جسم سے دو تین فٹ دور میرا حوصلہ بڑھاتا ہوا میرے ساتھ ساتھ جا رہا تھا اور مجھے میری فطرت اور میری جبلت کے راز سمجھا رہا تھا۔ میرے کانوں میں، میرے دل یا میرے تصور میں نہیں، میرے کانوں میں، ان کانوں میں جن پر میں دھوپ کی عینک لگاتا تھا، اس کی آواز بڑی واضح اور صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ پنجابی تھا لیکن وہ بڑی صاف ستھری اور شستہ اردو بول رہا تھا اور بار بار میرا نام یوں لے رہا تھا جیسے میرا صدیوں کا دوست ہو۔ وہ بہت پُر امید انداز میں مجھے آگے بڑھا رہا تھا لیکن اس بڑھاوے کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی گونج، ناامیدی اور خوف کی بھی تھی۔

اس نے بڑی دور تک اور بڑی دیر تک میرا ساتھ دیا اور مجھے سیڑھیوں پر رکتے ہوئے دیکھ کر میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اوپر اٹھایا اور کرسی کی سیڑھیوں پر چڑھایا۔ میں نے حوصلہ کر کے خود دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کوٹ کے کناروں کو کھینچ کر کوٹ کو سیدھا کیا۔ ٹائی کی ناٹ کی میڑھ نکالی اور بالوں پر ہاتھ پھیر کر اپنے آپ کو کمپوز کیا۔

میری گھنٹی کی آواز پر اب کی بار ایک ٹھگنے سے آدمی نے دروازہ کھولا۔ جھک کر مجھے سلام کیا اور اوپر سیڑھیاں چڑھنے کا اشارہ کیا۔

بائیں ہاتھ، دوہرے بدن کی وہی سینورا سنگ مرمر کے فرش پر وائپر پھیر رہی تھی۔ اس نے اسی انداز میں "جی آیاں نوں، بھلی کری آیا، سو سو واری آیا، مبارکباداں آیا شاد مرادی آیا" کہا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کو سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا سر جھکایا اور منزل مقصود کی طرف اٹھنے کو سیڑھیوں کی جانب مڑا۔

اس کے ساتھ ہی ایک کڑک دار آواز کا سناٹا سا پھیلا اور سنگ مرمر کے فرش پر بجلی سی کوندی "بے گھوڑا۔"

بد بخت...... حرامزادہ

ناشکر گزار...... لعنتی...... یہودی

باز آ، باز آ

کم بختا...... سور کے بچیا!!

وائپر پھیرنے والی عورت کے ساتھ حوالدار سمند خان اپنی پوری کٹ میں کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں وہی گول نکے والا ہنٹر تھا۔ انہوں نے وہ ہنٹر زور سے گھما کر اپنی ران پر مارا اور چیخ کر کہا "بے گھوڑا۔"

حوالدار صاحب اس وقت پورے جلال میں تھے اور اپنا ہنٹر گھما گھما کر اپنے دونوں پہلوؤں کو شدید ضربیں لگا

رہے تھے۔ان کے ہنٹر میں سختی کے باوجود بڑی لچک تھی اور اس کے سرے پر لوہے کا گیند سیسے سے بھرا تھا۔ بڑا وزنی اور بڑا خوفناک...... اگر میں وہاں سے اسی وقت اباؤٹ ٹرن مار کر لوٹ نہ پڑتا تو وہ مجھے اپنے ہنٹر کے گلے سے مار مار کر لہولہان کر دیتے اور وہیں گرا کر جان سے مار دیتے...... مرڈران کا سینو!

میں تیز تیز قدم اٹھاتا گھر واپس بھاگ آیا۔ کافی لمبا راستہ تھا لیکن میں نے سارا پیدل طے کیا۔ ایک عجیب طرح کے پکڑے جانے کا خوف تھا جو گھر پہنچ کر بھی میری جان کا عذاب بنا رہا۔ ہر گھڑی یہی لگتا تھا کہ چونکہ ایف آئی آر درج ہو چکی ہے، اس لیے ابھی کوئی گرفتار کرنے آ جائے گا۔ وطن عزیز سے دور، دیار غیر میں اگر خدانخواستہ آپ کے خلاف کوئی رپٹ درج ہو جائے اور آپ کو پتہ چل جائے کہ سرکار کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی ہے تو زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے خلاف بھی ایک سرکاری مشینری حرکت میں آ چکی تھی اور میں اپنی تمام تر کوشش اور بھاگ دوڑ کے باوصف زندوں میں نہیں رہا تھا اور میرا نام ادھر سے کٹ رہا تھا۔

---

(5)

پاکستان میں اچھا کھانے، اچھا پہننے اور گلچھرے اُڑانے کے ساتھ ساتھ کئی ادیبوں نے زندگی کی بے معنویت پر کمال کے مضمون اور افسانے لکھے ہیں۔ اسی طرح چیختے چنگھاڑتے شور مچاتے محلوں کے اندر تنگ مکانوں، مستقل مہمانوں اور امڈتے چوباروں کے درمیان پڑوسی لڑکیوں سے عشق لڑاتے ہوئے بے شمار شاعروں نے تنہائی اور اکلاپے پر کمال کی نظمیں لکھی ہیں اور نقادوں سے جھولیاں بھر کے داد حاصل کی ہے لیکن یہ لوگ نہ تو بے معنویت کی روزمرہ خودکشی سے کبھی گزرے ہیں اور نہ ہی انہوں نے تنہائی کے دکھ دیکھے ہیں۔

میں تنہا تو خیر نہیں تھا لیکن زندگی اس قدر لایعنی سی ہو گئی تھی کہ اب اس پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ کیفیت جو ایمان اور کفر کے درمیان جنم لے کر انسان کو دہریت کی طرف مائل کر کے رکھتی ہے، کچھ ویسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ مذہب تھوہر کے ڈنڈے کی طرح ہر وقت لباس کے اندر گھسا ہوا تھا اور نئے کپڑے پہننے پر بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتا تھا۔ مذہب کی چیرہ دستیاں، آپس کی خانہ جنگیاں، دشمنوں کے ساتھ لڑائیاں، افراد کی دشمنائیاں اور ظلم کی کہانیاں اتنی زیادہ اور اس قدر دور تک پھیلی ہوئی تھیں کہ ہر قسم کا مذہب زہر آب بن کر رہ گیا تھا۔

حوالدار صاحب کی موجودگی کا واہمہ، ان کی کڑک دار آواز کے بھری التباس اور مذہب کی فوق الفطرتی چیرہ دستی نے مجھ سے خوش وقتی کا سامان چھین کر زندگی کو کھنگر سا بنا دیا تھا۔ اب زندگی کے دو ہی عظیم مقصد سامنے تھے۔ روزمرہ کی نوکری یا ایک جھٹکے کی خودکشی! جس لذیذ راتب کی رکابی سے کتے کا منہ سنگی کے زور پر واپس کھینچ لیا جائے، اس کا علاج کتے کی سی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

میں دیار غیر میں کمی رزق کے خوف سے نوکری کے ساتھ چمٹا رہا اور اسی عظیم مقصد کو زندگی کا سہارا بنا لیا۔ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی ساری کلاسیں شام کے پانچ بجے ختم ہو جاتی تھیں لیکن مجھے سات بجے تک بیٹھنا پڑتا تھا۔ اصل کلاس کے ختم ہو جانے کے بعد مجھے گھنٹہ بھر کلاس روم میں فارغ بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد ایک نیا درس شروع ہوتا تھا۔ اس درس کا صرف ایک ہی طالب علم تھا اور اس خصوصی کلاس کے لیے مجھے الگ سے بھتہ ملتا تھا۔

میرے اس سٹوڈنٹ کا نام وتوریوولونیکا تھا اور یہ منسٹری آف کامرس میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھا۔ بھرا ہوا مضبوط جسم، میدہ اور شہاب چہرہ، کالی سیاہ داڑھی جس میں چاندی کی سفید تاریں، آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ، چوڑی پیشانی، کانوں کے اندر بالوں کے گنگھریالے چھلے، بائیں ہاتھ میں موٹی میرج رنگ۔

وتوریوولونیکا مجھ سے عمر میں کوئی اٹھارہ بیس سال بڑے ہوں گے لیکن جس ادب اور سپردگی کے ساتھ کلاس روم کے دروازے پر آکر اندر داخل ہونے کی اجازت مانگتے، میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ اندر آنے کے لیے اجازت نہ مانگا کریں، سیدھے اپنی سیٹ پر آ جایا کریں لیکن ان پر میری اس درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جن دنوں میں نے انہیں پڑھانا شروع کیا، وہ سندھ اردو ریڈر برائے جماعت ہشتم پڑھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ بانگ درا کی نظموں کا مختصر سا انتخاب تھا جو پروفیسر باؤسانی کی نگرانی میں جمع کر کے سائیکلوسٹائل کیا گیا تھا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ ان سے پوچھا کہ وہ اردو کیوں پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے کہا ''ہم پاکستان کے ساتھ اپنی تجارت بڑھانے کے خواہش مند ہیں۔ بڑھانے کے کیا، شروع کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس نئے ملک کے ساتھ تجارتی جانکاری حاصل کرنے کے لیے ہمیں آفیسروں کے علاوہ چھوٹے تاجروں اور دکانداروں سے بھی ملنا پڑے گا۔ ان سے ملنے اور ان کی طلب سے بہرہ مند ہونے کے لیے ان کی زبان میں گفتگو کرنا ہوگی اور چونکہ ان کی قومی زبان اردو ہے، اس لیے میں اردو پڑھنے پر مجبور ہوں۔''

ڈاکٹر ولونیکا، اکنامکس کے پی ایچ ڈی تھے اور عربی زبان سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ عربی زبان پر حاوی ہونے کی وجہ سے انہیں اردو سیکھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو رہی تھی اور وہ مجھے کسی قسم کی تکلیف دیئے بغیر بڑی آسانی سے سبقاً سبقاً آگے بڑھ رہے تھے لیکن ان کے ساتھ ایک مشکل ضرور تھی کہ وہ فقرے کی ساخت کو گرامر کے اصولوں پر رکھ کر آگے چلتے تھے۔

ایک دفعہ عبارت میں ''دھلوائی'' کا لفظ آیا تو ڈاکٹر صاحب رک گئے۔ پھر میری طرف منہ کر کے پوچھنے لگے، یہ دھلوائی کیا ہے؟ میں نے کہا یہ لفظ دھونے، دھلنے اور دھلوانے سے متعلق۔ جیسے ہم کپڑے دھلواتے ہیں، فرش دھلواتے ہیں، ہاتھ دھلواتے ہیں اور ان کے علاوہ...... لیکن ڈاکٹر صاحب نے میری بات کاٹ کر کہا ''وہ تو ٹھیک ہے سر۔ دھونے کے عمل کو تو میں اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ میں تو آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ ''دھلوائی'' گرامر میں کیا ہے؟''

میں نے کہا ''اوہ...... یہ تو سیدھی سی بات ہے...... دھلوائی بھی...... دوسرے پیشوں کی طرح بس ویسی ہی ہے...... اور اس کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کے رخ میں بھی وہی عمل پایا جاتا ہے......''

لفظوں اور ٹوٹے پھوٹے فقروں کے اندر ٹامک ٹوئیاں مارتے مجھے اچانک یاد آ گیا اور میں نے منہ پکا کر کے یقین کے ساتھ کہا ''ڈاکٹر صاحب دھوائی اسم ہے...... اسم...... ناؤن......'' ڈاکٹر صاحب نے ادب کے ساتھ سر جھکا لیا اور دھیمی آواز میں بولے ''اسم تو ہے سر مگر کیسا اسم ہے؟''

اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ان اسموں کم بختوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں اور ولایت کے طالب علم ان ساری

قسموں سے واقفیت حاصل کیے بغیر آگے نہیں چلتے تو میں نے بڑی شرافت کے ساتھ اقرار کر لیا کہ مجھے معلوم نہیں ''دھلوائی کس قسم کا اسم ہے۔''

ڈاکٹر ولونیکا نے کہا ''چلیے چھوڑیے، اس کو پھر دیکھ لیں گے، پہلے ہم اپنا سبق ختم کر لیں۔'' سبق ختم ہوا۔ کلاس ختم ہوئی۔ ہم دونوں دروازہ بھیڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو کوئی رات کے بارہ بجے مجھے ڈاکٹر ولونیکا کا فون آیا کہ ''دھلوائی اسم معاوضہ ہے۔''

میں نے کہا ''اچھا! آپ یہ پوچھ رہے تھے، یہ تو واضح اسم معاوضہ ہے۔ اس وقت میں ٹھیک سے آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''ٹھیک ہے سر! میری اردو بول چال ابھی کافی کمزور ہے اور میں اپنا مطلب ٹھیک سے سمجھا نہیں سکتا، آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔''

جن دنوں کا میں نے ابھی ذکر کیا کہ میں مذہب سے پوری طور پر متنفر ہو چکا تھا اور میں نے اپنے آپ کو مذہب اسلام سے مکمل طور پر خارج کر لیا تھا، انہیں دنوں بفانا کے تہوار پر میری ایک ایسی لڑکی سے ملاقات ہوئی جو اپنے علاقے کی نامی گرامی مارکسسٹ تھی اور سیاسی امور پر گہری نظر رکھتی تھی۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ مذہب تو عوام الناس کے لیے افیون کا درجہ رکھتی ہے اور اس نے نوع انسانی کے درخشاں مستقبل کو کھدیڑ کے رکھ دیا ہے...... اس لڑکی نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور میں نے جواباً اس کو اپنا فون نمبر بھی دیا اور ساتھ گھر کا پتہ بھی بتا دیا...... ہم کئی وجوہات کی بنا پر ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ گہرے اسرار کی لڑکی تھی اور بڑی خوش خلق تھی!

ایک شام ڈاکٹر ولونیکا کی کلاس لیتے وقت پتہ نہیں کدھر سے کالے بادل آ کر آسمان پر چھا گئے کہ باہر اندھیرا گھپ ہو گیا۔ سڑک پر جلتی ہوئی بتیاں کسی وجہ سے اچانک بجھ گئیں اور میرے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ''سر! شاید آج آپ کو بس یا ٹرام ملنے میں تکلیف ہو۔ اس لیے آج آپ کو میں گھر چھوڑ کر آؤں گا۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ باہر تیز بارش ہونے لگی اور موسم اچانک سرد ہو گیا۔ میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اپنی برساتی پہن کر بیٹھ جاؤں، کچھ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب میری بات کا جواب دیئے بغیر جلدی سے اٹھے۔ کھونٹی سے میری برساتی اتار کر اسے پہنانے کے انداز میں کھول کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پہن تو لی مگر انہیں آئندہ کے لیے ایسی خدمت کرنے سے منع کر دیا۔

جب وہ میرے سامنے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے تو اس بڑے سارے کلاس روم کو باہر کے موسم نے سیل بند کر کے ہمیں بالکل تنہا کر دیا۔ ڈاکٹر ولونیکا نے کہا ''اگر آپ اجازت دیں تو ہم پڑھائی بند کر دیں!''

میں نے کہا ''ضرور! ضرور!!...... کچھ عجیب سا موسم ہو گیا ہے۔'' انہوں نے ہنس کر کہا ''کم از کم پڑھائی کے قابل نہیں رہا۔ اعتراف کے مناسب ہو گیا ہے۔''

ہم دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھے باہر ہونے والی بارش کی آواز سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

اچانک ڈاکٹر صاحب نے اپنی چمکدار آنکھیں اوپر اٹھا کر کہا ”سر! کیا میں آپ سے ایک پرائیویٹ بات کر سکتا ہوں؟ خالص پرائیویٹ بات۔ اپنی زندگی سے متعلق۔“

میں نے کہا ”ضرور ضرور، ڈاکٹر صاحب یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں، شوق سے کہیں میں گوش برآواز ہوں۔“

انہوں نے رک رک کر بڑے شرمیلے انداز میں کہا ”استاد محترم! آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور بہت زیادہ کرتا ہوں...... ایسی گہری اور شدید محبت جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔“

میں کچھ گھبرا سا گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ”آپ کی مہربانی ہے ڈاکٹر صاحب۔“

انہوں نے میری بات سنے بغیر جلدی سے کہا ”اور سر ایسی محبت بتائی بھی نہیں جاتی اور جتائی بھی نہیں جاتی...... اس میں ایک عجیب طرح کا لگاؤ ہوتا ہے۔“

ڈاکٹر ولونیکا میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں محبت بھی تھی، عقیدت اور شفقت بھی۔ مودّت اور مروت بھی، شہوت اور شرافت بھی۔ عاجزی اور سپردگی بھی۔ جیسے جھوٹا ”حال“ کھیلتا کھیلتا انسان سچ مچ ٹرانس میں چلا جاتا ہے، اسی طرح ڈاکٹر وتوریو ولونیکا میرے سامنے سبات میں بیٹھے تھے اور خوشی اور کامرانی کے جذبے سے مسکرا رہے تھے۔ میں نے کسی قدر سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب؟“

تو ڈاکٹر وتوریو ولونیکا، سیکرٹری کامرس، وزارت تجارت، فیڈرل گورنمنٹ آف اٹلی نے کہا ”جناب والا۔ آج سے ٹھیک نو برس پہلے میں مسلمان ہو چکا ہوں لیکن مجھے اس کا کوئی شاہد دستیاب نہیں ہوا۔“

میں ان کی بات بالکل نہیں سمجھ سکا اور ان کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پہلے تو محبت سے دبایا پھر تھپتھپانے لگا۔ میں نے کہا ”مبارک ہو ڈاکٹر صاحب، دلی مبارک، روحانی اور قلبی مبارک۔“

انہوں نے میرا شکریہ ادا کر کے آہستگی سے کہا ”لیکن میں اسے مکمل نہیں سمجھتا۔ اس میں ابھی گیپ ہے۔“

میں نے کہا ”گیپ گوپ کوئی نہیں ڈاکٹر صاحب۔ یہی اکمل اور اسلم مذہب ہے جو آپ نے قبول کیا اور یہی وہ دین ہے جس نے آپ کو پسند فرمایا اور کیوں نہ ہو۔“ میں نے خوشی سے ان کا کندھا تھپتھپا کر کہا ”میرے مذہب میں ایک شریف النفس، قابل قدر، صلح کل اور انسان دوست شخص کا اضافہ ہوا...... لیکن یہ سب کیسے ہوا ڈاکٹر صاحب؟“

وتوریو نے کہا ”جن دنوں میں عربی پڑھ رہا تھا اور میں نے اس زبان پر کافی دسترس حاصل کر لی تھی تو ایسے ہی شوقیہ طور پر میں نے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑے دنوں بعد زبان کا اور زیادہ مزا لینے کو میں نے ساتھ الف لیلہ کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ ایک روز قرآن پڑھتا اور دوسرے روز الف لیلہ۔ دونوں چیزوں نے مجھے بڑا لطف دیا لیکن آہستہ آہستہ الف لیلہ کے مطالعے سے میری طبیعت اچاٹ ہو گئی اور میں خالصتاً قرآن کا ہو کر رہ گیا۔“ ڈاکٹر وتوریو ولونیکا نے غور سے میری جانب دیکھا اور پھر خاموش ہو گئے۔ میں بھی نہیں بولا۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی کہنے لگے ”استاد مکرم! کیا آپ نے قرآن پڑھا ہے؟“ میں نے کہا ”بچپن میں پڑھا تھا ڈاکٹر صاحب، اس کے بعد وقت ہی نہیں ملا۔ بی اے، ایم اے کی تیاری میں لگے رہے۔ اب ارادہ ہے کہ جونہی فرصت ملے گی قرآن ضرور پڑھنا ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا ”آپ کے پاس یہاں ہے کہ میں لا دوں؟“

میں نے کہا ”نہیں۔ میرے پاس ہے ایک حمائل شریف۔ میری ماں نے چلتے وقت دی تھی لیکن میں اسے کھول نہیں سکا۔ یہاں بھی وقت نہیں ملتا ڈاکٹر صاحب۔“

باہر بارش کافی تیز ہو گئی اور آسمان پر گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ بجلی چمکنے کے وقفے لمبے ہونے کی وجہ سے آسمان اور بھی تاریک ہو گیا تھا اور ہمارے کلاس روم کی خاموشی اور بھی بڑھ گئی تھی۔

ڈاکٹر وتوریو ولونیکا نے کہا ”جوں جوں میں قرآن پڑھتا تھا، میرے ذہن کے جالے اتر رہے تھے۔ جو چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی، جہاں جہاں کوئی سِرّی رمز ہوتی تھی، اس سے روح کی ذات میں بالیدگی پیدا ہو جاتی تھی۔“

ڈاکٹر ولونیکا نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے پوٹے جوڑ کر کہا ”روح کی باقاعدہ ایک ذات ہوتی ہے سر! اور یہ ذات باہر کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اس کی صحت ”جسمانی“ قائم رکھنے کو اسے سِرّی رموز سے وابستہ رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس کی خوراک اور اس کے تغذیے کا منبع ”لامعلوم“ میں ہوتا ہے اور اس کی ڈرپ لامعلوم کے گلوکوز کی تھیلی سے بندھی ہوتی ہے۔“

اس نے میرا منہ تحیر سے کھلا دیکھ کر کہا ”سیدھی سی بات ہے سر کہ انسانی فہم و دانش کی آبیاری قرآن کے مضمون اور متن سے ہوتی ہے اور انسانی روح کی ساری ”فرش منٹ“ حروف مقطعات سے اور نہ سمجھ میں آنے والی آیات سے جڑی ہوئی ہے۔ لامعلوم سے وابستہ ہے...... یہ ”لامعلوم“ کی کائنات، معلوم سے بھی بڑی اور اس سے بھی گہری ہے۔ اس کی کوئی تھاہ ہی نہیں۔“

میں نے اس کی بات نوٹ تو کر لی لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ میرے حساب سے تو لامعلوم کوئی شے ہی نہیں تھی۔ نہ قابل لمس نہ قابل محسوس نہ کوئی مرئی نہ غیر مرئی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کو یونہی ہاں ہاں کر دیا اور شاید وہ بھی کسی حد تک میری ہاں ہاں کو سمجھ گیا۔

کہنے لگا ”وہ رات بھی تقریباً ایسی ہی تھی۔ اسی قدر تاریک اور ایسی ہی گمبھیر لیکن اس وقت سے تھوڑی سی آگے تھی۔ رات کا ایک یا ڈیڑھ بجا ہو گا۔ میری بیوی اور بچہ دونوں گہری نیند سو رہے تھے اور ان بیچاروں کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور ذرا سی دیر بعد خود میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے...... میں نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور آہستگی سے چلتا ہوا لفٹ کے سامنے سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ بڑی گربہ پائی سے جب میں اپنی عمارت کی ساتوں منزلیں طے کر کے کوٹھے پر پہنچا تو وہاں بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ چھت پر امڈا ہوا پانی پرنالوں کے اندر چنگھاڑتا ہوا داخل ہو رہا تھا لیکن اب بھی چھت پر اس کی سطح تین تین چار چار انچ بلند تھی اور ابھی اس میں اور پانی جمع ہو رہا تھا۔“

میں اپنے جوتے اتار کر چھت کے عین درمیان میں جا کھڑا ہوا اور منہ اوپر اٹھا کر بولا ”اے سمیع و بصیر اور اے علیم و خبیر تو جانتا ہے کہ میں ملک میں اور اس شہر میں اکیلا ہوں اور یہاں کوئی میرا محرم اسرار نہیں۔ میں تیرے ان مظاہر کو،

اس بادل، بجلی، بارش اور موسم کو گواہ بنا کر تیرے پسندیدہ دین اسلام میں داخل ہوتا ہوں اور اپنے آپ کو تیرے سامنے پیش کر کے عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان مشکلات کے برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمانا جو مسلمان بننے کے بعد مجھ پر اپنا بوجھ ڈالیں گی...... تو جانتا ہے کہ میں ایک بہت ہی کچا اور بے حد بودا مسلمان ہوں اور تیرے فضل کے بغیر اگلا سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اس لیے مجھ پر خصوصی عنایت فرمانا اور اس عنایت کو آگے سے آگے پھیلاتے جانا۔"

ڈاکٹر ولونیکا نے کہا" میری اس تبدیلی مذہب پر مجھے کسی مظہر قدرت سے تو کوئی نشانی نہ ملی البتہ وہاں کھڑے کھڑے میری آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی کہ بارش کے پانی میں میری آنکھوں کا پانی بھی شامل ہونے لگا۔ جب میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر چھت پر نیچے اپنی پہلی منزل پر آیا تو میرے فلیٹ کے کھلے دروازے پر میری بیوی اور بیٹا کھڑے تھے اور ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔"

ڈاکٹر ولونیکا نے تھوڑی دیر توقف کے بعد کہا" ان دونوں کے ساتھ میرا کیا ناطہ ٹھہرا، یہ ایک الگ کہانی ہے لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب ان کو بھی پتہ چل گیا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد مجھ میں کچھ خوشگوار تبدیلیاں ہی پیدا ہوئی ہیں۔"

باہر بارش کی یورش قدرے کم ہو گئی تھی۔ سڑک کی روشنیاں بھی لوٹ آئی تھیں اور کلاس روم کے اندر کا فضائی دباؤ بھی نارمل ہو گیا تھا۔ میں نے کہا" ڈاکٹر صاحب! میرے لیے تو آپ کی عطا کردہ یہ خبر بہت بڑی تقویت کا باعث بن گئی ہے کہ اب اس درسگاہ میں میں اکیلا نہیں۔"

انہوں نے کہا" اب جس مقصد کے لیے میں نے آپ کو یہ روداد سنائی ہے، اسے آخری ٹچ دینے کے لیے میری مدد کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکستان سے اسی کام کے لیے بھیجا ہے۔"

میں نے کہا" فرمایئے! میں حاضر ہوں۔"

کہنے لگے" میں آپ کی موجودگی میں، آپ کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار اور اعلان کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو اس میں شاہد بنانا چاہتا ہوں کہ بغیر شہادت کے نیت اعلان کا درجہ اختیار نہیں کرتی۔"

میں نے کہا" ڈاکٹر صاحب، مجھے تو کسی کو مسلمان کرنا نہیں آتا۔ نہ تو آج تک میں نے کسی کو مشرف بہ اسلام کیا ہے اور نہ ہی میں اس کے آداب سے واقف ہوں۔ بس جس طرح سے آپ نے کر لیا، وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

کہنے لگے" آپ کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا جس طرح آپ ہیں، اسی طرح رہیں گے۔ فقط روز حشر تک اس حقیقت کے گواہ رہیں گے۔"

پھر انہوں نے قدرے اونچی آواز میں اعوذ باللہ...... اور بسم اللہ پڑھنے کے بعد ایک سورت کی تلاوت کی۔

اور آخر میں کہا" یا اللہ! یا رب کعبہ میں وتوریو ولونیکا اپنے استاد محترم اشفاق احمد کے سامنے تیرے وحدہ لاشریک ہونے کا اعتراف کرتا ہوں اور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی برحق اور نبی آخر الزماں تسلیم کرتا ہوں۔ اس کے ساتھ میں تیرے فرستادہ نبیوں، تیرے فرشتوں اور روز قیامت پر ایمان لا کر محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت

میں داخل ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔"

پھر ہم دونوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور ایک دوسرے کے لیے ایمان کی سلامتی اور دین و دنیا میں سرخرو ہونے کی دعائیں مانگیں۔

ڈاکٹر وتوریو ولونیکا پورے ڈیڑھ سال مجھ سے سبق لیتے رہے اور باقاعدگی کے ساتھ کلاس روم میں آتے رہے۔ آخر شام چونکہ پوری انسٹی ٹیوٹ میں ہم دونوں ہی ہوتے، اس لیے مغرب کی باجماعت نماز باقاعدگی سے ادا کر کے اور بڑا دروازہ بھیڑ کے اپنے اپنے گھر جاتے۔ بس یہی ایک نماز تھی جو میں نے باقاعدگی کے ساتھ ڈیڑھ سال تک روم میں پڑھی لیکن ڈاکٹر ولونیکا کے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ پھر بھی مجھے تقریبوں اور تہواروں میں ملتے رہے لیکن ہمارے درمیان کوئی باقاعدہ ربط نہ رہا۔

انہی ایام میں میں نے نقوش کے لیے ایک افسانہ" گلہ بان" کے عنوان سے لکھا لیکن آدھی مسافت طے کرنے کے بعد میں نے اس کا نام" چرواہا" کر دیا لیکن افسانہ بھجوانے سے پہلے جب میں نے اس پر نظرثانی کی تو چرواہا کاٹ کر اس کا نام" گڈریا" کر دیا۔

یہ افسانہ پاکستان پوسٹ کر دینے کے بعد مجھے اس وہم نے گھیر لیا کہ افسانہ اچھا نہیں ہے اور اس کی بنت میں جھول رہ گیا ہے۔ کہانی میں ڈاکٹر وتوریو ولونیکا میرے مڈل سکول کے استاد لالہ بھگت رام اور گیانی جی کی جھلک ضرور ہے لیکن اس میں ان کی ہوت نہیں ہے۔ میں نے فوراً ایک خط محمد طفیل کو لکھا کہ افسانہ روک لیں، یہ ترمیم طلب ہے۔ اسے ٹھیک کر کے آپ کے پاس بھیجوں گا لیکن ان کا جواب آیا کہ اب تو بڑی دیر ہو گئی، فرمے چھپ رہے ہیں۔

چند دنوں میں رسالہ چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا۔ کوئی ایک ماہ بعد محمد طفیل نے رسالے میں چھپا ہوا افسانہ کاٹ کر مجھے بھیج دیا اور ساتھ ہی ایک مختصر سا خط لکھا کہ افسانہ اچھا رہا، لوگوں نے پسند کیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا، اس کی کوتاہیوں پر لوگوں کی نظر نہیں گئی...... یہ کہانی میں نے ڈاکٹر وتوریو ولونیکا کو پڑھنے کے لیے دی تو انہیں بہت ہی پسند آئی۔ کہنے لگے" کاش میرا کردار بھی داؤ جی جیسا ہوتا۔" میں نے کہا" آپ تو ون اپ ہیں کہ منزل پر پہنچ بھی گئے، وہ ابھی تک ابن السبیل ہیں۔"

---

(6)

روم، جس کو گھر کے اور باہر کے بھی لوگ "چتا ایتر نا" یعنی شہر ازل کہہ کر یاد کرتے ہیں اور اسے کرۂ ارض پر سب سے پہلے آباد ہونے والا شہر قرار دیتے ہیں۔ یہ خوبصورت بھی ہے اور پرشکوہ بھی، اونچائیوں اترائیوں اور باغوں بہاروں والا بھی اور کھنڈروں، خرابوں اور ویرانوں والا بھی۔ اسی کے لیے تو حکم ہے کہ میری زمین کی سیر کرو۔

ایسے خوبصورت، دلاویز اور تاریخی شہر کے اندر اس کی یونیورسٹی بھی کس آن بان کی ہوگی۔ آپ اس کا اندازہ آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن اس یونیورسٹی کے سٹاف روم کے بارے میں آپ کا قیاس بہت دور تک آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا کہ ہم پرانا سٹاف روم چھوڑ کر نئے میں منتقل ہو گئے تھے اور نیا سٹاف روم ویسا نہیں تھا جیسا آپ نے سوچا تھا۔ وہ تاریخی ضرور تھا لیکن آج کی تاریخ کا۔ اس کا روحتہ الکبریٰ کی پرانی تاریخ سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن تھوڑی دیر اس سے مانوس ہونے کے بعد اس کی ہیئت تبدیل ہو جاتی تھی اور یہ پرانی تاریخ کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔ آپ نے نفسیات کی کتابوں کے "ادراک" کے باب میں بہت سی ادراکی ضلالت کی تصویریں دیکھی ہوں گی جو کبھی عورت نظر آتی ہے، کبھی گلدان، کبھی زینہ اور کبھی چھینٹے دار رومال۔ بس یہی حال ہمارے نئے سٹاف روم کا تھا۔ جولیس سیزر کے زمانے کا بھی لگتا تھا اور موسیولینی کے اندھا دھند دور کا بھی۔

شعبہ فزکس کے صدر پروفیسر فیرا کوتی، شعبہ ہسپانوی کے پروفیسر بائنی کے پروفیسر اور ارضیات کے پروفیسر اپنے اپنے مطالعے میں مستغرق تھے اور میں اپنی سیٹ پر بیٹھا کتابت کی مشق کر رہا تھا۔ اس زمانے میں چوڑے خط کے مارکر نئے نئے آئے تھے۔ ان سے اردو بڑی اچھی لکھی جاتی تھی اور آپ سے آپ لکھی جاتی تھی۔

میں آسمانی کاغذ پر گہرے نیلے مارکر سے غالب کا شعر لکھ کر اسے سجا رہا تھا کہ اگلے روز باؤ سانی کو دوں گا کہ سینورینا چپسالی عین میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور غور سے عمل کتابت کا نظارہ کرنے لگی۔ میں نے نگاہیں اوپر اٹھا کر جو دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا "پروفیسر! میں معافی چاہتی ہوں، کیا یہ حقیقت ہے کہ آپ کے ملک میں لوگ ابھی تک ضعیف الاعتقاد ہیں اور بھوت پریت، جادو ٹونے اور تعویذ گنڈے پر ایمان رکھتے ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے ملک میں

ہر تیسرا امکان آسیب زدہ ہوتا ہے اور اس کے مکین موری کے راستے اس میں داخل ہوتے ہیں؟ کیا آپ ہر کام کرنے سے پہلے پتری کھلواتے ہیں اور شگون سے کام لیتے ہیں۔ کیا آپ ایسی دھوتی باندھتے ہیں جو آگے سے کھلی ہوتی ہے اور اس میں کوئی زپ نہیں ہوتی؟ کیا یہ درست ہے کہ آپ کے گھروں میں سانپ، گوہ، ساہنے، نیولے پالتو جانوروں کے طور پر رکھے جاتے ہیں اور گھر کے سب لوگ ان سے بڑا پیار کرتے ہیں۔

سینورینا چپسالی باوجود اس کے کہ سارے بڈھے پروفیسروں کی آنکھ کا تارا تھی اور پوری یونیورسٹی کے لڑکوں کی نگاہوں کا مرکز اور لڑکیوں کے دلوں کی پھانس تھی، ایک معمولی لائبریری اسسٹنٹ ہونے کے باوصف یونیورسٹی سنڈیکیٹ سے کوئی سا بھی کام لے سکتی تھی۔ چپسالی اس وقت کے روم کی اتنی خوبصورت لڑکی تھی کہ کسی کو اس سے محبت کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کی ٹکر کی ایک اور لڑکی بھی ہمارے روم میں تھی لیکن وہ جینا لولو برجیڈا کے نام سے فلموں میں چلی گئی۔

میں نے اپنے مارکر کی کیپ لگا کر اور کتابت کی کاپی بند کر کے پورے اعتماد سے کہا "سینورینا چپسالی! یہ سب کچھ جو آپ نے سنا ہے یا کہیں پڑھا ہے، محض بکواس ہے اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ میرا ملک بلاشبہ ایک نوزائیدہ ملک ہے لیکن اس کی تاریخ ہزاروں لاکھوں سال پرانی ہے۔ ہم لوگ نہ تو ضعیف الاعتقاد ہیں اور نہ ہی غیر طبعی، غریب اور وہمی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں نہ تو کوئی بھوت رہتا ہے اور نہ ہی یہاں کسی آسیب کا مسکن ہے۔ جادو ٹونا، تعویذ گنڈا نہ تو انسان کے کسی کام آ سکتا ہے اور نہ ہی اس کا وار کسی انسان پر چل سکتا ہے۔ یہ سب خیالی چیزیں ہیں جو پرانے مصنفوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کا دل بہلانے کو اختراع کی تھیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ میرے ملک کے پالتو جانور بلی، کتا، گھوڑا، گائے، شکرے، باز، شہباز ضرور ہیں لیکن جن حشرات کا تم نے نام لیا ہے، ان کو ہم نے مداریوں کے سوا اور کہیں نہیں دیکھا۔ میرے ملک کے ایک حصے میں دھاری دار شیر ضرور ہوتا ہے اور میرے مشرقی پاکستان کے عزیز اور رشتہ دار بنگال ٹائیگر ضرور پالتے ہیں اور ہاتھیوں سے سواری کا کام بھی لیتے ہیں لیکن اور کسی جانور کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے...... سینورینا چپسالی! یہ جو تمہارے ذہن میں سری اور رمزی اور مشکوک قسم کے خیالات ہیں، ان کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اسرار آمیز باتیں سب خیالی اور قیاسی ہیں، ان کی بنیاد کوئی نہیں۔ اساس کچھ بھی نہیں۔"

سینورینا چپسالی میری لمبی بات سننے کے بعد ایک مرتبہ پھر مسکرائی اور سر ہلا کر کہنے لگی "سوری پروفیسر! میرا مطلب آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا، صرف معلومات حاصل کرنا تھا اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ یہ سب قیاس اور خیالی چیزیں ہیں اور ان کا کم از کم اس دنیا میں کوئی وجود نہیں...... کاش آپ مجھے پہلے ملے ہوتے تو میرے ذہن کی ساری گرہیں کھل چکی ہوتیں اور میں شانت سروپ زندگی گزار رہی ہوتی لیکن افسوس آپ بڑی دیر کے بعد ملے۔ پھر بھی شکر ہے کہ آپ ملے تو سہی۔ آپ کی بڑی مہربانی اور اس وضاحت کا دلی شکریہ۔"

چپسالی اپنی اونچی ایڑھی کو سٹاف روم کے چوبی فرش پر کڑے کوکڑے سے بجاتی ہوئی نکل گئی تو پروفیسر فیرا کوتی نے اپنی عینک کے ہلالی شیشوں سے نگاہیں اوپر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور پھر کافی دیر تک دیکھتے چلے گئے۔ سٹاف روم

کے دوسرے حاضرین نے ہماری باتوں کو بالکل نہیں سنا تھا مگر پروفیسر فیراکوتی اس ڈائیلاگ میں ہمہ تن گوش رہے۔ انہوں نے مجھے مخاطب کر کے دھیمی آواز میں کہا ''آپ نے چسپالی کے نا ملائم سوالوں کا جس خوش اسلوبی سے جواب دیا، وہ آپ جیسا ذہین، پُراعتماد اور صاحب نظر استاد ہی دے سکتا ہے۔''

میں نے سر جھکا کر اور عقیدت کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر پروفیسر فیراکوتی کا شکریہ ادا کیا اور ان کی عظیم شخصیت کے سامنے اپنے آپ کو نخنی ثابت کرنے کے لیے کچھ ٹوٹے پھوٹے جملے ادا بھی کیے لیکن وہ ان کی حوصلہ افزائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔

پروفیسر فیراکوتی نے اپنی عینک اتار کر کھلی ہوئی کتاب میں رکھتے ہوئے کہا ''آپ نے جس ایمان واعتبار کے ساتھ ایک حتمی انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیا، وہ ایک صاحب نظر اور صاحب کشف ہی دے سکتا تھا۔ ایک عام پڑھا لکھا انسان ایسے یقین اور وثوق کے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا جو آپ نے فرمایا۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے درمیان ایک نوجوان شریک کار ایسا بھی ہے جو آفاقی اسرار و رموز سے گہری واقفیت رکھتا ہے اور کھل کے ان کا اظہار کرتا ہے۔''

پروفیسر صاحب کی یہ بات سن کر میں سکتے میں آ گیا اور چند لمحوں تک گم سم اور ساکت و صامت اپنے سامنے تکتا رہا۔ پھر اپنی خفت ٹالنے کی غرض سے میں نے ان سے پوچھا۔ ''اگیر یجو پروفیسورے! کیا آپ جن بھوت اور پری پریت پر ایمان رکھتے ہیں اور کیا آپ کے خیال میں آسیب اور آسیب زدہ مقامات ہوتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہماری اُس دنیا میں سپر نیچرل کا کوئی عمل دخل ہے؟''

انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''ہم لوگ چونکہ سائنس کے طالب علم ہیں اور ہمارا تعلق سائنس کے شعبہ طبیعات کے ساتھ ہے، اس لیے ہم اس آسانی کے ساتھ ان ساری باتوں کا بطلان نہیں کر سکتے۔ جن باتوں کو آپ نے محرم اسرار ہونے کی بنا پر غلط اور نادرست قرار دیا ازحتمی اور قطعی طور پر انہیں رد کر کے ان کی تکذیب کی...... ویسے میں خوش ہوں کہ روم یونیورسٹی کو ایک قابل اور قابل اعتماد استاد میسر آیا جس سے ان کے ساتھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔''

میں نے بہت سا حیران ہو کر اور کسی قدر ہلکے سے چڑ کر کہا ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جنوں، بھوتوں، پریوں، چڑیلوں، آسیب زدہ مسکنوں اور فوق الفطرت عناصر پر ایمان رکھتے ہیں اور توہم پرستی کے ماننے والے ہیں اور فوق العادہ کے قائل ہیں۔''

انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا ''ہم چونکہ تجرباتی سائنس دان ہیں اور تجربیت پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے ہم کسی بات کا معائنہ، مطالعہ اور تجربہ کیے بغیر اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ اب تک چونکہ ہم نے جنوں، بھوتوں اور فوق العادہ پر کوئی تجربہ نہیں کیا اور ان کو اپنی لیبارٹری میں لے جا کر جانچا پرکھا نہیں، اس لیے ہم ان پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتے۔ ان کو درست یا نادرست نہیں کہہ سکتے...... آپ کا علم چونکہ بہت وسیع ہے اور آپ کی نظر چونکہ امکان اور لامکاں سے بھی آگے ہے، اس لیے آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب فضول ہے، بکواس ہے۔ ایسی چیزوں کا کوئی وجود نہیں، کوئی امکان نہیں، کوئی مقام نہیں۔''

مجھے پروفیسر فیراکوتی کی بات سن کر زبردست دھچکا لگا اور میں سوچنے لگا کہ ایز یکو فیرمی کی سیٹ پر بیٹھ کر کام کرنے والا یہ استاد کیسا سادہ لوح ہے کہ اس کو معلومات عامہ کی ایک سادہ سی بات بھی معلوم نہیں!

دو راتیں اور ایک دن بڑی چنتا اور دبدھا میں گزرے کہ یا اللہ اتنے بڑے پروفیسر کو اتنی سی بات بھی معلوم نہیں کہ فوق العادہ باتیں ذہن کی اختراعیں، نامعلوم کے خوف اور کم کوشی کے جواز ہیں، ان کی اصل کچھ بھی نہیں۔ میرا منہ تو نہیں لیکن اگر مجھے معاف کر دیا جائے تو میں یہ کہنے سے بھی گریز نہیں کروں گا کہ یہ سارا وقت سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی کے تتبع میں گزرا لیکن تیسرے روز میں نے پروفیسر فیراکوتی کو ان کی فزکس لیبارٹری میں جا پکڑا۔

وہ اس وقت کتھئی رنگ کے مگ میں ایسپریو کافی پی رہے تھے اور اپنے سامنے رکھے ہوئے بلور کے آلات کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے مخل ہونے کی معافی چاہی تو انہوں نے کمال مہربانی سے میرے لیے بھی کافی کا ایک مگ بنوالیا اور کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہنے لگے ''یوں تو بارش کے آثار بڑے واضح اور نمایاں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ بارش ہوگی نہیں، یہ ابر پھٹ کر معدوم ہو جائے گا۔''

میں نے کہا ''اگیر یجو پروفیسورے! مجھے آپ کی پرسوں کی بات نے بڑا پریشان کر رکھا ہے اور میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں کہ مرئی کے مقابلے میں ایک غیر مرئی وجود کس طرح سے اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے اور ''ہونے'' کے مقابلے میں ''نہ ہونا'' کیسے ترازو کے تول تل سکتا ہے...... اور وہ کونسی بیہودہ سائنس ہے جس نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ غیر موجود بھی موجود کی طرح ویسی ہی ماہیت رکھتا ہے اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے اپنا کافی کا مگ تو میز پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں تیزی سے رگڑتے ہوئے بولے ''بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مرئی کے مقابلے میں غیر مرئی کا وجود زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس کائنات میں ''شے'' کے مقابلے میں ''لاشے'' اور Something کے مقابلے میں Nothing زیادہ ہے حالانکہ بظاہر Nothing کچھ بھی نہیں اور...... Something بہت کچھ ہے۔''

میں نے کہا ''پرسوں آپ نے حیران و پریشان کر کے روانہ کیا تھا، آج آپ ذلیل و خوار کر کے بھیجیں گے۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟''

میری بات سن کر ہنسنے لگے اور دیر تک مسکراتے رہے۔ پھر اپنی ہلالی عینک اتار کر بولے ''پروفیسر صاحب! آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ دونوں میں سے کون طاقتور ہے؟ وہ جو ہمیں نظر آتا ہے یا وہ جو ہمیں نظر نہیں آتا۔ مرئی تگڑا ہے یا غیر مرئی؟''

میں احمقوں کی طرح ان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا تو انہوں نے کہا ''اس کا سیدھا، واضح اور بین جواب تو یہی ہے کہ جو شے نظر آتی ہے اور سامنے ہے اور مقابلے میں کھڑی ہے، وہ یقیناً نظر نہ آنے والی شے سے زیادہ طاقتور اور زیادہ قوی ہے...... اگر ہم اپنے اردگرد کی دنیا کا مطالعہ کریں اور مشاہدے میں دور تک اتر جائیں تو ہم آپ سے آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ جو چیز نظر نہیں آتی، وہ نظر آنے والی شے سے زیادہ طاقتور ہے۔''

میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ انہوں نے بے حد ملائم آواز میں کہا ''ذرا ہوا پر نظر ڈالیے۔ آپ کے اردگرد، دائیں بائیں، اوپر نیچے موجود۔ اس کا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا، نہ وجود نہ جسم نہ ہیئت نہ ہیولا اور جو اس کو جانچ کے دیکھیں تو ہوا سے زیادہ قوی اور شے اس کائنات میں موجود ہی نہیں۔ اس میں وافر مقدار میں آکسیجن موجود ہے جو چرندوں، پرندوں، حیوانوں اور جان داروں کو زندگی کی بنیاد مہیا کرتی ہے۔ اسی ہوا کے اندر کاربن ڈائی آکسائیڈ موجود ہے جس پر نباتات کی زندگی اور نشوونما کا دارومدار ہے...... ہر جگہ موجود ہے مگر نظر نہیں آتی۔ ہر وقت حاضر ہے مگر دکھائی نہیں دیتی...... ہمارے ہر کام کو نمٹانے کے لیے اس کا ہونا ضروری ہے۔ کسی کو محبت نامہ لکھنا ہو، کسی کی یاد میں رونا ہو، کسی کا بوسہ لینا ہو، بغلگیر ہونا ہو، قتل کرنا ہو، خودکشی کرنی ہو، گالی دینی ہو، ہنسنا ہو، حکم دینا ہو، معافی مانگنی ہو، بے وفائی کرنی ہو، بدمعاشی کرنی ہو۔ ہمیں ہر حال میں ہوا کی ضرورت ہے۔ کام کرنے سے پہلے کام کرنے کے دوران اور کام کرنے کے بعد۔ اگر اس کی وافر سپلائی موجود نہیں ہوگی تو سب کام دھرے رہ جائیں اور ان کے ساتھ آپ بھی دھرے پڑے ہوں گے...... ہوا بالکل نظر نہیں آتی لیکن زندگی کا سارا انحصار ایک اسی غیر مرئی Commodity پر ہے۔''

میرا خیال ہے پروفیسر صاحب کے ذہن میں وہی پرسوں والی بات موجود تھی اور وہ مجھے قائل کرنا چاہتے تھے کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا، وہ سائنسی اعتبار سے بھی درست تھا۔ مجھے صم بکم بیٹھا دیکھ کر انہوں نے میری تسلی کے لیے پھر کہنا شروع کیا کہ ''اس وقت آپ کے ذہن میں یہ خیال بار بار اٹھ کر آپ کو مجھ سے بھڑانا چاہتا ہے کہ چلو یہ تو ٹھیک ہے کہ ہوا نظر نہیں آتی اور اس کی ناموجودگی زندگی کو ختم کر سکتی ہے لیکن ایک جسمانی شے کے بارے میں آپ کا خیال ہے۔ ایک ایسی شے جو جسم رکھتی ہے۔ وجود رکھتی ہے۔ نظر آتی ہے، محسوس ہوتی ہے، چھوئی جا سکتی ہے۔ یہ مثلاً یہ کمرہ ہی ہے، فزکس لیبارٹری کا دفتر۔ اگر اس کی چھت گر پڑے تو وہ آپ کو آن واحد میں ہلاک کر دے گی۔ سانس گھٹ کر مرنے سے بہت پہلے، فٹافٹ، ایک سیکنڈ میں، لینٹر گرا اور آپ ختم! سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا!''

میں ان کی یہ بات سن کر بہت خوش ہوا۔ واقعی میرے ذہن میں اسی قسم کا سوال یا اسی قسم کے سوال جنم لے رہے تھے۔

پروفیسر فیراکوتی نے فرمایا ''لیکن پروفیسر صاحب یہ چھت گرے گی کیوں بھلا؟ کوئی تو ایسی شے ہے جس نے اس چھت کو گرنے پر مجبور کیا۔ کسی چیز نے تو اتنے بھاری لینٹر کو کھینچا، کسی نے تو اس بستی رستی چھت کو زمین بوس کیا۔ اب اس پر نظر کیجیے، اس کو بھی دیکھ لیجیے وہ بھی نظر نہیں آئے گی اور وہ نظر نہ آنے والی شے ''کشش'' ہے...... ''گریوٹی......!''

''اگر یہ غیر مرئی کشش نہ ہوتی تو ساری کی ساری ٹوٹ جانے والی چھت کبھی نیچے نہ گرتی۔ کبھی کسی کی موت کا باعث نہ بنتی۔ ٹوٹ جاتی، ریزہ ریزہ ہو جاتی لیکن نیچے کبھی نہ گرتی۔ اس جگہ اسی طرح سے قائم رہتی۔''

میں نے کبھی کشش ثقل کی اس اندھی طاقت پر غور ہی نہ کیا تھا۔ ہوا کی طرح یہ بھی میری زندگی سے الگ کوئی چیز تھی۔ آنے سے پہلے میرا ان دونوں سے کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے میں ان سے بے تعلق ہو کر زندگی گزار رہا تھا۔

پروفیسر فیراکوتی نے کہا ''اور یہ روشنی کیا ہے؟ اس کی ہیئت ترکیبی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ روشنی کو دیکھ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی روشنی کو دیکھا ہے؟ بالکل نہیں، کبھی بھی نہیں...... روشنی بھی ایک غیر مرئی شے ہے۔ خود نظر نہیں آتی لیکن جب کسی شے پر منعکس ہوتی ہے تب اس کا پتہ چلتا ہے۔ پھر ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے اثرات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ سیدھے روشنی کو نہیں دیکھ سکتے۔''

کہنے لگے ''بجلی کے بلب کو ہم دملتا ٹمٹماتا دیکھ سکتے ہیں۔ اسے روشن صورت میں دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی روشنی نہیں دیکھ سکتے جب تک وہ کسی دیوار، کسی شخص، کسی کرسی میز، کسی کمرے، درخت، میدان، پہاڑ سے نہ ٹکرائے۔ ہم روشن بلب یا روشن مشعل کو تو دیکھ سکتے ہیں لیکن اس سے نکلنے والی روشنی کو سفر کرتے نہیں دیکھ سکتے کہ اب یہاں پہنچی۔ اب ادھر کو مڑی۔ اب وہاں رکی، اب پھر روانہ ہوئی۔

اگر سورج اس زمین کو روشن کرتا ہے، اس کرۂ ارض کو دمکاتا ہے تو سورج سے زمین تک کا درمیانی فاصلہ بھی روشن ہونا چاہیے لیکن ایسے نہیں ہے۔ خلا سارے کا سارا تاریک ہے لیکن روشنی اس کے اندر سے گزر کر سطح زمین کو منور کر رہی ہے۔ ہر جگہ روشنی پھیلاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ روشنی کی لہریں غیر مرئی ہیں اور وہ اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتیں جب تک کہ کسی شے سے نہ ٹکرائیں یعنی جب تک زمین کی اس فضا پر منعکس نہ ہوں، جو فضا ہماری پیاری غیر مرئی سہیلی ہوا نے قائم کی ہے اور جس کو ہماری محبوب غیر مرئی کشش نے تھام کے رکھا ہے۔

اسی طرح سے ہم گرمی کو بھی نہیں دیکھ سکتے، محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔ یہی حال سردی کا ہے۔ آپ کسی کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ کمرہ کس قدر گرم یا کس قدر ٹھنڈا ہے۔ عین اسی طرح سے ہم بھی اپنے اندر جھانک کر ان طاقتور محرکوں کو نہیں دیکھ سکتے جنہوں نے ہماری زندگیوں کے اندر ایک طوفان اٹھا رکھا ہے۔ محبت، نفرت، طمع، خوف، خواہشیں، لوبھ، موہ، اہنکار، ہمدردی، ایثار، خوبی، خرابی وغیرہ یہ سب ہیجان اور جذبے جو ہمارے اندر ابلتے ہوئے لاوے اور پھیلتے سمٹے جوار بھاٹے کی شکل میں ہر وقت سرگرم عمل ہیں، سارے کے سارے غیر مرئی ہیں اور ان جذبوں کی طاقت اور ان کا تصادم ملاحظہ کرتے ہو؟ ان غیر مرئی نظر نہ آنے والے جذبوں کا ٹکراؤ اور ان کی وحشت ناک ٹکر!''

پروفیسر فیراکوتی نے اپنا مگ اٹھایا اور کافی کا ایک بھرپور گھونٹ بھر کر بولے ''یوں تو میں اپنی کافی ہمیشہ بغیر چینی کے پیتا ہوں لیکن کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ خوب میٹھی کافی پیوں اور چٹخارے لے کر اپنا مگ ختم کروں۔''

یہ بات انہوں نے میرا خوف دور کرنے کے لیے کی تھی۔ وہ خوف جو ان کی باتوں کا سامنا کرنے سے میرے سارے وجود پر طاری ہو گیا تھا اور میں بلّلا سا ہو کر ان کے سامنے سر ڈالے بیٹھا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر کی کچھ اور باتیں بھی کیں لیکن میں واپس اپنے محور پر نہ پہنچ سکا۔ پھر انہوں نے یونیورسٹی کے کچھ سکینڈل سنائے لیکن ان میں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

---

(7)

ستی مردیاتی سوریو بذدیو بڑے دنوں بعد ملی۔ وہ کچھ پژمردہ اور مضمحل سی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "چلو سامنے چل کر بنچ پر بیٹھتے ہیں۔ بہار آ رہی ہے اور درخت رنگ بدل رہے ہیں۔ گلہریاں بھی نیند سے بیدار ہو کر واپس آ گئی ہیں اور بہت خوش ہیں۔ میرے پاس شاہ بلوط کی گرم گرم گریاں ہیں جو میں نے راستے میں تمہارے لیے خریدی تھیں۔ پہلے کے مقابلے میں سستی ہو گئی ہیں۔"

ہم دونوں بنچ پر جا کر بیٹھ گئے لیکن اس نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا۔ دوسرے ہاتھ سے اپنا پرس کھول کر مشکل سے شاہ بلوطی گریوں کا لفافہ نکالا اور مجھے دیتے ہوئے بولی "اب انہیں ساتھ ساتھ چھیلنا تمہارا کام ہے۔" میں نے کہا "میں انہیں شوق سے چھیلوں گا اور ایمانداری کے ساتھ کھاؤں گا۔ ایک اپنے لیے ایک تمہارے لیے۔"

لیکن ان موٹے تڑخے ہوئے چھلکوں کو ایک ہاتھ سے چھیلنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ ہم بڑی دیر تک اسی طرح ساکت وصامت بیٹھے ان رنگ برنگی گاڑیوں کو دیکھتے رہے جن میں نومولود بچے لپٹے لپٹائے پڑے تھے۔ ان میں سے کچھ سوئے ہوئے ہوں گے اور کچھ کی آنکھیں کھلی ہوں گی اور وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں اور چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے ان فرشتوں سے باتیں کر رہے ہوں گے جو ہم کو نظر نہیں آتے۔ کچھ نوجوان جوڑے بھی بنچوں پر ایک دوسرے سے بغلگیر بیٹھے محبت کی کھلاڑیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے کئی تو محبت کی گھلاوٹ میں آ کر پگھل سے گئے تھے اور اپنے اپنے طریق پر نیم دراز ہو گئے تھے۔

پارک میں موجود دوسرے لوگوں میں میرے انہماک کو دیکھ کر ستی مردیاتی نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا اور میرے ہاتھ کو اور مضبوطی سے پکڑ کر اسے بل دینے لگی۔ میں نے اس کو اس کیفیت میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک جذباتی اور سادہ لوح سی لڑکی ضرور تھی لیکن اس کے چہرے پر ہر وقت خوشگواری کا ابٹن سا لگا رہتا اور ماتھے اور آنکھوں پر مسکراہٹ کا نٹ تار رہتا۔ آج اس کو اس حالت میں دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا اور میں نے اس کے ماتھے، گال، آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا "کیا ہو گیا ستی؟ کیسی افتاد پڑی اور کیا حادثہ گزرا جو اس طرح سے ہلکان ہو رہی ہو؟"

اس نے میرا پکڑا ہوا ہاتھ اور شدت سے مروڑنا شروع کر دیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "میری ماں مر گئی اشفاق اور میں اس بھری پڑی دنیا میں ایک تار آ جانے سے بالکل اکیلی ہو گئی۔ بالکل تنہا، ہمیشہ کے لیے بے یار و مددگار۔"

وہ میرے ساتھ چمٹ گئی اور کافی اونچی آواز میں رونے لگی۔ سامنے بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے نے اخبار پیچھے ہٹا کر ہمیں تھوڑی دیر کے لیے دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے لگا۔ اس کے قریب ایک بڑی تناور بڑھیا سویٹر بن رہی تھی، اس نے بھی سلائیاں روک کر ہمیں دیکھا اور پھر دیکھتی چلی گئی۔

میں کافی دیر تک ستی کو تھپکتا رہا اور وہ بڑی دیر تک میرے کندھے پر سر رکھے سسکیاں لیتی رہی۔ میں نے آہستگی سے اس کے کان میں کہا "اصل میں زندگی کا منتہائے مقصود ہی موت ہے تو پھر اس میں رونا دھونا کیا، جو ہوا اس پر صبر کرنا چاہیے۔" وہ میری بات سن کر اور بھی سسکیاں بھرنے لگی اور اس کا سارا بدن ہچکولے کھانے لگا۔ میں نے سوچا، مجھ سے شاید کوئی غلطی ہو گئی جس نے اس کے اندوہ میں اضافہ کر دیا ہے لیکن ہمارے پاکستان میں تو ایسے موقعوں پر اسی قسم کے فقرے بولا کرتے ہیں، انڈونیشیا میں شاید درد بٹانے کا کوئی اور طریق ہو۔

پھر میں نے کہا "دیکھو ستی! جس طرح پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے، اسی طرح مرنا بھی قدرتی ہے۔ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اور بالآخر اسی کو مٹی میں مل جانا ہے۔ تمہاری والدہ کی موت کا مجھے بھی اتنا ہی صدمہ ہے جس قدر تم کو ہے مگر ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ خدا کا ایک اٹل قانون ہے اور ہم اس کے سامنے بے بس ہیں۔"

اس نے اپنا سر میرے کندھے سے اٹھا لیا اور اپنی کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "یہ موت اصل میں ہے کیا چیز؟"

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اصل میں کوئی نہیں جانتا کہ موت ہے کیا چیز! نہ ہی کسی کو یہ معلوم ہے کہ یہ ایک نعمت ہے، ایک برکت ہے، ایک دعائے خیر ہے لیکن لوگ اس سے ڈرتے ضرور ہیں جیسے یہ کوئی بہت بڑی برائی ہو۔ کوئی نفرت انگیز شے ہو۔"

جلد ہی وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور سامنے دیکھنے لگی۔ سامنے بنچوں پر کئی جوڑے پاگل پن کی حرکتیں کر رہے تھے اور سکول کے بچے اور بچیاں ان کے پاس کھڑے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔

ستی مردیاتی نے کہا "میری ماں میرا واحد سہارا تھی۔ اسی طرح میں بھی اس کی واحد آس تھی۔ میرا خیال تھا میں گریجوایشن کر کے جلد واپس چلی جاؤں گی اور جکارتہ میں کوئی اچھی سی نوکری تلاش کر لوں گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اب مجھے اسی طرح واپس جانا پڑے گا اور اپنی ماں کی جگہ گھر کی نگہداشت کرنا ہو گی۔ پتہ نہیں میں اس کی جگہ سنبھال بھی سکوں گی یا ایسے ہی ناکام ہو کر بیٹھ جاؤں گی۔ میرا ایک جواں سال بھائی ذہنی ابتلا میں مبتلا ہے اور ہر دوسرے تیسرے دن گھر سے نکل جاتا ہے۔ کئی کئی مہینے واپس نہیں آتا۔ گو ہم نے اس کے گلے میں اپنے گھر کے پتے کی تختی بھی ڈالی ہوئی ہے۔ پھر بھی اس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ وہ خود ہی واپس آتا ہے اور آپ ہی اپنی خود ساختہ زبان میں اپنی درد بھری داستان بیان کرتا ہے۔ پھر میرا سوتیلا باپ ہے جو ایک اچھا آدمی نہیں ہے۔ پتہ نہیں میری ماں نے اس کے ساتھ کیوں شادی کی اور اس کو اس

رشتے سے کیا ملا؟''

میں ستی کی اس بات کا کیا جواب دیتا۔ اپنا چہرہ اس کی طرف گھما کر ہولے ہولے اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔ وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی ''اب میں جلد ہی واپس چلی جاؤں گی اور جا کر اپنے معذور بھائی اور سوتیلے باپ کا سامنا کروں گی۔ وہ مجھے دونوں ہی اچھے نہیں لگتے لیکن ایک سے میں محبت کروں گی، دوسرے کی عزت کروں گی اور دونوں کی نگہداری کروں گی۔ ہمارے انڈونیشیا میں منافقت بہت ہے۔ اوپر سے ہم کچھ اور ہوتے ہیں اور اندر سے کچھ اور۔ ہم میں تساوی نہیں، ہم جھوٹے لوگ ہیں اور سچ بولنے سے کتراتے ہیں۔''

میں نے کہا ''اور یہ جو انڈونیشیا کا سفیر ہے جن کے یہاں تم رہتی ہو!''

''یہ میرا سگا ماموں ہے۔'' اس نے جلدی سے میری بات کاٹ کر کہا ''لیکن اس کی بیوی کا سلوک میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں رہا۔ میں ان کے یہاں ایک ملازمہ کی حیثیت سے رہتی ہوں اور وہ سارے کام کرتی ہوں جو ایک ''میڈ'' کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ دونوں مجھ سے خوش نہیں ہیں اور میری فیس مشکل سے ادا کرتے رہے ہیں۔'' پھر وہ ذرا سا مسکرا کر بولی ''میں اپنے ماموں کو تخلیے میں بھی ماموں نہیں کہہ سکتی ''مسٹر'' کہہ کر بلاتی ہوں۔''

وہ بڑی دیر تک ٹرل ٹرل اپنے بچپن کی باتیں اور اپنی ماں کی محبتوں کے قصے سناتی رہی۔ اپنے گھر کے ایک ایک آدمی کو یاد کر کے ہنستی اور روتی رہی۔ روم میں اپنے سفارتخانے سے باہر اچھا وقت گزارنے کو یاد کرتی رہی اور پھر جھپ کھا کر موت کی طرف لوٹ گئی۔ وہ موت سے کچھ گھبرائی ہوئی، کچھ ہٹی ہوئی، ذرا سی خوفزدہ، بے حد شاکی اور قدرے محجوب سی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی مرحومہ ماں کے حوالے سے نہیں بلکہ موت کے مجرد سوال میں گھری ہوئی تھی۔ اصل میں اس سے اپنا سوال نہیں بن رہا تھا جس کے جواب کی تلاش میں وہ اپنی گول ٹھوڑی اوپر اٹھائے بیٹھی تھی۔

جب ہم آزاد کشمیر ریڈیو کے ملازم تھے تو اس وقت ممتاز مفتی کے پاس ایک دبنگ سا ملنگ آیا کرتا تھا جو اپنی باتوں سے بڑا پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا لیکن اپنی وضع قطع، اپنے لباس اور اپنے تلفظ سے بہت ہی گھامڑ سا نظر آتا تھا۔ استاد یوسف ظفر ہر مرتبہ اس سے سینگ پھنسا کر بیٹھ جاتا اور جلد ہی اس سے معذرت کر کے اپنے سینگ نکال کر باہر نکل جاتا۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ زندگی کے بعد مر جانا یا پیدا ہو کر ختم ہو جانا نہایت غیر معقول اور غیر منطقی بات ہے۔ اس بات کو نہ دل پسند کرتا ہے نہ عقل پسند کرتی ہے...... اور شہوت تو اس کو بالکل ہی پسند نہیں کرتی کہ کوئی پیدا ہو کر مر جائے تو یہ بڑے نقصان کی اور بڑے گھاٹے کی چیز ہے۔ اب عقل انسانی اور فہم انسانی گھاٹے کو پورا کرنے اور اس نقصان کا سدباب کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے اور انسان کو زندہ رکھنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیتی ہے۔ انسان کو بھوک ہو نہ ہو، وہ کھانا ضرور کھائے گا اور اس لیے کھائے گا کہ بھوک کی شدت موت کا باعث نہ بن جائے۔ اس طرح پانی پیے گا کہ موت کو ٹالنے کے لیے اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح ہوا ہے، جس کو سانسوں میں لپیٹ کر بڑے بڑے گھونٹ بھرتا ہے۔ سیر کرتا ہے، کسرت کرتا ہے، کس لیے؟ زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے...... لیکن کمال ہے! صدقے جاؤں، قربان جاؤں اور تیری اس کوشش کے واری جاؤں کہ چوبیس گھنٹے موت سے بچنے

کا سدباب کر رہا ہے اور زندگی کی پشتی بانی کر رہا ہے لیکن جتنی دیر اس سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے، موت کو پرے رکھنے کی جدوجہد کر رہا ہے، اتنی ہی موت اس کے قریب آ رہی ہے۔ اس کی جانب بڑھ رہی ہے۔ تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپک رہی ہے۔ ٹائم گزر رہا ہے۔

اب جب عقل اور دانش ہر طرح کی حیلہ سازی کر کے موت کو پرے رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور موت پھر بھی آ جاتی ہے تو عقل موت کے مقابلے میں ایک ناکارہ اور ناکام شے ہوئی کیونکہ مرنا جو ہے یہ عقل کے خلاف ہے۔ عقل کے ہوتے ہوئے انسان مر جاتا ہے اور پورے کا پورا مر جاتا ہے...... اب جب کچھ انسان کے اختیار میں ہے ہی نہیں یعنی اس کا بنیادی ڈھانچہ ہی اس کے تصرف میں نہیں کہ نہ اپنے ارادے سے آیا اور نہ اپنے ارادے سے فوت ہو رہا ہے، نہ اپنا پلان بنا کر آیا ہے اور نہ اب اپنا پلان بنا کر جا رہا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ کسی اور کے ارادے اور کسی اور کی خوشی سے آیا تھا اور اسی کی خوشی سے جائے گا تو اب منطقی صورت یہی نکلی کہ جس کی خوشی سے آیا تھا، اس کی خوشی کے مطابق زندگی گزارے اور اسی کے پلان کے مطابق عمر بسر کرے......

اب اگر اس کی خوشی سے اس دنیا میں رہا تو اس رہنے کا نام دین ہے اور اگر اپنی تجویز سے رہا تو ''من مرضی'' ہے۔ کفر ہے۔ پھر وہ کہتا ''لا مفتی چائے پلا اور پان کھلا اور خوش رہ کہ اس کا بھیجا ہوا وقت قریب آ رہا ہے۔''

اب میں یہ بات ستی مردیاتی کو کیا بتاتا کہ اس کے کام کی نہ تھی اور پھر خود مجھے اتنی مدت کے بعد یاد آئی تھی کہ اگر ستی کی والدہ فوت نہ ہوتی اور وہ اس طرح سے نہ روتی تو شاید مجھے بھی یاد نہ آتی۔

ستی سے اگلے دن پھر ملنے کا وعدہ کر کے میں اپنے گھر آ گیا اور کپڑے اتارے بغیر کرسی پر بیٹھ کر اپنی ماں کے بارے میں سوچنے لگا جو اس وقت مجھ سے ہزاروں میل دور تھی اور ہمارے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی ماں کو جو پیغام بھیجنا ہوتا، وہ میں اپنے بھائی کے خط میں لکھ دیتا اور میری ماں کو جو دعائیں بھجوانا ہوتیں، وہ بھائی سے کہہ کر مجھے بھجوا دیتی۔

میری ماں بڑی سادہ، بے حد شفیق اور بہت ہی محنتی تھی۔ ہم نے اسے لگاتار کام کرتے، بات بات پر مسکراتے، گیلے کپڑوں کے بوجھ اٹھائے۔ چاروں کے بٹھل بھرے، دالوں کی پراتیں اٹھائے اور آٹے کی بوریوں کو گھسیٹتے دیکھا۔ وہ کبھی تھکتی ہی نہ تھی۔ تھکتی تو بتاتی نہیں تھی۔ بیمار ہوتی تو ساگ بوئی، مولی چتو وغیرہ گھوٹ گھٹا کر پی لیتی اور لوٹ پوٹ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ اس کے سر میں اکثر درد رہتا۔ جب اس نے کاغذ کے گول نکلے آٹا لگا کر اپنی کنپٹیوں سے لگائے ہوتے تو ہمیں پتہ چل جاتا کہ اماں کے سر میں درد ہے اور اس کی کنپٹیاں بج رہی ہیں لیکن ہم نے اس سے اس سر درد کے بارے میں کبھی پوچھا نہ تھا۔ وہ اس سر درد کی پروا بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کی اصل سر دردی اس کا گھر اور اس کی اولاد تھی۔ وہ ہر وقت ڈری ڈری اور دھڑکی دھڑکی سی رہتی۔ جب بھی دروازے پر کوئی آہٹ ہوتی، اسے چونک کر دیکھتی یا کوئی جا رہا ہوتا یا داخل ہو رہا ہوتا، وہ ان دونوں کے درمیان ڈر سے بھری وقت گزارتی۔ میں اپنی ماں کو چنتا ماتا کہہ کر بلاتا تھا پتہ نہیں اس کو کس بات کی چنتا تھی کہ خوف کم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔

میری ماں بھی ان ہزاروں لاکھوں ماؤں کی طرح تھی جو ہمارے ملک میں اندیشوں کی الٹی چھری تلے وقت

گزارتی ہیں۔ یوں تو وہ زندہ ہوتی ہیں اور بڑی دیر تک زندہ رہتی ہیں لیکن ان کا ہر سانس لمحے کی چھری کی رگڑ کھا کر آتا ہے اور اسی خوف سے آنکھ بچا کر واپس جاتا ہے۔ ایک زندگی میں اربوں سنکھوں، نیلوں سانس ہوتے ہیں اور ماؤں کی زندگیاں بھی لمبی ہوتی ہیں۔ جب تک آخری بچہ کنارے نہ لگ جائے، وہ شوہ دریا کی ڈونگھی لہروں میں ڈبکیاں ہی کھاتی رہتی ہیں۔ اولاد کی ساری زندگی ماؤں کو خوفزدہ کرتے، مہنے مارتے، فقرے کستے گزرتی ہے، بچے ان کو دھمکاتے بھی ہیں اور جھمیاں بھی ڈالتے ہیں۔ ان سے پیسے چھینتے بھی ہیں اور ان کو کمائیاں لا لا کر بھی دیتے ہیں۔ ان کو رلاتے بھی ہیں اور ان کے لیے روتے بھی ہیں۔

مشرق میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص مرد عورت سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کا بے حد احترام کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کوئی کام عورت کی مرضی اور اس کے مشورہ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ عامل گو مرد ہوتا ہے لیکن پس پردہ راسیں عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز مرد اڑاتا ہے لیکن ناور سے اس کی نیوی گیشن عورت کے اختیار میں ہوتی ہے۔ سودا مرد کرتا ہے لیکن فیصلہ عورت کرتی ہے کہ یہ پلاٹ خریدنا ہے کہ نہیں۔ شادی لڑکے لڑکی کی ہوتی ہے لیکن فیصلے عورتوں نے کیے ہوتے ہیں۔ کفر آمیز باتیں ساری عمر مرد کرتا ہے اور حج پر اسے عورت کا فیصلہ لے کر جاتا ہے۔ ہمارے یہاں مرد ماں کے لیے، بہن کے لیے، محبوبہ کے لیے، ماسیوں، پھپھیوں، چچیوں کے لیے ہر قسم کی قربانی دیتا ہے اور ہر حال میں ان کی عزت بحال کر کے رکھتا ہے لیکن ایک رشتے پر آ کر رک جاتا ہے اور وہ رشتہ میاں بیوی کا ہے۔ اس میں واقعات کی بیل اس طرح سے منڈھے نہیں چڑھتی جس طرح ماں، ماسی، بہن، محبوبہ، بیٹی اور چچی تائی کے معاملے میں چڑھتی ہے۔ شاید اس میں مرد کو اتنی خرابی نہیں ہوتی جتنی شادی کے ادارے اور شادی کے چلن کی ہوتی ہے۔

مرد عورت کی شادی کی گاڑی میں پکھڑا ضرور پھنستا ہے اور شروع دن سے پھنستا ہے۔ اس میں دونوں ہی شرافت کی حدوں سے پرے نکل جاتے ہیں۔ مرد چونکہ طاقتور ہوتا ہے، صاحب حیثیت ہوتا ہے، ہر اعتبار سے قوی ہوتا ہے، اس لیے وہ ظلم اور زیادتی کے میدان میں بہت دور نکل جاتا ہے۔

لیکن شاید یہ ادارے والی بات بھی ٹھیک نہیں۔ شادی کے ادارے والی۔ اس میں کچھ اور ہی راز ہے، کوئی بڑا راز اور کوئی بے حد پیچیدہ گھنڈی، آخر مرد اور عورت محبت، پیار اور شفقت و مودت والے اتنے سارے رشتے طے کر کے یہیں آ کر کیوں رک جاتے ہیں۔ کسی ایک ملک ایک معاشرے یا کسی خاص گروہ انسانی میں نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر مقام اور ہر گروہ اور ہر موسم میں میاں بیوی کے درمیان ایک معرکہ ہی بپا رہتا ہے۔ ایک جدال کی کیفیت ہی رہتی ہے، خواہ اوپر سے امن و سکون ہی کیوں نہ نظر آ تا رہے۔

میرے خیال میں چونکہ محبت کے دوسرے رشتے بے حاصل اور غیر پیداواری ہوتے ہیں، اس لیے وہاں کوئی جھگڑا جھمیلا نہیں ہوتا، جہاں جہاں تخلیق ہوگی، پیداوار کی توقع ہوگی۔ باروری کا انتظار ہوگا، وہیں دنگا فساد، کٹا پٹی اور دشمنی خرخشہ ضرور ہوگا۔ کھیتوں میں کھلیانوں میں باغوں میں بوستانوں میں جہاں فصل اگائی جائے گی، دانہ بویا جائے گا، پیڑ پیوند کیے جائیں گے، وہاں بڑبلہ ہوگا۔ غوغا ہوگا، ڈھول پٹیں گے، حملے ہوں گے۔ مدافعت ہوگی۔ ہم برچھی تیغ کٹاری ڈانگ

سونٹے کے وار ہوں گے۔ کچھ رہ جائیں گے، کچھ ڈیہہ جائیں گے۔ کہیں ڈنڈ بھریں گے، کہیں صلح صفایاں ہوں گی۔ لیکن کب کھیت خالی ہوگا، بنجر ہوگا، باغ ویران ہوگا، بے برگ بار ہوگا تو کوئی ادھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ ایسے ہی ٹھنڈے ٹھنڈے گزر جائے گا، آرام چین کے ساتھ۔

انسانوں کے درمیان تو میاں بیوی کے جھگڑے تنازعے، خلع اور طلاق ہوتے ہی ہیں، جانوروں کے جوڑے ان سے بھی آگے گزر جاتے ہیں۔ شیرنی بارور ہوتے وقت شیر کے اس زور کا پنجہ مارتی ہے کہ بھاری بھرکم ایال والا شیر نر بیں قدم پرے جا کر بلونگڑے کی طرح گرتا ہے۔ شہد کی مکھی اڑتی جاتی ہے، اڑتی جاتی ہے اوپر اور اوپر اور اوپر نر اس کا تعاقب کرتے ادھ آسمان کی اڑانیں بھرتے جاتے اور تھک کر ٹوٹ کر مرتے جاتے ہیں۔ ملکہ مکھی خلع! خلع!! خلع!! پکارتی اوپر چڑھے جاتی ہے اور نر منتیں، خوشامدیں، عاجزیاں کرتے، طلاقیں لے کر نیچے گرتے جاتے ہیں۔

کالی مکڑی اختلاط کے عین بعد کالے مکڑے کو اوپر سے اتارتے ہی اس کا سر کناک سے کاٹ کر اپنے مضبوط جبڑوں میں اس کو کتر کتر ملیدہ کر کے کھا جاتی ہے اور اس کے بعد اس کے سارے جسم کو آہستگی کے ساتھ مزے مزے لے کر ہڑپ کر جاتی ہے، نہ خلع نہ طلاق سارا جھگڑا ایک ساتھ طے پا جاتا ہے۔

مرد عورت میں بھی جھگڑا باروری کے لاشعوری نزاع سے ملتا ہے۔ بچہ ہو جائے تو جھگڑا نہ ہو تو جھگڑا، بیچ میں نقص ہو تو لڑائی، زمین بنجر ہو تو ناچاقی پھل پسند ہو تو دنگا ناپسند ہو تو ٹنٹا۔ اصل میں جھگڑا محبت کی کمی بیشی کا نہیں ہوتا تخلیق کے لرزہ وارتعاش کا ہوتا ہے۔ کچھ جوڑے تو اس ارتعاش کے جھٹکے سہہ جاتے ہیں، باقی ساری زندگی ڈگمگاتے ہی رہتے ہیں اور جو ڈگمگاتے ہیں، ان کے کھیت رہنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔

حب نفس یعنی سیلف میں کوئی تنازعہ کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ بچہ اپنے وجود سے اپنے بدن سے، اپنے انگوٹھے سے محبت کرتا ہے۔ اپنے کان کی لو اور اپنی ناک کی پھننگ سے کھیلتا ہے۔ حب نفس کے مزے لیتا ہے اور خوش رہتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو اپنی جنس کے افراد کی طرف مائل ہو کر ان کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے۔ کوئی دنگا نہیں ہوتا، کوئی فساد نہیں ہوتا۔ کوئی تخلیق نہیں ہوتی۔ بس خالی محبت ہی محبت ہے۔ لگاوٹ ہی لگاؤ اور تعلق ہی تعلق ہے جیسے عزیزوں، رشتہ داروں کے درمیان ہوتا ہے کہ نہ آفرینش ہے نہ ایجاد۔

تخلیق میں بڑا غوغا اور بڑا جدال ہے۔ معمولی سے معمولی شاعر بے معنی سی تک بندی کر کے دوسرے شاعروں کے لیے وجہ نزاع بن جاتا ہے۔ بڑے جھگڑے بڑے لڑائیاں بڑے سر پھٹول ہوتے ہیں۔ پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ بڑی تکرار ہوتی ہے۔ ہجویں پڑھتے ہیں، کالم لکھتے ہیں۔ طعنوں کے تیر چلاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دروازوں پر گند کے ٹوکرے پھینکتے ہیں۔ پیش نظر گالیاں دیتے ہیں پس پشت رسوا کرتے ہیں۔ میاں بیوی سے بڑھ کر لڑائی ہوتی ہے۔ تین طلاقوں سے زیادہ طلاقیں دے کر بھی کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑتی۔ نہ جھگڑا زر کا نہ زن کا نہ زمین کا۔ سارا قصور ایک دھونسی ہوئی مدقوق سی تخلیق کا۔ ایک غزل کا ایک رباعی کا ایک قطعے کا اور ساری زندگی کی قطع کلامی!

تخلیق بڑی طاقتور اور زور آور قوت ہے۔ ایک کوزہ گر کے نئے کوزے سے اور ایک زرکوب کے اچھوتے ورق

سے چاروں کھونٹ مل جاتے ہیں اور نئی ہوائیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ تخلیق کے تصور، اس کے نقشے، اس کے خاکے اور زائچے اور ایکویشن سے فلکی شعاعوں میں نامختتم گونج بھر جاتی ہے اور اس کے لاثکی سلسلوں میں ساری کائنات لپٹ جاتی ہے تو جس وقت یہ کائنات معرض وجود میں آئی ہوگی تو کتنی بڑی گونج کے ساتھ تخلیق ہوئی ہوگی اور کیسا بگ بینگ ہوا ہوگا اور جب وہاں اتنا بڑا بگ بینگ ہوا ہوگا تو یہاں جہاں ہر ہر کنبے، ہر ہر گھرانے اور ہر ہر کوٹھے میں تخلیق کا عمل جاری ہے۔ چھوٹے بڑے دھماکے، چمکدار کڑاکے اور لہریا تڑاقے ہوتے رہیں گے۔ دراصل یہ میاں بیوی جھگڑے یا زن وشوکی لڑائیاں نہیں ہیں۔ کچھ اور ہی چیزیں ہیں۔ یہ ایسے سری اور رمزی معاملے ہیں جن کو معاشرتی مسائل کی سلیٹ پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ان کو نفسیات کے غولوں سے سمجھا جاسکتا ہے نہ عمرانیات کے فیتے سے ماپا جاسکتا ہے۔

ستی مردیاتی کی والدہ کے وفات پا جانے سے میں طرح طرح کے اندیشوں میں گھر گیا تھا اور ان میں سب سے بڑا خوف میری اپنی ماں کے مرجانے کا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ پاکستان میں میری ماں بھی فوت ہو جائے گی اور میں یہاں روم میں اکیلا بیٹھا رہ جاؤں گا۔ اگر میں واپس گیا بھی تو میرے بھائی اور بہنیں مجھے تسلیم کرنے اور اپنے ساتھ ملانے سے انکار کر دیں گے۔ کچھ لوگ میرے ساتھ ہوں گے کہ بیچارے کی ماں مرگئی اور کچھ لوگ ان کی طرف ہوں گے کہ پہلے اپنی پیاری ماں کو چھوڑ کر پردیس چلا گیا تھا، مزے کرنے اور دل بہلانے اب روتا پھرتا ہے۔ روتا ہے تو رو، ہم تجھے منع نہیں کرتے لیکن سچی بات یہ ہے کہ تجھے اپنی ماں سے پیار نہیں تھا۔ یہ سب دکھلاوے کی باتیں ہیں اور ہم منافقت کے قائل نہیں ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جب میری رشتے کی ایک نانی فوت ہوگئی تھیں اور میں بار بار آگے بڑھ کر ان کے جنازے کو کندھا دے رہا تھا تو میرے بڑے بھائی نے میرے ساتھ کندھا بدلتے ہوئے میرے کان میں کہا" کمینے! بدذات نانی کو خود مار کر اور خود قتل کر کے اب اس کو بار بار کندھا دے رہا ہے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے، اپنی تسلی کے لیے۔ اس فعل کا کفارہ ادا کرنے کے لیے۔ بس کر۔ چھوڑ دے اور باز آ...... صد بار گر توبہ شکستی باز آ......"

میں ان کی یہ بات سن کر گھبرا گیا اور جنازے سے ذرا دور ہو کر چلنے لگا۔ کافی دیر تک سوچتا رہا لیکن وہ الزام جو افتخار بھائی نے مجھ پر لگایا تھا، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ جوڑ سکا۔ نانی زلیخا مجھے سب بزرگوں میں سب سے زیادہ پیاری تھیں۔ میری ان کی روز ملاقات ہوتی تھی۔ میں ان کا دل و جان سے احترام کرتا تھا۔ وہ مجھے اپنے بچوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ ایک سال سے کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب میں نے ان کی حاضری نہ دی ہو۔ جب وہ بیمار ہو کر ہسپتال گئیں، اس وقت بھی میں دفتر سے سیدھا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر حالات و واقعات سے انہیں آگاہ کرتا رہا۔ ان کی چھوٹی موٹی فرمائشیں اور ان کی معمر خواہشیں پوری کرتا رہا۔ پھر افتخار بھائی نے یہ کیوں کہا؟ طنزیہ لہجے میں کس لیے اور ایسے غمناک موقع پر مجھے موردِ الزام کیوں ٹھہرایا؟

میں جنازے کے انبوہ میں گردن ڈالے چپ چاپ چلا جا رہا تھا اور مجھے نانی کی موت کے مقابلے میں اپنے بڑے بھائی کا بول غمزدہ کر رہا تھا جس نے مجھے کوئی حصوں میں بانٹ دیا تھا۔

میری اصلی نانی تو وہ تھیں جنھوں نے سہاگن ہونے کے باوجود اپنے بچے ایک بیوہ کی طرح پالے تھے۔ ان کے شوہر من موجی آدمی تھے۔ ایک مرتبہ گھر سے نکل جاتے تو دو دو سال تک واپس ہی نہ آتے تھے۔ نہ خط لکھتے نہ کوئی سندیسہ بھیجتے، نہ یہ پتہ ہوتا کہ ان دنوں کہاں ہیں اور کس حال میں گزر بسر ہو رہی ہے۔ میں نے اپنی نانی کی زندگی کی ایک مختصری جھلک اپنے افسانے "فہیم" میں دی تھی۔ اس کے بعد موقع ہی نہ مل سکا ورنہ ان کے حالات پر اس عہد کے حوالے سے ایک طویل ناول لکھتا اور اپنے قارئین کو اس خاتون سے متعارف کراتا جو ایک چھوٹی، گڑیا سی اور چیت سی ضعیفہ تھیں لیکن اپنے ارادوں میں عظمتوں کا پہاڑ تھیں۔ وہ ساری زندگی مشکل وقت کو صرف وقت اور مشکل ایام کو صرف ایام سمجھ کر ہی گزارتی رہیں۔ ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہوئیں لیکن اپنی ساری زندگی کو اسم ہی سمجھا اسم صفت کا نام نہ دے سکیں۔

یہ جو میری دوسری نانی فوت ہوئی تھیں اور جن کا جنازہ ہم قبرستان لے جا رہے تھے، یہ میری حقیقی نانی کی چھوٹی بہن تھیں اور کئی سال سے ان کی اپنی حقیقی بہن سے بول چال بند تھی۔ بول چال بند نہ کہیے، اس سے گلہ گزاری اور بائیکاٹ کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہ بات نہیں تھی۔ بس میری نانی زلیخا اپنی بڑی بہن سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا ایک اونچا مقام اور اونچا معیار تھا۔ ان کے خاوند پہلے قمر کابل میں انگریزی سفیر کے میر منشی تھے۔ پھر ہندوستان میں انگریز کمانڈر ان چیف کے مشیر بن گئے۔ ان کا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا بالکل انگریزوں جیسا تھا۔ وہ ہمیشہ نوبل صاحب کے ساتھ کھانا کھاتے لیکن ابن الوقت نہیں تھے۔ ابوالوقت تھے اور اپنے حالات پر حاوی ہو کر زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا سارا گھرانہ زیورِ علم اور زیورِ زر سے آراستہ تھا۔ تین لڑکے دو لڑکیاں، سبھی پڑھے لکھے۔ سبھی کلچرڈ ہر ایک اچھے مقام پر فائز۔ لڑکیوں کے خاوند ایک دوسرے کی کاٹ، ایک سوداگر چوب اور جنگلوں کا ٹھیکیدار دوسرا آرمی کانٹریکٹر، گورے صاحب کو گھنی رشوت دے کر اپنے کام نکالتے تھے اور میرے نانا نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ ایسی رشوت حرام نہیں، مکروہ ہے۔

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ خالہ کوکب کی کار پر سواری کی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر درزی کی دکان پر گیا۔ وہاں سے وہ فرنیچر والے کے شوروم میں گئیں۔ آتی دفعہ انہوں نے بازار سے شکر پارے اور نمک پارے خریدے اور مجھے کھانے کو دیے۔ خود نہیں کھائے۔ ڈرائیور سے اس کی بیمار والدہ کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ 14 اگست کے بعد جب ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تو نانی زلیخا کا گھرانہ پہلے سے لاہور میں موجود تھا اور ٹمپل روڈ کی ایک کوٹھی میں آباد تھا۔ اس کوٹھی کے کئی کمرے، گیراج میں دو کاریں اور گیٹ پر میانوالی کا مزمل خان چوکیدار موجود تھا۔

یوں تو ہم بھی متوسط درجے کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ہجرت کے بعد ہماری حالت کچھ غیر ہو گئی تھی۔ میرے والد کے میسرز بیلی رام برورز کے لالہ بالک رام سے کافی گہرے مراسم تھے۔ ہم نے اپنا رئیسی تانگہ مع سرنگ گھوڑی کے انہیں بھجوایا تھا اس لیے لالہ بالک رام میرے اباجی سے بڑے التفات سے پیش آئے اور انہوں نے نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کو میرے والد کو پانچ سو روپے دیے۔ گو یہ رقم 47ء میں ایک خطیر رقم تھی لیکن ہمارے سارے گھرانے کا بوجھ زیادہ دیر تک نہیں اٹھا سکتی تھی۔ میری والدہ نے اپنے چاروں بیکار بیٹوں کو گھر کا بوجھ اٹھانے کے لیے نوکری کرنے کا مشورہ دیا اور ہر ایک کو دس دس روپے دے کر نوکری کی تلاش میں روانہ کر دیا۔

اقبال بھائی چونکہ صرف ایف اے پاس تھے، اس لیے انہوں نے قریبی گاؤں سے گھی، انڈے، مرغی لا کر چوبرجی کے پاس بیچنا شروع کر دیئے۔ دس پندرہ دن بعد جب اچھی یافت ہونے لگی تو وہ بکرے اور دنبے بھی شہر لا کر فروخت کرنے لگے۔ ان کی اٰنم سے گھر کا خرچ اچھا چلنے لگا اور اماں کو بے فکری ہو گئی۔

اسحاق بھائی چونکہ انقلابی ذہن کے تھے اور پاکستان بنانے کے لیے بنگال جا کر بم بنانے کی تربیت حاصل کرتے رہے تھے، اس لیے وہ ایک مرتبہ پھر جہاد میں حصہ لینے کے لیے کشمیر پہنچ گئے۔ ان کے پاس کوئی تیر تلوار، گن بندوق نہیں تھی۔ بس ایک صندوقچی سی ہوتی تھی جیسی ملائی کی برف بیچنے والوں کے پاس ہوتی تھی۔ بس اسی کے زور پر وہ گولیاں اور فلیتے بھر بھر کر پٹھانوں کو دیتے تھے اور اپنے سیکٹر میں سپلائی لائین کے اکیلے ہی پوری پلاٹون تھے۔

سب سے چھوٹا چونکہ ماں کا لاڈلا تھا، اس لیے اس نے ہر قسم کا چھوٹا اور گندا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ اماں کو سبز باغ دکھا دکھا کر شیشے میں اتار لیا اور اس کے حج کے جمع کردہ فنڈ سے اچھی خاصی رقم اینٹھ کر اعلیٰ درجے کی ایک نئی نکور رائفل خریدی اور ماں سے دعا لے کر جہادِ کشمیر پر روانہ ہو گیا۔ اس زمانے کی مائیں چونکہ جذبہ اور جہالت سے معمور ہوتی تھیں اور ان کو ایم بی اے، او لیول، اے لیول اور ورلڈ بینک کی ملازمتوں کا علم نہیں تھا، اس لیے اپنے بچوں کو محاذ پر بھیجنے میں ان کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ وہ عورتیں تو بعد میں پیدا ہوئیں اور ہمارے ہی گھرانے میں پیدا ہوئیں جو یہ کہتی تھیں کہ یہ پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر بنانا ہی تھا تو اسے صرف ہماری اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے مخصوص رکھنا تھا۔ اس میں مذہب کدھر سے گھسیڑ دیا اور اگر مذہب لانا ہی تھا تو یہ پرانا، فرسودہ اور بنیادی مذہب کیوں اٹھا لائے۔ اس کو ماڈرن، مذہب کر کے پاکستان کے ساتھ متعارف کرانا تھا۔

جب میں اپنے چھوٹے اور سب کے پیارے اشتیاق بھائی کو محاذ پر جانے کے لیے چھوڑنے گیا تو چاروں لاریاں محاذِ جنگ پر جانے والے مجاہدوں سے بھری ہوئی تھیں اور بہت سے جوان چھتوں پر بیٹھے تھے۔ ایک رائفل بردار خوبصورت نوعمر لڑکے کو سائیکل کے ڈنڈے سے اتر کر اپنی طرف آتے دیکھا تو چھت پر بیٹھے جوانوں نے نعرہ تکبیر سے ساری فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ جب ہمارا پیارا چھوٹا بھائی لاری کی کھڑکی میں پاؤں رکھ کر اوپر چھت پر چڑھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اپنے بڑے بھائی کی تجارتی نوکری پر تو بہت خوش ہوا تھا۔ یہاں آنسو کس لیے؟ اپنی اپنی نوکری کی بات ہے اور اپنی اپنی نوکری کا مقام ہے۔

مجھے ایمپلائنٹ ایکسچینج نے تین ملازمتیں پیش کیں۔ ریلوے، لاہور کارپوریشن اور ریفیوجی کیمپ۔ میں نے ریفیوجی کیمپ کو ترجیح دی اور اجازت نامہ لے کر چائنیز ریفیوجی کیمپ پہنچ گیا۔ یہاں مجھے پینسٹھ روپے ماہوار پر جونیئر کلرک کی نوکری مل گئی۔ مزے ہو گئے۔

ریفیوجی کیمپ، جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ریفیوجی کیمپ تھا، تین حصوں میں منقسم تھا۔ والٹن ایریا، ایئرڈ روم اور چائنیز بیرکس۔ ان تینوں میں چائنیز بیرکس کا علاقہ سب سے بڑا تھا۔ یہیں لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین بیرکوں کے اندر اور باہر پڑے تھے اور یہیں ہماری ان کے ساتھ ہر طرح کی ڈیوٹی لگی تھی۔

میرے کیمپ کمانڈنٹ نے مجھے "معلومات" کی بیرک میں متعین کر دیا۔ یہاں دونوں طرف کی بارہ کھڑکیوں پر بارہ کلرک متعین تھے جو اپنے سامنے بے معنی سے کاغذ رکھے مہاجرین کو ان کے سوالوں کے جواب فراہم کر رہے تھے۔ ان سوالوں میں سب سے اہم سوال ایک ہی ہوتا تھا کہ فلاں شہر فلاں گاؤں فلاں بستی اور فلاں کوٹ کے لوگ اگر پاکستان آ گئے ہوں اور لاؤڈ سپیکر پر یہ اعلان سن رہے ہوں تو دفترِ معلومات کے سامنے پہنچ جائیں۔

جو کلرک "اناؤنسمنٹ بوتھ" میں مائیکروفون کے سامنے اعلان کرتا تھا، اس کو یہ کام سخت ناپسند تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ یہ کام چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا اور دوسرے کلرکوں کی طرح مٹر گشتی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ میں نے خوشی سے قبول کر لیا بلکہ شکریہ کے ساتھ قبول کر کے اناؤنسمنٹ میں اور بھی توجہ طلب باتیں کہنی شروع کر دیں۔ میرے کیمپ کمانڈنٹ نے میری یہ بقراطیاں سنیں تو انہوں نے مجھے سینئر کلرک کا گریڈ دلوا دیا۔ اپنی ہفتہ روز میٹنگ میں انہوں نے سیکرٹری صاحب سے کہہ کر "مورال بلڈنگ" کا ایک باقاعدہ پروگرام شروع کر دیا۔ پناہ گزینوں کے آلے زخموں پر لفظوں کے پھاہے رکھے جانے لگے تو ان میں زندہ رہنے کی رمق پھر سے پیدا ہو گئی۔

دوسرے دونوں کیمپوں میں بھی لاؤڈ سپیکر پر مورال بلڈنگ کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا۔ حکومت پنجاب نے دو اعلیٰ درجے کے دانشور اس کام پر متعین کیے۔ والٹن کیمپ میں خواجہ محمد شفیع دہلوی اور ایئرڈ روم کیمپ پر ممتاز مفتی۔ یہ پہلا موقع تھا جہاں مجھے اپنے جان سے پیارے اور آنکھ کے تارے محبوب مصنف ممتاز مفتی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ محمد شفیع بھی میرے پسندیدہ مصنفوں میں سے تھے۔ ان کے مضامین "ساقی" میں پڑھے تھے اور زبان کی چاشنی کے مزے لوٹے تھے۔ اب ان دونوں سے ہر روز ملاقات ہونے لگی۔ خواب حقیقت میں بدل گیا۔

اتنی لمبی تمہید میں نے اپنی مرحومہ نانی کی داستانِ غم سنانے کے لیے باندھی ہے کہ جب میں شام کے وقت ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر پہنچتا تو بس مجھے ریگل چوک پر اتار دیا کرتی تھی۔ یہاں سے ہمارا جلی ہوئی چھتوں والا مکان قریب تھا جس کے دو کمروں میں ہم سارے سر چھپا کر رہتے تھے اور خوش تھے کہ پاکستان بن گیا۔

مزنگ اڈے پر ہمارے گھر سے بہت پہلے ٹمپل روڈ پر نانی زلیخا کی کوٹھی تھی۔ میں اکثر انہیں سلام کر کے اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے گھر آتا تھا۔ نانی کی بڑی بیٹی جو رشتے میں میری خالہ تھیں لیکن ہم سب انہیں فرزانہ آپا کہتے تھے، اپنے دو بچوں سمیت یہیں مقیم تھیں۔ ان کے خاوند ولایت کچھ پڑھنے گئے تھے اور لمبی سٹڈی لیو پر تھے۔

انسانی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ایسے ہوا ہے کہ مہاجر آئے تو انصار نے اپنے گھروں سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ آنکھوں پر بٹھایا اور اپنے دلوں میں جگہ دی۔ انصار کی لڑکیاں دف لے کر مہاجروں کے سردار کے انتظار میں استقبالیہ گانے گاتی رہیں۔ بڑے بوڑھوں، لولے لنگڑوں، نابینا اور معذور آوازیں دے دے کر پوچھتے رہے کہ مہمان پہنچ گئے۔ مسافر آ گئے۔ مہاجر ورود کر گئے۔ قدم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست!

بس یہ ایک ہی موقع تھا جب بھائی چارے نے انسانیت کے سب سے اونچے مقام پر پہنچ کر نیچے فرشتوں کو اپنے اپنے کام میں مصروف و مشغول دیکھا۔ اس کے بعد پھر ایسا نہیں ہوا۔ کسی نے نہ تو خوش دلی سے پناہ گزینوں کو قبول کیا

اور نہ ہی پناہ گزینوں نے اپنے میزبانوں سے مہذب مہمانوں کا سا سلوک کیا۔

میں نے نانی زلیخا کے ساتھ تین چار ملاقاتوں کے بعد محسوس کیا کہ ان کو ہمارا لاہور آنا پسند نہیں آیا۔ وہ اس شہر پر بلا شرکت غیرے قبضہ قائم رکھنا چاہتی تھیں اور یہاں ہزاروں، لاکھوں اجنبی لوگ اچانک پہنچ گئے تھے۔ نہ صرف پہنچ گئے تھے بلکہ آہستہ آہستہ نئے گھروں میں آباد بھی ہونے لگے تھے۔ پہلے سے آباد لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ کوئی دوسرا بھی آباد ہو اور ان کے گھروں کے قریب ہی آباد ہو!

ایک روز نانی نے مجھ سے پوچھا "تم لوگ ایک جلے ہوئے مکان میں کیوں رہتے ہو؟ کوئی اچھا سا مکان کیوں نہیں کھلوا لیتے؟"

میں نے کہا "اچھا سا مکان لینے سے ابا جی گھبراتے ہیں کہ اگر انکوائری ہوگئی اور سرکار کو پتہ چل گیا کہ جو گھر ہم ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں، وہ اتنی مالیت کا نہ تھا تو ہم پر مقدمہ بن جائے گا۔"

نانی نے کہا "خیر یہ بات تو نہیں، کوئی اور ہی پھندہ ہے جو تیرے باپ نے تم لوگوں کو نہیں بتایا۔ وہ بڑا سیانا آدمی ہے اور پل پل کی خبر رکھتا ہے، ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔"

مجھے نانی کی یہ بات بری لگی اور میں کافی دیر تک ان کے اس فقرے پر غور کرتا رہا۔ گھر آ کر میں نے ابا جی کے چہرے کو غور سے دیکھا لیکن اس میں چالاکی کا کوئی عنصر کم از کم مجھے تو نظر نہ آیا، شاید نانی کو اندر کی باتوں کا کوئی علم ہو۔

ایک روز فرزانہ آپا نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہارے دونوں بھائی کشمیر میں کیا کرنے گے ہیں؟"

میں نے کہا "وہ جہاد میں شامل ہونے کے لیے گئے ہیں اور پچھلے ہفتے میں ان سے جہلم کے بیس کیمپ پر مل کر آیا ہوں۔ دونوں بہت خوش ہیں اور دونوں نے اپنے اپنے محاذ پر بڑے معرکے مارے ہیں۔"

آپا نے کہا "تیرا جو سب سے بڑا بھائی بہاولپور میں رہتا ہے، وہ اب کیا کرتا ہے؟"

میں نے کہا "جی وہ وہی کچھ کرتا ہے جو اب تک کرتا رہا ہے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اور چھوٹی موٹی ٹھیکیداری بھی کرتا ہے۔"

"اس نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر قبضہ نہیں کیا؟" آپا نے پوچھا۔ "وہ زمینیں جو اس کی زمینوں کے ساتھ لگتی تھیں؟"

میں نے کہا "جی ہمیں کیا ضرورت ہے کسی اور کی زمین پر قبضہ کرنے کی۔ ہماری اپنی زمینیں کافی ہیں اور انہی سے اللہ تعالیٰ ہمارے رزق میں برکت ڈال رہا ہے۔"

نانی زلیخا بھی ہمیں باتیں کرتے دیکھ کر قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی کرسی کے پائے کچھ اونچے نیچے فرش پر تھے لیکن انہوں نے اس "ڈگ مگ ڈولے" کی کوئی پروا نہ کی اور ہماری باتوں میں مشغول ہوگئیں۔

آپا پوچھ رہی تھیں کہ "میرے ابا جی اب کیا کام کرتے ہیں اور میرے وہ بھائی جو گاؤں سے گھی، مرغیاں، بکریاں وغیرہ لا کر فروخت کرتے ہیں، ان کو اس تجارت سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

نانی نے کہا "تمہاری والدہ کے پاس سونے کے جو دو پرانے کنگن ہیں، کیا وہ ان کو بیچنا چاہتی ہے؟" میں نے کہا "جی مجھے کیا پتہ کہ وہ ان کا کیا بنانا چاہتی ہیں...... مجھے تو یہ بھی علم نہیں کہ میری ماں کے پاس کوئی زیور ہے۔ اگر ہوتا تو وہ پہن کر نہ دکھاتیں۔"

نانی نے کہا "تیری ماں بڑی سمجھدار ہے اور اس کو عقلمندی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بڑے ڈھنگ آتے ہیں۔ اس نے اپنے مال کی کبھی نمائش نہیں کی۔ اندر ہی اندر سینت کر رکھتی ہے۔"

"ویسے ان سے یہ مت کہنا کہ نانی زلیخا نے کنگنوں کے بارے میں پوچھا تھا۔" آپا نے کہا "ان سے بس سرسری پوچھ لینا کہ وہ پرانا زیور فروخت کرنا چاہتی ہیں یا نہیں؟"

"بیچاری مشکل میں ہوگی۔" نانی نے کہا "اتنا بڑا ٹبر، آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہیں۔ کیا کرے بیچاری۔ آہستہ آہستہ ساری پرانی چیزیں بیچنی پڑیں گی۔"

آپا فرزانہ نے کہا "بس ایسے ہی اپنی طرف سے پوچھ لینا۔ ہمارا نام نہ لینا۔ بی بی بیچاری خوامخواہ پریشان ہوں گی۔"

میں نے کہا "نہیں آپا، میں پوچھوں گا ہی نہیں۔ پوچھا تو انہیں شک پڑ جائے گا۔ وہ اور تفصیل سے پوچھیں گی۔ مجھے اور تفصیل سے بتانا پڑے گا۔ پھر اصل حقیقت کھل جائے گی۔"

آپا نے میری اس دانشمندانہ بات سے خوش ہو کر مجھے ایک ٹافی دی اور میرے ذہن کی بڑی تعریف کی۔ میں بھی خوش ہوا۔ میرا حوصلہ بندھا اور ایسی ایسی اچھی اچھی باتیں سوچنے اور کرنے کی ترغیب ہوئی۔ میرے اندر پہلی مرتبہ بلوغت کا احساس ہوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں ایک لائق لڑکا نہیں لائق نوجوان ہوں۔

میرے لیے آپا فرزانہ اور نانی زلیخا کی محبت اس قدر بڑھ گئی کہ میں تقریباً ہر روز ان کے گھر جانے لگا اور ہمارے گھرانے کے اندرونی حالات کو جس تفصیل سے وہ جاننا چاہتی تھیں اور جس طرح سے جاننا چاہتی تھیں، ان کی جزئیات اس طرح سے بتانے لگا جن کی ان کو ضرورت تھی، جن کی ان کو خواہش تھی اور جیسے ان کا اندازہ تھا۔

ان رازوں کو بڑی احتیاط سے اگلنے اور ان کی ساری تفصیلات بہم کرنے کے صلے میں مجھے اعلیٰ درجے کی چائے، ریگل کے سموسے، بینت کے رکھی ہوئی مٹھائی۔ میرے لیے خصوصی طور پر سنبھالے ہوئے امرود، مالٹے اور دوسرے موسمی پھل ملنے لگے۔ کبھی کبھار آپا فرزانہ مجھے اپنے خاوند کا کوئی قیمتی رومال، پرانا پین، ایک مرتبہ استعمال کیے ہوئے بلیڈ اور کسی ضروری کام کے لیے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک کے لیے خانساماں کا سائیکل بھی لے دیتی تھیں۔ اب مجھ پر یہ بات اچھی طرح سے روشن ہو گئی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہیں اور مجھ سے ان کی کیسی توقعات وابستہ ہیں۔

پاکستان بننے سے پہلے چونکہ میں ایک قصبے میں رہتا تھا اور ضلع کے ایک معمولی سے کالج میں پڑھتا رہا تھا، اس لیے درسی اور نصابی طور پر کافی لائق ہونے کے باوجود مجھ میں وہ بات نہ پیدا ہو سکی تھی جو بڑے شہروں کے تیز و طرار لڑکوں اور گرجا گھر سکول کے طالب علموں میں آپ سے آپ جنم لے لیتی ہے۔ میں اپنی عمر کے مطابق ایک زیرک اور دانا لڑکا ضرور تھا۔ میرا مطالعہ بھی کافی تھا۔ کچھ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ابتدائی قسم کی خط و کتابت بھی تھی لیکن جدید طرز زندگی

اور ولایتی بود و باش کی افشاء اور نمائش مجھ پر وا نہیں ہوئی تھی۔ مجھ پر نئی زندگی اور نئے چلن کی آشکاری نہیں ہوئی تھی۔ بس کتابی سا علم تھا اور کتابی علم سارا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ایک کونہ سا اٹھا کر رہ جاتا ہے، باقی ہر طرف اندھیرا ہی ہوتا ہے۔

میری جدیدیت اور ترقی پسندی کا آغاز ایک دستی مشین سے ہوا جس کے اوپر ایک لگن تھا اور بائیں ہاتھ کو نیچے بھی ایک لگن تھا۔ ان کے درمیان سلائی مشین جیسی ایک ہتھی لگی تھی۔ یہ مشین انارکلی میں شیخ عنایت اللہ کی دکان کے شوکیس میں پڑی تھی اور اس پر لال ہتھی کے نیچے میڈ ان سویڈن لکھا تھا۔ یہ مشین دودھ سے کریم جدا کرنے کی تھی اور اس کی قیمت تین سو تیس روپے تھی۔ میں اس مشین کو بڑی بڑی دیر تک شوکیس کے سامنے کھڑا ہو کر دیکھا کرتا اور اسے چلا کر دیکھنے کی حسرت لے کر واپس آ جایا کرتا۔

اب میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ساری خرابی اس مشین کی وجہ سے ہوئی۔ اس دودھ سے کریم نکالنے والی مشین کی بدولت، یہ میرا کسی ولایتی برتن سے متعارف ہونے کا پہلا موقع تھا جس نے مجھے چاروں شانے چت گرا دیا۔ میری طرح ایشیا اور افریقہ کے کروڑوں باشندے ولایت کی کسی نہ کسی مشین کے سامنے میری طرح سے سجدہ ریز تھے اور زمین سے سر ہی نہیں اٹھاتے تھے۔ اوپر نگاہیں اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں تھے کہ سر پر ایک آسمان بھی موجود ہے جس کی بلندیوں پر بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے اور جس کی رفعتوں کے سہارے اوپر دیکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا بھی ہوا جا سکتا ہے لیکن ایسے نہیں تھا، ہم سجدہ ریز ہی رہنا چاہتے تھے۔

میں نے فرزانہ آپا سے اس مشین کا ذکر کیا تو وہ ایک بڑی سی اور موٹی سی کتاب اٹھا لائیں جو رنگین تصویروں سے لبریز تھی اور جس میں نیم برہنہ میمیں طرح طرح کے لباس پہنے اٹھکیلیاں سی کر رہی تھیں۔ پہلے مجھے اٹھکیلیاں کے معنی نہیں آتے تھے۔ جب میں نے دسویں میں ماسٹر گوردت سنگھ سے انشاء کی غزل پڑھی تھی، میرے ماسٹر صاحب کو اس لفظ کا مفہوم معلوم نہ تھا۔ انہوں نے اس مصرعے کی تشریح ان سادہ الفاظ میں کر دی تھی کہ اے نکہت باد بہاری تو ہم سے اٹھکیلیاں کر رہی ہے اور ہم اس دنیا سے بیزار بیٹھے ہیں۔ اس سال ماسٹر گوردت سنگھ صاحب کی سالانہ ترقی رک گئی تھی اور وہ ہر وقت بیزار رہتے تھے۔ اب جو شخص ہر وقت بیزار رہے، اس کو اٹھکیلیاں کا مطلب کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے!

لیکن اب جو میں نے ولایت کی اس رنگین کتاب میں میموں کو کپڑے اتارتے اور پہنتے دیکھا تو مجھے اٹھکیلیاں کا مطلب صاف سمجھ میں آ گیا۔ حالانکہ بہت بعد میں، آگے چل کر یہ حقیقت بھی کھلی کہ یہ بھی اٹھکیلیاں نہیں تھیں، وہ کچھ اور ہی ہوتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور جن کا مذکور ایک اور قسم کی کتابوں میں ہوتا ہے۔

آپا فرزانہ نے اس رنگین فہرست کے آخر میں برتنوں کا سیکشن نکال کر مجھے اس مشین کی تصویر دکھائی جو عنایت اللہ شوکیس میں پڑی تھی۔ آپا نے بتایا کہ اس کا نام سپریٹر ہے۔ اس سے کریم نکالی جاتی ہے اور اس کی سب سے اچھی ساخت سویڈن میں ہوتی ہے۔

مجھے اس مشین سے محبت ہو گئی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہنستے روتے اسی کا خیال رہنے لگا اور میں اس کا ایک حصہ بن گیا...... جب انسان کو کسی مشین سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ نہ اپنے کام کا نہ دوسروں کے

فائدے کا۔ ہر وقت ایک ہی دھن سوار رہتی ہے اور ایک ہی طلب دامن دل کھینچتی ہے کہ اس شے کا حصول ہو اور جلد ہو اور پورے کا پورا ہو! جب محبوب انسان ہو تو ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ دست طالب کو جھٹک دے گا۔ اظہار کے جواب میں انکار کر دے گا۔ اقرار کر کے جفا کار ہو جائے گا۔ بھول جائے گا۔ بھلا دے گا۔ کسی اور کا ہو جائے گا۔ کسی اور کے ساتھ چلا جائے گا۔ رقیب روسیاہ کو درمیان میں لے آئے گا۔ ناراض ہو جائے گا یا پھر اپنی چنچلتا سے بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا۔ مشین یہ سب کچھ نہیں کرتی۔ اس کے مزاج میں نہ جفا کاری ہے نہ فراموش کاری۔ نہ مکاری ہے نہ کنارہ کشی۔ وہ تو جب کسی کی ہو جاتی ہے تو پوری کی پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی بے ایمانی نہیں کرتی، خیانت نہیں کرتی، بے عفتی نہیں کرتی، ہمیشہ وفادار ہو کے رہتی ہے۔ مرسڈیز ہو، بی ایم ڈبلیو ہو، فراری ہو یا آلفا رومیو، جب ان کا عشق سر پر سوار ہوتا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ انسان برے سے برے کام کرنے سے نہیں چوکتا۔ صدر مملکت ہو چاہے بادشاہ، وقت موٹر کے عشق کا گرفتار، موٹر سے دور نہیں سو سکتا۔ رائفل ہو، ہیزل بلاڈ، کیمرہ ہو، کمپیوٹر ہو، سی ڈی سسٹم ہو، انسان ان کی محبت میں ہزاروں لاکھوں انسان قربان کر سکتا ہے۔ کلاشنکوف بنانے والے نے راتیں جاگ جاگ کر جس لگن کے ساتھ اپنے محبوب کا مجسمہ تیار کیا اور اس سے عشق کرنے والوں نے جس وارفتگی کے ساتھ اس کا استعمال کیا تو کسی بدنیتی سے نہیں اپنی محبوبہ کی نشیلی آنکھ کا نشانہ دیکھنے کے لیے اور اس کی چلنت کی دھڑکن محسوس کرنے کے لیے۔ مشین سے عشق کا علم نہیں ہوتا لیکن انسان اس کے ہجر اور وصال میں ایک سا گھلتا ہے اور گھل گھل کر ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی محبوب اتنا ظالم نہیں ہوتا۔

میں بھی ایک بیہودہ سی مشین کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا جو پوری مشین بھی نہیں تھی اور جس کا حصول بھی اتنا مشکل نہیں تھا۔

نانی زلیخا نے کہا "مرے کیوں جاتے ہو، یہ مشین لے لو۔ تین سو ہی میں تو آتی ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا "اور تین سو کدھر ہیں ہمارے پاس نانی ماں!"

انہوں نے باہر کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے چہرہ سنوار کے کہا "ماں سے کہو، وہ لے دے گی۔"

میں نے کہا "ان کے پاس اتنی رقم کدھر سے آئی جو وہ اپنے نکمے بیٹے کے چونچلے پورے کرتی پھریں۔"

آپا فرزانہ نے کہا "تمہاری ماں کے پاس بڑے پیسے ہیں لیکن بی بی انہیں ہوا نہیں لگواتی۔"

نانی بولیں "سارے مہاجر تالے توڑتے ہلکائے پھرتے ہیں۔ تم بھی کوئی تالہ توڑ کر کسی کوٹھی پر قبضہ کر لو۔ تم کو کسی نے منع تھوڑی کرنا ہے۔ مشکل تو ہم جیسے لوگوں کے لیے ہے جو اس ملک کے اصل باشندے ہیں اور مال غنیمت کے حصہ دار نہیں بن سکتے۔"

آپا نے کہا "ہم حصہ دار تو نہیں بن سکتے البتہ حصہ بنا تو سکتے ہیں۔ بی بی نے ادھر ادھر اچھے ہاتھ مارے ہیں، ہم اشفاق سے سفارش ڈلوا کر اپنا حصہ لے لیں گے۔"

میں نے قدرے اونچی آواز میں لرز کر پوچھا "آپ سے کس نے کہا؟" تو نانی زلیخا تشفی آمیز لہجہ میں بولیں۔

"یہ بات تو اب سارے خاندان میں مشہور ہو گئی ہے، اس میں کہنے اور سننے کی کیا بات ہے۔ سبھی جانتے ہیں!"

اس کے بعد میں کچھ دیر وہاں بیٹھا ضرور لیکن مجھ سے کوئی بات نہ ہو سکی!

نانی کی کوٹھی سے نکل کر میں ریگل کے برآمدے میں چالو اور آنے والی فلموں کی تصویریں دیکھتا رہا۔ پھر چہل قدمی کرتا ہوا اسمبلی ہال کے سامنے چھوٹے سے گراسی پلاٹ میں جا بیٹھا لیکن جب وہاں بھی دل کا بوجھ کم نہ ہوا تو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر پہنچ گیا۔ اماں اٹھ کر روٹی دینے لگیں تو میں نے کہا "رہنے دو اماں، مجھے بھوک نہیں۔"

انہوں نے حیرت سے میری جانب دیکھا تو میں نے کہا "آج دن بھر دفتر میں ایسی الم غلم چیزیں کھاتے رہے کہ اب معدہ انکاری ہو گیا ہے۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

اماں کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا لیکن ساتھ ہی ان کے چہرے سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ وہ چور ہیں اور انہوں نے بند کوٹھیوں کے تالے تڑوا کر بیگانہ مال سرقہ کیا ہے اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ میری ماں تو ایسی نہیں تھی لیکن کیا معلوم حالات اور واقعات نے ان کو ایسا بنا دیا ہو۔

بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے پاکستان بنانے میں دن رات ایک کر دیا تھا اور اپنے آپ پر راتوں کی نیندیں حرام کر لی تھیں، وہ دن کی روشنی میں حرام کھانے لگے تھے۔ بس دیکھتے دیکھتے اور کا اور ہو گیا تھا اور لوگوں کے چھپے ہوئے اندر باہر آ گئے تھے جس طرح اندر کی چھپی ہوئی گلٹی باہر آ جائے اور "صاحب گلٹی" اس طرح سے پریشان ہو جائے کہ اسے احساس نہ ہو، وہ پریشان ہو گیا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال حرام کھانے والوں کا تھا۔ کوئی کوئی شخص ان میں یہاں تک ضرور پہنچا تھا کہ ہم نے پاکستان سوچ سمجھ کر اور اپنے آپ کو بکتر بند کر کے نہیں بنایا بلکہ ایک جذبے کے تحت بنایا ہے اور جذبہ اندھا ہوتا ہے۔ ادھر بھی لے جا سکتا ہے، ادھر بھی لے جاتا ہے۔ اس کی لہر پر سوار انسان بالکل بے قابو ہو جاتا ہے۔

بہت ممکن ہے اماں بھی ادھر آ کر بے قابو ہو گئی ہوں اور ان سے یہ ساری خطائیں سرزد ہونے لگی ہوں جن کا ذکر نانی زلیخا اور فرزانہ آپا ایک ہی سانس میں کیا کرتی تھیں۔ میں نے اماں پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر دی اور اپنی بڑی آپا کو کچھ بتائے بغیر اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ ہماری تعمیر پاکستان والی مسلم لیگی قدروں پر نگاہ رکھیں اور جہاں کہیں ان میں کوئی تبدیلی محسوس کریں، فوراً سرجری کر کے اس خوفناک گروتھ کو جڑ سے کاٹ دیں۔

لیکن ہم سب کے محنت اور لگن سے کام کرنے کے باوجود ہمارے مالی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ابا جی نے دو تین مرتبہ لالہ بالک رام سے مزید قرض لیا تھا اور بھاری رقوم کا لیا تھا لیکن اس سے ہماری مالی حالت سدھرنے کے بجائے اور دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ میرے گھی، بکریاں اور انڈے، مرغ لانے والے بھائی یہ کام چھوڑ کر کچھ اور کرنے کی سوچ رہے تھے لیکن چھ سات ماہ کی عمر کے پاکستان میں کوئی پوٹینشل ہی نہیں تھا۔

جب میں نے یہ محسوس کیا کہ ہماری نانی زلیخا کا انصار گھرانہ ہم مہاجروں کو "چور اچکے، لالچی اور لوبھی" سمجھتا ہے اس نے ہمارے بارے میں غلط اندازے لگانے شروع کر دیے ہیں تو اس صورتحال نے مجھے شدید رنج میں لتھیڑ دیا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے مجھے یہی غم دیمک کی طرح چاٹنے لگا کہ ہم اپنی نیک نامی کا گرا ہوا سائن بورڈ پھر کیسے اٹھا کر اپنی ساکھ کے دروازے پر لگا سکتے ہیں۔

نانی زلیخا اور ان کے گھرانے سے روبہ اور دو بہ دو لڑنا ہماری طاقت سے باہر تھا۔ برادری میں ان کی شکایت کرنے کی کسی میں جرأت نہیں تھی۔ اپنی صفائی پیش کرنے پر کسی نے اعتبار نہیں کرنا تھا۔ یہ اتنا مشکل محاذ تھا اور وہ اتنے کڑے لوگ تھے کہ ہمارا ہونا نہ ہونا ایک جیسا تھا۔

تھی تو ایک طرح کی منافقت لیکن میں نے سوچا اپنا پالا چھوڑ کر نانی کے لشکر سے مل جاتے ہیں۔ اگر وہاں سیندھ لگ گئی تو ایک چھوٹا سا ڈائنامائٹ رکھ کر فلیتہ لگا دیں گے نہ لگ سکی تو واپس آ جائیں گے۔ گھر کے لوگ محبت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں، دھکے دھوڑے کھایا آدمی جب واپس گھر والوں کی دہلیز پر پہنچتا ہے تو دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔

ایک شام دفتر سے واپسی پر جب میں نانی کے گھر پہنچا تو آپا پاؤں کے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھیں۔ میں بیڈن سے باریک بوندی کے چھ لڈو لے کر چلا تھا۔ جاتے ہی لفافہ آپا فرزانہ کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے پوچھا "یہ کیا؟"

میں نے کہا "آپا میں نے وہ مشین خرید لی، کریم نکالنے والی۔ پونے تین سو میں۔"

پونے تین سو کا اعلان سن کر نانی بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ "کیا خریدلیا پونے تین سو میں؟"

"کریم نکالنے والی مشین اماں۔" آپا نے جواب دیا۔

"کس نے خریدی ہے؟"

"اس نے اماں...... اشفاق نے۔"

"یہ تو تین سو چھوڑ تین ہزار کی چیزیں بھی خرید سکتے ہیں۔" نانی نے وثوق کے ساتھ کہا "اب ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اس کا باپ چاہے تو پورے لاہور کو خرید سکتا ہے!"

میرے دل پر جیسے جاٹ کی برچھی لگی۔

آپا فرزانہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "مشین تو لے آئے ہو، مگر دودھ کہاں سے لو گے؟ اس کے ایک گھمان کے لیے کم از کم آٹھ سیر دودھ کی ضرورت ہو گی۔"

"اس کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں ذرا شرماتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر نانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے منہ کھولا ہی تھا کہ آپا بول اٹھیں "کدھر سے بندوبست ہو گیا ہے دودھ کا؟"

"اللہ نے تو کر دیا ہے منڈیا۔" نانی کہنے لگیں۔ "لیکن اس نے کوئی سبب بھی تو پیدا کیا ہو گا۔ اللہ سبب کے بغیر کچھ نہیں دیتا اور سبب اس کی ایک اوٹ ہے۔ اس نے کوئی راہ تو پیدا کی ہو گی ناں۔"

میں نے کہا "ہاں جی راہ پیدا کی ہے تو میں نے یہ مشین خریدی ہے ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی، خوانخواہ پیسے خرچ کرنے کی۔"

آپا نے بڑی محبت کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "آخر ہم کو بھی تو پتہ چلے کہ کونسی راہ پیدا ہو گئی ہے تم لوگوں کے لیے۔"

میں خاموش ہوگیا اور بڑی دیر تک اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ نانی نے کہا ''دیکھو ہم تیرے بڑے ہیں، تیرے بزرگ ہیں۔ تمہاری خوشی میں ہماری خوشی ہے اور تمہاری ترقی میں ہماری ترقی ہے۔ بتاؤ کیسا چانس ملا ہے تم کو؟''

میں پھر بھی اسی طرح خاموش اور ڈرا ڈرا بیٹھا رہا تو آپا فرزانہ نے چمکار کر کہا ''دیکھو میں تمہاری خالہ بھی ہوں اور تمہاری آپا بھی۔ پھر تمہارے آنے جانے سے ہم میں ایک طرح کی دوستی بھی پیدا ہوگئی ہے۔ اب اس دوستی میں اعتماد پیدا کرنا تمہارا کام ہے۔''

میں نے منمناتے ہوئے کہا ''مجھے ڈر لگتا ہے!''

''ڈر کس بات کا بیٹا!'' نانی نے کہا ''ہم تمہارے رشتہ دار ہیں، کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ کھل کر بات کرو۔''

''کھل کر بات کرو۔'' آپا نے کہا ''اور اعتماد کے ساتھ بات کرو، ہم پڑھے لکھے لوگ ہیں، ایک کا راز دوسرے کو نہیں دیا کرتے۔''

''بس سمجھو تم نے بات کی اور کنویں میں گر کر ختم ہوگئی۔'' نانی بولیں۔ ''ہم ایک کی بات دوسرے سے نہیں کیا کرتے۔ ہمارے بڑے پختہ اصول ہیں۔''

میں پھر بھی اسی طرح خاموش بیٹھا رہا تو آپا نے میرا گندہ ہاتھ اپنے خوشبودار ہاتھوں میں لے کہا ''ایسے چپ چپ کیوں ہو؟ اصل بات کیوں نہیں بتاتے؟ ہم کوئی تمہارے دشمن ہیں جو تمہاری پرائیویٹ بات کسی اور کو بتا دیں گے؟ شاباش، شاباش، کم آن...... کیا بات ہے؟''

میں نے آہستہ سے کہا ''دودھ کا بندوبست ہوگیا ہے اور تقریباً بیس سیر دودھ روز ملنے لگا ہے۔''

''لیکن کیسے بھئی؟ کس طرح؟'' آپا نے متھار کر پوچھا۔

''وہ ایسے آپا......'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''ہمارے قریب ہی فین روڈ پہ اندر کو جا کر رائے صاحب رام کرنی داس ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کی کوٹھی ہے۔ کوٹھی تو بند ہے البتہ اس کے سرونٹس کوارٹر اور شیڈ کے اندر رائے صاحب کی دو بھینسیں ابھی بھی موجود ہیں۔''

''اور وہ ابھی تک زندہ ہیں!'' نانی نے جلدی سے پوچھا۔

''ان کی دیکھ بھال کو ایڈووکیٹ صاحب ایک پوربیا ملازم چھوڑ گئے ہیں جو کوٹھی کی رکھوالی بھی کرتا ہے اور بھینسوں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ پرسوں افتخار بھائی نے اندر جھانک کر دیکھا تو پوربیا ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں بیٹھا روٹی پکا رہا تھا۔ بھائی جان نے اندر جا کر پوچھا کہ تم ابھی تک یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہو تو وہ گھگھیا کر بولا، مالک مجھے بھینسوں کی رکھوالی پر چھوڑ دیا ہے۔ بھائی جان نے جھڑک کر کہا، اوئے حرام زادے کافر ابھی تک کسی کو پتہ ہی نہیں چلنے دیا کہ تم یہاں رہتے ہو۔ وہ روٹی چولہے پر ہی چھوڑ کر ہاتھ باندھ کر رونے لگا اور کہنے لگا، مالک میری جان بخشی کر دیو میں تیرے سامنے ہی کوٹھی چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔ وہ چلا گیا تو بھائی جان نے بالٹی لے کر دونوں بھینسوں کی دھار نکالی اور دودھ لے کر گھر آگئے۔ اب صبح کے وقت وہ دودھ دوہتے ہیں اور شام کو میں جا کر دوہتا ہوں۔ اماں نے لسی بلو کر مکھن نکالنا شروع کر

دیا ہے اور اب ہم مکھن ڈال کر سالن بناتے ہیں۔''

''دودھ تو لے آتے ہو بالٹیاں بھر کر۔'' نانی بولی ''لیکن بھینسوں کا خرچ کون پورا کرے گا؟''

اس سوال سے میں کچھ بوکھلا سا گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ پر جرح بھی ہو سکتی ہے اور مجھ سے مشکل سوال بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ کافی گھمبیر صورتحال تھی لیکن چونکہ مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، اس لیے میں نے دونوں ماں بیٹی کو اپنے اعتماد میں لے کر کہا ''رائے صاحب کے شیڈ میں دو سو بوری تو بنولے کی پڑی ہے اور ساٹھ بوری کھلی کی موجود ہے۔ ایک پرانا گیراج بھوسے توڑی سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ بوریاں چنے کی دال اور چنے کی بھوسی کی بھی ہیں۔ سال دو سال تک آسانی سے کام چل جائے گا۔''

''اور اگر کسی اور نے بھینسوں اور گیراجوں پر قبضہ کر لیا، تمہاری طرح...... پھر؟''

''ہم نے نورے گھیاڑ کو چشتیاں سے بلوا لیا ہے، اب بھینسیں اور بھوسہ چوکر اس کی نگرانی میں ہے۔''

دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسری کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور ان کی آواز مدھم پڑ گئی۔ میں نے کہا ''اب مجھے رخصت دیجیے، زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا کہ مجھے جا کر بھینسوں کی دھار نکالنی ہے اور پھر ماں کے ساتھ مل کر دودھ کاڑھنا ہے۔''

ان دونوں کی کلغیاں گرا کر جب میں کوٹھی کے دروازے سے نکلا تو میرے فتح یاب دل نے پر پھڑ پھڑا کر ایک اونچی اذان دی اور میں پٹڑی پر گھمن گھیریاں سی ڈال کر چلنے لگا لیکن ایک دن کے اندر اندر یہ بات مصری شاہ والے پھپھا جی، مسلم ٹاؤن والی خالہ اور اسلامیہ پارک کے لالہ جی کے یہاں پہنچ گئی۔ میری ماں نے رو رو کر اور بددعائیں دے دے کر برا حال کر لیا۔ جب میری ماں روتے ہوئے ناک صاف کر کے اس جھوٹ بہتان لگانے والے کو بددعا دیتی تو میں سر سے لے کر پاؤں تک لرز جاتا لیکن میری ماں نہیں جانتی تھی کہ میں اسی کا بدلہ لے رہا ہوں اور ایک سائنٹفک طریقے پر لے رہا ہوں۔

انہی دنوں آپا فرزانہ کی چھوٹی بہن آپا نعمانہ پنڈی سے ملنے کے لیے آئیں تو میری نانی اور آپا نے ان کو ہمارے وارے نیارے کی طویل داستانیں سنائیں۔ مجھے ان کی آمد کا پتہ چل گیا تھا اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کس شدت سے میرا انتظار کر رہی ہیں لیکن میں تین چار دن ان کے گھر نہیں گیا۔ خالی دے گیا۔

میری ماں کو کچھ شک پڑنے لگا کہ یہ سارا جھوٹا پروپیگنڈہ ان کی خالہ زلیخا کرتی ہیں اور ایسی ساری کہانیاں ان کی کوٹھی میں پروان چڑھتی ہیں اور وہاں سے پھر سارے خاندان میں ایکسپورٹ ہوتی ہیں لیکن میں نے اماں کے خیال باطل کو اپنی مضبوط دلیلوں سے کاٹ دیا اور ان کی تشفی کرا دی کہ یہ سب کچھ کوئی اور کرتا ہے اور وہ ادھر ہی کہیں، ہمارے گھر کے آس پاس آباد ہے۔ اماں کی ساری توجہ اپنے ارد گرد کے لوگوں پر مرکوز ہوگئی اور وہ ایک گھرے بھمبل بھوسے میں پھنس گئیں۔

کچھ دنوں بعد جب میں نانی کے گھر گیا تو آپا نعمانہ نے میرے ساتھ ایسے گلے شکوے کیے کہ مجھے سچ مچ یقین

ہوگیا کہ سارے خاندان میں ان سے بڑھ کر کوئی بھی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا ''میں نے تو پنڈی سے چلتے ہو کیپٹن صاحب سے کہا تھا کہ اگر میں اشفاق سے نہ مل سکی تو میرا لاہور جانا ہی بیکار ہوگا۔ شکر ہے تم آ گئے لیکن تم ایسے بے وفا اور بے حیا ہو کہ اتنے دن ڈال کر آئے ہو۔ کیا تم کو پتہ نہیں چلا تھا کہ تمہاری آپا نعمانہ آئی ہوئی ہیں۔''

میں نے شرمندگی کا سر جھکا کر کندھے سکیڑ کے کہا ''مجھے معلوم تو ہوگیا تھا آپا کہ آپ آئی ہوئی ہیں لیکن ہمارے کیمپ میں پناہ گزینوں کی دو گاڑیاں ایک ساتھ انڈیا سے آئی تھیں اور ان کے زخمی اس بری طرح سے کٹے ہوئے تھے کہ ان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ادھر قبرستان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ میں نے تو ماڈل ٹاؤن کے باہر سڑک کنارے قبریں کھدوا کر لاشوں کو دفن کر دیا۔ لحدیں تو نہیں اٹھوائیں بس ایک نشان سے دوسرے نشان تک ایک لمبا سا اجتماعی قبرستان بنا دیا ہے۔ آگے اللہ معاف کرے۔''

میرا خیال تھا اس دردناک منظر سے متاثر ہو کر وہ سب رونے لگیں گے اور مجھے برا بھلا کہیں گی کہ میں نے لحدوں کی نشانیاں کیوں نہیں اٹھائیں اور انہیں دفن کرنے کے بعد زمین کو سپاٹ کیوں کر دیا مگر ان تینوں نے میری اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نہ وہ حیران ہوئیں۔ نہ ان کا دل پسیجا، نہ ہی آنکھیں نمناک ہوئیں۔ نانی زلیخا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ''بھینسوں کا کیا حال ہے؟''

میں نے کہا ''بھینسوں کا حال تو اچھا ہے لیکن نانی ایک مصیبت آ پڑی ہے۔ ہمیں خیال بھی نہیں تھا کہ یہ مشکل بھی ہو سکتی ہے لیکن ہوگئی......''

''ایسا تو پھر ہوتا ہے۔'' فرزانہ آپا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مفت کے مالوں پر یوں آزادی سے قبضے تو نہیں ہوتے!''

میں نے رک رک کر کہا ''سب تو ٹھیک ہوگیا نعمانہ آپا لیکن ابھی پورا سکون نہیں ہوا۔ ایڈووکیٹ صاحب کی کوٹھی میں گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''وہ تو ہونی ہی تھی۔'' فرزانہ آپا نے کہا۔

لیکن نانی زلیخا اصل حقیقت جاننے کے لیے بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے کہا ''کچھ پھوٹے گا بھی منہ سے یا ایسے ہی مرمیے پڑھتا جائے گا۔''

میں نے کہا ''دونوں بھینسوں کی جو دو کٹیاں تھیں، وہ دیکھتے دیکھتے جوان ہوگئیں۔''

''ابھی سے!'' نانی نے بات کاٹ کر کہا۔

میں نے کہا ''جی میرا مطلب ہے وہ دودھ پینا چھوڑ کر چارہ کھانے لگیں۔ اماں نے کہا دودھ پر بھی مہنگی تھیں اور چارے پر اور بھی مہنگی ہوگئی ہیں، ان کو دفع کرو۔ قصائیوں کو دے دو۔''

''ہائے میں مروں!'' نعمانہ آپا نے جھوٹی موٹی کہا۔

تو میں نے کہا ''نعمانہ آپا آدھی بوری تو وہ کھلی کی کھا گئیں اور آدھی چنے کے چھلکے اور سوڑھ کی۔ اماں نے کہا، ان کو دفع کرو۔''

''پھر کر دیں دفع؟'' نانی نے پوچھا۔

میں نے کہا ''جی ہاں، اسی اسی روپے میں دونوں بیچ دیں۔''

''چلو ایک سو ساٹھ یہ مل گئے تیری ماں کو مفت۔'' نانی نے ناخوش ہو کر کہا۔

میں نے کہا ''جی ایک سو ساٹھ تو مل گئے لیکن بھینسوں نے اپنی بچیوں کو یاد میں اڑانا شروع کر دیا۔ اس قدر زور زور سے ڈکرائیں کہ سارا علاقہ ان کے نالہ و شیون میں ڈوب گیا۔''

''کوئی آیا تو نہیں تحقیق کرنے؟'' نانی زلیخا نے پوچھا۔

''نہیں جی، تحقیق کرنے کس نے آنا ہے؟'' میں نے کہا ''آنا تھا تو مرنا تھا۔''

آپا نعمانہ اس واقعے پر کچھ زیادہ حیران نہ ہوئیں کیونکہ ان کو ساری بیک گراؤنڈ معلوم تھی۔ کچھ یہاں پہنچ کر معلوم ہوئی، کچھ روز کے روز ان کو فون پر بتا دی جاتی تھی۔ انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ''اب تو سکون ہے؟''

میں نے کہا ''جی اللہ کا شکر ہے۔ اب تو سکون ہے۔ اب تک تو وہ اپنی بچیوں کو بھول بھلا بھی گئی ہیں۔ شروع شروع میں ان کا دودھ بھی سوکھ گیا تھا لیکن اب بفضل خدا پھر اسی طرح سے دوہیل ہوگئی ہیں اور بالٹیاں بھر بھر کر دودھ دیتی ہیں۔''

یہ بھینسوں والا قصہ اس قدر شہرت پکڑ گیا تھا کہ ہمارے لاہور کے رشتہ داروں سے نکل کر دور دور شہروں تک چلا گیا تھا۔ میری ماں پہلے تو صرف گالیاں اور کوسنے دیتی تھیں، اب اس بجتان سے زخمی ہو کر دو ہتڑ بھی پیٹنے لگیں۔ مجھے اماں پر بہت ترس آتا تھا لیکن میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا، مجبور تھا۔

اس زمانے میں مال روڈ پر یاسین خان پیسٹری والے کی ایک مشہور دکان تھی جہاں سے پیسٹری اور جنرل مرچنڈائز کے علاوہ شیشے کی گلاسیوں میں کریم بھی مل جاتی تھی۔ میں نے دو گلاسیاں کریم خرید کر انہیں گھر لے جا کر سلور کی کٹوری میں انڈیلا اور اوپر اخبار کا کاغذ ڈوری چڑھا کے باندھا۔ یہ پنڈی سے آئی ہوئی نعمانہ آپا کے لیے ایک بیش بہا تحفہ تھا کہ وہ مری جا کر ہمیشہ کریم کافی پیا کرتی تھیں۔

انہوں نے کٹوری میں انگلی ڈبو کر سفید سفید کریم کو اپنے سرخ سرخ ہونٹوں سے چوسا اور پھر چٹخارہ بھر کر پوچھنے لگیں ''تم نے خود بنائی ہے اپنی مشین سے...... خود!''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر عاجزی کا اظہار کیا تو وہ خوشی سے لہرا کر بولیں ''فرزانہ آپا چکھ کے دیکھیے بالکل اصل کریم کا مزہ ہے۔ وہی فریش نیس، وہی موٹائی، ویسی سفیدی اور وہی خوشبو۔''

آپا نے کہا ''اب اس کو مشین چلا چلا کر محاورہ بھی تو ہوگیا ہے۔ بڑی آسانی سے سائیڈ بزنس شروع کر سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ محاورہ تو ہوگیا ہے۔ البتہ ایک دوسری مایوسی گلے کا ہار بن گئی ہے۔ ہم نے رائے بہادر صاحب کی کھول لی ہے لیکن اس میں بھاری بھرکم فرنیچر اور موٹے موٹے قالینوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

''کرا کری؟ کرا کری؟'' فرزانہ آپا نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے کہا ''وہ تو بہت ہے، تین الماریاں بھری ہوئیں لیکن عجیب سی گنواروی۔ ہم نے چائے کا ایک سیٹ نکالا تھا تو اس کی پیالیاں اتنی پتلی اور ایسی باریک دیواروں کی ہیں کہ باہر سے ساری چائے نظر آتی ہے۔''

نعمانہ آپا نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''ہائے میں مرجاؤں آپا۔ بون چائنا۔''

میں نے کہا ''بالکل ٹھیک ہے، ان سب کے پیندے کے نیچے یہی لکھا ہے۔ ہم یہ سیٹ نکال کر گھر لے جا کے چائے پینے بیٹھے تو اماں نے ساری چائے باہر پھینکوا دی۔''

''کیوں؟'' نانی نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''آپا نے اماں کو بتا دیا کہ اماں یہ پیالیاں ہڈی سے بنی ہیں اور ان پر بون لکھا ہوا ہے۔'' اماں نے کہا، ''دفع دور پتہ نہیں کس حرام جانور کی ہڈی ہوگی۔ ہم نہیں استعمال کرتے۔ سب ہاتھ منہ دھوؤ، کلی کرو۔''

''اور وہ ٹی سیٹ؟'' آپا فرزانہ نے پوچھا۔

''وہ اماں نے جمعدارنی کو دے دیا۔''

دونوں بہنوں نے ایک ساتھ چیخ نما نعرہ لگایا اور سر پیٹ لیا۔ پوچھنے لگیں ''تمہاری جمعدارنی کہاں رہتی ہے؟''

میں نے کہا ''وہ پروفیسر ابرار صاحب کے کوارٹر میں رہتی ہے۔ پروفیسر صاحب نے بیس روپے میں وہ سیٹ جمعدارنی سے خرید لیا ہے اور بہت خوش ہیں۔ ان کو حرام حلال کی کوئی پروا نہیں۔ ان کے سارے گھر والے اسی سیٹ میں چائے پیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہڈی کا ہوا تو کیا ہوا۔''

دونوں بہنوں نے ایک دوسری کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا جس میں غم غصہ حسرت لالچ پشیمانی اور شدید رنج کا اظہار تھا۔

میں نے کہا ''اچھا آپا میں اب چلتا ہوں، کافی دیر ہوگئی ہے۔ اماں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

جب میں گھر پہنچا تو اماں واقعی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''کل تجھے دفتر نہیں جانا۔ میرے ساتھ چلنا ہے منٹگمری۔'' میں نے حیرانی سے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اٹھ کر اسے گھٹ کے جپھی ڈالی تو وہ اور زور سے رونے لگی اور آہوں اور کراہوں میں اس کا بدن جھٹکے کھانے لگا۔ میں نے اپنے گندے سے رومال سے اس کے شفاف اور پاکیزہ آنسو پونچھے اور پھر چمکار کر پوچھا ''کیا بات ہے اماں؟ تو اس طرح سے رو کیوں رہی ہے؟''

اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ''ہماری منٹگمری کی ساری برادری میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ بی بی سردار بیگم کے مشٹنڈے بیٹوں نے لاہور لوٹنا شروع کر دیا ہے اور انہوں نے جانے والے ہندو مہاجروں کی کوٹھیاں توڑ کر ہر طرح کا سامان وہاں سے اٹھا لیا ہے اور تو اور انہوں نے چھ بھینسیں بھی لوٹ کر ایک احاطے میں جمع کر لی ہیں اور صبح، شام دودھ بیچنا شروع کر دیا ہے۔'' پھر ماں نے اونچے اونچے رو کر کہا ''ساری برادری میں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ میں بیچے ہوئے

دودھ کو بلو کر مکھن نکالتی ہوں اور گھی بنا کر بیچتی ہوں۔''

میں نے کہا ''چھوڑیں اماں، دفع کریں۔ ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان کا جواب دینے کی یا انہیں صفائی پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہم جو ہیں سو ہیں، ہم جانیں اور ہمارا خدا۔ ہمیں کسی کے سرٹیفکیٹ کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اماں نے کہا ''بکواس نہ کر اور جس طرح سے میں کہتی ہوں ویسے ہی کر۔ اپنا بیگ ابھی سے تیار کر کے رکھ لے صبح سویرے ہم پہلی لاری سے منٹگمری روانہ ہو جائیں گے اور دو دن ٹھہر کر واپس آ جائیں گے۔ میں برادری کے لوگوں سے منہ در منہ بات بھی کر لوں گی اور اپنے بھائی بہنوں اور عزیز رشتہ داروں سے مل بھی لوں گی۔''

''لیکن میں دفتر سے چھٹی لیے بغیر کیسے جا سکتا ہوں اماں۔'' میں نے منمنا کر کہا تو مجھے ایک زور کی ڈانٹ پڑی کہ ''ایسی کونسی تیری ڈپٹی کمشنری کی نوکری ہے جس کے لیے چھٹی لینی پڑے۔ واپس آ کر عرضی دے دینا۔ کوئی نہیں کچھ کہتا۔''

اب ان کی اس دلیل کے آگے میں کیا عرض کر سکتا تھا۔ ذرا سی دیر خاموش رہ کر میں نے کہا ''اچھا اماں جیسے آپ کی مرضی۔ جو آپ کہیں گی وہی ہوگا۔''

سہ پہر کے قریب ہم منٹگمری پہنچے تو لاری اڈا پر میرے کچھ ماموں، کچھ خالو اور ایک چچا کھڑے تھے۔ میری اماں چونکہ سب سے بڑی تھیں، اس لیے سارے ان کا دل و جان سے احترام کرتے تھے۔ جب ہم لاری سے اتر رہے تھے عین اسی وقت ماما نور محمد اپنے بیٹے اسحاق کو لے کر آ گئے۔ وہ بہت شرمندہ تھے کہ وقت سے پہلے اڈا لاریاں پر پہنچ کر بی بی کا سواگت نہ کر سکے۔

میرے ان سارے بزرگوں نے ایک مجھے گود میں نہیں اٹھایا، باقی اپنی محبت کے اظہار میں سب کچھ کیا۔ میں اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان سب کے دلوں میں اپنی بی بی کی ایسی قدر ہے۔

وہاں مجھے میرے کزن ضمیر کا ایک اور بھائی بھی ملا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بڑے تپاک اور گہری عقیدت و محبت سے میری ماں کو سلام کیا۔ میری ماں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی آبدیدہ ہو گئیں۔ منیر کے والد، میری ماں کے بھائی، کسی حادثے میں فوت ہو گئے تھے اور منیر نو عمری میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔ بھائی ضمیر نے بتایا کہ ہمارا یہ لاڈلا بھائی کوئی کام نہیں کرتا، شاعری کرتا ہے اور منیر نیازی کے نام سے لکھتا ہے۔ اس کی کچھ نظمیں اخبار رسالوں میں بھی شائع ہو چکی ہیں، اور اب یہ منٹگمری سے اپنا ایک پرچہ نکالنے کا منصوبہ بنا رہا ہے لیکن ہم اسے منع کر رہے ہیں کہ اپنا ٹرانسپورٹری کا آبائی کام چھوڑ کر کسی نئی بک بک میں نہ پڑے اور اسی کام میں عزت حاصل کرے جس سے باپ دادا نے دولت بھی کمائی ہے اور نام بھی کمایا ہے۔

میں اپنے خاندان کے ایک ہم نوجوان شاعر کو اپنے درمیان پا کر بہت خوش ہوا اور اس سے راہ و رسم بڑھانے کو قریب جا کر بولا ''مجھے بھی شاعری سے گہرا شغف ہے اور میں بیت بازی کے انٹر کالجیٹ مقابلوں میں شریک ہو کر ہمیشہ انعام حاصل کرتا رہا ہوں۔ اب آپ کو بھی اس مشغلے کا شوقین پا کر اپنی دوستی کا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتا ہوں...... السلام علیکم!''

میرا ہاتھ بڑھے کا بڑھا رہ گیا اور اس ظالم نے مجھ سے ہاتھ ملانا پسند نہ کیا۔

جب ہم دونوں ظالم و مظلوم ایک دوسرے کے سامنے چپ چاپ کھڑے تھے تو میری ماں نے آواز دے کر کہا:

''منیر میری صندوکڑی اٹھا لو بیٹا اور آگے آگے چلو۔ اپنی ماں کو بتاؤ کہ میں آ گئی ہوں۔''

منیر نے ''اچھاجی'' کہہ کر لپک کر اماں کی صندوکڑی اٹھا لی اور اسے اس فخر سے اٹھا کر چلا جیسے وہ شاعر نہ ہو کوئی معمولی سا منیر نیازی ہو۔

اماں نے جاتے ہی ساری برادری میں رپھڑ ڈال دیا تو سب مرد اور عورتیں کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر کہنے لگیں کہ ''ہم سے جونسی چاہے قسم لے لیں بی بی ہم نے نہ تو ان باتوں میں کوئی دخل دیا اور نہ کسی پر اعتبار کر کے ایسی باتوں کو مانا۔ یہ کوئی اور ہی بدذات اور بے ایمان کافر ہے جو آپ کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں پھیلاتا ہے۔ ہم اس سے بالکل بری الذمہ ہیں۔''

اماں نے ہاتھ اٹھا کر اس کافر، کتے کو بددعائیں دیں کہ اللہ کرے کیڑے پڑیں۔ کوڑھی ہو کر مرے۔ آنکھوں میں سُنڈیاں چلیں، کفن نصیب نہ ہو، چیلیں، کوے گدھیں گیدڑ لاش نوچ نوچ کر کھائیں، قبر نصیب نہ ہو۔

موقع پر موجود سب بی بیوں نے ہاتھوں پر دوپٹے پھیلا کر آمین کہا اور مردوں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر ثم آمین کہا۔ ایسی بددعائیں سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن میں مجبور تھا۔ ہمارے شریف، غریب، مفلوک الحال گھرانے کی تذلیل ہو رہی تھی، خاص طور پر میری ماں کی عزت چوراہے میں نیلام ہو رہی تھی، یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر تھا۔ میں ہر حال میں اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا۔ تیر و تفنگ سے بدلہ لینے کی مجھ میں طاقت نہ تھی، بس ایک فکشن کا سہارا تھا جو چوکھی لڑ رہی تھی اور بھرے ہاتھ کے وار کر رہی تھی۔

اماں جب ہماری منٹگمری برادری کی یو این او سے برأت کا سرٹیفکیٹ لے کر واپس لاہور پہنچیں تو اگلے ہفتے راولپنڈی برادری میں اپنا کیس لے جانے کا پروگرام بنانے لگیں۔ میں نے کہا ''اماں! ابھی دو تین ہفتے ٹھہر کے جانا، اوپر تلے ٹھیک نہیں۔ بڑے بزرگ سمجھیں گے شاید آپ ہی میں کوئی خرابی ہے جو بھاگی پھرتی ہیں۔'' اماں کی مہربانی تھی جو انہوں نے میری بات مان لی ورنہ اتنی اجتماعی بددعاؤں کے سامنے میرا اکلھ نہیں رہنا تھا!

تین دن بعد جب میں منٹگمری سے لوٹا تو سیدھا نانی کو سلام کرنے گیا۔ میری دونوں آپائیں اور نانی اور ساتھ ان کی کوئی سہیلی چائے پی رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ان کا خان زمان پرچ پیالی لے آیا اور میں ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔

ان کے اس استفسار پر کہ میں اتنے دنوں کہاں رہا؟ میں نے ڈرتے ڈرتے اور رکتے رکتے آپا فرزانہ کی طرف منہ کر کے کہا ''میں دو دن کے لیے جہلم گیا ہوا تھا۔''

''جہلم!'' نانی زلیخا نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''جہلم؟ وہ کس لیے اور وہاں کس لیے؟ جہلم میں تمہارا کون ہے؟''

میں نے کہا ''نانی! جہلم محاذ کشمیر کا بیس کیمپ ہے اور وہاں میں اپنے مجاہد بھائیوں سے ملنے گیا تھا۔ وہ دونوں ہر پندرہویں دن ایک ہفتہ ریسٹ کرنے کے لیے جہلم آتے ہیں اور یہاں سے گولہ بارود اور گڑ چنے لے کر واپس محاذ پر جاتے ہیں۔''

نانی نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہنسنے لگیں۔ انہوں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ ہندوستانی گورنمنٹ کہتی ہے کہ پٹھان حملہ آور لوٹ مار کے لیے کشمیر میں داخل ہوتے ہیں اور مقامی باشندوں کا مال و اسباب لوٹ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کا کشمیر کی آزادی سے یا کشمیریوں کو ہندوستان کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کی کوئی آرزو نہیں۔ میں نانی کی معنی خیز نظروں کا مطلب سمجھ گیا لیکن میں اس موقع اور اس مقام پر اپنا بیان بدلنے کا آرزومند نہیں تھا۔ میں نے اپنی نظریں جھکا لیں اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ نانی زلیخا میرے نظریں جھکانے اور خاموش رہنے کا مطلب آسانی سے سمجھ گئیں اور انہوں نے مجھے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میں شکست خوردہ سا وہاں سے لوٹ آیا اور شرمندہ شرمندہ اپنے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

اس زمانے میں ایک انگریزی میگزین ''لائف'' بڑا زوروں کا رسالہ تھا۔ تجازی سائز کا رنگین تصویروں اور معنی خیز مضمون سے لدا پھندا یہ رسالہ ہر پندرہ دن بعد بڑی باقاعدگی سے دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتا۔ میرے پاس اس رسالے کا پورا دو سال کا فائل تھا لیکن وہ مکتسر میں رہ گیا۔ سن چھیالیس میں میں نے اس رسالے کے ایڈیٹر کو ایک خط بھی لکھا تھا جو تین فقرے کم، سارے کا سارا چھپ گیا تھا۔

رسالہ ''لائف'' کی اسسٹنٹ ایڈیٹر اور دنیا کی نامور فوٹوگرافر اور سٹوری رائٹر مارگریٹ برک وہائٹ تاریخ انسان کی سب سے بڑی ہجرت کی تصویری کہانی بنانے لاہور آئی تھیں۔ میں ان کے رسالے کے ذریعے ان کے نام سے ان کے کام سے ان کی دفتری اور گھریلو زندگی سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ مہاجر کیمپوں میں مہاجرین کی مجموعی ہیئت اور ان کی خستہ حالی کی تصویریں بنانے کے لیے مارگریٹ برک وہائٹ نے میرے کیمپ کمانڈنٹ سے مجھ کو مانگ لیا اور میں مسز وہائٹ کی اردلی میں ان کے ساتھ ساتھ ایک غلام زادے کی طرح دوڑنے بھاگنے لگا۔ وہ بیرک کی ٹین کی چھت پر چڑھ کر دور دور تک پھیلے مہاجروں کا فوٹو اتارنا چاہتی ہیں تو میں اپنے کندھوں کی سیڑھی بنا کر انہیں کھلی کھڑکی کے پٹ کا زینہ مہیا کر کے چھت پر چڑھا رہا ہوں۔ وہ ضہرو لیاقت پیکٹ کے تحت ٹاٹا ایئر لائنز کے اترنے اور چڑھنے والے جہازوں کا فوٹو بنانا چاہتی ہیں تو میں جلدی سے میز گھسیٹ کر میز پر ٹین کی کرسی رکھ کے، کرسی کے پائیوں کو مضبوطی سے پکڑ کر مارگریٹ کو اس پر چڑھا رہا ہوں اور اپنی خدمت گزاری پر فخر کر رہا ہوں۔ میڈم برک وہائٹ کہتی ہیں لنگر سے تنوری روٹی اور دال لے کر آؤ تو میں سائیکل کی سی رفتار سے بھاگا جا رہا ہوں اور لانگری سے درخواست کر رہا ہوں کہ کچھ ایسا کرو جس سے دال میں مرچیں کم ہو جائیں۔

دن بھر میڈم مارگریٹ برک وہائٹ کا مہاجر کیمپوں میں ساتھ دینا، شام کو اسے تانگے کی سیر کرانا اور اس کا اگلی سیٹ پر بیٹھ کر بچوں کی طرح تانگے کی گھنٹی بجانا، اس کی ڈاک کو احتیاط کے ساتھ جی پی او لے جا کر پوسٹ کرنا، اس کو ہر روز کوئی نہ کوئی دیسی کھانا کھلانا اور وقت سے پہلے دکاندار کو بتلا جانا کہ کھانے کا ذائقہ، خوشبو اور کاٹ وہی رہے لیکن اس میں مرچیں کم ہوں۔ سب سے پہلے باربی کیو کا مطلب مجھے میڈم ہی کی زبانی معلوم ہوا ورنہ میں تو باربی کیو کو گاہکوں کی وہ قطار ہی سمجھتا تھا جو باربر کی دکان پر اپنی باری کے انتظار میں لگی ہوتی ہے۔ میڈم کو لاہوری کھانوں میں سب سے زیادہ خلیفے کے کباب پسند تھے اور وہ ہر دوسرے دن چونا منڈی جا کر خلیفے کے باربی کیو سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔

میڈم مارگریٹ برک وہائٹ کو پورے دس روز لاہور میں گزارنے تھے لیکن ان کے جانے کا اچانک پروگرام بن گیا۔ امریکہ سے کیبل گرام آیا تھا اور میں نے ہی ریسیو کر کے میڈم کو دیا تھا۔ تار دیکھ کر وہ آن واحد میں تیار ہو گئیں۔ اورینٹ ایئرویز کا ڈکوٹا لاہور سے ملتان، ملتان سے حیدر آباد ہو کر کراچی جاتا تھا۔ میڈم کراچی روانہ ہو گئیں اور جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئیں کہ میرے کپڑے لے کر محتاجوں میں تقسیم کر دینا۔ پادری صاحب کو دے دینا یا خود انہیں ڈسپوز کر دینا۔ ڈرائی کلیننگ کی اجرت میں نے ادا کر دی لیکن کپڑے ابھی تک تیار نہیں ہوئے تھے۔

میڈم مارگریٹ کے کپڑے لانڈری کی نہایت ہی خوبصورت لڑکی سے (جو کاؤنٹر کے دوسری طرف تیار شدہ کپڑے بڑے سے خاکی کاغذ میں گلوری کی طرح لپیٹا کرتی تھی) لے کر میں سیدھا نانی زلیخا کے گھر پہنچا۔ آپا فرزانہ بال دھو کر دھوپ میں سکھا رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں "مرز" کا ایک پرانا پرچہ تھا اور وہ اپنے کنوارے زمانے کی پھُنّی کا کی سی بن کر اپنے دونوں پاؤں پائینچوں میں پھنسائے بیٹھی تھیں۔ میں سلام کر کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تو وہ میرے پیکٹ کی طرف اشارہ کر کے بولیں "یہ کیا ہے؟"

"یہ کپڑے ہیں۔" میں نے خوشی سے کہا۔ "ولایتی کپڑے۔ یوروپین۔"

"تم نے کہاں سے لیے؟" انہوں نے حیران ہو کر پوچھا تو میں نے مسکرا کر کہا "آج کل سب کچھ مل جاتا ہے، ذرا سی ہمت ہونی چاہیے۔"

آپا نے کہا "ہمت کے بچے، لا دکھا مجھے، کیا اٹھائے پھرتا ہے۔"

میں نے ڈرائی کلین کا دو رنگوں میں چھپے خاکی کاغذ کا پڑا ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ انہوں نے کمال صفائی اور شائستگی کے ساتھ اسے کھولا اور اس پیکٹ میں ولایتی کپڑے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ "یہ کیا؟" انہوں نے چہرہ اوپر اٹھا کر پوچھا تو میں نے ادھر ادھر نظریں گھما کر سارے ماحول کا جائزہ اس طرح سے لیا جیسے کوئی اور تو موجود نہیں۔ کوئی سن تو نہیں رہا، کوئی دیکھ تو نہیں رہا...... پھر میں نے آہستگی سے کہا "رائے بہادر رام سرن داس ایڈووکیٹ کی کوٹھی کا ایک اور کمرہ کھولا تھا تو اس کے وارڈ روب میں سے یہ پیکٹ برآمد ہوا۔"

"لیکن یہ تو ولایتی کپڑے ہیں؟" آپا نے کہا۔

"رائے بہادر صاحب کی بڑی بہو ایک آرٹش لڑکی تھی۔" میں نے منمناتے ہوئے کہا "اردگرد کے لوگوں سے مجھے ہی کچھ معلوم ہو سکا، اس سے زیادہ نہیں۔ آپ اپنی پسند کے کپڑے رکھ لیں اور جو مناسب نہ ہوں، وہ مجھے واپس کر دیں۔"

آپا فرزانہ نے ان میں سے ایک سیش، ایک پولکا ڈاٹس کا رومال اور تین لنگریز علیحدہ کر لیں۔ پھر انہوں نے سارے کپڑوں کو یکجا کرتے ہوئے کہا "تو ان کا کیا کرے گا، باقی کپڑوں کا؟"

میں نے کہا "وہ میں اماں طالعاں کی بیٹی کو دے دوں گا۔ اس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی ہے، وہ ان کپڑوں کو کاٹ کتر کر بچی کی فراکیں اور کلوٹ بنا لے گی۔"

"تو رہنے دے اماں طالعاں کی بیٹی کو۔" آپا نے چڑ کر کہا "اسے کیا معلوم کہ یہ کپڑا کیا ہے اور کس قدر قیمتی

ہے۔ گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ۔ تو رہنے دے، میں یہ سارے رکھ لیتی ہوں، کچھ سوچوں گی ان کا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے آپا۔ میں تو یہ سب کچھ آپ ہی کے لیے لایا تھا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔"

ہماری باتیں سن کر پہلے تو نانی زلیخا ادھر آئیں اور آتے ہی بولیں "وے منڈیا تو مجھے بتا کر آیا کر اور بتا کے جایا کر...... کل بھی تو ملے بغیر چلا گیا، اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ایسے ہی چلا گیا تھا۔"

میں نے کہا "نانی میں تو آپا فرزانہ اور آپ نعمانہ دونوں کو بتا کر گیا تھا کہ نانی جی کو بتا دینا۔"

"نہیں ناں۔" انہوں نے دونوں نہیوں پر زور دے کر کہا "مجھ سے مل کے نہیں جائے گا تو مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو اور اللہ کے فضل سے کیسے آباد ہو رہے ہو؟"

میں نے کہا "بس ٹھیک ہی کام چل رہا ہے نانی۔ آہستہ آہستہ آباد ہو ہی جائیں گے، کچھ وقت لگے گا۔"

نانی نے کمال مہربانی سے فرمایا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مانگ لینا۔ تیری ماں اپنے ہی تکبر میں رہتی ہے۔ رشتہ داروں، عزیزوں سے کچھ مانگتی نہیں۔"

"ان کو ضرورت ہی کیا ہے۔" آپا نے کہا "جن کے گھروں میں ولایتی پوشاکیں آتی ہیں، بن مانگے، انہیں کیا ضرورت پڑی ہے دست سوال دراز کرنے کی۔"

نانی اماں نے کپڑوں کا پیکٹ دیکھ کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے فرزانہ؟" تو آپا نے ساری رام کہانی، کچھ اندازے سے اور کچھ اس اندازے پر حاشیے چڑھا کے بیان کر دی۔ نانی نے اپنے اڑسٹھ برس پرانے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر پوچھا۔ "بس یہی کچھ تھا وہاں یا اور بھی کچھ نکلا؟"

میں نے کہا "اور بھی بہت کچھ تھا لیکن اماں ناراض ہوں گی۔"

"اس کی تم پرواہی نہ کرو۔" نانی اور آپا یک زبان ہو کر بولیں "ہم تمہاری اماں کو پتہ ہی نہیں چلنے دیں گے۔"

میں نے کھکھیا کر کہا "بات ہوتی ہوتی دور جا نکلتی ہے اور سارے خاندان میں پھیل جاتی ہے۔ پھر ہم صفایاں کرتے پھرتے ہیں اور کوئی مانتا ہی نہیں۔"

آپا نے کہا "مجھے معلوم ہے تم لوگ منٹگمری گئے تھے اور وہاں بڑی صفائیاں پیش کر کے آئے ہو لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں......"

میں نے بات کاٹ کر کہا "اماں تو صفائیاں پیش کرتی رہیں اور بددعائیں مجھے ملتی رہیں۔"

آپا نعمانہ دوسرے کمرے سے ہماری گفتگو سنتی آئی تھیں۔ انہوں نے گیلری میں سے باہر نکلتے ہوئے کہا "بڑا کامیاب دورہ رہا آپ لوگوں کا، منٹگمری والا...... ساری برادری نے تمہاری صفائیاں مان لی ہیں اور بی بی کو باعزت بری کر دیا ہے۔" پھر وہ ہنسنے لگیں اور ان کی ہنسی میں زہر کی ہزیمت سے زیادہ ہی آمیزش تھی۔ انہوں نے ڈرائی کلین کیے کپڑوں میں سے جینز اٹھا کر کہا "یہ میں لے لیتی ہوں۔ میرے پوری آ جائے گی۔"

آپا نے کہا "تم لے کر کیا کرو گی، نہ پہنی جا سکتی ہے، نہ دکھائی جا سکتی ہے۔ فائدہ!"

نانی اماں نے کہا ''پہنی کیوں نہیں جا سکتی۔ ولایت جا کر پہن لے گی۔ جب یہ لوگ دورے پر جائیں گے۔''

آپا فرزانہ نے کہا ''ابھی طے تھوڑی ہوا ہے ولایت جانے کا۔ اگر جانا ہوا تو مجھ سے مانگ لینا۔ جب تک میں سنبھال کے رکھوں گی۔''

آپا نعمانہ نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا تو نانی زلیخا بولیں ''بھئی میں پوچھ رہی تھی کہ بس یہی کچھ ملا وہاں سے، اتنی بڑی کوٹھی سے؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''کچھ زیور بھی تھا!''

تینوں پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ وقتی طور پر ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گئیں۔

آخر نانی ہی نے پرانے تجربے کی بنا پر حوصلے کی ڈوری پکڑ کر اوپر سر نکالا اور پوچھا ''کیا ملا؟''

میں نے کہا ''نانی ملنا کیا تھا۔ بڑا ہی ڈھنگ اور ہندوانہ رواج کا زیور تھا۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا نے تو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا کہ ہمارے کس کام کا، ہمارے لیے تو کوڑا ہے۔''

آپا فرزانہ نے پوچھا۔ ''تھا کیا کچھ؟''

میں نے کہا ''بارہ تو کنگن تھے میلے میلے اور چھ سال لڑے تھے، شیر کے مونہہ والے، پاؤں میں پہننے کے۔ ایک تاج تھا سونے کا جیسے سر پر کڑاہی اوندھی رکھ لی ہو، لوٹا سا......'' اماں نے کہا ''دفع دور کیسی احمق ہوں گی یہ ہندوانیاں جو اسے سر پر پہن کے چل پھر سکتی ہوں گی، پاگل کہیں کی!''

نانی نے کہا ''تو ہندوانیوں کو دفع کر، یہ بتا اور کیا نکلا؟''

میں نے کہا ''نانی اور کچھ ہار تھے، ماتھے کے جھومر تھے۔ ہاتھوں کی پہنچیاں تھیں......'' اس کے بعد میرا زیورات کے بارے میں ذخیرہ الفاظ ختم ہو گیا تو میں ان کے چہرے دیکھنے لگا۔ آپا نعمانہ کی تو گھگھی سی بندھ گئی تھی اور وہ بغیر آواز نکالے، سسکیاں بھرے دھاڑ دھاڑ رو رہی تھیں۔ آپا فرزانہ کے دھوئے دھائے بال بالکل سوکھ گئے تھے اور اب وہ سر جھکا کے غم کھا کے بڑی افسردگی کی حالت میں بالوں کو سمیٹ کر ڈھیلی ڈھیلی سی مٹ کر رہی تھیں۔ صرف نانی ماں قدرے حوصلے کے ساتھ بیٹھی تھیں لیکن ان کا حوصلہ بھی محض دکھاوے کا تھا، اندر جان نہیں تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگیں۔ ''اب کہاں رکھا ہے وہ زیور؟''

میں نے کہا ''جب سب نے ناپسند کر دیا نانی تو پھر مجبوری تھی، اماں نے عتیق سنار کو بلا کر کہا ''ان سب کو پگھلا کے ایک ڈلا بنا دے اور موتی۔ منکے پنا، ٹانکا تو رکھ لے......لیکن مجھے اندازہ لگا کر بتا دے کہ کل کتنا سونا ہو گا......اس نے سارے زیوروں کو الٹ پلٹ کے کئی بار دیکھا اور کہا ''ماسی جی میرا اندازہ ہے پونے سیر کے قریب سونا ہو جائے گا......''

ابھی میں نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ نانی ماں کو زور کا چکر آیا اور وہ کرسی کے دونوں بازو پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ آپا فرزانہ چارپائی کے نیچے اپنا ننگا پاؤں گھما گھما کر اپنے سلیپر تلاش کر رہی تھیں لیکن ان کو سلیپر نہ مل سکے اور وہ حرماں نصیب، ویسے ہی ننگے پاؤں اندر چلی گئیں۔ آپا نعمانہ مرقع چغتائی کی داغ فراق محبت شب کی جلی ہوئی...... والی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ آپا ویسے بھی خوبصورت نہیں تھیں لیکن اس سانحے نے تو ان کے غمناک چہرے کو حسین بنا دیا تھا۔

نانی نے حوصلہ کر کے پوچھا ''پھر بنایا اس نے ڈلا سونے کا؟''

''ڈلا تو بنا لایا نانی......'' میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا لیکن اس کا حساب بالکل غلط نکلا۔ نانی کے چہرے پر امید کی ایک چھوٹی سی کرن نمودار ہوئی کہ اچھا ہی ہوا!!

میں نے کہا ''اس نے پونے تین سیر سونے کا اندازہ لگایا تھا لیکن جب سب زیوروں کو پگھلایا تو ڈھیلا سوا تین سیر کا بن گیا۔''

آپا فرزانہ تو پھر بھی اپنے پاؤں پر چل کر اندر چلی گئی تھیں لیکن نانی ماں سے کوشش کے باوجود اٹھا نہ گیا۔ انہوں نے دو تین مرتبہ زور لگایا لیکن زمین نے ان کے پاؤں پکڑنے سے انکار کر دیا اور وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کر کے گویا مجھ سے کہا ''اب جا، دفع بھی ہو جا۔ کب تک ہمارا کلیجہ جلاتا رہے گا۔''

میں اٹھا اور دونوں کو سلام کر کے گھر واپس آ گیا۔

سارے مہاجر کیمپوں میں انسانی فضلے کی ایسی بھرمار تھی کہ عادی شخص کے علاوہ اور کوئی پانچ منٹ سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ممتاز مفتی اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کو جب بھی دوپہر کے کھانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ میرے دفتر میں آ کر کھاتے۔

میرا اناؤنسنگ بوتھ بالکل ایئر ٹائٹ تھا اور میں نے کھڑکیوں اور دروازوں کو کرافٹ پیپر لگا کر سیل بند کر رکھا تھا۔ ایک کھڑکی میں دوہرا لحاف گھسیڑا ہوا تھا اور ایک دروازے پر چھینٹ کی رضائی کا دبیز پردہ منڈھا ہوا تھا۔ اندر آنے جانے کے لیے ایک ہی چھوٹا سا دروازہ تھا اور اس بوتھ میں بیٹھ کر اطمینان سے کھانا کھایا جا سکتا تھا، باہر کی بو کم آتی تھی۔

مفتی اور خواجہ شفیع میرے بوتھ میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے اور میں ان کی میزبانی کے شوق میں باہر لنگر سے گرم گرم روٹی لا کر دیتا تھا کہ میرے تیسرے چکر میں میرے پاؤں کی زمین اٹھ کر آسمان سے جا ملی اور اس فوری اور اونچی اڑان میں جو خطرہ لاحق ہوتا ہے، وہ بھی میرے وجود سے لپٹ کر سنسنانے لگا۔

میں اخبار کی چوہری تہہ پر تنور سے نکلی ہوئی دو سرخ اور کڑکڑ کرتی روٹیاں لے کر آ رہا تھا۔ جلدی اس بات کی تھی کہ گرم گرم اور تازہ تازہ روٹی لے کر اپنے مہمانوں کی خدمت میں پہنچ جاؤں لیکن یہ تیزی تنور سے لنگر کی سرحد تک ہی غیب ہو گئی، اس کے بعد میں پتھر کا بت بن گیا۔

میرے عین سامنے قائداعظم کھڑے تھے اور ایک طرح سے میرا راستہ روک کر کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ پر چوہرا اخبار تھا۔ اس پر دو تنوری روٹیاں تھیں۔ جیب میں کچھ سکے تھے۔ پاؤں میں خاکی رنگ کے فلیٹ بوٹ تھے۔ آنکھوں پر دور کی نظر کا چشمہ تھا اور میرا محبوب میرے عین سامنے کھڑا تھا۔ وہ محبوب جس سے آج تک ان دیکھے محبت کی تھی، جس کے ارشادات گرامی پڑھے تھے جس کی تقریر سننے گھر والوں سے چوری جالندھر کا سفر کیا تھا، جس کی کچھ تصویریں اپنے کمرے میں فریم کر کے سجائی تھیں، باقی دل کی دیواروں پر بغیر فریم کے لٹک رہی تھیں۔

قائداعظم کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر میرا دل مرجانے کو چاہا کہ بس اس کے بعد نہ اور کچھ ہو اور نہ ہی یہ پیکر دوبارہ وجود میں آئے۔ ایسے ہی ختم ختما ہو جائے! قائداعظم کے ساتھ اس وقت ہمارے کیمپ کمانڈنٹ رانا صاحب نواب ممدوٹ، میاں افتخار الدین، آئی جی پولیس اور دوسرے بہت سے زعماء تھے۔

قائداعظم نے اپنا دایاں ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا کر مجھ سے پوچھا "روٹی ہے!"

میں نے کہا "جی جناب روٹی ہے۔"

"یہاں بنی ہے؟"

"جی جناب یہیں پکی ہے، اسی لنگر میں۔"

"سب کے لیے ہے؟"

"ہاں جی، سب کے لیے ہے۔"

"اچھی ہے؟ ٹھیک ہے؟"

"بہت اچھی جناب عالی۔"

"کھا کے دکھاؤ۔"

میں نے تعمیل ارشاد میں فوراً ایک لقمہ توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔ پھر آپ نے بھی ہاتھ آگے بڑھا کر اس روٹی سے ایک لقمہ توڑا اور اسے منہ میں ڈال کر آہستہ آہستہ چبانے لگے۔ قائداعظم کا ہاتھ بہت ہی دبلا، نہایت کمزور اور بے حد پتلا تھا۔ بس ڈوریوں کا ایک پنجہ تھا جس پر باریک سی جھلی چڑھی تھی۔ قائداعظم اکہرے بدن کے ایک دھان پانی سے فرد تھے۔ یہ تو ہم سب جانتے تھے لیکن وہ اس قدر کمزور، نحیف اور ضعیف ہوں گے، اس کا کم از کم مجھے اندازہ نہ تھا۔ ان کا قافلہ آگے بڑھ گیا تو میں اپنی جگہ سے ہلا، پھر تیز تیز قدم چلا اور آخر کو بیرک کی طرف بھاگا جہاں مفتی اور خواجہ شفیع میرا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے بیرک میں داخل ہوتے ہی شور مچا دیا۔ "قائداعظم...... قائداعظم۔ ہمارے کیمپ میں، چائنیز بیرک میں، ہم سے ملنے آئے ہیں، مہاجروں کو دیکھنے آئے ہیں۔" سارے لوگ دیکھنے کے لیے باہر کو لپکے اور برآمدے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک نوجوان جس کی میز میرے اور آغا شیریں کے درمیان ہوا کرتی تھی اور جو چھٹی کے وقت کھانے کے بجائے رسالے پڑھتا تھا، اور جس نے حال ہی میں اپنا نام محمد شفیع سے بدل کر سلیم چودھری رکھ لیا تھا، کچھ دیوانہ سا ہو گیا۔ وہ اپنے دس بارہ قریبی عزیز دریائے بیاس کے کنارے شہید کروا کر آیا تھا، خاموش سا رہتا تھا۔ قائداعظم کے کیمپ میں تشریف لانے کی خبر پا کر وہ دیوانوں کی طرح پاکستان زندہ باد! قائداعظم زندہ باد! محسن اسلام، محسن پاکستان زندہ باد، پائندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا قائداعظم کے گروہ کے پیچھے بھاگا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس کے ایک کارندے نے پلٹ کر اسے روکا تو وہ بپھر گیا۔ کارخاص ملازم اپنے دونوں بازو پھیلا کر اس کی راہ میں مزاحم ہوا تو وہ اس سے بھڑ گیا، دونوں زمین پر گرے۔ کارخاص کے آدمی نے اس پر گوڈا رکھ کر اس کی دونوں کلائیاں مضبوطی سے پکڑ لیں۔ وہ زمین پر لیٹا تڑپار

تھا اور اونچے اونچے پکار رہا تھا، قائداعظم زندہ باد، محسن انسانیت زندہ باد، محبوب عوام زندہ باد...... زندہ باد زندہ باد...... زندہ باد......

جب میں نے ممتاز مفتی کو بتلایا کہ اسی روٹی میں سے قائداعظم نے ایک لقمہ توڑ کر کھایا ہے تو اس نے وہ روٹی میرے ہاتھ سے اچک کر، اخبار میں لپیٹ کر، بغل میں دبا لی، کہنے لگا "بس یار میرا پیٹ تو بھر گیا، یہ دوسری روٹی تم کھا لو۔"

بڑے سال بعد جب میں آزاد کشمیر ریڈیو پر سکرپٹ رائٹر ہو کر گیا تو مفتی نے مجھے وہ سوکھی ہوئی روٹی دکھائی جو اس نے ایک ریشمی جزدان میں رکھی ہوئی تھی۔

ان دنوں کشمیر کے اندر سارے محاذ ایک ساتھ گرم ہو گئے اور محاذوں سے خبریں آنی بند ہو گئیں۔ میرے دونوں بھائیوں میں سے ایک کا بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ سرینگر کے ایئرپورٹ پر پاکستان کا قبضہ ہو گیا ہے اور اب ٹھیک دو دنوں بعد سارے سرینگر پر پاکستانی قبضے کی خبر آنے والی ہے۔ سب تیار رہیں۔

قبضے کی خبر تو نہ آئی البتہ یہ پتہ چلا کہ میرا بڑا بھائی زخمی ہو گیا ہے اور اسے جہلم کے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے۔ میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوری طور پر جہلم پہنچا اور ہسپتال میں اپنے بھائی سے ملا۔ وہ ایک پہاڑی کے پیچھے چوکس پوزیشن میں دشمن کی پسپائی پر گہری نظر رکھنے پر متعین تھے۔ گولہ چلنے کے ارتعاش سے پہاڑی سے ایک بڑا سا پتھر سیدھا ان کی کمر پر گرا اور وہ چیک کر اسی مقام پر بے ہوش ہو گئے۔ سارے پنجر پر شدید دباؤ پڑا لیکن پسلیاں ٹوٹنے سے محفوظ رہیں۔ ہسپتال والے صبح و شام ان کا باقاعدگی کے ساتھ مشاہدہ کرتے تھے کہ اندرونی جریان خون مکمل طور پر رک گیا ہے یا ابھی بھی کوئی کوئی قطرہ رستا ہے...... مجھے توقع سے بڑھ کر وہاں رکنا پڑا، واپس آیا تو نانی زلیخا کا پیغام آیا تھا کہ مجھ سے جلدی آ کر ملو، ایک ضروری کام ہے۔

میں حسب ارشاد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ضروری کام کی بابت پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ضروری کام اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ تمہاری خیریت کی خبر مطلوب تھی۔ تم جو کئی روز سے نہیں آئے تو مجھے کسی نے بتایا کہ اپنے بھائیوں سے ملنے جہلم گئے ہو۔ پہلے تو دوسرے روز ہی واپس آ جاتے تھے، اب کی بار تم نے پورا ایک ہفتہ لگا دیا تو مجھے تشویش ہوئی کہ اللہ خیر کرے، لڑکا آیا نہیں۔

میں اپنے بھائی کی صحیح صورتحال واضح کرنے لگا تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اس سے تو نانی کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ وہ میرے بیان کو جھوٹ سمجھیں گی اور میں چڑ کر شاید خشمگیں ہو جاؤں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان کی مرضی کی اور ان کے فائدے کی بات کی جائے۔ وہ جو کچھ چاہتی ہیں، وہی بتایا جائے۔

میں نے حسب عادت ادھر ادھر دیکھ کر کہا "میں وہاں سے ٹرنک لینے گیا تھا؟"

"ٹرنک!" نانی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھائی وادی کشمیر سے دو ٹرنک لائے تھے۔ ایک تو ان کے ساتھ آ گیا، دوسرا انہوں نے کانوائے ٹرک میں رکھا

تھا، وہ پیچھے رہ گیا۔"

"ٹرنک کیسے تھے کاکا؟" انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

"بس جی ایسے ہی تھے جستی ٹرنک، معمولی۔ جیسے ہمارے گھروں میں ہوتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جستی ٹرنک تو میں سمجھتی ہوں، اچھی طرح سے لیکن ان میں تھا کیا؟"

"ہونا کیا تھا نانی؟" میں نے ڈھیل دے کر کہا "ایک تو پہنچ گیا اور دوسرا پیچھے رہ گیا۔"

"لیکن وہ تھے کس چیز کے...... تھا کیا ان میں؟"

"وہ جو بھائی صاحب کے ساتھ آ گیا وہ تو بس ایسے ہی تھا، نیم بھرا ہوا...... کھڑکتا سا۔"

"میں کیا پوچھ رہی ہوں اور تو کیا بکواس کیے جا رہا ہے۔" نانی نے چڑ کر کہا۔

میں نے کہا "میں تو وہی کچھ بتا رہا ہوں نانی جو آپ پوچھ رہی ہیں۔ بتا تو رہا ہوں کہ میں ٹرنک لینے گیا تھا۔"

"کونسے ٹرنک؟ کیسے ٹرنک؟ کس نے بھجوائے تھے؟ کیا تھا ان میں؟" انہوں نے مزید بے صبری سے پوچھا۔

میں نے کہا "نانی وہ اتنے بڑے بڑے ٹرنک نہیں تھے جس قدر آپ سوچ رہی ہیں۔ رضائیاں رکھنے والی پیٹیاں نہیں تھیں۔ سوٹ کیس سائز کے ٹرنک تھے...... جستی۔"

"پھر وہی بات!" انہوں نے زچ ہو کر کہا "تھا کیا ان ٹرنکوں میں؟"

"وہ جو بھائی صاحب اپنے ساتھ لائے تھے، اس کی تو چابی کھو گئی تھی، وہیں محاذ پر...... اور جو کانوائے میں آ رہا تھا، وہ ابھی تک پہنچا نہیں تھا۔"

"پہنچ گیا پھر؟" انہوں نے چیخ کر پوچھا۔

"ہاں جی پہنچ تو گیا لیکن بالکل چبا ہو گیا تھا راستے میں۔ پٹھان مجاہدین، اس پر بیٹھ کر چائے پیتے رہے۔"

"اس میں کیا تھا؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس میں زیور تھے نانی۔ کشمیر کی وادی سے لوٹے ہوئے زیور۔"

"تیرے بھائی نے لوٹے تھے؟"

"سب نے مل کر لوٹے تھے۔ پھر حصہ پتی ڈال کے اپنا اپنا مال الگ کر لیا تھا۔ میرے بھائی کے حصے میں سب سے زیادہ مال آیا کیونکہ وہ بہت ہی اگلے فرنٹ سے لڑ کر لوٹا تھا۔"

"وہ تو سنا ہے زخمی بھی ہو گیا ہے۔" نانی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"زخمی تو خیر نہیں ہوا، اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہے لیکن دوسرا ٹرنک آنے تک مجھے کوئی بہانہ تو کرنا ہی تھا ناں اتنی دیر جہلم میں توقف کرنے کا!"

"تو پھر آ گیا دوسرا ٹرنک؟"

"بتا تو رہا ہوں کہ آ گیا۔ اس کی چابی تھی میرے بھائی کے پاس لیکن جو اپنے ساتھ لائے تھے، اس کی چابی کھو دی موصوف نے راستے میں۔"

"چابی کو دفع کرو۔" نانی نے آرام سے کہا "یہ بتاؤ کہ ان دونوں ٹرنکوں کو یہاں لا کر کس کے حوالے کیا؟"

"لیجیے نانی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ دینا کس کو تھا، سارا حق ماں باپ کا ہی ہوتا ہے اولاد کی فتوحات پر۔ دونوں ٹرنک والدہ صاحبہ کی خدمت میں پہنچا دیے۔"

"اور جس کی چابی گم ہو گئی تھی؟" نانی نے پوچھا۔

"وہ ہتھوڑے کے ایک دھموکے سے کھل گیا...... کھڑاک۔"

"تیری ماں تو بہت خوش ہو گی؟"

"خوش کیا ہونا ہے نانی، سارا زیور ڈوگرا گھڑنت ہے۔ موٹے موٹے، اکھڑ اکھڑ، پرزے سے ہیں، مشین کے زیور نہیں لگتے۔ نزاکت نہیں ان میں...... ڈوگرا لوگ ایسا ہی زیور پسند کرتے ہیں شاید۔"

"تمہاری کونسی ماؤں بہنوں نے پہننا ہے۔" نانی بولیں۔ "لے کے سارے کا سارا گلا ہی لینا ہے، ڈھیلا بنانے کے لیے۔"

"وہ تو پھر مجبوری ہے۔" میں نے انہیں چڑانے کی غرض سے کہا لیکن وہ چڑی نہیں، غمزدہ سی ہو گئیں۔ ایک وقت تھا ہمارے سارے خاندان، سارے خانوادے، ساری برادری پر ان کی حکومت تھی۔ ان کی دولت، جائیداد اور عالی رتبے کے آگے کوئی بول نہیں سکتا تھا اور اب سونا ایک اُبلتا ہوا چشمہ بن کر ہمارے گھر میں داخل ہو رہا تھا اور بہت بھاری مقدار میں داخل ہو رہا تھا۔

پوچھنے لگیں۔ "کیا تم ہر ہفتے ایسے ٹرنک لینے جہلم جاتے ہو؟"

میں نے کہا "ہر ہفتے نہیں نانی، ہر پندرھویں دن۔ ان کو چھٹی ہی پندرہ دن بعد ملتی ہے اور پھر اتنی جلدی اچھا مال اکٹھا بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے خالی ہاتھ بھی آنا پڑتا ہے۔"

"اور یہ جو ڈھیلے بن جاتے ہیں سونے کے، اتنے بڑے بڑے۔" نانی نے انگلیاں کھول کر ہاتھ کا کفچہ بناتے ہوئے کہا "ان کو رکھتے کہاں ہو؟"

میں نے کہا "ان کو زمین میں دبا دیتے ہیں۔ وہ گوشہ زمین سوائے اماں جی اور ابا جی کے اور کسی کو معلوم نہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔"

اس زمانے میں دل کی تقویت کے لیے اور ہارٹ ٹربل کے لیے بس ایک دوا تھی...... کورامین۔ ان کے ڈاکٹر نے نانی کے لیے یہ دوا تجویز کی تو ان کو کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ جب پی لیتیں تو دل ذرا ٹھہر جاتا ورنہ پھر اسی طرح سے دھڑکنے لگتا۔ ہماری دولت کے چڑھتے ہوئے گراف کو دیکھ کر وہ روز بروز نیچے ہی نیچے گرتی جا رہی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں تھوڑا سا رعشہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ آپا فرزانہ اب مجھ سے ملنے میں کتراتی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ میری ملاقات انہیں کوئی راحت عطا نہیں کرے گی بلکہ مزید پریشانیوں میں مبتلا کر دے گی۔ ان کا خیال تھا کہ برے کاموں کا نتیجہ ایک روز برا ہی

نکلتا ہے اور چاؤ چاؤ میں آگے بڑھتا انسان خود ہی علی بابا کے غار میں بند ہو جاتا ہے۔ یہ خیال ان کو بہت تسکین عطا کرتا تھا اور وہ اسی کے سہارے نارمل زندگی گزار رہی تھیں۔

نانی کی کوٹھی میں سبز رنگ کی ایک پرانی واکس ہال گاڑی تھی جسے نانا جی مرحوم کا پرانا ڈرائیور تاج دین چلاتا تھا۔ یہ گاڑی اکثر ورکشاپ پر رہتی تھی اور پٹرول اور ڈیزل قحط زدہ ڈنگروں کی طرح کھاتی تھی۔ تاج دین اور واکس ہال کے باوجود گھر کے سب لوگ سالم تانگہ کرا کے اپنے اپنے کاموں پر جاتے تھے۔ گاڑی کبھی چل پڑتی تھی، کبھی انکاری ہو جاتی تھی۔ کئی مرتبہ راستے میں کھڑی ہو جاتی تھی تو اسے دھکیل کر کوٹھی پر واپس لاتے تھے۔ گاڑی کم تھی، بس عزت ہی عزت تھی۔ دور دور کے لوگوں کو معلوم تھا کہ خان صاحب کے یہاں کار ہے جو اگر ایک دفعہ گرم ہو جائے تو ذرا سی چابی مارنے سے چل پڑتی ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اگر ایک مرتبہ کھڑی ہو جائے تو پھر بڑی مشکل سے گھر واپس آتی ہے۔

نانی بس ایک مرتبہ ہی واکس ہال پر اپنے حکیم کے ہاں جا سکی تھیں حالانکہ ان کی آرزو تھی کہ ہفتے کے ہفتے گاڑی میں ہی جایا کریں اور حکیم صاحب سے اپنے اختلاج قلب کی دوا کے نسخے بدلوایا کریں!

ایک رات جب سبز واکس ہال کو تاج دین ڈرائیور اچھرے اور مسلم ٹاؤن کی درمیانی آبادی میں سڑک کنارے چھوڑ آیا اور میرے نانا مرحوم کی محبوب کار ساری رات ایک غیر علاقے میں بے یار و مددگار کھڑی رہی تو مجھے اس حقیقت حال پر دلی صدمہ ہوا۔ میرے خیال میں واکس ہال کو ایسے کرنا نہیں چاہیے تھا۔

ٹھیک چار روز بعد جمعرات کے دن میں دفتر سے دو گھنٹے پہلے چھٹی کر کے نانی زلیخا کے یہاں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت بستر میں تھیں اور آپا فرزانہ نے ان کو کورامین کے بارہ قطرے پلا کر ابھی ابھی لٹایا تھا۔ نعمانہ آپا ان کے تلوے رگڑ رہی تھیں اور بار بار پوچھ رہی تھیں "اماں اب طبیعت کیسی ہے...... اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟" نانی گومدھم آواز میں "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" کہہ رہی تھیں لیکن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

سلیم چودھری نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے گاؤں میں سب سے اعلیٰ اور سب سے آخری دوائیں سیب اور بہی کا مربہ ہوتی ہیں اور ان کے زور پر مریض کئی کئی سال نکال جاتے ہیں...... نانی زلیخا کی طبیعت خواہ کیسی بھی تھی لیکن وہ بہر حال میری نانی تھیں اور مجھے ان کی صحت کی ویسی ہی فکر تھی جیسی ان کے بچوں کو تھیں۔ میں جاتے ہوئے ان کے لیے آدھ آدھ پاؤ سیب اور بہی کا مربہ لے گیا اور اسے بضد ہو کر انہیں کھانے پر مجبور کیا۔ تھوڑا تھوڑا آپا فرزانہ اور آپا نعمانہ نے بھی چکھا اور مجھ سے اس کے ملنے کا پتہ پوچھا۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے فرزانہ آپا سے پوچھا "آپا یہ چیری سلر کیا ہوتی ہے؟"

آپا نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا "مجھے تو معلوم نہیں کہ چیری سلر کیا ہوتی ہے؟"

"تم نے کہیں یہ لفظ دیکھا ہے؟" نعمانہ آپا نے پوچھا "یا کہیں پڑھا ہے؟"

میں نے کہا "میں نے دیکھا بھی ہے اور پڑھا بھی ہے لیکن میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

نعمانہ آپا نے کہا "کہاں پڑھا ہے؟"

میں نے کہا "یہیں جی، اسی لاہور میں، اسی شہر میں......"

فرزانہ آپا نے کہا "تو چیری بلاسم کو تو نہیں پوچھ رہا۔ یہ ایک قسم کی بوٹ پالش ہوتی ہے اور ولایت سے آتی ہے۔"

نانی نے بڑی نحیف آواز میں پوچھا "لیکن تم نے دیکھا کہاں یہ لفظ؟"

میں نے کہا "نانی لفظوں کا کوئی خاص مقام تو نہیں ہوتا ناں۔ ڈکشنری کے علاوہ بھی ادھر ادھر نظر آ جاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ایسے ہوتے ہیں کہ ڈکشنری میں بالکل نہیں ملتے لیکن روزمرہ میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔" فرزانہ آپا نے کہا "جتنا تو بڑا ہو رہا ہے، اسی قدر بے وقوف بھی ہو رہا ہے...... ساتھ ساتھ۔"

میں نے کہا "آپا اب آپ سے کیا پردہ اور بچی بات چھپانے سے کیا حاصل، ہم نے ایک کار چرائی ہے۔"

"کار!" نانی نے کہنی کے بل ہو کر اور سر اٹھا کر اپنی بیٹیوں کی آواز میں آواز ملائی۔

"کہاں سے چرائی؟" آپا فرزانہ نے پوچھا۔

میں نے کہا "بس کہیں سے بھی چرائی، چرالی...... لمبی چیز خدا کی دھیلے کی نہ پائی......"

"پھر بھی۔" نانی نے اسی طرح کہنی کے بل سر کو اور اوپر اٹھا کر پوچھا۔ "کہیں سے تو چرائی ہو گی آخر!"

میں نے کہا "یہ جو فین روڈ ہے ناں اس کے ساتھ ایک اور چھوٹی سی ٹرنر روڈ ہے۔ اس پر وکیلوں کے دفتر ہیں لیکن ان دفتروں کے پیچھے پرانی وضع کی کوٹھیاں بھی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ان میں زیادہ کوٹھیاں آسیب زدہ ہیں اور ان میں بھوت رہتے ہیں۔ پرانے بھوت بھی اور نئے حالیہ بھوت بھی سن سینتالیس کے فسادات کے۔"

وہ تینوں میری طرف الف لیلوی داستان غور سے سن رہی تھیں اور اس پر یقین کیے جا رہی تھیں۔ "پرسوں" میں نے سوچتے ہوئے کہا "پرسوں کی بات ہے۔ نانا، اترسوں کی...... پرسوں سے ایک دن پہلے کی کہ میرے سب سے بڑے بھائی بہاولپور سے آئے تھے۔ ان کو ہم نے آسیب زدہ مکانوں کے قصے سنائے تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ ہم سے بڑا بھوت اور کون ہو گا اس زمانے میں۔ لاؤ تو ذرا مجھ کو بھی دکھاؤ ایسے مکان جن میں بھوتوں کا بسیرا ہو۔"

"واہ بڑا دلیر ہے تیرا بھائی۔" نانی نے فخر سے کہا "ایک مرتبہ بالٹی اٹھا کر دس سیر کچا دودھ پی گیا تھا۔ تیرے نانا نے اس کو بیس روپے انعام دیئے۔"

میں نے کہا "جی بالکل، وہ ایسے ہی ہیں اور کسی سے ڈرتے نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی لوہے کے کڑوں والی لاٹھی کندھے پہ رکھی اور میرے دوسرے بھائی سے جو گاؤں سے گھی، مرغیاں اور بکرے لا کر فروخت کرتے ہیں، کہا چل بھئی دکھلا مجھے آسیب زدہ مکان۔"

"توبہ بابا، بڑی جرأت ہے تم گاؤں کے لوگوں میں۔" فرزانہ آپا ناک سکوڑ کر بولیں۔

میں نے کہا "میں تو خیر ایسا نہیں لیکن میرے دوسرے بھائی بھی بہادر اور جرأت مند ہیں۔ جب وہ دونوں چلے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایک بند کوٹھی کا وکٹ گیٹ کھول کر جب ہم اندر لان میں داخل ہوئے تو کھپریل کی چھت

تلے سے ایک کوا پھڑ پھڑاتا ہوا نکلا اور تقریباً ہم سے ٹکراتا ہوا اوپر کو نکل گیا۔ میں تو خوف کے مارے پیلا پڑ گیا۔ میرے بھائی نے اپنی شام والی لاٹھی جو گھما کر سامنے والے تالے پر ماری تو تالا وہ جا کر باڑ میں گرا۔ گیراج کا پھاٹک کھل گیا۔ اندر ایک سیاہ رنگ کی جھم جھم کرتی کار کھڑی تھی۔"

"کار" تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"اور اس کار کے پیچھے جہاں فالتو پہیہ رکھتے ہیں......" میں نے یقین بھرے انداز میں کہا "پہیے سے اوپر کو لفظ لکھا تھا "چیری سلر"

فرزانہ آپا نے زور سے اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا اور چیخ کر کہا "چیری سلر نہیں گدھے، کرائسلر ...... کرائسلر ...... اس وقت دنیا کی سب سے خوبصورت کار ہے اور لاہور میں اس وقت اس کے تین چار دانے ہی ہوں گے۔" پھر انہوں نے دوسری چیخ مار کر کہا "کہاں گئی وہ کار؟"

میں نے کہا "ہم نے نکال لی...... بھاگ کے جانے والے جلدی میں ہوں گے۔ انہوں نے کار بھی کھلی چھوڑی ہوئی تھی اور اس کے اندر اس کی چابیاں بھی لٹک رہی تھیں۔"

"لیکن نکالی کس نے؟" نانی زلیخا نے باریک بات پوچھی۔

"نکالی میرے بھائی نے نانی۔ وہ بھائی جو گاؤں سے گھی، مرغیاں وغیرہ لاتا ہے۔ اس نے لاری چلانی سیکھا ہے۔ ڈرائیور اسے سیٹ پر بیٹھا کر سٹیئرنگ اس کے حوالے کر دیتے ہیں اور خود ایک ٹھونکا لگا لیتے ہیں۔ سارا راستہ گاڑی چلاتا ہے، شہر قریب آنے پر ڈرائیور واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور میرا بھائی سواریوں کے ساتھ جا بیٹھتا ہے۔"

"پھر؟" نعمانہ آپا نے پوچھا۔ "پھر......!"

"پھر کیا! ہم نے گاڑی نکال لی اور سارے شہر کا چکر لگایا۔ اماں کو بٹھا کر داتا دربار لے گئے۔ ابا جی کو بادشاہی مسجد لے جا کر مغرب کی نماز پڑھوائی...... لیکن ابا جی کو پسند نہیں آئی۔"

"کیا نہیں پسند آیا تیرے باپ کو...... نخریلے کو۔" نانی نے پوچھا۔

میں نے کہا "نانی ان کو گاڑی نہیں پسند آئی۔"

"نئی نکور گاڑی؟" فرزانہ آپا نے کہا "اور بھائی جی کو پسند نہیں آئی۔"

"اس وجہ سے پسند نہیں آئی کہ گاڑی نئی نکور نہیں ہے، سیکنڈ ہینڈ ہے۔"

"سیکنڈ ہینڈ کیسے؟" نانی نے پوچھا۔

میں نے گلا صاف کر کے قدرے اونچی آواز میں کہا "نانی! گاڑی دو ہزار میل پہلے ہی چلی ہوئی ہے۔" آپا نے پھر ایک مرتبہ اپنے ماتھے پر زور کا ہاتھ مارا اور کہا "بے وقوف لوگو! گاڑی کا دو ہزار میل چلے ہونا، چلنا نہیں کہلاتا، رنگ کہلاتا ہے...... اس سے نئی گاڑی اور کون سی ہو سکتی ہے بھلا۔"

پھر آپا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "کرائسلر گاڑی۔ فائی سیون ماڈل۔ بلیک کلر۔ برینڈ نیو۔ اور کیا چاہیے کسی کو اس دنیا میں۔"

میں نے کہا "آپا لیکن اس میں ایک خرابی ہے کہ اس کے سامنے چابی نہیں لگتی۔ اندر بیٹھے بیٹھے آن ہو جاتی ہے۔"

"یہ خوبی ہے کہ خرابی گدھے!" آپا نے گدھے پر زور دے کر کہا "یہ تو لیٹسٹ ماڈل ہے بیوقوف، اس کو چابی کی کیا ضرورت!"

میں نے کہا "چابی مارتا ہوا آدمی ذرا خوبصورت لگتا ہے۔ سمارٹ دکھائی دیتا ہے۔ ایک اتھلیٹ نظر آتا ہے۔ اندر بیٹھے بیٹھے گھس کر کے چلا لینا تو کوئی خوبی کی بات نہیں۔"

آپا نے بھنا کر کہا "جا دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے...... اگر تو نے پھر ایسی بات کی......"

"لیکن وہ گاڑی ہے کہاں؟" نانی نے کہنی پر جھکے جھکے پوچھا۔

"ہمارے گھر کھڑی ہے۔" میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "ہمارے دروازے کے سامنے...... اب تو میں بھی کچھ کچھ چلانے لگا ہوں لیکن یونیورسٹی گراؤنڈ اور لیک روڈ کی طرف چلاتا ہوں، مال روڈ پر نہیں جاتا۔"

اچانک نانی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں اور اپنے دونوں ہاتھ زانوؤں پر رکھ کر بولیں۔ "اس طرح سے تو تم پکڑے جاؤ گے بچو۔ گاڑی کا تو نمبر ہوتا ہے اور نمبر سے فٹ پتہ چل جاتا ہے کہ کس کی گاڑی ہے۔ تم کب تک چھپاؤ گے۔" نانی کو اپنی اس بات پر شرلک ہومز جیسا مزا آ رہا تھا اور وہ سر ہلا ہلا کر کہہ رہی تھیں "مشکل پڑ جائے گی میاں، خاصی مشکل۔ ڈاہڈی مشکل۔ تم کو تو چھڑایا بھی نہیں جا سکے گا۔"

میں نے کہا "پرسوں یہ گاڑی بہاولپور جا رہی ہے۔ وہاں اس کی نمبر پلیٹ تبدیل ہو گی۔ سرکاری نمبر اتر کر اس پر ریاستی نمبر لگے گا۔ وہیں اس کا ٹوکن بنے گا، وہیں اس کی خریداری کی رسید کٹے گی۔ بڑے بھائی نے سب بندوبست کر لیا ہے۔"

کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔

میں نے کہا "جب یہ گاڑی نمبر پلیٹ بدل کر یہاں آ جائے گی تو میں خود آپ کو اس میں سیر کرایا کروں گا۔ کبھی شالامار باغ، کبھی راوی، کبھی قلعہ، کبھی ہرن مینار...... بس سیر ہی سیر...... سیر ہی سیر...... سیر ہی سیر۔"

کسی نے بھی کچھ نہ کہا۔ سبھی سننے والے خاموش بیٹھے رہے۔

میں نے کہا "اچھا اب میں اجازت چاہوں گا۔ اگلی مرتبہ آیا تو گاڑی لے کر ہی آؤں گا انشاءاللہ بشرطیکہ بڑے بھائی اسے بہاولپور سے جلد لے آئے۔ ان کا اپنا ارادہ اُچ شریف جانے کا ہے۔ وہ کہتے ہیں میں گاڑی کو وہاں بھی سلام کرانے لے جاؤں گا۔"

تینوں میں سے کسی نے بھی میری بات کا جواب نہ دیا اور میں سلام کر کے خاموشی سے باہر نکل آیا۔ باہر پورچ میں تاج دین سبز واکس ہال کے نیچے لیٹا ہوا کوئی پیچ فٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو بار بار گر جاتا تھا......!

دو دن تو نانی زلیخا کی حالت گھر پہ غیر رہی، پھر ان کو گورا وارڈ میں داخل کرا دیا گیا۔ ان کا دل بڑھ گیا تھا۔ بلڈ پریشر میں اضافہ ہو گیا تھا اور دل کی کواڑیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں...... میں ان کو دیکھنے ہسپتال گیا تو انہوں نے سارے بیمار

پری کرنے والوں کو وہاں سے اٹھا دیا۔ مجھے اپنے بیڈ پر بٹھا کر بولیں۔ ''کوئی اور ٹرنک لے کر نہیں...... جستی ٹرنک۔''

میں نے کہا ''پچھلے ہفتے لے آیا تھا لیکن ایک ہی طرح کا مال نکلتا ہے۔ ڈگ اور ان گھڑت ٹو میں! کشمیری برہمن پھر بھی ٹیسٹ فل ہیں، ان کے زیورات خوبصورت ہیں لیکن ڈوگرے تو زیورات کے نام پر تالے اور ہتھوڑے سے بناتے ہیں۔ دیکھنے میں واہیات لیکن وزن میں سالڈ۔ نگر اور پورے تول کے۔''

نانی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ''اچھا بھئی اپنی اپنی قسمت ہے۔ ہم ایمانداری میں رہے اور لوگ کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ جو بھاگ بے ایمانی کو لگتا ہے، وہ ایمانداری کو نہیں۔''

میں نے کہا ''یہ تو ٹھیک ہے نانی لیکن اب ہم بھی کیا کریں۔ لٹ لٹا کے آئے ہیں، کچھ تو اس کا مداوا ہونا چاہیے۔''

نانی چڑ کر بولیں ''دفع ہو سارے۔ چلیے میں جاؤ۔ یہ مداوا کر رہے ہو کہ رنبا پھیر رہے ہو گا جروں میں۔'' میں نے نانی کے اس فقرے پر ہنسنے کی کوشش کی تو وہ بھنا کر بولیں۔ ''اوپر سے تو تیری ماں بڑی شریف بنتی ہے اور ہر وقت ذکر کرتی رہتی ہے کام کاج کرتے ہوئے لیکن اندر سے بڑی گہری ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں ہونے دیتی کہ کیسے کیسے گھاؤ گھپ کر رہی ہے۔''

نانی ماں کہہ رہی تھیں اور اماں کی کردار کشی ہو رہی تھی۔ میرے لیے دونوں بزرگ ہستیاں تھیں، اس لیے میں خاموش ہو کر بیٹھا رہا، گو اندر سے میرا دل چاہتا تھا کہ ایک انارکسٹ کی طرح میز پر کھڑے ہو کر دھواں دھار تقریر کروں اور پھر اس کمرے کا سب کچھ تہس نہس کر دوں۔ میں نے ظالم سماج کا رُخ پہلی مرتبہ ایسا دیکھا تھا جس پر گوکھرو ابھرے ہوئے تھے اور جس کے ایک ایک کانٹے سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور جس کا ہر ایک خار کٹار کا زخم دیتا تھا۔

جب میں اٹھنے لگا تو نانی نے تکیے تلے ہاتھ پھیر کر ایک روپیہ نکالا اور اسے غور سے دیکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ ان کے تکیے کے نیچے صدقے اور خیرات کے لیے بہت سی کھلی رقم رکھی تھی۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری ماں موٹے موٹے آنسو بہا کر اپنے کھدر کے دوپٹے سے آنکھیں پونچھ رہی ہے اور ہلکی آواز میں بین کر رہی ہے۔ درمیان میں رک کر وہ خودکلامی میں مصروف ہو جاتی اور بات کرتے ہوئے اس کی گھگھی بندھ جاتی۔

میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور خوفزدہ آواز میں بولا ''کیا بات ہے ماں؟ رو کیوں رہی ہے؟'' تو اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر اونچی آواز میں کہا ''مرجانے جوگوں نے اب ہم پر ایک اور الزام لگا دیا ہے کہ ہم نے کسی کا گیراج توڑ کر اندر سے نئی نکور کار نکال لی ہے اور اسے اڑائے اڑائے پھرتے ہیں۔''

میں اپنی ماں کا کندھا تھپکتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گیا اور روکھی آواز میں بولا ''تو فکر نہ کر ماں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کے رہے گا۔ سچ کا بول بالا ہوگا اور جھوٹے کا منہ کالا ہوگا۔ بس تھوڑی دیر اور صبر کر۔'' اماں میرے ساتھ لپٹ کر اور اونچی آواز میں رونے لگیں۔

اگلے روز جب میں نانی ماں کی خبر لینے ہسپتال گیا تو وہاں آپا فرزانہ، آپا نعمانہ اور ان کے ساتھ ماموں بھی موجود تھے۔ نانی کی حالت پہلے کے مقابلے میں قدرے خراب تھی اور وہ بالکل خاموش لیٹی ہوئی چھت کی طرف دیکھ

رہی تھیں۔ میں نے ان کو سلام کیا تو انہوں نے صرف نظریں گھما کر دیکھ کر سلام کا جواب نہیں دیا۔ آپا فرزانہ نے پوچھا ''امی گلوکوز پئیں گی۔'' تو نانی نے نفی میں سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ماموں نے کہا ''سنا ہے آج کل بڑی فتوحات ہو رہی ہیں اور لمبے ہاتھ مارے جا رہے ہیں!'' میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا ''ایسی تو کوئی بات نہیں ماموں۔ بس کبھی نہ کبھی، کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔''

''کچھ ناں کچھ......'' آپا نعمانہ نے چیخ کر کہا ''کچھ ناں کچھ! جہاں نئی نکور کرائسلر موٹر آ جائے، زیرو میٹر چلی ہوئی، اس کو تم کچھ نہ کچھ کہو گے۔''

نانی نے آنکھیں کھول کر کہا ''ہر ساتویں دن دو ٹرنک آتے ہیں زیور اور لعل و جواہر کے بھرے ہوئے اور یہ کچھ ناں کچھ کہہ رہا ہے۔''

ماموں نے کہا ''کوئی اور نئی چیز بھی ملی؟''

میں نے کہا ''کل تو دو گھڑیاں ملی ہیں فیور لیوبا کی۔ ایک نئی تھی بالکل۔ مخمل کی تھیلی میں لپٹی ہوئی، ڈبیا میں بند۔ دوسری بھی تھی تو نئی لیکن اس میں سٹریپ پڑا ہوا تھا۔ کسی نے آٹھ دس دن استعمال کر کے واپس کیس میں رکھی تھی۔''

''اوہ وہ ہیں کہاں دونوں گھڑیاں؟'' ماموں نے جلدی سے پوچھا۔

''گھر پر ہیں۔ الماری میں رکھی ہوئی ہیں۔''

''ان میں سے ایک مجھے دے سکتے ہو؟ اپنے ماموں کو!''

''کیوں نہیں؟'' میں نے اعتماد دلاتے ہوئے کہا ''آپ دونوں لے لیجیے، ہمارے کس کام کی۔''

ان کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر ابھری اور پھر ٹھوڑی سے ماتھے تک پھیل گئی۔ جب وہ ایسی آسودگی کی گود میں کنڈلی مار کر لیٹ گئے تو میں نے آہستہ سے کہا ''ایک کیمرہ بھی تھا۔''

''کونسا؟'' وہ بجلی کی طرح تڑپے۔

میں نے کہا ''مجھے اس کا نام اچھی طرح سے نہیں آتا۔ لیکا یا لائقہ تھا۔''

''کہاں ہے؟ کہاں ہے کہاں ہے!!!'' وہ ایک دم اٹھے اور انگڑائی سی بن کر تن گئے۔

میں نے کہا ''وہ تین چار دن تو ادھر ادھر چارپائیوں پر رلتا رہا، پھر ڈبے بوتلیں والا کباڑیا آیا تو اماں نے گیارہ روپے میں اس کے ہاتھ بیچ دیا۔''

ماموں نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور گرتے گرتے بچے۔ انہوں نے میرے دونوں کندھے زور سے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ''اس کباڑیے کو جانتے ہو؟ اس کی دکان کا پتہ ہے۔''

میں نے ڈھیلا سا منہ بنا کر آہستگی سے کہا۔ ''اس کی دکان تو علم نہیں البتہ میں اسے شکل سے پہچانتا ہوں۔ کسی روز نظر آیا تو آپ کو اطلاع کر دوں گا۔''

ماموں نے کہا ''میں تو پرسوں چلا جاؤں گا لیکن اگر وہ کباڑیا نظر آ جائے تو اس سے وہ کیمرہ، سو ڈیڑھ سو دو سو

بلکہ چار پانچ سو میں بھی خرید لیتا...... پیسے فرزانہ سے لے لیتا یا نعمانہ سے لیکن وہ کیمرہ چھوڑتا نہیں بالکل۔"

نانی نے آنکھیں کھول کر دھیمی آواز میں کہا "اس کو پیسوں کی کیا پروا ہے۔ یہ تو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ لے لے گا، پیسے دے دے گا۔ تیرا شوق پورا کر دے گا۔"

"اور گھڑی؟" ماموں نے پوچھا۔

"وہ میں کل لیتا آؤں گا۔"

"اسی وقت...... یہیں!"

"جی...... اسی وقت۔ یہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔"

مجھے یقین ہے ماموں بے فکر نہیں رہے اور ساری رات سوچتے رہے کہ وہ نئی گھڑی باندھ کر دفتر جائیں گے۔

اگلے روز میں جان بوجھ کر ہسپتال نہیں گیا۔ گھڑی پاس ہوتی تو جاتا۔ اسی وجہ سے خالی دیا۔ دو دن بعد پتہ چلا کہ نانی کی حالت اچھی نہیں۔ رات سے ڈرپ لگی ہے۔ پیشاب آور دوائیں دی جارہی ہیں اور نالی کے ذریعے ہی پیشاب نیچے بوتل میں لیا جارہا ہے۔

میں گیا تو مجھے دیکھ کر رونے لگیں۔ بہت ہی مدھم آواز میں بولیں۔ "ماموں کی گھڑی لے آئے؟"

میں نے کہا "نہیں نانی، وہ گھڑی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ بڑے بھائی لے کر سرگودھا چلے گئے۔ میں نے فون کر کے پچھوایا تو پتہ چلا کہ انہوں نے کمشنر سرگودھا کو تحفے کے طور پر دے دی...... لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں جلدی ایک نئی اور اس سے بھی اعلیٰ گھڑی پیدا کر کے دوں گا اور جلد پیدا کروں گا۔"

نانی نے پوچھا "جہلم نہیں گئے؟"

میں نے کہا "ہو کر آرہا ہوں، اسی لیے تو دو روز حاضر نہیں ہو سکا۔"

"بھر لائے ٹرنک......" نانی نے دکھی ہو کر پوچھا۔

"اس مرتبہ بہت سا مال غنیمت ہاتھ آیا۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "لیکن ان میں زیادہ تعداد پرانی بادشاہتوں کے زری سکوں اور اشرفیوں کی ہے۔ اشرفیاں موٹی اور بڑے سائز کی ہیں۔ آپ چاہیں تو انہیں ٹی ٹرالی میں پہیوں کی جگہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ویسے ان کی چھب ویسی کی ویسی ہے۔ چھم چھم کرتی اشرفیاں۔ ڈھکنا کھولو تو ان کی ڈلک زیادہ دیر کھلی آنکھوں سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ بینائی ماند پڑ جاتی ہے۔ آدمی اندھا ہو جاتا ہے اور دولت کا اندھا تو آپریشن کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اندھیرے میں ہی ساری زندگی گزارتا ہے۔"

نانی نے کہا "کتنے ٹرنک ہیں اشرفیوں کے؟"

میں نے کہا "نانی انہیں ٹرنک تو نہ کہا کریں جستی ٹرنکیوں کو۔ چار فٹ بائی دو فٹ بائی ایک فٹ۔"

نانی نے کہا "مجھے ان کا ناک نقشہ نہ سمجھا۔ قد بت نہ بتا۔ یہ بتلا کہ ملے کتنے؟"

"پانچ نانی اماں پانچ۔" میں نے خوش ہو کر اپنا دایاں پنجہ نانی کے ڈوبتے ہوئے چہرے کی طرف کر دیا۔

انہوں نے ایک مرتبہ جی بھر کے پنجہ دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سورج ڈوبنے لگا اور پیلی روشنی ماند پڑتے پڑتے ایک سنولائی لکیر میں تبدیل ہوگئی۔

میں نے اس سے پہلے کبھی کسی انسان کو مرتے نہیں دیکھا تھا۔ میتیں اور لاشیں ضرور دیکھی تھیں۔ بے گور و کفن مردہ لوگ بھی دیکھے تھے۔ ریفیوجی کیمپ میں اتنا عرصہ کام کرنے سے لاشوں سے پٹی ہوئی گاڑیاں خالی کرانے، گاڑیوں کے ڈبے دھلوانے۔ باہر بالٹیوں سے پانی اچھال اچھال کر ٹرینوں کو صاف کرانے کا کام ضرور کیا تھا لیکن کسی کو اس قدر قریب سے مرتے نہیں دیکھا تھا۔

میری نانی میرے سامنے فوت ہو رہی تھیں اور میں ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ آگے بڑھ کر ان کو تسلی نہیں دے سکتا تھا۔ ان کے سامنے کچھ پڑھ نہیں سکتا تھا، ان پر دم نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ پھونک نہیں سکتا تھا۔ ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اوپر چڑھی، تاڑے لگی ہوئی نظروں کو واپس نہیں اتار سکتا تھا۔ خاموش اور سہما ہوا سا بیٹھا تھا۔ موت کا خوف تو بلاشبہ تھا لیکن اس کے گرد غصے کا ایک کمبل بھی لپٹا ہوا تھا۔ اس نے کچھ سہارا دے رکھا تھا۔ ذرا سی گرمائی بھی عطا کی ہوئی تھی کہ انہوں نے میری ماں کو جو اتنا تنگ کیا تھا، اسے سارے خاندان میں بدنام کیا تھا، ہر ایک کو شک و شبہ میں مبتلا کیا تھا۔ ان کی عمر بھر کی کمائی افواہوں اور غلط بیانیوں کے لبدے سے قیمہ کر دی تھی۔ میری ماں کو بڑا رلایا تھا تو اب میں کیا کروں۔ میں کدھر سے ان کی تسلی کروں، ان کا سہارا بنوں۔

میری نانی میرے سامنے آہستہ آہستہ فوت ہوتی گئیں اور میں ان کے قریب دیوار سے ڈھو لگا کر چپ چاپ بیٹھا رہا...... وہ جو میرے بھائی نے کندھا بدلتے ہوئے میرے کان میں بات کہی تھی، کچھ ایسی غلط نہیں تھی۔ اسی طرح سے ہوا تھا۔ میری نانی بھرے ہوئے ٹرنکوں کی حسرت لے کر فوت ہوئی تھیں۔ ایسے ٹرنک جو علی بابا کو تو مفت ملتے رہے تھے لیکن اس کے بھائی قاسم کے لیے شجر ممنوعہ بن گئے تھے۔

موت بھی کیا عجیب چیز ہے۔ اس سے کئی کھلے ہوئے ٹرنک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں اور کئی ازل کے منہ بند خزانے آپ سے آپ کھل جاتے ہیں۔ وہ جو مجھ میں اور ستی مرد یاتی میں ایک طویل المیعاد حجاب قائم تھا، وہ اس کی ماں کے انڈونیشیا کے ایک قصبے میں فوت ہو جانے سے خود بخود دور ہو گیا اور ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر بڑی بڑی دیر تک ایک دوسرے کو چومتے رہتے اور تسلیاں دیتے رہے۔ اتنی دور کی موت نے ہمارے درمیان کتنی قربت پیدا کر دی تھی!

ہماری لائبریری میں اطالوی اقتباسات کی ایک ڈکشنری تھی، میں نے اس میں سے "موت" کی پٹی نکال کر اپنی پسند کے اقتباس جمع کر لیے۔ وقت گزرنے پر جب ستی مجھ سے قدرے دور ہو جاتی تو میں اس کا کندھا تھپتھپا کر کہتا "ہم موت کی کیا پروا کرتے ہیں ستی! جب ہم زندہ ہوتے ہیں تو یہ نہیں ہوتی اور جب یہ ہوتی ہے تو ہم نہیں ہوتے۔ کیسے مزے کی بات ہے کہ ہمارا اور اس کا آمنا سامنا ہی نہیں ہوتا۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔" اس اقتباس سے حوصلہ پکڑ کر ستی میرے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتی اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتا "تمہیں سقراط کے

آخری وقت کے مکالمات بھی تو یاد ہوں گے۔ جب اس نے کہا تھا کہ اب جب کہ فراق کا وقت آ گیا ہے اور ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے، مجھے اپنی موت کے سفر پر روانہ ہونا ہے اور آپ کو اپنی زندگی کے ساتھ آگے بڑھنا ہے تو ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہم میں سے خوش قسمت کون ہے اور مزے میں کون ہے۔ یہ حقیقت تو بس خدا ہی کو معلوم ہے۔"

"اور پھر اس بات پر بھی غور کرو ستی! کہ ہم حضرت آدم علیہ السلام کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے دنیا کو موت جیسی نعمت سے بہرہ مند کیا۔"

"دیکھو ایک وقت تھا کہ ہم نہیں تھے لیکن ہم اس نہ ہونے پر فکر مند نہیں تھے۔ اسی طرح سے ایک وقت آئے گا کہ ہم پھر نہیں ہوں گے تو پھر اس نہ ہونے پر فکر کیسا!"

"اور سنو ستی مرد یاتی! ایک قدرتی موت وہ ہے جب آپ خود اپنی مرضی سے مر جائیں، کسی ڈاکٹر یا ہسپتال کی مدد کے بغیر......"

لیکن ستی نے ایک خوفزدہ ہرنی کی طرح کہا "میرے خیال میں، اس دنیا میں سب سے زیادہ بری چیز موت ہے۔" میں نے فوراً پلٹ کر کہا "اس دنیا میں کئی چیزیں موت سے بھی بری ہیں۔ مثلاً زندگی!"

اس نے تھوڑی دیر غور کیا، پھر مسکراتی ہوئی میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ہم بڑی دیر تک اس کی والدہ کی باتیں کرتے رہے یعنی وہ کرتی رہی اور میں سنتا رہا اور ساتھ ساتھ ہنکارا بھی بھرتا رہا کہ لغت اقتباسات سے اٹھائے ہوئے میرے جملے استعمال میں آ جائیں۔

علم بھی کیا کمال کی چیز ہے کہ اس کو ذاتی غرض سے کہیں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس کا نشانہ کبھی چوکتا نہیں۔ جب ہم شکار پر جاتے تھے اور بھائی جان اڑتے ہوئے تیتر یا اترتی ہوئی مرغابی کو نشانہ بناتے تھے تو بسا اوقات نشانہ چوک جاتا تھا۔ نشانہ لگ بھی جاتا اور شکار گر بھی جاتا تو اٹھا کر لانے والے کتے ڈائریکشن بھول کر ایک دوسرے سے لڑنے لگتے۔ سارا وقت ان کے چکر کاٹنے، دائروں میں احمقانہ گھومنے اور بھنبل بھوسوں میں گزر جاتا...... لیکن علم ایسی چیز ہے کہ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ انسان کو گھائل کر کے رہتا ہے۔ اس پر اثر انداز ہو کے رہتا ہے۔ اس کو متاثر کر کے جان چھوڑتا ہے۔

میں نے بھی معلومات اور جان کاری کی کنڈی ڈال کر صرف ایک موضوع کے کانٹے سے ستی کو پکڑ لیا۔ وہ اپنی ماں کے مر جانے سے نم دیدہ تھی۔ میں نے موت کے موضوع کا پھندا ڈال کر اس کو گرفتار کر لیا۔ اگر وہ غریب ہوتی تو میں غربت، مفلسی، بھوک، ناداری کے المناک قصے سنا کر اپنا مطیع کر لیتا۔ اگر وہ بیمار ہوتی تو میں ظالموں، معالجوں کے رویوں پر تنقید کر کے اس کا دل خوش کر دیتا۔ مجھے اس کے لیے کچھ کرنا نہیں تھا، صرف اس کی خواہش کی تکمیل کا زبانی کلامی ساتھ دینا تھا۔ جس طرح پیر اپنے مریدوں کے لیے کچھ کرتا نہیں ہے، ان کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے دعا کر کے ان سے چندہ وصول کر کے لے آتا ہے۔ شاعر غریبوں، ناداروں اور ذلتوں کے ماروں کے لیے کچھ کرتا نہیں ہے۔ صرف ان کے خوابوں میں رنگ بھر کر ان سے آنے جانے کا کرایہ، مشاعرے کی فیس اور ضیافتوں کا اہتمام کرا کے آ جاتا ہے...... واقعی علم

میں بڑی طاقت ہے۔

ویسے ایک علم ڈاکٹر کا، معالج کا، ملاح کا، بڑھئی کا اور کسان کا بھی ہے لیکن وہ گفتگو کے علم اور کلام محض کے فن کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ علم نافع کے مقابلے میں علم غیر نافع بگڑا مضبوط اور زیادہ کارگر ہے۔ وہ سارے کیے کرائے پر دو لفظوں سے پانی پھیر سکتا ہے۔ ساری خدمت اور چاکری کو ایک فقرے سے کاٹ سکتا ہے اور سالوں کی محنت مشقت، جانفشانی اور ریاضت کو ایک نعرے سے ملیامیٹ کر دیتا ہے۔ علم غیر نافع میں واقعی بڑا زور ہے۔ وہ ساری دنیا کا واحد حکمران ہے...... بلا شرکت غیرے!

---

(8)

انہی دنوں ہمارے شہر روم میں ایک بابا دھرم داس آیا۔ اس کی خبر اخباروں میں بھی لگی اور یونیورسٹی میں اس کا زبانی چرچا بھی ہوا۔ میرے کچھ ساتھیوں، شاگردوں اور دوستوں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ''بابا'' کا لفظ سن کر اور پڑھ کر میرے دل میں بھی اس سے ملنے کی آرزو پیدا ہوئی لیکن اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں جب میں نے اس کی تصویر دیکھی اور اس کا انٹرویو پڑھا تو مجھ پر کھلا کہ یہ باباجی پینتیس چالیس برس کی عمر کے ایک آرٹش دکاندار ہیں۔ پہلے رومن کیتھولک تھے، پھر یوگا کی طرف مائل ہو کر بابا بن گئے۔ سٹیفن آنس سے نام بدل کر دھرم داس بن گئے۔ مذہب تو بدستور رومن کیتھولک ہی رہا لیکن مشرب میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ لباس بھی بدل لیا اور وہ سنہری ڈاڑھی جو پہلے چھوٹی تھی، اب سینے تک بڑھالی۔ سر کے بال عورتوں کی طرح چھوڑ دیئے اور ماتھے پر قشقہ کھینچ لیا۔ ریلوے سٹیشن کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں میڈی ٹیشن کی تعلیم دیتے تھے اور بھگوان سے لو لگانے کے طریق بتاتے تھے۔ ہفتے میں دو بار ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیم پر لیکچر ہوتا، ساتھ سلائیڈز بھی دکھاتے تھے۔ لکھا تھا کہ انہوں نے گیارہ برس تک نامی گرامی گوروں سے تعلیم حاصل کی اور مٹھ میں ایک لمبی مدت گزاری۔

میرے بہت سے ساتھی بابا دھرم داس کا بھاشن سن کر سر دھنتے ہوئے آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ اگر علم کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھنا ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔ آنا لوکر چو اور ماریا پیا لور یتی تو اس کے عشق میں مبتلا ہو کر ایسی مسحور ہوئی تھیں کہ بابا کے سوا اور کوئی بات ہی نہ کرتی تھیں۔

ہم کل سات افراد بھگوان بابا دھرم داس کی سیوا میں اپسچت ہوئے اور پائے لاگن کے بعد ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔ بابا دھرم داس سنہرے بالوں اور سنہری ڈاڑھی کے زور پر تصویری کرائسٹ کا نیا روپ نظر آتے تھے۔ ماتھے پر گہرے سرخ رنگ کا کیوٹس کے قوام والا قشقہ، گرداگرد چوطرفہ سفید حاشیہ، قشقے کے اندر چھ سات دھلے دھلائے سفید چاول ماتھے سے چپٹے ہوئے۔ آنکھوں میں سرخ انجن، سر یر سے کیسر کی خوشبو اور کمرے میں دھوپ سامگری کا مشام انگیز دھواں۔

مسکراتے رہے اور ہماری طرف دیکھتے رہے۔ ہماری طرف دیکھتے رہے اور مسکراتے رہے۔ آنکھیں پوری

کھلی تھیں، پر نظروں کا رخ اوپر کو تھا۔ آنا لوکر چو نے حوصلہ کر کے پوچھا ''مہاراج یہ حقیقت کیا ہوتی ہے؟ یہ سچ اور اور...... اور''

کہنے لگے ''سچائی ہر مقام پر سچائی ہی ہوتی ہے۔ اس کی کوئی شکل، کوئی گھڑت، کوئی مورت نہیں ہوتی۔ یہ وہ ہے کہ جو ہے۔ شروع سے ہے اور اخیر تک اسی طرح رہے گی۔ یہ سوچنے سے، پرکھنے سے، بولنے سے، بھاشن سے اور کٹھن سے اوپر کی چیز ہے۔''

پھر وہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے ''سچائی اور واستوتا جو روشن، پرکاشت اور ویکت ہے کسی رنج، سن تاپ اور پشچاتاپ کے بنا، کسی جسم، بدن اور دیہہ بنا اپنے آپ میں ہوتی ہے۔ اس کا سنسار کے ہونے نہ ہونے سے کوئی سمبندھ نہیں ہوتا، کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔''

میں بابا کے منہ سے نکلے شبدوں پر حیران ہو رہا تھا اور رام سنگھ تو مرنکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا کیوں بچو! دیکھا ہمارے بھاشن کا کرشمہ۔ ابھی تو یہ شروعات ہیں۔ دو سال کے اندر اندر ساری دنیا کی زبان ہندی ہو جائے گی۔ میں دل ہی دل میں ہندی کے پھیلاؤ سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی لہریں اب میرے وجود سے ٹکرا کر واپس جانے لگی تھیں اور میں دل ہی دل میں اس سے مرعوب ہونے لگا تھا۔

مرچیدیس نے کہا ''مہاراج یہ Awareness کیا ہے اور اس کو کس طرح سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟''

''اور اگر حاصل ہو جائے'' ماریا جلدی سے بولی ''تو اس کو کس طرح سے Cultivate کیا جاسکتا ہے؟''

بابا دھرم داس نے اپنی روشن روشن نظریں ہم پر جما کر کہا ''تم خود Awareness ہو، تم آپ جانکاری ہو، تمہارا ہی دوسرا نام سوچنا ہے۔ اب جب تم خود جانکاری ہو تو اسے حاصل کہاں سے کرنا ہے بھائی۔ جب آپ ہی سوچنا ہو تو اس کی Cultivation کیسی!''

پھر آنکھیں بند کر کے بولے ''بس اس جانکاری اور اس سے پرے پیچھے حاصل کرنے کے لیے تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ ذرا سا یدھ کرنا ہے اور وہ یہ کہ اپنے سوا اور جتنی چیزوں کی جانکاری ہے اور جو انفرمیشن ہے، اس کو چھوڑنا ہے۔ ان سب کو تیاگنا ہے یعنی اپنی ذات، اپنی ہستی اور اپنی اس جانکاری کے علاوہ سب چیزوں کو ترک کرنا ہے اور جب یہ ہو گیا، سارے نقش مٹ گئے، سارے چتر، سارے نشان سارے بیل بوٹے، پھول پتی ملیا میٹ ہو گئے تو پھر آپ ہی آپ رہ گیا، ذات ہی ذات رہ گئی۔''

رابیر تو نے کہا ''مہاراج اگر ذات کو آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ جانکاری مل جاتی ہے کہ سب کاٹھ کباڑ، جھاڑ جھنکاڑ، نشان چتر مٹ گئے ہیں اور اب میں ہی میں ہوں تو پھر مجھ کو، مجھ رابیر تو کو، رابیر تو لیارا کو پتہ کیوں نہیں چلتا کہ میری ذات اجاگر ہو گئی ہے، سب آلائشوں اور گندبلا سے پاک ہو گئی ہے۔ بالکل اکیلی ہے، مجرد ہے۔''

بابا دھرم داس نے بڑی شفقت اور سنجیدگی سے کہا ''تمہارا اس وقت کا گیان، اس وقت کی بدھی اور اس وقت کی سمجھ اور ودیا سارے کا سارا اجنتا کے کارن ہے۔ انا کی وجہ سے ہے۔ یہ ودیا نہیں ہے، بے سمبندھ ودیا ہے۔ انا دشک

جان کاری ہے۔ فضول معلومات ہے۔ ایسی جانکاری کو اور اس پرکار کی ودیا کو ہمیشہ ایک ''کرتا'' کی اور ایک ''کرم'' کی طلب ہوتی ہے۔ ایک فاعل کی اور ایک مفعول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساری دنیا کا علم اس چوکھٹے میں بندھا ہے۔ اس سے باہر نہیں نکل سکتا...... اس کے مقابلے میں ذات کی جانکاری اور ذات کی پہچان کے بعد کسی قسم کے مفعول کی ضرورت نہیں رہتی۔ دوئی مٹ جاتی ہے اور یکتائی رہ جاتی ہے۔ وحدت رہ جاتی ہے۔ توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے۔''

پھر کہنے لگے ''سنسار کی پہلی ودیا اور اس دنیا کی تعلیم کا یادے اور خیال سے اسمرن شکتی اور یادداشت سے گہرا تعلق ہے بلکہ ہماری تعلیم کی بنیاد ہی یہی ہے لیکن یہ بھی ایک فالتو چیز ہے۔ اضافی شے ہے، یاد کرنے کے لیے ایک فاعل درکار ہے جو یاد کرے۔ ایک مفعول جس کو یاد کیا جائے لیکن ذات کی آگہی میں ایسی کوئی چیز نہیں۔ کوئی دوئی نہیں۔ کوئی ٹکراؤ نہیں۔ نہ کوئی یاد کرنے والا ہے نہ کسی کی یاد آ رہی ہے...... اور نہ ہی کوئی یاد ہے۔''

ہم سب دم بخود ان کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا کلام ہمارے رگ و پے میں اترتا جا رہا تھا۔ یہ ایک عجیب ہی علم تھا اور ہمارے لیے بالکل ہی نئی بات تھی لیکن تعجب اس پر ہو رہا تھا کہ بات ہمارے اندر سرایت کر رہی تھی۔ گو اس کے پورے معانی اور مطالب واضح نہیں ہو رہے تھے لیکن اس کا ہیولا سامنے نظر آ رہا تھا۔ صاف اور بے لاگ! لیکن ذات کا وجود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذات کا حلیہ واضح نہیں تھا۔ ذات کی ذات کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس برادری سے تعلق رکھتی ہے۔

بابا دھرم داس کہنے لگا ''ذات ہر وقت موجود ہے۔ ساتھ ساتھ ہے لیکن ہر شخص ذات کو جاننا چاہتا ہے۔ اصل میں لوگ اپنے آپ کو اور اپنی ذات کو جاننے کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ جنگلوں، بنوں میں اس کو ڈھونڈتے ہیں۔ لوگوں سے مدد کی اچھیا کرتے ہیں کہ مجھ سے میری ذات ملا دو۔ مجھ سے میری ذات کا تعارف کرا دو، پریچے کرا دو۔ حیرانی کی بات ہے کہ لوگ اسے ایک نئی چیز سمجھتے ہیں۔ بازار سے لائی ہوئی کوئی شے۔ کسی سے مانگی ہوئی یا ادھار لی ہوئی۔ پر یہ نہیں ہوتی اور کہیں سے لائی بھی نہیں جاتی۔ ساتھ ہی ہوتی ہے، وہی ہوتی ہے۔ پر بھائی اور دکھائی نہیں جا سکتی۔ اس کا گیان گوچر ہوتا ہے۔''

تومرجی نے کہا ''اسی کا چرچا اپنشدوں اور سوتروں میں تو ہے مہاراج۔''

مہاراج نے انمانے جی سے کہا ''ہے اور آدیشا ہے، پر اس سے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ پرتی پادھن نہیں ہوتا۔ پرانے سوتروں میں کیول سمجھانے کے لیے اس کا اندولن ہے کہ ذات اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر ہوتی ہے۔ بال کی نوک جیسی ہوتی ہے۔ بجلی کے چکارے سمان ہوتی ہے۔ پوتر سے پوتر، ملائم سے ملائم اور مردل سے مردل ہوتی ہے۔''

''تو پھر اس کا تجربہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس کو بھانا کیسے جا سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

سائیں بابا نے ذرا سا زچ ہو کر کہا ''بتا تو رہا ہوں بابا لوگ کہ اگر ہم ذات کو جاننے کی پریتن کریں گے تو پھر دو ذاتیں ہو جائیں گی۔ ایک جاننے والی دوسری جنوانے والی۔ دوئی پیدا ہو جائے گی...... دوئی پیدا ہوئی تو ناش ہوا! سمجھے کہ نہیں؟''

میں نے گھبرا کر کہا ''سمجھ گیا جی بالکل سمجھ گیا۔''

بابا دھرم داس نے محبت سے میری طرف دیکھ کر کہا ''سادھو بابا! ذات کی سمسیا نہیں بتائی جا سکتی۔ اس میں اترا جا سکتا ہے۔ جیسے باولی میں اتر کر جل سے گاگر بھری جاتی ہے۔ اسی طرح اس میں اتر کر درپن کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح چپ کو پکڑا جا سکتا ہے۔ چپ میں اترا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ذات میں بھی بسرام کیا جا سکتا ہے۔ چپ ایک ایسی چیز ہے، جس کو شبدوں میں نہیں بتایا جا سکتا۔ اکھروں میں نہیں لکھا جا سکتا۔ چپ تو بس چپ ہی ہوتی ہے۔''

آنا نے کہا ''باباجی یہ چپ ہے کیا؟ اس کی اصل کیا ہے اور اس کا دنیا میں کام کیا ہے؟''

گو اسائیں دھرم نے کہا ''سنو رینا! بول چال، بات چیت، کتھوپ کتھن سے پرے چپ ہے، خاموشی ہے، مون ہے یعنی جو ہے وہ مون ہے جو مون نہیں ہے، اس کا کوئی شریر نہیں، استو نہیں...... اور یہ جو چپ ہے، یہ جو خاموش ذات ہے، یہی بھگوان ہے۔ خالی ذات جیو ہے۔ خاموش اور مون ذات بھگوان ہے...... اس سنسار کے سارے علم کمزور، نکمے اور رذیل ہیں۔ خاموشی اور مون کا علم ہی اصل علم ہے۔ وہی صحیح علم ہے۔''

انہوں نے آنکھیں بند کر کے پھر اپنا آموختہ دہرایا کہ ''ذات تو ہر وقت اور ہمہ وقت موجود ہے، ساتھ ساتھ ہے۔ پر اس کے لیے خاموشی اور سکوت مطلوب ہے۔ جب ''نا ذات'' کا اور ''لا ذات'' کا بکھیڑا اٹھ گیا تو ذات صاف نظر آنے لگی۔ کمرہ تو موجود ہے پر اس کا شعور پیدا کرنے کے لیے اندر کا کاٹھ کباڑ، گودڑ پھونس اٹھانا پڑے گا۔ صفائی کرنی پڑے گی۔ جونہی صفائی ہوئی، کمرہ کھٹ سے سامنے آ گیا بلکہ کمرہ ہی کمرہ گیا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔''

ماریا پیا نے ذات کے جھگڑے سے تنگ آ کر ''تھا'' کر کے پوچھا۔ ''باباجی! ذات کی بات تو تھوڑی سمجھ میں آ گئی، یہ بتایئے کہ جیون میں آنند کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سکون قلب اور موشکا کیسے پکڑا جا سکتا ہے؟''

ماریا کے اس سوال کو ہم سب نے پسند کیا!

آخرش بابا دھرم داس نے کہا ''اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کی خوشی اور آنند کا بھید باہر کی چیزوں اور باہر کے جمع جتھے سے ہے تو وہ مورکھ ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی خوشی اس کے مال اسباب روپے پیسے نوکر چاکر کی وجہ سے ہے تو وہ مہا مورکھ ہے۔ جو کوئی یہ وچار پرگٹ کرتا ہے کہ جب تک اس کے پاس دھن دولت ہے، مال منال ہے اور جمین جائیداد ہے تو وہ دھن دان ہے تو خوش ہے۔ آنند میں ہے، موج میں ہے اور جونہی اس سے یہ چیزیں چھن جاتی ہیں، لٹ جاتی ہیں تو وہ غریب ہو جاتا ہے۔ غریب ہو جاتا ہے تو دکھی ہو جاتا ہے۔ سکھ سے دور اور دکھ کے پاس ہو جاتا ہے۔ سارا جیون نرک میں گزرتا ہے اور مرے پر بھی نرک ہی جاتا ہے۔ یہ خیال بڑا غلط ہے بلکہ سارا وچار ہی جھوٹا ہے۔ آج کی سوچ کے انوسار بالکل ہی نان سائنٹفک ہے۔ دھن، دولت اور ہووت اور جمع جتھہ آدمی کو سکھ شانتی نہیں دیتا۔ یہ اس کے بس میں نہیں۔''

ہم سب کے دلوں میں ایک ہی سوال اٹھا اور ایک ہی بات ایک ساتھ ابھری کہ اگر ''ہونا'' خوشی نہیں دے سکتا، دھن دولت اور جمع جتھہ زمین جائیداد اور پنڈی پرچہ آنند نہیں دے سکتا، پوزیشن پزیشن لگاتار سکھ نہیں دے سکتا تو پھر اور کونسی شے انسانی خوشی کا باعث ہو سکتی ہے؟

بابا دھرم داس نے ہمارے چہروں سے ہمارے اندر کی کیفیت بھانپ لی اور کہنے لگے ''کبھی تم نے سوئے

ہوئے آدمی کو غور سے دیکھا ہے؟ کسی بھی سوئے ہوئے انسان کو، مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا۔ گورا ہو یا کالا۔ کوئی بھی انسان ہو، پر ہو سویا ہوا۔ پلنگ پر، کھاٹ پر، صوفے پر یا دھرتی پر، کہیں بھی سویا ہوا اور گہری نیند سویا ہو تو اس وقت اس کی ذات، خالص اور اصل ذات اجاگر ہوتی ہے۔ اس کے اضافے حوالے ٹوٹ چکے ہوتے ہیں اور اس کی صرف ایک ہی پہچان باقی رہ گئی ہوتی ہے۔ اصلی اور ذاتی پہچان۔"

"گہری نیند میں بہت ہی گھوک سویا ہوا انسان دھن، دولت اور جمع جتھہ اور حکومت سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ ہوتا تو وہی انسان ہے، جسمانی، روحانی اور ذہنی طور پر لیکن اس کی ذات سے وہ سارے پوسٹر، اشتہار اور لیبل اتر چکے ہوتے ہیں جو اس نے بڑی محنت کے ساتھ اپنے وجود کے ساتھ چپکائے ہوتے ہیں۔ وہ کوا جس نے ہنس کے پر لگا کر اپنی ذات کو سجانے کی کوشش کی ہوتی ہے، گہری نیند میں ان پروں سے بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے۔ اب وہ بڑے آرام اور اطمینان کے ساتھ اپنی چال چل رہا ہوتا ہے اور خوشی، مسرت، شادمانی اور آنند کی دنیا میں پہنچ چکا ہوتا ہے۔

سویا ہوا آدمی، بے گھر، بے در، بے نشان و بے گمان، نہ مال و دولت، نہ زمین جائیداد، نہ سونا چاندی، نہ ہیرے جواہر نہ سلطنت نہ حکومت نیند کی آغوش میں نومولود بچے کی طرح لیٹا ہوتا ہے۔ جگاؤ تو جاگتا نہیں، منمنا کے دھیمی آواز میں یہ کہہ کر کہ "ذرا سا اور سو لینے دو" پہلو بدل کر پھر نیند کی وادی میں اتر جاتا ہے...... مال منال اور سونا چاندی، روپا پیتا اور لعل جواہر میں جوں جوں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی آسودگی کم ہوتی ہے۔ جونہی ان کو بھولنے لگتا ہے، پریشن اور پوزیشن سے پرے ہوتا ہے۔ بے خودی اور بیہوشی کے عالم میں نیند کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ پھر کسی چیز کی پروا نہیں رہتی، کوئی چیز یاد نہیں آتی۔ کسی ملکیت سے علاقہ نہیں رہتا۔ تو یہ سوچنا کہ ملکیت ثروت سے تحلیکی طمانیت ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے، ایک نہایت ہی غلط مفروضہ ہے۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

پس معلوم یہ ہوا کہ خوشی مسرت انبساط اور آنند انسان کے اندر ذاتی، اصلی اور موروثی ہوتی ہے۔ کہیں باہر سے نہیں آتی۔ نہ آ سکتی ہے نہ لائی جا سکتی ہے۔ نہ باہر سے کچھ لے کر خوشی حاصل کی جا سکتی ہے۔ نہ اپنے ارد گرد اشیاء اور دولت جمع کر کے سکون قلب کی دولت کمائی جا سکتی ہے۔"

ہم یہ بات سن کر حیران رہ گئے۔

پروفیسر ایتو نے کہا "یہ سارے کا سارا جاپانی فلسفہ ہے اور ہماری پرانی داستانوں میں اس کا واضح تصور ملتا ہے۔" تومرجی نے کہا "جاپان تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا جب اپنشدوں میں اس درشن شاستر کی چرچا ہو گئی تھی۔"

دونوں پروفیسروں کے درمیان اسی بات پر ہلکا سا جھگڑا ہو گیا لیکن ہم نے ان کی طرف کوئی زیادہ نہیں دی۔ بھگوان دھرم داس بھی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

گھر آ کر میں نے سوچا تو مجھے بھگوان دھرم داس کی باتوں میں بڑا وزن معلوم ہوا۔ یہ ایک ایسی نئی بات تھی جس نے میرے مذہب کی کسی ہوئی چولیں ذرا ڈھیلی کر دی تھیں اور میرے اندر تشکیک کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنے گھر کی باتیں کچھ غیر غیری لگنے لگی تھیں اور پڑوسیوں کے دروازے پر خیر نظر آنے لگی تھی۔

سہ پہر کے وقت ریڈیو ٹرانسمیشن کے بعد میں سیدھا مہاراج دھرم داس کی سیوا میں حاضر ہو جاتا، وہاں اور لوگ بھی ہوتے لیکن وہ مجھ پر خاص توجہ دے کر سب کے سامنے میرا مان بڑھاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں انگریزی، ہندی میں ان کے بھاشن کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور کہیں چوکتا نہیں تھا جبکہ دوسرے اطالوی حاضرین انہیں بار بار روک کر مہاراج کے ملفوظات کی وضاحت طلب کرتے تھے لیکن اس کی دوسری اور اصل وجہ یہ تھی کہ میں مسلمان تھا اور میرے دل میں ان کی سیندھ نہایت کامیابی سے لگ رہی تھی۔ انہوں نے میرے مذہب کے بارے میں کبھی کچھ کہا تو نہیں تھا البتہ ان کی باتوں کا رخ بتاتا تھا کہ اس دنیا میں ویدوں کا علم ہی عالی ہے اور ویدک دھرم ہی اصل دھرم ہے۔

میری فرمائش پر مہاراج نے مجھے ہندو آتمک کا درس دینا قبول کر لیا اور میں ایک بھکاری کی طرح ہندو دھرم کی دہلیز سے لگ کر کھڑا ہو گیا کہ آ گیا ہوں تو میں اندر آنگن میں چلا جاؤں گا اور اس گھرانے کی سیوا قبول کر لوں گا۔

پہلے کچھ روز جھجک سی رہی لیکن پھر مجھے اچانک ایک سہارا مل گیا۔ ایک رات سوتے وقت کچھ گھبراہٹ، کچھ دبدھا اور کچھ بے چارگی کے عالم میں مجھے معاً خیال آیا کہ بڑے بڑے جید علماء اور اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ مسلمان اور منجھے ہوئے مسلمان سیاستدان دل و جان سے ہندو کانگریس کے ساتھ تھے اور لباس، زبان، فہم اور سوچ کے اعتبار سے ہندو دھرم کے زیادہ قریب تھے۔ اکثر ان کے بیانات سے مسلم لیگ کی تنگ نظری، تنگ دلی اور تنگ ظرفی کی وضاحت ہوتی رہتی تھی اور اس سے بلاواسطہ طور پر اسلام کو ماننے والوں کے کردار اور اخلاق پر بھی روشنی پڑتی رہتی تھی۔ سیاستدانوں کی کچھ باتیں بڑی دلفریب اور ان کے منطقی دلائل اکثر و بیشتر بڑے وزنی ہوتے تھے۔ ہمارا گھرانہ تھا تو مسلم لیگی لیکن ہمارے بھائی زیور علم سے آراستہ ہونے کے بعد کافی حد تک لبرل ہو گئے تھے لیکن زیور کی یہ خوبی کہ اسے پہن کر آدمی گھر کا نہیں رہتا، اسے سجاوٹ، اٹھلاہٹ اور سنگھار کے لیے باہر جانا ہی پڑتا ہے۔ اپنا آپ دکھانا ہی پڑتا ہے اور باہر کے لوگ جبھی درشن کرنے آتے ہیں جب ان کی مانتا کی جائے، ان کی طرف کی بات کی جائے۔ ان کو تسلیم کیا جائے۔

ولایت آ کر میں اور لبرل ہو گیا تھا اور مجھے تنگ نظری اور بنیاد پرستی کی باتیں بری لگنے لگی تھیں۔ اسلام کے بارے میں جو باتیں آریہ سماجی کرتے تھے اور جو جو اعتراضات ستیارتھ پرکاش جیسی کتابوں میں تھے اور جو مذاق خود میرے ہم مذہب اپنے ہم مذہب پر کرتے تھے، ان ساری باتوں میں اب معنی سے پیدا ہو گئے تھے۔ اب یہ بات بار بار میرے منطقی وجود کو گدگدانے لگی تھی کہ میں چونکہ ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہو گیا تھا، اس لیے مسلمان تھا۔ اگر کسی پارسی یا یہودی کے گھر میں جنم لے لیتا تو وہی ہوتا۔ پھر مذہب کے بارے میں جھگڑا کیسا اور ایک مذہب کے ہو کر رہنے میں فائدہ کس کا! انسانیت سب سے بڑی چیز ہے۔ سارے مذہبوں، تمام مسلکوں، دریاؤں، سمندروں، ستاروں، سیاروں بلکہ کل کائنات سے بڑی اور ارفع چیز انسانیت ہے۔ جب تک اس کو نہ اختیار کیا جائے، مذہب کے ساتھ وابستہ ہونے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ فائدہ اس لیے نہیں کہ پروہتوں، پادریوں اور پیروں نے اپنے اپنے فائدے کے لیے مذہب کے بڑے بڑے بت تراش کے رکھ لیے ہیں اور معصوم لوگوں سے انہیں سجدے کرائے جاتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھوائے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے بلیدان دیے جا رہے ہیں اور اس کائنات کی سب سے ارفع مخلوق کو کیڑے

مکوڑوں سے کمتر بنائے چلے جا رہے ہیں۔

جب ایسے خیالات نے میرے ذہن میں جگہ جگہ جالے تن دیئے اور میں نے ایک راسخ العقیدہ انسان دوست کی طرح مذہب انسانیت کو اختیار کر لیا تو میں نے کچھ سب شغل حاصل کرنے کے لیے سائیں بابا دھرم داس کے ڈیرے پر ایک طویل حاضری دی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ مختلف النوع کے پھلوں، کیک کے ڈبوں، چاکلیٹ کے پیکٹوں اور میٹھی گولیوں کے رنگین لفافوں سے سائیں مہاراج کے کمرے کا فرش پٹا پڑا تھا۔ میں ان کے سامنے ایک کونے میں ہو کر بیٹھ گیا اور بڑی عاجزی سے بولا "مجھے ویدک فلشا دیجیے مہاراج اور اس دھیان کی تہہ میں اتاریئے جہاں سے گیان پراپت ہوتا ہے۔"

بابا دھرم داس نے بڑے پریم سے میری ساتھ ویدانت کے فلسفے پر گفتگو شروع کی اور جہاں جہاں ان کو مشکل پڑی وہاں انہوں نے انگریزی کا سہارا لے کر اس گھمبیر فلسفے کی تفصیلات فراہم کیں۔ ان کی آسانی کے لیے اور خود میری فہم کے لیے انگریزی زبان بہتر ذریعہ اظہار ثابت ہوئی اور ہم بڑی دیر تک اسی زبان میں بات چیت کرتے رہے۔

مہاراج نے کہا کہ اگر مجھ کو واقعی راہ سلوک اور ایشور پراپتی سے دلچسپی ہے اور میں اس معاملے میں سنجیدہ ہوں تو مجھے اپنی زمین ہموار کرنے کے لیے روحانیت کا بیج وصول کرنے کے لیے اپنے کھیت کو تیار کرنا ہوگا اور جیسا کہ ہر کھیت کی تیاری کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے، اسی طرح مجھے بھی اس پراپتی کے لیے کشٹ کرنا ہوگا۔

انہوں نے مجھے گائتری منتر کا اچارن کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی اور کہا اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، کام کرتے فارغ بیٹھتے من ہی من میں اس منتر کا جاپ کرتے جانا ہے اور تین دن بعد لوٹ کر میرے پاس آنا ہے۔ تین دن بعد انہوں نے ایشور کے مارگ پر چلنے کی خوشخبری دی اور بتایا کہ بدھ کے روز صبح سویرے چار مختلف پھل اور چار مختلف پھول اور چار مختلف اناج ایک ان چھوئی تھالی میں پروس کر میرے پاس لانا اور گورو مہاراج کو سیس نوا کر ایشور پراپتی کے راستے پر پہلا قدم رکھ کے اپنا سفر شروع کر دینا۔

پھر انہوں نے مجھے گائتری منتر لکھوایا جو میں نے ان کے سامنے اردو میں لکھا کہ تلفظ کی غلطی کا اندیشہ کم سے کم رہے۔

سائیں بابا دھرم داس نے کہا "بولو میرے ساتھ......!"

اوم بھور بھوہ سوتہ سوی تر ورے نیم بھر گو دوستی دھی مہی دھیو یونہ، پر چویات......!

میں نے ڈرتے ڈرتے اس کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فصیح انگریزی میں فرمایا، اس کا مطلب ہے "اللہ تعالیٰ جو کل مخلوقات میں جلوہ گر ہے اور ہر شے میں اس کا روپ ہے۔ وہ پرستش کے لائق ہے...... اس پیدا کنندہ کا نور سب جانوں میں جلوہ گر ہے۔ ہم تیرے بندے تیرے فرمانبردار، ترے عبد خلوص عقیدت سے یقین کرتے ہیں کہ جو ہمارے حواس خمسہ اور دل و عقل میں ان کو اپنی طرف رجوع فرمالے۔"

پھر انہوں نے ایک ایک کا تلفظ بتاتے ہوئے ان کے معنی بتائے کہ اُوم کے معنی ہیں اللہ اور بھور کہتے ہیں آسمانِ اول کو، بھوہ دوسرے آسمان کو اور سوہ کے معنی ہیں تیسرا آسمان...... تت سوی تیر کا مطلب ہے اس پیدا کنندہ اور

ورنیم ہوتا ہے ماننے کے لائق۔ بھر گو روشنی ہے اور دوستی کا مطلب ہے روشن کنندہ۔ دھی مہی یعنی ہم خیال کرتے ہیں اور دھیو یو حواس خمسہ اور عقل اور کہتے ہیں اور پرچودیات کا مطلب ہے رجوع کرے۔

میں نے سارے لفظوں کے الگ الگ معنی ان کے نیچے لکھ لیے اور مہاراج کے ساتھ آٹھ دس مرتبہ اس منتر کا جاپ پکا کر واپس گھر آ گیا۔

تین دن اور تین راتیں، اپنی ڈیوٹی کے علاوہ میں ہر وقت گائتری منتر کا جاپ کرتا رہا۔ آخری رات کہ صبح مجھے بیعت کے لیے مہاراج کے پاس جانا تھا، مجھے اچانک خیال آیا کہ اس منتر کا ترجمہ تو علامہ اقبال نے بھی کیا ہے اور گائتری کے حضور میں ایک بہت اچھی نظم بانگ درا میں درج کی ہے۔ بانگ درا اس وقت دستیاب نہ تھی اور مجھے اس وقت اس نظم کا صرف مطلع اور ایک ایک شعر یاد آ رہا تھا کہ "اے آفتاب روح روانِ جہاں ہے تو + شیرازہ بند دفتر کون و مکاں ہے تو۔ اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے + چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے...... اور پھر نہ ابتداء کوئی نہ کوئی انتہا تری...... اس کے بعد کوئی مصرعہ یا کوئی شعر یاد نہیں آ رہا تھا۔ سب کچھ ذہن سے اتر گیا تھا۔ بس ایک بات ابھر کر بار بار سامنے آ رہی تھی کہ حضرت علامہ بھی شاید میری طرح اس منتر کا جاپ کرتے رہے ہوں گے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہ تھا بس گمان ہی گمان تھا!

بدھ کے روز میں چینی کی ایک خوبصورت نئی پلیٹ میں چار پھل اور ان کے ساتھ چار خوش رنگ پھول اور ایک کونے میں چار قسم کے اناج رکھ کر سائیں مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ دھوپ سامگری اور ولایتی قسم کی اگربتیوں سے سارا کمرہ دھواں دھار ہو رہا تھا۔ مہاراج مرگ چھالا پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اپنے سامنے بیٹھنے کی آ گیا دی۔ میں ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔

انہوں نے اپنے داہنے شیشے میں جڑی اپنے گورو مہاراج کی ایک تصویر پر ہاتھ رکھ کر اونچے اونچے اشلوک پڑھنے شروع کر دیئے۔ میں کچھ متاثر، کچھ خوفزدہ، کچھ متجسس دھیمی آواز میں گائتری منتر کا جاپ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے آنکھیں کھول کر میری پلیٹ پر دھوپ دان سے دھواں دیا اور ساتھ ساتھ بھاری آواز میں اشلوک پڑھتے گئے۔ پھر انہوں نے اپنے گورو کی تصویر کی آرتی اتاری اور تصویر کا سارا شیشہ دھوئیں کی دبیز تہہ کے نیچے ڈوب گیا۔

پھر بابا دھرم داس نے دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "تیرا کلیان ہو بابا۔ جیون مکت ہو اور کرموں کا چکر سماپت ہو...... گورو مہاراج کو ڈنڈوت کرو۔"

میں نے گرو مہاراج کو جن کے ہونٹ بہت موٹے اور ناک کے نتھنے دور تک کھلے تھے، ذرا سا ہاتھ اٹھا کر لکھنوی طوائفوں کی طرح سلام کیا۔ سائیں دھرم داس نے سمجھانے کے انداز میں قدرے اونچی آواز میں کہا "ڈنڈوت کرو بابا! ڈنڈوت۔"

میں الوؤں کی طرح گوسائیں جی کو دیکھنے لگا!

وہ سمجھ گئے کہ میں ان کا مطلب نہیں سمجھا۔ مسکرا کر بولے "ڈنڈوت" پھر ذرا سے توقف کے بعد انہوں نے زمین پر سجدہ کر کے کہا "ماتھا ٹیکو بابا ماتھا...... گورو مہاراج کی مورت کو ماتھا ٹیکو۔"

میں نے کچھ اس حیرت سے سائیں دھرم داس کی طرف دیکھا کہ میرا سارا وجود پتھر کا بت بن گیا۔

دھرم داس جی بیاکل ہو کر بولے۔ "جلدی کرو بابا، گورو مہاراج ہی آ گیا دیں گے۔ یہی نام دان کریں گے اور انہی کی شکشا ہوگی۔"

میں نے مکتب کے ایک نو آموز طالب علم کی طرح کہا "خدا کی ذات کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ پتھر، مورتی، تصویر، خنجر شجر سب کو سجدہ کرنے کی مناہی آئی ہے۔ میں اس تصویر کو سجدہ نہیں کر سکتا۔"

انہوں نے پچکار کر کہا "دیکھو سادھو یہ تو ایک رچوئیل ہے۔ اس میں دین دھرم کے خراب ہونے کا کوئی ڈر تراس نہیں۔ تصویر کو ماتھا ٹیکنا گورو کے مان اور ست کار کے لیے ہے۔ اس کی پوجا کے لیے نہیں۔"

میں نے کہا "دھرم داس جی اور جو چاہے کرالو، جیسے من میں آئے منالو لیکن اللہ کے سوا میں کسی اور سجدہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات میری کیمسٹری نہیں، آئی ایم ویری سوری۔"

میں سوامی جی سے ہاتھ ملائے بغیر اپنی پلیٹ اور پھل پھول انہی کے پاس چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہوٹل کے پاس "پیاتزا ویل اسپدرا" کے فوارے پر کسے ہوئے بوٹ اور تنی ہوئی جرابیں اتار کر ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ چھوٹے سے رومال سے چوڑا منہ اور موٹے بازو پونچھے۔ گیلے پاؤں پر جرابیں چڑھائیں تو اندر بوٹ بھی بھیگ گئے۔ بس پکڑ کر گھر آ گیا۔

گھر پہنچ کر تھوڑی دیر تک تو بستر کے کنارے بیٹھا رہا۔ پھر دتوریو لونیکا کو فون کر کے قبلہ کی سمت دریافت کی۔ اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا "آپ کے پاس قطب نما ہے؟" میں نے کہا "ہے۔"

کہنے لگا "ذرا توجہ سے سمجھ لیجئے۔ اس میں آپ کو تھوڑی سی مشکل ہوگی۔"

لیکن جب اس نے سمجھایا تو کوئی بات بھی مشکل نہ لگی۔ کعبہ عین سامنے آ گیا۔ میں نے فرش پر اخبار بچھا کر خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اے اللہ آج آپ نے مجھ پر بڑی کرپا کی نہیں تو میں تو لبرلٹی کی ڈھلوان پر پھسل کر آگے ہی نکل گیا تھا!

میرے سنگی ساتھی، لڑکے اور لڑکیاں، بزرگ دوست اور استاد، پندرہ کی تعداد میں گوسائیں دھرم داس کے ہاتھ پرانی شی ایٹ ہوئے۔ ہر ایک کو الگ الگ نام دان ملا اور سب نے پابندی کے ساتھ میڈی ٹیشن شروع کر دی۔

جب یہ لوگ آپس میں ملتے تو اپنے اپنے مراقبے کی تفصیلات ایک دوسرے کو بتاتے اور باہم نوٹس ملاتے تو مجھے بڑا افسوس ہوتا کہ میں ذرا سی بات پر اڑ کر اتنی بڑی نعمت سے محروم ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا۔ پھر خیال آتا کہ جب مجھے اس بات کا حکم ہی نہیں ہے کہ میں کسی اور کو معبود مان کر اس کے آگے سجدہ کروں تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں حکم عدولی کر کے امر سے باہر نکل جاؤں۔

دراصل میرے اندر ایک بہت ہی قدیم، بے حد بوڑھا اور ایک اصولی قسم کا بزرگ شخص رہتا تھا۔ یہ بزرگ ایک بنیاد پرست بوڑھا تھا جس کا پلنگ میرے وجود کی ڈیوڑھی کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ یہ بوڑھا بیمار بھی تھا اور عمر رسیدہ بھی لیکن میں نے اسے پلنگ پر لیٹے بہت کم دیکھا تھا۔ دونوں پاؤں زمین پر جما کر اور دونوں ہاتھوں سے پلنگ

کی پٹی مضبوطی سے پکڑ کر پلنگ کے کنارے بیٹھا رہتا۔ جب ہم اس کے قریب سے گزرتے تو وہ سر اٹھا کر بھرپور نظروں سے ہماری طرف دیکھتا اور پوچھتا "کہاں جا رہے ہو؟" اسی طرح ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے ہماری واپسی پر کھنکار کے پوچھتا "کہاں سے آ رہے ہو؟" گو ہم نے کبھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور ہمیشہ وہاں سے کنی کاٹ کے گزرتے تھے۔ پھر بھی اس کمزور اور بیمار بوڑھے کا دبدبہ ایسا تھا کہ ہم اس سے آنکھ ملا کے بات نہیں کر سکتے تھے۔ اسے جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ اس کے دلائل کا بطلان نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اسی بابے بڈھے کا خوف تھا جس نے مجھے گورو مہاراج کی تصویر کے سامنے جھکنے سے روکا اور میری گردن میں اپنے پنجے گاڑھ کر مجھے سیدھا بٹھا دیا۔

خیر یہ تو ہوا اور میں اس کا شاکی بھی نہیں تھا۔ جو کچھ گزرا اس پر مطمئن تھا لیکن بابا دھرم داس کی باتیں بھی کمال کی تھیں۔ اس کے گوروؤں نے اور ان کے لکھوں نے بڑے پیچیدہ مسائل پر گہری نظر ڈالی تھی اور پاتال میں اتر کر بکاؤلی کا پھول لائے تھے لیکن ساری سمساؤں کا جواب تو کسی کے پاس بھی نہیں تھا لیکن ان کی یہ بات کہ انسان کی سیلف اور انسان کی اصل ہی خوشی اور آنند ہے وہ جب گہری نیند میں اپنی انا کی جکڑ بندیوں سے رہائی حاصل کر کے اپنا مظاہرہ کرتی ہے تو سکون قلب کی شکل مجسم انداز میں نظر آنے لگتی ہے۔ ذات اصل ہے اور ایگو اس کا کینسر ہے۔ یہ کینسر ذات کے رگ و پے میں اتر کر اس کو چاٹ چاٹ کے ختم کر دیتا ہے۔ سیلف مٹ جاتا ہے، کینسر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اس دنیا میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے، ہاتھ ملاتے، منہ چومتے، جپھی ڈالتے، سر جھکاتے، دوزانو ہوتے، نماز گزارتے۔ ذات تو پیچھے رہ جاتی ہے، انا ہی ایک دوسرے مل ملا کر، معاملے کر کے، نیوتہ دے کر، وعدہ کر کے، خوش ہو کر، ناراض رہ کر اپنی اپنی راہ چلی جاتی ہے۔ اس دنیا میں سب اناؤں کے میلے ہیں۔ انا کی محفل مشاعرہ ہے، ایگو کی لیلا ہے! ایگو کی کونسلیں ہیں، انا کی بادشاہتیں اور ایگو کی ڈیموکریسیاں ہیں۔

چت بھی اس کی ہے پٹ بھی اس کی۔ درویشی بھی اسی کی، سلطانی بھی اسی کی۔ ین بھی یہی یانگ بھی یہی۔ کالج کے زمانے کا پڑھا ہوا تذکرہ غوثیہ کا ایک قصہ یاد آ گیا جس میں ایک بے لوث آدمی کا ذکر تھا جو لوگوں سے اللہ واسطے کی محبت کرتا تھا...... فرمایا:

ایک مرتبہ ہم قلندر صاحب کے چلہ میں جا کر ٹھہرے، یہ جگہ بوڑیہ کے قریب ہے اور چلہ کا مقام بالکل ویرانے میں ہے۔ شاہ امیر الدین صاحب بھی وہاں تشریف لائے اور مجھ سے فرمانے لگے کہ میاں جنگل میں رہ کر تم کیا کھاؤ گے اور کہاں سے کھاؤ گے۔ ہم نے کہا، صاحب جو خدا کھلائے گا، اسی پر راضی رہیں گے اور اس کا شکر ادا کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک شخص آیا اور چاول، مرغی، گھی وغیرہ لایا۔ ہم نے اس سے کہا "بھائی اگر تو قلندر صاحب کی نذر لایا ہے تو پانی پت پاکر نال کو لے جا اور اگر زندہ قلندر کے واسطے لایا ہے تو ہمارے سامنے رکھ دے، ہم حاضر ہیں۔" اس نے کہا "صاحب میں تو آپ کے واسطے لایا ہوں کہ پتہ چلا تھا کہ آپ چلہ میں تشریف لائے ہیں۔"

ہم نے اس کا پلاؤ پکایا اور مزے سے کھایا۔ پھر تو ہمیشہ یہی کیفیت رہی، چھ مہینے تک ہم وہاں ٹھہرے، ہر روز کچھ نہ کچھ آتا رہا۔ بڑا اچھا وقت گزرا اور خوب کیفیتیں رہیں۔

ہمارا ایک دوست باجو کیمیا گر بھی اکثر وہاں آیا کرتا جس کے ساتھ خوب گپ رہتی۔ باجو کیمیا گر کا دستور تھا کہ جب آتا تو مٹھائی شیرنی وغیرہ ضرور لاتا۔ ایک روز ہم نے باجو سے پوچھا کہ یہ جو کیمیا گری کا فن ہے یہ تو نے کیسے حاصل کیا؟ اور کس سے حاصل کیا؟ اس نے جواب دیا کہ میری آٹھ یا نو برس کی عمر تھی کہ والدین کا انتقال ہو گیا۔ جو نقد و جنس تھا، اس پر ہمارے چچا نے قبضہ کر لیا۔ میں ان کی گائے بھینس چراتا جس کے بدلے وہ مجھے دو وقت کی روکھی سوکھی دے دیتے تھے۔ چچی میری مجھ کو بہت مارتی اور تنگ کرتی تھی تا کہ میں نکل جاؤں اور میرا مال و اسباب بے کھٹکے ان کے پاس رہے۔ چنانچہ ایک دن چچی نے مجھ کو بڑی بے دردی سے مارا۔ میں بھینس لے کر جنگل کو چلا اور راہ میں بیٹھ کر رونے لگا۔ اتنے میں ایک گرو اور دو چیلے ان کے میری طرف کو آئے۔ مجھ کو روتا دیکھ کر ٹھٹکے اور حال پوچھا۔ میں نے اپنا تمام قصہ بیان کیا۔ فرمایا کہ آ ہمارے ساتھ چل اور یہ گائے بھینس یہیں چھوڑ اور اس گاؤں کو خیر باد کہہ کر اس نئے سفر پر روانہ ہو۔ چنانچہ میں گائے بھینس وہیں چھوڑ کر ان کے ہمراہ ہو لیا۔

گورو نے میرے ساتھ بڑی محبت اور شفقت کا اظہار فرمایا اور قدم قدم پر میری نگہداری کی۔ گورو کی اس الفت اور محبت کے باعث وہ چیلے میرے جانی دشمن ہو گئے۔ ایک دن گورو جی تو باہر گئے تھے، چیلوں نے اکیلا پا کر مجھے خوب پیٹا۔ میں رو رہا تھا اور سسکیاں لے لے کر آستین سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا کہ گورو جی آ گئے۔ پوچھا، اب کیوں روتا ہے؟ میں نے عرض کیا، سرکار! وہاں تو ایک اکیلی چچی دشمن تھیں، یہاں آپ کے دونوں چیلوں نے مل کر مجھے پیٹا ہے اور میری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔ مہربانی فرما کر مجھے رخصت کیجئے۔ اب کہیں اور ہی زندگی کے دن کاٹوں گا۔

یہ بات سن کر گورو جی بولے "خیر! اب تو ارنڈھی کا درخت لگائیں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے سورۃ والضحیٰ سے مجھ کو قرآن شریف پڑھانا شروع کیا۔ جب یہ سورتیں حفظ ہو گئیں تو نماز کے ارکان و احکام سمجھائے۔ نماز بھی بخوبی یاد ہو گئی۔

ایک رات گورو جی نے مجھے فرمایا کہ آج دو رکعت نماز اس ترکیب سے پڑھ کر سو رہنا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے مجھ کو تمام ترکیبیں چاندی بنانے کی تعلیم کیں۔ علی الصبح یہ خواب گورو جی سے عرض کیا تو انہوں نے فرمایا، ٹھیک ہے۔ اب ان ترکیبوں کی آزمائش کر کے مجھے بتلا۔ میں شام تک سب ترکیبوں کا امتحان کرتا رہا۔ جو کی سو پوری اتری، میرے دل کو یقین ہو گیا۔

دوسری شب پھر ان کے فرمانے پر وہی دوگانہ پڑھ کر سویا تو حضرت خضر علیہ السلام نے سونا بنانے کی ترکیبیں ارشاد فرمائیں۔ دن میں ان کی بھی آزمائش کی تو ان کو سو فیصد درست پایا۔ تیسری رات پھر وہی عمل کیا تو جواہرات کی صفت تعلیم فرمائی۔ چوتھے روز گورو جی نے مجھے رخصت کر دیا اور وہ چیلے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

میں چلا تو آیا لیکن تین دن تک یہ حال رہا کہ نہ کھانے کو جی چاہے نہ نیند آئے۔ پھر گورو جی کے پاس گیا اور یہ کیفیت عرض کی تو انہوں نے فرمایا "جا میاں! تو کھلائے گا تو کیا اور ڈیرا کس طرح سے چلائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ خود کھایا کر۔"...... اس دن سے میں خوب کھانے پینے لگا اور دیکھ لیجئے، اب تک مزے کر رہا ہوں۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ نہ رنج و غم نہ درد و الم، بڑی موج میں گزر رہی ہے۔

ہم نے پوچھا "میاں باجو یہ تو بتلاؤ کہ بھلا تم نے بھی کیمیا گری کی ترکیب کسی اور کو سکھائی؟" کہنے لگا "ہاں ایک شخص کو تو میں نے زبردستی سکھائی اور دوسرے نے زبردستی مجھ سے سیکھ لی۔"

ہم نے کہا "ذرا اس اجمال کی تفصیل بیان ہو جائے۔"

باجو کیمیا گر نے کہا "اس کا حال یوں ہے کہ ایک مرتبہ ہم دو کیمیا گر ہم سفر تھے۔ دور دراز کا لمبا راستہ طے کر کے ہم ایک گاؤں میں پہنچے جہاں کا چودھری نہایت نیک بخت اور تخیر آدمی تھا۔ چوپال میں ہم دونوں جا کر اترے تو وہ آیا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اس کے ساتھ تھی جس کے کانوں میں سونے کے بالے تھے۔ اس نے ہمارا حال پوچھا اور کہا "جب تک آپ کا جی چاہے یہاں ٹھہریں۔ کھانا ہمارے گھر سے آیا کرے گا۔ اس روز اتفاق سے ان کے گھر میں کچھ نہیں تھا۔ اس مرد کریم نے اپنی چھوٹی لڑکی کا بالا گروی رکھا اور ہم کو تین دن تک طرح طرح کا کھانا کھلایا۔ خوان خود لے کر آتا اور خالی برتن آپ سمیٹ کر چلا جاتا۔ ہم دونوں کیمیا گر اس کے خلوص اور بے غرضی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اس شخص میں تکبر اور انا نام کو نہ تھی۔ سوتے جاگتے میں ایک جیسا تھا اور ملکیت اور اندوختے سے بالکل بے بہرہ۔ اس کی ذات دھوپ چھاؤں میں ایک سار تھی۔ نہ وہاں سایہ تھا نہ یہاں۔ ایکتا کا پریمی تھا دوئی نام کو نہ تھی۔"

باجو نے کہا "چوتھے روز جو ہم اس سے رخصت ہوئے تو ایک بیل اکسیر کی اس کے حوالے کی اور اپنے روبرو اس کی تاثیر دکھلا دی کہ تانبہ اس طرح سونے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس نے بیل تو گھما کے کہیں دور ٹیلوں میں پھینک دی اور لٹھ لے کر ہمارے پیچھے دوڑا کہ میں نے تمہاری خدمت بے غرضی اور خلوص نیتی سے راہ للہ کی تھی، نہ اس طمع کے لیے اور اس کا عوضانہ پانے کے لیے۔ خدائی مہمان سمجھ کر تمہاری سیوا کی اور تم بنیا بن کر اس کا حساب چکانے لگے۔ پھر اس نے ہمارے مارنے کو لاٹھی اٹھائی تو ہم نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور بمشکل اس سے جان چھڑائی۔

اس نے تو ہمیں خدائی مہمان سمجھ کر اپنا ہاتھ روک لیا لیکن ہمیں کوس ڈیڑھ کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد خیال آیا کہ دیکھو یہ شخص دنیادار ہو کر اس بے لوث طریق پر ہمارے ساتھ پیش آیا اور ہم نے اس کی مہربانی کا کوئی بدلہ نہ دیا، یہ کتنے شرم کی بات ہے، ہمارے پاس ایک کمال کا فن موجود ہے، لعنت ہو ہم پر اگر ہم اس کو کیمیا گری سکھا کر نہ جائیں۔"

چنانچہ ہم پھر واپس پلٹے اور اسی چوپال پر آ کر قیام کیا۔ چودھری نے کہا "کیوں پھر مار کھانے کا ارادہ ہے جو دوبارہ اس گاؤں میں آ گئے ہو؟" ہم نے کہا "صاحب! ایسی کوئی بات نہ ہو گی۔ ہم تین روز اور یہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں، اس کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔" چودھری بولا "بسر و چشم! میں دل و جان سے آپ لوگوں کی خدمت کروں گا اور اس خدمت کی خوشی میں لہراتے ہوئے آپ کی سیوا کروں گا لیکن حرف طمع زبان پر لاؤ گے اور مجھے خواہش کے اندھے کوئیں میں گرانے کی کوشش کرو گے تو جان سے مار ڈالوں گا۔"

باجو بولا "میں نے کہا، بھائی طمع کی بات جانے دو۔ اس سے ہم بھر پائے البتہ ایک نماز تم کو بتاتے ہیں تو پڑھو گے یا نہیں۔" کہا "ہاں! کیوں نہیں پڑھوں گا۔ نماز کا کوئی مضائقہ نہیں۔"

باجو کیمیا گر نے کہا "میں نے وہی دوگانہ خضری اس کو بتا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس نماز کو تین روز تک

پڑھنا ہے۔"

باجو نے کہا "ہم اس شخص کی شرافت اور بے غرض مہمان نوازی سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ہر حال میں اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ جب اس نے اکسیر لینے سے انکار کیا تو ہم نے اس کو اکسیر سازی کے منبع سے ہی متعارف کرا دیا۔ ہم تو چلے گئے، ہمارے بعد اس نے دوگانہ خضری ہماری اشارت کے مطابق پڑھی اور اس سے فیض یاب ہوا...... سال بھر بعد جو ہم واپس آئے تو لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ چودھری دیوانہ ہو گیا اور گاؤں گاؤں بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ بہت جستجو کے بعد ملا تو ہم کو دیکھتے ہی لٹھ لے کر ہمارے پیچھے دوڑا اور کہا کہ خدا تم کو غارت کرے۔ تم نے مجھ کو خراب کر دیا۔ میں جو دیے دلانے اور دان پن کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا، مجھے طمع کی بانبی پر بٹھا دیا اور میں دینے کے بجائے جمع کرنے لگا۔ گھر بار بال بچے سب چھٹ گئے۔ روٹی ٹکڑے کا بھی ٹھکانہ نہ رہا۔ یہ کہہ کر وہ بدنصیب اونچے اونچے رونے لگا اور کہا کہ خدا دشمن کو بھی اس مصیبت میں نہ ڈالے۔ نہ دنیا رہی نہ دین، سب غارت ہو گیا۔ تمام جہان اپنی جان کا دشمن معلوم ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا "اچھا میاں باجو یہ تو ہوئی اس شخص کی داستان جس کو مال و منال سے جبلی طور پر کوئی علاقہ نہ تھا اور تم نے زبردستی اس کو دھن دولت سے باندھ کر کیمیا گری کی توپ سے اُڑا دیا۔ اب یہ بتاؤ کہ جس نے زبردستی تم سے یہ فن سیکھا اور زور بازو سے یہ راز لے اُڑے، وہ کون لوگ تھے؟"

باجو نے کہا "ایک مرتبہ ہم ضلع سہارنپور کے ایک گاؤں میں مقیم تھے تو وہاں کے ایک جولاہے نے ہماری بڑی خدمت کی۔ یہاں تک کہ اپنا تمام مال و اسباب بیچ کر ہم کو کھلا دیا۔ جب وہ بالکل قلاش ہو گیا تو اس نے ایک روز کیا کام کیا کہ قد آدم گڑھا گھر کے اندر کھودا اور اس پر ایک بوریا اور بوریا پر سفید چادر بچھا دی اور اپنی بیوی کو سمجھا دیا کہ خالی دیگچیوں میں چمچا ہلاتی رہنا تا کہ معلوم ہو کہ کھانا کئی قسم کا پکتا ہے اور ضیافت کا اہتمام جاری ہے۔ پھر وہ جولاہا ہم کو بلا کر لے گیا کہ چلیے آپ کی دعوت ہے۔ ہم کو تو اچھے کھانوں کی چاٹ لگی ہوئی تھی، جھٹ چلے گئے۔ پہلے تو ہم اور وہ ایک چارپائی پر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور وہ اپنی بیوی کو تاکید کرتا رہا کہ جلدی پلاؤ اور زردہ پکا کر لا ہم کب سے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں کیا خاک دھرا تھا جو وہ لاتی۔ یوں ہی جھوٹ موٹ دیگچی کھڑکا دیتی تھی۔ اس انتظار میں آدھی رات ہو گئی۔ اس وقت ہمارے میزبان نے کہا "آؤ کھانا تیار ہے۔"

"ہم بخوشی اٹھے اور سفید چادر پر قدم رکھا کہ اب تر نوالے کھائیں گے لیکن اس پر بیٹھنا تھا کہ دھم سے گڑھے کے اندر! میں تو گرا اور میرے گرتے ہی وہ دونوں میاں بیوی لٹھ لے کر میرے سر پر آ چڑھے اور دھڑا دھڑ مارنے لگے اور بولے کہ آج اسی گڑھے میں تم کو مار کر دبا دیں گے اور اوپر پانی چھینٹا لگا کے چارپائی ڈال کے بیٹھ جائیں گے کہ کسی کو خبر تک نہ ہو...... ناچار اس جولاہے کو چاندی کا ایک نسخہ بتلانا پڑا۔ اس نے دو چار دفعہ اسی دم آزما لیا اور اس کی بیوی لٹھ لے کر میرے اوپر پہرا دیتی رہی۔ جب بے کار دھاتوں سے کھٹا کھٹ چاندی بننے لگی تو اس نے رہائی دی۔ پھر پاؤں میں گر پڑا اور رو رو کر قصور معاف کرایا۔ اس دن سے میں نے توبہ کی کہ کسی کی دعوت نہیں کھاؤں گا۔"

ایک روز اسی باجو کیمیا گر نے ہم سے دریافت کیا کہ "میاں صاحب سینکڑوں آدمی میرے پیچھے پھرتے ہیں اور

کیمیا کے طالب ہیں۔ ہر ایک کا یہی سوال ہے کہ کوئی نسخہ بتلا دو مگر باوجود محبت اور بے تکلفی اور ملاقات کے آپ نے کبھی اس امر کی خواہش نہ کی، اس کا کیا سبب ہے؟"

ہم نے کہا "اچھا! پہلے یہ بتاؤ کہ جو لوگ تم سے پوچھتے ہیں، کیا ان کو تم نے بتایا؟"

کہنے لگا "نہیں۔" ہم نے کہا "پھر ہمیں کیا ہے جو تم سے خواہش کریں اور اس ملاقات میں خلل ڈالیں۔ رہا فائدہ کیمیا کا سو ہم کو یونہی حاصل ہے۔ تم ہر روز مٹھائی اور ملائی لے کر آ جاتے ہو اور ہم کھا لیتے ہیں، اس سے زیادہ مزا کیمیا کا ہم کو درکار نہیں۔"

باجو نے کہا "ایک روز میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک پیر جی کی خدمت میں گیا کہ حضرت مجھے مرید کر لیجیے لیکن انہوں نے مجھے غریب، شکستہ حال، دردمند دیکھ کر مجھے دھتکار دیا۔ اس وقت پیر جی کیمیا گری کی دھت میں مصروف پھونکا پھانکی کر رہے تھے۔ میں نے ان کی ادویات لے کر اور کچھ اپنے پاس سے ملا کر جھٹ پٹ چاندی بنا کر دکھا دی۔ پھر تو پیر جی لٹو ہو گئے۔ بڑی خاطر و مدارات کی اور کہا کہ ہم تجھ کو دل و جان سے مرید کریں گے۔ بشرطیکہ کیمیا سکھا دے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ تین من گوہ بندروں کا جمع کرا دیجیے، پھر عمل شروع ہوگا۔ پیر جی نے مریدوں کو حکم دیا۔ چند روز میں بندروں کا گوہ جمع ہو گیا۔ میں نے کہا اس کو گھڑوں میں بند کر کے آگے دے دیجیے تا کہ اس کا تیل نکل آئے۔ پھر تیل نکل آنے کے بعد کی ترکیب بتا کر میں تو چل دیا اور پیر جی نے گوہ کو آگ دلوا دی۔ مارے بدبو کے تمام بستی کے لوگ چلا اٹھے اور پیر جی کے گھر پر ایک شور و غل مچا دیا کہ خدا کے لیے پیر جی کیوں تمام بستی کا ناک میں دم کیا اور آپ کیسے پیر ہیں جو اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکے کہ کبھی بندر کے گوہ سے بھی سونا بنا ہے! خفیف ہوئے اور بستی چھوڑ کر کسی اور طرف کو نکل گئے۔"

---

(9)

پروفیسر انگاریتی روم یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس تھے اور اپنی مرضی سے یونیورسٹی تشریف لاتے تھے۔ وہ اٹلی کے ملک الشعراء تھے اور ان کی شاعری اور شرافت کی سارے ملک میں دھوم تھی۔ بڑے ملنسار، مرنجاں مرنج، پرانی وضع کے انسان تھے اور پروفیسر باؤسانی سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ میں نے ان کا نام سن رکھا تھا لیکن ان کو جانتا نہیں تھا۔

ایک روز ایک بڑی عمر کا بھکاری پاؤں میں بغیر تسموں کے فلیٹ بوٹ پہنے، ہاتھ میں جوٹ کا تھیلا لٹکائے، سر پر ایک میلی کچیلی بیری اوڑھے سٹاف روم کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس وقت کوئی دس بارہ پروفیسر سٹاف روم میں موجود ہوں گے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ صرف میں نے اس منگتے کو دروازے کی طرف آتے دیکھا تو حیران رہ گیا کہ اسے یونیورسٹی کے گیٹ کے اندر داخل ہونے کی اجازت کس نے دی! اور اگر وہ کسی طرح سے اندر داخل ہو ہی گیا تھا تو اسے لڑکے لڑکیوں نے آگے کیوں بڑھنے دیا۔

جونہی وہ فقیر دروازے پر رُکے بغیر اور کسی سے پوچھے بنا اندر سٹاف روم میں داخل ہوا تو سارے پروفیسر ہڑبڑا کر اٹھے اور اپنی اپنی کرسیاں چھوڑ کر سرو قد ایستادہ ہو گئے۔ کسی نے "بن جورنو پروفیسورے۔" کسی نے "بن جورنو ماایسترو" کسی نے انگریجو کہا اور وہ شخص ہاتھ ہلاتا، ہکلاتا سارے سلاموں کا جواب دیتا دیتا ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرے چہرے پر حیرانی اور سراسیمگی کے آثار دیکھ کر پروفیسر گرگانوں نے کہا "یہ مائسترو انگریتی ہیں۔ اٹلی کے ملک الشعراء۔ ہم سب کے استاد، سب کے سینئر۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کر اور ہلکا سا سر ہلا کر انہیں سلام کیا لیکن انہوں نے میری طرف دیکھا نہیں۔ اس وقت وہ کرسی پر بیٹھ رہے تھے۔

جب ہم سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے سبزی کا تھیلا جس میں سے پالک کے پتے اور چقندر کے گہرے ارغوانی ڈنٹھل باہر نکلے پڑے تھے، اپنی کرسی کی ٹانگ کے ساتھ کھڑا کر لیا تو حاضرین توجہ بھری

نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

پروفیسر انگاریتی نے کہا "ہمارا خیال تھا کہ ہمارے گھر میں چوہے ہیں، رات کے وقت کچھ کھڑ کھڑ ہوئی تھی تو میری بیوی کو شک ہو گیا تھا کہ ہمارے گھر میں چوہوں کا کوئی گھرانہ آباد ہے۔ میں اس کی یہ بات تسلیم نہیں کرتا تھا لیکن وہ بچی تھی۔ اس کی سہیلی نے اسے ایک چوہے دان لا کر دیا جسے میں نے دھو دھا کر، سکھا کر اور اس کے اندر پنیر کا ایک ٹکڑا لگا کر اندر کے کمرے میں رکھ دیا۔"

"پھر سر! پکڑا کوئی چور" پروفیسر فیراکوتی نے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں...... ابھی نہیں۔" ماسٹر انگریتی نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا "ابھی تو بڑی دیر ہے۔ چوہا کوئی اتنی جلدی تھوڑی پکڑا جاتا ہے۔"

پھر وہ کچھ سوچنے لگے اور خاموش ہو گئے۔ انہیں سوچ میں ڈوبے دیکھ کر ہم بھی ساکت و صامت اسی طرح بیٹھے رہے۔

پھر انہوں نے سر ہلایا۔ ہلکی سی "ہونہہ" کی اور مسکرا کر بولے۔ "میں اب ان کا بھیدی ہو گیا ہوں۔ واقعی ہمارے گھر میں ہیں اور ان کا پورا ایک گھرانہ آباد ہے...... میں نے یکے بعد دیگرے تین پکڑے۔"

"تینوں کو مار دیا کہ باہر لے جا کر چھوڑ دیا؟" ہم میں سے کسی نے پوچھا۔

"نہ مارا" ماسٹر انگاریتی نے کہا "نہ باہر لے جا کر چھوڑا۔ چوہے دان کا دروازہ کھول کر انہیں واپس اپنے بلوں میں جانے دیا۔ بڑی خوشی سے چھلانگیں مارتے بھاگ گئے...... اب میرے دوست بن گئے ہیں۔"

مجھے یہ آدمی کچھ دیوانہ سا معلوم ہوا!

پروفیسر انگاریتی نے کہا "انسان اور چوہے بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بہت ہی قریب ہو کر ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ دونوں ہی ہمہ خور ہوتے ہیں۔ اناج کھاتے ہیں، پھل کھاتے ہیں، گوشت کھاتے ہیں، سبزی کھاتے ہیں، مغز انڈے۔ مچھلی کھاتے ہیں...... اور اگر کچھ نہ ملے تو ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں۔"

ہم سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں ان کی بات کی داد دی۔

"مجھے بتایا گیا ہے......" پروفیسر انگاریتی بولے "کہ دونوں پر تقریباً ایک جیسی بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں کیونکہ دونوں کا اعصابی نظام اور نظام ہضم بالکل ایک جیسا ہے۔"

پھر انہوں نے کہا "انسان اور چوہے سخت سے سخت موسم میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ بحرِ منجمد شمالی میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں اور صحرائے کالاہاری میں بھی۔ دوسرے جاندار ہر موسم میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کو ایک مناسب ماحول اور متعلق آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔"

پھر استاد انگاریتی ہنسے اور ہنستے ہوئے بولے "میں نے اپنے گھریلو چوہوں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ بھی ہماری طرح موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جب میں اپنا باجہ بجاتا ہوں تو کسی کسی پسندیدہ دھن پر وہ دانت بجاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چوسیاں مار کر خوش ہوتے ہیں...... میرا مشاہدہ ہے کہ چوہے بھی انسانوں کی طرح خوشیاں مناتے ہیں، قلابازیاں

لگاتے ہیں اور موج میلہ کرتے ہیں۔"

"لیکن ایک بات ہے......" انہوں نے انگلی اٹھا کر کہا "چوہے ایک معاملے میں انسان سے افضل ہیں کہ نسل کشی میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ مجھے پیرس کے ایک ماہر حیوانات نے بتایا تھا کہ اگر چوہوں کا ایک جوڑا باقاعدگی سے بچے پیدا کرتا رہے اور چوہے اور چوہیا میں کوئی ذہنی، بدنی، معاشی یا جنسی اختلاف پیدا نہ ہو اور ان کے سیاسی حالات ٹھیک رہیں اور ان کے درمیان کوئی اور چوہیا نہ آ جائے تو ایک جوڑا پانچ سال کی مدت میں نسل در نسل بارور کر کے نو کھرب چالیس ارب چھتیس کروڑ ننانوے لاکھ انہتر ہزار ایک سو بائیس بچے پیدا کر سکتا ہے۔"

ہم سب نے زوآلوجی کے پروفیسر رینالدو کی طرف دیکھا جو زیرلب مسکرا رہے تھے اور اس بات کے معترف نظر آ رہے تھے کہ اگر ایک جوڑے کے خانوادے کی جلد جلد شادیاں ہوتی جائیں تو واقعی ان کی نسل کی تعداد تقریباً اسی قدر ہو جائے گی۔

"اور ایک اور معاملے میں بھی چوہا انسان سے برتر ہے۔" استاد نے وثوق سے کہا "اور وہ یہ کہ اس نے اپنی ذات کی قربانی دے کر ہی کمال کے علاج اور غضب کی دوائیں دریافت کر کے دی ہیں اور انسانوں کے وجود پر اپنی زندگیاں قربان کر دی ہیں۔"

"اب فرق صرف یہ ہے" انہوں نے کہا "کہ چوہا صرف کھاتا پیتا ہے اور بچے پیدا کرتا ہے اور ساری زندگی بلی سے کنی کترا کر گزار دیتا ہے۔ اس کو شاعری، مصوری، فلسفے یا فلائی فزکس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اپنے تنگ و تاریک بلوں میں، اینٹوں کے انبار کے درمیان اور ٹرنکوں کے پیچھے اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے۔ کسی چوہے نے نہ تو دانتے کا نام سنا ہے اور نہ ہی مائیکل اینجلو کی تصویریں دیکھی ہیں۔ نہ آئن سٹائن کی تھیوری پر کبھی مباحثہ کیا ہے...... سیدھی بات یہ ہے کہ چوہے کی کوئی روحانی یا فکری زندگی نہیں ہوتی۔"

"پھر اس ساری دنیا میں آج تک کوئی چوہا ایسا پیدا نہیں ہوا جس کو کوئی اخلاقی پرابلم رہی ہو۔"

سارے سٹاف روم پر سکوت طاری تھا اور ہم بڑے غور سے استاد مکرم ماسٹر انگاریتی کی بات سن رہے تھے۔

انہوں نے کہا "آج تک کسی چوہے کو یہ سوچنا نہیں پڑا کہ وہ ایک غرض مند دنیادار ہو کر رہے یا ایک صوفی کی طرح زندگی گزارے...... اس کے مقابلے میں انسان کو ہزار الجھن میں لاکھوں Conflicts ہیں اور وہ ان کے درمیان اختیاری اور بے اختیاری کی لہروں میں الجھتا گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ انسان صرف اس صورت میں انسان ہے کہ وہ اپنی جبلتوں کے منہ میں لگام دے کر پوری مضبوطی کے ساتھ راسیں سنبھال کر زندگی کے راہوار کو اڑائے چلا جائے۔ انسانیت یہی ہے کہ انسان ان جبلتوں پر جنہیں وہ دوسرے جانداروں کے ساتھ Share کرتا ہے، قابو پا کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق عمل میں لائے۔ انسان میں اور چوہے میں یہی نمایاں فرق ہے کہ وہ چوہے کی طرح اپنی جبلت کو اپنا قائد مان کر اس کے حکم اور اشاروں پر نہیں چلتا...... لیکن اپنی جبلتوں کی راہیں اپنے ہاتھوں میں سہار کر زندگی بسر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے بلکہ بہت ہی بڑا مسئلہ ہے جس کے ساتھ ہمارے دوسرے چھوٹے چھوٹے بے شمار مسئلے بندھے ہیں۔ یہ چھوٹے

چھوٹے مسئلے انفرادی طور پر اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس بڑے مسئلے کا کوئی حل نہیں ڈھونڈا جاتا۔"

"اور یہ بھی سر!" ہم میں سے ایک بولا کہ "کوئی آگے بڑھ کر ہمارا یہ مسئلہ حل کر دے گا اور ہمارا رہنما بن کر مستعدی کے ساتھ کھڑا ہو جائے گا اور ہم اس کی ہر بات کو اسی طرح سے تسلیم کرنے لگیں گے جس طرح سے چوہا اپنی جبلت کو دل و جان سے مانتا ہے۔"

"کچھ یوں لگتا ہے۔" پروفیسر انگاریتی نے کہا "کہ ہمارے اوپر کبھی بھی وہ وقت نہیں آئے گا جب ہم اخلاقی مسائل سے عہدہ برا ہو جائیں گے اور انسان اپنے اندرونی خلفشار سے نکل کر آرام اور اطمینان کے سنگھاسن پر بیٹھ جائے گا...... بس یہی فرق ہے جو ہمارے اور چوہے کے اندر موجود ہے۔ چوہا مزے میں ہے اور ہم ہر لمحہ بے چینی اور Stress میں گزار رہے ہیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی چوہے کے ساتھ اپنی زندگی بدلنے کا خواہش مند نہیں۔"

"اور یہ بات ایسی ہے......" انہوں نے ذرا رک کر کہا "جسے کوئی چوہا آج تک سمجھ نہیں سکا! اور یہی وجہ ہے جس کی بنا پر چوہا، چوہا ہے!!"

پھر وہ جلدی سے اٹھے۔ اپنا سبزی کا تھیلا اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے سٹاف روم سے باہر نکل گئے کہ "اس وقت تک میرے چوہے دان میں ضرور کوئی چوہا لگ گیا ہو گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میری بیوی پڑوسیوں کا لڑکا بلوا کر اسے مروا نہ دے۔ میں ان میں سے ایک ایک کو پہچانتا ہوں، سبھی میرے دوست ہیں۔"

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے انہیں دور تک دیکھا۔ وہ آنے والے قدموں کے مقابلے میں جانے والے قدم زیادہ تیزی سے اٹھا کر جا رہے تھے اور لڑکے لڑکیاں، پروفیسر، مالی، چپڑاسی، ہرکارے او چوکیدار رک رک کر اور جھک جھک کر انہیں سلام کر رہے تھے۔

پروفیسر باؤسانی نے مجھے بتایا کہ استاد مکرم پروفیسر انگاریتی تسکانیا کے ایک کسان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے والد تلاش معاش کے سلسلے میں اپنا پیارا اٹلی چھوڑ کر مصر میں آباد ہو گئے تھے۔ اسکندریہ کے قریب ایک قصبے میں ان کی بیکری تھی اور اچھی گزر اوقات ہو رہی تھی۔ پروفیسر انگاریتی 1888ء میں اسی قصبے، اسی علاقے اور اسی لسانی ماحول میں پیدا ہوئے اور اپنی جوانی کے آغاز تک کا زمانہ اسی جگہ گزار دیا۔ چوبیس برس کی عمر میں یہ اطالوی نوجوان مصر چھوڑ کر پیرس چلا آیا اور پیرس جاتے ہوئے اس نے پہلی مرتبہ اپنے پرکھوں کے وطن اطالیہ کو دیکھا۔

"پہلی جنگ عظیم کی ابتداء ہوئی تو میں میلان میں تھا۔" یہ کہہ کر استاد ذی مکرم انگاریتی نے غور سے میری طرف دیکھا اور انگلی سے میرے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "تم عربی جانتے ہو؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے حیران ہو کر پوچھا "پھر تم قرآن کس طرح سے سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "یا شیخ! ہم قرآن سمجھتے نہیں، قرآن پڑھتے ہیں۔ قرآن کا متن ہمیں بچپن میں پڑھا دیا جاتا ہے۔ سکھا دیا جاتا ہے...... رٹا دیا جاتا ہے اور پھر ساری زندگی ہم مختلف موقعوں پر اور زندگی کے مختلف مراحل میں قرآن کی

تلاوت کرتے رہتے ہیں۔"

کہنے لگے "میں چونکہ مصر میں پیدا ہوا تھا، اس لیے میری ملکی اور معاشرتی زبان عربی تھی۔ گھر پر ہم اطالوی بولتے تھے اور سکول میں ہمیں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی۔ کچھ مدرسے انگریزی کے بھی تھے لیکن میرے والد نے مجھے انگریزی پڑھانا پسند نہ کیا۔ فرانسیسی مدرسے میں داخل کروا دیا۔" پھر ذرا سا رُک کر اور ہنس کر بولے "میں نے اپنی شاعری کی ابتدا عربی میں کی تھی۔ ایک تو میں فرفر عربی بولتا تھا، دوسرے مجھے اس کا رسم الخط بہت پسند تھا اور تیسری بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری بیکری سے ایک لڑکی ڈبل روٹی، پاستا اور پانے لینے آئی تھی اور وہ بہت ہی خوبصورت تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لمبی باتیں تو ضرور کرتے تھے پر میں اس کی تحلیل و تعظیم کے واسطے گفتگو سے بڑھ کر کوئی کام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے حسن کی شان میں قصیدے لکھنے شروع کر دیے اور اپنے آپ کو ایک مایہ ناز شاعر سمجھنے لگا۔"

"اور اس پر......" میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "اس حسینۂ نازنین اور ناظورہ دلفریب پر آپ کی شاعری کا کیا اثر ہوا؟"

"اسے میں نے کبھی اپنی نظمیں دکھائی ہی نہیں۔"

"کیا؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ "قصیدہ لکھ کر اسے ممدوح کو سنایا ہی نہیں؟"

دھیمی آواز میں بولے "نہیں...... میں نے مناسب نہیں سمجھا...... دراصل میں شروع ہی سے اس طرح کا تھا۔ جذباتی، جھینپو، امن پسند اور شرمسار زمانہ نوجوان! مجھے اچھا نہیں لگتا تھا کہ اظہار محبت کر کے محبوبہ کی شان میں گستاخی کروں اور اس کا رتبہ گھٹاؤں۔"

"اس نے بھی آپ کی محبت کو محسوس کیا یا نہیں۔" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ضرور کیا ہوگا۔" انہوں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا...... وہ ایک بہت باوقار لڑکی تھی۔ مصری نہیں تھی لیکن میری طرح وہ بھی مصر میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا خاندان ایران سے آ کر اسکندریہ آباد ہو گیا تھا۔ پھر اس کے باپ نے کاروبار شروع کر دیا تو اپنے گھر والوں کو ہمارے قصبے میں بھیج دیا۔ اس کا نام ارجمند تھا۔ آنکھیں گہری نیلی، بال کالے سیاہ اور رنگ گورا، میں اس سے ملنے کے بعد احساس کمتری کا مریض ہو گیا اور میں کم ہی گھر سے باہر نکلتا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے خوف سا لگا رہتا تھا کہ اچانک وہ راستے میں نہ مل جائے۔"

"صرف اس خوف کے مارے آپ گھر میں چھپے رہتے تھے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں!" انہوں نے سنجیدگی سے کہا "اس کے فراق کا دکھ بھی ایسا جان لیوا تھا کہ مجھ میں ملنے جلنے کی اور باہر نکلنے کی طاقت ہی باقی نہ رہی تھی۔"

یہ پروفیسر انگاریتی سے میری دوسری ملاقات تھی۔

میں سٹاف روم میں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ حسب معمول آ کر دروازے پر کھڑے ہو گئے، ادھر ادھر دیکھا۔ واپس جانے لگے تو میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتے میرے پاس آ کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہم دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا، میری بابت پوچھا۔ پھر پاکستان کے اور پاکستان کی ادبی زندگی کے بارے میں سوال کرتے رہے اور آخر میں پھر کبھی تفصیلی ملاقات کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

اس پہلی ملاقات میں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی تعلیم واجبی سی ہے اور وہ سکول کے درمیانی درجوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ 1915ء میں جب اطالیہ بھی پہلی جنگ عظیم میں شریک ہوا تو انگاریتی بھی ایک سپاہی کے طور پر فوج میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر پہنچ گئے۔ محاذ کی اگلی صفوں میں گولہ باری کے درمیان وہ کئی مرتبہ مرے اور کئی مرتبہ جئے۔ یہ مرنے جینے کا تجربہ ان کی زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا جس نے ان سے آدھی زندگی لے لی تھی اور آدھی موت دے دی تھی۔ انگاریتی کی شاعری کی ابتداء گولہ باری کے دوران انہی خندقوں میں ہوئی اور اس نے اپنی شاعری کا پہلا مجموعہ یہیں مرتب کیا جو بعد میں ALLEGRIA کے نام سے شائع ہوا۔

کہتے تھے 1920ء میں میں نے شادی کر لی اور اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کی خاطر میں اس کے شہر روم میں آباد ہو گیا اور روم میں مجھے تم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تم جو مشرق کے رہنے والے ہو، اور میں جو یورپ کا ایک باشندہ ہوں اور میری پیدائش پاکستان اور اطالیہ کے درمیان اسکندریہ میں ہوئی تو پھر میں کون ہوں اور میرا تمہارا کیا رشتہ ہے...... وقت اور زمان کے بارے میں ان کے نظریات بہت ہی عجیب تھے۔ ان میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ صاحب وقت تبدیل نہیں ہوتا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ چلتا چلا جاتا ہے۔ جس طرح تیز رفتار گھوڑے کا سوار وقت اور مسافت کو قطع کرتے ہوئے سوار ہی رہتا ہے۔ اسی طرح وقت سے گزرنے والا انسان اپنی شکل و صورت اور ہیئت پر قائم رہتا ہے۔ جتنی اس میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، اسی قدر وقت بھی عمر میں بڑھ جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ عمر کے آخری حصے میں محمد حسین آزاد کی سوچ میں بھی ایسی ہی کوک بھر گئی تھی لیکن وہ چونکہ بنیادی طور پر شاعر نہیں تھے، اس لیے ان کی فکر سپاک و نماک کے بھمبل بھوسے میں پھنس گئی اور انگاریتی اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر کے طور پر ابھرے۔ شاعر چونکہ فلسفی یا ریاضی دان نہیں ہوتا، اس لیے اپنی شاعری میں خط کشیدہ الفاظ بھی چھوڑے جاتا ہے اور خالی جگہوں کو پُر کرنے کا حکم بھی لگاتا جاتا ہے۔ شاعری کو علم و ادب کی سرکاری سرپرستی حاصل ہے اور یہ میوز کی چھتر چھایا میں بلا خوف و خطر کامیابی سے آگے بڑھتی ہے۔ نثر کے لیے ایسا کوئی اہتمام نہیں!

میں مائستر وانگاریتی کی شاعری کے مقابلے میں ان کی ذات سے زیادہ متاثر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو استاد مکرم کے لیے نوبل پرائز کے طلبگار تھے۔ انگاریتی شاید واقعی اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر تھے لیکن اطالوی ہونے کے ناطے ان کی انٹرنیشنل پی آر نہ ہونے کے برابر تھی۔ نوبل پرائز حاصل کرنے کے لیے چونکہ بڑے پیچیدہ اور طاقتور پی آر کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے ایل مائسترو دونوں مرتبہ نوبل پرائز پانے سے رہ گئے۔

اس سلسلے میں جرمنی اور فرانس کے ادبی حلقوں میں ان کی کچھ ہیٹی بھی ہوئی لیکن مائستر و نے اس کی کوئی خاص پروا نہ کی۔

لیکن جس طرح مربوط انداز میں بات کرتے کرتے ان کے خیال کی توپ رجک چاٹ جاتی تھی اور اس گرم میں ایک عجیب طرح کی تجلی رونما ہوتی تھی تو میں اس روشنی کا بڑا دیوانہ تھا۔ باؤ سانی نے مجھے بتایا کہ 39ء میں ان کا نوجوان اکلوتا بیٹا اپینڈکس کے غلط آپریشن کی وجہ سے فوت ہو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب اپنے مردہ بچے کو سینے سے لگا کر ہسپتال سے پیدل گھر آئے تھے اور کسی کو اسے دفن کرنے نہیں دیتے تھے۔ اس روز سے ان کی شاعری نے تو لامعلوم نئی جہتوں کی نشاندہی شروع کر دی لیکن ان کی گفتگو میں کبھی کبھی ایک پہیہ ایک طرف کی کھنچ مارنے لگا اور یہی کھنچ ان کی ذات کے حسن و جمال کا سمبل بن گئی۔

ایک روز جب میں نے بابا دھرم داس سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور ان سے انی شی ایٹ ہونے کی خواہش کا قصہ بیان کیا تو وہ میری بات سن کر بہت حیران ہوئے۔ اول تو ان کا خیال تھا کہ میں اس عمر میں یقیناً کسی سے بیعت ہو چکا ہوں گا اور میں نے باطن کے سفر کا آغاز کر دیا ہوگا۔ دوم یہ کہ اگر اب تک کوئی راستہ نہیں پکڑا تو پھر کوئی نیا راستہ کیوں؟ وہ اپنے بزرگوں کا اور اپنے پرکھوں کا پرانا راستہ ہے، اس کو کیوں نہ تلاش کیا جائے۔ کوئی دور تو نہیں ہوگا، ایسا پوشیدہ بھی نہیں ہوگا۔ ذرا سا جھاڑ جھنکار دور کر کے صاف نظر آنے لگے گا۔ بالکل سامنے!

ایک روز جب مائستر و نے مجھے اپنے گھر آنے کی اجازت دی تو متعلق اور مناسب ماحول ہونے کی بنا پر میں نے ان سے انسان کی اصل ذات اور انسان کے بنیادی جوہر کی بابت پوچھا کہ یہ سیلف کیا چیز ہے؟ اس کا تذکرہ بابا دھرم داس بہت کرتے تھے لیکن ہمیں یہ چیز اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

پروفیسر انگاریتی نے کہا "مجھے بھی یہ بات اپنے محبوب بیٹے کے مرجانے کے بعد سمجھ میں آئی ہے...... اس کے لیے یا تو بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے یا کوئی بہت قیمتی قربانی دینی پڑتی ہے لیکن قربانی والا سودا بڑا مہنگا ہے کہ قربانی کے ساتھ ساتھ قربانی دینے والے کا بھی ایک بڑا حصہ بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔"

"بہت سال پہلے کی بات ہے......" انہوں نے کہا "میں اس وقت فرانس میں تھا۔ جب یورپ کے کچھ ماہرین نفسیات، انسانیات، اقتصادیات اور معاشریات نے مل کر یہ سوچنا شروع کیا کہ انسان اصل میں ہے کیا؟ کیا جنگ و جدال، نفرت و خصومت، بربادی اور راہزنی، قتل و غارت اس کی فطرت میں شامل ہے اور یہ چیزیں وہ اپنے خونی ورثے کے طور پر لے کر پیدا ہوتا ہے یا اتنا بہت کچھ وہ بعد میں سیکھتا ہے۔ اس دلچسپ سوال کا دائرہ وسیع ہو کر ساری دنیا پر پھیل گیا اور ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، فلسفیوں نے اس موضوع پر لمبے چوڑے مضمون لکھے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ایک عرب فقیہ نے بھی، جو اس وقت پیرس میں قیام پذیر تھا، اس سلسلے میں ایک طویل مقالہ لکھا جس کا لب لباب تھا کہ انسان فطری طور پر اسلام پر پیدا ہوتا ہے اور اس کی ذات، سلامتی اور سکون کا امتزاج ہوتی ہے...... میں نے تو ان کے اس مقالے کو بے حد پسند کیا لیکن باقی سب دانشوروں اور محققوں نے اس کا بے طرح مذاق اڑایا۔ اگر انہوں نے اپنے مضمون میں "اسلام" کا لفظ استعمال نہ کیا ہوتا تو سب نے بڑی توجہ سے یہ مقالہ پڑھنا تھا اور اس کی بنیاد پر بات آگے کی تحقیق میں

داخل ہو جاتی لیکن ایسا نہ ہوا اور ان کی بات صدا الصحرا ہو کر ریگزاروں کے حوالے ہو گئی۔"

"بڑی دیر تک یہ بات اخباروں، رسالوں اور لیکچروں کے درمیان گھومتی رہی۔ آخر ایک انجمن نے فیصلہ کیا کہ اس پر ایک سیمینار ہونا چاہیے تاکہ ماہرین اور فاضلین دو بدو ایک دوسرے سے بات کر سکیں۔ برسلز کے مقام پر ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں دنیا بھر کے ادیبوں، فلسفیوں، نفسیات دانوں، علم حیاتیات کے ماہروں اور مذہبی رہنماؤں نے شرکت کی۔"

"آپ بھی اس سیمینار میں شریک ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

پروفیسر انگاریتی نے کہا "میں اس سیمینار میں شرکت تو نہیں کر سکا البتہ اس کی روزمرہ کارروائی سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ مستفید ہوتا رہا۔ میرے پاس اب بھی اس کی پوری روئیداد موجود ہے اور شرکاء مذاکرہ کا متفقہ فیصلہ بھی میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

میں اس متفقہ فیصلے کی تفصیل جاننے کے لیے بے چین ہوا تو مائستر و نے فرمایا کہ مذاکرہ میں پہلے دن طویل گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ پروان چڑھے عاقل و بالغ انسان کے بجائے اس کی کنہ اور اس کے Bud کا مطالعہ اور معائنہ کیا جائے کہ اس کی سرشت کیا ہوتی ہے اور اس میں جبلی طور پر کیا رنگ بھرا ہوتا ہے اور اس کی فطری نفسیات کیا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سیمینار کے دوران اسی مقام پر مختلف رنگ و نسل، مختلف شباہت اور مختلف صحت اور قومیت کے اسی بچے جمع کیے گئے۔ ان میں کچھ شیر خوار بچے تھے، کچھ گھٹنوں چلتے تھے، کسی نے کھڑے ہونا سیکھ لیا تھا اور چند ایک بالکل نومولود تھے۔

شرکائے مذاکرہ نے ڈاکٹروں، نرسوں، فلسفیوں اور نفسیات دانوں کی موجودگی میں ان بچوں کا بغور مطالعہ کیا اور دن اور رات کے مختلف اوقات میں مختلف حالات کے تحت کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کی جڑ اور نسل انسانی کی بنیاد میں کوئی خرابی نہیں، دنیا کا کوئی بچہ لالچی، فریبی، ظالم، حاسد، مکار، کرودھی اور متکبر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہم عمروں، ہم عصروں، ساتھیوں، ہم جولیوں اور بڑے بزرگوں سے کلکاریں مارتے ہی ملتا ہے اور ہونٹوں پر انگلی سے تونبہ بجاتے اور برو پھرو کرتے ہی جدا ہو جاتا ہے۔ اپنے قریب کی چیزیں کھینچتا گھسیٹتا ضرور ہے لیکن جلد ہی ان چیزوں کو بھول کر کسی اور دھیان میں لگ جاتا ہے۔

چنانچہ طے یہ پایا کہ انسان فطری طور پر اچھا ہوتا ہے، خیر ہوتا ہے۔ شریف النفس ہوتا ہے اور خوش قلب اور مہربان ہوتا ہے۔ انسان کے بچے کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں تو وہاں بدی، خباثت، خیانت اور ظلم نہیں ہوگا بلکہ خوشی، لطافت، چمک، ہمک، رونق اور محبت ہی نظر آئے گی۔"

میں نے عرض کیا "بچے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن جب ہم اپنا، اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں، رشتہ داروں اور ساتھیوں، ملاقاتیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندر باہر گند ہی گند دیکھتے ہیں۔ وہ کونسی بدی، خرابی اور ممکنہ عیب ہے جو ہم میں موجود نہیں۔ یہ جنگیں، یہ نعرے، سرحدوں کے جھگڑے، مذہبوں کی لڑائیاں، ظالموں کی چیرہ دستیاں، کونسا عیب ہے جو حضرت انسان میں موجود نہیں اور جس میں وقت کے ساتھ ساتھ قوی تر ہونے کے امکان ظاہر نہیں۔"

مائستر وانگاریتی نے کہا ''بچے اسفنج کی طرح ہوتے ہیں۔ غسل کرنے کے تولیے جیسے، ہر شے بڑی آسانی سے جذب کر لیتے ہیں۔ جب ان کی عمر دو سال کی ہو چکتی ہے تو انہوں نے دس ہزار گھنٹے کی زندگی کا مظاہرہ کیا ہوتا ہے۔ اچھا برا، خوش نما بدنما، کڑوا میٹھا، گفتنی ناگفتنی...... زندگی کی ساری جزئیات، اپنی الٹی سیدھی بنت کے ساتھ ان کے تجربے سے گزری ہوتی ہے۔ اب اپنی آگے بڑھتی ہوئی زندگی میں جب بچے اپنے مشاہدات کو عملی صورت عطا کرنے کے لیے وقت کی سٹیج پر آتے ہیں تو ایکٹ کے دوران ان کو پتہ چلتا ہے کہ اس جہان رنگ و بو میں کچھ چیزیں ''اچھی'' ہیں اور کچھ ''بری'' اور ہم سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ ہم ''اچھا اچھا'' کریں اور ''برا برا'' ترک کر دیں۔ یہی یہاں کا دستور ہے اور یہی اس دنیا کا قاعدہ ہے۔''

''بچے یہ بات جان تو جاتے ہیں لیکن ایک بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کچھ چیزیں ''صحیح'' کیوں کہلاتی ہیں اور کچھ چیزوں کو ''غلط'' کا نام کیوں دیا گیا ہے...... لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچہ آہستہ آہستہ کس قدر کامیابی کے ساتھ اپنے بڑوں کا یہ فن سیکھ جاتا ہے کہ برے کو اچھے کے ساتھ اور غلط کو صحیح کے ساتھ کس طرح سے ڈھانپا جا سکتا ہے اور اس میں کیسے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔''

بدی اور برائی تو اپنے ماحول کا مطالعہ کرنے سے سیکھی جاتی ہے اور نیکی ان کو ان کا ماحول اس لیے سکھاتا ہے کہ اس بدی کو مستور کیسے کرنا ہے۔ دراصل ہمیں اچھا بننے کی حیلہ سازی اور نیک ہونے کا مکر سکھایا جاتا ہے اور جب کبھی مکر کی اوٹ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتی ہے تو نیچے سے بدی نمایاں طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ جب انسان بھری پری سٹیج پر اس طرح سے عریاں ہو جاتا ہے تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرا اندر خراب ہے اور میں نہاں طور پر بدی سے بھرا ہوا ہوں۔ چنانچہ اچھائی کا بھرم رکھنے کے لیے انسان ایک ایسی نامختتم جدوجہد میں اُلجھ جاتا ہے جس کا سچائی سے، حق سے اور انصاف سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

آپ جو لوگ صبر و استقامت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ اندر کی برائی کے نیچے پہنچ کر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں وہاں سکون اور سکینت کا ایک سمندر دکھائی دیتا ہے اور وہ اسی خیر سے متعارف ہوتے ہیں جو اصل ہے۔ انسانیت کی کنہ ہے اور ان کے بچپن کا وجود ہے۔ وہ وجود جو ان کی صحیح ذات اور ان کا مجرد سیلف ہے۔

پھر انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور فرمایا ''وہ جو تمہارے بابا دھرم داس تھے، وہ اسی سیلف کی بات کرتے تھے کہ تمہارا سیلف تو نیک پاک، شریف اور خوشگوار و خوش کردار ہے لیکن تم نے اپنی ذات کے ارد گرد اتنے مضبوط سائن بورڈ اور ایسے بھاری بھاری تختے جڑ لیے ہیں جن کا اتارنا اب ممکن نہیں رہا۔ ان سائن بورڈوں پر کہیں ''ہیرو'' لکھا ہے کہیں ''عالم'' کہیں ''ایکٹر'' اور کہیں ''دانشور'' کہیں ''سیاستدان'' اور کہیں ''نابغہ روزگار'' ضرورت پڑنے پر موقع و محل کے مطابق آپ وہ سائن بورڈ آگے کرتے جاتے ہیں جس کی نمائش مقصود ہوتی ہے۔ تمہاری اصل ذات اور تمہارا سیلف ایک چوزے کی مانند ان تختوں، پھٹوں اور سائن بورڈوں کے جکڑ بند میں ایک عمر قیدی کی طرح وقت گزار رہا ہوتا ہے۔ وہی چوزہ جو دو برس تک آزادی کی بھرپور فضاؤں میں گودیوں کے اندر پلا، باغوں میں گھوما، ستاروں کے ساتھ مسکرایا اور کائنات کے

مظاہر سے ہم کلام رہا...... صوفیوں، سنتوں، روحانیوں، بیراگیوں اور بھگتوں کی ایک ہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ذات کے چوزے کو عمر قید سے رہائی دلوا کر اسی سکھ شانتی، حق حقیقت اور صدق و صفائی کی اس جولانگاہ میں پہنچ جائیں جہاں سے زندگی نے اپنا آغاز کیا تھا۔

میں نے کہا ''تو یہ ذات کا چوزہ ہر شخص میں موجود ہوتا ہے؟''

فرمایا ''ہر شخص میں موجود ہوتا ہے۔''

''مجھ میں بھی موجود ہوگا؟''

''ہوگا کیا! موجود ہے۔''

''ظالم ڈاکو، چور اور زانی، ہٹلر اور ہلاکو میں بھی موجود ہوتا ہے۔''

''ان میں بھی موجود ہوتا ہے؟''

''تو پھر یہ چوزہ اپنی قید کے کسی کونے کھدرے سے سر نکال کر باہر کیوں نہیں دیکھتا؟''

''ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے سیلف پر اس محنت سے تختے، چادریں اور پھٹے چڑھائے ہیں اور اس قدر شدت سے ان میں پیچ اور کابلے کسے ہیں کہ وقت گزرنے پر اب ان نٹوں اور ڈھبریوں کو کھولا نہیں جا سکتا۔ وہ سب زنگ آلود ہو کر یک جان ہو چکے ہیں۔''

پروفیسر صاحب کی یہ طویل گفتگو سن کر مجھے پہلی مرتبہ اپنے سیلف کی اسیری کا حال معلوم ہوا۔ میری ذات کا وہ چھوٹا سا چوزہ جو مجھ سے الگ رہ کر روشنی اور ہوا سے محروم، تنہائی، لاغری، کمزوری اور بے بضاعتی کی زندگی گزار رہا تھا اور مجھے اس سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ نہ ہی میں اس کو اس کی حالت اسیری میں گڑ، تل اور تیل پہنچا سکتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان پہنچنے کی ساری راہیں مسدود تھیں لیکن حیرانی کی یہ بات تھی کہ میں اس سے باہر بھی نہیں تھا۔ میرے چوزے نے خود اپنی شان بنانے کے لیے اپنے گرد سائن بورڈوں، سائن پوسٹوں، بینروں کی ایک مضبوط جیل تعمیر کر لی تھی جس کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ میرا سیلف اس کے اندر قید تھا اور میں خود ایک ملاقاتی کی حیثیت سے اپنی ذات سے ملنے کی آرزو میں تڑپ رہا تھا۔

میرے چوزے کے گرد لوہے کی چادر کا ایک بورڈ تھا جس پر ''ادیب'' لکھا تھا۔ دوسری چادر پر ''براڈ کاسٹر'' چھپا تھا۔ تیسری پر ''پروفیسر اور ماہر تعلیم'' چوتھی پر میری پہلی کتاب ''ایک محبت سو افسانے'' کا نام۔ درزوں اور جھریوں پر سٹین لیس سٹیل کی تختیاں ربٹوں سے پیوست تھیں جن پر ''خوبصورت''، ''صحت مند''، ''شریف النفس''، ''خوش کلام''، ''مرد مجاہد''، ''فرزند پاکستان''، ''نیک نہاد''، ''صلح کن'' اور پتہ نہیں کیا کیا لکھا تھا اور ان سب پر دو انچ موٹے لوہے کی چادر کا تنگ خول چڑھا تھا جس کے چاروں طرف ''گڈریا گڈریا'' لکھا تھا۔

میں نے پروفیسر انگاریتی کی طرف درد بھری نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کسی صورت میں اپنے سیلف سے مل سکتا ہوں۔ ایک بار...... آخری بار......!''

انہوں نے مسکرا کر کہا" بتا تو رہا ہوں بھائی کہ صوفی سادھو اس ملاقات کو باطن کا سفر کہتے ہیں اور کیمیا گروں کی طرح وہ ساری زندگی اسی دھن میں گزار دیتے ہیں۔"

"اور ان کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ تختے، پھٹے، کھل جاتے ہیں؟ راہ مل جاتی ہے" میں نے پوچھا۔

کہنے لگے" کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ بہت سوں کو مل جاتی ہے۔ بہت سوں کو ملی۔ سینٹ فرانسس آف آسیسری، سینٹ تھرلیا، سینٹ آگسٹائیں، منصور حلاج۔ جنید بغدادی، راما کرشنا...... اور بے شمار...... لاکھوں، ہزاروں کروڑوں کو ہی...... کسی کا نام معلوم ہو گیا۔ بہت سے اسی سرخوشی میں بے نام آگے نکل گئے کہ منزل مل گئی۔ مزے ہو گئے۔ ملاقاتیں ہو گئیں۔ نام بنا کر اور نام بتا کر کیا لینا ہے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا" اس کا کوئی طریقہ ہے اپنی ذات بکھانے کا؟"

کہنے لگے" مجھے تو معلوم نہیں۔ میں نے تو یہ راہ دریافت کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ البتہ طریقت والوں نے کئی طریقے نکالے ہیں جیسے پہاڑوں کی چوٹیوں اور سمندروں کی تہوں میں جانے والوں نے راستے ڈھونڈے ہیں، اسی طرح باطن کے مسافروں نے بھی کچھ راستے نکالے ہیں!"

"آپ ان کی بابت کچھ جانتے ہیں۔" میں نے جلدی سے پوچھا تو انہوں نے مایوسی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا اور خاموش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد اپنے آپ سے گویا ہوئے کہ" بس منت خوشامد اور للو چتو ہی ہے کوئی باقاعدہ کلیہ یا کوئی سائنسی طریقہ نہیں، بس ایسے بڑھاوا چڑھاوا ہی ہے۔ اس سے ادراک ذات ہو جائے تو پو بارہ نہیں تو اندھی کھو میں ظلمات کا سفر تو ہے ہی۔"

میں نے پوچھا" اور یہ للو چتو کیا ہے؟"

کہنے لگے" بس کیے جانے کا نام للو چتو ہے۔ کوئی منزل تو ہے ہی نہیں۔" پھر ذرا سا مسکرا کر بولے۔" ہمارے اسکندریہ کی جامع مسجد کے ایک خطیب تھے، ابو القاسم طبلاوی۔ میرے والد سے ان کی اچھی راہ و رسم تھی۔ وہ جب بھی ہمارے یہاں آتے تو میرے والد ایک ہی بات پوچھتے کہ اچھا مسلمان بننے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا ایک ہی جواب دیا کرتے کہ اچھا مسلمان بننے کے لیے صرف کوشش ہی کی جا سکتی ہے اور اسی کوشش کا نام اچھی مسلمانی ہے لیکن میرے والد کی اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ میں دور بیٹھا خوب سمجھتا تھا کہ شیخ ٹھیک فرما رہے ہیں۔"

پھر آنکھیں بند کر کے کہنے لگے" انسان نے قدیم زمانے سے لے کر اب تک گیانِ ذات کے لیے اپنی دو قوتوں کا ہی سہارا لیا ہے۔ ایک بصارت اور دوسرے سماعت لیکن بصارت کے مقابلے میں سماعت سے زیادہ کام لیا ہے یا یوں سمجھو کہ بصارت کے مقابلے میں سماعت نے بہتر طور پر رہنمائی کی ہے۔"

"نظر، ارتکازِ نظر یا عرفِ عام میں نظر بندی کے علاوہ تفکیر اور مراقبے کی اور بھی کئی فنی روشیں اور مہارتی طریقے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر تفہیم ذات کا ڈول ڈالا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ بے مقصد بیٹھنے، بیٹھے رہنے اور خاموش لمحات

گزارنے سے بھی ذات کا گیان ہونے لگتا ہے۔"

آپ مراقبہ کریں، تفکیر کریں یا خاموش ہو کر ایسے ہی بیٹھ رہیں، اس میں آپ کو ایک اصول پر ضرور عمل پیرا ہونا پڑے گا کہ آپ کے ارد گرد روشنی ہے۔ روشنی کا ایک بہت بڑا تنبو ہے اور آپ اس کے نیچے بیٹھے ہیں۔ روشنی کی ایک آبشار ہے۔ ایک نیاگرا فال ہے اور آپ اس کے امڈتے ہوئے جھلار میں نہا رہے ہیں۔

"روشنی کیوں؟" میں نے پوچھا" خوشبو کیوں نہیں، رنگ کیوں نہیں، نظارہ کیوں نہیں؟"

پروفیسر نے کہا" اگر میں عربی میں پڑھوں گا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اطالوی میں سمجھاؤں۔ آسان اور سادہ اطالوی میں اور تمہارے قریب ہو کر بتاؤں کہ اللہ روشنی ہے۔ آسمانوں کی اور زمین کی۔ مثال اس روشنی کی یہ ہے کہ جیسے ایک طاق ہو اور اس کے اندر ایک چراغ...... اور وہ چراغ دھرا ہو ایک شیشے میں، ایک قندیل میں اور وہ قندیل ہے جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ، تیل جلتا ہے اس میں ایک برکت والے درخت کا جو زیتون کا ہے اور جو نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف! لگتا ہے کہ اس کا تیل روشنی ہے اگرچہ اس میں آگ نہ لگی ہو...... روشن پر روشن، نور پر نور...... اللہ جس کو چاہے اپنی روشنی کی آگ دکھا دیتا ہے اور بیان کرتا ہے اللہ کی مثالیں لوگوں کے واسطے ہیں اور اللہ سب چیز جانتا ہے۔"

میں نے کہا" یہ تو کسی مذہبی کتاب کا بیان معلوم ہوتا ہے۔ کسی پرانے صحیفے کا۔"

انہوں نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے کہا" خداوند زمین و آسمان کی رونق اور بستی ہے اور کائنات کی ساری مخلوقات کو اسی سے نور وجود ملتا ہے۔ چاند، سورج، ستارے، سیارے، معلوم اور لامعلوم، حاضر اور غائب، انبیا، اولیا، فرشتے اور ان کے علاوہ اور بھی جو کچھ ہے اور ان میں جو واضح اور پوشیدہ روشنی ہے، وہ اسی خزانہ نور کی بدولت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد، گورو، پیر مرشد، شیخ اور ہادی باطن کے مسافر کا پہلا قدم اندھیرے سے نکال کر نور کی شاہراہ پر رکھتے ہیں اور پھر اس کی انگلی پکڑ کر قدم قدم چلاتے ہیں۔"

"لیکن اس میں طاق کا کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا۔" جس میں روشنی کی قندیل رکھی ہے؟"

کہنے لگے یوں تو خدا کے نور سے کل کائنات کی موجودات روشن ہیں لیکن گیانِ ذات کے متلاشی کا جسم ایک طاق کی مانند ہو جاتا ہے۔ ایک دراز قد محرابی طاق کی طرح، اور اس کے اندر ستارہ کی طرح کا چمکدار شیشہ قندیل رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ شیشہ اصل میں اس کا قلب ہوتا ہے۔ جو ایک انٹینا کی طرح عالم بالا سے متعلق ہوتا ہے اور اپنے سارے سگنل وہیں سے وصول کرتا ہے۔

پروفیسر صاحب اکثر ہمارے سٹاف روم میں آ کر علم و ادب کی گہری وارداتیں اور شاعری کے میمنہ اور میسرہ کی باریک کیفیتیں اور روزمرہ کے دلچسپ مگر خیال انگیز قصے سنا کر چلے جاتے تھے لیکن ایسی بات انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہ کی تھی۔ مجھے کچھ کچھ تو سمجھ میں آ رہا تھا لیکن ان کی باتوں کا بیشتر حصہ ابر سیاہ مست کی ٹکڑیاں بن بن کر اڑا جا رہا تھا۔ میں کچھ حیران بھی تھا اور کسی قدر گھبرایا ہوا بھی تھا لیکن میری حیرانی میں گھبراہٹ زیادہ تھی۔

چہرہ اوپر اٹھا کر اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ کہنے لگے۔ ''اس قندیل کی روشنی بے حد صاف و شفاف ہوتی ہے جو نگاہوں کو ٹھنڈک اور وجود کو سکون عطا کرتی ہے۔ یہ روشنی ایک مبارک درخت زیتون کے تیل سے حاصل کی جاتی ہے جو نہ مشرق کا ہوتا نہ مغرب کا۔''

میں نے کہا ''میں آپ کے اس درخت کی شباہت نہیں سمجھا۔''

جلدی سے بولے ''تم نے زیتون کا درخت دیکھا ہے؟''

میں نے کہا ''کیوں نہیں سر! میں اٹلی کا باشندہ ہواور زیتون کے درختوں سے، ان کے پودوں سے، ان کی بیج سے اور ان کے پھل سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''اور اس کے تیل سے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اس کے تیل سے بھی متعارف ہوں۔ دو وقت کا اسی تیل میں پکا کھاتا ہوں اور اس کو کچی صورت میں سلاد پر انڈیل کر لطف لیتا ہوں۔''

انہوں نے کہا ''اور زیتون کا یہ درخت جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے، وہ اس جہان کے اندر کسی رُخ کا محتاج نہیں۔ وہ آزاد ہے اور گویا ایک کھلے میدان میں ہے۔ اس پر دھوپ اور روشنی ہمہ وقت ضوفگن ہے۔ سورج مشرق میں ہو یا مغرب میں، اس زیتون کے وجود پر اور وجود کے ہر کونے اور پہلو پر دھوپ پڑتی ہے اور یہ عام غذا کے علاوہ روشنی سے بھی اپنی خوراک اور قوت حاصل کرتا ہے۔ نباتات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ ایسے زیتون کا تیل بہت صاف اور لطیف ہوتا ہے۔ اس قدر صاف لطیف، چمکدار اور درخشندہ کہ یوں لگتا ہے کہ آگ دکھائے بغیر ہی روشن ہو جائے گا۔''

پھر انہوں نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''یہ خدا کے نور کا ذکر ہے اور اس کا نور کسی وجہ کسی رُخ، کسی دلیل یا کسی توجیح کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ جہت کی قید سے پاک ہے! جو بھی اس کا طالب ہوگا، اس کو یہ روشنی ضرور ملے گی۔ سب کچھ اس کے قبضے میں ہے، وہ جس کو چاہے اپنی روشنی عنایت کر دے۔''

میں نے کہا ''آپ نے یہ سب کچھ کہاں سے سنا؟''

کہنے لگے ''میں نے یہ درس اپنے اسکندریہ سے اور اپنے مصر کے کوچہ و بازار سے لیا۔ پھر میری ماں بچپن میں مجھے انجیل مقدس کا سبق پڑھاتے ہوئے بھی بتایا کرتی تھی کہ یوحنا کے پہلے خط میں درج ہے کہ ''خدا نور ہے اور اس میں ذرا بھی تاریکی نہیں۔''

میں نے کہا ''اس ازلی روشنی کا سارے مذاہب میں ذکر ہے اور پرانے صحیفوں میں بھی یہ بیان موجود ہے لیکن روشنی پر روشنی کے کیا معنی؟ جب روشنی کا مذکور ہو گیا تو پھر نور علیٰ نور کیا ہوا؟''

مائسترو نے کہا ''میں کچھ یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا البتہ احتمالاً اور ارتجالاً یہ سمجھتا ہوں کہ ایک تو خود قابلیت نور کی اعلیٰ درجے کی تھی، اس پر نار کا بھی اس کے ساتھ پیوند لگ گیا۔ پھر چراغ قندیل میں ہونے سے اور شیشہ قندیل پہلودار ہونے سے ایک روشنی بہت سی روشنیوں کا مخرج بن گئی۔''

اس پرانی یادوں کو ٹٹولتے ہوئے پروفیسر انگاریتی نے کہا ''بچپن میں ہمارے ایک استاد سکول کے بچوں کو نہر سویز کے کنارے روشنی کا مینار دکھانے لے گئے تو ہم نے دیکھا کہ شیشے کے ایک مدور گولے کے درمیان سفید گیس کا ہنڈا روشن ہے۔ اس ہنڈے کی روشنی اس قدر تیز تھی کہ ادھر نگاہ نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہنڈا تو اپنی جگہ ساکت و صامت روشن تھا البتہ اس کے گرد شیشے کا گولا گھوم رہا تھا۔ یہ گولہ بند نہ تھا بلکہ شیشے کی براق تکونی قلموں سے بنا تھا۔ جو گولائی کے خم دے کر مختلف زاویوں پر لگائی گئی تھیں۔ اندر سے ہنڈے کی روشنی جب ان براق قلموں سے منعکس ہو کر نکلتی تو دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی۔ یہ براق قلمیں تیز Reflectors کا کام دیتی تھیں۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ روشنی جب بھی کسی جسم صیقلی سے یا آلۂ انعکاس سے چھچھل کر نکلتی ہے تو اس کی رینج میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''یہ تو ہوئی ناں مثال۔'' میں نے تسلیم کرتے ہوئے کہا ''بہت ہی کامیاب مثال۔ اب بتایئے آپ کے نزدیک اس کی اصل کیا ہے۔''

کہنے لگے ''بھئی بات یہ ہے کہ اصل تو اس کی کوئی صاحب معرفت ہی بتا سکتا ہے۔ میں تو ایک رمضان سحری کے وقت قاہرہ کے بازاروں میں گھومنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پہلے تو دیکھنے والے کو نور کا علم ہوتا ہے۔ اس کا ادراک ہوتا ہے۔ پھر وہ روشنی قلب پر وارد ہو کر عمل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح ایک سٹیج پر علم و عمل یکجا ہو کر نور علیٰ نور ہو جاتے ہیں۔''

پروفیسر صاحب کی بیگم دو اعلیٰ درجے کی دھواں چھوڑتے کافی مگ ٹرے میں رکھ کر لائیں تو ہم نے یک زبان ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا ''آپ کو میرا شکر گزار ہونے کے لیے دو مرتبہ شکریہ ادا کرنا پڑے گا کیونکہ میں دوسری مرتبہ کافی بنا کر لائی ہوں۔''

''اور پہلی مرتبہ کب تھی؟'' پروفیسر انگاریتی نے پوچھا۔

''پہلی مرتبہ آپ اشفاق صاحب کو روشنی اور نور کے بارے میں اپنی کوئی نظم سنا رہے تھے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا ''جس میں زیتون کا اور زیتون کے درختوں کا کچھ اچھا سا ذکر تھا۔''

کہنے لگے ''ٹھیک ہے، آپ کا دو مرتبہ شکریہ بلکہ آپ کا شکریہ ہی شکریہ۔''

ہم آہستہ آہستہ دیر تک کافی پیتے رہے اور خاموش رہے۔ بعض اوقات سننے والے کے دل پر کہنے والے کی بات ایسا تاثر چھوڑ جاتی ہے کہ وہ وقتی طور پر گنگ ہو جاتا ہے اور محفل میں جب کوئی پوچھنے والا اور سوال کرنے والا ہی نہ رہے تو جواب دینے والا بھی گم سم سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت ایک عجیب طرح کی ایسی گونج پیدا ہو جاتی ہے جس کے ارتعاش کو صرف بدن کے رونگٹوں سے ہی پکڑا جا سکتا ہے۔

کافی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اور خاموشی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں ان سے رخصت لے کر جانا بھی چاہتا تھا اور ابھی کچھ دیر اور ان کے پاس بیٹھنا بھی چاہتا تھا۔ میرے پاس ان دونوں کاموں کے لیے کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ جب سینورا انگاریتی کافی کے خالی مگ لینے آئیں تو میں نے پروفیسر صاحب سے کہا ''اب میں آپ سے اجازت چاہوں

گا۔ آپ کا بڑا وقت لیا لیکن اس سے مجھ کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ایسی باتیں نہ تو کتابوں میں ملتی ہیں نہ کوئی انہیں اس تفصیل کے ساتھ سمجھا سکتا ہے۔"

سینورا مسکرا کر کہنے لگیں۔ "مجھے تمہارے پروفیسر کے علم و دانش سے تو کوئی علاقہ نہیں، نہ میں ان کی باتیں سمجھتی ہوں، نہ ان کی شاعری البتہ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ یہ آدمی بہت اچھے ہیں۔ مجھے ان سے آج تک کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔"

میں نے کہا "سینورا! شاعر ہونا اور صاحب علم ہونا بڑی اچھی بات ہے لیکن اچھے ہونا زیادہ اچھی اور ارفع بات ہے۔ اور اگر کسی کی نصف بہتر اس کی اچھائی اور شرافت کی شہادت دے تو اس بیان پر گویا مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔"

سینورا نے کہا "اگر تم کو کوئی ضروری کام نہ ہو اور تمہیں یہاں بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہ ہو تو ابھی کچھ دیر اور رکو۔ جو پے تمہاری موجودگی میں اور بھی خوش نظر آ رہے ہیں۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" پروفیسر انگاریتی نے کہا "میں یقیناً اشفاق سے باتیں کر کے فرحت محسوس کر رہا ہوں اور میرے لیے یہ ایک بے حد اطمینان بخش نشست ہے۔"

میں نے خالص گوتمی بدھسٹ انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور سیس نوا کر کہا "میری اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ میں استاد محترم کی معیت میں چند لمحے اور گزار کر ان کمیوں کو پورا کر لوں اور جو اور کسی جگہ سے پوری نہیں کی جا سکیں۔"

سینورا انگاریتی نے کہا "میں آپ لوگوں کے لیے چیز اور مشروم کا ایک ایک سینڈوچ بنا کر لاتی ہوں اور اس کے ساتھ گرم گرم کافی کا ایک کپ اور۔"

پروفیسر صاحب نے کہا "براوا! دی واظ روما...... روما چیتا اتیرنا!!!"

سینورا کے چلے جانے کے بعد میں نے کہا "مائسترو! وہ جس ذات کا آپ ابھی تذکرہ کر رہے تھے، وہ پیلی پیلی روئیں والا چوزہ، اس سے پھر ملاقات ہو سکتی ہے؟ مرنے سے پہلے یا مکمل طور پر ناامید ہو جانے سے پیشتر؟"

کہنے لگے "انسان بڑی مظلوم اور محکوم مخلوق ہے۔ اس کے اختیار میں سب کچھ نہیں۔ زمین کو برمانا اس کے اختیار میں ہے لیکن اس میں سے میٹھا پانی تلاش کر لینا اس کے بس میں نہیں۔ دوا دارو علاج معالجہ اس کے اختیار میں ہے لیکن بیماری کا قلع قمع کرنا اس کے قابو میں نہیں۔ محبت کر لینا اس کی قدرت میں ہے لیکن محبت کا جواب پانے پر اس کا کوئی زور نہیں۔ اسے پکار کرنے کا پورا ادھیکار ہے لیکن اس کی بازگشت پر کوئی دسترس نہیں۔"

"اپنے نفس گم گشتہ سے ملاقات اس کے فضل سے ہوتی ہے اور جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا...... اور خدا جس کسی کو اپنا آپ پہچوانا چاہتا ہے، اس کو اپنی روشنی کی آگ دکھا دیتا ہے۔"

"اور دوسرے جو اسے پہچاننے کے دل سے آرزومند ہوتے ہیں...... وہ؟"

"وہ اپنا اپنا کشکول لے کر کوہ و بیاباں، صحرا و دریا کوچہ و بازار اور محل و مزار میں گھومتے رہتے ہیں۔"

"ان کو بھی روشنی مل جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

تو کہنے لگے "کوشش سے کچھ ہوتا نہیں لیکن بندے کی شان یہی ہے کہ کوشش کرتا رہے۔ ملے نہ ملے، ہماری

شان تو برقرار رہنی چاہیے۔"

پھر بولے "ہمارے وہاں مصر میں جب لوگوں کے ولیمے ہوتے ہیں تو بڑی ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ معزز مہمان دور دور سے آتے ہیں اور دولہا ان کے ہاتھ چوم کر عزتوں کے مقام پر بٹھاتا ہے۔ ایک بڑے شامیانے تلے مہمانوں کی نشست کا انتظام الگ ہوتا ہے۔ محفل رقص و سرود کا خانہ دوسرا ہوتا ہے اور اشیائے خورد و نوش کی چھولداری نے آدھا تنبو بانٹ دیا ہوتا ہے۔ جب مہمانانِ گرامی گرم گرم سیخوں سے مرغ و ماہی اتار کر کھاتے ہیں، چاول شوربے اور خستہ نان قلچوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہو کر اور مشروبات پسندیدہ کے جام لنڈھاتے ہیں تو خیمے کی دیواروں کے ساتھ چمٹے ہوئے فقیر، دریوزہ گر و درویش، بخت خوار بھکاری اپنے کشکول بجا کر دردناک صدائیں لگاتے ہیں کہ شاید ان کے بھانڈے میں بھی کوئی ٹکڑا کوئی چھیچھڑا، کوئی روٹی، کوئی بوٹی، کوئی خیر خیرات آ جائے اور وہ پر باش ہو کر کسی تنور سے ٹیک لگا کر سو جائیں۔ وہ جو خوش نصیب، طالع مند اور بختیار مہمان ہوتے ہیں، خوان نعمت سے اپنا حصہ بخرہ وصول کرتے ہیں اور وہ جو شامیانے کے باہر کشکول کا کڑا بجا کر صدا لگاتے ہیں تو ان میں سے بھی کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ لیکن ایک کثیر تعداد خالی ہاتھ اور خالی پیٹ واپس چلی جاتی ہے اور ان کے کڑے بجاتے ہوئے خالی کشکول کی صدا دور دور تک سنائی دیتی ہے۔"

"دراصل انسان کوک پکار کا آدمی ہے اور سوالی بن کر زندگی بسر کرتا ہے۔"

"اور باطن کے سفر کی بھی کوئی کوک پکار ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ہے اور بے شمار ہے۔" مائسترو نے کہا "ہمارے مصر میں، صومعوں کے اندر درویش لوگ "اللہ ہو" کا وظیفہ کرتے ہیں۔ اللہ کا لفظ منہ بند کر کے نتھنوں سے سانس لے کر اندر کو کھینچتے ہیں اور "ھو" کی آواز ہونٹوں کو گول کر کے نکالتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس قسم کا ورد میں نے اپنے ملک کے فقیروں میں دیکھا ہے جو درگاہوں، مزاروں اور خانقاہوں پر سروں پر چادر ڈال کے ایسا ورد کیا کرتے ہیں۔ ورد کے دوران ان کا بدن ہچکولے کھانے لگتا ہے اور یوں سنائی دیتا ہے جیسے ایک ہی بدن سے دو قسم کی آوازیں آ رہی ہوں۔"

پروفیسر صاحب نے کہا "گہری میڈی ٹیشن کے لیے ایک وظیفہ خالی "ہو" بھی ہے...... ہو کی آواز ازلی اور قدیمی ہے۔ جب انسان نے ایک اونچی، ارفع اور ذات قدیم و عمیق کے بارے میں اپنا تصور قائم کیا تو اس نے سب سے پہلے اسے "ہو" کے نام ہی سے پکارا۔ جنگلوں، بیابانوں، صحراؤں اور سمندروں میں "ہو" کی آواز گونجنے لگی۔ "ہو" کی ادائی تسلسل کے ساتھ لمبے سانس میں بھی کی جا سکتی ہے اور توڑ کر بھی۔ لمبے سانس میں تو آپ اپنے پھیپھڑوں میں سانس بھر کر سانس چھوڑتے وقت "ہوووووووو" کی وہاں تک لمبی سانس چھوڑتے جائیں گے جہاں تک آپ کی سانس ساتھ دیتا ہے لیکن توڑ کر اس ورد کو یوں کیا جاتا ہے کہ "ہ" کی آواز اندر کھینچی جاتی ہے اور "او" کی صدا باہر نکالی جاتی ہے...... ھو کی آواز اونچے سروں میں بھی نکالتے ہیں لیکن پندرہ بیس مرتبہ سے زیادہ نہیں کیونکہ یہ بہت ہی طاقتور ارتعاش ہے اور انسانی بدن اس کے تواتر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

میں نے متجسس ہو کر پوچھا "مائسترو! کیا آپ ہو کا ورد کرتے رہے ہیں؟"

انہوں نے جلدی سے کہا "یہ باتیں پوچھنے کی نہیں ہوتیں، کرنے کی ہوتی ہیں۔" پھر کہنے لگے "ایک ورد 'یا ہو' کا بھی۔ اس میں انی کی آواز سانس کے ساتھ اندر کھینچتے ہیں اور ہو کی پلٹتے ہوئے سانس کے ساتھ باہر نکالتے ہیں۔ یہ سرود کشیدہ عام طور پر اجتماعی رنگ میں کی جاتی ہے۔ کچھ فقیر ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ کر اور سر گھٹنوں تک جھکا کر مناجات کیا کرتے ہیں۔"

پھر میری طرف غور سے دیکھ کر بولے۔ "میں نے کچھ گروہوں کو 'را' کی آواز میں میڈی ٹیٹ کرتے بھی دیکھا ہے۔ ان کے سرخیل نے بتایا کہ 'را' کا آہنگ بدن کو اعلیٰ درجے کی طبعی طاقت عطا کرتا ہے۔ آپ اسے کھڑا ہو کر اور ناف پر ہاتھ باندھ کر یا بیٹھ کر، دونوں طریق سے کر سکتے ہیں لیکن کھڑے ہو کر کرنے سے قوت کا بہتر طور پر حصول ہوتا ہے۔"

"سیدھے کھڑے ہو کر ایک لمبی سانس کھینچیں اور سانس چھوڑتے وقت ارررررا...... آ...... آ...... اس وقت تک کرتے جائیں جب تک کہ آپ کی سانس پورے طور پر نہ ختم ہو جائے۔ اس کے بعد پھر یہی "مناجات" کریں اور ختم ہونے پر اسے دہرائیں۔ تین مرتبہ کر چکنے کے بعد رک جائیں اور نارمل انداز میں سانس لیں۔ اس کے بعد پھر یہی مشق دہرائیں اور تین کا سیٹ ختم ہونے پر رک جائیں۔ قدرتی انداز میں سانس لیں اور پھر یہی مشق کریں لیکن ایک بات یاد رکھیں، اور یہ میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ یہ ایکسر سائز تین سیٹ سے زیادہ نہ کریں۔"

پھر خود ہی کہنے لگے کہ اس طرح کا ایک اور طریق بھی ہے۔ اس تفکیر کو سوہانگ میڈی ٹیشن کہتے ہیں۔ یہ مشکل اور الجھے معاملات میں انسان کی بڑی مدد کرتی ہے۔ جب آپ کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس میں "کروں؟" یا "نہ کروں؟" کی دبدھا ہو تو یہ ایکسر سائز بہت ہی فائدہ دیتی ہے۔ مثلاً آپ کا ذہن اور سوچ ایک بات کرنے کو کہتی ہے اور آپ کے جذبات اس سے الٹ راستہ اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں تو پھر آنکھیں بند کر کے اور بغیر آواز نکالے اندر ہی اندر سوہانگ کی سرود اپنائی جاتی ہے۔"

"سانس لیتے وقت سو...... او...... او...... و...... و...... و کہتے جائیں اور سانس چھوڑتے وقت ہانگ کی آواز نکالیں۔ لمبی اور کشیدہ، آنکھیں بند کر کے پانچ سے دس منٹ تک یہ مشق کریں اور پھر دیکھیں آپ کیسا محسوس کرتے ہیں! وہ کام جو آپ ٹالتے آئے ہیں، اور وہ ارادہ جو آپ توڑتے آئے ہیں، خود بخود مجتمع ہو کر آپ کے ہاتھ پکڑے گا اور آپ کو عمل کے میدان میں لے جائے گا۔"

پھر انہوں نے میرے سوال کا انتظار کیے بغیر کہنا شروع کیا کہ اسی طرح ایک تفکیر تھو کی بھی ہے۔ ایک لمبی سانس بھریں اور جب سانس چھوڑیں اور ساتھ ہی تھووووو...... وووو کہتے چلے جائیں۔ اس میں تھ کی آواز تیز اور کرخت ہوتی ہے۔ اکثر آپ کے اوپر کے ہونٹ کو تھرتھراتی ہے اور جب اس کے ساتھ اُو...... و...... و...... وکی آواز نکلتی ہے تو بھی ہونٹ کانپتا اور تھرتھراتا ہے...... اس کے کرنے کا یہ طریق ہے کہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں۔ بدن ڈھیلا چھوڑ دیں۔ دو مرتبہ لمبا سانس لیں اور چھوڑیں۔ اس کے بعد تیسرے سانس میں تھووو...... وو...... وو...... کا عمل شروع کریں۔ اس عمل کے دوران سوچیں کہ آپ کے بیمار جسم پر یا آپ کی بیماری پر یہ آہنگ ایک آری کی طرح چل رہا ہے اور بیماری کو کاٹ رہا ہے۔"

"یہ میڈی ٹیشن کسی جسمانی روگ یا ذہنی اور بدنی بیماری کو دور کرنے کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ مراقبے کو بھی تین سیٹ سے زیادہ نہیں کرنا، یعنی دو مرتبہ خالی سانس اور ایک مرتبہ تھو کا سرود ایک سیٹ ہوا...... لیکن یاد رہے کہ کوئی بھی مراقبہ، کوئی تفکیر یا کوئی میڈی ٹیشن موٹر چلاتے ہوئے یا کسی مشین کو ہینڈل کرتے ہوئے نہیں کرنی۔ اس کے لیے پرسکون ماحول اور شور و شغب سے دور کا علاقہ چاہیے جہاں یکسوئی ہو اور سارا وجود مراقبے کے لیے وقف ہو۔"

"لیکن ایک بات" انہوں نے انگلی اٹھا کر کہا "جس کی طرف لوگ کم دھیان دیتے ہیں یا جس کا مراقبین کو علم نہیں ہوتا یہ ہے کہ مراقبے کے بعد اپنے آپ کو ارتھ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ روح کے اوپر اٹھ جانے کے بعد اس کو زمین سے پیوست کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ جس طرح بجلی کے طاقتور تاروں کو ارتھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح سے مراقبی وجود کو واپس لانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے ای کی آواز کو اونچے سروں میں ادا کر کے روح کی واپسی کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ای...... ی...... ی...... ی کو مدھم سروں سے شروع کر کے پنچم پر لے جا کر پھر اسی سانس میں واپس مدھم میں آ جانا ہوتا ہے۔ دراصل اس ختم مراقبہ میں آواز کو جھولا جھلانا ہوتا ہے۔ مدھم ای سے پاؤں زمین پر جما کر یہ تصور باندھنا پڑتا ہے کہ یہ آواز میرے اندر سے گزر کر زمین میں سرایت کر رہی ہے۔ پھر جب اسی آواز کو پنچم میں لے جانا ہوتا ہے تو آواز کے اس ہنڈولے کے ساتھ روح کو اوپر اٹھاتے جانا ہوتا ہے اور جب آواز کو پنچم سے اتار کر نیچے لانا پڑتا ہے تو اترتے اترتے پاؤں میں سے ہو کر پورے طور پر ارتھ ہو جانا ہوتا ہے۔ ہر میڈی ٹیشن کی بیٹھک کے بعد تین چار مرتبہ ای...... ی...... ی...... کا ہنڈولا جھلا کر واپس نارمل صورت میں آنا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے روح میں تلاطم اور بدن میں ارتعاش باقی نہیں رہتا۔"

میں نے ان کی باتوں کو بڑے غور سے، بے حد دلجمعی سے اور گہری وابستگی سے سنا۔ مجھے ان کی ذرا ذرا سی تفصیل اب تک یاد ہے اور میں جب بھی کسی مراقبے کا ذکر کرتا ہوں تو مجھے استاد مکرم کا چہرہ اپنے پورے خدوخال کے ساتھ یاد آ جاتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ انہوں نے یہ چلے خود کھینچ کر دیکھے اور خود ان کے عمل میں سے گزرے یا کسی مراقبی کو دیکھ کر یہ نتائج اخذ کیے۔

پروفیسر صاحب نے کہا "ہر علم کو اختیار کرنے کے لیے عمل میں سے گزرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کچھ علوم اور کوئی خبر آزمائے بغیر بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ ایسا علم اور ایسی خبر ذہن اور دماغ سے ماورا ہوتی ہے اور ذات کے کسی حصے پر لینڈ کر کے اپنا سفر ختم کر چکی ہوتی ہے۔ ایسا علم بھی علم الیقین ہی ہوتا ہے!"

اس روز میں بڑی دیر تک ان کی خدمت میں بیٹھا رہا لیکن اس گفتگو کے بعد انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی اور ہم دیر تک فٹبال کے میچوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ میلان ٹیم اطالیہ کی ساری فٹبال ٹیموں میں نمبر ون ہے لیکن میں ان کے اس خیال سے متفق نہ تھا۔ میری دانست میں ریجو کالابریا کی ٹیم زیادہ تند خو تھی اور اس میں ہر قسم کے دباؤ کو برداشت کرنے کا مادہ سب سے زیادہ تھا۔

---

(10)

پاکستان سے منٹو کا خط آیا تھا ''بس کرو خواجہ۔ اب آ بھی جاؤ۔ تم سے کچھ ہوگا نہیں۔ ولایت میں رہنا آز
لوگوں کا کام ہے......اشر تمہیں بہت یاد کرتا ہے، چٹھی کو تار سمجھنا......تمہارا سعادت......''

اس وقت بھی لوگ منٹو سے متاثر تھے۔ جو لوگ اسے پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو ناپسند کرتے تھے، وہ بھی اب
حاشیے لکھ کر اس نے بڑی شہرت اور نیک نامی حاصل کی تھی۔ قارئین اس کی سچائی اور کھرے پن کے دیوانے تھے۔ میں
ایک مرعوب بچے کی طرح منہ میں انگلی ڈال کر اس کی محفل میں بیٹھتا تھا اور اس کی شہرت سے بہت متاثر تھا۔

یہ ترقی پسند تحریک کا زمانہ تھا اور یہ تحریک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حاکمیت کی طرح سارے برصغیر کو اپنی لپیٹ می
لیے چلی جارہی تھی۔ جو لوگ اس تحریک سے وابستہ تھے، وہ تو خیر تھے ہی جو اس سے ذرا فاصلے پر تھے وہ بھی اس کے جا
اور اس کی ہمہ گیر قوت سے سہمے ہوئے تھے۔ ان کو پتہ تو نہیں چلتا تھا لیکن ان کی تحریروں کی خوبو میں تبدیلی سی آ گئی تھی۔ ا
تحریک کا مقصد ہندوستانی لوگوں کے ذہن میں فکری تبدیلی لا کر نظام کہنہ کو بدلنا اور ان کو فرسودہ روایتی سوچ سے نکال ک
ایک نئی اور ترقی یافتہ زندگی سے روشناس کرانا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے ادیبوں، شاعروں فنکار اور مصوروں کا ایک مشترک
پروگرام تھا کہ اپنے ہم وطنوں کو جبر و جہالت کی فرسودہ روایات سے نکال کر ایک خوش آئند، روشن اور سنہرے مستقبل س
روشناس کرایا جائے اور ان کو صدیوں کے روایتی اور رواجی اندھیروں سے چھٹکارا دلا کر آکسیجن سے لبریز چمنستانوں م
آباد کیا جائے۔

اس سے پہلے بھی انگریزوں نے ہندوستان کو سماجی جاگرتی کی ایک نئی تحریک سے روشناس کرایا تھا اور ا
تحریک کو ''دیہات سدھار انجمن'' کا نام دیا تھا۔ اس انجمن کے ساتھ لوگوں کی مالی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لی
''امداد باہمی کی انجمن'' کا اضافہ کر دیا تھا اور دیہات سدھار کے فلسفے کو ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیا تھا ک
اپنے مکانوں کی چھتیں اونچی رکھیں۔ فرش سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر روشندان بنائیں۔ مویشیوں کو انسانوں کے رہائ
کمروں میں نہ باندھیں۔ کنوؤں میں لال دوائی ڈالیں۔ بچوں کو تعلیم دلوائیں۔ اپنی بچت انجمن امداد باہمی کے بینکوں م

جمع کرائیں اور پرانے رسم و رواج ترک کر کے نئے اور ترقی یافتہ رسم و رواج اختیار کریں۔

میں بھی اپنے سکول کے زمانے میں دیہات سدھار اور امدادی باہمی کی انجمن کے گانے اپنے گاؤں کی گلیوں میں گھوم کر گایا کرتا تھا اور میری ٹولی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ جب میری پارٹی میرے پیچھے پیچھے ننگے پیر ھے راستوں پر یہ ترانہ گاتی ہوئی نکلتی کہ

واہ واہ سکول نوں جا بچیا، لے پیسہ
گھر آندے نوں کڑھا بناد یاں کیسا
سکول نوں جا بچیا، لے پیسہ
باہر وا گیاں نوں لسی ناں ملدی
سکولیاں نوں دوھ ملدا کیسا
سکول نوں جا بچیا، لے پیسہ

ہمارے اس گانے کی آواز پر گلی محلوں کے بچے اپنے اپنے گھروں کے دروازے پر آ کھڑے ہوتے اور ہمیں حسرت اور چاہت سے دیکھتے۔ انہی میں سے ایک آدھ بچہ ضد کر کے اگلے دن ہمارے سکول آ کر کچی جماعت میں نام لکھوا لیتا۔ جس طرح کھیدا کرنے والے تربیت یافتہ ہاتھی کو ساتھ لے کر جنگلی ہاتھی پکڑ لاتے ہیں، اسی طرح ہم کرتے تھے۔ گاؤں کے کئی ہنستے کھیلتے بچوں کو ہم نے ورغلا کر سکول میں داخل کروا دیا اور ''لے پیسہ'' کا وعدہ بھی پورا نہ کیا۔

اسی طرح ہمارے بڑے بزرگ جب کھیتوں سے واپس آ کر اور تازہ چلمیں بھر کر دائرے میں بیٹھ جاتے ہم ان کے سامنے کھڑے ہو کر اونچی آواز میں تان اڑاتے۔

لے بئی پنڈ نوں جان والیا
سن لے عقل دیاں گلاں
منشی کہندا بابو کہندا
تے پنڈ نوں جان والیا
اچے روشندان بناویں
بچیاں نوں توں پڑھنے پاویں
منشی کہندا بابو کہندا
بئی پنڈ جان والیا
سن لے عقل دیاں گلاں
منشی کہندا بابو کہندا!!
تے پنڈ نوں جان والیا!!

''انجمن امداد باہمی'' اور ''دیہات سدھار'' کے بعد جو تیسری سبھا ہمیں عقل کی باتیں سکھانے کے لیے مقرر کی گئی وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین تھی۔ اس نے ہمارے پرانے اور فرسودہ خیالات کی بیخ کنی کے لیے بڑی ہمت اور شجاعت کے ساتھ آگے بڑھ کر کام کیا اور بزم ادب سے پرانا چراغ اٹھا کر نئی شمع لانے کا بندوبست کیا۔ علم و ادب کے ایوان نئی روشنی سے جگمگانے لگے۔ ہر کونا کھدرا روشن ہو گیا اور لوگوں کو اپنے مصائب و آلام بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آنے لگے۔

غریبی، مفلسی، بڑھاپا، بیماری، کسمپرسی اور ظلم و زیادتی کے بارے میں یوں تو مہاتما بدھ کے زمانے سے لے کر اب تک لکھا، بولا، رویا اور گُرلایا جا رہا تھا لیکن ترقی پسند مصنّفین نے غریبی، مفلسی اور بیروزگاری کے موضوع کو بڑے حسن اور سلیقے کے ساتھ اپنایا اور بڑی محنت اور لگن کے ساتھ اس پر نظم نثر کے سر پارے رقم کیے۔ تحقیقی، تنقیدی اور تحلیلی و تجزیاتی مضامین میں اقتصادیات، معاشریات، سیاسیات اور مذہبیات پر بڑے کھلے دل سے تنقید کی اور صدیوں کی غلامی سے اہل ہند کے اندر جو گھٹن اور جمود پیدا ہو گیا تھا، اس کا تجزیہ کیا اور خرابی کا ایک ایک جز و محدب شیشے کے نیچے رکھ کر دکھایا، سمجھایا اور پھر اس کا پوسٹ مارٹم کر کے بتایا کہ پانی کہاں مر رہا ہے۔

اس تحریک نے بڑے مشکل اور پیچیدہ موضوعات سہڑے تھے۔ ان پر فلسفیانہ انداز میں بات کی تھی اور نئی سائنسی تحقیق سے قاری کو روشن کرانے کی کوشش کی تھی۔ مارکس فلسفہ اور جدلیات کا تصور ہاتھ سے نکل نکل جاتا تھا۔ کچھ سمجھ میں آتا تھا اور باقی کا سب کچھ سپاٹ ہو کر رہ جاتا تھا۔ پڑھتے ہوئے جی گھبراتا تھا اور طبیعت اوبتی تھی، پر قاری کو ساتھ لے کر چلنا ضروری تھا اور اس کی راسیں سنبھال کر ساتھ رکھنا لازمی ہو گیا تھا۔ اس لیے انجمن ترقی پسند مصنّفین نے مشکل اور پیچیدہ مضامین کے ساتھ ٹوٹے چلانے کی اجازت بھی دے دی۔

ڈاکٹر رشید جہاں، احمد علی اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تحریروں میں کوک شاستری ست ڈالنا شروع کر دیا۔ یہ موضوعات خوب بکے، ذکر میں اترے، بین ہوئے، کھوجے گئے اور ہاتھوں ہاتھ دور دور تک پہنچے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے مصنفوں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ وہ انجمن کے رکن تھے یا نہیں تھے، اس کے نظریات سے ہم آہنگ تھے یا نہیں تھے، اس پر صاد کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے، سبھی اسی راستے پر چل نکلے۔

ان لوگوں نے اپنے قاریوں اور ہم وطنوں کو یقین دلایا تھا کہ مذہب ایک فرسودہ شے ہے۔ خوف کی پیداوار ہے۔ لایعنی اور بے معنی ہے۔ انسانوں کے لیے افیون کا درجہ رکھتا ہے۔ ترقی کی راہ کا روڑا ہے اور اس کے رسم و رواج انسان کو رجعت پسندی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا ہر منشی اور ہر بابو اونچی آوازیں تانیں اڑا رہا تھا کہ

اچھے روشن دان بناویں
منڈیاں نوں توڑ ھنے پانویں
پچھے نوں ناں جھاتی پاویں
میریاں گلاں سن دا جانویں
وے پنڈ نوں جان والیا

اس دیہات سدھار تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب نے جو پریم چندوں مہاشے سدرشنوں، ڈپٹی نذیر احمدوں اور مواعظ حسنہ کے بارے قلم کاروں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا اور چیونٹی کی چال چل رہا تھا۔ ایک دم چھلانگ مار کر ولایتی اور روسی ادب کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور اس کے اندر ایسے اونچے روشن دان لگ گئے کہ اندر سے سب کچھ نظر آنے لگا۔ ادب کے وجود میں نئی ہوائیں داخل ہو گئیں اور نئے پانی مرنے لگے۔

سچ کی اور حق کی ایک نئی ڈیفی نیشن طے پائی کہ کھل کے بات کرنا، وجود کے گند اور غلاظت سے پردہ اٹھانا، جبتوں کا احترام کرنا، انسانی کمزوریوں کے اظہار اور اقرار کی ستر پوشی نہ کرنا اور پرانے والانوں میں انسانی نفسیات کی نئی کھڑکیاں کھولتے جانا ہی سچ ہے اور یہی حق ہے اور یہی راستی اور ست ہے!

ہمارے گرو اور استاد سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، عصمت چغتائی، محمد حسن عسکری وغیرہم گو باقاعدہ طور پر ترقی پسند انجمن سے وابستہ نہ تھے لیکن انجمن کی کھلی چھٹی اور عام معافی کے تحت انسانی کمینگیوں، بدفطرتیوں، غلاظتوں اور ستر پوشیوں کا پوسٹ مارٹم کر کے ان کی خرابیوں کے دفتر تیار کرتے تھے اور ہم چھوٹے قد کے نئے لکھنے والے ان کی تحریروں سے لذت بھی حاصل کرتے تھے اور ان کی آزادروی، آزاد خیالی، بے باکی اور بے خوفی سے بڑے متاثر تھے۔

میں منٹو کی کھلی کھلی باتوں، کھلی کھلی تحریروں اور کھلے کھلے ململ کے کرتے میں اس کالے کشمیری حسن کا عاشق تھا۔ تقریباً ہر روز اس سے ملاقات رہتی۔ ہر روز اس کی بچی کڑوی صداقت مآب اور آزاد مشرب باتیں سننا پڑتیں اور ہر روز اسے جھڑکی دے کر ٹوکنا پڑتا کہ میں اس کی بات توجہ سے نہیں سن رہا اور اندر ہی اندر استہزا کر رہا ہوں۔

میں بھی اس کی محفل میں ایک حقیر اور فرومایہ سا حاشیہ بردار تھا۔ میں تھا تو ڈبیل لیکن ٹھونگ مارنے سے نہیں رہتا تھا۔ جب کبھی وہ اپنی رندی اور آزادروی کے قصے اونچے سروں میں بیان کر کے حاضرین محفل سے داد لیتا تو میں سینے پر ہاتھ باندھ کر، جمعرات کی روٹیاں مانگنے والے مسیتے کی طرح ایک ہی سانس میں آواز لگاتا کہ:

ایک فقیر رند مشرب مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''مولوی بابا ہمیں شراب پلوا۔''

شاہ صاحب نے ایک روپیہ اس کی نذر کیا اور فرمایا کہ جو چاہو سو کھاؤ پیو تم کو اختیار ہے۔

وہ بولا ''ہم نے تو آپ کا بڑا نام سنا تھا لیکن آپ تو قید میں ہیں۔''

شاہ صاحب نے فرمایا ''صاحب من! کیا آپ قید میں نہیں ہیں؟''

کہا ''نہیں۔ ہم تو رند مشرب لوگ ہیں کدھر کی قید اور کدھر کی پابندی۔

ہم آزاد ہیں اور آزادی کے پرستار ہیں۔ ہمارے یہاں جکڑ بندیاں نہیں۔''

شاہ صاحب نے فرمایا کہ ''اگر کسی روش کے قیدی نہیں ہو تو آج غسل کرو جبہ پہنو، عمامہ باندھ کر مسجد میں چلو اور نماز پڑھو...... ورنہ جس طرح تم رندی کی قید میں ہو اسی طرح ہم شریعت غرا کی قید میں پابند ہیں۔ اصل میں تمہاری آزادی ایک خیال خام ہے۔''

یہ بات سن کر نہایت چپ ہوا اور شاہ صاحب کے قدم پکڑے کہ "دراصل ہمارا خیال غلط تھا جو آزادی کا دم بھرتے تھے!"

یہ قصہ میں نے منٹو کی محفل میں کوئی پانچ چھ مرتبہ سنایا اور ہر مرتبہ گالیاں کھائیں۔ ویسے وہ بڑا دلدار آدمی تھا۔ یاروں کا یار اور بے سہاروں کا سہارا تھا۔ اس کی محفل سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ گو اس کی آزادروی اور راست گوئی سے اختلاف رہتا، مار کھانی پڑتی اور ذلیل ہونا پڑتا۔

حق گوئی اور بے باکی کی بھی بڑی قسمیں ہیں اور ہر شخص اپنی قسم کو سب سے بہتر برینڈ خیال کرتا ہے اور اس کے ابلاغ میں اپنی عمرِ عزیز صرف کر کے گمنامی کی وادی میں اتر جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک مکمل طور پر سچا شخص اکثر اوقات بڑا ہی ظالم ہوتا ہے۔

ریسرچ کا کام بھی راستی اور سچائی کی چھان پھٹک کے لیے کیا جاتا ہے۔ دانہ الگ اور بھوسہ الگ کر کے علیحدہ علیحدہ ڈھیر لگا دیے جاتے ہیں۔ لوگوں کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستے پر ڈالنے کا کام تحقیق کا ہے۔ تحقیق کے نتائج چھوٹے بڑے چراغوں کی صورت میں ہر راستے کو روشن اور ہر منزل کو منور کرتے چلے جاتے ہیں۔ انسان کے بھٹکنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔

جب میں اپنی کالج کی تعلیم کے چھٹے سال میں تھا اور اپنے افسانوں کا مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" چھپوا چکا تھا، اس وقت میرا ایک ہی معمول تھا کہ سورج ڈھلتے ہی اپنے پبلشر مکتبہ جدید کی دکان پر پہنچ کر بہانے بہانے سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ میری کتاب کتنی بکی ہے اور لوگوں کو کس قدر پسند آئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر شام اپنے سینئر ادیبوں سے ملنا اور ان کی باتوں کو سمیٹ کر گھر لا کر سینت کے رکھتے جانا۔

ایک شام ہم مکتبہ جدید پر کھڑے بڑی قد آور باتیں کر رہے تھے۔ خوش تھے کہ ساحر لدھیانوی اور عزیز احمد ہمارے ساتھ موقع پر موجود تھے۔ صفدر میر اپنے مخصوص کامریڈی لباس میں رک سیک پشت پر ڈالے بڑے انہماک سے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ چودھری رشید پارسلوں پر ستلی لپیٹ رہے تھے کہ بھرے بھرے بدن کا ایک گورا چٹا لڑکا سفید مکھن زین کی پتلون اور سفید ٹول کی قمیص پہنے سٹال پر آ کر سلام علیک کہہ کر نئے رسالے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی پتلون موٹے چمڑے کی براؤن پیٹی سے بندھی تھی اور اس کے ہاتھ میں سولا ہیٹ تھا۔

چودھری رشید نے ہم سب کا اس نوجوان سے تعارف کرایا جس کی حال ہی میں چھپنے والی کتاب نے اسے راتوں رات فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اس کتاب کا نام "شبلی کی داستان معاشقہ" تھا اور اس میں کسی عطیہ فیضی سے شبلی کی گہری وابستگی کے دستاویزی ثبوت پیش کیے گئے تھے۔ میں نے یہ کتاب سنی ضرور تھی لیکن پڑھی نہ تھی۔

نوجوان مصنف نے کمال مہربانی سے اپنی یہ کتاب آٹوگراف کر کے مجھے مرحمت کی اور کہا اسے پڑھ کر اپنی رائے ضرور دینا۔ عزیز احمد نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور اپنی عینک کے پیچھے اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں جھپک کر کہا "تعجب! آپ نے یہ کتاب ابھی تک پڑھی ہی نہیں۔" میں نے بڑی ندامت سے سر جھکا کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر مجھ

سے بات بن نہ سکی، گھگھیا کر رہ گیا۔

رات کی تنہائی میں اپنے کمرے کے اندر بالکل اکیلا، جیسے جیسے میں یہ کتاب پڑھتا جاتا تھا، میرے رونگٹے کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ شبلی نعمانی کی ہمارے گھر میں بڑی عزت تھی۔ ہماری بڑی آپا ہم سب کو سیرۃ النبی سبقاً سبقاً پڑھاتی تھیں اور مشکل مقامات پر رک کر ہمیں تاریخی تفصیلات بہم کرتی جاتی تھیں۔ جو کمال شبلی کی تحریر کا طرۂ امتیاز تھا، کچھ ایسا ہی کمال ہماری آپا کی تقریر کے سحر میں تھا۔ ہم سب بے پروا، اچاٹ مزاج، کھلنڈرے اور ٹال مٹول ہونے کے باوجود سیرت کے اس سیشن کے بڑے رسیا تھے اور آپا کو کبھی چھٹی کرنے نہیں دیتے تھے۔

جب میں نے یہ کتاب ختم کی تو صبح کے چار بج رہے تھے اور فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ شبلی جس کی ہم لوگ پوجا کرتے تھے، ایک اور ہی روپ میں میرے سامنے تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملا رہے تھے۔ میں اپنی جگہ شرمندہ تھا اور شبلی اپنے مقام پر کچے پڑ رہے تھے۔ ہمارے درمیان پہلے تو دوری پیدا ہوئی۔ پھر اجنبیت نے جنم لیا اور سورج طلوع ہونے تک میں اپنے محبوب مصنف سے کنارہ کش ہو کر اس کے خلاف ہو گیا۔ میرے دل میں اس کے خلاف نفرت کی ایک ایسی لہر پیدا ہوئی جو بلند سے بلند تر ہوتی گئی اور جس نے مجھے مایوسیوں اور گرداب میں تیزی سے بلونا شروع کر دیا۔

میں زندگی میں پہلی مرتبہ ریسرچ کی افادیت سے روشناس ہوا اور میں پہلی مرتبہ سچ کی چھان پھٹک کے گہرے علم کی گہرائیوں میں اترا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میرے دل نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جب ایک شخص ایسا کمزور، اس قدر بودا، ایسا دوررخا اور کاذب ہے تو پھر اس کی تصنیف پر کس طرح سے اعتبار کیا جا سکتا ہے اور اس کی تحریر کے واقعاتی سچ کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اس معاملے میں آپا کے ساتھ بڑی بحثیں ہوئیں اور گفتگو کے دوران پہلی مرتبہ میں اپنی بہت ہی پیاری اور ہم سب کی محبوب بہن کے ساتھ گستاخی کے ساتھ پیش آیا۔ کچھ باتیں میرے منہ سے ایسی بھی نکل گئیں جو مصنف کی ذات، اس کی کتاب اور کتاب کے نفسِ مضمون سے بھی تعلق رکھتی تھیں۔ آپا میری باتیں سن کر پتھرا سی گئیں اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے لیکن میں ریسرچ سے اور ریسرچ کی سچائی سے ایسا متاثر ہو چکا تھا کہ اب مجھے ان آنسوؤں کی کوئی پروا نہ رہی تھی اور میں ایک بہادر اور سچا انسان بن چکا تھا۔

کچھ لوگ سچ کو دبا کر، چھپا کر اور کپڑوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں کہ باہر نکلا تو سچ کو ٹھنڈ لگ جائے گی اور اس کو فلو ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ڈھکا رہے اور لوگوں کی نگاہوں سے چھپا رہے۔ ایسے لوگ معاشرے کو اور انسانیت کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں اور ترقی کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔

اپنی آپا کی صحبت میں اور ان کی تعلیم کی وجہ سے بچپن ہی سے میں فارغ اوقات میں درود شریف پڑھا کرتا تھا۔ اب میں نے اس کا پڑھنا بھی ترک کر دیا!

سچ میرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا اور میں ایک روشن خیال اور عظیم انسان بنتا جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا

تھا کہ ہم سچ سننا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ ہم سچ بولتے نہیں، سچ بولنے کے لیے اور سچ کہنے کے لیے سب سے پہلے سچ سننے کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ اس کلیے کے تحت میں سچ سننے کا رسیا بن گیا اور مجھے اس کا چسکا پڑ گیا۔

اسی زمانے میں مجھے مجرا دیکھنے کا ایسا چسکا پڑا کہ جہاں بھی کسی شوخ وشنگ بائی کے مجرے کی خبر پاتا، اڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔ طوائفیں بھی بڑی سچی مخلوق ہوتی ہیں۔ ہر قسم کے بھید بھاؤ بتاتی جاتی ہیں، کچھ چھپا کر نہیں رکھتیں۔ اظہار میں سب کچھ کھول کھول کر نمایاں کرتی جاتی ہیں۔ انگ انگ کھلا ہوتا ہے، کچھ ڈھانپ کے نہیں رکھتیں۔ اسی حقیقت بیان کی وجہ سے لوگ انہیں پسند کرتے ہیں اور انہی حقیقتوں کے اظہار کی بدولت وہ ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر شہرت پاتی ہیں...... مجرے کے علاوہ جہاں کہیں شوخ وشنگ قسم کے سچ کا اظہار ہوتا، میں بھاگ کر وہاں پہنچ جاتا اور حسب توفیق ٹھرک جھاڑ کر واپس آ جاتا۔

ریسرچ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو سچ سے گزرے بغیر اور سچ کیے بغیر بنے بنائے سچ کی دولت مفت مل جاتی ہے۔ بنا بنایا اور ریڈی میڈ سچ بڑا ہی مفید، بے حد موزوں اور حد درجہ آرام دہ ہوتا ہے۔ یہ خواب آور گولی سے بھی بڑھ کر سکون دیتا ہے۔

تقریباً ایسا سکون ایک مرتبہ پہلے بھی ملا تھا جب میں دسویں کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے مکتسر میں جو انجمن اسلامیہ کا سالانہ جلسہ جامع مسجد میں ہوتا تھا، اس کے لیے دور دراز سے اعلیٰ درجے کے مولوی بلائے جاتے تھے۔ میرے اباجی اور چاچا ولی محمد اس انجمن کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ ہمارے قصبے کے لوگوں کی فرمائش پر ایسے مولوی بلانے پر مجبور تھے جو گلے کے سریلے کھانے کے چسکورے بات کے ہٹیلے اور دلیل کے کٹیلے ہوں۔ دوسرے مسلک کے لوگوں کے چھکے چھڑا دیں اور اپنے عقیدے پر آنچ نہ آنے دیں۔ منظوم لطیفے اور ظریفانہ کہانیاں آسانی سے سنا سکیں۔ روتوں کو ہنسا دیں اور ہنستوں کو رلا دیں اور اپنی ہاؤ ہو سے جلسے میں مجلس کا سا رنگ پیدا کر دیں...... اس سلسلے میں جلال آباد کے مولوی امیر دین سر فہرست تھے اور تینوں نشستوں میں ان کی تقریر سب سے بعد میں رکھی جاتی تھی۔ مولوی صاحب لوگوں کو ہنسا ہنسا کر جلسے کو کشت زعفران بن دیتے تھے اور جو لوگ مسجد میں پاؤں پھیلا کر دیر سے گہری نیند سوئے ہوتے، ان کو آن واحد میں اپنے پھکڑ پن سے جگا دیتے تھے۔

میرے بڑے بھائی نے جو ان دنوں لاہور میں ایل ایل بی کر رہے تھے، اباجی سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں اور ان کے پاس ذرائع ہوں تو وہ ان آٹھ دس مولویوں کی کھیپ میں ایک ایسے نوجوان مولوی کو بھی بلائیں جو ایم اے پاس ہے۔ پتلون کوٹ پہنتے ہیں اور لاہور کی ایک مسجد میں امامت کرتے ہیں۔ اباجی نے چاچا ولی محمد سے ذکر کیا تو انہوں نے اپنے ذہن فتین اور گولڈ میڈلسٹ بھتیجے کی فرمائش کو صاد کیا اور لاہور سے مرزا عبدالحمید صاحب کو مکتسر آنے کی دعوت دے دی گئی۔

جب ہم لوگ مرزا عبدالحمید صاحب کو سٹیشن پر لینے گئے سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک چاق وچوبند پھرتیلا اور نوکیلا سا نوجوان شیروانی پہنے اور سر پر رومی ٹوپی رکھے برآمد ہوا۔ ہمارے علاقے کا جو ٹرینڈ گروہ مولویوں کو ریلوے سٹیشن

سے لینے جایا کرتا تھا۔ اس نے مرزا عبدالحمید کو دیکھ کر ایک بھی نعرہ نہ لگایا اور حیرانی سے بھائی جان کے اٹھتے ہوئے بازو کو دیکھنے لگے جو انہیں نعرے لگانے کے لیے اونچے اونچے بلا رہے تھے۔

مرزا عبدالحمید نے ایک ایک کر کے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور ہم انہیں ساتھ لے کر اپنے گھر آ گئے۔

یہ پہلا موقع تھا جب ہمارے گھر سے پرانی قسم کے روایتی مذہب کو رخصت کیا گیا اور اس کی جگہ ایک نئی وضع قطع کا اسلام آسانیاں، تن آسانیاں اور توبیانیاں لے کر خود بخود ہماری چار دیواری کے اندر آ گیا۔ ہم بھائیوں کے درمیان ہر لحظہ ایسی تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو گفتگو ہونے لگی کہ میری والدہ کو شک پڑنے لگا کہ ہم آریہ سماجی ہو گئے ہیں اور لالہ امرناتھ نے ہماری شدھی کر لی ہے۔

لالہ امرناتھ کی سوڈا واٹر بھرنے کی مشین تھی اور سارے شہر میں صرف اس کا پانی چلتا تھا۔ وہ سوڈا واٹر کے علاوہ جنجر، روز اور دودھ کی بوتلیں بھی بھرتا تھا۔ شام کو اس کے ''کارخانے'' پر مکتسر کے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوتے تھے اور مذہب پر سیر حاصل گفتگو کر کے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میرے چاروں بڑے بھائی ان مباحثوں میں شریک ہو کر مخالفین کے دانت کھٹے کر دیتے تھے لیکن میری ماں کو ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ بچے غلط جگہ پر جا کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔

اماں چونکہ پرانی وضع کی ایک پینڈو عورت تھیں اور صدیوں سے چلتے آئے پرانے دین پر سختی سے عمل پیرا تھیں، اس لیے وہ تحقیق وتفتیش کے رموز سے ناآشنا تھیں اور اسی لکیر پر فقیرانہ چلی آ رہی تھیں جو ان کے بڑوں نے اور ان کے پرکھوں نے ان کے لیے طے کر دی تھی۔ اماں طرز کہن کا برقعہ پہنے اباجی کی قیادت میں آنکھیں بند کر کے چلی آ رہی تھیں اور اباجی ڈاکٹر ہونے کے باوصف اپنے خانوادے کی ڈائریکشن کے مطابق انہی راستوں پر چل رہے تھے جو خط کھینچ کر ان کو سمجھا دیے گئے تھے۔

میرے چاروں بڑے بھائی جو اپنے اپنے فن میں یگانہ روزگار تھے، کچھ تو لالہ امرناتھ کے کارخانے پر بحث مباحثے کی وجہ سے اور کچھ آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی نو طرازیوں سے متاثر ہونے کی بنا پر مرزا عبدالحمید کی دو تقریروں کی مار بھی برداشت نہ کر سکے اور ان کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ یہ ان کی اصل تقریریں نہیں ہیں کہ مکتسر جیسا قصبہ ان کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا اور یہ لوگ میری تحقیق کے ایک فقرے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں چالوسی باتیں کر کے ان کا دل خوش کر رہا ہوں ورنہ اصل حقیقت تو کچھ اور ہے۔

اور جب ہم نے علیحدگی میں ان سے اصل حقیقت دریافت کی تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کی تحقیق بتاتی تھی کہ نمازیں پانچ نہیں بلکہ دو ہیں۔ بڑی عید پر قربانی کرنا ناجائز ہے۔ ایک سے زیادہ شادی حرام ہے اور جہاد کا مطلب مد مخالف سے لڑنا نہیں بلکہ اپنی کوتاہیوں اور بدخصالیوں کو دور کر کے اپنی روح کو پاک صاف کرنا ہے۔

مرزا عبدالحمید صاحب نے بتایا کہ اسلام اس وقت ہمارے سامنے اپنی اصل صورت میں نہیں ہے۔ مولویوں اور ملاؤں نے اس کی صورت مسخ کر کے اور اس میں کافرانہ مذاہب کے عناصر داخل کر کے اسے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ آج کا اسلام وہ اسلام نہیں جو اصل اسلام تھا اور جو اپنے وجود میں آنے کے چند سال بعد ہی دنیا کے گوشے

گوشے میں پھیل کر انسانیت کی فلاح و بہبود کا باعث بنا تھا۔ آج کا اسلام تو بے عملی، بے یقینی، شخصیت پرستی اور شاہ پسندی کی ایک بھونڈی سی تصویر ہے جس پر شرک والحاد کے حاشیے چڑھتے اور اترتے رہتے ہیں...... مرزا صاحب اپنی گفتگو کے ہر وقفے کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ''اسلام ایک ارفع اور اعلیٰ نظام حیات تھا جسے ظالموں، غاصبوں، احمقوں نے مل میں ملا کر اس کی ہیئت ہی تبدیل کر دی۔ اب کوئی موسیٰ ہی اس طلسم سامری کو توڑ سکتا ہے اور وہی ہماری کھوئی ہوئی میراث کو دشمنوں کے پنجے سے نکال کر واپس لا سکتا ہے۔''

میرے نیک دل، شریف، پاکباز اور دیانتدار بھائی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ وہ جو چوتھی جماعت سے لے کر ایل ایل بی کے آخری سال تک نماز باقاعدگی سے پڑھتے چلے آ رہے تھے اور اپنے مذہب کے سارے رچوئیل پابندی سے ادا کرتے تھے، تحقیق و جستجو کے پنجے سے پنجہ لڑا کر پانچ کے بجائے دو نمازیں پڑھنے لگے اور ریسرچ کی روشنی میں اسلام کی بہت سی فروعی باتوں کو ترک کر کے صحیح معنوں میں سچے مسلمان بن گئے۔ انہوں نے مرزا صاحب سے بہت سی راز کی باتیں سیکھیں اور ساتھ ہی بڑی مشکل اور طویل منت سماجت کے بعد مرزا صاحب سے ان کے پیر کا نام بھی معلوم کر لیا۔

ان کا نام پیرزادہ ابراہیم حنیف تھا اور وہ ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے گیٹ کے سامنے قومی کتب خانے کی اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ ان کے چوبارے کو جانے والی سیڑھیاں گھوم کر اوپر جاتی تھیں اور ان سیڑھیوں کے اوپر کا دروازہ اندر سے ہمیشہ بند رہتا تھا۔ پیرزادہ صاحب چھوٹے قد کے منحنی سے انسان تھے لیکن ان کی آواز بڑی پاٹ دار تھی۔ انہیں یقین کے ساتھ بات کرنے اور اپنے بیان پر قائم رہنے کا بڑا ملکہ تھا۔ بڑی سی کرسی میں چھوٹے سے ہو کر بیٹھنے کے باوجود وہ اپنے کتب خانے کی ہر شے پر حاوی تھے۔

ان کے کتب خانے میں اردو، فارسی، عربی کتابوں کے علاوہ انگریزی، عبرانی، ہندی، سنسکرت اور فرانسیسی زبان کی بھی بے شمار کتابیں تھیں۔ دیواروں پر خوبصورت جاپانی لڑکیوں کے رنگین کیلنڈر آویزاں تھے اور ان کے درمیان شیشے میں فریم کی ہوئی فارسی رباعیوں کے طغرے تھے جو کسی ایک ہی شاعر ابوسعید ابوالخیر کے کلام پر مشتمل تھے۔ کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں اور شیشوں پر کاغذ منڈھے تھے۔ اندر بلب جلا کر روشنی کی جاتی تھی اور پیرزادہ صاحب کے میز پر ٹیبل لیمپ کے پاس خوبصورت ہینڈل والا ایک محدب شیشہ بھی ہر وقت موجود رہتا تھا۔

یہ گول اوپر چڑھتی سیڑھیاں ایک مرتبہ اور بل کھا کر مزید اوپر چڑھتی تھیں جہاں پیرزادہ صاحب کی والدہ اور ان کے مرحوم بیٹے کا اکلوتا لڑکا رہتے تھے۔ ابراہیم حنیف صاحب نے شادی نہیں کی تھی اور وہ علمی تحقیق کو اپنے حبالہ نکاح میں لانے کے بعد دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کے بھتیجے تھوڑے سے فاتر العقل تھے۔ اس لیے جسمانی طور پر بہت مضبوط اور کام کرنے کے دھنی تھے۔ گھر کا سارا بوجھ ان کے کندھوں پر تھا۔ دو من کی آٹے کی بوری بغل میں دبا کر بل کھاتی تنگ سیڑھیوں پر گلہری کی طرح گزر جاتے تھے۔ نچلے دروازے پر کسی کی آہٹ پا کر یا دستک سن کر سب سے پہلے میاں کی گونجدار ''کون ہے؟'' گول سیڑھی کے زخرے میں گونجتی اور سب کو پتہ چل جاتا کہ چوکھٹ پر کوئی ہے اور شرف باریابی چاہتا ہے۔

پیرزادہ ابراہیم حنیف صاحب کے ملاقاتیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ گنپت روڈ کے رام لال سوری ان کے پبلشر تھے۔ ان کا کارندہ من موہن چپڑاسی دن میں دو تین مرتبہ پیرزادہ صاحب کے گھر کا چکر لگایا کرتا۔ کبھی پروف دینے کبھی پروف واپس لینے۔ کبھی کاغذ کا نمونہ دکھانے کبھی سطر کا سائز جانچوانے۔ وہ ایک ایک بات خود جانچتے تھے۔ پھر اس سے پیدا ہونے والی متوقع صورتحال آنکتے تھے۔ اس کو دو سے ضرب دے کر خدشات میں اضافہ کر لیتے تھے۔ پھر ان خدشات کو فکر کی خراد پر چڑھا کر عقل کے ٹول سے ان کے چھوڑے اتارتے تھے اور مضبوط پایہ تخت کو ایک کمزوری ٹانگ میں تبدیل کر کے سارا بوجھ اس پر ڈال دیتے تھے۔ بڑے زبردست موحد تھے لیکن اللہ کو پورے کا پورا نہیں مانتے تھے۔ خدا سے بے پناہ الفت تھی، اس لیے اس کو ہر وقت دانش کی باتیں بتاتے رہتے تھے۔ اس کا بڑا خیال رکھتے اور اس کی بھولی باتیں اپنی پسند کے ملاقاتیوں سے بیان کیا کرتے۔

میں نے جب چھ ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد ان کے پراسرار ٹھکانے کا پتہ چلایا اور ان کی دہلیز پر آواز دینے میں کامیاب ہو گیا تو میرے ایف اے کے فائنل امتحان میں چار ماہ باقی رہ گئے تھے۔ جنگ عظیم اپنے پورے زوروں پر تھی۔ گورا پلٹنوں کے فوجی لاہور کی مال روڈ کے علاوہ دوسری سڑکوں پر بھی نظر آ جاتے تھے لیکن کم کم! اس وقت گورا فوج کے لیے کچھ ایسے ولایتی رسالے بھی آتے تھے جن کے اندر تصویروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہم مر مر جاتے تھے۔ ایک رسالہ Men only دوسرا Lilliput تیسرا Heal of Vitality ایسے رسالے تھے جن کے اندر غضب کے نسوانی جسم آویزاں ہوتے۔ ان تصویروں کو اس زمانے میں Pin up girls کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ راما کرشنا کتابوں کی دکانوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کھوکھے میں دتو دکباڑیے کی دکان تھی جو صرف اپنی کتابیں بیچتا تھا۔ اس کے پاس ایسے رسالے کافی تعداد میں موجود تھے۔ وہ ایک رسالہ ایک مرتبہ دیکھنے کے آٹھ آنے لیتا تھا۔ شام تک بیس پچیس روپے بنا لیتا اور رسالے اس کے پاس محفوظ کے محفوظ رہ جاتے۔

جب میں پیرزادہ ابراہیم حنیف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو فقہ اللغت پر ان کے خیال افروز لیکچر سن کر بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے ایک ابتدائی کتاب بھی اس موضوع پر شائع کر رکھی ہے اور بڑی ضخامت اور بڑی تقطیع کی ایک اور کتاب کا بھی ڈول ڈال رکھا تھا۔ وہ زبان میں اعراب، نشان گزاری، اعلام اور تلفظ پر بہت زور دیتے تھے۔ ہر شعر کو فن نرت کے مطابق پڑھنے اور اس کے مطالب صرف بھاؤ بتانے سے واضح کرنے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔ مجھ پر اعتبار کرنے اور میری ذات میں دلچسپی لینے کے بعد انہوں نے ایک کتاب آگے بڑھا کر فرمایا ''یہ شعر پڑھو۔''

میں نے قدرے اونچی آواز میں وضاحت کے ساتھ تعمیل ارشاد کرتے ہوئے کہا:

کعبۂ دل میں کیا آن کے اس بت نے مقام
دل گنہگار، گنہگار، گنہگار نہیں......!

کہنے لگے مطلب بیان کرو، میں نے عرض کیا ''میری حد درجہ کوشش، گریز اور گریخت کے باوجود اس محبوب ستم پیشہ اور نگار عربدہ جو نے زبردستی میرے دل پر قبضہ کر لیا اور وہاں آ کر براجمان ہو گیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا

دل ہرگز ہرگز گنہگار نہیں ہے......"

جب میں ان کی خدمت میں یہ مطلب بیان کر چکا تو آپ نے کہا "اب اس شعر پر فن نرت لاگو کرو اور اس کا بھید بھاؤ بتاؤ۔ اس کی نقطہ گزاری کرو...... میں الو کی طرح آنکھیں کھولے، کان پھیلائے اور سر ہلائے بغیر احمقوں کی طرح بیٹھا تھا۔ میں کوئی بھویوں کا لونڈا تھا جو نرت پھرت کی رمز جانتا یا میں نے کوئی شدہ مجرے دیکھے تھے جو بدن تھرکا کر شعر کی تقطیع کر لیتا! پیرزادہ صاحب میری طرف اور میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر انہوں نے مسکرا کر ایک ہاتھ اوپر اٹھایا، اس کی مٹھی گھمائی، سر کو ہلکا سا ہلایا اور کہا:

کعبۂ دل میں کیا آن کے اس بت نے مقام
دل گنہگار (واہ جی واہ، سبحان اللہ) دل گنہگار!
(اور گنہگار، گنہگار نہیں؟ (یہ جو مکار سا موقع پا کر دل کے اندر آ کر بیٹھ گیا ہے! یہ گنہگار نہیں
جس نے بتائے بغیر قبضہ کر لیا ہے!!)

شعر کی Punctuation تبدیل ہو جانے سے شعر کا مطلب ہی بدل گیا۔ بڑا لطف آیا۔ میں نے پیرزادہ صاحب کو فوجی سیلوٹ کیا تو انہوں نے سر ہلا کر کہا "غالب کی شاعری میں نرت کا فن اپنے عروج پر ہے۔ اردو کے اور کسی شاعر کو اس صنف لطیف پر ایسی دسترس حاصل نہیں جو غالب کو ہے۔ اس کا مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ شعر سامنے رکھیں۔ فن نرت کی خورد بین سے اس کا تجزیہ کریں اور الگ الگ حصوں کو سروں کی طرح دبا کر اور اٹھا کر دیکھیں، مطلب خود بخود واضح ہو جائے گا۔ مثلاً اس شعر کے دیوان کا پہلا ہی شعر ملاحظہ کرو کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

پہلے تو میں اس بات پر ہی ٹھٹھکا کہ یہ دیوان غالب کا اولیں شعر ہے۔ پھر اس کے معانی پر غور کیا تو وہی پرانے معنی ذہن میں آئے جو تشریح کرنے والوں نے بتائے اور سمجھائے تھے۔ عرض کیا "پیرزادہ صاحب کم از کم اس شعر پر تو آپ کی نرت کا فن نہیں چلے گا۔ بات واضح ہے اور شعر میں کوئی پیچیدگی نہیں۔"

انہوں نے میری بات سن کر بغیر آواز کے "ہونہہ" کہا اور بولے "ایک تو وہ مطلب ہے جو تم سپاٹ ادائی سے سمجھ گئے ہو۔ دوسرا مطلب فن نرت وارد ہونے کے بعد یہ نکلتا ہے کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا (اپنے سینے پر ہاتھ مار کر حضرت انسان کہتا ہے کہ) نہ تھا کچھ تو (میں) خدا تھا (اور اگر بدستور کچھ نہ ہوتا تو خدا ہی رہتا) کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا! (ارے میاں اس ہونے نے مجھے مار ڈالا) ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا...... پھر کہنے لگے اچھا مرزا غالب ہی کا دوسرا شعر لو...... میں نے بات کاٹ کر بڑے ادب سے کہا "حضور والا دوسرا شعر تو بعد میں لیں گے پہلے یہ فرمائیے کہ آپ سے کس مسخرے نے یہ بات کہی کہ یہ شعر دیوان غالب کا پہلا شعر ہے؟"

کہنے لگے "مسخروں سے نہ ہم بات کرتے ہیں، نہ انہیں منہ لگاتے ہیں۔ تم جیسے بدفہموں سے اس لیے کلام کر

لیتے ہیں کہ شاید روشنی کی کوئی کرن تمہارے نہاں خانہ میں اتر جائے اور تمہارا کچھ فائدہ ہو جائے۔ دو تین مرتبہ اور دیکھیں گے، پھر تم سے معذرت کر لیں گے۔ ہمارا تو بس یہی چلن ہے۔"

میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور آپ کوئی سا بھی دیوان غالب، کہیں کا بھی چھپا ہوا، کسی بھی زمانے کا مرتبہ اٹھا کر دیکھ لیں، اس کا سب سے پہلا شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

ہی ملے گا۔"

میری بات تیزی سے کاٹ کر بولے "وہ بھی تمہاری طرح کے جاہل اور گھامڑ لوگ تھے۔ نہ ان کے پاس علم تھا نہ عقل۔ جو شعر کسی نے اپنی مرضی سے اولین دیوان میں چھاپ دیا، سب نے دھڑا دھڑ اسی کے تتبع میں دیوان شائع کرنے شروع کر دیئے...... یہ بھیڑوں کی دنیا ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم بھی بھیڑوں میں بھیڑ مل کر رہا کرو۔ ہمارے جیسی باتیں کرو گے تو گلا کٹواؤ گے۔"

میں نے کہا "غالب کی زندگی میں جو دیوان چھپا تھا، اس میں بھی یہی غزل سب سے پہلی غزل ہے۔"

فرمانے لگے "ہمیں یقین ہے کہ اس کے عہد میں جو دیوان چھپا تھا اور جس طرح سے اس نے اپنا دیوان مرتب کر کے دیا تھا، وہ اسی مطلع سے شروع ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "تاریخی شواہد تو یہی بتلاتے ہیں حضور! اور غالب شناس اس کے خطوں کے حوالے سے اسی شعر کا تذکرہ کرتے ہیں کہ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا اور کاغذی......"

بات کاٹ کر بولے "اس دنیا میں ایسے کاتنے والے بہت ہیں کہ کچے دھاگے کے مُڈلے لے دوڑے اور ہر ایک کے سامنے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کرنے لگے...... میاں صاحبزادے اردو فارسی کے شعراء کی یہ رسم قدیم ہے کہ اپنے دیوان کی ابتداء حمد سے یا اپنے کسی حمدیہ شعر سے کرتے ہیں۔ دوسرا التزام یہ رکھتے ہیں کہ اپنی غزلوں کو انضباطی ترتیب سے شامل دیوان کرتے ہیں کہ تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ چنانچہ مرزا نوشہ کا ردیف "ا" اور یا کا تو کوئی شعر ان کے دیوان میں موجود نہیں۔ البتہ "تا" کی ردیف سے ان کی غزل شروع ہوتی ہے کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اب یہ ردیف انضباطی ترتیب سے شروع بھی "تا" سے ہوتی ہے اور اس کا یہی شعر حمیدہ بھی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے مرتب کردہ دیوان غالب کو اسی اعتبار سے شائع کیا ہے اور اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے اپنی بے ترتیب لائبریری کی ایک الماری کے اوپر والے خانے سے "درس غالب" کی ایک کتاب نکال کر مجھے عنایت کی۔ درسی کتاب سائز کا یہ دیوان صاحب ستھرے کاغذ میں لیتھو میں چھپا

تھااور اس کے ہر شعر کو اوقاف کی علامتوں اور اعراب کے ساتھ نشان گزاری کر کے شائع کیا گیا تھا اور شعر کے اندر کا ڈائیلاگ واوین میں دیا گیا تھا۔

میں نے گھر لا کر جب اس دیوان کا مطالعہ کیا تو بہت سے پیچیدہ اشعار کے الجھیلے مطالب خود بخود واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ پھر اس دیوان کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ غالب کی کوئی سی بھی غزل تلاش کرنے میں حد درجہ آسانی ہو گی۔

میں جو دھوبی کے منطے بیل کی طرح گلے میں پیتل کی گھنٹی لٹکائے۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا دھوبی گھاٹ سے گھر اور گھر سے دھوبی گھاٹ کا فاصلہ طے کر رہا تھا۔ میرے اندر اسپ تازی کا خروش پیدا ہو گیا۔ پیرزادہ صاحب کو ملنے سے پہلے میں تحقیق و تشخیص کے فن سے بالکل ناآشنا تھا اور ریسرچ کا مطلب اچھی طرح سے نہ سمجھتا تھا۔ ان کی معیت میں مجھ پر نئے نئے انکشافات ہونے لگے اور ان کی تواتر کی لعن طعن سے کہ میں طرز کہن پر اڑا ہوا ایک رواجی مسلمان ہوں، میرے اندر پچھتاوے کی ایک گھگھی بندھ گئی اور میں نے اپنے آپ کو ایک راست قدم مسلمان بنانے کا تہیہ کر لیا۔ راست قدم مسلمان بننے کے لیے پرانے رسوم و قیود توڑنے اور باپ دادا کے ریچوئیل کو ترک کرنے کی ضرورت تھی۔ میرا ارادہ تو پختہ تھا لیکن ابھی مجھ میں اتنی ہمت پیدا نہ ہوئی تھی کہ میں چلتی آئی اور ساتھ چمٹی ہوئی روایات کو یک قلم ترک کر دوں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے پیرزادہ صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ جتنی بھی حدیثیں ہیں وہ سب غلط ہیں اور ان کے راوی اور خالق یہودی ہیں۔ انہوں نے دین اسلام کو تباہ کرنے کے لیے حدیثیں اختراع کر کے ہمارے مذہب میں اس طریقے سے داخل کیں کہ مسلمان انہیں سچ سمجھنے لگے۔

میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''اس کا ثبوت؟''

فرمانے لگے ''میں اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کروں گا البتہ کچھ حدیثیں تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔ تم پڑھے لکھے، سمجھدار، صاحب قلم افسانہ نگار ہو۔ اگر تمہارا دل گواہی دے کہ یہ نبی کریمؐ کے ارشادات گرامی ہو سکتے ہیں یا ان کے افعال ہو سکتے ہیں تو پھر دوسروں کی طرح بھیڑوں میں بھیڑ ملی رہنا لیکن اگر تمہارا دل گواہی نہ دے تو گھر جا کر اس پر غور کرنا۔''

انہوں نے میرے سامنے جو حدیثیں رکھیں، وہ کسی مرزا حیرت دہلوی صاحب کا ترجمہ تھیں اور انہوں نے بڑی شفاف اردو میں ترجمے کا حق ادا کیا تھا۔ جوں جوں میں ان حدیثوں کو پڑھتا جاتا تھا، میرا گمان یقین میں تبدیل ہوتا جاتا تھا کہ حضورؐ نے کبھی بھی ایسے نہیں فرمایا ہو گا۔ کبھی بھی یوں نہیں کیا ہو گا۔ پیرزادہ صاحب نے پتہ نہیں کب کے اس کتاب میں فلیگ لگا رکھے تھے۔ میں ایک ایک کر کے آگے بڑھتا جاتا تھا اور آزردہ ہوتا جاتا تھا۔

پیرزادہ صاحب بڑے سالوں کی تگ و دو اور جستجو کے بعد اس مقام پر پہنچے تھے اور انہوں نے کتاب کے حاشیے پر تشریحی نوٹ بھی لکھے تھے جس کے مطالعے سے الجھنیں ساتھ ساتھ دور ہوتی جاتی تھیں۔ جب میں رواداری میں تیس پینتیس صفحے ایک ساتھ پڑھ گیا تو میری بس ہو گئی۔ میں مسلمانوں کی حالت زار پر منہ مار کر رویا نہیں باقی میں نے سب کچھ کیا۔ اندر ہی اندر اس مردہ قوم کو گالیاں دیں، لعن طعن کی۔ رجز تو بیخ کی اور اس کے کندھے کے ساتھ کندھا

ملا کر نہ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایسی قدامت پسندانہ، کہنہ پرست اور یبوست کی ماری ہوئی قوم سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں اور اس کے مستقبل پر کس طرح سے اعتبار کیا جا سکتا تھا...... دو دن اور دو راتیں بڑی کشمکش میں گزریں۔ کسی پل چین نہ پڑتا تھا۔ بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا اور جو ابھی باقی تھا، اس میں گہری دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ وجود کا کوئی حصہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

پیرزادہ صاحب سے اپنی پریشان نظری کا دارو لینے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو پتہ چلا نماز ہماری عبادت ہی نہیں۔ اس کا قرآن پاک میں کوئی ذکر نہیں۔ صلوٰۃ البتہ ہے لیکن وہ بھی پانچ وقتہ نہیں، دوسرے سارے مذاہب کی طرح دو وقتہ ہے۔ ایک صبح ایک شام! ''نماز ہماری عبادت ہی نہیں۔'' میں نے چیخ کر کہا تو پیرزادہ صاحب نے نفی میں سر ہلا کر فرمایا ''میری تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ ہمیں نماز ادا کرنے کا حکم ہی نہیں۔ یہ لفظ سنسکرت کا ہے اور اس کا روٹ ''نما'' ہے...... نما...... نمو...... نمستے...... نمستکم...... نمازم......''

ان کی یہ بات سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں نے توبہ کرتے ہوئے کان چھو کر کہا ''تو آج تک ہم جو یہ نماز پڑھتے آئے ہیں، تو یہ غلطی تھی؟''

فرمانے لگے ''صلوٰۃ غلط نہیں لیکن تم لوگوں نے اسے غلط نام دے کر ایک غلط راستے پر چلا دیا۔ خود بھی بھٹکے اور دوسروں کو بھی بہکایا۔ دو وقت کی عبادت تھی۔ سلاطین نے اسے پانچ وقت پر محمول فرما دیا۔ خدا کے حکم سے نکال کر اپنے حکم کے اندر داخل کر دیا۔''

پیرزادہ صاحب مسلمان بادشاہوں اور مولویوں کے سخت خلاف تھے۔ اسلام کی تباہی اور بربادی میں وہ ان دونوں کو نام دھرتے تھے۔ ''ان دونوں کی ملی بھگت سے غلط بنیادوں پر دین کے جو بلند و بالا مینار اٹھائے گئے، وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت نظر آتے ہیں لیکن اصل میں گمراہی اور تباہی کے نشان ہیں۔ اب بادشاہتیں تو باقی نہیں رہیں البتہ مولوی بدستور موجود ہیں اور دین کی جڑوں میں پانی دے رہے ہیں۔ اگر تو دین ان کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا تو انشاء اللہ دنیا بھر کے انسانوں کی رہنمائی کرے گا اور اگر انہیں دقیانوسی، کج بحث اور کٹھ ملاؤں کے تصرف میں رہا تو ایک روز صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے گا، خدانخواستہ!''

پیرزادہ صاحب کی اس تحقیق اور راست گوئی سے میں پریشان تو بہت ہوا اور اٹھتے بیٹھتے میرے منہ سے ''توبہ استغفار'' نکلنے لگا جو گنڈے دار نماز پڑھتا تھا۔ اس کو باقاعدہ کر کے پوری پانچ نمازیں ادا کرنے لگا لیکن ان کی اس گہری ریسرچ نے مجھے دور دور تک سوچنے کی نئی جہتیں عطا کیں اور میرے اندر آسودگی نے تکیہ دوہرا کر کے سر کے نیچے رکھا اور آسائش کی ٹانگیں دور دور تک پھیلا دیں۔ یہ ریسرچ بھی کیا غضب کی چیز ہے کہ اگر انسان ثابت قدمی کے ساتھ لگا رہے تو ایک نہ ایک روز اس کی مرضی کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔ وہی نتیجہ برآمد ہوتا ہو جاتا ہے جس کی آرزو لے کر پہلے روز چلا تھا!

پیرزادہ صاحب جو زبان کے سخت اور بیان کے کرخت تھے، مجھے اچھے لگنے لگے۔ پہلے انہوں نے تین نمازوں سے پکی چھٹی دلائی، پھر نماز پڑھنے کا صحیح انداز بھی سمجھایا۔

فرمانے لگے "اب جب کہ تم گروہ گوسفنداں سے الگ ہونے کی صلاحیت پیدا کر رہے ہو اور تم میں بوجھ اٹھانے کی اہلیت پیدا ہو چلی ہے تو حق کو تھامنے کے لیے اپنا اوک آگے پھیلاؤ اور اس تحقیق کو سنبھالنے کے لیے اندر حوصلہ پیدا کر کے سنو کہ یہ خالص میری کھوج ہے۔ اس سے پہلے نہ تو کوئی یہ راز سمجھا اور نہ ہی کسی نے اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی۔" انہوں نے ذرا سا رک کر میری طرف غور سے دیکھا اور میں ان کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر بالکل ساکت ہو گیا۔

فرمانے لگے "قرآن میں کہیں بھی نماز پڑھنے کا ذکر نہیں، صلوٰۃ قائم کرنے کا ذکر ہے۔ نماز پڑھی نہیں جاتی قائم کی جاتی ہے اور یہ صلوٰۃ ایک عہد ہے۔ ایک وعدہ ہے جو بندہ اپنے خدا کے ساتھ کرتا ہے۔ صبح سویرے اٹھو، بستر پر لیٹے لیٹے اپنے ربّ کے ساتھ وعدہ کرو کہ میں دن بھر تیری ہی عبادت کروں گا اور تجھی سے مدد مانگوں گا اور جب سارا دن گزر جائے، بھول چوک ہوتی رہے...... تو شام کو پھر خدا کے ساتھ صلوٰۃ قائم کرو کہ اب تیرے ساتھ پھر وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے عہد پر قائم رہوں گا۔ تیری ہی عبادت کروں گا اور تجھی سے مدد مانگوں گا۔ یہ جو رکعتیں اور قیام و قعدہ وغیرہ ہے، یہ سب مولوی کی اختراع ہے۔"

اس دن کے بعد سے میں نے نماز چھوڑ دی اور صلوٰۃ قائم کرنی شروع کر دی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دین میں بڑی سہولت ہے تو واقعی سہولت پیدا ہو گئی۔ یہ سہولت ایک ایسے عالم دین نے پیدا کر کے دی تھی جو دینوی علوم پر بھی گہری نظر رکھتا تھا اور جس نے کبھی سنی سنائی یا گھڑی گھڑائی بات نہ کی تھی بلکہ ہر معاملے کو تحقیق کے ترازو میں تولا تھا اور ریسرچ کی چھلنی میں چھانا تھا۔ پیرزادہ صاحب علم الکلام، علوم فقہ اللغت، علوم سماوی وارض، علم لدنی، منطق استخراجی کے سمندروں کے غواص تھے۔ ان کو الفاظ کی سیپی کے اندر ہر نوح کے گوہر معانی کا علم ہوتا تھا اور وہ کسی بھی سیپی سے اپنے علم کے زور پر نئے معانی پیدا کر کے دے سکتے تھے۔ شاعری خاص طور پر کلاسیکی عربی شاعری پر ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ جاہلہ کے شاعر جن سے عربی زبان کا بڑے سے بڑا محقق بھی نا آشنا تھا، پیرزادہ صاحب نہ صرف اس کے کلام سے آشنا تھے بلکہ اس کے ناقد اور شارح بھی تھے۔ میں نے ان سے بڑا عالم نہ آج تک دیکھا نہ سنا نہ کتابوں میں پڑھا۔ وہ اپنی مثال آپ تھے۔

جن دنوں میں باقاعدگی سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا (اور یہ بیالیس تنتالیس اور چوالیس کی بات ہے) ان دنوں وہ "فلسفہ حسن وعشق" پر دس جلدوں کے اندر ایک نیا تھیسس پیش کر رہے تھے جو "فلسفہ جمال" پر ایک عظیم کتاب کی صورت میں ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ وہ کہتے تھے، یہ میری آخری تصنیف ہے جس کے بعد میں نہیں ہوگا...... میں نے جب کبھی ان سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اس کے بعد آپ وفات پا جائیں گے تو وہ ہمیشہ جھڑک کر یہی کہا کرتے "احمق انسان اس میں مرنا جینا کدھر سے آ گیا۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس کے بعد میں نہیں ہوں گا۔"

دیوار کے ساتھ لگی الماریوں میں تو ان کی کتابیں ٹھسا ٹھس بھری تھیں لیکن فرش پر رکھے بارہ جستی ٹرنکوں میں ان کے مسودات تھے جن کو وہ بڑی احتیاط کے ساتھ تالا لگا کے رکھتے تھے اور کسی شخص کو ان کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ نہ ٹرنکوں کے پاس نہ ان کی چابیوں کے پاس۔ میں نے زندگی میں بس ایک مرتبہ ان کے حکم سے ایک ٹرنک کا تالا کھول کر

لیکن اس کا ڈھکنا اٹھانے کی اجازت نہ مل سکی۔ فرمایا کرتے تھے، ان ٹرنکوں میں "فلسفہ حسن وعشق" کا مواد محفوظ ہے جو اگر ادھر سے ادھر ہو گیا تو سارے تھیسس کا تانا بانا بکھر جائے گا اور پھر اس کی شیرازہ بندی نہ ہو سکے گی...... میں نے کبھی دیکھا تو نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان ٹرنکوں میں اجسام وابدان کی ایسی نایاب تصویریں تھیں جنہیں اس علاقے کے لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تاریخ جمالیات کے اس عظیم سکالر کی تقریباً ساری زندگی حسن کے مختلف زاویوں کا مواد اکٹھا کرنے میں صرف ہو گئی تھی اور ابھی وہ اور مواد جمع کر رہے تھے۔

میں جب کبھی اپنے آپ کو قریب سے دیکھتا ہوں تو خود کو بہت ہی فرسودہ، روایت پرست، ماضی گزیدہ اور پرکھ پوجا کا آدمی پاتا ہوں۔ میرے ساتھ کے دوست وقت کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اور انقلاب کی تند و تیز لہروں میں سوار ہو کر کہیں کے کہیں پہنچ گئے اور میں انہی پامال اور خوارزبوں روایتوں کے جال میں الجھ کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ میرا وجود ایسا روایت پرست ہے کہ ابھی تک اسی زمین پر چل پھر رہا ہے جو بڑی دیر ہوئی ایک پٹاخے کے ساتھ معرض وجود میں آئی تھی۔ میں ابھی تک اسی سورج سے گرمی اور روشنی حاصل کر رہا ہوں جس کا سن شریف ارب ہا بلکہ پدم ہا سالوں سے بھی زیادہ ہے۔ ابھی تک وہی گندم کھا رہا ہوں جس کا ایک دانہ بھولے سے میرے جدامجد نے کھا لیا تھا اور ان کو عرش سے اتار کر فرش پر پہنچا دیا گیا تھا۔ میں ابھی تک انہی سمندروں پر کشتی رانی کر رہا ہوں، انہی دریاؤں کا پانی پی رہا ہوں انہیں پہاڑوں کے اندر شکار کھیل رہا ہوں جو بگ بینگ کے ساتھ معرض وجود میں آئے تھے۔ پتہ نہیں میں اس قدر کاہل اور ایسا پھسنڈی کیوں ہوں۔ میرے سارے ساتھی ان آثار کہن کو چھوڑ کر کہیں کے کہیں پہنچ گئے اور میں ابھی تک اس جگہ پر دائم پڑا ہوا ہوں۔

لیکن اس ساری کاہلی، سستی اور گراں جانی کے باوجود میں نئی تحقیق سے اور ریسرچ سے متاثر ضرور ہوتا ہوں۔ ان کا حسن وجمال میری نگاہ فکر کو خیرہ بھی کرتا ہے۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا بھی ہوتا ہوں۔ بڑے سجاؤ اور سپردگی کے ساتھ اپنا آپ بھی اس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں لیکن تحقیق وتفتیش اور ریسرچ مجھے پورا کا پورا قبول نہیں کرتی۔ میرے کچھ پچھڑے اور رودے ماضی کے ساتھ بھی چپکے رہ جاتے ہیں اور میں پورا نعرہ مار کر جدید کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تحقیق وتدقیق کی عقیدت مندی کا دم نہیں بھرتا۔ اس کا احسان مند اور نشان گزار نہیں ہوتا۔ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں ریسرچ کا رسیا ضرور ہوں لیکن اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر ڈوئٹ گانے والوں کی طرح جھولنے نہیں لگتا...... ریسرچ سکالر البتہ مجھے ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ اس کی عظمت کا "لے سو" مجھے بار بار پکڑتا اور قدم قدم جھنجھوڑتا رہتا ہے، لیکن اپنی مرضی اپنی خواہش اور اپنے موج میلے سے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میرے اندر پیر پرستی کا مادہ زیادہ ہے اور میں ہر صاحب کرشمہ وکرامات کی ہر وقت چوکی بھرتا رہتا ہوں۔

ایک روز میں اور فکر تونسوی مکتبہ جدید کی کیوسک کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ وہاں بلونت سنگھ آ گیا۔ ان دنوں مکتبہ جدید کی طرف سے اس کی کتاب "جگا" چھپ رہی تھی اور اس کی افسانہ نگاری کا طوطی ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں بول رہا تھا۔ وہ نیلے رنگ کے خوبصورت سوٹ میں ملبوس سرخ رنگ کی ٹائی لگائے اور ہلکے نسواری

رنگ کی جماوٹ دار پگڑی باندھے نئے آنے والے رسالوں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس نے فکر سے، مکتبہ اردو، اردو بک سٹال کے بارے میں کچھ کاروباری سی باتیں کیں اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "تم اب تک دو افسانے سنا چکے ہو، چھپا ایک بھی نہیں، کیا ڈرتے ہو؟" میں نے کہا "ہرگز نہیں سردار جی۔ میرے دونوں افسانے "ادبی دنیا" اور "ساقی" میں چھپ چکے ہیں اور ایک ہمایوں کو بھجوا رکھا ہے۔ دیکھیں کب چھپتا ہے۔ اس نے ایک سینئر ادیب کی طرح میرے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی اور "شاباش شاباش" کہہ کر پھر رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

فکر تونسوی نے ایک جھٹکے دار "لو" کے ساتھ کہا "یہ بھی آ گیا بابا ٹل۔ پکی پکائی گھل" ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دیوندر ستیارتھی اپنا لمبا کوٹ کالی ڈاڑھی اور سیاہ زلفیں پہنے ہمارے قریب پہنچ کر رک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک گھسا پٹا بریف کیس تھا۔ پاؤں میں نرئی کی جوتی اور کندھے پر ایک چیکٹ سا مفلر جھول رہا تھا۔ بلونت سنگھ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور دعا سلام کیے بغیر پھر رسالوں کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔

دیوندر ستیارتھی بار بار فکر تونسوی سے اپنے نئے افسانے کا عنوان پوچھ رہا تھا اور فکر یہ کہہ کر جان چھڑا رہا تھا کہ کسی روز مکتبہ آ کر افسانہ سنانا نا پھر عنوان پوچھنا اور دیوندر یہ کہہ رہا تھا کہ تم یہ افسانہ دو مرتبہ سن چکے ہو اور جان بوجھ کر اس کا عنوان طے کرنے میں میری مدد نہیں کر رہے ہو۔ تم گھڑیال کی جون بھگتو گے اور اس کے بعد بھی تمہارا کلیان نہیں ہوگا۔ جو کوئی علم کا دھارا کسی سے روک کر رکھتا ہے، وہ سنسار کی جون بھگت کر کنڈ پالتے چوہے کی جون میں داخل ہوتا ہے۔ جنگلی خار پشت کی جون میں۔

فکر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف منہ کر کے کوئی نہایت ہی غیر ضروری اور غیر اہم بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اتنے میں چھوٹے قد کا ایک سانولا سا نوجوان بے حد قیمتی سوٹ پہنے اور اپنی ٹائی میں سونے کی پن لگائے ہاتھ میں خاکی کاغذ میں لپٹا ایک چھوٹا سا پیکٹ اٹھائے ہمارے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اس کلین شیو گول مٹول جھینپے جھینپے اور رکتے رکتے آدمی کو میں نے کہیں دیکھا تھا لیکن مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کا فوٹو کہیں چھپا تھا یا اس سے بالمشافہ کوئی بات ہوئی تھی یا کسی محفل میں اسے دور سے دیکھا تھا۔ دیکھا ضرور تھا لیکن اب میری یاد سے اس کی شبیہ پکڑی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے باری باری ہم سب سے کچھ کہے، کچھ بولے یا سلام کیے بغیر ہاتھ ملایا اور پلٹ کر سامنے کا رسالہ اٹھانے کو بڑھا تو چودھری بشیر نے اپنے کھاتے سے سر اٹھا کر اونچی آواز میں "اوہو" کہہ کر اپنا بازو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "آپ کب آئے شہاب صاحب...... کوئی اطلاع ہی نہیں دی۔" شہاب صاحب نے شرمیلی آواز میں منمناتے ہوئے کہا "اچانک آنا ہو گیا، ایک سرکاری میٹنگ تھی۔ تین دن دلی میں رہی۔ ایک روز کے لیے لاہور چلی آئی، اسی سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں۔"

مجھے قدرت اللہ شہاب کی شاعری نے بہت متاثر کیا تھا اور میں بڑی دیر سے اس سے ملنے کا آرزومند تھا۔ حال ہی میں اس نے افسانے بھی لکھنے شروع کر دیے تھے لیکن جو لطف اس کی شاعری میں تھا، وہ اس کے افسانوں میں نہیں ملا

تھا۔ اس نے انگریزی شاعروں کا شعر میں ترجمہ کیا تھا اور نظم کی ہیئت گزائی اور نفس مضمون کو ہمیشہ جوں کا توں رہنے دیا تھا۔ ایسی نظمیں یا تو میرا جی کا طرہ امتیاز تھا یا پھر شہاب نے ادھر توجہ کی تھی۔ میرا جی کے ہاں تو ولایتی نظموں کے ترجمے کی ایک طغیانی تھی اور شہاب کبھی کبھی لکھتا تھا مگر اس کا منظوم ترجمہ بھی دل کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔

میں نے کہا شہاب صاحب کالج کے زمانے میں ہم نے بڑی محبت اور چاہت کے ساتھ شیلے کا مطالعہ کیا ہے لیکن اس کا حسن بیاں اس وقت تک نہ کھل سکا جب تک ہم نے آپ کا ترجمہ نہیں دیکھا...... آپ کے بیان میں بڑا زور ہے۔

"کس کے بیان میں زور ہے؟" کسی نے پیچھے سے پکار کر پوچھا۔ ہم سب نے پلٹ کر دیکھا مخمور جالندھری اپنا توا سا چہرہ لیے مخصوص انداز میں مسکرا رہا تھا۔

دیوندر نے کہا "ہم شہاب کی شاعری کا ذکر کر رہے تھے کہ اس کے بیان میں بڑا زور ہے۔ اوپر سے جالندھر کا زور آور سنگھ آ گیا۔"

مخمور نے کہا "نہیں نہیں...... شہاب نظم کی نسبت کا ڈھنگ خوب جانتا ہے اور اصل پر حاوی ہو کر ترجمہ کرتا ہے۔" پھر اس نے شہاب سے ہاتھ ملایا اور کچھ ایسی باتیں کرنے لگے جیسے ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہوں۔

شہاب نے کہا "اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ہم یہاں قریب ہی کسی ہوٹل پر چل کر چائے پیتے ہیں۔"

ستیارتی نے کہا "چائے بھی پیتے ہیں اور ساتھ کچھ نقل بھی کرتے ہیں۔ نظام ہوٹل میں دونوں چیزوں کا بے حد اچھا انتظام ہے۔ آزمائش شرط ہے۔"

شہاب مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے، وہیں چلتے ہیں۔"

جب ہم نظام ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے اور شہاب کے چائے کے آرڈر پر ذرا اور کھل کر بے فکر بیٹھ گئے تو ستیارتی نے بیرے سے کہا "اور ساتھ بھی کچھ......"

ہم سب نے کہا "کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ وہ تو ساتھ ہی ہے...... وہ تو ہوتا ہی ہے۔"

اس روز میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ میں شہاب کی شاعری کے علاوہ اس کی آئی سی ایس شپ سے بھی متاثر ہوں...... بلکہ اس سے کسی حد تک زیادہ ہی متاثر ہوں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے میرے سینئر ادیب بھی اس کے کام سے بڑھ کر اس کے دام سے متاثر تھے۔ وہ اس وقت اردو کا واحد ادیب تھا جو آئی سی ایس تھا۔ آئی سی ایس ہونا بڑے جوکھوں کا کام تھا۔ ہر کوئی اس دریا کو پار نہ کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے نامی گرامی پیراک چھوٹی چھوٹی لہروں کے پیچھے اور کٹورہ بھر گرداب میں ڈوب جاتے تھے۔ دس ہزار امیدواروں میں سے کوئی ایک سرے چڑھتا تھا۔ لوگ اسے دیکھنے دور دور سے آتے۔ دیکھ تو کیا سکتے، اخبار میں چھپی ہوئی تصویروں پر ہی اکتفا کر کے خوش ہو جاتے۔ اس زمانے میں لوگ آئی سی ایس افسروں کے نام بھی جانتے تھے۔ ناموں کی مہارانی مختلف صوبوں کی مختلف زبانوں میں دہرائی جاتی تھی اور لوگ اپنے اپنے پسندیدہ آئی سی ایس کے بارے میں ایک دوسرے کو معلومات فراہم کرتے رہتے تھے۔ ولایت کے آئے ہوئے گورے آفیسر تو پھر بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں نظر آ جاتے تھے لیکن آئی سی ایس کے مقامی آفیسروں کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو وہ دفتر

کچہری جانے کے علاوہ باہر نہیں نکلتے تھے، دوسرے اپنی کوٹھیوں اور بنگلوں کے لانوں میں گورے آفیسروں کی طرح ایکسرسائز نہیں کرتے تھے۔ کالے لوگوں سے دور دور رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کالے لوگوں کے قریب آنے سے ان کی تمکنت میں ممکنت پیدا ہو جائے گی اور دیسی لوگوں کا ان سے ملنا ممکن ہو جائے گا۔

اتنی ساری بندشوں کے باوجود اور ایسی مائتھالوجی کے باوصف ایک بھرپور آئی سی ایس آفیسر جس نے انگریزی کمپی ٹیشن کا ایک بین الاقوامی انعام جیتا تھا، ہمارے درمیان مزے سے بیٹھا ہم سے باتیں کر رہا تھا اور ہمارے جیسی باتیں کر رہا تھا۔

مخمور جالندھری نے کہا ''شہاب صاحب آپ کی پھر ویسی کوئی نظم دیکھنے کو نہ ملی جو شیلے کی کسی نظم کے ترجمے کی صورت میں ادبی دنیا میں چھپی تھی۔''

شہاب نے کہا ''اب کچھ عرصے سے افسانوں پر توجہ ہو گئی ہے لیکن ان کا بھی وہی حال ہے، نظموں جیسا۔ ہرا لعنت!''

سیتھارتھی نے کہا ''کہانیوں کو تو خیر کچھ نہ کہیے وہ تو اپنے انداز میں ٹھیک چل رہی ہیں، کرشن اور اوپندر سے ہٹ کر، ان میں تو بڑی جان ہے۔''

مخمور نے کہا ''لیکن ان کی جان کا ہیرا ان نظموں میں بند ہے...... وہ کیا ہے شہاب صاحب...... وہ......''

شہاب نے کہا ''مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ وہ تو شیلے کے کابوس نے پکڑ لیا اور حکماً ترجمہ کروالیا...... بس ایسے ہی ہے۔''

میں نے کہا ''اس نظم کا عنوان ہے ''سہاگ گیت'' اور یہ ایک کورس کے روپ میں ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے یہ ادبی دنیا کے اکتوبر 40ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ ہم نے اس کی ایک سطحی سی دھن بنا کر کالج ٹیوٹوریل گروپ میں اس کی ریڈنگ کی تھی اور لڑکیوں کا رول بھی لڑکوں نے ہی کیا تھا؟''

''کیوں؟ لڑکیوں کو کیا ہوا؟'' بلونت سنگھ نے سنجیدگی سے پوچھا تو دیوندر سیتھارتھی نے بھولا سا منہ بنا کر کہا ''ان کو پسند نہیں ہوگا۔ یہ جو پنجاب کی لڑکیاں ہیں ناں یہ شانتی نکیتن جیسی لڑکیاں نہیں کہ ناچتی ہوئی کلاس میں آئیں اور ناچتی ہوئی واپس جائیں۔ ان میں اور ان میں فرق ہے۔ یہاں منافقت ہے۔''

فکر تونسوی کو پنجاب کی لڑکیوں کے بارے میں سیتھارتھی کا یہ خیال کچھ اچھا نہ لگا۔ اس نے بدلہ لینے کی غرض سے اپنی باچھیں کھینچ کر کہا ''تم یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم نے شانتی نکیتن دیکھا ہے اور ٹیگور کے ساتھ فوٹو کھنچوایا ہے...... بھلا اس میں کیا بڑائی ہے؟ یہ کونسی شیخی کی بات ہے۔ شانتی نکیتن کوئی بھی جا سکتا ہے۔ کرایہ ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا ''ہم نے جب کالج ٹیوٹوریل میں اس نظم کا ٹیبلو پیش کیا تھا تو ہم لوگ دو ٹکڑیاں بنا کر آمنے سامنے نہیں بیٹھے تھے بلکہ ایک ہی گروہ میں گھل مل کر بیٹھے تھے اور اپنا اپنا ڈائیلاگ آ جانے پر اسی ٹکڑی کے اندر اسی طرح ادائیگی شروع کر دیتے تھے مگر ایک اور بھید بھاؤ کے اندر...... نظم تھی:

لڑکے: رات! جلا دے جلدی جلدی دیپک مالا تاروں کی تو
بھر بھر تھال لٹا دے موتی جھولی میں گلزاروں کی تو......!
چاندی کرنوں کو بن بن کے سندر صورت سیج بچھا دے
دکھ داتا ہے دن کی اگنی، سورج دیو کی جوت بجھا دے
آ جا سندر سپنوں والی! جھوٹے حیلے اور بہانے!
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا...... ہائے کوئی یہ کیا جانے!

لڑکیاں: جا ری سکھی! آکاش کے تارے آج ترے رکھوالے ہوں گے
سکھ سنگت کی ریت منانے، جھوم جھوم متوالے ہوں گے
پریم کی اونچ اور نیچ سے تھک کر، پیاری سکھی جب تو سو جائے
سندر سندر، کومل کومل، ٹھنڈے سپنوں میں کھو جائے
رہ رہ کر یوں ڈرتا ہے من، تو اپنی ہے وہ بیگانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا...... ہائے کوئی یہ کیا جانے

لڑکے: رات کا پل پل بڑھتا جائے، دن کی گھڑیاں سوتی جائیں
اونچے نیچے پربت میں سورج کی کرنیں کھوتی جائیں......!
کڑند کڑند کے بجلی چپے، کالی بدلی میں کھو جائے
جیسے کالے بالوں والی ناری بیٹھی بال سکھائے......!

لڑکیاں: جا ری سکھی، پر تیرا جانا...... دل ہی نہ مانے...... دل ہی نہ مانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا...... ہائے کوئی یہ کیا جانے

سب مل کر: نیند کے ماتے نیند بھلا دیں، پریم کا ساگر جب لہرائے
من کا راگی من مندر میں میٹھی میٹھی تان اڑائے
جیسے من کی پینگ بڑھا کر چنچل آشا جھولا جھولے
یا جیسے رت آئے بسنتی، کھیت کھیت میں سرسوں پھولے
روٹھ روٹھ کے بیٹھے کوئی...... کوئی ڈھونڈے چور بہانے
رات کے گھونگھٹ میں کیا ہوگا...... ہائے کوئی یہ کیا جانے

جب میں تقریباً اسی انداز اور اسی رچاؤ میں یہ نظم سنا چکا تو ہر ایک نے جی بھر کے داد دی۔ شہاب صاحب ایک ہی دم اتنی ساری داد وصول کرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے، پہلے ذرا سے جھینپے پھر شرمائے اور بعد میں آبدیدہ سے ہو کر سر جھکا کے بیٹھ گئے...... ہم سب نے محسوس کیا کہ کسی کسی آئی سی ایس میں ایک انسان بھی ہوتا ہے۔ ایک جاتا ہوا سا انسان۔ وجود کی

گلی کی نکڑ پر۔ تھوڑا سا نظر آتا ہوا باقی سب گزرا گزرا اور کند ھا بدل بدل کے بڑھتا ہوا!

یہ شہاب صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان دنوں وہ اوڑیسہ میں اسسٹنٹ کمشنر تھے اور کسی میٹنگ کے سلسلے میں دارالحکومت دلی آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو ان کی کہانیوں اور نظموں سے کہیں زیادہ بلند پایا۔ ان میں ایک عجیب طرح کا پیارا پن اور ایک عجیب طرح کی شرماہٹ تھی۔ یہ لجیا ان لوگوں میں ہوتی ہے جن میں کسی قسم کا مالی، جانی، باہی، جاہی یا علمی، شکلی اور عقلی تکبر نہیں ہوتا اور جو کسی کو بتائے جتائے سنائے دکھائے بغیر آسانیاں عطا کرتے رہتے ہیں۔

کئی سال بعد اسی روم میں مجھے ان کا خط ملا کہ ''بڑی مشکل سے تمہارا پتہ حاصل کیا ہے۔ میں ان دنوں ہالینڈ میں ہوں۔ ایک کورس ہے، جس کی تکمیل پر قریباً دس ماہ لگیں گے۔ پھر پاکستان جاتے ہوئے چند روز روم میں گزاروں گا اور تم سے ملاقاتیں رہیں گی۔''

میں نے اس خط کا فوری جواب یہ لکھا کہ دس ماہ بعد پاکستان جاتے ہوئے تو ضرور روم ٹھہر کر جایئے لیکن ابھی آنے میں کیا حرج ہے۔ ویک اینڈ کے ساتھ کوئی چھٹی ملا کر آ جائیں۔ دو تین روز میرے پاس رہیں۔ پھر واپس ہالینڈ چلے جائیں۔ ہالینڈ کونسا دور ہے۔ بات یہ ہے، میں نے لکھا کہ کتاب روم کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کی فہرست مندرجات سے پہلے آگاہ ہونا ضروری ہے اور یہ تقاضا جبھی پورا ہو سکتا ہے کہ روم کی سیر کرنے کے لیے پہلے چند روز آ کر روم کو پرے سے دیکھا جائے۔ پھر گھر واپس جا کر اس ''دید'' کے ساتھ چند مہینے رہا جائے، پھر وقت مقررہ پر آ کر روم کی سیر کی جائے۔ روم ایک دن میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک ہفتے میں بھی اور اسی طرح ایک مہینے کے اندر بھی اور ایک سال میں بھی لیکن مشکل یہ ہے کہ جو لوگ کئی نسلوں سے یہاں رہ رہے ہیں، انہوں نے بھی روم نہیں دیکھا۔ پورا روم نہیں دیکھا، اس کے حصے بخرے ضرور دیکھے ہیں۔

میرے ایسے لمبے خط کا جواب شہاب صاحب نے نہایت مختصر دیا کہ ''فی الحال نہیں آ سکتا، بہت مشکل ہے۔ نہ چھٹی مل سکتی ہے نہ اجازت۔ اگلے ہفتے امتحان ہے، اسے نپٹا کر سوچ سکتا ہوں لیکن اس کے بعد پھر ایک ٹیسٹ ہے۔ آپ میرے تھوڑا لکھے کو بہت سمجھیں اور معذور جان کر معاف فرما دیں۔''

میں نے انہیں معاف تو کر دیا البتہ ہمارے درمیان خطوں کا ایک لنگڑا سا سلسلہ ضرور شروع ہو گیا۔

جس روز میں روم پہنچا تو وہ دن اور اس سے اگلا دن تو میں نے اپنے کمرے میں گزارا لیکن باہر نکلنے پر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ٹیکسی لے کر پروٹسنٹ قبرستان پہنچا اور شیلے کی قبر پر ایک گلدستہ اپنی طرف سے اور دوسرا شہاب صاحب کی طرف سے بصد عجز و نیاز اس سل کے قدموں میں رکھا جس پر شیلے کا نام اور اس کی تاریخ وفات لکھی تھی۔

شیلے کی قبر ایک چھوٹے سے اہرامی مینار کے قریب واقع ہے اور اس کا تعویذ زمین کے ساتھ ہموار صورت میں پیوست ہے زیادہ اوپر اٹھا ہوا نہیں۔ نہ ہی مزار کے پاس کوئی لوح یا صلیب ایستادہ ہے۔ نہ ہی اس کا کوئی چبوترہ یا جنگلا ہے۔ بس ایک بڑی سی سنگ مرمر کی سل ہے اور اس پر مرنے والے کی نشانی رقم ہے۔

میرے پاس میرا کیمرہ تھا اور اس کے شٹر میں کوک بھر کر اپنی بھی تصویر لی جا سکتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ سامنے

کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں کیمرہ رکھا جا سکتا۔ میں نے پتھر کے ایک ٹوٹے پر کیمرہ رکھ کر دیکھا تو لیول بہت نیچا تھا۔ اگر میں قبر کی لوح پر لیٹ بھی جاتا تو بھی تصویر نہ آ سکتی تھی لیکن شیلے کی قبر پر آ کر تصویر کھنچوائے بغیر چلے جانا میرے لیے موت کا پیغام تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی۔ کپاس کے جھاڑ کی سی ایک سونٹی نما لکڑی قریب ہی سے مل گئی۔ اس کو ایک قبر کی جڑ میں جکڑ کر اس کے ساتھ کیمرہ لٹکایا تو کیمرے کے وزن کی وجہ سے لکڑی ٹوٹ گئی۔ نہایت ہی قیمتی کیمرہ بری طرح سے زمین پر گرا۔

اہرام کی طرف سے آنے والے ایک شخص نے میری مصیبت کو بھانپا اور میرے قریب پہنچ کر نہایت صاف اور واضح انگریزی میں پوچھا۔ ''آپ اپنی تصویر بنانا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا ''جی۔''

پوچھا ''شیلے کی قبر پر یا اس کے احاطے میں کسی بھی اور جگہ؟''

میں نے کہا ''شیلے اور صرف شیلے کی قبر پر...... میں سات ہزار میل کی دوری سے یہاں فوٹو ہی کھنچوانے آیا ہوں اور میرا ادھر آنے کا کوئی مقصد نہیں۔''

اس نے کیمرہ میرے ہاتھ سے لے کر کہا ''بیٹھیں۔''

میں پتھر کی اس سل کے سامنے دوزانو سا بیٹھ گیا تو اس شخص نے دو چار اینگل ادھر ادھر سے بنا کر کہا ''آپ کی یہ نشست ٹھیک نہیں، لوح آتی ہے تو آپ کا چہرہ کٹ جاتا ہے۔ آپ کا چہرہ کمپوز کرتا ہوں تو سل کا ایک کونا کٹ جاتا ہے۔ آپ اس سل پر چوڑائی کے رخ دونوں ہاتھ رکھ کر سوگوار انداز میں سر جھکا کر بیٹھیں تو ٹھیک رہے گا۔''

میں نے اس کی بات مان لی اور دونوں ہاتھ سل پر رکھ کر اور بدن کا بوجھ ہتھیلیوں پر ڈال کر غمناک انداز میں سر جھکا کر بیٹھا تو اس نے کہا ''بالکل ٹھیک ہے۔ سر ذرا سا اور جھکا دیں۔ چہرے پر دکھ کے آثار پیدا کریں۔ آنکھیں کھلی رکھیں اور آنکھیں عبارت پر رکھیں۔ میں سامنے سے نہیں بلکہ پہلو کی جانب سے پروفیل بناؤں گا۔ بس...... خاموش...... ریڈی۔''

اس نے میری اسی طرح بیٹھے بیٹھے اسی مقام سے دو سنیپ شاٹ لیے اور کیمرہ مجھے لوٹا دیا۔ جب میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا ''میرا نام کندوتی ہے۔ ماریو کندوتی اور میں ہفتے میں دو بار شیلے کی قبر پر ضرور آتا ہوں۔ یہ جو میں نے انگریزی سیکھی ہے تو اسی شاعر بے بدل کی یاد میں سیکھی ہے۔''

ماریو کندوتی کی عمر کوئی ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھی مگر وہ اپنی عمر کے مقابلے میں بہت جوان نظر آتا تھا۔ دراز قد، بھرے بھرے کندھے، مضبوط جسم، ہلکا گندمی رنگ اور مسکراتی ہوئی آنکھیں...... اس نے مجھے بتایا کہ اس کا دادا سینورا جولیو کندوتی بندرگاہ پر سامان ڈھوتا تھا لیکن اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے مزدوروں کا میٹ بن گیا۔ اس کی ملاقات نوجوان شاعر سے ڈوور کی بندرگاہ پر ہوئی تھی۔ جب اس نے شیلے کو گود میں اٹھا کر دوسری کشتی میں اتارا تھا۔ پایاب ساحل پر کشتیاں مل مل کر ایک دوسری سے بج رہی تھیں اور شیلے کے لیے ایک کشتی سے دوسری میں منتقل ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ میرے دادا نے کولی بھر کر حسن کے اس مجسمے کو آن واحد میں دوسری کشتی میں اتار دیا۔ کشتی کی سیٹ پر بیٹھتے ہی جب اس مجسمہ حسن و خوبی نے

اپنی بڑی بڑی حیران نگاہوں سے میرے دادا کی طرف دیکھا تو میرا دادا اس یونانی دیوتا زادے کا اسیر ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور دونوں میں دوستی ہو گئی۔

ماریو نے کہا "میرا دادا ایک سو گیارہ سال کا ہو کر فوت ہوا لیکن اس ان پڑھ مزدور نے انگریزی زبان پر ایسا عبور حاصل کیا کہ کیٹس جیسے تنک مزاج اس کو اپنی نظمیں دکھا کر رائے لیا کرتے تھے اور انگریزی روزمرہ میں اس سے مشورہ لے کر مصرعوں کا رُخ بدلا کرتے تھے...... پھر جب شیلے نے اپنی ازدواجی زندگی سے تنگ آ کر اپنی محبوبہ کے ساتھ روم منتقل ہونے کا پروگرام بنایا تو میرے دادا کو اس کی جنت گم گشتہ ہاتھ آ گئی۔ اپنا آبائی وطن باپ دادا کا شہر، پوپ کی قربت، پرانے یاروں کی سنگت، میرا دادا شیلے سے بھی پہلے روم پہنچ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔"

یہ مزدور پیشہ اور جفاکش لوگ بڑے قابل اعتماد ساتھی ہوتے ہیں۔ میرا دادا بھی ایسا ہی یاروں کا یار اور پیاروں کا پیار تھا۔ روم پہنچ کر اس نے گلہ بانی، درخت کٹائی اور کوہ پیائی کا کام شروع کر دیا۔ جنگل میں درختوں کے ٹھیکے سے اسے کافی آمدن ہونے لگی اور اس کے پاس دوستداریوں کے لیے وافر وقت کا ذخیرہ عام ہو گیا۔

میرے والد کو انگریزی زبان پسند نہ تھی جیسی مجھے یا میرے دادا کو تھی۔ اس نے میرے دادا سے تھوڑی بہت سیکھی ضرور لیکن اس کا اصل عشق نجاری تھا۔ وہ روم بھر میں اپنے وقت کا اعلیٰ درجے کا بڑھئی تھا اور اس کے ہاتھوں میں ہر قسم کی لکڑی موم کی طرح ہر صورت میں ڈھلتی جاتی تھی۔ وہ ایک آرٹسٹ ضرور تھا لیکن اسے زبان سے یا زباندانی سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ میرا دادا جب بھی کوئی مشکل نظم یا پیچیدہ فلسفہ اس کے سامنے پڑھتا تو وہ سمجھ ضرور لیتا لیکن اس سے زیادہ لطف اندوز نہ ہو سکتا۔ اپنے باپ کے مقابلے میں اپنے دادا کا زیادہ چہیتا تھا کہ میں اس کی ادبی لطف بازیوں میں برابر کا ساتھ دیتا اور کبھی کبھی اس سے پیچیدہ سوال پوچھ کر اسے گھنٹی لڑنے پر بھی مجبور کر دیتا۔

ماریو کندوتی میرے ساتھ کوثر میں ڈھلی انگریزی اور خالص لندن کے مخرج میں بات کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بی بی سی لندن سے خبریں سن رہا ہوں اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد یہی شخص خبروں پر تبصرہ بھی شروع کر دے گا۔

پہلی ہی ملاقات میں میں کندوتی فیملی سے یوں گھل مل گیا جیسے میرے اور ان کے صدیوں کے تعلقات ہوں۔ میری انگریزی سخن دانی اور گفتگو تو اس جیسی نہ تھی لیکن تازہ علمی اور ادبی معلومات میرے پاس زیادہ تھیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اس لیے بھی بہت پسند کیا کہ ہماری گفتگو کا بیشتر موضوع شیلے، اس کی شاعری اور اس کی زندگی سے متعلق تھا۔ اس کے گھر میں اس کے دادا کے ساتھ شیلے کی کئی تصویریں تھیں جنہیں انہوں نے دادا کی وصیت کے مطابق عام نہیں کیا تھا۔ کمرہ بند کر کے، پردے کھینچ کے اور دو قفلی ٹرنک کھول کر ماریو نے ایک مرتبہ یہ فوٹو دکھائے تھے اور پھر ان کا کوئی تذکرہ نہ کیا تھا۔

ماریو نے کہا کہ میرا دادا بتایا کرتا تھا کہ میں شیلے کا اور اس کی شاعری کا دیوانہ تھا۔ وہ اپنے سیاہ گھنگھریالے بالوں کے نیچے شفاف آنکھیں کھول کر فضا میں تکتا تھا تو سامنے کا سارا خلا با معنی ہو جاتا تھا۔ اس کی باتیں، اس کے نظریات، اس کے خیال اور اس کی پیش گوئیاں پنکھڑیوں کی طرح سطح زمین پر پھیل جاتی تھیں اور پھر ان پر تصورات، پندار اور انگار کی تتلیاں رقص کرنے لگتی تھیں۔ وہ اٹلی کی شراب اور روم کی عورتوں کا عاشق تھا اور ہر اس شے کا دیوانہ تھا جو اس کی

نگاہوں میں حسین تھی۔

دادا کہتا ہے کہ جس روز "تو اور تو" کی جھیل میں اس کی کشتی ڈوبی ہے، میں عین اس وقت کلوزیم کی دیوار پر رسہ پھینک کر کمند سے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے نیچے بہت سے تماشائی جمع ہو گئے تھے جن میں سے کچھ مجھے ایک کوہ پیما کی حیثیت سے جانتے بھی تھے۔ یہ آٹھ جولائی کی ایک گرم اور امسی ہوئی شام کا ذکر ہے۔ جب میں کلوزیم کی ستواں دیوار پر بہت اوپر کافی اونچا چڑھ گیا تھا...... دادا کہتا ہے کہ اس وقت کسی نے نیچے سے بہت اونچی آواز میں پکار کر کہا "تمہارا جگری یار اور پیارا شاعر شیلے پانی میں ڈوب کر مر گیا ہے اور اس کی کشتی پچھاڑی کے اندر غرق ہو گئی ہے۔" میں بجلی کی سی تیزی سے رستے پر رپٹتا ہوا نیچے آیا اور میرے ہاتھ اور پاؤں رسے کی رگڑ سے ادھڑ کر جل اٹھے۔

دادا بتاتا تھا کہ جب ہم جائے حادثہ پر پہنچے تو بائرن اور لی ہنٹ بھی بگھی میں سوار وہاں پہنچ چکے تھے۔ ان کے ساتھ سپاہیوں کا ایک ویسا ہی دستہ تھا جو ایک روز پہلے ہیلتھ آفیسر کے ہمراہ یہاں پہنچا تھا۔

گورگرنا، کاپرائی اور ایلبا جزیروں کے درمیان ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہمارے سامنے تھا اور ہم اس مقام اور اس فضا کے طلسم میں جکڑے ہوئے تھے جو شیلے نے اپنی موت کے لیے پسند کی تھی۔ پتھریلی چٹانوں پر گزرے ہوئے موسموں کے سرد و گرم چشیدہ پرانی وضع کے روشنی کے مینار ایک کھلی قوس میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے سنگ مرمر کی دبی ہوئی گھاٹیوں کا ایک ذخیرہ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس وقت سمندر کے بڑے بڑے تھپیڑوں کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ ہر طرف اک ہُو کا عالم تھا۔ خوف کی فضا نے دور دور تک چھاؤنی چھائی تھی اور ہر شے پر سے ایک سہم کا سایہ گزر رہا تھا۔

دادا کہتا ہے کہ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ شیلے کو اپنے آخری سفر کے لیے اس سے بہتر اور کونسا مقام نصیب ہو سکتا تھا۔ تقدیر نے اس کی کیسی اچھی رہنمائی کی۔

کشتی الٹ جانے کی وجہ سے شیلے کی لاش ریت میں دھنس گئی تھی اور وقت گزر جانے پر پتھروں میں دھنس گئی تھی۔

دادا کہتا ہے کہ ہمارا رویہ اس وقت بھیڑیوں اور شکاری کتوں سے بھی بدتر تھا کہ ہم پتھروں تلے سے اس کی لاش پانی کے اندر ہی گھسیٹتے گھسیٹتے ایک ہموار مقام کی طرف لے جا رہے تھے۔ مُردوں کو چونکہ زندہ کے افعال اور کردار پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، اس لیے ہم شیلے کی خستہ اور برہنہ لاش کو نوچ نوچ کر آگے کی طرف کھسا رہے تھے۔ اس کھینچ تان میں شیلے کی لاش دور تک ادھڑتی، پھٹی، کھلتی اور گھستی گئی۔

میرا دادا اس سانحے کا ذکر کرتے ہوئے اکثر کہا کرتا "افسوس میں بھی لاش کی بے حرمتی کے خلاف کوئی احتجاج نہ کر سکا۔ مجبوری تھی۔ اسے اسی طرح سے نکالا جا سکتا تھا۔"

شیلے کو جلانے کی آخری رسومات خاموشی سے اور دلسوزی سے ادا ہوتی رہیں۔ اس وقت سب پر ایسی گھڑی براجمان تھی کہ ہر کام چپ چاپ طے ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ بائرن بھی اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے چپ چاپ کھڑا تھا اور اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم پیلی پیلی ریت اور سرمئی پتھروں سے شیلے کی لاش جھڑوا رہے تھے تو بیلچے کی ایک ترچھی چوٹ شیلے کی کھوپڑی پر ایسی اوچھی پڑی کہ اس سے ایک مہیب آواز بلند ہوئی۔ ہم

نے دیکھا کہ اس چوٹ سے اس کی کھوپڑی بالکل کھل گئی لیکن دوسری جانب جلد کے ساتھ چمٹی رہی۔ اس وقت بائرن نے کنارے پر کھڑے کھڑے کہا تھا" اس کی کھوپڑی اتار کر مجھے دے دو، میں اپنے پاس رکھوں گا!"

دادا نے کہا" میں نے اس وقت بائرن کی بات کا برا مانا اور کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک بیہودہ اور متکبر آدمی تھا۔ اس کے پاس پہلے بھی ایک انسانی کھوپڑی تھی جس میں وہ شراب ڈال کر پیا کرتا تھا۔ میں کسی بھی صورت میں شیلے کی توہین برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے گھور کر بائرن کی طرف دیکھا اور وہ میری گھوری کا مطلب سمجھ گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اب چپ چاپ کھڑا تھا اور صرف شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔"

شیلے کو جلانے کے لیے ہم نے ضرورت سے زیادہ لکڑیاں جمع کر لی تھیں تا کہ چتا اچھی طرح سے روشن ہو کر اس کے جسد خاکی کو جلد از جلد خاکستر میں تبدیل کر دے اور کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

دادا کہتا ہے کہ جب ہم نے چتا روشن کی اور اس کے لانبو بل کھاتے ستونوں کی طرح اوپر اٹھنے لگے تو ہم نے شیلے کی بیلچوں سے کٹی پھٹی لاش کو شراب میں نہلا دیا اور اس کے پھولے ہوئے وجود پر خم کے خم لنڈھا دیے۔ ہم نے کھلے دل کے ساتھ اس کے جسد خاکی کو اتنی شراب سے تر اریز کر دیا جتنی شراب اس نے ساری زندگی ملا کر بھی نہ پی ہو۔

دادا بتایا کرتا تھا کہ جب ہم نے شیلے کو اس بھڑکتی ہوئی چتا میں پھینکا تو شعلوں نے جھپٹ کر اس کو اپنی آغوش میں لے لیا...... گرمی کا موسم، آگ کی حدت اور دھوپ کی شدت سے ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کا سارا بدن پھٹ گیا اور اس کا دل سینے کے پھٹے ہوئے شگاف سے باہر لٹک آیا۔ کھوپڑی کا اگلا حصہ جو بیلچے کی چوٹ سے دراڑ کھا گیا تھا، اس آگ کے جہنم میں سیف کے ڈھکنے کی طرح کھل گیا۔ ہم سب نے اس کی کھوپڑی کے اندر شیلے کا بھیجا دیکھا جو ابلتی، پگھلتی اور جوش کھاتی ہوئی ہنڈیا کی طرح کھد بد کر رہا تھا۔ بائرن سے یہ منظر دیکھا نہ گیا، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ساحل کی اس جانب چلا گیا جہاں لی ہنٹ ابھی تک بگھی میں بیٹھا تھا اور خوف کے مارے چتا کے قریب نہیں آیا تھا۔

آگ اس قدر تیز اور ایسی بھڑکیلی تھی کہ دیکھتے دیکھتے سارے جسد کو چاٹ کر خاکستر میں تبدیل کر گئی۔ اگر شیلے کا کچھ بچا تو ہڈیوں کے چند جوڑ۔ ایک جبڑا اور کھوپڑی کا ایک بڑا سا حصہ تھا۔

لیکن جس بات نے چتا کے گرد موجود سب لوگوں کو حیران کر دیا وہ شیلے کا دل تھا جو سلگتی ہوئی آگ کے اندر بدستور ویسے کا ویسا تھا اور اپنی اصلی حالت میں تھا۔

ماریو نے کہا" میرا دادا اکثر بتایا کرتا تھا اور ہمیشہ دکھایا کرتا تھا کہ سلگتی ہوئی آگ کے دہکتے ہوئے کوئلوں کے اندر بازو ڈال کر جب اس نے شیلے کا دل کھینچ کر باہر نکالا تو اس کا بازو کہنی سے اوپر تک بری طرح سے جل گیا اور ہاتھ کے اوپر کا چمڑا یوں داغا گیا کہ چمڑا کھنچ کر مستقل طور پر اکڑ گیا۔"

ماریو نے بڑے افسوس کے ساتھ بتایا کہ اس کے بعد ساری عمر دادا کو مٹھی بند کرنے اور کھولنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا...... اور جہاں میں نے تمہارا فوٹو اتارا تھا، اس قبر میں شیلے کا وہی دل دفن ہے جو میرے دادا نے جان پر کھیل کر چتا سے نکالا تھا۔

ماریو کندوتی مجھ سے کافی بڑا تھا۔ میں نے اس سے اس کی عمر کے بارے میں تو کبھی نہیں پوچھا لیکن میرا خیال ہے جب میں چھبیس برس کا تھا تو اس کی عمر ساٹھ باسٹھ کے قریب ہوگی۔ ماریو بڑا مہذب، بے حد شائستہ اور پرانی روایات کا حامل تھا۔ روم میں اس کے فرنیچر کے دو شوروم تھے اور دونوں ہی کسی توجہ طلب میوزیم کی طرح ہر وقت گاہکوں سے بھرے رہتے تھے۔ آرہ کشی، نجاری اور فرنیچر سازی کا کام گورمینو قصبے میں ہوتا تھا جو روم سے ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

ماریو کی ایک بہت ہی خوبصورت نواسی تھی۔ ایسی خوبصورت کہ اسے دیکھ کر بدن پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی اور اس سے بات کرتے وقت حلق میں تھوبا سا پھنس جاتا تھا۔ مجھ سے پورے پانچ سال چھوٹی تھی لیکن عقل و دانش، معلومات عامہ اور سوجھ بوجھ میں مجھ سے تقریباً پچاس سال آگے تھی۔ اس کے بال، اس کے کندھے، اس کی گردن وینس ڈی مائیلو کے مجسمے کی ہو بہو نقل تھی اور جب وہ مسکراتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے لیونارڈو نے جیوکونڈ مسکراہٹ اس کو دیکھ کر اپنی تصویر میں بھری تھی، سارے روم میں وہ ایک ہی دیدنی لڑکی تھی جس کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن وہ چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ بچپن میں اسے پولیو کا شدید اٹیک ہو گیا تھا اور اس کا نچلا دھڑ بالکل بے جان تھا۔

میں جب بھی ان کے گھر جاتا، آنجلا اپنی کرسی چلاتی ہوئی میری نشست کے قریب آ کر بڑی ملائمت سے ہاتھ ملاتی۔ دھیمے سے حال پوچھتی اور گردن گھما کر اندر باورچی خانے میں دیکھتے ہوئے ذرا سی اونچی آواز میں کہتی" کیا پیو گے؟" میں اسے اپنی پسند کا مشروب بتا کر اس کا منا سا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتا اور دیسی آدمیوں کی طرح سر ہلا کر پوچھتا" کیسی ہو؟" اور وہ ہمیشہ خوش دلی کے ساتھ ایک ہی جواب دیتی" پہلے کے مقابلے میں اچھی ہوں۔"

پھر اس کی ماں باورچی خانہ سے کھانا پکاتے ہوئے یا غسل خانے میں کپڑے دھوتے ہوئے یا مچھلیوں کو ان کی جن من سی خوراک ڈالتے ہوئے ایپرن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی ہمارے پاس آ کر بیٹھ جاتی۔

آنجلا کی ماں مجھ سے ہر بار صرف ہاتھیوں کے بارے میں پوچھا کرتی۔ ان کا وزن، عمومی قد، سونڈھ کی موٹائی، ٹانگوں کی گولائی، کھانے کے انداز، پانی پینے کا طریقہ، اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ ماں باپ کا سلوک، اور انہیں کھلانے پلانے اور نہلانے دھلانے کے طریقے۔

اتفاق سے میرا ملک بھی برما، سری لنکا اور آسام کی طرح ہاتھیوں کا ملک تھا۔ اس لیے میں ہاتھیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ خود ہمارے باورچی نورالدین احمد کا باپ نواکھالی کا مشہور مہاوت تھا۔ جوانی میں وہ سندر بن میں کھیدا بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ترپن قوی الجثہ جنگلی ہاتھی پکڑ کر انہیں سدھایا تھا اور بڑے مہنگے بھاؤ سرحد کے اس پار بیچا تھا۔

نورالدین احمد کے پاس ہاتھیوں کی کہانیوں کا نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ میں نے وہ سارا خزانہ جوں کا توں آنجلا کی ماں کے قدموں پر نثار کر دیا اور اس سے وعدہ کیا کہ جب میں پاکستان واپس جاؤں گا تو پھر ہم اکٹھے ہی مشرقی پاکستان چلیں گے اور پورا ایک مہینہ سندر بن میں گزاریں گے۔ مجھ سے ملنے کے بعد آنجلا کی ماں زیادہ تر سندر بن میں رہنے لگی تھی، حالانکہ میں نے خود ابھی تک اپنے وطن کا وہ حصہ نہیں دیکھا تھا۔

ایک روز جب میں اور آنجلا اس کے کیمرے سے کھینچی ہوئی رنگین سلائیڈیں دیکھ رہے تھے تو اس نے سلائیڈ دیکھتے ہوئے چہرہ میری طرف گھما کر کہا "آج تم کو ایک نیا مشروب پلاتے ہیں۔ ابھی اس کی تعارفی سپلائی ہوئی ہے لیکن امید ہے اگلے ہفتے تک دکانوں، بقالوں، ریستورانوں میں عام ملنے لگے گا۔ نانا میرے لیے اس کی چھ بوتلیں لائے ہیں اور میں نے ان سے میں سے ابھی ایک بھی نہیں کھولی۔"

"کیوں؟" میں نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے چھوٹے بچوں کو مارنے کا سا نشان بنا کر کہا "ان کے ڈھکنے نہیں کھلتے تھے۔ اوپنر نہیں تھا جس سے اس نئے مشروب کا ڈھکنا کھولا جا سکے۔"

میں نے کہا "اب مل گیا ہے؟"

کہنے لگی "ملا تو نہیں، البتہ امید ہے کہ مل جائے گا۔"

پھر اس نے ملازمہ کو آواز دے کر کہا "فریج سے کل والی ڈرنک نکال کے لے آؤ...... ساتھ سٹرا بھی۔"

نوراً چاندی کے خوبصورت طشت میں، بلور کے دو لمبے گلاس نسواری رنگ کے مشروب سے بھر کے لے آئی۔ میں نے حیرانی سے اس مشروب کو دیکھا اور ذرا سی ناک چڑھائی۔ اس رنگ کا مشروب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی درخت کی چھال کا ابلا ہوا پانی ہو یا زہر مہرہ گھول کر کوئی محلول بنایا گیا ہو۔ جب میں نے گلاس اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ وہی زہر ہے جو سقراط کو دیا گیا تھا اور جو دھتورے کے عرق سے تیار ہوا تھا۔ میں نے گلاس کے اندر کا سٹرا تو نکال کر ایک طرف دکھ دیا۔ پھر سطح مشروب پر اٹھتے ہوئے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے ایک لمبا سا گھونٹ بھرا۔ اپنی میزبان کے حسن لازوال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اور اپنی جان ناتواں کو اس کے حکم لا ثانے معنون کرتے ہوئے!

لیکن اس دارو کے میرے حلق سے اترتے ہی اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک ہلکی سی چھینک جو منہ بند ہونے کی وجہ سے صرف ناک سے پھٹک سکتی تھی، مشروب کے چند قطرے میرے گریبان میں گرا گئی۔

آنجلا نے گلاس میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا "نہیں پیا جاتا؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

کہنے لگی "بہت تیز ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رومال سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

وہ میری ہیئت کذائی دیکھ کر پہلے تو مسکرائی، پھر ہنسنے لگی۔ مجھے اس کا ایسے موقع پر ہنسنا کچھ زیادہ اچھا نہ لگا۔ عجب واہیات قسم کا مشروب تھا۔ بچپن میں اماں بخار آ جانے پر دیا کرتی تھیں۔ چارپائی پر لٹا کر اور قصاب کا سا زانو سینے پر رکھ کر بڑے چمچ باچھیں چیر کر پلایا کرتی تھیں جو ذرا سا دارو گوشہ دہن سے باہر نکلتا تھا تو اسے فوراً چمچ پر لے کر پھر منہ میں ٹھونس دیا کرتی تھیں۔ اس دوائی میں سے رال، ہڑتال، بینگن کے جلے ہوئے بھرتے، نمک، املی، مرغیوں کے ڈربے اور کنیر کے

پھولوں کی بو آیا کرتی تھی۔ اس دوا کا نام "ڈائیافریکٹ" تھا اور جس کارنس پر یہ رکھی ہوتی تھی، ادھر سے گزرنے پر خوف آتا تھا۔ بالکل وہی دوائی اتنے سالوں بعد آنجلا نے میری عزت افزائی کے لیے فریج میں رکھ کے اور برف میں لگا کر پلا دی تھی۔

یہ بارہ جولائی سن انیس سو باون کا واقعہ ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ "کوکا کولا" پیا۔ کوئی چھ مہینے سے اٹلی کے اخباروں، رسالوں، پرچوں میں فل پیج اشتہار آ رہے تھے کہ دنیا کا اول درجے کا مشروب کوکا کولا اب اٹلی پہنچ کر رومیوں کے کام و دہن کی لذت کے سامان بہم کرنے والا ہے...... بڑے بڑے رنگدار ہورڈنگ جگہ جگہ لگے تھے۔ قد آدم اشتہار شہر کی دیواروں سے چسپاں تھے۔ جس گھرانے نے کوکا کولا تیار کرنے کا کارخانہ لگایا تھا، ان کا ہر روز شام کے پانچ بجے ریڈیو پر انٹرویو ہوتا تھا۔ یہ انٹرویو کے سننے کے لیے لوگ دور دور مقامات سے اپنے گھروں کو بھاگتے تھے۔ اطالوی زبان میں انٹرویو کے دوران جب امریکی لڑکی انگریزی میں یہ کہتی کہ "ڈرنک کوکا کولا اینڈ کوئنچ آل تھرسٹ" تو گھر کے لوگ اس کے ساتھ مل کر خوشی کا نعرہ لگاتے اور ریڈیو کے گرد چھوٹی سی لڈی ڈال کے اس انتظار میں کھڑے ہو جاتے کہ دیکھیں پھر کب اشتہار آتا ہے۔

لوہاروں، ترکھانوں، موچیوں اور گٹر صاف کرنے والے کارندوں کے نوجوان بیٹوں نے ابھی سے اپنا پیٹ کاٹ کر لیرے جمع کرنے شروع کر دیئے تھے کہ وقت آنے پر اپنی محبوباؤں کو "کوکا کولا" پلا سکیں اور تواتر کے ساتھ پلا سکیں۔ اگر ہر روز نہیں تو ہر اتوار، دو تین بار نہیں تو کم از کم ایک بار ضرور...... بلا تخفیف۔

کم تعلیم یافتہ بزرگوں کو زیادہ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت بوڑھوں نے از خود بتا دیا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد رات کو کوکا کولا کی ایک بوتل سارا کھانا سونے سے پہلے ہضم کر دیتی ہے اور اس سے کھل کر ڈکار آ جاتے ہیں۔

میری لینڈ لیڈی کو یقین تھا کہ جب کوکا کولا آئے گا تو اس کے پرانے پھوڑے پھنسیاں خود بخود دور ہو جائیں گے کیونکہ "کوکا کولا" جلدی امراض کا آخری اور واحد حل ہے۔

نوجوانوں نے امریکی فلموں میں ہیرو کو کوکا کولا کی بوتل گردن سے پکڑے اپنی محبوبہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے دور دراز مرغزاروں میں چلتے دیکھا تھا۔ ہیروئنیں تبسم کناں لٹک لٹک کر چلتی تھیں اور لہک لہک کر باتیں کرتی تھیں۔ نہ کوئی شکوہ تھا نہ جھگڑا، نہ مرد عورت کا تنازع نہ طعنہ نہ الہنا! مرد جب چاہتا ساتھ چلتی ہوئی لڑکی کو اپنی بوتل تھما دیتا۔ وہ ایک گھونٹ بھر کے بوتل واپس کر دیتی اور دونوں پھر چلنے لگتے۔

ہمارے محلے کا ڈاکیہ سینور کردوتی ٹانگیں کھول کھول کر اور سی سی کر کے چلتا تھا۔ اس بیچارے کو کافی دیر سے تکلیف تھی لیکن اب اس کا چہرہ پر سکون ہو گیا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ اس نے مجھے ویٹی کن گیٹ کے سامنے روک کر کہا "پروفیسورے! آج تمہاری ڈاک تو نہیں البتہ ایک خوشخبری ہے کہ اگلے ہفتے "کوکا کولا" اٹلی میں آ رہا ہے۔ اس کے پینے سے پرانی اور دیرینہ بواسیر ایک ہفتے میں دور ہو جاتی ہے۔ میرے بیٹے کا سسر لندن میں رہ کر آیا ہے۔ اس نے تین ہفتے باقاعدگی سے "کوکا کولا" پیا اور اس کی بچپن کی بواسیر دور ہو گئی۔ میری تو ابھی صرف پندرہ سال پرانی ہے۔"

ہماری یونیورسٹی کی تقریباً ساری لڑکیوں نے کندھے پر لٹکانے کے خصوصی تھیلے بنوا لیے تھے جن میں کوکا کولا کی

ایک بوتل، ایک چھوٹا گلاس اور ساتھ سٹین لیس سٹیل کا ایک اوپنر رکھا جاسکے۔ یہ تھیلے ان کی سکرٹس سے بھی زیادہ جاذب نظر تھے اور ان میں غضب کی سیکس اپیل تھی!

ہمارے پادری صاحب، پادری سانتریلی جنگ کے بعد آسٹریا گئے تھے۔ وہاں ویانا میں انہوں نے امریکن زون میں ایک امریکی پرائیویٹ کی مہربانی سے کوکا کولا کی پوری بوتل پی تھی۔ سارے روم میں کوکا کولا پینے والے تیرہ آدمیوں میں پادری صاحب کا نام بھی تھا۔ روزنامہ "ایل میساجیرو" نے اپنے سنڈے ایڈیشن میں ان لوگوں کے نام اور پتے دیئے تھے جنہوں نے خوش قسمتی سے کوکا کولا پیا تھا...... پادری سانتریلی کہتے تھے کہ کوکا کولا پینے سے آدمی میں ایک سرمدی سرور پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی روحانی تفاصیل بڑھ جاتی ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے حضرت مریم کی قسم کھا کر کہا کہ جس روز انہوں نے کوکا کولا پیا، ان کو خواب میں حضرت یسوعؑ کی زیارت نصیب ہوئی۔ بہت سے لوگوں کے گروہ میں ہمارے پادری صاحب حضرت یسوعؑ کے بہت ہی قریب کھڑے تھے۔

مجھے معلوم تو تھا کہ ہمارے اٹلی میں کوکا کولا آرہا ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس قدر جلد آرہا ہے۔

آنجلا نے کہا "اگر دل نہیں چاہتا تو نہ پیو۔"

میں نے کہا "دل تو بہت چاہتا ہے مگر پیا نہیں جاتا۔"

کہنے لگی "تم کو یقین نہیں آئے گا لیکن یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ ایک وقت آئے گا تم پکار پکار کر کوکا کولا مانگا کرو گے اور اگر نہیں ملے گا تو اس محفل سے اٹھ کر وہاں پہنچ جایا کرو گے جہاں کوکا کولا ملے گا۔"

میں نے کہا "کچھ خدا کا خوف کرو آنجلا۔ ایسی بدبودار، سیاہ رنگ، تلخ اور خروش آور دوا کو کون خوش دلی سے پی سکتا ہے بھلا؟"

پھر آنجلا نے مجھے کوکا کولا کی تخلیق کی لمبی اور مسحور کن کہانی سنائی کہ کس طرح ایک ڈاکٹر Pemberton پمبرٹن کے معمل میں اس کے کمپاؤنڈر نے سر درد کا ایک محلول تیار کیا اور اسے بڑے بزرگوں کو یہ کہہ کر دینے لگا کہ بس ناک آنکھیں بند کر کے چڑھا جاؤ، فعل ہاضمہ میں مدد دے گا۔ درد سے نجات ہو گی۔ وہ بیچارے اسی طرح کرتے رہے، لیکن کسی کا بھی سر درد دور نہ ہوا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" میں نے یہی پر زور دے کر کہا کہ اصل میں یہ ایک دوائی ہے اور اس کا ذائقہ ہمارے بچپن کی ڈائیا فریکٹ سے بہت ملتا ہے۔

"لیکن اب یہ دوا نہیں رہی پیارے۔ اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ شامل کر کے بلبلے اٹھا دیئے گئے ہیں۔ اب یہ ایک مشروب ہے اور جسم و جاں کو تر و تازگی عطا کرتا ہے۔"

پھر خود ہی کہنے لگی "البتہ اگر اس کو یخ نہ کیا جائے اور اس میں برف نہ ڈالی جائے اور یہ روم ٹمپریچر پر گرم ہو جائے تو پھر یہ دوائی ہے۔ وہی دوائی جو کمپاؤنڈر بنایا کرتا تھا۔ بے ذائقہ، ناقابل برداشت۔"

میں نے پھر کہا کہ یہی تو میں کہہ رہا تھا لیکن آنجلا نے میری بات کاٹ کر ایک دھیمے مزاج کی استانی کے انداز

میں کہا "کوکا کولا کمرشل کرنے سے پہلے کئی سال اس پر تحقیق ہوتی رہی ہے۔ امریکہ میں بسنے والی ساری قوموں کے نمائندہ لوگوں کو کوکا کولا پلا کر یہ دیکھا گیا کہ ان پر اس کا کیسا ردعمل ہوتا ہے۔ یورپی لوگوں نے تو اسے خوشگوار طریق پر برداشت کر لیا لیکن ریڈ انڈین اور ایسکیموؤں نے پہلا گھونٹ بھرتے ہی اسے بجڑاک سے زمین پر اگل دیا۔ اس میں پھر رد و بدل کیا جانے لگا۔ دو سال کی مدت کے بعد اسے ناپسند کرنے والے لوگ بھی پسند کرنے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد جب اسے بچوں پر آزمایا گیا تو دو سال تک کی عمر کے بچوں نے تو پسند کیا لیکن دس بارہ برس کے لڑکے اور لڑکیوں نے ابکائی کر دی۔ اب پھر اس میں ترمیم و تنسیخ ہونے لگی۔"

میں نے کہا "کیا یہ انجیل مقدس میں لکھا ہے کہ دنیا کے سب لوگوں کو کوکا کولا پلایا جائے اور ان کی ناک میں دم کیا جائے۔"

آنجلا ہنسی اور کہنے لگی "تم بھی میرے نانا کی سی بات کرتے ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح سے فرسودہ خیالات کے مالک ہیں اور ایسی ہی پلپلی ہوئی باتیں کیا کرتے ہیں۔ امریکی ہم اطالویوں جیسے نہیں، وہ ترقی یافتہ لوگ ہیں اور ہر کام میں ہر ایک سے آگے ہیں۔ ان میں تحقیق و جستجو کا مادہ ہم یورپین لوگوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک مرتبہ جس کام کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اسے آخر تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ ہر جزو کو ہر تفصیل کو محدب شیشے کے نیچے رکھ کر اسے جانچتے، آنکتے اور پرتالتے ہیں۔ جو نظر آتا ہے، وہ! جو نظر نہیں آتا...... وہ! اور جو آگے چل کر نظر آنے لگے گا۔ یہ سب کچھ ان کے مطالعے میں ہوتا ہے...... جب تک یہ مشروب بن کر اس پر مختلف المزاج لوگوں کی پسندیدگی کی مہر نہیں لگ گئی، اس کو مارکیٹ کرنے کا پروگرام نہیں بنایا۔"

"کیوں؟" میں نے امریکیوں کی حماقت پر سر جھٹک کر کہا۔

آنجلا کہنے لگی "سب سے مشکل کام اس مشروب کو ایسا نام دینا تھا جو دنیا بھر میں مقبول ہو سکے اور کرۂ ارض کا ہر بندہ اس کو آسانی کے ساتھ ادا کر سکے۔ چنانچہ ماہرین لسانیات اور ماہرین صوت شناسی کے ایک گروہ نے پہلے پچاس ناموں کا انتخاب کیا۔ پھر انہیں امریکہ میں ٹیسٹ کر کے بیس ناموں تک محدود کیا۔ اس کے بعد اس پیش نہاد کمپنی کے کارندے ساری دنیا میں پھیل گئے تاکہ ایک یونیورسل نام پر پسندیدگی کی مہر لگوا سکیں۔"

میں حیرت سے آنجلا کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ جو اپنے آپ کو امریکیوں کے مقابلے میں پسماندہ اور عقب افتادہ کہہ رہی تھی تو ان سب کے سامنے میں کس سطح پر ہوں!

کہنے لگی "اپنے مشروب کے لیے کوکا کولا کمپنی نے جتنے نام بھی چنے، وہ سارے کے سارے "واولز" میں ختم ہوتے تھے۔ واول میں ختم ہونے والے لفظ کی ادائیگی ہر کوئی کر سکتا ہے اور اس کے مخرج میں کسی کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ چنانچہ دنیا بھر کے طویل چکر لگانے کے بعد کمپنی کے کارندے اس نتیجے پر پہنچے کہ لفظ "کوکا کولا" دنیا کا ہر شخص آسانی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ وہ چاہے عرب ہو، چاہے ہندوستانی یا بھوٹانی، افریقہ میں کالاہاری کے جنگلوں کا شکار خور ہو یا ایمزن کے ننگا معاشرے کا فرد، جاپانی ہو، آسٹریلیا کا بچی ہو۔ قطب شمالی کا ایسکیمو ہو بھی آسانی کے ساتھ، پورے مخرج کے ساتھ اور صحیح تلفظ کے ساتھ "کوکا کولا" کہہ سکتے ہیں۔

میں نے کہا "آخر بھلا ایسی سب باتیں تمہیں کون بتاتا ہے اور یہ تم کہاں سے سنتی ہو؟"

اس کی آنکھیں ذرا سی نمناک ہو گئیں۔ سر اوپر اٹھا کر کہنے لگی۔ "سارا دن اس وہیل چیئر پر گزرتا ہے۔ گھر سے باہر جانا نہیں ہوتا۔ بیٹھی پڑھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں اور سوچتے سوچتے سو جاتی ہوں۔ اس کے بعد زندگی کا کم پیریڈ شروع ہو جاتا ہے۔"

ستی مردیاتی نے انڈونیشیا جانے کے بجائے یہیں ایک یمنی سے شادی کر لی تھی۔ اس کا شوہر معروف حاطان گورے رنگ کا ایک دراز قد طالب علم تھا جو گیلے ریٹا کے ایک شعبہ میں مجسمہ سازی کا فن سیکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا تاجر بھی تھا۔ روم میں کچھ امپورٹ کرتا تھا۔ یمن کو کچھ ایکسپورٹ کرتا تھا۔ فٹبال کا کھلاڑی بھی تھا۔ کبھی کار خرید لیتا کبھی بیچ کر موٹر سائیکل پر آ جاتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کنی کتراتے تھے اور میل ملاقات سے گھبراتے تھے۔ ستی کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ اس کے خیال میں ہم دونوں ہی اچھے انسان تھے اور مسلمان ہونے کے باوجود آزاد خیال تھے۔

میں نے جب بھی اس سے معروف کے بارے میں پوچھا، ستی کو اس کی تعریف کرتے ہی پایا۔ کہتی تھی وہ ایک اچھا شوہر، ایک دردمند ساتھی اور بڑا محنتی طالب علم ہے۔ وہ پتھر کی ریلیف پلیٹیں تیار کرتا تھا اور ان پر کوفی خط میں قرآن شریف کی آیات ابھارتا تھا۔ ستی مردیاتی کے مطابق معروف ایک متمول گھرانے کا فرزند تھا اور سنا میں ان کا ایک بہت بڑا ولا تھا...... میرا خیال تھا کہ ستی یمن ہو آئی ہے اور اپنے سسرال والوں سے بری، عیدی، تحائف اور معروف کے حصے کا کچھ نقد نانواں بھی وصول کر لائی ہے لیکن یوں نہیں تھا۔ اس نے ابھی سنا کے ویو کارڈ اور اپنے سسرالی ولا کے فوٹو ہی دیکھے تھے۔

وہ اس شادی سے بہت خوش تھی اور ہر وقت معروف کا دُم چھلا بنی لنڈوری سی اس کے ساتھ گھومتی رہتی۔ میں نے کئی مرتبہ اسے معروف کے خلاف ابھارنا چاہا یا یوں کہیے اس کے دل میں معروف کے بارے میں کچھ شک و شبہ کے جالے لگانے چاہے۔ کچھ اپنی تسلی کے لیے اس سے استفسار کیے مگر وہ اپنے مقام پر جوں کی توں کھڑی رہی۔

جب ہم اپنی کسی عزیز کو اس کے سسرال کے خلاف اکساتے ہیں اور اس کی ازدواجی اور سسرالی زندگی کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتے ہیں اور وہ ہمارا ساتھ نہیں دیتی، تفریحاً بھی ہماری تنقید کا ساتھ نہیں دیتی تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ دل یہی چاہا کرتا ہے کہ ہم جس کی برائی کریں، مخاطب بھی اس میں شامل ہو۔ ہمارا ساتھ دے بلکہ بڑھ چڑھ کر ساتھ دے۔ کسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے، اس کی چغلی کھاتے ہوئے، اس کی خرابیاں بیان کرتے ہوئے اگر اپنا ہی ساتھی ہوں ہاں اور چوں چاں کر کے رہ جائے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ہمیں تو گفتگو کا مزا ہی اس وقت آتا ہے جب کھل کر بات ہو رہی ہو۔ سچ بولا جا رہا ہو اور حقیقت پسندی سے کام لیا جا رہا ہو۔ ہمارے یہاں حقیقت پسندی کسی کو لتاڑنے اور بچ کسی کو چھان پھٹک کر خراب اور بد ماننے کا نام ہے۔ ہم کہیں جمع ہو کر یونانی فلسفیوں یا مسلمان علم الکلامیوں یا ہندو ودوانوں جیسی باتیں تھوڑی کرتے ہیں، ہمارے پاس تو بس کرنے کی ایک ہی بات ہوتی ہے۔ کردار اور واقعات بدلتے رہتے ہیں، قصہ وہی چلا جاتا ہے جو کئی برس پہلے شروع کیا تھا۔ میری تو ساری زندگی اسی لیک میں گزر رہی تھی اور پہیہ باہر

نکلنے کا امکان نہ تھا۔ کبھی کبھی رُک ضرور جاتا تھا لیکن انکار کے اس گلزار سے نکل نہیں سکتا تھا۔ میرے بہت سے ساتھی ادیب اسی رنگ میں کالم لکھنے لگے تھے جس قدر کسی پر نکتہ چینی کرتے، اسی قدر ان کی تعریف ہوتی جیسے جیسے لوگوں کے جوتے پڑتے، اس سے اونچی آواز میں تالی پٹتی!

میں بڑی صدق دلی کے ساتھ ستی کو اس کے مقام سے اکھیڑتا رہا اور بالآخر اللہ کے فضل سے کامیاب ہو گیا۔ ستی نے لوگو کافی ہاؤس میں زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ معروف کا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں اور وہ اس کو ہر وقت طلاق کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔ سنا میں اس کا باپ بڑھئی ہے اور موٹی لکڑی کا کام کرتا ہے۔ اس کی دو بیویاں اور نو بچے ہیں۔ کھلے میدان میں ٹین اور کینوس کی جھگیاں بنا کر ان میں رہتے ہیں۔

میں نے کہا "تمہیں کس نے بتایا؟"

کہنے لگی "اس کا ایک دوست وہاں سے آیا تھا۔ اس نے سب کچھ بتایا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا اسے چھوڑ کر مجھ سے شادی کر لو، میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا کیونکہ سبزی منڈی میں میری آڑھت کی دکان ہے اور میں سرسبز علاقوں اور ارد گرد کے نخلستانوں سے فروٹ بھی درآمد کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہ کی؟"

کہنے لگی "اگر وہ بھی جھوٹا نکلا...... پھر؟"

میں نے کہا "پھر یا قسمت یا نصیب۔ زندگی میں ایسے ہی ہوتا ہے، یہ زندگی کوئی گھوڑی تو نہیں کہ منہ میں لگام دے کر پیٹھ پر کاٹھی ڈال کر جدھر چاہا نکل گئے۔ یہ تو زندگی ہے، اپنی مرضی کا راستہ اختیار کرے گی، اپنی مرضی کی چال چلے گی۔" پھر میں نے اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور آنسوؤں سے نمکین گال دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات مخدوش ہیں لیکن ہم سے ایک بڑی طاقت بھی تو موجود ہے جو حالات بدل دیا کرتی ہے اور کامیابی کے راستوں کو آپ ہی سامنے لے آیا کرتی ہے۔ بس ان پر قدم دھرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح جیسے اپنے تلاش کیے ہوئے راستوں پر اپنی مرضی سے چلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور قدم جمتا نہیں ہے......"

اس نے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کچھ زیادہ ہی دبا کر پوچھا۔ "میرے دن پھر سکتے ہیں؟ میری زندگی میں بہار آ سکتی ہے؟ مجھے تم جیسا شوہر مل سکتا ہے؟"

مجھے اس آخری استفسار سے بے حد خوشی ہوئی لیکن ساتھ ہی میں ڈر کر آسیب زدہ لڑکی جیسی آنکھیں پھاڑ کر منہ سے جھاگ کا گولا نکال کر بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں اگر ستی مردیاتی مجھ سے یہ کہتی تو میں چھلانگ مار کے قبول کر لیتا لیکن اب وہ مجھے ایک بوجھ سا دکھائی دے رہی تھی جیسے بھوسے کا ایک بڑا سا گٹھڑ میرے سر پر ہو اور مجھے ادھ کھلے دروازے سے گزر کر اس کی دوسری طرف جانا ہو۔

کچھ دیر تک ہم ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے اور طعنے الہنے دیتے ان وقتوں کی بات کرتے رہے جب ہم سب نئے نئے اٹلی آئے تھے اور خوشیوں کے گہوارے میں زور زور کے جھونٹے لیا کرتے تھے۔ ہمارے حلقہ احباب

میں مشرقی پاکستان کا ایک ربیع الدین اور بھی تھا جو ''چھینے چتا'' میں فلم ڈائریکشن کی تعلیم لینے آیا تھا اور تین ماہ بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن چلا گیا تھا۔ اس ربیع الدین احمد نے اٹلی آتے ہوئے عدن سے ایک گھوڑی بھی خریدی تھی جسے وہ اپنے ساتھ روم لے آیا تھا۔

ربیع الدین احمد، ویا نومن تانا ایک نئی عمارت کی چوتھی منزل میں رہتا تھا اور مشرقی پاکستان کی پراونشل گورنمنٹ کے وظیفے پر تھا۔ اس کے پاس اپنے بھی کافی پیسے تھے اور وہ ''چھینے چتا'' کی براؤن بس میں سٹوڈیو جایا کرتا تھا۔ ہمارے ساتھ چلتے چلتے وہ دونوں ہاتھوں کی دونوں انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتا اور پھر ایک وکٹری کو دوسری وکٹری کے اوپر کراس چوکور نما کھلی جھری سے آؤٹ ڈور شوٹنگ کا شاٹ بنایا کرتا۔ ہم نے بھی اس کی دیکھا دیکھی فلم شوٹنگ کا اصل معلوم کر لیا تھا اور ہم بھی راہ چلتے دستاویزی فلمیں بناتے جاتے تھے۔ اس معاملے میں فرانس کی روزیت ربیع الدین کو بہت تنگ کیا کرتی تھی۔ وہ انگلیوں کا آنکڑا بنا کر اس میں آنکھ لگانے کے بجائے اپنے سرخ سرخ ہونٹوں سے ایسی حرکت کیا کرتی تھی کہ سارے شرم کے مارے نظریں جھکا لیتے تھے اور ربیع الدین بنگالی میں گالیاں سی دینے لگ جاتا۔ روزیت فرانس سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئی تھی اور وہ ویٹی کن کے علاوہ ہماری یونیورسٹی میں تقابل ادیان کی کلاسیں بھی اٹینڈ کیا کرتی تھی۔ بڑی بدذات لڑکی تھی، کسی کو معاف ہی نہ کرتی تھی۔ مذاہب کے بارے میں اسے ایسے ایسے لطیفے یاد تھے جنہیں سن کر آدمی پانی پانی ہو جاتا تھا۔

''چھینے چتا'' میں فلم ڈائریکشن کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب پروفیسر وتوریو دے سیکا نے سٹوڈنٹس کے لیے سواری کے گھوڑے منگوائے تو ربیع الدین نے گھوڑے پر چڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھیوں، پروفیسروں، ایکٹروں اور پرانے ہدایتکاروں نے اسے سمجھایا کہ گھڑ سواری اس کورس کا ایک اہم حصہ ہے۔ جب تک ڈائریکٹر خود گھوڑے پر سوار ہو کر ان راستوں، کھیتوں، جنگلوں اور لوکیشنوں کو نہیں دیکھے گا وہ کس طرح سے وہاں شوٹنگ کر سکے گا اور کیسے اس کا شیڈول بنا سکے گا۔ اٹلی میں فلم ڈائریکٹر کے لیے ڈائریکٹر کو اعلیٰ درجے کا گھڑ سوار ہونا ضروری تھا۔ ربیع الدین احمد چونکہ گھوڑے سے بہت ڈرتا تھا، اس لیے اس نے اٹلی سے فلم ڈائریکشن کی ڈگری حاصل کرنے سے انکار کر دیا اور لندن میں داخلہ لے لیا۔

اس کے اس دردناک فیصلے کا ہم سب کو شدید رنج تھا۔ ملینا جو چیکوسلواکیہ سے فلم ڈائریکشن کی تعلیم لینے آئی تھی اور ربیع الدین احمد کی ہم جماعت تھی، اس کو اپنے ساتھی کے اس اچانک فیصلے سے بڑا دکھ ہوا۔ اس نے کئی مرتبہ گھوڑے پر چڑھ کر اور اتر کر ربیع الدین احمد کو یقین دلایا کہ یہ سب سے آسان سواری ہے اور اس میں کسی سے کچھ سیکھنا بھی نہیں پڑتا۔ بس گھوڑے کے کان میں منزل کا اور سفر کے راستے کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ باقی سارے معاملات گھوڑا خود طے کر لیتا ہے۔ گھڑ سواری کچھ بھی نہیں لیکن ربیع الدین نہ مانا اور لندن جانے کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے اپنی ٹکڑی سے ایک ماہر فن شخص کو الگ ہوتے دیکھ کر اسے سختی سے کہا ''او گدھے آدمی کیوں اتنی اچھی انسٹی ٹیوشن چھوڑ کر لندن جا رہے ہو۔ لندن میں آج تک نہ تو کوئی اچھی فلم بنی ہے اور نہ ہی آئندہ بن سکے گی، پھر تم وہاں جا کر

سے کیا حاصل کرو گے۔''

اس نے کہا ''اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے اشفاق اور میں اپنے فیصلے کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

میں نے کہا ''اور وہ تمہاری گھوڑی!''

کہنے لگا ''وہ ہے میرے پاس۔''

میں نے جھنجھلا کر کہا ''اور اس سے ڈر نہیں آتا بدبخت۔''

کہنے لگا ''بالکل نہیں...... اس میں ڈر کی کیا بات ہے۔''

میں نے کہا ''کونسی قسم کی گھوڑی ہے؟''

کہنے لگا ''ڈورس ہے۔''

''اور رنگ؟'' میں نے پوچھا۔

بولا ''گولڈن۔''

میں نے کہا ''چلو میرے ساتھ اور دکھاؤ مجھے...... تم بکواس کرتے ہو۔''

اس نے فوراً اپنے کف کا بٹن کھولا اور آستین اوپر چڑھا کر بولا ''یہ دیکھو......''

اس کی کلائی پر گولڈن رنگ کی ڈورس گھڑی بندھی تھی جو تاریخ کے علاوہ چاند کی گردش بھی دکھلاتی تھی۔

میری طرف منہ اٹھا کر اور میرا کندھا ٹھونک کر بولا ''یہ میں نے آتے ہوئے عدن کی بندرگاہ سے خریدی تھی۔ بالکل ٹھیک ٹائم دے رہی ہے۔ ایک منٹ کا بھی فرق نہیں پڑا۔''

میں نے ملینا سے کہا ''اسے لندن چلے ہی جانے دو، یہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔''

ستی مردیانی کا دل لگانے کے لیے میں نے اسے آنجلا کے حوالے کر دیا۔ ستی میں کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی کہ اس کے ساتھ دیر تک اور دور تک دوستی کی جا سکے لیکن آنجلا میں یہ صفت ضرور تھی کہ وہ ایک مرتبہ جس کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی، چھوڑتی نہیں تھی۔ جب تک دوسرا خود چھڑانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں میں ہی داب کے رکھتی تھی۔ ستی مردیانی کے ساتھ بھی اس نے خوب ساتھ نبھایا۔ وہ ہفتہ ہفتہ بھر آ کر اس کے پاس رہتی۔ اس کے کپڑے استعمال کرتی، اس کے یہاں سے کھانا کھاتی۔ نانا اس کے لیے بس کا مہینے بھر کا ٹکٹ بھی بنوا لاتا لیکن اتنی ساری آسائشوں کے باوجود ستی خوش نہیں تھی۔ اصل میں زندگی کا جب کوئی غلط فیصلہ ہو جائے تو اس کے بعد اچھے اچھے حالات بھی اس غلط فیصلے کے آسیبی سائے میں دھونے ہوئے سے رہتے ہیں۔ ستی ہم سب کو بہت ہی عزیز تھی لیکن اب ہم اس کے عزیز نہیں رہے تھے۔ وہ ہم پر شک سا کرنے لگی تھی اور کبھی کبھی رنجیدہ ہو کر تلخ باتیں بھی کر جاتی تھی۔ اصل میں اس کا محبوب خاوند اسے چھوڑ کر ایمسٹرڈیم چلا گیا تھا اور اس نے وہاں سے طلاق بھی بھجوا دی تھی لیکن ستی اس راز کو اپنے ساتھ چھپائے پھرتی تھی۔

گرمینو قصبے میں جہاں ماریو کندوتی کے شوروم کے لیے فرنیچر تیار ہوتا تھا اور جہاں بیلے ڈانسرز کی تربیت کی ایک بہت بڑی درسگاہ تھی وہاں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ گرجے کے پاس گھنی آبادی میں ایک پرانے مکان کو آگ لگی

اور دیکھتے دیکھتے سارا گھر اونچے اونچے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ ان شعلوں کے حلقے میں اردگرد کے گھر بھی پکڑے گئے اور پچھواڑے لکڑی کے ایک سٹور کو بھی آگ لگ گئی۔

لوگ گرتے پڑتے، کھانستے پکارتے، جلتے بھنتے باہر کو بھاگے اور اپنے اپنے گھروں کو شعلوں کی نذر ہوتے دیکھنے لگے۔ درمیانی گھر کی جوان عورت نے چیخنا چلانا شروع کر دیا، ہائے میرے بچے! ہائے میرے بچے! سب نے اس کا واویلا سنا لیکن کوئی بھی آگے نہ بڑھا۔ وہ اپنے دونوں بازو پھیلا پھیلا کر اپنے بچوں کو پکار رہی تھی لیکن آگ کی اس جاں سوز بھٹی میں کودنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ عورت گھٹنوں کے بل گر کر اور دونوں ہاتھ اوپر باندھ کر پاک مریم سے بچوں کو بچانے کی دعا کر رہی تھی لیکن اوپر سے بھی حکم بند ہو چکا تھا۔

قصبے کا ایک نوجوان لوچانو دارئیس جو کوئی خاص کام نہیں کرتا تھا، بس لاریوں کے اڈے پر اور چوپڑ کھیلتے لوگوں کی پھڑوں تک اور شام کو میونسپلٹی کے براس بینڈ کے چکر پر ان کے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ یہ خبر پا کر کہ گرجا محلے میں آگ لگ گئی ہے، بھاگ کر وہاں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں زیتون کی ایک موٹی سی شاخ تھی اور سر پر گڈریوں جیسی اونی ٹوپی تھی۔ اس نے اپنے جوتے اور ٹوپی اتار کر پرے پھینکی۔ سوٹی کو زمین پر آرام سے لٹایا اور جلتے ہوئے مکان کے اندر گھس گیا۔

سوا سال کا بمبینو دھوئیں اور گرمی سے گھبرایا ہوا گھٹنے چل کر باہر ڈیوڑھی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ لوچانو کے پاؤں سے ٹکرا کر زور سے چیخا تو اس نے جھک کر اسے گودی میں اٹھا لیا اور باہر لے آیا۔ گریہ زاری کرتی ہوئی عورت نے لپک کر اپنے بچے کو سینے لگا لیا اور بین کرتے ہوئے بولی "ابھی دو اور ہیں، ابھی دو اندر ہیں۔"

لوچانو دارئیس پھر پلٹا اور شعلوں کی چادر سے تنی چوکھٹ کے اندر گھس گیا۔ وہ کہتا ہے جب اندر میری سانس گھٹ گئی اور میرا گلا بالکل بند ہو گیا تو مجھے اونچے اونچے رونے کی آواز آئی۔ میں نے رونے کی طرف ہاتھ پھیلا کر دو قدم آگے بڑھائے تو میری گرفت میں وہ بارہ سالہ لڑکا آ گیا جس کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی اور وہ چلنے سے قاصر تھا۔ میں نے جلدی سے جھک کر اسے بوری طرح کندھے پر ڈالا اور جلتی ہوئی آبشار میں سے باہر آ گیا۔ لوگوں نے براوو براوو اور زندہ باد کے نعرے لگائے اور جلتے ہوئے لڑکے پر کمبل پھینک کر اسے پونی کی طرح لپیٹ دیا۔

وہ عورت اب بھی چلائے جا رہی تھی "میری بیٹی۔ میری بیٹی۔ میری چتورا۔ چتورا سا ننا۔"

لوچانو اسی پاگل پن، اسی بے ہوشی اور اسی بے خودی کے عالم میں ایک مرتبہ پھر آگ کے سمندر میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد گھوم کر دروازے سے ایک طرف ہو کر زور سے پوچھنے لگا "کدھر ہے، کس طرف ہے؟ کہاں ہے؟"

"بانیویں بانیویں" عورت چیخ کر بولی۔ "غسل خانے میں، نہانے کو داخل ہوئی تھی، پھر پتہ نہیں کیا ہوئی۔ ہائے میری چتورا۔ میری چتورا۔ چتورا سا ننا۔ چتورا بیلا۔" لوچانے نے بھی اسی طرح اونچے اونچے بلکہ بہت ہی اونچے اور بے حد گرجدار آواز میں چتورا، چتورا کہہ کر پکارا اور اسے یوں لگا جیسے چتورا اس کے جواب میں یہ کہہ رہی ہے کہ میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں...... اور میں مر رہی ہوں۔ لیکن لوچانے نے اسے مرنے نہ دیا اور اپنے انداز میں بوری کندھے پر پھینک کر باہر کو بھاگا۔

چتورا کے نیم برہنہ بدن پر پانی سے بھرا بڑا تولیہ لپٹا تھا اور اس میں سے سٹیم اٹھ رہی تھی۔ ننوں نے جو گرجے سے نکل کر وہاں جمع ہو گئی تھیں، جلدی سے چتورا کے بدن پر چادریں پھینکنا شروع کیں کیونکہ زمین پر ڈالنے سے وہ بالکل ہی برہنہ ہو گئی تھی اور گلابی سنگ مرمر کی تصویر نظر آتی تھی۔

لوگوں نے دیکھا لوچانو ایک طرف بیٹھا اپنی پتلون کا پائنچہ دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس کی سلائی ادھیڑ رہا تھا۔ اس کی دائیں پنڈلی بری طرح سے جل گئی تھی اور جلد کے نیچے سے سفید سفید چربی نکل آئی تھی۔ قصبے کے ڈاکٹر نے چلا کر کہا "ٹھہرو! ٹھہرو!! اسے ہاتھ مت لگانا، میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر اپنا فرسٹ ایڈ باکس لے کر اس کے پاس پہنچ گیا اور قینچی سے اس کی پتلون کاٹ کر لوچانو کا پنڈ چھڑانے لگا۔ آگ لگنے سے پہلے لوچانو کی سنہری رنگ کی بڑی خوبصورت اور گھنی داڑھی تھی۔ اب وہ بالکل صفاچٹ، کلین شیو بیٹھا تھا اور لوگوں کی طرف دیکھ کر شرمندگی سے مسکرا رہا تھا۔ دائیں طرف کی گال جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور ابروؤں کے صرف نشان باقی رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر نے لوگوں سے کہا "لوچانو کو سٹریچر پر ڈال کر ہسپتال لے آئیں کیونکہ اس کی مکمل مرہم پٹی ہسپتال میں ہوگی یہاں نہیں۔"

لوگ "لوچانو زندہ باد۔ لوچانو سینٹ زندہ باد اور گریمنو زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے لوچانو کو سٹریچر پر ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ جب ڈاکٹر نے اسے ٹیبل پر لٹایا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا اور اس کے بدن سے جلے ہوئے ماس کی بو آ رہی تھی۔

لوچانو کو ہر روز گلوکوز لگتا رہا۔ ٹیکے لگتے رہے۔ اس کی پٹیاں تبدیل ہوتی رہیں اور اس کے سرہانے بیٹھ کر پادری صبح و شام باقاعدگی سے انجیل مقدس کی تلاوت کرتا رہا۔

پندرہ دن بعد جب لوچانو چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور ہسپتال کے لان میں صبح و شام چہل قدمی کرنے لگا تو قصبے کے لوگوں نے سوچا کہ لوچانو کو اتنے بڑے کام پر تحفہ حسن کارکردگی ملنا چاہیے۔ چنانچہ میونسپلٹی نے اپنے شہر میں اور شہر کے باہر اس بات کا اعلان کر دیا کہ "تیئیس اکتوبر کو لوچانو کو اس کے جرأت مندانہ اقدام پر ایک تمغہ اور اس کے ساتھ ایک خصوصی سرٹیفکیٹ دیا جائے گا جس سے وہ معززین شہر کی فہرست میں داخل ہو جائے گا اور میونسپلٹی، تھانے اور کچہری میں خصوصی رویے سے نوازا جائے گا۔"

سارے قصبے نے تیئیس اکتوبر کے جشن کی تیاریاں شروع کر دیں اور لوگوں نے اپنے اپنے رشتہ داروں کو خط لکھ کر اس جشن میں شرکت کی دعوتیں بھجوا دیں۔

سکول کے عملے اور لڑکے لڑکیوں کے ذمے اس میدان کو سجانا تھا جہاں لوچانو کا فنکشن ہو رہا تھا۔ فٹ بال کی مقامی ٹیموں کو نمائش میچ کھیلنے کی خصوصی دعوت دے دی گئی تھی اور فنکشن کے شروع کے لیے گرجے کو گھنٹے بجا کر سارے علاقے کو اطلاع دینے کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔

میونسپلٹی کا میئر تین دن سے اپنی چھوٹی فیٹ پر جگہ جگہ گھوم رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ میونسپلٹی کے کارندے اپنی

روایتی کام چوری سے اس عظیم فنکشن میں کوئی نہ کوئی پھڈا ضرور ڈال دیں گے۔ کوئی کمی ضرور رہ جائے گی اور باہر سے آنے والے مہمان ہمارے شہر کے بارے میں اچھا گمان لے کر نہ جائیں گے۔ میئر نے اپنے سارے عملے کو سولی پر ٹانگ رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جو سپاسنامہ لوچانو کی شان میں لکھ کر دیا تھا، اس میں یکے بعد دیگرے تین تین بڑی تبدیلیاں کر کے میئر نے واپس ہیڈ ماسٹر کو بھجوا دیا تھا۔ انہوں نے جو نامانوس الفاظ اور مشکل تلفظ والی ترکیبیں سپاس نامہ میں ڈال دی تھیں، میئر نے ان کے نیچے نشان لگا کر تبدیل کرنے کی درخواست کر دی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب چونکہ کمیٹی کے ملازم نہیں تھے، محکمہ تعلیم کے کارندے تھے، اس لیے وہ سپاسنامہ لکھ کر دینے یا اس میں تبدیلیاں کرنے کے مکلف نہیں تھے لیکن چونکہ یہ سب ایک عظیم انسان کی پذیرائی اور کے لیے ہو رہا تھا، اس لیے سب آگے بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔

سکول کے بچوں نے بہت سی نظمیں، تین ڈرامے اور دو ٹیبلو اس مضمون پر تیار کیے تھے کہ "ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے + کام آتے ہیں جو دوسروں کے"

ضلعی اخباروں کے علاوہ ملک کے بڑے اخباروں کے نامور رپورٹر اور کالم نویس بھی اس فنکشن پر پہنچ رہے تھے۔ ان کے ٹھہرنے کے انتظام، سکول بورڈنگ ہاؤس اور گرجے کی مونٹیسری میں کر دیئے گئے تھے۔ میئر صاحب نے گیسی غباروں کے علاوہ کبوتروں کے ایک پنجرے کا انتظام بھی کر لیا تھا جو کبوتر فروشوں نے اپنی طرف سے دان کیا تھا کہ کبوتروں کے اڑ جانے کے بعد میونسپلٹی سے کسی قسم کی اجرت نہیں لی جائے گی۔

میرے بزرگ دوست ماریو کندوتی اور آنجلا کے نانا نے ہم سب کو حکم دیا تھا کہ ہم اپنے سنڈے بیسٹ میں اس فنکشن میں شمولیت کے لیے آئیں اور اپنے ساتھ پھولوں کا ایک ایک گلدستہ بھی لوچانو کو بھینٹ کرنے کے لیے لائیں۔

ہم سب وقت مقررہ پر ماریو کندوتی کے گھر جمع ہو گئے اور اس نے وہ بڑی وین سفر کے لیے نکالی جس پر اس کی لکڑی جنگل سے آتی تھی اور تیار شدہ فرنیچر روم جاتا تھا۔ اس وین کے اندر لکڑی کا ایک بہت بڑا کیبن کرین سے اٹھا کر اندر رکھ دیا جاتا تھا اور دیکھتے دیکھتے یہ وین ایک خوبصورت سفری وین میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ بیٹھنے کی سیٹیں، لیٹنے کے صوفے، چھوٹا سا غسل خانہ، فریج، کچنٹ، سامنے موسیقی کا ساگوانی ڈیک، ایک بارہ انچ سپول کا ٹیپ ریکارڈر، ایک ڈسک پلیئر، کیسٹ ابھی ایجاد ہو کر معرض وجود میں نہیں آئی تھی اس لیے میوزک ڈیک کچنٹ سے اور فریج سے بڑا تھا۔

جب ہم تیار ہو کر چلنے لگے اور آنجلا اپنی وہیل چیئر میں شیفون کا ارغوانی لباس لہراتی ہوئی آ گئی تو ستی مردیاتی نے کہا "میں اور آنجلا ساتھ ساتھ بیٹھیں گی۔" آنجلا نے کہا "سوری ڈیئر آج تم ماما، بھائی، نانا اور ابو کے ساتھ پیچھے بیٹھو گی اور میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھوں گی۔"

"اور ڈرائیو کون کرے گا؟" ماما نے پوچھا۔

تو آنجلا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کر اپنے ابو کی طرف دیکھا اور کہا "یہ چلائے گا...... پروفیسر!"

اس کے نانا نے کہا "تمہارا مطلب ہے اشفاق چلائے گا، سارا راستہ!"

آنجلا نے کہا "کیوں نہیں، راستہ ایسا کونسا لمبا ہے اور سڑک کونسی ایسی بل کھاتی ہے، یہ چلائے گا۔"

میں نے گھبرا کر اور سر کھجا کر اس کی ماں کی طرف دیکھا تو اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا "دیکھو آنجلا یہ لمبا سفر ہے۔ مختلف قسم کی گاڑی ہے۔ سٹیئرنگ بڑا ہے اور بریکیں ویکیم والی ہیں۔ اس لیے اشفاق کو بڑی دقت ہو گی...... اور پھر ہم بھی صحیح سلامت فنکشن میں پہنچنا چاہتے ہیں۔"

آنجلا نے کہا "آپ لوگ فکر نہ کریں، یہ بالکل ٹھیک گاڑی چلائے گا اور ہم کو وقت مقررہ پر پہنچا دے گا۔ میں نے اس کے ساتھ روم کی چھوٹی گلیوں اور کھلے بازاروں میں بڑے چکر لگائے ہیں۔ یہ بہت اچھا ڈرائیور ہے اور موٹر اس کی عاشق ہے...... بیٹھو بیٹھو...... جلدی کرو...... ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

ماریو کندوتی نے آنجلا کو گود میں اٹھا کر اگلی سیٹ پر بٹھا دیا اور میں بسم اللہ کہہ کر سٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگی "وہی پڑھ کر اگنیشن لگاؤ جو پڑھا کرتے ہو۔" میں نے آیت الکرسی پڑھی اور چابی گھما کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

ستی مردیاتی کو یہ سارا انداز سفر کچھ اچھا نہیں لگا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو سارا شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ گرجے کے گھنٹے بج رہے تھے۔ سرسبز لان پر کمیٹی کا براس بینڈ اونچی اور چلنت دھنیں اڑا رہا تھا۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔ اکتوبر کی خوشگوار دھوپ میں چھ سات سو اعلیٰ درجے کی نئی کرسیاں کھلے پنڈال میں پڑی تھیں۔ پنڈال کے چاروں کونوں پر گیسی غباروں کے بڑے بڑے جھنڈ مضبوط رسی سے بندھے اوپر جانے کو بے قرار تھے۔

سٹیج پر تین کرسیاں تھیں۔ ایک اس ملک کے عظیم ہیرو لوچانو کے لیے، دوسری میئر کے لیے اور تیسری گرجے کے بڑے پادری کے لیے جو رتبے کے اعتبار سے کارڈینل بھی تھا۔

جب پنڈال مہمانوں اور میزبانوں سے کھچا کھچ بھر گیا اور میئر کے حکم سے غباروں کی طنابیں کاٹ دی گئیں تو وقت کے عظیم انسان کے سامنے کبوتروں کا جال کھول کر زمین پر پھیلا دیا گیا۔ سارا آسمان دور دور تک اڑتے پرندوں سے مالا مال ہو گیا اور تماشائی گردنیں گھما گھما کر کبوتروں کا ساتھ دینے گے۔

پھر بینڈ نے ایک چلنت دھن بجا کر ڈرم پر سٹاپ بیٹ دی اور خاموش ہو گیا۔ سارا مجمع خاموش تھا، نہ کوئی حرکت کر رہا تھا نہ سانس لے رہا تھا۔ نہ اپنے وجود سے واقف تھا، بس آنکھیں بنے بیٹھے تھے۔

میئر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے، سپاسنامہ کی پہلی سطروں کو سکرول کی طرح کھولا اور مرد عظیم کو مخاطب کر کے یہ بتلانا شروع کیا کہ کوئی بھی خطہ زمین از خود کہتر یا بہتر نہیں ہوتا بلکہ اپنے لوگوں کی موجودگی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کے برگ و بار، انجم و آثار اور کہسار و جوئبار اس کے لوگ ہوتے ہیں۔ انہی کی بدولت علاقوں پر برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور انہی کی خاطر آفتاب طلوع ہو کر ساری دنیا کو منور کرتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن میں سے ایک عظیم شخص اس وقت ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس شخص نے اپنی ہمت، جرأت، جوانمردی اور اخلاص و قربانی سے اس علاقے کی نئی تاریخ لکھی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پورے عالم انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

پھر انہوں نے لوچانو کے گھرانے، اس کے آباؤ اجداد اور اس کے پرکھوں کے مختصر حالات بیان کیے۔ کسی کو کو یہ معلوم نہ تھا کہ لوچانو کے آباؤ اجداد اپنے جہاز بنا کر راولنڈوا ئکنگز (Vikings) سے لڑا کرتے تھے اور پرامن بستیوں او معصوم بحری مسافروں کو ان کے ظلم وستم سے نجات دلایا کرتے تھے...... میئر صاحب کا خطبہ کافی لمبا تھا جس میں تاریخ بھی تھی، فلسفہ بھی، اخلاقیات اور دینیات بھی اور ایک شخص کے لیے خراج عقیدت کا جذبہ بھی۔ ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی اور ہلکی پھلکی کہانیوں کا امتزاج بھی تھا۔ حاضرین بالکل بور نہیں ہوئے بلکہ بات بات پر تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے رہے۔

جب میئر اپنی تقریر ختم کر چکے تو انہوں نے کارڈینل صاحب کی طرف دیکھ کر کہا "تقدس مآب! اب اس عظیم ہستی کو تمغہ لگانے اور انہیں حسن کارکردگی کا سرٹیفکیٹ عطا کرنے کا کام آپ کا ہے۔ میں اس کے لیے ایک بہت ہی چھوٹا اور حقیر آدمی ہوں اور یہ ہستی بہت ہی عظیم، بہت ہی معزز اور بے حد معظم ہے۔ آپ ہی ان کی خدمت میں یہ حقیر سا تحفہ پیش کیجئے اور آپ ہی ان کو دعا دیجئے تاکہ ان کی وجہ سے ملی ہوا دعا اس سارے علاقے، سارے منطقے اور پورے اطالیہ پھیل جائے۔"

کارڈینل صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور میئر کی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے پہلے تو انجیل مقدس سے کچھ آیات پڑھیں۔ پھر لوچانو کو اپنے پہلو میں کھڑا کر کے لوگوں سے اس کی شان میں نعرے لگوائے۔ اس کے بعد اس کے سینے پر بہادری کا تمغہ بڑی مشکل سے لگایا کیونکہ اس کی پن نئی قسم کی ہونے کی وجہ سے کھلتی نہیں تھی اور کارڈینل صاحب کو اس کے کھولنے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔

تمغہ لگا کر اور حسن کارکردگی کی سکرول بنا کر انہوں نے آگے بڑھاتے ہوئے ایک ایسی دعا پڑھی جس میں قادر مطلق کی شان کریمی اور انسان کے دوزانو ہو کر اس کے شکر گزار ہونے کا بیان تھا۔ یہ دعا پڑھتے پڑھتے کارڈینل صاحب آبدیدہ ہو گئے اور ان پر عجیب سی رقت طاری ہو گئی۔ انہوں نے رومال نکالنے کو جب اپنے پہلو میں ہاتھ ڈالا تو اچانک اس کے اندر سے بچھو نے کاٹا۔ کارڈینل صاحب نے چیخ کر کہا "میرا بٹوہ...... میرا بٹوہ...... خواتین و حضرات کسی نے میری جیب کاٹ لی ہے، کوئی شخص پنڈال سے باہر نہ جائے۔"

مجمع میں چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں ہونے لگیں۔ سارا پنڈال بھنبھناتی مکھیوں کی آواز سے بھر گیا۔ میئر نے آگے بڑھ کر اونچی آواز میں پوچھا "پرس میں کیا تھا؟" کارڈینل صاحب نے بتایا "بیس ہزار لیرے۔ تیس امریکی ڈالر اور ایک مرصع فاؤنٹین پن۔"

کچھ لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں اور ارد گرد کے لوگوں کو تلاشی دی۔ کچھ نے سٹیج پر چڑھ کر کارڈینل صاحب کو جامہ تلاشی دینے کے لیے اپنا آپ پیش کیا لیکن بٹوہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

کارڈینل صاحب نے اپنے غمناک چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا "خیر کوئی بات نہیں۔ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ اصل چیز انسان ہے۔ وہ احسن التقویم ہے۔ اس کا نام اونچا اور اسی کی کوشش سربلند ہے۔ ہمیں ایسے نقصانات کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ یہ مادی چیزیں ہیں۔ فانی چیزیں ہیں اور ان کو ایک نہ ایک دن فنا ہونا ہے...... اب

میں اس شہر کے بطل عظیم کو وہ سرٹیفکیٹ پیش کرتا ہوں جو خاص ان کے لیے تیار کیا گیا ہے اور انہی کے لیے سنہرے لاطینی رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔"

لوچانو کو یہ سرٹیفکیٹ عطا کر کے انہوں نے اس کے دونوں گالوں پر باری باری بوسہ دیا اور اس سے ہاتھ ملا کر سٹیج سے نیچے اتر آئے۔

وہ جو ایک شیطانی صفت اور ابلیس روسو کھا سٹریل بڈھا ٹھوڑی پر دم جیسی ڈاڑھی لٹکائے اور چندھی آنکھوں کے آگے چونچ جیسی ناک نکالے بیٹھا تھا، میئر صاحب کو پکار کر بولا "انسان بھولن ہار اور خطا کار ہے ایک نظر سینور لوچانو کو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

لوگوں نے شیم شیم اور مردہ باد کے نعرے لگائے اور اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میئر صاحب بھولے بچے کی طرح منہ میں انگلی ڈالے سٹیج پر ہیرو کے ساتھ کھڑے تھے۔ سٹیج سے اترنے لگے تو انہوں نے لوچانو سے عقیدت مندانہ انداز میں مصافحہ کیا اور اس کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر پھرولا پھرولی شروع کر دی۔ لوچانو نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ میئر کی اس مجنونانہ حرکت کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔

میئر نے لوچانو کے نئے اور خوبصورت کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ایسا بٹوہ برآمد کیا جس کے اندر بیس ہزار لیرے، تیس ڈالر اور ایک مرصع فاؤنٹین پن تھا۔ کارڈینل صاحب جب اپنے دونوں ہاتھوں سے حسن کارکردگی کا تمغہ لگا رہے تھے تو موصوف بلیڈ پھیر کر ہاتھ کی صفائی دکھا چکے تھے۔

بہت سے لوگ پکار پکار کر کہہ رہے تھے "معاف کر دو، معاف کر دو کہ یہی خداوند یسوع کا حکم اور یہی عیسائیت کی ریت ہے لیکن کچھ لوگ ان کے خلاف بول رہے تھے۔" میئر نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "ہم اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ خطا کار کو اس کی سزا مل کے رہے گی۔"

وہ سپاہی جو لوچانو کے گزارنے کے لیے بڑی دیر سے تلواروں کی لمبی محراب بنائے کھڑے تھے، ان میں سے ایک سپاہی نے سٹیج پر چڑھ کر لوچانو کو ہتھکڑی لگائی اور ٹہوکا دے کر آگے چلنے کو کہا

جب لوچانو سٹیج سے اتر رہا تھا تو اس کے ہاتھ میں حسن کارکردگی کی گول کی ہوئی سند تھی اور سینے پر حسن کارکردگی کا تمغہ جھول رہا تھا۔

لوگ سر جھکائے ایک دوسرے سے نظریں ہٹائے، ہاتھ لٹکائے چپ چاپ اپنی اپنی سواریوں کی طرف جا رہے تھے۔ نہ کوئی بول رہا تھا، نہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ نہ اس احساس کے ساتھ چل رہا تھا کوئی اور بھی اس کے قریب موجود ہے۔ ہر کوئی غم کے غیر مرئی بگولے میں لپٹا دھیرے دھیرے سے قدم اٹھا رہا تھا۔ مردوں نے ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال لیے تھے، عورتوں نے ان بچوں کو گود میں اٹھا لیا تھا جو ابھی بھاگتے دوڑتے ان کے ساتھ آئے تھے۔ یہ کیسا غم تھا، کیسا دکھ تھا، کیسا کرب تھا جس نے سب کو آن واحد میں اس درجہ پریشان کر دیا تھا۔ کوئی کشتی نہیں ڈوبی تھی، کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔ دھماکہ نہیں ہوا تھا، قحط نہیں پڑا تھا لیکن سبھی لوگ ان حادثات سے بھی بڑھ کر غمگین ہو گئے تھے۔ کیا انسان کے زوال سے

لوگ اس قدر سہم جاتے ہیں۔ ایک انسان کی پستی سے سارا معاشرہ بے جان ہو جاتا ہے! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک فرد کی کم اوقاتی سارے ماحول کو شرمندہ کر دے۔

پنڈال آہستہ آہستہ لوگوں سے خالی ہو رہا تھا۔ صرف ایک کرسی پر آنجلا بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ بھی اپنی مجبوری کی وجہ سے۔ میں اس کے قریب آ گیا تو اس نے اپنی نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کچھ پوچھے بنا اس کو گود میں لا کر اس کی وہیل چیئر میں ڈالا اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔ وین کے پاس اس کا سارا کنبہ چپ چاپ اور خاموش کھڑا تھا۔

کسی سے کچھ کہے سنے بغیر ہم سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ نانا ماریو نے وین کے اندر سے درمیانی دیوار کو بجایا اور میں نے چابی گھما کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

ساٹھ میل کے لمبے راستے میں انجلا نے مجھ سے ایک بات بھی نہ کی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہاتی اور ان سے اپنا بہت ہی چھوٹا سا رومال بھگوتی مسلسل آہیں بھرتی رہی۔ اس ساری مسافت میں مجھے دو مرتبہ اس کے دو بول سنائی دیے ''ہم سبھی اپاہج ہیں۔ واقعی ہم سب لوگ اپاہج ہیں! اور یہ کہ خطرہ ہر مقام پر موجود ہوتا ہے اور آخری سانس کے آنے تک کچھ بھی ہو سکتا ہے!!''

جب میں ان کے گھر سے سنی مردیاتی کو لے کر چلا تو کسی نے ہم کو رکنے کے لیے نہ کہا۔ نہ کسی نے شام کے کھانے کی صلح ماری، نہ کل آنے کے لیے کہا!

اٹلی میں رہتے ہوئے مجھے تقریباً دو سال ہو گئے تھے لیکن اپنے قیام سے میں نے کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔ صبح سویرے یونیورسٹی جا کر طالب علموں کو سندھ اردو ریڈر پڑھانا، پھر ان کی کاپیاں دیکھنا، تلفظ ٹھیک کرنا، گھر واپس آ کر قریبی ڈھابے سے کھانا کھانا۔ پھر پتلون ذرا سی ڈھیلی کر کے نشریات کی مہم پر روانہ ہو جانا۔ ریڈیو سٹیشن پر ذرا سا اونگھنا، فارن سروس کے دوسرے اناؤنسروں سے گپ لگانا، اپنی پندرہ منٹ کی ٹرانسمیشن ختم کر کے یا گھر واپس آ جانا یا مٹر گشتی کے لیے فضول ادھر ادھر نکل جانا...... یہ تو کوئی زندگی نہیں تھی۔ اس میں تو کسی قسم کی دستیابی کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ کوئی انجام کمال کی نوید نہیں تھی۔ پھر میں کیوں خوانخواہ یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میری نوکری دیال سنگھ کالج میں پکی تھی۔ میری جگہ عوضی پر ایک اور لیکچرار کام کر رہا تھا اور مجھے آخر وہیں لوٹ کر جانا تھا اور مستقلاً اسی پیشے میں رہنا تھا۔

عام انسانی زندگی کافی بے مقصد ہوتی ہے۔ ہر کسی کو تو کوئی لگن یا کوئی دھن یا کسی قسم کا جنون یا کوئی ایسا شوق نہیں ہوتا جس کے لیے وہ اپنی ساری زندگی وقف کر دے۔ وہ لوگ تو خال خال ہوتے ہیں لیکن باقی کے لوگ صرف روٹی، کپڑا، مکان، آسائش اور خوش وقتی کے طلبگار رہتے ہیں۔ ان کے بھانویں کوئی مرے کوئی جیے ان کا پیالہ پُر رہنا چاہیے۔ ان کا وقت اچھا گزرنا چاہیے اور ان کی آسائشوں میں اضافہ ہوتے رہنا چاہیے۔ میں اس دوسری قسم کے لوگوں میں سے تھا اور میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ پیرزادہ ابراہیم حنیف میرے پے در پے سوالوں سے کبھی زچ ہوتے تھے تو ایک ہی بات

کہا کرتے ''بھیڑوں میں بھیڑ ملی رہو بھائی...... عیش کرو اور مزے لوٹو، متفاوت ہو کر مرنا ہے! اپنے بھی جی کا زیاں دوسروں کے لیے بھی موت!''

میں بھی اپنا بریف کیس اٹھائے بھیڑوں میں بھیڑ ملا دن اور رات کی گردش کے اندر مدام چل رہا تھا۔ ٹرام سے اترنا، بس پکڑنا، پیدل چلنا، لفٹ سے چڑھنا، سٹیمپ خریدنا، خط لکھنا، شیو بنانا، فون کرنا، یاروں سے ملنا، ٹھٹھے اڑانا، اچھا کھانا، مندا بولنا، پوشاکیں بدلنا، نوکری کرنا، افسروں کی خوشامد کرنا، ان کی بیویوں اور محبوباؤں کی سالگرہیں یاد رکھنا اور اپنی تنخواہ میں اضافے کی کوشش کرتے رہنا...... یہ سب کچھ کرنے کی وجہ سے میں ایک بھیڑ میں تبدیل ہو چکا تھا اور میرے وجود سے بھیڑ جیسی بو آنے لگی تھی۔ میں نے شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو وہ لاہور والی شکل نہیں تھی۔ ایک بھیڑ کا چہرہ تھا، ویسی ہی شرمندہ آنکھیں، اسی قسم کی ننناک ناک ویسے ہی گرے ہوئے سے کان۔ میں سب کچھ تھا بس بھیڑ کی طرح ممیا نہیں سکتا تھا۔

انھی دنوں روم میں یہ خبر گشت کرنے لگی تھی کہ اٹلی میں بہت جلد ٹی وی آ رہا ہے اور تفریح کی دنیا میں ایک بہت بڑے ذریعے کا اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ اس خبر پر یقین رکھتے تھے اور اس کی تصدیق کے لیے طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے تھے مگر ایک بہت بڑا سنجیدہ طبقہ اس خبر کو صحیح نہیں گردانتا تھا کہ اطالوی حکومت کے پاس اتنے فنڈز ہی نہیں کہ وہ ٹی وی جیسے منصوبے کی متحمل ہو سکے۔ ان کا خیال تھا کہ میلان ایک تجارتی شہر ہونے کی بنا پر چیمبر آف کامرس کی طرف سے آدھے خرچے کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ اس لیے وہاں تو ایک مقامی قسم کا ٹی وی سٹیشن لگ سکتا تھا لیکن سارے اطالیہ میں اس کے بوسٹروں کا جال بچھانا ممکن نہیں۔

میرا پڑوسی جورجی کہتا تھا ''پروفیسر یہ ہے تو لگژری لیکن اگر اٹلی میں کسی کی مدد امداد سے ٹی وی لگ جائے تو سارے ملک کے بھاگ جاگ اٹھیں......'' وہ اپنی مائنس کی عینک کے پیچھے سے ستر سالہ گول گول بوڑھی آنکھیں گھما کر کہتا ''اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ملک سے جہالت اور کم علمی کا روگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ کبھی بھی سکول نہ گئے لوہار، ترکھان، کنجڑے، قصائی، بھڑوے اور طوائفیں سب تعلیم یافتہ ہو جائیں گے۔''

جب میں نے جورجی کے اس بیان پر تعجب کا اظہار کیا تو اس نے میرے قریب ہو کر کہا ''ان لوگوں کو لکھنا پڑھنا تو نہیں آئے گا لیکن یہ پڑھے لکھے لوگوں جیسے آداب ضرور سیکھ لیں گے۔ ہر قسم کی معلومات اکٹھی کریں گے اور سائنسی موضوعات پر بلا تکان گفتگو کر سکیں گے...... علم ہوتا ہی کیا ہے......'' میں کافی دیر اس کا فقرہ مکمل کرنے کے انتظار میں بیٹھا رہا لیکن جب وہ اپنے تمباکو کی نئی چٹکی چبانے لگا تو میں نے پوچھا ''سینوز جورجی علم کیا ہوتا ہے؟''

کہنے لگا ''لو حد ہو گئی۔ کمال ہے بھئی ایک پروفیسر مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ علم کیا ہوتا ہے۔ یہ تو بچے بچے کو معلوم ہے پروفیسر کہ علم گفتگو کا نام ہے۔ جس کو گفتگو آ گئی، اچھی اور رواں گفتگو آ گئی، بلا جھجک اور بے تکان بولنا آ گیا وہ صاحب علم ہے۔'' پھر اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور میری کلائی پکڑ کر بولا ''کبھی وکیلوں کو عدالت میں دیکھا ہے؟ فلموں کے سین میں، سٹیج پر...... کلاس روم میں، بس وہ جو کچھ بول رہے ہوتے ہیں، وہ علم ہوتا ہے۔''

میں نے کہا "صرف بولنا؟"

کہنے لگا "صرف بولنا...... بے تکان بولنا اور بلا جھجک بولنا علم ہوتا ہے۔ اگر کبھی ٹیلی ویژن آ گیا تو تم دیکھو گے کہ یہاں کا بچہ بچہ بولنے لگے گا۔ ڈائیلاگ ڈیلیوری کرے گا اور ہر شخص زیورِ علم سے آراستہ ہو جائے گا لیکن حکومت کے پاس پیسہ نہیں۔" اس نے بائیں ہاتھ کا چلو اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے انگوٹھا چلو میں جھٹکاتے ہوئے کہا "یہ سیاستدان سب کھاؤ یار ہیں۔ سارا مال اُڑا جاتے ہیں۔ عیش کرتے ہیں اور غریبوں کا خون کیانتی سمجھ کر پی جاتے ہیں۔ شکر کرو اٹالین نہیں ہو، تمہارے باپ دادا نے ضرور کوئی نیک کام کیے ہوں گے جو تم نے اٹلی میں جنم نہیں لیا۔ ہم تو سور لوگ ہیں اور سوروں کے حکمران مہا سور! شکر کیا کرو اور جب بھی کھڑکی کھلے پوپ کے درشن کیا کرو۔"

فیوریتی کی دکان پر رینا تا اکثر کہا کرتی تھی "اٹلی میں ٹیلی ویژن نہیں آنا...... آیا بھی تو کم از کم ہماری زندگی بھر نہیں آنا۔ ان وزیروں سفیروں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ ان کو کسی کیا پروا۔ کوئی مرے کوئی جیے۔ کسی کا جنازہ اٹھے یا آخری منڈیر پر قبر بنے، ان کو تو اپنی عیاشیوں سے غرض ہے، عوام کی کوئی فکر نہیں۔"

ٹیلی ویژن کی آمد کی بات تو بعد میں کریں گے۔ پہلے منڈیر پر قبر کی وضاحت کر دوں کہ اٹلی کے بڑے گنجان اور پرہجوم شہروں میں قبرستان زمین پر پھیلے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ دیواروں کی صورت منزل در منزل اوپر کو اٹھتے جاتے ہیں...... لمبی لمبی فصیل نما دیواریں سات آٹھ فٹ چوڑی اور آدھی آدھی فرلانگ بھی ہوتی ہیں۔ آپ نے دیوار چین کی تصویر دیکھی ہوگی۔ بس اس کی چوڑائی ذہن میں رکھ لیجیے اور اس کا دیوار ہونا سوچ لیجیے۔ بس اس کی لمبائی چھوڑ دیجیے۔

ان سات آٹھ فٹ چوڑی فصیلوں میں ڈھائی فٹ مربع کے مستطیل خانے ہوتے ہیں جن میں میت کو ایک ہارڈ بورڈ پر لٹا کر اندر دھکیل دیا جاتا ہے اور خانے کا منہ سنگ مرمر کی سلیب سے بند کر دیا جاتا ہے۔ اس سلیب کو مضبوطی سے بند کرنے کے لیے بہت ہی اعلیٰ درجے کا مسالا استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قبر کے مرمریں ڈھکنے کو سیسہ پلا کر بند کیا گیا ہو۔ اندر کی دنیا اندر، باہر کی باہر، کوئی تال میل ہی نہیں رہتا۔ ہر سلیب کے باہر آگے کو بڑھے ہوئے دو دو تین تین انچ کے چھوٹے چھوٹے کارنس ہوتے ہیں جن کے سوراخوں میں ایک طرف اگربتیاں کھڑی کی جا سکتی ہیں اور دوسری طرف پھولوں کی ڈنڈیاں، پھولوں والے سوراخ کھلے اور اگربتیوں والے تنگ ہوتے ہیں۔ ہر سلیب کے اوپر بہت موٹے حروف میں قبر کا نمبر ہوتا ہے بلکہ ایسا جیسے گاڑی کی نمبر پلیٹ ہوتی ہے اور ساتھ اگر کسی نے خصوصی رقم خرچ کی ہوتی تو مردے کا نام بھی لکھا ہوتا۔

ان دیواروں میں زمین کے ساتھ کی سب سے نچلی قطار یعنی گراؤنڈ فلور کی قبریں سب سے مہنگی ہوتی ہیں اور جوں جوں خانے اوپر چڑھتے جاتے ہیں قبریں سستی ہوتی جاتی ہیں۔ چودھویں، پندرھویں منزل کی قبریں جنہیں زمین سے دیکھتے ہوئے ٹوپی گرتی تھی، کافی سستی ہوتیں جن میں غریب غربا اپنے مردے دفن کرتے تھے۔ یہ قبریں تو سستی تھیں لیکن ان میں "مردہ چڑھائی" کی فیس کافی تھی۔ ایک خصوصی کرین کے ساتھ میت اوپر اٹھائی جاتی اور اس کرین کے اندر سے ایک دھکیلو نکل کر مردے کو اس کے مطلوبہ موکھے میں آرام سے دھکیل دیتا۔ جیسے بندوق میں کارتوس فٹ ہو جاتا ہے

اور پھر یہی کرین نیچے اتر کر قبرستان کے معمار کو بمعہ سنگ مرمر کی نمبر پلیٹ کے اوپر لے جاتا اور مستری فٹافٹ موکھے کا منہ ابدی طور پر بند کر کے نیچے اتر آتا۔ قبر تو سستی تھی لیکن کرین کا کرایہ کافی تھا۔

سارا قبرستان، پھولوں، روشوں، سرسبز پودوں اور گھنے درختوں کے اندر واقع ہے۔ کوئی بارہ تیرہ آدھ آدھ فرلانگ لمبی دیواریں ایک دوسری کے متوازی کھڑی ہیں۔ ہر دیوار کے دونوں طرف چھ فٹ موٹا، سیاہ رنگ میں دیوار کا نمبر لکھا ہے کہ بہت اونچے اُڑتے ہوائی جہاز سے بھی نظر آتا ہے اور ہر دیوار کے سنگین درازوں میں ایک ایک مردہ دفن ہے۔ ہر دیوار میں بیس بائیس ہزار مردے ابدی نیند سو رہے ہیں اور ہر ایک کے باہر اس کی نمبر پلیٹ لگی ہے۔

میری استانی روزیتا جو مجھ سے عمر میں نو سال بڑی تھیں اور جن سے میں اطالوی گرامر اور بنیادی لاطینی کے ہفتہ میں ایک دن چھوڑ کر تین دن درس لیتا تھا، صرف میری زباندانی ہی کی استاد نہیں تھیں بلکہ مجھے اطالوی تہذیب، رومن اطوار اور عیسائی مذہب سکھانے پر بھی کاربند تھیں۔ یہ ذمہ داری انہوں نے خود ہی اپنے ذمے لے لی تھی اور وہ ہر دسویں پندرھویں مجھے اپنے ساتھ بس پر، ٹرام پر یا ٹرالی میں لے نکلتی تھیں اور مجھے اپنی تہذیب سے روشناس کراتی تھیں۔ وہ پکی رومن کیتھولک، بے حد شرعی، نہایت کم آمیز اور اپنے اصولوں کی بڑی پکی خاتون تھیں۔ میرے ساتھ چلنے پھرنے، گھومنے گھمانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ میں بھی ایک پکا مذہبی، سخت وہابی، اخلاق گزیدہ اور کٹر نوجوان تھا۔ سینور ینا روزیتا کو ہر ہفتے باقاعدگی سے ان کی فیس ادا کرنے اور ان کے ساتھ استادی شاگردی کے رشتے سے آزادانہ گھومنے، انہیں بس سے یا ٹرام سے ہاتھ پکڑ کر اتارنے، پھسلنی جگہ پر انہیں اپنا بازو پیش کرنے، گرجے پر لے جاتے وقت ان کے دونوں ہاتھ تھام کر دعا کی درخواست کرنے سے سینور ینا میں اصولوں کی سختی نہیں رہی تھی اور میں بھی اپنا وہابی پن چھوڑ چکا تھا۔ انسان کو اتنا بھی پابندِ حجاب اور رہینِ شرح و تشریفات نہیں ہونا چاہیے۔ انسان تو خدا کی کھلی عبادت کے لیے پیدا ہوا ہے۔

استانی صاحبہ نے ایک روز مجھے ایک نئی مہم پر لے جاتے ہوئے لفٹ میں کہا "مجھے محترمہ استانی صاحبہ یا سینورنا کہنے کے بجائے صرف روزیتا کہا کرو۔ اس سے اجنبیت نہیں رہتی۔ پھر روم کے لوگ اس اندازِ تخاطب کو پسند کرتے ہیں اور خود مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ ہمارے درمیان تکلف کی فضا باقی رہے۔"

میں اس اعترافِ محبت پر خوش تو ضرور ہوا لیکن ایک دم سے اس پر عمل کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ اب تک کی استانی کو ایک دم سے روزیتا کہنا شروع کر دینا کافی مشکل تھا۔ میں نے ان سے اس تبدیلی مخرج کے لیے چند دن کی مہلت طلب کر لی کہ جونہی میرا اجھاکا دور ہو جائے گا، میں تم کو روزیتا کہنے لگوں گا۔ اس نے بڑی خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دی اور بتایا کہ آج میں تمہیں روم کے قبرستان لے جا رہی ہوں جہاں میری والدہ کی قبر ہے اور جہاں مجھے اس کی مغفرت اور آسائشِ ابدی کی دعا مانگنی ہے۔

جب ہم قبرستان پہنچے تو وہاں مرد، عورتوں، بچوں کا ایک میلہ سا لگا تھا۔ کوئی مذہبی تہوار تھا اور بے شمار لوگ اپنے اپنے عزیزوں کی قبروں پر دعا مانگنے آئے تھے۔

سینور ینا روزیتا نے پہلے مجھے قبرستان کا ایک جنرل ویو دیا۔ مرجانے فنا ہونے اور اگلی دنیا بسانے پر مذہبی اور

سیکولر تصورات اور عقائد سے روشناس کرایا۔ پھر اس خصوصی قبرستان کا برڈز آئی ویو پیش کیا کہ زمین کی تنگی اور جگہ کی کمی کے باعث مردوں کو دفن کرنے کا یہ قابل احترام طریقہ دریافت کیا گیا۔ اس میں عقیدت اور محبت دونوں جذبے شامل ہیں۔ پھر پوپ سے اس کی اجازت لے کر شرعی جواز حاصل کیا گیا۔ کچھ لوگ اس کے مخالف رہے اور اپنے مردے دور دراز قصبوں اور گاؤں میں جا کر دفن کرتے رہے لیکن یہ طریقہ چونکہ زیادہ پریکٹیکل اور آسان تھا، اس لیے تنگ نظر اور بنیاد پرست مذہبی جنونیوں کا گروہ ہار گیا اور وہ بھی اسی قبرستان میں اپنے مردے دفن کرنے لگے۔

میں نے کہا "سینورینا یہ دفن کرنا تو نہیں، یہ تو دراز میں بند کرنا ہے۔ اس کے لیے کوئی نیا مصدر وضع کرنا چاہیے۔"

کہنے لگیں "یہ دفن کرنا ہی ہے اور اس کو شرعی طور پر دفن کرنا ہی کہا جائے گا...... وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ دین میں اجتہاد کرنا ضروری ہے۔ مناسب اور بروقت اجتہاد نہیں ہوگا تو دین کمزور ہو کر ختم ہو جائے گا۔" پھر انہوں نے مجھے اجتہاد کے معنی سمجھائے اور اس فلسفے پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہوئے میرے سارے شکوک کے شافی جواب عنایت فرمائے۔

اتنے میں قبرستان کا کارکن مضبوط بانس کی ایک لمبی سی سیڑھی لے آیا اور سینورینا سے قبر کا نمبر پوچھنے لگا۔ جب میڈم نے اسے چودہ ہزار تین سو بہتر بتایا تو ان کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ یہ میری استانی کی ماں کی قبر تھی۔ شاگرد ہونے کے رشتے سے میں بھی آبدیدہ ہو گیا اور منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا تا کہ ان کو یقین ہو جائے کہ میں بھی ان کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

جب میڈم نے سیڑھی والے سے ٹوکن رسید لے کر اسے ہزار لیرے سیڑھی کا کرایہ دیا اور سیڑھی والے نے ٹھیک مقام پر سیڑھی لگا دی تو میڈم دعاؤں کی چھوٹی کتاب اور تین پھولوں کا گلدستہ لے کر سیڑھی پر چڑھ گئیں۔

دسویں منزل پر میری استانی کی والدہ کی قبر تھی۔ انہوں نے پہلے تو تینوں پھول چھوٹے طاقچے کے بڑے سوراخوں میں لگائے، پھر دعاؤں کی کتاب کھول کر جلدی جلدی دعائیں پڑھنے لگیں۔ ان کے ساتھ ہی ذرا نیچے نویں قطار میں ایک جھکی سا بڈھا، ڈاڑھی بڑھائے، بڑے سے سر پر چھوٹی ٹوپی پھنسائے، اپنی بیوی کی نمبر پلیٹ سے ماتھا لگائے کسی انجیل یا دعاؤں کی کتاب کے بغیر زبانی کچھ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دعاؤں کی یا مغفرت کی التجاؤں کی نرمی نہیں تھی بلکہ ایک جھٹکے دار غصہ تھا جو ہر مکالمے کی ادائیگی کے بعد اور شدید ہو جاتا تھا۔ مجھے اس کی آواز تو کیا سنائی دیتی کہ وہ بہت دور تھا اور کافی بلندی پر تھا لیکن مجھے صاف پتہ چل رہا تھا کہ مرنے والی پر طعنوں، الہنوں، بددعاؤں کے کوڑے برسا رہا ہے۔

بڈھا کہہ رہا تھا "مر جا! مر جا!! دفع ہو جا۔ چلی جا اپنے یاروں کے پاس مجھے بھیڑیوں اور کتوں کے پاس چھوڑ کر...... آئے ہائے ہائے میں اپنے بابا پاس جاؤں گی۔ اپنی ماں پاس جاؤں گی۔ اب میرا وقت آ گیا ہے، اب دوا دارو ختم کر دو...... اوئے وقت کی بچی۔ دوا دارو کی ٹھونگی۔ پھوکی جھونگی۔ وہاں کون تیرے یار بیٹھے تھے جو میری ڈھوئی پر لات مار کر چلی گئی۔ اب سنبھال ان کو۔ روک کے دکھا...... سامنے آ کے بتا، مجھے میرے ہی گھر سے نکال رہے ہیں۔ دونوں بیٹے ایک ساتھ مل گئے ہیں۔ دونوں بہوؤں نے بارہ سال بعد صلح کر لی ہے اور میرے خلاف ایکا کر لیا ہے اور وہ جو چھوٹی کا میکہ ہے، اس نے عدالت میں عرضی بھی دیدی ہے کہ گھر اصل میں بیٹوں کا ہے...... ہت تیری...... کتی...... مردار...... سوُر کی بچی...... مر جا مر جا، چھوڑ جا بڈھے کو پوتے کار لوپل کے نیچے ایڑیاں رگڑنے کو ہڈیاں جلانے کو...... سن لے سوُر کی بچی، دو بر چھوں کی ماں، ڈائین بے وفا، میں بھی اگر کیڑے پڑ کر نہ مرا تو میرا بھی نام روبیر تو نہیں...... تجھ سے پوچھ لوں گا۔ سمجھ لوں گا، چھوڑوں گا تو نہیں۔ مجھ سے استادی کر کے یہاں آ گئی۔ مر جا! مر جا!! دفع ہو جا...... جلتی جا، جہنم میں تپتی جا، بلتی جا...... ہت تیرا ستیاناس جائے...... دھوکے باز...... جعل ساز...... فریبی عورت......"

یہ جھکی بڈھا جب سیڑھی سے اتر کر میرے قریب سے گزرا تب بھی اسی طرح تڑپ تڑپ کے بڑھیا کو جھاڑ پلا رہا تھا اور اس کو گالیاں دے رہا تھا۔ پھر جب میری استانی واپس سیڑھی سے اتریں میں تو انہوں نے بھی یہی شکایت کی کہ اس بڈھے نے ساری توجہ اور سارا خشوع ہلا کے رکھ دیا، پتہ نہیں میری کوئی دعا میری ماں کو پہنچی بھی یا نہیں۔

میں نے کہا "میڈم آپ فکر نہ کریں، کسی روز میں خود یہاں آ کر عقیدت کے پھول آپ کی والدہ کی خدمت میں پیش کروں گا اور ان کے لیے صمیم قلب سے دعا کروں گا...... آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے!"

روزتیا نے محبت کے ساتھ میرا ہاتھ دبایا اور بڑی دیر تک اسے اسی طرح سے پکڑے رکھا۔

جب ہم گھر واپس آ رہے تھے تو میڈم نے بس کی ساری سواریوں کے سامنے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہوئی تھیں۔

مجھے اچھا تو بہت لگا لیکن ساتھ شرم بھی آتی رہی۔ میں نے کسی سے آنکھ ہی نہیں ملائی۔ بس کے باہر ہی دیکھتا رہا۔

کوئی ایک ہفتہ بعد ہمارے یہاں اچانک ایک چھٹی آ گئی۔ شام کی ٹرانسمیشن ایک فوری منصوبے کے لیے مخصوص ہو گئی اور ہمارا سارا دن فری ہو گیا۔ میں بریف کیس کے بغیر سر پر جوکیوں والی ٹوپی اوڑھے اپنی میڈم کے گھر گیا اور ان سے ہاتھ ملا کر یہ اطلاع دی کہ آج میں فارغ ہوں اور آپ کی والدہ کی قبر پر جا کر دعا کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کا قبر نمبر بتا دیجئے اور ساتھ ہی دعا کی عبارت دے دیجئے۔

روزیتا نے کہا "ٹھہرو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

میں نے کہا "اس طرح سے تو میری محبت اور عقیدت میں فرق آ جائے گا۔ میں اکیلا ہی جانا چاہتا ہوں اور اکیلا ہی جاؤں گا۔"

وہ میری اس سپردگی اور میرے اس عزم سے بہت خوش ہوئیں اور بولیں "ماما کا قبر نمبر کاغذ پر لکھ لو وہاں جا کر اونی گلدستہ مل جاتا ہے۔"

میں نے کہا "حد کرتی ہیں آپ۔ ماما کا نمبر اور میں بھول جاؤں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے! آخر میرا بھی تو کوئی رشتہ ہے۔"

انہوں نے خوش ہو کر کہا "توجہ سے سنو...... دیوار نمبر سات...... قبر نمبر چھ کے بعد آٹھ ہے اور اس کے ساتھ ذرا کنارے بھی، پیچھے کو ہٹی ہوئی سات ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو پتھر پر لکیر ہو گئی۔ اس کو تو ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اب یہ بتائیے کہ مجھے وہاں جا کر پڑھنا کیا ہے؟"

انہوں نے کہا "کچھ بھی پڑھ دو، دعاؤں کی کتاب ہے۔ بائبل ہے۔ تسبیح پر گنتی ہے۔ جو بھی تمہیں پسند آئے

پڑھ دو۔ ہر نیک عمل اور نیک تمنا مردے کو پہنچ جاتی ہے۔''

میں اپنی استانی کے کندھے اور کمر پر عقیدت کا لمبا سا ہاتھ ڈال کر ان سے رخصت لے کر واقعی قبرستان چلا گیا۔ وہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں وقف کی ہوئی چھوٹی بڑی بے شمار انجیلیں پڑی تھیں، میں نے چرمی جلد کی ایک چھوٹی سی بائبل لے لی اور سیڑھی والے سے آٹھ نمبر کی دیوار پر چلنے کو کہا۔

آج رش کچھ زیادہ نہیں تھا۔ کم کم لوگ تھے۔ پھول والے اور اگربتی والے بھی کم تھے۔ ایک بڑے سے درخت کی اوٹ میں تین پادری لوڈو کھیل رہے تھے۔ جب سیڑھی والے نے آٹھ نمبر کی دیوار کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے قبر نمبر مانگا تو میں ششش و پنج میں پڑ گیا۔ میڈم نے آٹھ نمبر کی دیوار کہا تھا یا سات نمبر کی دیوار...... انہوں نے کہا کہ تھا چھ کے بعد آٹھ آتی ہے اور وہ ذرا ٹیڑھی سی ہے...... تو یہاں تو سات پیچھے کو ہٹی ہوئی ہے اور وہ ترچھی سی ہے۔ یقین ہو گیا کہ آٹھ نمبر دیوار ہی کہا تھا۔ اب اس دیوار میں درمیان سے ذرا آگے وہی قبر تھی جہاں میڈم دعائے مغفرت کر کے گئی تھیں......

میں سیڑھی پر چڑھا، ماما کے لیے اگربتی سلگا کر پتھر کے سوراخ میں اتاری اور کرنتھیوں کا باب لے کر پڑھنے لگا۔ کرنتھیوں کا باب مجھے ساری بائبل میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ میں نے اسے اتنی مرتبہ پڑھا ہے کہ اس کا پہلا ڈیڑھ صفحہ مجھے زبانی یاد ہو گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی دعا کو ڈیڑھ صفحے پر ہی ختم کر دیا اور سیڑھی سے نیچے اتر آیا۔

قبرستان کے باہر ایک ٹھیلے والا آئس کریم بیچ رہا تھا۔ اس سے تنکے پر لگی ہوئی ایک لولی آئس کریم خریدی۔ قریبی بنچ پر بیٹھ کر کھائی اور جب فارغ ہو گیا تو سوچنے لگا کہ ابھی استانی کے پاس جاؤں یا کل شام! کاہلی اور لاتعلقی نے کہا، کل چلے جانا یا پرسوں اترسوں جا کر رپورٹ بول دینا لیکن عقل نے رائے دی کہ آج ہی ٹھیک ہے، بلکہ ابھی اور اسی وقت مناسب ہے۔

جب میں نے لفٹ سے نکل کر اپنی استانی کے گھر کی گھنٹی بجائی تو اندر سے اس کا تایا نکلا جو نیچے تراتوریا میں شطرنج کھیلنے جا رہا تھا۔ میں نے بڑے تپاک سے اس کو سلام کیا، مگر اس نے میرے سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ شطرنج کی دھن میں اس نے اتنا بھی نہ سوچا کہ کوئی دروازے پر کھڑا ہے۔ جس نے ابھی گھنٹی بجائی تھی اور جس کے جواب میں آپ نے دروازہ کھولا تھا اور جس نے آپ کو بڑے خلوص اور نیازمندی کے ساتھ سلام کیا تھا لیکن وہ اس وقت شطرنج کے نشے میں دھت تھا۔ اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ لفٹ سامنے موجود ہے اور نیچے جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ اس نے آٹھویں منزل سے سیڑھیاں اترنا شروع کیں اور بڑی دیر تک مجھے سیڑھیوں کے اندر گھومتا ہوا نیچے جاتا نظر آتا رہا۔

میں نے دوبارہ گھنٹی بجائی تو میری استانی لمبا سا فرغل پہنے، ہاتھ میں انڈا اپھینٹنے والا اسپرنگ اٹھائے مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ اس نے صوفے کی طرف ہاتھ پھیلا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں نے کہا ''سوری میڈم! اس وقت میں جلدی میں ہوں، کل آؤں گا اور تفصیل سے آپ کے ساتھ باتیں کروں گا۔ اب تو میں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ اس وقت سیدھا قبرستان سے آ رہا ہوں اور آپ کی والدہ کے سرہانے اگربتی سلگا کر اور کلام پڑھ کر ابھی ابھی سیڑھی سے اترا ہوں۔''

اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اسے دبایا اور بڑی گل پاشیوں کے ساتھ بڑا شکریہ ادا کرنے لگی۔

میں نے کہا ''آپ کی والدہ کی لحد کے سامنے مجھ پر ایک عجیب سی روحانی کیفیت طاری ہوئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس دنیا کا باشندہ نہیں ہوں، کسی اور ہی سیارے سے آیا ہوں اور کچھ اور ہی قسم کی مخلوق ہوں۔''

انہوں نے کہا ''اصل میں میری والدہ ایک بہت بڑی سینٹ تھیں اور ان پر کشف کا عالم ہر وقت طاری رہتا تھا...... وہ ہر آنے جانے والے شخص کے آر پار دیکھ لیتی تھیں اور اس کی کیفیت اور اس کے مزاج کے مطابق بات کرتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیا۔''

میں نے کہا ''بڑے بزرگوں اور روحانیت کے صحیح عاملوں کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنا آپ کبھی بھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ لوگ ہمیشہ دبدھا میں رہتے ہیں کہ ہیں یا نہیں ہیں۔ کوئی چمکتار دکھائیں گے یا ایسے ہی ٹرخا دیں گے۔''

لیکن انہوں نے میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر جلدی سے پوچھا ''اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے انجیل مقدس کا کون سا حصہ پڑھا تھا اور کس قدر پڑھا تھا؟''

میں نے کہا ''مس! میں نے کرنتھیوں کا باب پڑھا تھا اور تقریباً آدھے سے بھی زیادہ پڑھ گیا تھا۔''

وہ میری بات سن کر بہت خوش ہوئیں اور یونہی بے دھیانی میں بولیں ''نمبر یاد رہا تھا کہ حسب عادت بھول گئے تھے؟''

میں نے کہا ''کمال کرتی ہیں مس آپ کی والدہ کی تربت شریف اور مجھے اس کا نمبر یاد نہ رہے۔ وہ تو میرے دل پر لکھا ہوا ہے...... دیوار نمبر آٹھ، قبر نمبر...... اور منزل نمبر گیارہ!''

روز تیا نے اپنے پورے ہاتھ کا طمانچہ میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا ''گدھے یہ میری والدہ کا لحد نمبر ہے! تم سے کہا نہیں تھا کہ لکھ لو، بھول جاؤ گے لیکن تم نے کوئی پروا نہیں کی۔''

ویسے تو وہ میری ٹیچر تھیں، مار سکتی تھیں لیکن مجھے اس تھپڑ کا دکھ اس لیے ہوا کہ تین چار روز پیشتر ہم نے ایک دوسرے سے گھٹ گھٹ کر جپھیاں ڈالی تھیں اور ہم عنقریب کافی بے تکلف ہونے والے تھے۔

میں چپ چاپ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا حالانکہ لفٹ کی ڈولی نیچے جانے کے لیے موجود کھڑی تھیں۔

رہ رہ کر مجھے اپنے بچپن کا وہ دن یاد آ رہا تھا جب ہماری جمعدارنی نے اماں سے کہا تھا کہ بڑے تھانیدار نے جو صندلال کنجری حویلی میں رکھی ہوئی ہے، بڑی ٹھسے دار بیگموں کی طرح رہتی ہے اور اس نے تھانیدار کی بیوی کو گھر سے نکلوا کر اس کے میکے بھجوا دیا ہے۔

اماں نے کہا ''تو پھر میں کیا کروں؟''

بے بے جمعدارنی نے کہا ''کرنا کیا ہے بی بی وہ تو بڑی منہ زور ہے۔ کسی کی پروا ہی نہیں کرتی۔ تھانیدار کی گھوڑی پر جو سائیس ملازم ہے، رتو کالیا، اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔''

''کون؟'' اماں نے چونک کر پوچھا ''صندلال کنجری!''

''تو اور کون بی بی؟'' لالو جمعدارنی نے کہا ''میں خود پکی آگاہ ہوں اس کی۔ کئی بار تو میں نے دیکھا۔''

اماں نے کہا" چل دفع کر، ہم کو کیا لینا ہے کسی کے عملوں سے۔ وہ جانے اور اس کا رب جانے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بی بی" جمعدارنی نے کہا" ہمیں کسی کے اندر باہر سے کیا۔ جس کا بھید اس کے رب نے چھپایا ہے، تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی چھپایا ہے ناں۔ اس کی بات نہیں ہے۔ بات دوسری ہے!"

"دوسری کونسی!" اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دوسری بات یہ بی بی کہ صنداں سجاؤ کی گرم اور دل کی کھوٹی ہے۔ کوئی دید لحاظ نہیں ہے اس میں۔ بندے کو اس طرح تو نہیں کرنا چاہیے ناں۔"

اماں نے کہا" کیا کیا ہے اس دل کی کھوٹی نے؟"

بے بے جمعدارنی نے کہا" لے سن لے میرے سامنے کی بات۔ صنداں نے رتو کا لے سے پنجیری کا سامان منگایا تو وہ شہدا کھمیس پنساری سے ایک ایک شے چھنا تک بھر لایا...... صنداں نے پڑیاں کھول کر کہا، کمر کس اور کیکر گوند کم ہے۔ پا یہ پایہ تو نہیں، رتو نے کہا، پورا ہے بی بی آپ تلوا کے دیکھ لیں تو کڑک کے بولی میں جھوٹ کہتی ہوں گدھے کے بچے! اور تاڑ سے اس کے منہ پر چپیڑ ماری۔ ہائے بی بی کوئی بندے بشر کا مان آدر کرنا چاہیے۔ پھر ایسے بندے کا جس کو میں نے سو دفعہ دیکھا کہ ایک دوسرے کو گھٹ گھٹ کے جپھیاں ڈال رہے ہیں۔ رتو اور صنداں۔"

پتہ نہیں اس رات مجھے روم جیسے شہر میں صنداں کنجری کیوں یاد آنے لگی حالانکہ میں نے اس کو اپنے بچپن میں دیکھا تھا اور اب اس کی شکل وصورت بھی یاد نہ رہی تھی۔

اٹلی میں ٹیلی ویژن کے آنے کی خبر پر سارے ملک میں خیال آرائیاں ہو رہی تھیں اور ریناتا دھوبن کہہ رہی تھی کہ اٹلی میں ٹیلی ویژن نہیں آتا۔ آیا تو کم از کم ہماری زندگی میں نہیں آتا۔ ان وزیروں سفیروں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ کوئی مرے کوئی جئے، کسی کا جنازہ اٹھے یا آخری منڈیر پر قبر بنے ان کو تو اپنی عیاشیوں سے غرض ہے۔ عوام کی کوئی فکر نہیں...... اور اب یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ فصیل کی سب سے اوپر کی منڈیر پر قبریں سستی ہوتی ہیں اور غریب لوگوں کی ہوتی ہیں۔ میری استانی کی والدہ کی قبر بھی دیوار میں کافی اونچی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو اشرافیہ میں داخل سمجھتی تھیں اور کسی کو اپنی والدہ کی قبر کا پتہ نہیں دیتی تھیں۔

فیورجی کے کیفے کے عین سامنے دواؤں کی دکان تھی۔ اس کا مالک بڈھا یہودی ڈینئل بڑا گنی آدمی تھا۔ اس کو مشکل اور چالاک مچھلی پکڑنے سے لے کر معصوم اور سادہ لوح لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانے کے کئی طریقے آتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ چالاک اور مکار لڑکی کو پھنسا لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا بھولی بھالی اور معصوم لڑکی کو۔ بھولی بھالی اور معصوم لڑکی دام محبت میں پھنسے بغیر ہی اس کا اعلان کر کے سارا معاملہ کھنڈت میں ڈال دیتی ہے۔ اس کو چھپانے، ورغلانے، بات بتانے اور اڑان گھائیاں بتانے کا فن نہیں آتا۔ وہ راہ شوق طے کیے بغیر منزل پر پہنچنے کا اعلان کر دیتی ہے۔ اسی لیے مرد ہمیشہ خرانٹ، مکار، بے شرم اور دغاباز عورتوں کو پسند کیا کرتے ہیں۔

سینور ڈینئل کا خیال تھا کہ ٹی وی اٹلی میں آئے گا ضرور کہ اس کے بغیر معاشرتی زندگی کا ایک حصہ مکمل نہیں ہوتا

لیکن ذرا دیر لگے گی۔ ویسے اس نے اپنی دکان کا ایک کاؤنٹر ابھی سے آلٹر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں وہ دوائیوں کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن سیٹ بیچنے کا منصوبہ بھی بنائے بیٹھا تھا۔ جو کوئی اس سے اس تبدیل شدہ کاؤنٹر کی بابت دریافت کرتا تو وہ یہی کہتا کہ یہاں وہ ایسی قدیم دواؤں کا کاؤنٹر کھول رہا ہے جن کا ذکر بائبل میں اور دوسری پرانی مقدس کتابوں میں آتا ہے۔

میرے ساتھ ڈینئل کا رشتہ بڑا گہرا، جذباتی اور روحانی تھا۔ جب میں اسے ہاتھ لہرا کر اپنے سکوٹر سے سلام کرتا تو وہ اپنی دکان کے شیشوں کے پیچھے سے مجھے مکا دکھا کر سلام کا جواب دیتا۔ کہا کرتا تھا" پروفیسر ایک روز ہم تم کو اور تمہارے عرب ورلڈ کو ملیا میٹ کر کے دم لیں گے۔ ہم تو عیسائیت کو ہی نہیں مانتے تم بعد میں ایک اور شطونگڑا اسلام بھی نکال کر لے آئے۔ مذہب اس دنیا میں صرف یہود کا ہے۔ باقی سب وہم وگمان کے ناکام قصے ہیں۔ ایک دن تم سارے کے سارے مسلمان حضرت موسیٰ کے عصا کے سامنے رسیوں کے ٹوٹے بن جاؤ گے۔"

ڈینئل بڑا شریف، بے حد کمینہ، غضب کا باتونی، بہت ذہین اور کینہ پرور آدمی تھا۔ اس کی ہنسی میں بھی قتل کی سازش کا روپہلی ارادہ موجود تھا۔ وہ کوئی بھی بات کرتا تو اس کی بات وہ نہ ہوتی جو کر رہا ہوتا۔ اس کے پیچھے کوئی دوسری بات ہوتی جس نے ابھی سفر کا ارادہ بھی نہ باندھا ہوتا۔

انتونیو تھا تو مجھ سے چھوٹا مگر بڑا ہی پیارا دوست تھا۔ اس کی شکل پوپ یار سے بڑی ملتی تھی۔ بہت خوبصورت تھا لیکن تھا بالکل پپو! اس کے والد وکیل تھے اور کسی تجارتی مقدمے کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔ وہاں سے ایک عدد فلپس کا ٹی وی سیٹ خرید لائے کہ جس روز اٹلی میں ٹیلی ویژن آیا، وہ سب سے پہلے سب سے پہلا پروگرام دیکھیں گے...... انتونیو نے اپنے دوستوں اور سہیلیوں کو ایوننگ پارٹی پر بلا رکھا تھا کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے ٹی وی سیٹ نہیں دیکھا تھا اور وہ ہم کو اپنا ٹی وی سیٹ دکھا کر یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ٹی وی ہوتا کیا ہے۔

ہم ابھی اپنی ناؤ نوش پارٹی میں مشغول تھے کہ انتونیو کے والد گتے کا ایک بڑا سا ڈبہ اٹھائے ہانپتے ہانپتے اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ ایدا نے اپنا ہاتھ اوپر لہرا کر زور کا نعرہ لگایا ECCO niene it Cesare di oggi سب نے زور کی تالیاں بجائیں۔ انتونیو نے گتے کا ڈبہ میز پر رکھا اور سب کو سٹیج ایکٹروں کی طرح سر جھکا جھکا کر سلام کیا۔

ہم سب دم بخود کھڑے تھے اور ہمارے سامنے ایک ایسی شے منصۂ شہود پر آنے والی تھی جس کو ہم نے ابھی تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ انتونیو کے ڈیڈی نے گتے کا ڈبہ کھولا اور اس کے اندر دونوں ہاتھ ڈال کر گوہر مقصود کو نکالنے کی کوشش کی تو ڈبہ اوپر ضرور اٹھ گیا لیکن اندر کے ہاتھ جوں کے توں رہے، باہر کچھ بھی نہ نکلا۔ ایدا لپک کر ڈیڈی کی مدد کو پہنچی اور اس نے ڈبے کو باہر سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

اندر سے کالے سیاہ رنگ کا ایک بھدا سا صندوقچہ نکلا جس کے سامنے ایک گنبا سا اندھا شیشہ لگا تھا۔ یہ صندوقچہ بالکل بھدا تھا بلکہ دور تک پیچھے کو نکل گیا تھا اور اس کا پچھلا حصہ سامنے والے سے بھی بھونڈا اور بے ترتیبا تھا۔

میرا خیال تھا کہ ٹی وی سیٹ کسی تصویر کے خوبصورت فریم کی طرح ہو گا کہ سامنے مہاگنی کا فریم، اس کے اندر شیشہ، شیشے کے پیچھے متحرک تصویر اور اس کے پیچھے گتہ فریم کے دونوں طرف ہک کہ ڈوری ڈال کر چاہے دیوار کے ساتھ لٹکا

لوچا ہے سامنے میز پر رکھ لو چاہے کارنس پر دیوار سے ٹیک لگا کر رکھ دو۔ زندہ ناچ گانا ہو رہا ہے اور دھنیں بج رہی تھیں لیکن تو کچھ اور ہی طرح کا نکلا جیسے امریکی گھڑیال کا سر ہو۔ کلے پھولے ہوئے گردن لمبی، منہ کھلا اور ماتھا تنگ۔

انتونیو کے ڈیڈی میز پر رکھے ہوئے ٹی وی سیٹ کو بڑی احتیاط کے ساتھ گھما پھرا کر اس کا ایک ایک پہلو دکھا رہے تھے اور ہم سب آگے کو ہو کر اس کی تفصیلات سمجھ رہے تھے۔ ایدا نے کہا ''انکل اس پر رنگدار تصویر آئے گی۔ ٹیکنی کلر جیسی سینما گھروں میں آتی ہے؟'' ڈیڈی نے بڑے وثوق کے ساتھ سر ہلا کر کہا ''نو نو نو...... ٹی وی پر رنگدار پروگرام پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ٹیکنالوجی ہی اس قسم کی ہے کہ ٹی وی صرف بلیک اینڈ وہائٹ تصویر دکھا سکتا ہے۔ رنگدار نہیں۔ کچھ اخباروں نے اپنے سنڈے ایڈیشنوں نے یہ بے پر کی ضرور اڑائی ہے کہ امریکہ میں رنگدار ٹی وی کے کچھ کامیاب تجربے ہوئے ہیں لیکن یہ سب سنسنی صحافت اور زرد اخبار نویسی کا کمال ہے۔ ایسا کوئی تجربہ کہیں بھی نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی تو ناکامی کا منہ دیکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھپ ہو گیا۔''

''اس کا مطلب ہے انکل......'' ایک اور لڑکی نے پوچھا۔ ''کہ ہم رنگین ٹیلی ویژن کبھی نہیں دیکھ سکیں گے!'' تو انکل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''انسان کے چاند پر جانے کی امید کی جا سکتی ہے لیکن رنگین ٹی وی کے ایجاد ہونے کی نہیں۔''

ہم سب جو اٹلی میں رنگین تصویروں، مرقعوں، پینٹنگوں اور رنگین لباسوں کے اندر رہتے تھے، اس خبر کے سنانے میں آ گئے۔ پھر آہستہ آہستہ مایوس ہوئے اور بالآخر پتھرا کر بیٹھ گئے...... ایدا چونکہ انکل کی ہونے والی بہو تھی اور اس کو اپنے ہونے والے سسر کے تبحر علمی پر بڑا ناز تھا، اس نے ہم سب کو مرعوب کرنے کے لیے انکل سے پوچھا ''آخر اس کی کیا وجہ ہے انکل کہ رنگین ٹی وی کبھی بھی معرض وجود میں نہیں آ سکے گا؟''

انکل نے آنکھیں اوپر اٹھا کر پیسہ غائب کرنے والے مداریوں کی طرح کہا ''بات یہ ہے پیاری بیٹی کہ رنگین ٹی وی کو رنگ عطا کرنے کے لیے تین رنگین لہروں کی ضرورت ہے۔ نیلی، پیلی اور سرخ۔ یہ تینوں ہماری ضرورت کے مطابق آپس میں مل مل کر مطلوبہ رنگ تیار کرتی رہیں گی اور سکرین پر جھلملاتی رہیں گی لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے ایک گڑبڑ اور ایک رنگین لہر سائنس دانوں کا کہنا نہیں مانتی۔''

تقریباً ہم سب نے بہت ہی اونچی آواز میں چلا کر پوچھا ''کونسی وہ انکل...... کونسی؟''

انہوں نے ایک عظیم سائنس دان کی طرح سوچتے ہوئے مدھم سی سنجیدہ آواز میں کہا ''سرخ وہ بچو...... سرخ وہ؟'' پھر انہوں نے ذرا سے وقفے کے بعد کہا ''سرخ رنگ چونکہ بہت وزنی ہوتا ہے، اس لیے ایتھر اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پکڑتے ہی گرا دیتا ہے اور ہر لہر کو چونکہ ایتھر سے ہو کر آنا ہوتا ہے، اس لیے سرخ لہر وہیں ایتھر میں گر کر ختم ہو جاتی ہے۔''

انتونیو نے پوچھا ''ڈیڈی اس ایتھر کو تگڑا نہیں کیا جا سکتا؟''

''ضرور کیا جا سکتا ہے'' وکیل صاحب نے یقین کے ساتھ جواب دیا۔ ''لیکن اس پر خرچ بہت اٹھتا ہے۔ کوئی ملک اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایتھر کو پانچ سیکنڈ تک اس قدر طاقتور بنانے کے لیے کہ وہ سرخ رنگ کی لہر کو سہار سکے تقریباً تین ارب ڈالر کی لاگت اٹھتی ہے۔ اب تم ہی کہو یہ خرچ کونسی حکومت برداشت کرے گی۔''

ہم کو رنگین ٹیلی ویژن ایجاد نہ ہو سکنے کا افسوس تو ضرور ہوا لیکن اس بات کی خوشی اس سے زیادہ ہوئی کہ ہمارے انکل ایڈووکیٹ ہونے کے باوجود سائنسی معلومات پر کیسی گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے!

سہ پہر کے وقت جورجی اور رینا تا فیورتی کی کافی شاپ کے کونے میں کراس ورڈ معمے بھر رہے تھے۔ دونوں کے لیے یہ کام بے حد مشکل تھا کہ دونوں کا ذخیرہ الفاظ تین چار سو الفاظ سے زیادہ نہیں تھا۔ رینا تا تو اپنے فارغ اوقات میں پہلے بھی معمے بھرتی رہتی تھی اور اس کو اس کام کا محاورہ ہو گیا تھا مگر جورجی خواہ مخواہ زور لگا کر ماتھے پر تیوریاں سی ڈالے بیٹھا تھا۔ مجھے اندر آتے دیکھ کر اس نے پکار کے پوچھا ''کہو پروفیسر پھر آ رہا ہے ٹیلی ویژن کہ نہیں؟''

رینا تا نے معمے پر سر جھکائے اس طرح سے جواب دیا۔ ''نہیں!''

جوا جی نے کہا ''میں پروفیسر سے پوچھ رہا ہوں۔ یہ سیانا آدمی ہے اور اخبار دیکھتا رہتا ہے۔''

رینا تا نے کہا ''یہ بھی وہی کہے گا جو میں کہہ رہی ہوں...... ہاں پروفیسر؟''

میں نے کہا ''ٹیلی ویژن ہمارے اٹلی میں اتنی جلدی آتا دکھائی نہیں دیتا، اس پر کئی سال لگیں گے۔ حکومت کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ ٹی وی کا بوجھ برداشت کر سکے۔ اس لیے مشکل ہے۔''

''زیادہ سے زیادہ کتنی مدت لگ جائے گی؟'' جورجی نے پوچھا۔ ''پانچ سال، دس سال، بیس سال۔''

میں نے کہا ''نہیں نہیں، میں یہیں ہوں گا۔''

''اور اس نے کہاں جانا ہے۔'' رینا تا نے سر اٹھائے بغیر کہا ''اب یہ ہمارا ہم وطن ہے۔ کیتھولک ہے، اطالوی ہے۔''

جوا جی نے کہا ''تم تو پروٹیسٹنٹ ہو پروفیسر! پروٹیسٹنٹ نہیں ہو؟''

میں نے کہا ''نہیں، میں تو کیتھولک ہوں لیکن تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟''

کہنے لگا ''برطانیہ کے تو سارے لوگ پروٹیسٹنٹ ہوتے ہیں تم کیوں نہیں ہو؟''

میں نے کہا ''میں کوئی برطانوی تھوڑا ہوں، میں تو پاکستانی ہوں۔''

کہنے لگا ''میرا مطلب ہے جو برطانیہ کی ماتحتی میں رہے، وہ سارے ملک پروٹیسٹنٹ ہوتے ہیں۔ پھر تم کیسے کیتھولک ہو؟''

میں نے کہا ''میں نے روم ایئرپورٹ پر اترتے ہی اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا تھا۔''

وہ میری یہ بات سن کر خوش ہو گیا۔ جیسے کوئی غیر ملکی آپ کا ہم مذہب نکل آئے تو آپ اس پر سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ ورجیلو ڈاکیہ آ گیا۔ اس نے سائیکل دیوار کے ساتھ لگائی اور کیفے میں داخل ہوتے ہی اونچی آواز لگائی ''اچھا ہو گیا پروفیسر جو تو مجھے یہیں مل گیا ورنہ مجھے ایک سو سولہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنا پڑتا تھا۔ تیری فون سا تا کا خط آیا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ میری فون سا تا کا خط ہے۔ میرے گھر والوں میں سے اور بھی کسی کا ہو سکتا

ہے۔ میری ماں کا، میرے بڑے بھائی کا، میری آپا کا۔ میرے کنبے کے اکتالیس افراد ہیں۔"

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے ٹھیک ہے...... تیرے کنبے کے اکتالیس افراد ہی ہوں گے خدا ان سب کو زندہ سلامت رکھے لیکن یہ تیری فون سا تا ہی کا خط ہے...... دوسرے گھر والے اتنا لمبا، اتنا موٹا اور ایسا بھاری خط کبھی نہیں لکھا کرتے، یہ کام عاشقوں کا ہے جن کے پاس فارغ وقت ہوتا ہے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ خط بھاری ہو گیا ہے اور اس نے کوئی پروا نہیں کی۔ رومان پسند لڑکیوں کو ڈاک خانے کے قواعد کا علم نہیں ہوتا۔ ان کو پہلے روز جو شرح بتا دی جاتی ہے، اسی کے حساب سے ٹکٹ لگاتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اس کا بھی یہی حال ہے۔ خط بیرنگ ہو گیا ہے۔ اس لیے مہربانی کر کے ایک ہزار لیرے نکال دو۔"

میں نے کہا "ایک ہزار لیرے سامنے فوریتی صاحب سے لے لو اور جاتے جاتے اتنا بتا جاؤ کہ ہمارے یہاں ٹیلی ویژن آ رہا ہے یا نہیں؟"

کہنے لگا "آ رہا ہے اور تیرہ اکتوبر کی شام کے چھ بجے پہلا پروگرام ہو رہا ہے...... صدر کا قوم سے خطاب، اس کے ساتھ ہی زندہ ناچ گانا......"

رینا تا تڑپ کر اپنی کرسی سے اٹھی اور دائیں بائیں کولہے ہلا کر گانے لگی۔

جواجی نے چیخ کر رینا تا کو گانے اور دم ہلانے سے روکا اور ورجیلیو سے کہنے لگا "تمہیں کیسے معلوم ہے کہ آ رہا ہے؟"

ورجیلیو نے کہا "ہم ڈاک خانے کے ملازم ہیں، ہم کو ساری باتوں کا علم ہوتا ہے...... ذرا...... ذرا......"

جواجی نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تیرہ اکتوبر کی شام کو اس کی رسم افتتاح ادا ہو رہی ہے۔"

ورجیلیو نے بڑے سبھاؤ کے ساتھ پھر اسی لہجے میں کہا "اوہ بھائی! ہم ڈاک خانے کے لوگ ہیں، ساری خبریں ہمارے سامنے سے گزرتی ہیں اور ہماری مشینوں کے اندر سے ہو کر نکلتی ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم ہو گا تو اور کس کو ہو گا!"

جواجی نے کرسی سے اٹھ کر مسیو لیتی کے انداز میں "اطالیہ زندہ باد" کے تین فلک شگاف نعرے لگائے اور رینا تا کو اپنے ساتھ لپٹا کر وہی گانا گانے اور ویسی ہی دم ہلانے لگا۔

ورجیلیو نے تالی بجا کر انہیں خاموش کرایا اور کندھے اوپر چڑھا کر "اے اے اے" کرتے ہوئے بولا "خوش تو ہو رہے ہو لیکن پتہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں اٹلی میں کنٹرولڈ ٹی وی آ رہا ہے، آزاد نہیں۔"

"کیا مطلب؟" رینا تا نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اس پر کنٹرولڈ پروگرام پیش کیے جایا کریں گے آزاد اور عوام پسند پروگرام نہیں...... پروگرام پر تمہارا کوئی اختیار نہیں ہو گا، دوسرے آزاد ملکوں کے ٹی وی کی طرح......"

سینور فیورتی نے کافی کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے پرچ چھکاتے ہوئے پوچھا "آزاد پروگراموں سے تمہاری کیا مراد ہے۔ پروگرام تو ٹی وی سٹیشن ہی تیار کرتا ہے اور وہی پیش کرتا ہے۔ اس میں تماشائیوں کا کیا عمل دخل!"

"آزاد ملکوں میں اور اٹلی میں یہی تو فرق ہے کہ یہاں وہی پروگرام دیکھنا پڑے گا جو سٹیشن پیش کر رہا ہے لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں یہ نہیں ہے۔ وہاں کے تماشائی اس میں تبدیلی کر سکتے ہیں، پروگرام میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" سینور فیوریتی نے کہا "جن جن ملکوں میں دو دو چینل کام کر رہے ہیں وہاں یہ آسانی میسر آ سکتی ہے، ہر ملک میں نہیں۔"

"چینل تبدیل نہیں کرنا۔" ورجیلیو ڈاکیے نے چیخ کر کہا "چلتے ہوئے پروگرام میں تبدیلی کرنی ہے۔ اسی پروگرام میں۔"

ہم سب احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ورجیلیو نے کہا "ترقی یافتہ، آزاد منش اور آزاد خیال ملکوں کے ٹی وی سیٹ میں ایک خاص بٹن لگا ہوتا ہے۔ میچور سوئچ......"

"میچور سوئچ!" فیوریتی نے حیرانی سے پوچھا۔

"بڑوں کے پروگرام کے لیے" ورجیلیو نے کہا "میری تمہاری عمر کے لوگوں کے لیے۔"

"اس میں کیا ہوتا ہے، اس سوئچ میں؟" رینا تا نے پوچھا تو ورجیلیو بھونچکا سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا اور جواجی کی طرف منہ کر کے بولا "تم کو تو معلوم ہی ہو گا سینور جواجی کہ ٹی وی سیٹ میں ایک خاص بٹن ہوتا ہے جو خاص چابی سے آپریٹ ہوتا ہے۔"

"مجھے پتہ ہے، پتہ ہے۔" جواجی نے جھوٹ بولتے ہوئے اور اپنی عزت بچاتے ہوئے کہا "میں اس سوئچ کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔"

"تم نے ٹی وی سیٹ دیکھا ہے گھونے!" رینا تا نے جل کر کہا تو جواجی شرمندہ سی ہنسی ہنس کر بولا "دیکھا تو نہیں البتہ میں اس کی بابت جانتا ضرور ہوں۔ میرا ایک ہم زلف ریڈیو کی دکان میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔"

"لیکن یہاں نہیں نا لگوانے دیتے ویسا سوئچ۔" ورجیلیو نے غصے میں الفاظ بھنبھوڑتے ہوئے کہا "یہ کتے پادری! حرام کے پلے، کالے لباس والے...... خود چاہے جو مرضی کر لیں لیکن لوگوں پر پہرے بٹھا کر ان کی زندگی حرام کریں گے۔ سؤر کے بچے۔ اخلاق کے مامے۔ پوپ کے گماشتے۔"

رینا تا نے جب پادریوں پر اور پوپ برادر ویٹی کن پر ایسی پھٹکار پڑتی سنی تو وہ اور متجسس ہو گئی اور فیوریتی کی طرف منہ کر کے کہنے لگی "اس سے پوچھو تو سہی ڈاک چور سے کہ یہ کہنا کیا چاہتا ہے؟"

اپنے لیے ایسا بیہودہ ریمارک سن کر ورجیلیو بھڑک کر اٹھا اور "ٹھیک ہے ٹھیک ہے" کہتا ہوا تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ فیوریتی نے کوفی بار کی اوٹ سے نکل کر اس کا راستہ روک لیا اور ہنس کر کہنے لگا "بس یار، اتنی سی بات پر ناراض ہو گئے۔ رینا تا کی تو پرانی عادت ہے۔ سب کے نام دھرنے کی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا جو تم سمجھے ہو...... آؤ...... میں تمہارے لیے کوفی کا ایک گرم کپ بناتا ہوں اور ہاتھ کنگن کو آرسی دکھاتا ہوں کہ مجھ سے بہتر کافی سارے روم میں اور کوئی نہیں بنا سکتا۔"

کوفی کا نام سن کر ورجیلیو رام ہو گیا اور میرے ساتھ کی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اونچی آواز میں اعلان کرتے ہوئے کہا "اے محکمہ مواصلات کے جلیل القدر فرزند اب ہم کو یہ بتا کہ ٹی وی سیٹ پر وہ سوئچ کیا کرتا ہے جو ہمارے سیٹوں پر موجود نہیں ہو گا اور دنیا کے سارے سیٹوں پر لگا ہوا ہے۔"

ورجیلیو نے کہا "ہمارے سیٹوں پر بھی لگا ہوا تھا لیکن ان حرامی پادریوں نے سنٹرل گورنمنٹ پر دباؤ ڈال کر اور ساری کیتھولک دنیا کا ڈراوا دے کر سرکاری طور پر حکم نافذ کرا دیا ہے کہ اٹلی میں ٹی وی سیٹوں پر میجوزر سوئچ نہیں لگ سکتا۔ اگر کسی کے ہاں ایسا سیٹ برآمد ہو گیا تو مالک کو پانچ سال قید بامشقت کی سزا سنائی جائے گی۔"

"وہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔" ریناتا نے کہا "کہ وہ مرنے جوگا سوئچ کیا کرتا ہے جو پوپ کے جبہ میں آگ لگ گئی ہے اور اس نے وہ سوئچ منع کروا دیا ہے...... کالے منہ والے نے!"

"جب کوئی زندہ ناچ گانے کا پروگرام پیش ہوتا ہے" ورجیلیو نے ایک جان کار استاد کی طرح کہنا شروع کیا "یا کوئی سولو ناچ ہوتا ہے، سرکس شو ہوتا ہے۔ بیلے ہوتا ہے تو اس کو ڈ سوئچ کو دبا کر کردار میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔"

ورجیلیو خاموش ہو گیا تو فیوریتی نے کہا "اوئے گھگھو وہی تو ہم پوچھ رہے ہیں کہ کیسے تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔"

ورجیلیو ڈاکیے نے کہا "سوئچ دبا کر آپ ناچتی ہوئی، گاتی ہوئی یا سرکس میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی لڑکی کا لباس غائب کر سکتے ہیں...... بس نچ کیا اور ٹچاٹچ سب کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ایک سیکنڈ میں سارے کپڑے اترے اور پرفارمر آپ کے سامنے برہنہ ہو گئی۔"

"ننگی ہو گئی!" ریناتا نے چیخ کر کہا۔

"بالکل برہنہ!" ورجیلیو نے یقین دلایا "مادرزاد برہنہ...... اپنے جسم کے سارے خدوخال کے ساتھ۔"

فیوریتی نے "ہوہ" کر کے سر جھٹکا اور جھلا کر بولا "احمقوں والی بات! یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بھلا!"

"اور یہ ممکن ہو سکتا ہے۔" ورجیلیو نے غصے سے کہا کہ "بٹن دبانے سے ہوا میں اڑتی ہوئی ایک تصویر آپ کے سامنے آ کر ناچنے لگے، گانے لگے۔ خبریں سنانے لگے اور بحث مباحثہ کرنے لگے۔"

"بالکل بالکل" جواجی نے کہا "سائنس دانوں کے لیے کیا مشکل ہے۔ وہ ہر چیز کر سکتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "دوستو! یہ مردانہ خواہش اور مردانہ کمزوری ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں سائنس کا طالب علم ہوں اور سائنس میں اس قسم کے طلسماتی کام نہیں ہوتے۔"

ورجیلیو نے غصے میں آ کر کہا "چل اٹھ میرے ساتھ۔ اپنا بھی کرایہ دے اور میرا بھاڑا بھی ڈال۔ تجھے جرمنی لے کر جاؤں اور تو اپنی آنکھوں سے سامنے دیکھے۔ خود بٹن دبا کر دیکھے کہ سکرٹ کیسے گرتی ہے اور جمپر کیسے غائب ہوتا ہے۔ چل میرے ساتھ۔"

جورجی نے کہا "جرمنی میں کیا ہے؟"

کہنے لگا "وہ سائنس ہے، علم ہے، ٹی وی سیٹ ہے۔ یہ پادری نہیں ہیں لمبے چوغوں والے، بدمعاش۔ علم کے دشمن، ترقی کے بیری...... میرا ماما خود دیکھ کے آیا ہے۔"

"کیا دیکھ کر آیا ہے تمہارا ماما؟" میں نے ماما پر زور دے کر کہا۔

اس نے کہا "وہ ترکھان ہے اور تین سال تک ہیمبرگ میں رہا ہے۔ جوڑیاں چڑھاتا رہا ہے نئی بلڈنگوں کی۔ اس کے پاس اپنا ٹی وی سیٹ تھا...... ذاتی! اس میں یہ سوئچ لگا ہوا ہے۔ جب چاہتا ہے کپڑے اتروا لیتا تھا، جب چاہتا تھا سوئچ آف کر دیتا تھا۔"

"کون؟" فیوریتی نے یقین کرتے ہوئے کہا "تمہارا ماما؟"

"اور کون! میرا سگا ماما، میری ماں کا چھوٹا بھائی...... اپنے ساتھ لے کر آیا ہے اپنا ٹی وی سیٹ لیکن یہاں نہیں چل سکے گا ناں۔ ان حرامیوں کی وجہ سے۔ یہاں بین کر دیا گیا ہے یہ سوئچ۔"

ریناتا نے کہا "دونوں کے کپڑے اتر جاتے ہیں، مردوں کے اور عورتوں کے؟"

ورجیلیو چہک کر بولا "صرف عورتوں کے۔ پہلے دونوں کے اتر جاتے تھے لیکن مردوں کے جسم بھدے اور توندل ہونے کی وجہ سے سائنس دانوں نے اندر تین ٹرانسسٹر کا ایسا "چپ" لگا دیا ہے کہ صرف عورتوں کے اترتے ہیں اور ان سے حوروں جیسے جسم نکل آتے ہیں، اپنی وینس کے مجسموں جیسے۔"

ہم سب سوچ میں پڑ گئے کہ آدمی تو بونگا اور بے ترتیبا سا ہے لیکن کیا معلوم سچ ہی کہتا ہو۔ پھر سائنس کے آگے کیا مشکل ہے۔ جب وہ ایک لہر کو منتقل کر سکتی ہے تو ایک تصویر کے کپڑے نہیں اتروا سکتی! وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ پھر ہم کو ان پادریوں، مذہبی پیشواؤں اور ملاؤں پر بڑا غصہ آیا جو کم علمی کی بنا پر انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور انسانی فکر پر لوہے کے خود چڑھا کر لوگوں کو دولے شاہ کے چوہے بنا رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ہمارے یہاں کے ملاء اور ملّانے ہی ایسے عقل دشمن اور کوتاہ نظر لوگ ہیں لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ بڑے میاں سبحان اللہ ہیں اور ساری کیتھولک ورلڈ کو آگے لے جانے کے بجائے پیچھے لے جا رہے ہیں۔

ٹی وی کے آنے نہ آنے کے بارے میں میری ساری گرم جوشی ٹھنڈی پڑ گئی۔ اب جہاں کہیں اس کے بارے میں بحث مباحثہ بھی ہو رہا ہوتا میں اس سے کنی کاٹ جاتا۔ ایسے ٹی وی کا کیا فائدہ جس میں ورجیلیو کے ماما والا سوئچ نہ لگا ہو۔ اس سے تو پھر ریڈیو ہی اچھا۔ آواز ہی آواز...... جسم جسد کا کوئی جھگڑا ہی نہیں۔

ایک شام جب میں ریڈیو پر اپنا پروگرام کر کے گھر واپس آ رہا تھا تو میرے راستے کی ساری سڑکوں پر بلوے کا سماں تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کسی کسی دکان کے سامنے لوگوں کا ہجوم ٹکڑی اندر ٹکڑی پھیل پھیل کر سارے بازار کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ ٹریفک بالکل بند تھی اور سپاہی سیٹیاں بجا رہے تھے۔ میں نے ایڑیاں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ایک دکان کے باہر سڑک کنارے ساگوان کے خوبصورت میزوں پر ٹی وی سیٹ پڑے تھے اور اطالیہ کے مقبول گانوں کا پروگرام چل رہا تھا۔ جن موسیقاروں کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو ایک عرصہ ہوا دل میں دفن ہو چکی تھی، وہ موسیقار سامنے کھڑے گا نا گا

رہے تھے اور سازندوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ سازندے بھی چترائی میں آ کر اپنے فن کا مظاہرہ مبالغہ آمیز حرکات سے کر رہے تھے۔ جب ڈرم بجانے والے نے بڑے ڈھول کے سامنے قلابازی لگا کر لے کو پھر پکڑ کر ڈگا لگایا تو سارا مجمع خوشی میں آ کر سڑک پر ہی ناچنے لگا۔ اس کے بعد ٹریفک نہ آگے جا سکا نہ پیچھے، ہر کوئی اپنی اپنی سواری سے اتر کر رقص میں شریک ہو گیا۔

میرا علاقہ تو غیر چھوٹا سا تھا لیکن اگلے روز جب ہم نے خبروں میں دیکھا تو اندرون روم سارے کا سارا ہجوم تھا اور اس کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ پیاتزا اسیدرا۔ دیا وینے تو اہسپانوی سیڑھیاں کلوسیئم کے ملحقہ بازار سب رقص کر رہے تھے۔ لوگ تو تھک کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے لیکن علاقے ابھی تک ناچ رہے تھے۔

میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے مزدور سے پوچھا۔ ''آج کیا تاریخ ہے؟'' تو اس نے حیرت کے ساتھ میری طرف دیکھا اور گھور کر بولا ''تیرہ اکتوبر''

میں نے کہا، واقعی ورجیلیو سچا تھا۔ اس نے یہی تاریخ اور یہی وقت دیا تھا اور جب اس کی یہ بات سچ نکلی تو پھر اس کے سوچ والی بات بھی ٹھیک ہی ہوگی!

اگلے دن رات کے دس بجے والی خبروں میں پہلی خبر ہی دلدوز نکلی۔ میلان کی ایک خوبصورت دراز اور بلونڈ ہیئر ڈریسر نے اپنے سیلون میں بڑے عمر کے ایک گاہک کو ہلاک کر دیا اور پھر خود ہی قریبی تھانے اطلاع دینے چلی گئی۔

نیوز رپورٹر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس خبر کا ڈھانچہ تیار کیا تھا۔ اس میں واقعے کا ابتدائی تعارف سیلون کا تصویری جائزہ۔ اس کرسی کی تفصیلی عکس بندی جس پر قتل ہوا مقتول کے تین پورٹریٹ، ایک جوانی کا، ایک ادھیڑ عمر کا اور ایک حالیہ۔ اس کے بیٹے اور بیٹی سے انٹرویو۔ مقتول کے کردار کے بارے میں سوالات، اس کے قریبی دوستوں کا اظہار۔ یہ سب کچھ اس خبر میں شامل تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے رپورٹر کئی سال سے ٹیلی ویژن میں کام کر رہا ہو اور اس کے سارے رموز و اسرار سے واقف ہو۔

لڑکی، تھانے میں پولیس آفیسر سے کہہ رہی تھی ''رات کے دس بجے ہوں گے۔ بارش کی وجہ سے سڑکوں پر رش کم ہو گیا تھا اور ہمارے دائیں بائیں کی تقریباً ساری دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ میرے ساتھی ایک ایک کر کے جا چکے تھے اور دکان پر صرف میں ہی اکیلی رہ گئی تھی۔ میں بھی بڑی آسانی سے جا سکتی تھی۔ میرے اوپر کوئی پابندی نہ تھی لیکن میں نے سوچا کہ اس وقت کوئی گاہک آئے گا تو بال کٹوانے یا شیو بنوانے کے بعد مجھے خاص ٹپ دے کر جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا، آپ لوگ جائیں میں خود ہی دکان بند کر کے چلی جاؤں گی۔''

''کچھ دیر تو میں فیشن کے رسالے دیکھتی اور کامکس پڑھتی رہی۔ اس کے بعد بارش کا نظارہ کرنے لگی۔ دور تک سڑکوں کے اوپر بتیوں کا عکس اتر آئے تھے جنہیں ٹریفک کی گاڑیاں کاٹ کاٹ کر اور چاٹ چاٹ کر گزرتی تھیں۔ رات گہری ہو رہی تھی لیکن بہت ہی خوبصورت رات تھی۔''

''کوئی دس گیارہ بجے پینسٹھ چھیاسٹھ برس کا یہ بڈھا اعلیٰ درجہ کا ٹرائیکل سوٹ پہنے دکان میں داخل ہوا۔ اندازہ

ہے کہ اس کے پاس اپنی کوئی گاڑی نہیں تھی اور یہ پبلک ٹرانسپورٹ سے اترا تھا۔ ایسے بڈھے شکل و صورت کے اچھے، وضع قطع کے چھیلے اور ریت رویئے کے ٹھرکی ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں بڑی لچھے دار اور ان کے قصے بہت ہی سہانے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ یا تو ابی سینیا میں اپنی بہادری کے قصے سناتے ہیں یا دوچے کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں۔''

''اس نے اندر آ کر کوٹ کھونٹی پر لٹکا دیا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''میری پیاری چڑیا بال کاٹ دو۔ پیچھے سے اوپر اٹھا کر۔ سامنے کے ویسے ہی چھوڑ کر اور قلموں میں گھنگھرالیاں ڈال کر۔ یہاں کے بال سیدھے ہو گئے ہیں اور مجھے اچھے نہیں لگتے۔'' میں نے کہا ''ٹھیک ہے سینور جیسے آپ نے کہا ہے، ویسے ہی ہوگا لیکن کیا آپ شیو کرانا بھی پسند کریں گے؟'' کہنے لگا ''شیو تو میں نے صبح سویرے کر لی تھی۔ اس وقت شیو کرنے سے فائدہ! میں کچھ نظر بازیاں کر کے گھر واپس چلا جاؤں گا۔ تم جیسی لڑکیوں کے جلوے دیکھوں گا اور جا کر سو رہوں گا۔''

''میں نے الماری سے ایک دھلی دھلائی آئرش لنن (Linen) کی سفید چادر نکالی اور اسے زور سے پھٹک کر سینور گاہک کو گھٹنوں تک اس میں لپیٹ دیا۔ گردن کی لپیٹ کے اندر میں نے کاٹن وول کی پونیاں پیوست کیں اور حجامت بنانے کے لیے تیار ہو گئی۔''

''جب میں کھولتے ہوئے پانی سے حجامت بنانے کے اوزار نکال رہی تھی تو میں نے گردن گھما کر دیکھا کہ وہ خبیث بڈھا اسی طرح آئینہ رُخ بیٹھا تھا لیکن اس کی نیت بدل چکی تھی۔ اس نے آئرش لنن کی چادر کے اندر اپنے ہاتھ گود سے ذرا آگے کھسکا کر اپنی پتلون کی فلائی پر رکھ لیے تھے اور ان میں خفیف سی حرکت شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کھولتے ہوئے پانی سے حجامت کے ہتھیار تو نکال لیے تھے لیکن اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔ مجھے اس کی نیت پر شک ہو رہا تھا کیونکہ اس کا چہرہ پہلے کے مقابلے میں بالکل تبدیل ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھوں کی حرکت زوردار ہو گئی تھی...... لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کرتا، میں نے ڈسٹلڈ واٹر کی بڑی بوتل اٹھائی، اس کے اندر سے پھوار کی نلکی نکالی۔ منہ پیچدار ڈھکنے سے بند کیا اور اس بڈھے فرتوت کے پیچھے جا کر بوتل کو موگری کی طرح گھما کر اس کے سر پر پورے زور سے دے مارا۔ اس نے نہ کوئی آواز نکالی، نہ ہی اپنی جگہ سے ہلا اور نہ ہی اس ضرب سے کوئی نمایاں خون نکلا۔ بس جیسے بیٹھا تھا، ویسے کا ویسا بیٹھا رہ گیا اور اس خبیث کے ہاتھوں کی حرکت ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔''

ہیئر ڈریسر لڑکی کے اس بیان کے بعد رپورٹر نے تین پولیس آفیسروں کو اس سیلون میں دکھایا جو محل واردات کا معائنہ کر رہے تھے...... ہیئر ڈریسر کا منحوس ٹھرکی بڈھا اسی طرح کرسی میں بیٹھا تھا۔ اسی طرح اس کے ہاتھ چادر کے اندر تھے۔ ویسے ہی اس کے گرد آئرش لنن کی چادر لپٹی تھی۔ سامنے شیشے کے پاس وہی دو پونڈ وزنی پانی کی بوتل کھڑی تھی۔ ویسا ہی سارا ماحول تھا۔ فقط فوت ہو جانے کی وجہ سے اس بدبخت کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی تھی۔

پولیس آفیسر نے صورتحال کا معائنہ کرنے کو اور مضروب کے فوٹو اتارنے کو جب اس کے اردگرد لپٹی ہوئی چادر کا پلّو کھولا تو بڈھے فرتوت کے دونوں ہاتھ اب بھی اس کی پتلون کی فلائی پر تھے۔ وہ اپنی نزدیک کی عینک کے شیشے ٹشو پیپر سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا ہوا اس جہان فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ ٹشو پیپر اس کو ہیئر ڈریسر کے ڈبے سے ملے تھے۔ جب اس

کے ہاتھوں کا اور اس میں پکڑی ہوئی عینک کا لشکارا مار کر فوٹو اتارا گیا تو عینک کے دونوں شیشے ہلکی نیلی جوت کے ساتھ جگمگائے اور کیمرہ لینز کی طرح نظر آئے۔

اس روز سارے اٹلی میں دھوم مچ گئی کہ ٹیلی ویژن کس قدر مفید چیز ہے اور اس سے کیسے کیسے کام لیے جا سکتے ہیں۔

ہالینڈ سے شہاب صاحب کا خط آیا تھا کہ ان کا ششماہی کورس ختم ہو گیا ہے اور اب وہ اگلے ہفتے آٹھ دس روز روم میں قیام کرنے کے بعد وطن واپس جا رہے ہیں۔ لکھا تھا میرے لیے کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں بکنگ کرا دیجیے اور دن کا تھوڑا سا وقت میرے لیے محفوظ کر لیجیے۔ کچھ باتیں کریں گے اور کچھ مقامات دیکھیں گے۔ میں تو پہلی بار روم دیکھوں گا، آپ کی تجدید دید ہو جائے گی۔ چھٹی لینے کی ضرورت نہیں، شام کے وقت گھوم پھر لیا کریں گے...... میں نے ان کو جواب لکھا، کہ آپ آئیں تو سہی، چشم ما روشن دل ماشاد۔ اپنے ہوٹل کی اور میری چھٹی کی پروانہ کریں، دونوں ہی بے کار ہیں۔ بس آپ کا آنا ضروری ہے۔

دوسرے دن مجھے کراچی سے حبیب درانی کا خط ملا کہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں ایک مہینے کے لیے لندن جا رہا ہے۔ راستے میں روم ٹھہرے گا اور میرا مہمان ہو گا۔ ہوٹل کی بکنگ اس نے کر لی ہے، فقط گھومنے پھرنے کے لیے بات میرا ساتھ درکار ہو گا۔ اگر میں ابھی سے ایک ہفتے کی چھٹی کا بندوبست کر لوں تو مناسب رہے گا کیونکہ اس کے بعد دو تین آگے بڑھانے مشکل نہیں ہوں گے۔

جو تاریخیں حبیب نے اپنی آمد کی دی تھیں، وہ عین وہی تھیں جن دنوں شہاب صاحب میرے پاس آ رہے تھے۔ یہ خبر سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے۔ درانی بھی میرا پیارا تھا اور اس کے ساتھ بڑے اچھے دن گزارے تھے۔ بڑا ہی خوبصورت، نہایت بھولا اور بے حد دکھی انسان تھا۔ میں اس کو ناں بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن شہاب صاحب کی موجودگی میں اسے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اور طرح کا آدمی تھا۔ فیشن ایبل، ماڈرن آزاد خیال اور آسان گیر، وہ شہاب صاحب کے ساتھ کیسے چل سکے گا۔ اس طرح شہاب صاحب ایک خود پسند اور خود بیں آئی سی ایس آفیسر ہو کر حبیب کو برداشت کر سکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کو اپنے ادیب اور شاعر ہونے پر بھی بڑا گھمنڈ ہو گا، وہ درانی کے ساتھ کیسے گھل مل سکیں گے۔ پھر ان دونوں کے درمیان میں کس کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو سکوں گا...... سوچ سوچ کر میں نے درانی کو کیبل بھجوایا کہ ان دنوں میں روم میں نہیں ہوں، جینوا میں ہوں گا جہاں مجھے زباندانی کا ایک ماہی کورس مکمل کرنا ہے۔ اگر تم لندن سے واپسی پر میرے پاس ٹھہرو تو میں ہر وقت تمہاری اردل میں موجود چلوں گا اور تم کو وہ وہ باتیں یاد دلاؤں گا جو تم اب تک بھول چکے ہو گے۔ وہ دن بھی کیسے اچھے تھے!

اگلے ہی روز مجھے اپنے تار کا جواب تار میں ملا اور درانی اس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ لندن سے واپسی پر میرے پاس ٹھہرے گا، جاتے ہوئے نہیں، اللہ درانی کو رہتی دنیا تک شاد و آباد رکھے، وہ بے حد ماڈرن اور ناقابل یقین حد تک آزاد خیال ہونے کے باوصف ایک بھولا بھالا اور مان لینے والے لوگوں میں سے تھا۔ وہ قسمت کا دھنی تھا اور ہونی کے

پیچھے چلا چلا کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا۔ اس کے سامنے نئی سے نئی راہیں آپ سے آپ کھلتی جاتی تھیں اور واپسی کے دروازے خود بخود بند ہوتے جاتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہمارے احاطہ افراں کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک جوڑا گرین روم میں داخل ہوا اور زوبی اور اس کے ماڈل لیلا ڈی جیکسن کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم سب نے ان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مرد نے مڈنائٹ بلو سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے گلے میں چاند جیسی بو لگی تھی۔ لڑکی بہت ہی دبلی پتلی، ہوا کا جھونکا، سرخ و سفید ہیولا، آہو چشم پورے قد سے ایستادہ تھی۔ ہم نے اس سے پہلے ایسے خوبصورت لوگ ولایتی فلموں میں تو دیکھے تھے لیکن موجودہ حالت میں گوشت پوست کے روپ میں نہیں۔ ان کے سامنے صرف بکنی میں ملبوس فلاڈلفیا سے آئی ہوئی لیلا ڈی جیکسن بھی ایک مرتبہ دھند میں چھپ گئی اور جب برآمد ہوئی تو پہلے والے زوروں میں نہیں تھی۔ کلغی گرا کے نکلی تھی۔ زوبی چکنی مٹی سے اس کا مجسمہ بنا چکا تھا اور اب کئی دن سے اس کی نوک پلک درست کر رہا تھا لیکن اس وقت وہ ہماری توجہ کا مرکز نہیں رہی تھی۔ آنے والی لڑکی نے ہنٹر والی کی طرح ہم سب کو اپنے چابک میں لپیٹ لیا تھا۔

نوجوان نے کہا "زوبی صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟" تو زوبی نے مجسمے سے نگاہیں اٹھائے بغیر بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ کہا "کیوں نہیں، آپ درانی صاحب ہیں۔ حبیب درانی! اور میری آپ کی ملاقات کراچی کے کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔"

"اور میں نے آپ کو اپنا پتہ بھی دیا تھا۔" نوجوان نے کہا "جو آپ نے یقیناً ادھر ادھر کہیں پھینک دیا ہو گا۔ یہ میری بیوی ہے ارجمند بانو۔ ہم سب اس کو للی کہہ کر بلاتے ہیں اور یہ للی ہی کے نام پر بولتی ہے ارجمند کے نام پر نہیں۔"

للی نے ہنس کر کہا "مجھے تو یاد ہی نہیں پڑتا کہ میرا نام ارجمند ہے۔ شروع سے للی ہی سنتی آئی ہوں اور اسی پر چلی جا رہی ہوں۔"

زوبی نے کہا "یہ میرے دوست اشفاق احمد ہیں، نئے نئے افسانہ نگار اور شوقیہ مصور اور یہ حفیظ رومانی نیس پلازہ کے منیجر۔ آپ ممتاز مفتی ہیں معروف ادیب، افسانہ نگار اور ایڈیٹر۔ پیر تاج میں مصوری اور مجسمہ سازی کے مبصر لیکن ان کا رخ فارن سروس کی طرف ہے۔ جلد ہی ہم کو چھوڑ جائیں گے۔ یہ رمزو ہیں ایشیا کے نامور سٹل فوٹوگرافر۔ اور آپ مسعود پرویز ہیں، ہماری فلمی دنیا کے خوبصورت، باوضع، سنجیدہ مزاج ہیرو اور اردو زبان کے شاعر۔"

ان دونوں نے ہم سب سے باری باری ہاتھ ملایا اور حفیظ کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ للی نے اپنے سنہرے سگریٹ کیس کو سب کے سامنے گھما کر پیش کیا اور پھر اکیلی ہی سگریٹ سلگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا خاوند سگریٹ پیتا نہیں تھا اور ہم پینے والوں نے اپنے اپنے سگریٹ پہلے سے سلگائے ہوئے تھے۔ ایک مخلوط مزاج لڑکی کو اس آزادی سے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر ہمیں ایک گونہ خوشی ہوئی اور ہمارے سر فخر سے بلند ہو گئے کہ اب لیلا ڈی جیکسن ہم کو غیر ترقی یافتہ، قدیم اور بدوی خیال نہیں کرے گی اور ہمارا نام مہذب دنیا کی فہرست میں درج کر کے ہمارے ساتھ اور بے تکلف ہو جائے گی۔

زوبی نے کہا "للی! اس وقت ہم سطح لاہور سے پونے دو سو فٹ کی بلندی پر بیٹھے ہیں اور یہ ہمارے شہر کا مشہور

صحت افزا مقام ہے۔ اس کا نام اوپن ایئر تھیٹر ہے اور یہ لارنس باغ میں واقع ہے۔ شہر کے لوگ اس سے بالکل واقف [illegible] ہیں۔ باغ کی سیر کرنے آتے ہیں لیکن اُدھر نہیں آتے۔ اس پر ہمارا اور صرف ہمارا قبضہ ہے اور یہ میرا اسٹوڈیو ہے۔ [illegible] آج کل یہاں ملک کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے چہروں کے مجسمے بنا رہا ہوں۔ کسی کسی کا بسٹ (Bust) بنانے کا ارادہ بھی ہے۔ دیکھیں یہ سارا پراجیکٹ کب مکمل ہوتا ہے۔ آپ لوگ جب بھی لاہور آئیں یہاں ضرور آیا کریں۔ [illegible] سب آپ سے مل کر بے انتہا خوش ہوں گے۔" ہم سب نے زوبی کے تتبع میں مری مری سی ہاں ہاں، ضرور ضرور اور [illegible] بالکل کی آواز نکالی اور پھر خاموش ہو گئے۔

اس وقت پاکستان کو وجود میں آئے ایک سال اور چند ماہ کی مدت گزری تھی۔ ہم لوگ کم علمی کی وجہ سے [illegible] شرمیلے، مخلوط محفلوں کے کم آمیز مہمان، غیرت مند، بہادر، کھڑکدار پاکستانی، جذباتی میزبان، فریب نا آشنا پڑوسی، [illegible] ہاتھ راہی اور سیاست سے کوسوں دور تھے۔ ہمارے ملک میں ایک ہی تو یونیورسٹی تھی۔ اس کا پکا ٹانکا بھی ابھی ولایت کی گرڈیشن سے نہ لگا تھا تو پھر ایسے ہی ہونا تھا۔

اس عہد کے پاکستانی کچھ اور ہی قسم کے تھے۔ عورتیں پردہ کرتی تھیں اور بہت کم باہر نکلتی تھیں۔ سفید لمبے [illegible] برقعے بڑی عمر کی عورتوں کی نشانی تھے اور سیاہ، براؤن اور سلیٹی برقعے مصری برقعے کہلاتے تھے اور دو حصوں میں منقسم تھے۔ اوپر کے حصے میں لمبی پٹی کا نقصان ہوتا تھا جس کے پیچھے کبھی کبھی گوری گوری جلد، بھورے بھورے بال اور کالی کالی آنکھیں نظر آ جایا کرتیں۔ کسی لڑکی کا پورا چہرہ کبھی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سرِ راہ چلتے ہوئے، بس میں بیٹھے ہوئے یا سہیلیوں سے باتیں کرتے ہوئے ان کے چہرے نقاب میں مستور رہتے تھے۔ صرف نقاب کی جھری میں سے دیکھ کر اندازہ لگانا پڑتا تھا کہ کس شکل وصورت کی لڑکی ہے اور کس طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔

اتنے بڑے لاہور شہر میں لے دے کے بس ایک ہی طبقہ ایسا تھا جس کی لڑکیاں سستے پھولدار اور سادے [illegible] کر کھلے منہ تانگوں میں نکلتی تھیں۔ مال روڈ پر بائیسکل چلاتی تھیں اور اپنے والدین اور گھر والوں کے ساتھ ناچ گھر [illegible] جاتی تھیں۔ ان میں کسی اِکا دُکا لڑکی نے لاہور کی سڑکوں پر کار بھی چلانا شروع کر دی۔ وہ دن کے گیارہ بجے لوئر مال کی جانب سے مال روڈ میں داخل ہوتی اور سیدھی لارنس باغ تک چلی جاتی۔ ہم لوگ بھی ٹھیک وقت پر بھنگیوں کی توپ کے چبوترے پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کیا کرتے۔ جن کا پیریڈ ذرا لمبا کھنچ جاتا، وہ اس چلتے پھرتے جھروکے کے درشن سے محروم رہ جاتے۔

سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس وغیرہ اپنے افسانوں کے لیے یہی لڑکیاں مستعار لے کر افسانے لکھتے تھے۔ پاکستانی لڑکی میں اصلی اور منہ زور افسانے سے ٹکر لینے کی تاب نہیں تھی۔ اس پر تو ممتاز مفتی کے "آپا" جیسے افسانے لکھے جا سکتے تھے۔ وہ بھی خوب تھے لیکن ان میں ڈنک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ضرب شدید نہیں ہوتی تھی جس سے گیدڑ کمان کی تانت کھا کر مرا تھا۔ پاکستانی لڑکیاں گھروں کے اندر محصور رہنے کی وجہ سے بڑی شریف، متحمل مزاج، [illegible] شعار، صابر وشاکر اور شرافت واخلاق کی پیکر تھیں۔ ان پر اچھا افسانہ کس طرح سے لکھا جا سکتا تھا بھلا۔

اب جو لِلی ہمارے درمیان آئی تو ہم سب کے دل کی کلی کھل گئی۔ باری باری ہم نے اس کو سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر مال روڈ اور میکلوڈ روڈ کی سیر کرائی اور اپنی شو بنائی۔ میں اس کو سیدھا چھاؤنی کی سڑکوں پر لے گیا کیونکہ اُدھر، شہر کی طرف، ہمارے کسی عزیز کے مل جانے کا خطرہ تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ لِلی بے حد با اخلاق اور اصول پرست لڑکی ہے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی لبرٹی نہیں لی جا سکتی۔ وہ ایک ایسی طاقتور اور قلعہ بند لڑکی تھی جس کو سوائے اپنی زبان کے اپنے ایک ایک عضو پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ کیا مجال جو کوئی عضو چوک جائے یا کمزوری دکھا جائے۔ ہر وقت چوکس، ہر گھڑی اٹن شن!

اس کی زبان سے ہم نے ایسے ایسے لطیفے سنے کہ پہلی مرتبہ تو ممتاز مفتی کے کان بھی سرخ ہو گئے۔ ہر لطیفے کے خاتمے پر اس کا خاوند کہتا "جانی وہ واقعہ بتاؤ جب تم ایک کرنل کے ساتھ کرسمس ڈانس سے واپس آئی تھیں یا اس ٹھرکی بڈھے کی کرگراہٹ بیان کرو جس نے تمہیں لان میں کھڑا کر کے دھوپ سامگری سے تمہاری آرتی اتارنی شروع کر دی تھی کہ تم سرسوتی کا روپ ہو۔"

لِلی اور درانی کا یہ طے شدہ فلسفہ تھا کہ انسان کو اخلاقی طور پر لنگوٹ بند ہونا چاہیے۔ زبانی کلامی چاہے دلوں میں حسرتوں کے تنبو تان دے۔ ایک دوسرے کا وفا شعار اور وفادار ہونا چاہیے چاہے بیس آدمیوں کو انگلی سے لپیٹ کر اوئی اوئی کراتا رہے۔ دل کا پردہ اور آنکھ کی شرم ہونی چاہیے۔ کپڑے چاہے پہن لے۔ دل نہیں مانتا تو نہ پہنے۔

دونوں میاں بیوی آرٹ کے رسیا اور مصوری مجسمہ سازی کے دیوانے تھے۔ ان کے پاس ملکی اور غیر ملکی رنگوں کے نادر نمونے تھے اور انہوں نے گھر کا سب سے بڑا کمرہ عجائب گھر کے طور پر سجا رکھا تھا۔ درانی کبھی کبھی پنڈی، پشاور جاتا تو لِلی کو ہمارے پاس لاہور چھوڑ جاتا۔ وہ ریلوے سٹیشن کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رہا کرتی تھی جہاں ریلوے کے بڈھے اینگلو انڈین آفیسر اور خیبر میل اور ہوڑہ ایکسپریس کے ڈرائیور بریک جرنی کیا کرتے تھے۔ رات کے وقت لِلی ہال روم میں بھنبیری کی طرح ناچا کرتی اور لٹو کی طرح وہیں کسی صوفے میں گر کر سو جایا کرتی۔ جب بھی اس کا موڈ آن ہوتا وہ اپنے ولایتی رقص کا نظارہ کروانے کے لیے ہم کو اپنے ہوٹل ضرور بلوایا کرتی اور پھر صبح اذانوں کے وقت واپس جانے دیا کرتی کہ رات کو ٹوٹے ٹوٹے کر کے استعمال کرنا اس کے نزدیک رات کے ساتھ زبردستی کرنے کے برابر تھا۔ وہ رات کا بڑا احترام کرتی تھی۔ انگریز کی پرستار اور ولایتی تہذیب کی عاشق تھی۔ میلہ چراغاں اس کے روم روم میں تھا اور وہ گز بھر سے زیادہ میلہ چراغاں کی بولیاں بلا تکان سن سکتی تھی۔ ایک بولی پر دوسری، دوسری پر تیسری، ٹھکا ٹھک ٹھک...... چکا چک چک......

لِلی ایک اعلیٰ درجے کی آرٹ کرٹک ہی نہیں تھی، اعلیٰ اظہار کی مصور بھی تھی۔ آئل میں کام کرتی۔ برش اور پچولا دونوں پر ایک سی قدرت تھی، رنگوں کے استعمال میں اس کی آنکھ استاد اللہ بخش جیسی تھی۔ موضوعات زیادہ تر لینڈ سکیپ تھے۔ کانسٹیبل کے انداز کے یا پھر بچوں کے چہرے اور جاتے ہوئے بزرگوں کی پشتیں۔ ایسی اچھی مصور سخت کام چور اور اوّل درجے کی ہڈ حرام بھی تھی۔ تصویر شروع کر لیتی اس کے بعد کینوس کو آئل پلا کر اور بنیادی رنگ لگا کر [illegible] نسیاں میں پھینک کر بھول بھال جاتا کہ کچھ شروع بھی کیا تھا اور جو کبھی درانی گودام میں سے اٹھا کر لے آئے تو اس کے ساتھ لڑائی کرنا

کہ میری چیز کو بلا پوچھے کیوں ہاتھ لگاتے ہو اور کس لیے اٹھا کر لائے ہو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ میرا کام جانے اور
محبت، ہمارے گہرے اور قریبی رشتے میں تم کیوں دخل دیتے ہو۔

حبیب درانی کا کوئی انشورنس کا کام تھا۔ بہت لمبا چوڑا اور کافی پیچیدہ، کئی بار اس نے سمجھانے کی کوشش کی
مرتبہ ہم نے سمجھنے کی کوشش کی لیکن ہم دونوں ہی کسی نتیجے پر پہنچے بغیر اس معاملے کو ایسے ہی چھوڑ گئے۔ اس کا صدر دفتر
میں تھا۔ کام زیادہ تر جی ایچ کیو پنڈی میں تھا۔ پھر اس کو رسالپور اور میرن شاہ بھی جانا ہوتا۔ فوجیوں کی تو انشورنس ہوتی
ہوگی۔ ان کے سامان حرب کی ترسیل اور اس کی انشورنس میں حبیب درانی کی کمپنی کا بھی کوئی گہرا عمل دخل تھا۔ کمپنی
انگریزوں، ڈچوں اور اطالوی جہاز رانوں کے ڈائریکٹروں پر مشتمل تھی لیکن ان گوروں کے درمیان وہ دیسی گورا
گوروں سے بھی زیادہ گورا اور ان کے کلچر، تہذیب اور کلچر میں مکمل طور پر گندھا ہوا تھا، کمپنی کے لیے رگ جاں کی
رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ درانی کمپنی کا ملازم ہونے کے باوصف اس کا حاکم اعلیٰ بن کر رہتا اور حاکم اعلیٰ ہی نظر آتا
کے لیے قیام، طعام، رخصت، ضیافت، ملاقات پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ خود اپنا باس تھا۔ ہم اس کو جتنے دن چاہتے
میں روک لیتے، جب اجازت دیتے تو وہ چلا جاتا۔ اگر لٹی کو ہمارے ساتھ رہنا منظور ہوتا تو وہ ہمارے ساتھ خرمستیوں
مشغول رہتی۔ اگر جانا پسند ہوتا تو درانی کے ساتھ کراچی چلی جاتی۔

بڑے اچھے دن تھے اور بے حد سہانی راتیں۔ ہمارے اوپن تھیٹر کے شانتی نکیتن میں طلبا اور طالبات کی
بڑھ رہی تھی اور ہم شام کے وقت اپنی اپنی مرگ چھالا لے کر تھیٹر کی سیڑھیوں پر براجمان ہو جاتے۔ پھر جس کو جس کی
رابطہ قائم کرنا ہوتا اس کے چرنوں میں جا کر بیٹھ جاتا اور گیان دھیان کے موتی چننے میں مصروف ہو جاتا۔

ایک روز سہ پہر کے وقت جب ہم شام کی چائے پی رہے تھے اور نکمے نکمے کے فلسفوں میں مصروف تھے
درانی اپنے سنڈے بیسٹ میں ملبوس، پگ سکن کا بریف کیس اٹھائے دروازے میں داخل ہوا تو ہم سب نے اس
استقبال میں ایک پر جوش نعرہ مارا اور تالی بجا کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے ناف کے برابر ہاتھ اٹھا کر چوکے کا سا
کرتے ہوئے بازو لہرایا اور قوس بنا کر نیچے لٹکا دیا۔

ممتاز مفتی نے پوچھا "لٹی کہاں ہے؟"

کہنے لگا "وہ نہیں آئی۔"

حفیظ رومانی نے کہا "بکواس مت کرو اور ہمارے ساتھ چالاکیاں نہ جھاڑو۔ اس کو نیچے کھڑا کر آئے ہو اور
غچہ دیتے ہو۔"

لیکن پیشتر اس کے کہ درانی کوئی جواب دیتا۔ ہم سب نے اونچی آواز میں پکارا "آ جاؤ لٹی آ جاؤ، سرپرائز
چکا۔ خبر ہو گئی۔ اب آ جاؤ۔"

لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ سرتاج نے اور مفتی نے سیڑھیوں پر جا کر دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ پہاڑی سے نیچے
نگاہ ڈالی تو سڑک پر بھی کوئی موجود نہ تھا...... ہم سب کو یقین ہو گیا کہ لٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی اور ڈاکٹروں نے

نہیں دی ہو گی۔ مفتی نے ایک سیانے اور تجربہ کار خاوند کی حیثیت سے کہا "درانی! اچھا کیا جو تم اسے
پر جانے کی اجازت
ساتھ نہیں لائے۔ ایسے موقعوں پر نہ تو سفر کرنا چاہیے، نہ ہی اونچی ایڑی کے جوتے پہننے چاہئیں...... بہت اچھا کیا جو اسے
ساتھ نہیں لائے۔"

درانی نے کہا "مفتی جی! وہ میرے ساتھ اس لیے نہیں آئی کہ ہم دونوں میں طلاق ہو چکی ہے اور اب ہمارا ایک
دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں۔"

ہم سب یہ خبر سن کر گنگ ہو گئے۔ کسی سے کوئی بات نہ بن پڑی۔ کوئی بول ہی نہ سکا۔ آپ بھی وہاں ہوتے تو
ہماری طرح پتھر کا بت بن جاتے۔

درانی نے چائے ڈالتے ہوئے کہا "عجیب سی عورت نکلی حرام زادی۔" بات کرتے کرتے وہ رک گیا۔ ہم تو پہلے
ہی ڈرے ہوئے تھے، سٹوڈیو میں بالکل خاموشی چھا گئی۔

کہنے لگا "یہ موسٹ ماڈرن اور الٹرا کلاس عورتیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔ ان سے دوستی تو کی جا سکتی ہے،
شادی نہیں۔ خواہ مخواہ میرے نو سال برباد کیے اور میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر سارا گھر برباد کر دیا...... میں آپ سب کو نصیحت
کروں گا کہ ایسی سنہری بلا سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جائے۔ اپنے مستقبل کو محفوظ رکھا جائے، اپنی زندگی کو بچایا جائے۔"

درانی ہماری پروا کیے بغیر آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ پیتا رہا اور چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر
غصے کے، محرومی کے اور دیوانگی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم میں سے کسی کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

اصل میں لٹی اس قدر کھلی ڈلی، شوخ چشم اور بے حیا عورت تھی کہ اس کے ساتھ دوستی لگانے میں تو یقیناً مزا تھا
لیکن اسے بیوی بنا کر گھر پر رکھنا مشکل کام تھا۔ کوئی کب تک دوسروں کو سمجھا سکتا ہے کہ ہم آرٹسٹ لوگ ہیں اور کھلی کھلی
باتیں کیا کرتے ہیں۔ ایسی باتیں کرنے سے دل تنگ اور ذہن زنگ آلود نہیں ہوتے لیکن لوگ تو یہ دلیل نہیں مانیں گے، وہ
تو اپنے چوکھٹے میں رکھ کر پرکھیں گے۔

مفتی نے حوصلہ کر کے کہا "دیکھو درانی یہ تو مشکل بات اور ایسے تکلیف دہ موقع پر روایتی غم خواری کچھ مدد بھی
نہیں کرتی لیکن یاری کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلا تو جا سکتا ہے، مدد چاہیے ہو تو نہ ہو!"

درانی نے کہا "کچھ بھی نہیں مفتی جی، ہمارے مزاج ایک جیسے نہیں تھے۔ ہماری طبیعتوں میں بنیادی فرق تھا۔
ہماری طبیعت مختلف تھے اور...... اور...... میں تو شاید نباہ کر لیتا اور کسی حد تک اپنی طبیعت بدل بھی لیتا لیکن وہ اپنی جگہ پر
ایک ضدی، اڑیل خچر کی طرح جمی ہوئی تھی اور ہلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔"

حفیظ نے کہا "ذرا وضاحت سے بیان کرو، تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

درانی نے کہا "یہ طلاق میری طرف سے نہیں ہوئی۔ اس کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس نے زور ڈال کر اور زور
لگا کر شادی فسخ کروائی ہے۔ میں تو اس واقعے سے چشم پوشی بھی کر لیتا لیکن وہ نہیں مانی۔ کہنے لگی اب میں تمہارے ساتھ
جھوٹ نہیں بول سکتی اور جھوٹی بن کر رہ بھی نہیں سکتی، اس لیے مجھے طلاق دے دو اور جلد دے دو۔ تم نے سب کچھ اپنی

آنکھوں سے تو دیکھ لیا ہے۔''

جب ہم نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ کہنے لگا۔ ''میں بھی آخر خاندانی آدمی ہوں۔ درانی پٹھان ہوں، میری غیرت یہ سب کچھ کیسے گوارا کر سکتی تھی۔ میں نے اس کو پکڑ لیا!''

''کہاں پکڑ لیا خان صاحب۔'' حفیظ رومانی نے مزا لیتے ہوئے کہا۔

''اپنے گھر میں۔ اپنی کوٹھی کے اندر۔ بلا کا ہاؤس میں۔ موہٹا پیلس کے ساتھ...... سب سے آخری کوٹھری میں گھسے ہوئے تھے حضرت صاحب۔ سٹور روم میں! حالانکہ ان کو پتہ تھا یہ میرے آنے کا وقت ہے۔ میں نے فون کیا تھا، بتا دیا تھا۔ ریسپشن پر جانے کا بتایا تھا۔''

''اور تم نے طلاق دے دی۔'' سرتاج نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کسی نے صلح صفائی بھی نہیں کرائی؟''

''صلح صفائی کی کیا ضرورت تھی سرتاج بھائی! اس نے خود مجھ سے کہا۔ آپ نے سجیشن دیا۔ خود وکیل صاحب کو فون کر کے بلایا اور مجھے سامنے بٹھا کر ڈیل کروایا۔''

زوبی نے کہا ''اور وہ بھاگ گیا؟''

''بھاگنا ہی تھا جی اور کیا کر سکتا تھا۔ میرے غصے کے سامنے تو پھر بھاگنا ہی پڑتا ہے۔ میری شکل دیکھ کر بھاگ گیا۔''

جب ہم سے کوئی اگلا سوال نہ بن پڑا تو درانی نے خود ہی کہا ''دفع کرو جی، خس کم جہاں پاک ہو گیا۔ نہ اس نے کوئی ڈیمانڈ کیا نہ میں نے۔ وہ اپنا اٹیچی کیس ہاتھوں میں اٹھا کر چلی گئی اور میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔''

مفتی نے کہا ''معاف کرنا یار درانی، مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے، تمہارے جیسی۔ میرے والد کی چار بیویاں تھیں اور وہ بے حد غصہ ور آدمی تھا۔ ہم نے بڑا مشکل وقت دیکھا ہے اور سارے کا سارا اپنے والد کے ہاتھوں۔ کسی غیر نے کوئی دکھ نہیں دیا۔ بس والد صاحب ہی اس کھیل کے ولن تھے...... تو یہ مرد کی ذات بڑی سنگدل اور بے وفا ہوتی ہے۔''

''تمہارے ادھر پنجاب میں ہوتی ہوگی۔'' درانی نے قدرے غصے سے کہا ''لیکن ہمارے ادھر ایسی نہیں ہوتی۔ افغانستان میں یا صوبہ سرحد یا علاقہ غیر میں!''

ہم نے اس کی دکھتی رگ کو مزید چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس سانحے کے بعد کافی دکھی معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں للّی کا پورٹریٹ اب بھی واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسک گیا تھا اور اس کی گفتگو اس حادثے کی وجہ سے کافی بے ربط ہو گئی تھی۔ بار بار زور لگا کر ہچکولے مار کر وہ اپنی گاڑی کھوبے سے نکالنے کی کوشش تو کر رہا تھا لیکن اس کے پہیے دیکھتے دیکھتے اور نیچے دھنس رہے تھے۔ اس کو للّی سے علیحدہ ہونے کا شدید غم تھا اور وہ اس کے بغیر نامکمل سا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس کا آدھے سے کم خرچ ہو چکا تھا اور باقی کا تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ درانی کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے ساری زندگی ایک چوتھائی بن کر گزارنی پڑے گی اور اس پر صبر شکر کرنا ہوگا۔

مفتی نے پوچھا ''تو وہ اب کہاں ہے...... ہماری پیاری للّی؟''

اس پر درانی نے آنکھیں چکا کر کہا ''مجھے کیا معلوم! وہیں کہیں ہوگی کراچی میں۔ مجھ سے تو کبھی ملی نہیں لیکن آپ لوگوں سے ضرور ملے گی۔ آپ سب کی بڑی قدر ہے اس کے دل میں۔''

مفتی نے کہا ''بھائی درانی تم نے جلدی کی۔ پٹھانوں والا کام کر دیا جھٹا پٹ اور فٹافٹ۔''

درانی نے کہا ''میں نے جلدی کی یا اس نے؟ وہ تو میری جان کو آ رہی تھی کہ مجھے ابھی طلاق دو۔ ابھی کاغذ لکھ کر دو...... میں نے جلدی کی! میں نے!!''

مفتی نے کہا ''مگر وہ تھا کون؟''

''کون؟ کون!'' درانی نے حیران ہو کر پوچھا ''کون کون تھا! کس کو پوچھ رہے ہو؟''

مفتی نے کہا ''بھئی وہی جو بھاگا تھا تمہارے گھر سے!''

''ہمارے گھر سے کون بھاگا تھا؟'' درانی نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہم کو تو معلوم نہیں کہ کون بھاگا تھا!''

''وہی جس کا تم ذکر کر رہے تھے۔'' مفتی نے کہا ''جو تمہارے غصے کے سامنے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔''

''اچھا وہ...... وہ تو ہمارا وکیل تھا۔'' درانی نے کہا ''وہ کچھ کہنے سنے بغیر بھاگ گیا تھا۔''

''تو یہ وکیل صاحب تھے جنہوں نے ایسی دراز دستی کی۔'' سرتاج نے پوچھا۔

درانی کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا اور وہ ہمارے درمیان بدھو سا بنا بیٹھا تھا۔ مفتی کو اس سارے معاملے پر کچھ عجیب سا شک پڑنے لگا تھا۔ اس نے صورتحال کی وضاحت طلب کرتے ہوئے کہا ''ہمیں اصل بات بتاؤ، سیدھی طرح سے کہ کیا ہوا تھا۔ پھر تمہارا کیا ردعمل ہوا اور طلاق تک کیسے نوبت پہنچ گئی۔ آناً فاناً!''

درانی نے کہا ''رات کو ایک ریسپشن تھی۔ لاسونا تا جہاز پر۔ یہ جہاز ان دنوں کراچی میں لنگر انداز تھا اور اس پر برطانیہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی ریسپشن تھی جو ہماری کمپنی کی طرف سے دی جا رہی تھی اور میں اس کا مدار المہام تھا۔ میں اور میری بیوی...... ظاہر ہے ہم دونوں ہی کو اپنی کمپنی کی نمائندگی کرنا تھی۔ مسٹر اینڈ مسز کی حیثیت سے...... اس پارٹی میں گورنر سندھ اور ان کی بیگم کے علاوہ کوئی بھی دیسی شخص مدعو نہ تھا۔ میں نے صبح سویرے للّی کو فون کر کے ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا اور وہ میرے ساتھ اپنے ڈریس اور میک اپ کے بارے میں تبادلہ خیال کرتی رہی۔ سہ پہر کے وقت اس نے مجھے فون کیا کہ میں نے اپنے ڈریس میں تبدیلی کر لی ہے اور اس کا انداز بدل دیا ہے۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا، درانی تم مائنڈ تو نہیں کرو گے۔ اگر میں اس میں تھوڑی سی عریانی ڈال لوں، اپنے لباس میں؟ میں نے کہا بالکل ٹھیک، ہرگز نہیں۔ میں تو بلکہ خوش ہوں گا کہ کانٹی نینٹ کے لوگوں سے ہمارے مشرق کا حسن کاماسوترا کے بعد دوسری مرتبہ متعارف ہوا۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے، شام کو دیکھنا۔''

زوبی نے کہا ''یہ تو بہت اچھی بات سوچی اس نے...... کام کی بات!''

سرتاج نے کہا ''اور اس بات نے اس کا بیڑا غرق کیا ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے!''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' درانی نے انگلی سے سرتاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ایک خان ہی خان کی

بات کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی بات نے بیڑا غرق کیا اور اسی واقعے نے ہماری زندگی دو ٹکڑے کر دی۔"

"شام کے وقت جب میں جہاز پر دعوت کے سارے انتظامات کر کے، پھول پتیاں اور چنڈول فانوس لگا کے جب گھر پہنچا تو نوکر نے ڈرتے ڈرتے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ میڈم اندر ہیں...... اگلے اندر......!"

میں آوازیں دیتا اور سیٹی بجاتا جب اگلے اندر گیا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ساتھ کی گیلری میں نظر دوڑائی وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ سٹور کی طرف میرا دھیان ہی نہیں جا سکتا تھا۔ نہ ہی میں اس کے بارے میں سوچ سکتا تھا کہ لتی سٹور میں ہو گی۔ میں نے اونچے اونچے آواز دینا شروع کر دی تو مجھے سٹور کے اندر سے ہلکی ہلکی کراہوں کی اور مدھم سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

میں نے بھڑاک سے دروازہ کھول کر اندر جو دیکھا تو میرے ہوش گم ہو گئے۔ میرا عزیز ترین دوست میرا سفائر جو ایک بیہودہ سی لمبی تسبیح روم ڈیکوریشن کے لیے اجمیر سے لایا تھا، وہ لتی کے ہاتھ میں ہے۔ آنکھوں سے قطار اندر قطار آنسو چہرے پر رواں ہیں۔ ہونٹ بند ہیں۔ ہر سسکی کے ساتھ ایک دانہ گراتی ہے۔ نیلے کنارے والی سفید دھوتی باندھی ہوئی ہے جو آیا لوگ باندھا کرتی ہیں۔ گلے میں بیہودہ قسم کے پھولوں کے ہار پہنے بیٹھی ہے۔ چہرے پر شدید خوف کے آثار ہیں۔ میں نے ایک دفعہ بلایا، دوسری دفعہ بلایا، پھر اونچی آواز میں بلایا لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلایا تو چہرہ اٹھا کر بولی "حبیب خان!"

میں نے چیخ کر کہا "یہ سب کیا ہے اور تم کیا کر رہی ہو؟ اور ایسا کرنے کو تم سے کس نے کہا ہے؟"

وہ میری بات سنی ان سنی کر کے اپنی کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی اور میں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر کچھ گھبرا سا گیا۔ مجھے پریشان دیکھ کر کہنے لگی "سن درانی بابا، نہ میں کہیں گئی نہ آئی۔ نہ کسی سے کچھ طلب کیا۔ نہ میں اس کوچہ باطن سے واقف تھی۔ خدا نے گھر بیٹھے اپنی نعمت عطا فرمائی۔ اب میں تمہارے کام کی نہیں رہی، نہ ہی تم میرے مطلب کے ہو۔ چلو! اپنا اپنا کام کریں اور خوش رہیں۔"

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ مفتی نے کڑک کر کہا "اوئے عقل کے کولہو تجھ سے کس نے کہا تھا سیدانی سے شادی کرنے کو...... یہ سیّدزادے بڑے ڈاہڈے لوگ ہوتے ہیں۔ کیسے بھی ہوں، انؑ کا کنکشن بڑی دور لگا ہوتا ہے۔ پلگ ڈھیلے ہو جائیں، تاریں کٹ جائیں، شارٹ سرکٹ ہو کر فیوز اڑ جائیں تو دوسری بات ہے لیکن جونہی کبھی کسی میں کرنٹ کی جھلک آ گئی، اس نے بھڑکا کے رکھ دیا، سب کچھ جلا جلو کے خاک سیاہ کر دیا...... تجھ سے کس نے کہا تھا سیدہ ارجمند سے شادی کرنے کو...... اوئے گھگھو! ہم سے ہی پوچھ لیا ہوتا!"

گھگھو بیچارا ہمارے درمیان اور بھی گھگھو بنا بیٹھا تھا۔ جب حفیظ نے مفتی کو جھڑک کر کہا "یہ نگار خانہ ہے اور ہم آرٹسٹ لوگ اپنے فن کی طلب کے لیے یہاں جمع ہوتے ہیں، روحانیت یا مذہبی پرچار کے لیے۔ آپ کی باتوں سے پرچارک کی بو آتی ہے اور اس بو کا ایک پٹ اس سارے خوشگوار ماحول کو زہر آلود کر سکتا ہے۔ مگر ہم نے مذہب، روحانیت، خدا کی باتیں یہاں شروع کر دیں تو ہم اپنے مسلک سے پھسل جائیں گے اور ہمارا یہاں جمع ہونا بے معنی ہو جائے گا۔"

مفتی بے چارہ شرمندہ سا ہو کر خاموش ہو گیا۔

میں پھر ایم اے کا امتحان دیتے ہی آزاد کشمیر ریڈیو میں ملازم ہو کر تراڑکھیل چلا گیا۔ میرے بعد اس نگار خانے کا کیا بنا اور یہاں کے دوستوں نے کیسی زندگی بسر کی، اس کا ایک بڑا حصہ تو معلوم ہے لیکن اس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں۔ لاہور سے تعلق ٹوٹ جانے کے بعد آدمی زندہ تو رہتا ہے لیکن ایسے جیسے اچھی بھلی چلتی موٹر کو گیس پر منتقل کرا لیا جائے۔ چلتی تو رہتی ہے لیکن اس میں وہ روانی نہیں ہوتی، حرکت تو ہوتی ہے لیکن تھرسٹ نہیں ہوتا۔ لاہور سے جدا ہونے والے لوگ بڑے بڑے امیر کبیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں اچھی اچھی عمدہ نوکریوں پر خوشحال اور فارغ البال تو ہوتے ہیں لیکن ان کو سوکھے کا مرض ہو جاتا ہے۔ ہر وقت ریں ریں کرتے آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ نوکری، چاکری، دولت، شہرت ان کے مرض کا مداوا نہیں کرتی۔ ساری عمر لاہور کو یاد کرتے گزر جاتی ہے اور لاہور آ نہیں سکتے۔ بس آیا ہی نہیں جاتا۔ کچھ پتہ نہیں لوہا ڈال سے...... والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

ادھر ان کے بغیر لاہور کا ایک حصہ بھی بکھر جاتا ہے۔ ٹوٹ کے گر پڑتا ہے۔ جیسے پرانی عمارت سے ایک اینٹ نکلو تو دوسری خوانخواہ گر پڑتی ہے۔ کچھ اسی طرح سے لاہور سے چلے جانے والے کے بعد لاہور کا حال ہوتا ہے...... ہمارا وہ نگار خانہ، وہ شانتی نکیتن جو سطح لاہور سے ڈیڑھ دو سوفٹ کی بلندی پر تھا، زیادہ تر بند رہنے لگا۔ پاکستان آگے کو بڑھ رہا تھا۔ کام کرنے اور زندگی بنانے کے مواقع ریڑھیوں پر کے سیر بک رہے تھے۔ سنہرا مستقبل شنگرفی لو دے رہا تھا۔ لوگ ترقی کی تلاش میں باہر نکل گئے۔ گھروں کے دروازے بند ہو گئے۔ اماں بابے کہانیاں کہنا بھول گئے۔ کوئی گھر پر ہوتا ہی نہیں تھا، کہانی کسے سناتے، بات کسے بتاتے۔

میں چار روز کی چھٹی لے کر تراڑکھیل سے پنڈی آیا تو بڑے ڈاکخانے کے پاس مجھے حبیب درانی مل گیا۔ اپنی سرخ لینڈ روور سے گینگسٹر کی طرح چھلانگ مار کر باہر نکلا اور مجھ سے لپٹ گیا کہ گھر چل، ابھی چل، فوراً چل...... تیرے لیے نئی قسم کا ڈچ چیز رکھا ہے! میں نے کہا "کونسا گھر؟ کس کا گھر؟ کیسا گھر؟ تمہارا گھر سے کیا کام!"

کہنے لگا "میں کراچی سے راولپنڈی منتقل ہو گیا ہوں۔ یہاں میری کمپنی کا کوئی دو سالہ پراجیکٹ ہے اور میں نے روز روز کے سفر سے تنگ آ کر اپنے آپ کو یہیں مقیم کر لیا ہے۔"

میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تو اس نے ایکسلیٹر پورا دبا کر کچھ ایسے جھٹاک سے کلچ چھوڑا کہ گاڑی دس چلدہ فٹ کی زقند بھر کر پھر زمین پر آ رہی۔ میں نے کہا "پہلے مجھے اتار دو، پھر یہ سرکس کام کرنا۔ مجھے تو چھٹی نپٹا کے واپس بھی جانا ہے، تم سے پوچھنے والا کون ہے، خود اپنے باس ہو۔"

ہنس کر کہنے لگا "کیا کروں یار میں ایک مرتبہ پھر وہی کنوارا لڑکا بن گیا ہوں جو اپنے ٹیم کا سینٹر فارورڈ تھا۔ ڈبیٹ سوسائٹی کا سیکرٹری اور ڈرامہ سرکل کا سٹیج منیجر...... اصل میں کنوارپنا بڑی طاقتور چیز ہے۔ بہت اونچی چھلانگ مارتا ہے۔ واپس نہیں آتا۔ شیر سیدھا تیرتا ہے، وقت رفتن آب میں......"

میں نے کہا ''للّی سے ملاقات ہوئی؟''

کہنے لگا ''چھوڑو دفع کرو۔ جس کا نام ایک مرتبہ لسٹ سے پھاڑ دیا، اس کو آ ٹا لگا کر جوڑنے سے فائدہ! یہ شادی ہے ہی بڑی واہیات چیز۔ پتہ نہیں کس نے بنائی تھی اور کس نے اس کے حق میں پروپیگنڈہ کیا تھا کہ اچھی چیز ہے۔ لعنت ان سب پر۔''

میں نے کہا ''گدھے آدمی ایسے نہ کہو، پتہ نہیں کون کون سے بڑے اور بزرگ انسان اس کے محرک ہوں گے تم بلا سوچے سمجھے بکواس کر دیتے ہو۔''

اس کا گھر پرانی وضع کی ایک بہت ہی بڑی پارسی کوٹھی پر مشتمل تھا جس کے سرونٹس کوارٹر کے پاس گھوڑوں کا اصطبل تھا۔ مجھے اس میں دو گھوڑوں کی لمبی دمیں نظر آئیں۔ وہ منہ دوسری طرف کیے دانہ کھا رہے تھے۔ کوارٹروں کے باہر ایک چھوٹے سے حوض پر تین ملازمائیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ برآمدے میں ایک بیرا سفید وردی میں ملبوس گیٹ کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ اس نے صاحب کو کار سے اترتے دیکھا تو اندر کو بھاگا اور ایک چاق و چوبند اردلی نے اس کو برآمدے میں کراس کیا۔

جب ہم گاڑی سے نکلے تو میں نے کہا ''یہ تمہارا بنگلہ ہے؟''

ہنس کر بولا ''میں نے کیا کرنے ہیں بنگلے جنگلے، یہ کمپنی کی کوٹھی ہے۔''

میں نے کہا ''ویسی ہی کوٹھی جیسی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کیا کرتی تھی؟''

کہنے لگا ''بالکل وہی بلکہ اس سے بھی زیادہ...... اب کے جو کوٹھیاں قائم ہوں گی وہ پاکستان کو فتح کر کے ولایتی سرکار کے زیرِ نگیں نہیں لائیں گی صرف ان کو اپنے تصرف میں رکھیں گی۔ اقتصادی کنٹرول کمپنی کا ہوگا، بدنی زندگی پاکستان کی اپنی ہوگی۔''

میں نے کہا ''بکواس مت کرو اور خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں ایک آزاد شہری ہوں، ایسی باتوں سے ڈرا نہیں کرتا۔''

پھر اس کے کھلے بلکہ بہت ہی کھلے ڈرائنگ روم میں چائے آ گئی جس کے ساتھ سو سو طرح کے لوازمات تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پھر للّی کی بابت پوچھا تو اس نے کہا ''خدا کی قسم مجھے ہرگز معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ اڑتی اڑتی یہ خبر سنی تھی کہ سوات کے کسی گاؤں میں رہتی ہے۔ کوئی بابا پیر ہے، اس سے دینی اور روحانی تعلیم حاصل کرتی ہے اور والی کے نواسے نواسیوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔ میں نے تحقیق نہیں کی لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ بات ٹھیک ہی ہوگی...... اور مجھے تحقیق کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔''

پھر درانی نے مجھے دماغی عوارض پر ایک لیکچر دیا جس میں اس کے گہرے مطالعے کی جھلک موجود تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بے حد فیشن زدہ، آزاد خیال اور آزاد منش، کھلی ڈھلی، عریاں نفس عورتیں جب وقت کے گونا گوں جنگلوں میں سے گزرتی ہیں تو اور سارے پل تو آسانی کے ساتھ عبور کر جاتی ہیں لیکن روحانیت کے پل پر سے سے گزرتے

ہوئے اکثر اوقات اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتیں اور دریائے حقیقت میں گر جاتی ہیں، سبھی نہیں۔ لاکھوں نہیں، ایک یا اس سے بھی کم۔

اس نے مجھے حیران اور بھونچکا پا کر بڑی شفقت سے کہا۔ ''اس میں ان بیچاریوں کا قصور نہیں ہوتا، اس جھلنگا پل کا دوش ہوتا ہے جو ان کے وجود کا بوجھ اٹھاتے ہی حق ہو کر کے دیوانہ وار جھولنے لگتا ہے اور اس کو حال پڑ جاتا ہے...... پتہ نہیں تم نے پہاڑی علاقوں میں تار کے ایسے پل دیکھے ہیں یا نہیں۔ ان پر تو پرسکون اوقات میں چلنا مشکل ہوتا ہے، اگر سارا پل اور پل کو تھامنے والے کناروں پر کھڑے فصیلوں جیسے سنگین مینار بھی جھولنے لگیں تو کون دریا پار کر سکتا ہے؟''

میں نے کہا ''پھر!''

کہنے لگا ''پھر یہ کہ شادی ہمیشہ ایک سیدھی سادی، نیک پاک، نیک چلن اور نیک اطوار، سادہ لوح اور احمق قسم کی لڑکی سے کرنی چاہیے۔ اس سے محفل تو نہیں سجتی لیکن زندگی بڑی خوشگوار رہتی ہے۔ سارا سفر بغیر تھکن کے گزر جاتا ہے۔''

''تو اب تم کسی ایسی ہی لڑکی سے شادی کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''توبہ توبہ...... توبہ۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ''میں اور شادی کروں! یعنی پھر شادی کروں!!! ایک مرتبہ پھر اس پل صراط سے گزروں جس پر پورے نو برس اور تین مہینے گزارے، مجھے کون عقلمند کہے گا۔ توبہ توبہ...... توبہ!!''

ہم چائے پیتے رہے۔ ایام گزشتہ کی باتیں کرتے رہے۔ اوپن ایئر تھیٹر کے نگار خانے میں آنے والے ایک ایک مہمان کو یاد کرتے رہے اور بیچ بیچ میں اس کو دوبارہ شادی کرنے کی تلقین کر کے اس کا غصہ مول لیتا رہا۔

اب وہ واقعی اٹھارہویں صدی کے بیچلر لارڈز کی طرح زندگی بسر کرنے کا خواہشمند تھا اور زندگی کی ڈور اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر جیون پتلی کو اپنی مرضی سے نچوانے کا آرزومند تھا۔ وہ ارادے کا مضبوط اور دھن کا پکا درانی تھا اور اس میں پٹھانوں والی ضد ہتھیار بند ہو کر اس کے آگے آگے چلتی تھی۔

جب اس نے مجھے چھوڑنے کے لیے کار سیدھی کی تو خانساماں اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ درانی نے دس دس کے دو نوٹ اس کی طرف لہرائے جو اس نے بڑے ادب کے ساتھ ڈنڈوت کے انداز میں دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیے۔ اس کے بعد کپڑے دھونے والی تینوں عورتیں، ڈرتی ڈرتی، سہمی سہمی اس کی گاڑی کے قریب آئیں تو درانی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور کہا ''یہ بے بے ہاجراں ہیں جو یہاں کسی قریبی گاؤں سے آتی ہیں اور یہ ان کی بیٹیاں ہیں داراں اور گوماں۔ دونوں بڑی محنتی، شریف اور دیانتدار لڑکیاں ہیں۔ اپنی ماں کا خیال بھی رکھتی ہیں اور اس کا ہر طرح سے ساتھ بھی دیتی ہیں۔''

لڑکیوں کی ماں نے اثبات میں سر ہلایا اور دس کا نوٹ اپنی اوڑھنی کے کنارے سے باندھنے لگی۔ درانی نے ایک خوش دل جرگہ چیف کی طرح سے پوچھا ''بے بے کیا نام ہے بھلا تمہارے گاؤں کا؟'' تو ماں کی بجائے داراں نے گاؤں کا نام بتایا اور ذرا شوخی سے میری طرف دیکھا۔ اس کا بدن قدرے بھاری اور رنگ خوب گورا تھا۔ آنکھوں میں تھوڑی سی طلب ہلکی سی اجازت اور مری مری طلب سے روکنے کی خواہش تھی۔ گوماں سانولے رنگ کی بے حد دبلی پتلی،

سڑیل مزاج، اکل کھری لڑکی تھی۔ اس کو اپنی ماں اور بہن کا یہ رویہ پسند نہیں تھا اور چہرہ قدرے موڑ کر کھڑی تھی۔ اس کے نقوش کافی تیز تھے اور ناک میں پیتل کی ایک تیز سی تیلی تھی۔

ان کے جانے کے بعد سائیس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ستے ہوئے بدن اور بھاری مونچھوں والا جھنگی شہسوار۔ اس نے درانی کو کاٹھی، لگام اور دہانے کی مرمت کا بل دیا۔ بل دیکھ کر درانی کے ماتھے پر ہلکی سی شکنیں ابھر آئیں اور اس نے تنک کر کہا "کاٹھی مرمت کرنے کے سو روپے؟"

"جی سرکار۔" جھنگی شہسوار نے کہا "ولایتی کاٹھی ہے تو ولایتی چمڑا اور ولایتی ڈوری لگی تھی۔ دونوں بک جڑی کے ہیں اور سامنے نگے کے کوکے......"

"اوئے سو روپے میں تو نئی کاٹھی آ جاتی ہے...... مکمل" درانی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"بالکل آ جاتی ہے سائیں ضرور آ جاتی ہے۔" اس نے یقین کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا "پر اس پر چمڑا نہیں ہوتا۔ اصلی چمڑا۔ اس کو کچھ اور کہتے ہیں۔ دیکھنے میں چمڑا نظر آتا ہے، پر ہوتا نہیں۔"

درانی نے کہا "یہ بڑا کاریگر آدمی ہے۔ اچھا گھڑ سوار تو نہیں البتہ اچھا بات سنوار ضرور ہے۔ اس کا والد جھنگ میں جاگیرداروں کے گھوڑوں کو ناچ سکھایا کرتا تھا اور اس......"

"وہ جناب ولایت بھی گیا تھا ڈانسیا گھوڑا لے کر۔" اس نے بات کاٹ کر کہا "میرا والد بڑا قابل آدمی تھا۔ ہم تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں نہیں، تم بھی بڑے قابل آدمی ہو۔" درانی نے جلدی سے کہا "تمہاری قابلیت کے سامنے تمہارے والد کی قابلیت ہیچ تھی۔ یہ جو فن تم کو آتا ہے، اس کو نہیں آتا ہوگا۔"

پھر اس نے بل واپس لوٹاتے ہوئے کہا "تم یہ بل رکھو کل میں شیخ صاحب سے فون پر بات کروں گا۔"

سائیس کے ایک طرف ہٹتے ہی چوکیدار ہماری گاڑی کی طرف بڑھا تو درانی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو وہیں روک دیا اور ہم کمپنی کی کوٹھی سے باہر نکل آئے۔

درانی پہلے کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ، زیادہ بردبار، بڑا خوشگوار اور بہتر انسان بن گیا تھا۔ اس کے اندر ایک عجیب طرح کی حسِ مزاح پیدا ہو گئی تھی جس کا پہلے شائبہ تک نہ تھا۔

تراڑ کھیل واپس پہنچ کر میں نے سوچا کہ یہ کس قدر اچھا ہوا کہ درانی مستقل طور پر پنڈی تعینات ہو گیا۔ میرے لیے ایک جذباتی مرکز تو طے ہوا۔ پہلے پنڈی آ کر تکے کباب کھا کر اور دو تین شو دیکھ کر واپس جا کر یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ دورہ بہت کامیاب رہا اب سچ مچ نیک انجام اور عاقبت بخیر درانی کے ساتھ رہ کر بڑا لطف آتا تھا۔

کچھ دیر میرے اس کے درمیان تار برقی جیسی خط و کتابت رہی لیکن اس کے بعد شاید ہم دونوں کو اس کی ضرورت نہ رہی۔ میرا خیال تھا کہ جب کبھی میں پنڈی جاؤں گا، اس سے مل لوں گا۔ اس نے بھی شاید کچھ ایسے ہی سوچا ہوگا۔ چنانچہ کسی کو سگنل دیے بغیر ہماری معمولی قسم کی خط و کتابت بھی ختم ہو گئی۔

یوں تو یہ بات بڑی دیر سے چل رہی تھی لیکن اس کی کوئی عملی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ آزاد کشمیر ریڈیو کو تراڑ کھیل سے کوہ مری منتقل کر دیا جائے۔ اس کے لیے سیکرٹری انفرمیشن نے بڑے وزنی دلائل دیے تھے لیکن آپریشن "اے" یونٹ ان سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اتفاق تو شاید اپنی ضد کی وجہ سے نہیں کرتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ریڈیو سٹیشن کو واقعی مری منتقل ہو جانا چاہیے تھا اور یہاں سے صرف ڈسکوں اور تین مرتبہ کی خبروں کے علاوہ کچھ زندہ اور موقع پر موجود لوگوں کے پروگرام بھی ہونے چاہئیں تھے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتے تھے کہ متعلقہ لوگوں یعنی مقرروں، سیاستدانوں، مجاہدوں اور سرکاری افسروں کو پنڈی، مظفر آباد سے بلوا کر ان کے منہ در منہ پروگرام کرائے جاتے اور موسیقی کے خانے کو نامور گائیکوں سے اور ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویوز سے براڈکاسٹ کیا جاتا۔

یونٹ کے ایک نئے کمانڈر آئے اور انہوں نے آتے ہی وزارت اطلاعات کی رائے سے اتفاق کیا اور ریڈیو سٹیشن مری منتقل ہو گیا۔

بھر گرمیوں کے دن تھے لیکن پاکستان کے لوگ ابھی پورے زور سے امیر نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے مری خالی خالی سا تھا۔ کشمیر پوائنٹ پر تو پھر کچھ رونق تھی لیکن پنڈی پوائنٹ کے سارے بنگلے خالی پڑے تھے۔ مال روڈ پر صرف وہی پانچ چھ انگریزی وضع کی دکانیں تھیں جہاں سے اب بھی ولایتی پنیر، ڈوڈوتھ پاؤڈر، مونچھوں والے کا تیل، فریش گرائپ واٹر، ہوائی بندوق کے چھرے اور سیاہ سوبرانی روسی سگریٹ مل جاتے تھے۔

ایک سہ پہر میں لوئر بازار سے کھانا کھا کر اوپر کی جانب ابھر رہا تھا کہ مجھے ڈاکخانے کی سیڑھیوں پر درانی نظر آ گیا۔ وہ اپنی ڈاک لے کر سیڑھیاں اتر رہا تھا اور اس نے جوکیوں کی کٹ پہنی ہوئی تھی۔ بغل میں چابک تھا اور منہ میں بہت ہی ٹیڑھی چھوٹی بے جیسا پائپ تھا۔ اس نے رک کر پائپ کو نئے سرے سے سلگانے کی کوشش کی تو میں جھپٹ کر اس سے چمٹ گیا۔ پھر اس کا پائپ بھی گر گیا اور بغل کا چابک بھی اور ہم دونوں بھی گرتے گرتے بچے کہ اس زمانے میں ڈاکخانے کی سیڑھیاں بہت تنگ اور بے حد عمودی تھیں۔

درانی نے سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس نے سارے فلسفے چھوڑ کر اور سارے بندھن توڑ کر پھر سے اپنا گھر آباد کر لیا ہے اور بہت خوش ہے۔ اس کی بیوی ایک شریف اور سادہ لوح گھرانے کی لڑکی ہے اور ماڈرن لائف کے نازنخروں سے زیادہ واقف نہیں۔

میں نے ٹوک کر کہا "اگر وہ واقف نہیں ہے تو تم اسے سکھا دو گے۔"

کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا "اس مرتبہ میری توبہ! بھر پایا پہلے مجھے کونسا سکھ ملا تھا جو اب ایسا کروں گا لیکن تم ابھی اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔ اپنی بھابی سے ملو، اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیو اور تازہ دم ہو جاؤ۔"

میں نے کہا "وہ بھی ساتھ آئی ہیں۔"

کہنے لگا "گدھے آدمی کوئی شادی شدہ مرد مری بھی اکیلے آتا ہے...... یا آ سکتا ہے؟ لیکن...... چونکہ ابھی ناتجربہ کار ہو، کنوارے ہو، اس لیے ایسے احمقانہ سوال کرتے ہو۔"

میں نے کہا" لیکن ابھی تو ہماری شام کی ٹرانسمیشن شروع ہو جائے گی...... اگر......"

اس نے میری کمر میں ایک زور کا دھموکا مارا اور کہا" تمہاری ٹرانسمیشن شروع ہونے میں تو ابھی پورا ایک گھنٹہ اور بائیس منٹ پڑے ہیں۔ گھر چلو...... ہم ساتھ ہی تو رہتے ہیں روز ولا میں۔ دو منٹ کی واک بھی نہیں۔"

"روز ولا کا نام سن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ یہاں سے میں روز گزرا کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا، پتہ نہیں اس کے اندر کہاں کے سردار اور جاگیردار رہتے ہوں گے اور اندر کیسی زندگی گزارتے ہوں گے۔ کیا کھاتے ہوں گے اور کیا لنڈھاتے ہوں گے لیکن میں نے اسے اندر سے دیکھنے کی کبھی خواہش نہ کی تھی، باہر سے دیکھ کر ہی مزا آ جاتا تھا۔"

جب ہم روز ولا کے اندر داخل ہوئے تو درانی نے پکار کر کہا" ڈارلنگ باہر نکل کر دیکھو، میرا جگری یار آیا ہے۔"

پہلو کے کمرے کا جالی والا دروازہ کھلا اور وہاں سے درانی کی نئی بیوی برآمد ہوئی۔ دھان پان، دراز قد، سانولی سلونی، سیاہ موٹی موٹی آنکھیں، گہری لپ سٹک، آنکھوں کے اوپر ہلکا چمکدار سا مسکارا اور کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس۔ اس نے نفیس کاٹن کے تیز کلف لگے کپڑے پہن رکھے تھے اور دو چوٹیاں کر رکھی تھیں۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے عقیدت اور محبت سے سلام کیا!

وہ گوماں تھی، داراں کی چھوٹی بہن جو اپنی ماں کے ساتھ صاحب کے کپڑے دھونے آیا کرتی تھیں اور شام سے پہلے پہلے واپس اپنے گاؤں پہنچ جایا کرتی تھیں۔

درانی نے کہا" ڈارلنگ چائے! لیکن تمہارے ہاتھ کی، خانسامے کی نہیں۔"

گوماں نے دھیمی آواز میں" ایکسکیوز می" کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

درانی نے کہا" اب تم پوچھو گے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا، کیوں ہوا اور کیونکر ہوا تو میرے پاس اس کا کوئی منطقی جواب نہیں ہے۔"

میں نے کہا" بھائی وہ تو جب میں پوچھوں گا، اس وقت تم جواب دو گے۔ میری تو سٹی گم ہو گئی ہے اور میرے پاس پوچھنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا اور میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا" نہ مجھے گوماں سے کوئی عشق ہوا نہ ہی مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہوئی جس کے بعد شادی کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ نہ میں نے کبھی اس کا نوٹس لیا نہ کبھی اس سے کوئی بات کی...... بس ایک روز دفتر میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اس طرح ٹھیک نہیں، اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ چنانچہ ارادہ باندھ لیا اور سوچنے لگا کہ شادی کسی ایسی گھریلو لڑکی سے ہونی چاہیے جو ہمارے کلچر میں گندھی بسی ہو اور جس کو سوائے اپنوں کے اور کسی کا علم نہ ہو اور میں تم کو بھی یہی نصیحت کروں گا کہ شادی جب کرنا ایسی لڑکی سے کرنا جس کی جڑیں اس دھرتی میں گہری چلی گئی ہوں اور جو اس مٹی کی مورت اور اس ہوا کی سنسناہٹ ہو۔ معصوم ہو، سادہ ہو، تعلیم یافتہ نہ ہو، سادھارن ہو، گھر بارن ہو۔ اس سے اپنے پن کی اور اپنے ہونے کی خوشبو آئے...... اب تم بتاؤ کیسا ہے میرا فیصلہ؟"

میں نے کہا" فیصلہ تو اچھا ہے مگر تم خود نالائق آدمی ہو۔ آگے چل کر کہیں یہ تمہارا فلسفہ نالائقی کا شکار نہ ہو جائے۔"

اس نے کہا" میں مانتا ہوں کہ میں سیانا، چالاک اور چرب زبان نہیں ہوں لیکن میرا خلوص مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ میری معصومیت میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔"

میں نے کہا" بھابی کا نام کیا رکھا ہے؟"

اس نے کہا" وہی، گوماں! مجھے تو یہ بہت ہی پیارا نام لگتا ہے...... گوماں...... اس میں فرانسیسی نام کی جھلک ہے اور اس کا ساؤنڈ ایفیکٹ موجود ہے۔"

میں نے کہا" اور اس کی ٹیوشن کا کیا بندوبست کیا...... مسز گوماں کی؟"

چڑ کر بولا" میں اس وقت سے کیا بکواس کر رہا ہوں اور تم کولہو کے بیل کی طرح وہیں گھوم رہے ہو...... میں اسے تعلیم دے کر اس کی معصومیت تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے وہ خلوص چھیننا نہیں چاہتا جو یہاں کی مٹی نے اس کے خمیر میں گوندھا ہے۔ میں اس کو اپنے آپ سے جدا کرنا نہیں چاہتا اب مجھے اس سے شدید محبت ہو گئی۔"

"کیا یہ ساری عمر اسی طرح سے رہے گی؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا" ان پڑھ، گھامڑ، بے علم، ناشائستہ۔"

اس نے کہا" میں نے گوماں کو انگریزی میں دستخط کرنا سکھا دیے ہیں اور بڑے لوگوں میں بس اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ دستخط کرنے آتے ہوں تو سب معاملے خود بخود نپٹتے چلے جاتے ہیں۔ سقراط ارسطو چاہے کتنی کتابیں لکھ لیں، ان کا ایک چیک بھی کیش نہیں ہو سکتا...... اس کے تین اکاؤنٹ ہیں اور تینوں یہ خود ہی آپریٹ کرتی ہے۔"

"لیکن چیک بھرنا بھی تو پڑتا ہے۔" میں نے کہا" خالی دستخطوں سے تو کام نہیں چل سکتا ناں۔"

"وہ اس کے بینکر بھرتے ہیں۔" درانی نے فخر سے کہا" اس کے بینک میں داخل ہوتے ہی سب کارندے، اسسٹنٹ منیجر بھاگے آتے ہیں اور حکم کے منتظر کھڑے ہو جاتے ہیں...... وہی اس کے چیک بھرتے ہیں یہ تو بس دستخط کر کے اور رقم لے کے آ جاتی ہے۔"

"اور اس کی ماں اور بہن داراں!...... وہ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ابھی اپنے گاؤں میں ہی ہیں۔ ان کے لیے گوماں نے ایک کینال کا پکا مکان بنا دیا ہے۔ فور بیڈ روم و باتھ، فل سسٹم، غرقی کے ساتھ۔ دو ان کے گھریلو ملازم ہیں، ایک چوکیدار۔"

میں نے کہا" گاؤں میں ملازموں کے ساتھ رہنا مشکل بھی ہوتا ہے اور مشکوک بھی۔"

کہنے لگا" ایک نوکر تو داراں کا سگا ماموں ہے اور دوسرا اس کی ماں کا سب سے چھوٹا چچا۔ منڈی میں آڑھتے کی دکان پر جنس تولا کرتا تھا۔ گوماں پچاس روپے زیادہ دے کر اپنے گھر لے آئی...... اور چوکیدار بھی ان کا کوئی رشتہ دار ہی ہے گر دور کا۔"

میں نے کہا" یہ تمہارے ساتھ خوش بھی ہے کہ نہیں۔"

ہنس کر کہنے لگا" میرے ساتھ خوش نہیں ہوگی تو اور کس کے ساتھ ہوگی۔ میں ایک بہت ہی رومانٹک عاشق اور ایک ذمہ دار اور وفا شعار شوہر ہوں...... گوماں میرے ساتھ بہت ہی خوش ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے

بنے تھے۔ مگر کچھ عرصہ دور رہ گئے۔ اب خدا کا شکر ہے!"

اتنے میں بھابی چائے لے کر آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے وردی والا ایک خانساماں تھا جس کے ہاتھ میں ٹرے اور کندھے پر نیا میز پوش تھا۔ گوماں نے میز پوش خانساماں کے کندھے سے اتارا اور ہمارے سامنے بچھا کر قرینے سے اس پر چائے کے برتن رکھ دیئے۔ میرا خیال ہے اس نے آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا تھا جس کا استعارہ پکڑ کر خانساماں کمرے سے باہر چلا گیا۔ گوماں نے بڑے سلیقے اور صفائی کے ساتھ ہماری پیالیوں میں چائے ڈالنا شروع کی اور دونوں پیالیوں کو ایک سے لیول تک بھر دیا۔ پھر اس نے ایک جیسا ایک مقدار کا ایک وزن کا دودھ ڈالا اور بڑی نفاست سے ایک مرتبہ چمچ چلا کر دودھ اور چائے کو ہم آہنگ کر دیا۔

گوماں دراصل ایک گیشا گرل تھی جو غلطی سے پنڈی کے ایک قریبی گاؤں میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کم گو، کم آمیز، کم سن ضرور تھی لیکن اس کا بدن ہر وقت بولتا، گنگناتا اور سرگوشیاں کرتا رہتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی تنگ کمر کو اپنی اوڑھنی میں اس طرح لپیٹ کر بیٹھتی تھی کہ کمر کی تنگی اور کوکھ کا خالی پن اور نمایاں ہو جاتا تھا۔ بولنے کے معاملے میں وہ بڑی کنجوس تھی لیکن جس کے ساتھ بات کرنا چاہتی تو بڑی دیر تک اور بڑی دور تک چلی جاتی۔ میں نے محسوس کیا، اس کے اندر ولایت کے سیاستدانوں کا انداز نمایاں تھا۔ وہ بات چیت کرنے سے گریزاں تھی لیکن ڈائیلاگ بڑی صفائی کے ساتھ کر سکتی تھی۔ جب وہ درانی کے سرونٹس کوارٹر سے چوبچے پر کپڑے دھونے آتی تھی تو میں نے اس میں ایک بھی خوبی نوٹ نہیں کی تھی اور اب جب وہ کپڑے نہیں دھو رہی تھی تو مجھے اس میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آنے لگی تھیں۔

گوماں ایک ٹھنڈی ٹھار، پرسکون اور ابھرے بدن لڑکی تھی۔ زیادہ خاموش اور تھوڑی سی خشمگیں کہ اس کے اعضائے بدن ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ابھی کندھوں نے سینے کو چھیڑا تو سینے نے منہ اٹھا کر ٹھوڑی اور جبڑوں سے جھگڑا شروع کر دیا۔ آنکھیں گالوں کو دھمکیاں دیتی تھیں۔ ہاتھ چلتے چلتے کولہوں کو تھپکی سی دے جاتے تھے تو کولہے پیچھے سے پہلو نکال کر سامنے کے سارے جسم سے لڑائی مول لے لیتے تھے۔ گوماں خود تو خاموش رہتی تھی مگر اس کے جسم کی اسمبلی میں ہر وقت ایک ہنگامہ سا بپا رہتا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سارے اعضائے بدن حزب مخالف کے ارکان ہوں اور وقت بے وقت ہلڑبازی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہوں۔ میرا خیال ہے درانی کو بھی اس بولتے بدن میں یہی خوبی نظر آئی ورنہ گوماں میں ایسی تو کوئی بات نہ تھی کہ ایک سمجھدار، پڑھا لکھا، نفیس مزاج، صاحب سرکار اور ملک التجار اس سے شادی کر لیتا۔

میرا اندازہ ہے کہ اس کا آئی کیو تو بالکل معمولی تھا لیکن اس کا بدن ایک مافوق الفطرت جزیرہ تھا جہاں دیومالائی دیویاں اور دیوتا قیام پذیر تھے...... گوماں کے اسرار پہلے نہ کھلے تھے، اب ذرا سے نزدیک ہو جانے کی وجہ سے اس کا پیکر ہر سوال کا حیرت انگیز جواب دے رہا تھا۔

میں تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھا، پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ایکسلسیئر ہوٹل کی چڑھائی چڑھنے لگا۔

ایسے واقعات پر انسان سوائے سوچنے کے اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ حادثہ آپ کو مار پیٹ کر، لتاڑ کر اور ذلیل وخوار

کرنے کے بعد بڑے آرام سے سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر مونچھ مروڑنے لگتا ہے اور آپ اس کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھائے بغیر صرف سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں کافی مشکل چڑھائی چڑھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ظہور پذیر ہوا۔ کس نے درانی سے کہا کہ اٹھو اور گاؤں جا کر گوماں کو بلا لاؤ۔ بلا لانے کے بعد اس سے نکاح پڑھوا لو۔ نکاح پڑھوانے سے پہلے گوماں کو منانا اور راضی کرنا ہمارا ذمہ۔ گوماں کو نئے حالات میں فٹ ان کرنا حالات کے ذمے اور تم کو خوش اسلوبی کے ساتھ اس نئی صورتحال سے گزارنے کے لیے تمہارے خوش آئند اور خوشگوار ماحول کا حسن کارکردگی۔

میں نے ریڈیو سٹیشن پہنچ کر مفتی کو یہ خوفناک، دلدوز اور جانکاہ خبر سنائی تو وہ مزے سے بیٹھا پان چباتا اور پڑیا بناتا رہا۔ مجھے ذرا سا گھبرایا اور کافی سارا سٹپٹایا دیکھ کر اس نے کہا "یہ ایسے ہی ہوتا ہے چن میرے! اور اسی طرح سے ہونا چاہیے۔ اس میں برکت ہے...... مرد بڑا گرم طبیعت ہوتا ہے۔ اس کو یہی کچھ کرنا چاہیے۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے!"

میں نے کہا "غضب خدا کا۔ للی کو چھوڑ کر گوماں سے شادی کرنا، کوئی حد تو ہونی چاہیے۔"

مفتی جی نے اپنی آنکھیں پوری کھول کر کہا "بھائی میرے للی وِلی اور گوماں شوماں ایک ہی عورت کے مختلف نام ہیں۔ مرد کو عورت درکار ہوتی ہے نام نہیں...... تم دیکھنا یہ گوماں کے عشق میں بھی ویسے ہی غرق ہو جائے گا، جیسے للی کے عشق میں تھا۔"

"ہے ہے مفتی" میں نے چیخ کر کہا "ابھی سے ہے اور اس سے زیادہ ہے۔ للی تو اس کو یاد بھی نہیں، وہ تو گوماں کے گرد بھنبیری بن کر ناچ رہا ہے۔"

"شاباش! شاباش!!" مفتی نے خوش ہو کر کہا۔ "اس کو ایسے ہی ہونا چاہیے۔ ٹھیک جا رہا ہے، راست قدم، سیدھے سبھاؤ۔"

آپ کو یاد ہوگا کہ درانی کی کمپنی نے کراچی کے ساحل پر ایک بحری جہاز میں ریسیپشن کا بندوبست کیا تھا اور مہمانوں میں سوائے گورنر سندھ کے اور کوئی دیسی مہمان نہیں تھا اور اس ریسیپشن کی وجہ سے درانی اور للی میں طلاق ہو گئی تھی!

اب کے پھر اس قسم کی ضیافت تھی لیکن جہاز منوڑہ کے جزیرہ پر کھڑا تھا۔ مہمانوں کے لانے لے جانے کے لیے خصوصی کشتیوں کا انتظام کیا گیا تھا اور ہر کشتی کے ساتھ باوردی گائیڈ چلتے تھے۔ اب کی بار پھر اس ریسیپشن میں کوئی دیسی مہمان نہیں تھا، سوائے گورنر سندھ، ان کی بیگم اور میری ذات کے۔ میں اتفاق سے کراچی میں تھا اور درانی مجھے زبردستی اس ریسیپشن میں گھسیٹ لے گیا تھا حالانکہ اس میں شمولیت کے لیے میرے پاس مناسب لباس بھی نہیں تھا۔

تقریباً سارے مغربی ملکوں کے سفیران کی بیگمات، ان کی جوان لڑکیاں اور لڑکے۔ ولایتی فرموں کے گورے سٹرا ینڈ مسز اور ان کے جوان بچے اور بہت سے امریکی فوجی جو کسی مشن پر کراچی آئے ہوئے تھے، اس دعوت میں مدعو تھے۔

جو گائیڈ مجھے منوڑہ لے جانے پر مامور تھا، وہ ایک سمارٹ سی موٹر بوٹ لیے کراچی کے ساحل پر الگ سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے سیٹ پر بٹھا کر وہ اسی طرح باادب کھڑا رہا اور ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔

جب میں منوّرہ میں کھڑے جہاز کے گینگ وے کی سیڑھیاں چڑھتا اوپر پہنچا تو عرشہ پر عین سامنے درانی اور گوماں کھڑے تھے۔ درانی نے نیل کوٹ اور دھاری دھار پتلون پہن رکھی تھی اور ان لوگوں کے درمیان گورا صاحب ہی لگ رہا تھا۔ گوماں البتہ اپنے ہلکے سلونے بلکہ بہت ہی ہلکے سلونے رنگ کے ساتھ اس کا بازو تھامے کھڑی تھی۔ اس نے ٹخنوں سے اونچی ایک ٹائٹ جینز پہنی ہوئی تھی اور اوپر لال کالر والے پولکا جمپر کو ناف سے اٹھا کر پھولدار گانٹھ دے کر باندھا ہوا تھا۔ اس کی بہت ہی چھوٹی سی کمر میں نشے میں ڈوبی ہوئی دھنی ہر حرکت کے ساتھ ارگنی سی دکھائی دیتی تھی۔

گوماں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے میرا بازو زور سے دبایا اور کہنے لگی "بھائی جان ہاؤ ڈو آئی لک؟"

میں نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا "گارجیس گوماں! گارجیس"

اس نے کہا "تھینک یو ویری مچ ان ڈیڈ...... یو آر ویری کائنڈ۔"

اس کے بعد جرمنی کا سفیر اور اس کے بیوی بچے آ گئے۔ گوماں نے ان کو پورے ڈیکورم کے ساتھ ریسیو کیا اور تھوڑی دوران کے ساتھ چل کر انہیں ہال کا راستہ دکھا آئی۔

پھر کسی اور ملک کا سفیر اور اس کا کنبہ آ گیا۔ سفیر کی بیگم شاید پہلے سے گوماں کی واقف تھیں۔ انہوں نے آتے ہی گوماں کے نازک نازک گالوں پر دو بڑے بڑے چمے دیئے اور جہاز کی بتیاں دیکھ کر کہنے لگیں۔ "یہ چراغاں بھی خوب ہے لیکن اس وقت تمہاری ذات کی جوت سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے...... یو لک مارولس!"

گوماں نے ایک بہت ہی ریفائنڈ ہیروئنا کی طرح مسز ایمبیسڈر کا شکریہ ادا کیا اور انہیں ساتھ لے کر ہال کے عرشہ پر لے گئی...... واپسی پر میں نے اسے کہا "تم اپنا کام کرو، میں جا کر اپنی سیٹ تلاش کرتا ہوں۔ پھر تم فارغ ہو جاؤ گی تو بیٹھ کر گپ کریں گے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "نہیں بھائی جان، آپ کو ابھی یہیں ٹھہرنا پڑے گا اور اچھے میزبان کی طرح میرے ساتھ ڈیوٹی دینی پڑے گی۔"

میں نے کہا "درانی جو تمہارے ساتھ ہے۔"

کہنے لگی "وہ تو ٹھیک ہے لیکن درانی کبھی کبھی بے وجہ ہنس پڑتا ہے اور پھر کافی دیر تک ہنستا رہتا ہے۔ آپ کے ہونے سے ذرا بیلنس رکھے گا۔" اتنے میں مہمانوں کا ایک اور گروہ آ گیا جس سے میرا تعارف کراتے ہوئے گوماں نے کہا "یہ میرے بڑے بھائی ہیں اور ریڈیو کے ایک بہت بڑے آفیسر اور آرٹسٹ ہیں۔"

ان سب نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملائے کہ اس زمانے میں ریڈیو آرٹسٹ، عزت اور وقار کی نشانی تھی اور لوگ ریڈیو اناؤنسروں سے ملنے کے لیے تڑپتے رہتے تھے۔

پھر جب سب مہمان آ چکے اور مہمانوں کو لانے والی موٹر بوٹیں جہاز کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں تو پینے پلانے کی محفل آراستہ ہوئی۔ اس کی مہمان نوازی کے فرائض اکیلے درانی اور کمپنی کے ڈائریکٹروں کے ذمہ تھی۔

گوماں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "آؤ بھائی جان، ہم چل کر ایک کونے میں بیٹھتے ہیں اور دکھ سکھ کہتے ہیں، ہمارا ان لوگوں سے کیا کام؟"

ہم دونوں عرشہ کے ایک ایسے کونے میں جا کر بیٹھ گئے جہاں اندھیرا تھا اور روشنی سے آنے والے کو خاص پتہ نہیں چلتا تھا کہ ادھر کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ کہنے لگی "آپ کبھی یقین کر سکتے تھے کہ میری اور درانی کی شادی ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "شادی تو ایک طرف گوماں میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم درانی پر چھاپہ مارو گی اور اسے ہمیشہ کے لیے مطیع کر لو گی۔"

کہنے لگی "اس میں چھاپے چھوپے کی کوئی بات نہیں بھائی جان، ان کو کسی ایسی بیوی کی تلاش تھی جو گھر گرہستن ہو، سادہ ہو اور ایک کونے میں بیٹھ کر خاوند کی آرتی اتارتی ہو۔"

"اور اس معاملے میں تم سے بہتر اور کون لڑکی ہو سکتی تھی۔" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "تم گاؤں کے لوگوں کا موہ، وادیٔ سندھ کا حسن اور سطح مرتفع پوٹھوہار کے علاقے کا چلن موجود ہے۔ تم سے بہتر اور کس کا چوائس ہو سکتا تھا۔"

کہنے لگی "حبیب نے میری ماں سے بات کی تو وہ جھٹ راضی ہو گئی اس سے اچھی پروپوزیشن اور کیا ہو سکتی تھی بھلا۔ ماں کی تو لاٹری نکل رہی تھی...... اماں اور داراں تو دل و جان سے مان گئیں لیکن میں اڑ گئی۔"

میں نے کہا "تمہارے اندر ایک ضدی بڑھیا موجود ہے۔ آگے کو کھینچو تو وہیں کھڑی کھڑی کھنچ کے مر جائے گی لیکن آگے قدم نہیں بڑھائے گی۔"

کہنے لگی "ٹھیک ہے میں ضدی بھی ہوں اور اڑیل بھی اور جو بات مجھے پسند نہ آئے، اسے کسی بھی صورت میں ہونے نہیں دیتی لیکن یہ پروپوزل مجھے بالکل ہی عجیب لگتا تھا۔"

میں نے کہا "تو چاہتی تھی تیری شادی کمالے گوجر سے ہو جائے اور تو اس کے بچیوں کا منہ دھلاتے دھلاتے اس جہان فانی سے کوچ کر جائے یا تیرا بیاہ بیٹھے قصائی کے بیکار لڑکے سے ہو جائے اور وہ تجھے گھر چھوڑ کر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا پھرے۔"

کہنے لگی "اگر میری کمالے گوجر سے شادی ہو جاتی تو میں نے اس کے دو بچے پیدا کر کے اودھل جانا تھا اور اودھالنے والوں نے مجھے سرگودھا جا کر بیچ دینا تھا۔ وہاں سے میں نے ایک بچہ اور لے کر واپس اپنے گاؤں بھاگ آنا تھا اور کمالے گوجر کے گھر اس کی دوسری بیوی کے ساتھ رہنا شروع کر دینا تھا۔ کمالے نے مجھے مارنا تھا، کوٹنا تھا۔ بھاگ جانے کے طعنے دینے تھے اور مجھے صرف ایک وقت کی روٹی دینی تھی۔ ایسے مشکل وقت میں میں نے کمالے کے لیے ایک بیٹی اور ایک بڑا اور پیدا کرنا تھا۔ اب میں یہاں بیٹھی ہوں۔ عرشہ جہاز پر مسز درانی، چاؤ چو مچلی۔"

میں نے کہا "تو پہلے بھی اس قسم کی بکواس کیا کرتی تھی یا اب اس کلچر نے تیرا منہ کھول دیا ہے؟"

کہنے لگی "باتیں تو میں پہلے بھی اسی قسم کی کیا کرتی تھی لیکن اس وقت کوئی میری سنتا نہیں تھا۔ اب میں صاحب اختیار ہوں۔ ایک سپیریئر پوزیشن کی مالک ہوں۔ ایک پوش خاتون خانہ اور ایک کامیاب مجلسی عورت ہوں، اس لیے سب میری بات ادب سے سنتے ہیں اور سر جھکا کے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "گوماں تو نے ایسی اچھی انگریزی کہاں سے سیکھی۔ کوئی ٹیوشن رکھی، کسی مدرسے میں گئی۔ کوئی انگلش کورس کیا یا ولایت رہ کر پریکٹس کی؟"

اس نے کہا "ان سب راستوں میں سے میں نے کوئی بھی اختیار نہیں کیا۔ پہلے پہل مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ انگریزی تو انگریزی مجھے اردو سمجھنے میں بھی خاصی دقت ہوتی تھی لیکن میں نے اپنی یہ دقت کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ آدمی چپ رہے، بالکل چپ رہے تو اس کے عیب ہنر ظاہر نہیں ہو پاتے۔ میں نے بھی جب کچھ سیکھنا ہوتا ہے تو ... کر کے آنکھیں پوری کھول دیتی ہوں۔ سارا علم سانپ کی طرح بل کے اندر چلا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ایسی انگریزی جیسی تم بولتی ہو، ایسی تو درانی بھی نہیں بول سکتا۔"

کہنے لگی "میں نے غیر ملکی عورتوں کے ساتھ انگریزی بول بول کر اور انگلش فلمیں دیکھ دیکھ کر اپنی سپوکن انگلش مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر لیا۔ اس کے بعد میں نے لنگوافون کا پورا سیٹ خریدا اور اسے سن سن کر اپنے لفظ اور اپنے لہجے میں مطلوبہ تبدیلی کی...... حبیب کتابی اور دفتری انگریزی بولتا ہے، روزمرہ سے واقف نہیں ہے۔"

میں نے کہا "اور پڑھنا لکھنا؟...... وہ؟"

کہنے لگی "پڑھنے لکھنے کی میں بڑی چور ہوں۔ تھوڑا تھوڑا پڑھ تو لیتی ہوں اور پڑھ کر بخوبی سمجھ بھی لیتی ہوں لیکن مجھے لکھنا نہیں آتا۔ سوائے اپنے دستخطوں کے اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔"

میں نے کہا "یہ تو بڑی شرمناک بات ہے۔ تم جیسی ذہین و فطین اور اونچے طبقے کی عورت کو انگریزی لکھنا نہ آئے، بڑے شرم کی بات ہے۔"

کہنے لگی "میں آنکھ کے بجائے کان سے سیکھتی ہوں۔ دیکھ کر پڑھنے کے مقابلے میں سن کر جلدی سیکھ لیتی ہوں۔ آج کل میں نے فرنچ کا لنگوافون منگوایا ہوا ہے۔ ابتدائی کورس تو کر لیا ہے، اب اگلے اور اونچے درجے کے کورس کی سٹڈی کر رہی ہوں، وہ بھی ختم ہونے والا ہے...... فرانسیسی عورتوں سے ان کی زبان میں گفتگو کرتی ہوں اور مجھ پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا۔ البتہ ان کے لٹریچر سے پورے طور پر واقف نہیں ہوں۔ وہاں مجھے رک جانا پڑتا ہے لیکن فیشن، تھیٹر، فلم، فرانسیسی خوشبوئیات اور فرنچ سیکس کی تفصیلات سے پورے طور پر آگاہ ہوں...... اصل میں لٹریچر مجھے پسند ہی نہیں، ایسے ہی جھوٹی جھوٹی سی باتیں کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "جب تم نے اتنا کمال حاصل کر لیا ہے تو لکھنے اور پڑھنے پر کیوں توجہ نہیں دیتی ہو۔ کیوں اس ہنر کو حاصل نہیں کرتی ہو۔"

ہنس کر کہنے لگی "اس کا کوئی فائدہ نہیں بھائی جان۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد علم ایک مرتبہ پھر سپوکن ہو گیا ہے۔ جو شخص اچھی انگریزی بول سکتا ہے، وہ اچھی انگریزی لکھنے والے کے مقابلے میں زیادہ عزت، زیادہ دولت، زیادہ شہرت کماتا ہے۔ یہ دور بول بچپن کا دور ہے اور اس میں گفتگو کرنے والے کا درجہ سب سے اونچا مقرر کر دیا گیا ہے۔ آپ نے کبھی یو این او کی تقریریں نہیں سنیں۔ بی بی سی ریڈیو پر نامور ٹاکرز کو نہیں سنا۔ نامی گرامی پروفیسروں کے لیکچر نہیں سنے۔ سارے گفتگو کے زور پر مشہور اور نامور ہوتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی ساری توجہ سپوکن ورڈ پر دے دی ہے۔"

اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کیا رہ گیا تھا کہ میں اس کی دانش اور کمال فن کی داد دوں اور اس کی تحقیق کے آگے سر جھکا دوں۔

میں نے کہا "ظالمے اپنا نام تو بدل لینا تھا...... کیا دوسرے سارے معزز نام ختم ہو گئے تھے جو تو نے اس کمبخت گوماں ہی کو گلے لگائے رکھا۔"

کہنے لگی "پہلے پہل تو میں نے اپنا نام نوشابہ رکھا تھا کیونکہ یہ ایک کرنل کی بیٹی کا نام تھا اور وہ مجھے لڑکی بہت ہی اچھی لگتی تھی۔ اس نام سے میں نے ایک بینک اکاؤنٹ بھی کھلوایا اور اس کے دستخطوں کی پریکٹس بھی کی لیکن جب میں نے بہت سے فرنچ مرد اور عورتوں کے نام اپنے پرانے نام کے قریب تر دیکھے تو میں نے ارادہ بدل لیا۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب۔"

بولی "فرانسیسی نام تھے، دیمیا، شرماں، گویاں، للیاں تو میں بھی اپنے پرانے نام "گوماں" پر واپس آ گئی۔ میں نے فرانسیسی ہجوں کے ساتھ جی او ایم اے این ٹی لکھتی ہوں Gomant...... فرانسیسی میں آخری ٹی نہیں بولتی۔"

پہلے تو میں پھر بھی اس سے کسی موضوع پر بات کر سکتا تھا لیکن "گوماں" کے ساؤنڈ ایفیکٹ کے بعد میری آواز بالکل بند ہو گئی۔

پھر وہ مجھ سے میری نوکری، میری پوزیشن اور میری شادی کے بارے میں پوچھتی رہی کہ کب تک ارادہ ہے اور کس کے ساتھ ارادہ ہے تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میری ایک کلاس فیلو ہے۔ بڑی اچھی بڑی نیک، شریف اور میں اسی کے ساتھ کرنے کا ارادہ ہے تو اس نے بڑی محبت کے ساتھ کہا "ایک نظر مجھے دکھا دیجئے گا اور ایک مرتبہ ملا دیجئے گا، پھر میں جو کہوں اس پر عمل کیجئے گا...... اگر آپ کی مرضی ہو تو۔"

میں نے کہا "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو سب کے حکم کا غلام ہوں......" لیکن یہ فقرہ ابھی میرے منہ ہی میں تھا کہ ایک امریکی میجر نے ہمارے قریب آ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنے ساتھ اٹھا کرلے گیا۔

سامنے عرشے پر اب ڈانس شروع ہو گیا تھا اور پانچ چھ جوڑے میدان میں اتر آئے تھے۔ امریکی میجر نے پہلے گوماں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر والٹس کی دھن پر کھلتے اور بند ہوتے قدموں کا ناچ کیا، پھر اس نے گوماں کو چھوڑ کر اور پیچھے ہٹ کر فل فائٹر کا سا پینترا بنایا تو گوماں نے چٹکی تالی ایک ساتھ بجا کر اپنی گرگابی کی ایڑی چوبی فرش پر ٹکٹکائی اور بل کی طرح میجر پر حملہ آور ہو گئی۔ میجر بے وقوف نے اپنی شیخی میں ڈانس تو شروع کر لیا لیکن گوماں کے سامنے اس کے ناچ کی گھگھی بندھ گئی۔ گوماں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ یہاں وہاں سیدھی ٹیڑھی کلاک وائز اینٹی کلاک وائز کچھ عجیب انداز سے پھیریاں لے رہی تھی اور اسی کی ان بدنی لہروں میں چٹکی اور تالی کی ملی جلی صدا تسلسل کے ساتھ آ رہی تھی۔ وہ جو گلوکاری میں کاسٹینیٹ بجا کر ہسپانوی عورتیں ناچا کرتی ہیں، وہی کمال گوماں دکھا رہی تھی۔ گو اس کا لباس خانہ بدوش عورتوں سے بالکل مختلف تھا لیکن اس کے بدن کا آہنگ اور وزن وہی تھا۔ امریکی میجر نے خجل ہو کر جب اس کے اعزاز میں تالی

بجائی تو سارا عرشہ تالیوں کی گونج سے تھرا اٹھا۔ گوماں اپنا ناچ ختم کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا "بہت زیادہ تھک گئی ہو گوماں؟" تو اس نے ہنس کر کہا "تھکنا کیسا بھائی جان، یہ تو ہمارا روز کا کام ہے۔ محفلیں سجانا اور محفلیں تھرانا، یہ ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے۔"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ چھریرے بدن کا ایک خوبصورت سا نوجوان ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ گوماں نے بڑی شوخی کے ساتھ اسے "ہائے" کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نوجوان سے میرا تعارف کراتے ہوئے گوماں نے انگریزی میں کہا "میرے بھائی سے ملیے۔ ریڈیو کے ڈرامہ نگار اور مائیکروفون کے میزبان...... اور یہ ہے ان گرانسمان جونیئر، ڈچ ایمبیسی کا تھرڈ سیکرٹری، دو ہفتے کی چھٹی پر وطن واپس جا رہا ہے۔"

ہم دونوں نے گرم جوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور وہی گوماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بال رنگ میں لے گیا۔ پھر ان دونوں نے جو تباہی مچائی، اور جس جوش کے ساتھ آرکسٹرا نے ان کی سنگت کی، اس سے سارے جہاز پر ایک نئی طرز کی روشنی اتر آئی۔ مرد اور عورتیں بار بار تالی بجانے کے بعد اب مسلسل تالی پر اتر آئے تھے اور یہ سلسلہ ختم ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ نہ تالی نہ رقص، نہ ہرے نہ انگور...... ! میں نے دیکھا سمندر پہلے کے مقابلے میں کچھ اور ہو گیا تھا اور کیماڑی منوڑہ سے بہت دور چلا گیا تھا۔

اس مرتبہ جب گوماں واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھی تو واقعی تھکی ہوئی تھی۔ اس کی سانس اور دھڑکن دونوں تیز تھیں اور جوان گرانسمان تھا، وہ اپنی سیٹ کے پاس کھڑا اپنے چہرے اور گردن سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔

میں نے کہا "بس اب اور کسی کے ساتھ نہیں جانا، تمہاری تو سانس اکھڑ گئی ہے۔"

مسکرا کر کہنے لگی "یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی جان۔ کوئی ہاتھ بڑھا کر ڈانس کے لیے کہے تو اٹھنا ہی پڑتا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج میرا گلا خراب ہے اس لیے گا نہیں سکتا...... یہاں تو اٹھنا ہی پڑتا ہے۔"

اور اس کے بعد گوماں کا جو نیا عاشق اس کی طرف دونوں بازو پھیلائے ہوئے بڑھا وہ درانی تھا۔ قریب آیا تو میں نے کہا "اوئے گدھے، بھابی بالکل تھک چکی ہے۔ ذرا ٹھہر کے آنا۔" اس نے کہا "کوئی پروا نہیں۔ ناچنا گوماں کے لیے جنت کی سیر ہے۔ ہم تو اس کی ایک ایک مو پر اپنی جانیں نچھاور کر دیتے ہیں۔"

وہ نشے میں دھت ہو رہا تھا اور اس کی زبان گول ہو کر توتے جیسی ہو گئی تھی۔

گوماں ماتھے پر شکن ڈالے بغیر مسکراتی ہوئی اٹھی اور اپنے خاوند کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پھر میدان میں چلی گئی۔ وہاں ان دونوں نے گاؤں کی الہڑ مٹیاروں کی طرح اپنے اپنے بازو کراس کر کے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے۔ سر بالکل پیچھے پھینکے۔ پاؤں ذرا سے کھولے اور کیکلی ڈانس شروع کر دیا۔ ان کے اشارہ پاتے ہی آرکسٹرا نے

کیکلی کلیر دی۔ پگ میرے ویر دی، دوپٹہ بھرجائی دا...... پھٹے منہ جوائی دا۔

بجانا شروع کر دیا۔ اس عجیب و غریب بھنبھیری ڈانس کا ولایتی لوگوں پر کچھ عجیب سا اثر ہوا۔ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بھی آرکسٹرا کی دھن کے ساتھ تالیاں بجانے لگے۔ ایک دو نے ایک دوسرے کی کلائیاں پکڑ کر گھومنیاں لینے کی

کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ دو بڈھے شرابی ایک دوسرے سے کمریں جوڑ کر اور کندھوں کے اوپر ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگے اور اچھا ناچے۔ دونوں ہی کسی یورپی ملکوں کے سفیر تھے۔

جب آرکسٹرا نے بیٹ کا آخری ٹھونگا مار کر دھن بند کی اور گوماں اور درانی نے سر جھکا کر سب کو سلام کیا تو ناکام کیکلی والوں نے گوماں سے اس رقص کے بنیادی اصول کا راز پوچھا تو گوماں نے لڑکے کے ہاتھ اوپر اٹھا کر بتایا کہ تم کو مٹھی بند کر کے اپنے مضبوط انگوٹھوں کو کھڑا رکھنا ہے۔ بالکل تان کر اور لڑکی کو ان کھڑے انگوٹھوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر پھر اپنے اپنے بوجھ پیچھے پھینکنے ہوتے ہیں۔ تم لوگ تو ایک دوسرے کی کلائیاں تھام کر کھڑے ہو گئے ہو، اس طرح سے چکر کیسے لو گے۔

پھر جب انہوں نے اس ڈانس کا نام پوچھا تو گوماں نے مائیکروفون پر آ کر کہا "اس ڈانس کا نام تو "کیکلی" ہے لیکن یہ مغل بادشاہوں کی اختراع ہے۔ شہنشاہ جہانگیر نے اپنے قیام لاہور کے زمانے میں گھومتے ہوئے فواروں کو دیکھ کر حکم دیا تھا کہ اس طرح کا ایک ناچ تشکیل دیا جائے۔ جو دربار سے ہٹ کر باغ میں مرتب کیا جائے اور ناچنے والے فواروں کے درمیان، فواروں سے الٹ گھوم کر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کریں...... اس طرح یہ کیکلی ڈانس لاہور کے شاہی قلعے کے فواروں کے درمیان وجود میں آیا اور اس کے مخترع ناصر بھگت تھے۔"

سب نے اپنی اپنی ڈائریاں نکال کر شاہی قلعہ لاہور، شہنشاہ جہانگیر، کیکلی ڈانس اور ناصر بھگت کے نام محفوظ کر لیے۔

میں، گوماں کی ایسی جامع، پر تاثیر، تفصیلی اور جھوٹ کا پلندہ تعارفی تقریر پر انگشت بدنداں رہ گیا اور دل و جان سے اقرار کر گیا کہ واقعی سپوکن ورڈ کے آگے اور کسی چیز کا جادو نہیں چل سکتا۔

جب ہمیں مری میں سٹیشن چلاتے ایک طویل مدت گزر گئی تو فیصلہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ریڈیو پاکستان کا ایک نیا اور طاقتور سٹیشن قائم کیا جائے اور اس کے قریب ہی دوسری بلڈنگ میں آزاد کشمیر ریڈیو کو منتقل کر دیا جائے۔

ہمیں نئے ریڈیو سٹیشن پر کام کرتے کوئی تین مہینے گزرے تھے کہ مجھے درانی کا فون آیا کہ میں ایک مرتبہ پھر راولپنڈی آ گیا ہوں اور تمہیں دیکھنے کو ترس رہا ہوں۔ کہو تو ابھی آ کر ساتھ لے جاؤں۔ کچھ دیر گپ کریں گے۔ شام کا کھانا ساتھ کھائیں گے اور پھر تم جہاں کہو گے، تمہیں چھوڑ دوں گا۔

مجھے پانچ بج کا ایک آئٹم بھگتانا تھا لیکن استاد یوسف ظفر کے ہوتے ہوئے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ اس نے چمکدار آنکھیں شیشوں کے پیچھے سے گھماتے ہوئے کہا "فکر نہیں بھائی جی، سب ٹھیک ہو جائے گا، تم جاؤ اپنا کام کرو۔"

میں نے درانی کو فون کر دیا کہ میں فارغ ہوں، ابھی آ جاؤ...... وہ ایسا عنان گسختہ آیا کہ مجھے اس کی تھنڈربرڈ کی آواز پشاور روڈ سے سنائی دی اور وہ چشم زدن میں میرے پاس پہنچ گیا۔

موٹر سے نہیں نکلا، اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں نے بیٹھتے ہی پوچھا "بھابی گوماں نہیں آئی؟" کہنے لگا "اس کی طبیعت ناساز تھی، گھر پر ہی رہ گئی۔"

میں نے شرارتاً کہا "اچھا! تو گویا طبیعت ناساز ہو گئی ہے بالآخر!"

کہنے لگا "ویسے نہیں، ایسے ہی فلو سا ہو گیا ہے، اس لیے گھر پر ہی رہ گئی۔ تم ملو گے تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

پھر وہ میرے کام، نئے سٹیشن کی نئی ذمہ داریوں اور پروگرام "بوٹ پٹی چکا کے" کے بارے میں پوچھتا رہا جو ان دنوں فوج کے جوانوں میں بہت مقبول تھا اور جس میں صوبیدار ضابطے خاں کا رول میں ادا کرتا تھا۔

ہم باتیں کرتے، گپ لڑاتے اور صوبیدار ضابطے خاں کی مخصوص فوجی زبان میں باتیں کرتے، اس کی کمپنی کی اسی کوٹھی میں پہنچ گئے جہاں وہ دو سال پہلے رہا کرتا تھا۔ دراصل یہ کوٹھی اس کی کمپنی کا مہمان خانہ تھی اور ہر طرح سے درانی کے چارج میں تھی۔

ابھی ہم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ پردے کو حرکت ہوئی اور ایک پور بن آیا چائے کی ٹرالی لے کر اندر آ گئی۔ درانی نے میرے لیے چائے بنائی، اپنے لیے کافی گھولی اور میرے استفسار سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا کہ تمہاری بھابی کو اطلاع دیتا ہوں اور بلا کر لاتا ہوں۔

وہ اٹھ کر اندر چلا گیا میں ان دونوں کا انتظار کرنے لگا۔ جب اسے اندر گئے پانچ چھ منٹ ہو گئے تو میں نے اپنی پیالی اٹھا کر چائے پینا شروع کر دی۔ تھی تو بری بات لیکن چائے تیزی سے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

درانی جلدی جلدی قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہوا اور میرے پاس آ کر جھک کے بولا "تمہاری بھابی بھاگ گئی!"

میں نے کہا "کیا بکواس کرتے ہو اور کسے بہکاتے ہو، کوئی اور مذاق کرو۔"

وہ آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھ کر پھر کافی گھونٹنے لگا اور سنجیدگی سے بولا۔ "وہ حرام زادی، سوٗر کی بچی، بچا بچا گئی آج نہیں، ایک سال، ایک مہینہ اور گیارہ دن پہلے مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔"

میں نے چیخ کر کہا "کیا کہتے ہو، کیا کہہ گئے ہو؟ تم ہوش میں تو ہو۔"

اس نے کہا "میری گوماں، تمہاری بھابی، ہم سب کی آنکھ کا تارا ایک سال ایک مہینہ اور گیارہ دن پہلے مجھے داغِ مفارقت دے گئی اور اس کی قبر کا بھی کوئی نشان باقی نہیں رہا۔"

میں نے کہا "مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا، نہ ہی تم نے اس واقعے کی اطلاع دی۔ نہ کسی نے مجھ سے ذکر کیا۔"

اس نے کافی گھونٹنا چھوڑ کر کرسی کی پشت سے ڈھولگالی اور دونوں ہاتھ کرسی کی پشت سے گزار کر نیم دراز ہو گیا۔

میری پیالی پڑی کی پڑی کی رہ گئی۔

کہنے لگا "اس نے مجھ سے طلاق لے لی اور گلے پر انگوٹھا رکھ کر لی۔"

میں نے کہا "یہ ڈرامہ اب سوچا ہے یا مجھے لینے آئے تھے، اس وقت کا سوچا ہوا ہے!"

کہنے لگا "میں مذاق نہیں کرتا، سچ کہہ رہا ہوں اور تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ کبھی کسی مخلص، سادہ لوح، پاکباز اور اعلیٰ دوشیزہ سے شادی نہ کرنا، یہ اندر سے بالکل حرام زادیاں ہوتی ہیں، طوائفوں سے بھی بڑی ناگنیں...... تم کو گوماں کی اصل معلوم ہے ناں؟"

میں نے کہا "بالکل معلوم ہے!"

"کس طرح میں نے اس گندی موری کے کیڑے کو اپنی چٹکی میں پکڑ کر باہر نکالا۔ کس طرح اس کو ٹشو پیپر میں رکھ کر سکھایا۔ کس طرح اس پر یوڈی کلون کی سپرے کی اور کس اونچے پیڈسٹل پر اس کو رکھ کر اس کی پوجا کی...... اور کروائی۔"

میں نے کہا "یہ تو سب ٹھیک ہے......"

"اور پھر کس محنت اور توجہ کے ساتھ میں نے اس کی ماں اور دارں کی خدمت کی۔ پہلے ان کو گاؤں میں پکا مکان بنوا کر دیا پھر یہاں، پنڈی میں ان کی خواہش کے مطابق ایک کوٹھی تعمیر کروائی۔ وہ حرامزادیاں، اب بھی مزے سے وہاں رہتی ہیں اور وہ چھوٹی حرامزادی سوٗر کی بچی مجھے چھوڑ چھاڑ کر فارغ ہو گئی ہے۔"

درانی یہ بات کرتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گیا اور اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔ جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ وہ اس وقت ہے کہاں؟ تو اس نے گندی گالی دے کر کہا "میرے دوست بھی حرامزادے، اس کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ انہیں میری بجائے ہر وقت اس کتنی کی خوشنودی مطلوب تھی...... اور میں صرف انہیں کو دوش نہیں دیتا، تم بھی ان میں شامل تھے اور پوری طرح اور پکی طرح!"

میں نے بھی اسی طرح غصے میں آ کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "گدھے کے بچے ہم کو الزام دے رہے ہو اور ہمیں بدنام کر رہے ہو لیکن یہ بکواس نہیں کر سکتے کہ وہ اس وقت ہے کہاں؟"

کہنے لگا "مجھے کیا معلوم! میں کوئی اس کا ٹھیکیدار ہوں۔ دلال ہوں۔ دلا ہوں...... میری طرف سے بھاڑ میں جائے باکویں میں گرے، مجھے اس کی پروا نہیں...... لیکن تم دیکھ لینا...... اور میری بات یاد رکھنا اور اس کو اپنی ڈائری میں لکھ کر چھوڑ جانا کہ اس کا انجام عبرتناک ہو گا اور وہ در در کی ٹھوکریں کھا کر مرے گی اور کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے والا نہیں ہو گا۔"

میں نے کڑک کر کہا "کتے کے بچے، بکواس مینڈھے وہ اس وقت ہے کہاں؟"

کہنے لگا "میں کوئی اس کا پرائیویٹ سیکرٹری ہوں، اس کا تنخواہ دار ہوں یا اس کا قرض خواہ ہوں کہ مجھے اس کا ٹھکانہ معلوم ہو۔ مجھے کیا ضرورت ہے۔ مرے، دفع ہوئے، آگ لگے، بھسم ہو کر راکھ بنے، مجھے کیا؟"

میں نے زچ ہو کر کہا "اچھا پھر میں چلتا ہوں اور اپنے طور پر معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور کرسی سے نکل کر چلنے لگا تو اس نے منہ پکا کر کے کہا "وہ جو ایک ڈچ نوجوان نہیں تھا، ماں کا یار، ڈچ ایمبیسی کا تھرڈ سیکرٹری......"

"وان گرانسمان جونیئر......" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"وہی وان چوہے وان کنجر سمان! وہی۔ چپٹے منہ والا گورا۔ اس سے شادی کر لی ہے تمہاری بھابی نے اور وہ دونوں ہالینڈ چلے گئے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے۔"

"ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اوئے ہمیشہ ہمیشہ ہی ہوا ناں۔ وہ یہاں اپنی ایمبیسی سے استعفیٰ دے گیا وان کنجر سمان اور گوماں اس سے شادی کر کے اس کے ملک چلی گئی۔ اب یا قسمت یا نصیب، کون آتا ہے اور کون جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ کیا کرتا ہے وہاں وان؟ نوکری کے بغیر؟"

کہنے لگا "مجھے کیا معلوم، میں نے کوئی اس کا مچلکا کاٹا ہوا ہے جو مجھے معلوم ہو وہ کیا کرتا ہے۔"

وہاں اس کے باپ کی ایک ایلومینیم کی فیکٹری ہے۔ پہلے بھی وہیں کام کرتا تھا، اب پھر واپس اپنی پرانی پوزیشن پر چلا گیا ہوگا۔ ماں باپ کا اکلوتا بچہ ہے۔ آسودہ حال لوگ ہیں۔ فلپس کی ساری مشینوں کے ایلومینیم کے جو پارٹس لگتے ہیں، وہ یہی لوگ بناتے ہیں...... باپ تو برائے نام مینیجنگ ڈائریکٹر ہے، اصل مالک تو یہی کنجر ہے...... لیکن دونوں ہی حرامزادے ہیں۔ انہوں نے مجھے پتہ ہی نہیں چلنے دیا کہ ان کے درمیان محبت ہو گئی ہے...... یہ بے ایمانی ہے ناں، ڈس آنسٹی...... یار مار! اور پھر دیکھو میں نے گوماں پر کتنا بڑا احسان کیا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کسی کو بتاؤ تو وہ مانے گا ہی نہیں کہ میں نے گلیوں کے روڑے کو تاج شہنشہی کا مرکزی ہیرا بنا دیا...... اصل میں وہ بیوقوف ہے، کچھی نہیں۔ اتنا کچھ جاننے کے باوصف ابھی تک اندر سے پینڈو ہے۔ اس کو جب پتہ چلے گا جب وہ ذلیل وخوار ہو کر ولایت کی گلیوں میں بھیک مانگا کرے گی اور لوگ اسے حقارت سے دیکھ کر منہ پھیر لیا کریں گے۔

میں نے اس سے جب سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک شام گوماں ہی نے اس سے یہ کہہ کر بات شروع کی کہ ہمیں حقیقت حال کا سامنا کر کے ہی اپنے معاملات کو نپٹانا چاہیے اور دیہاتی لوگوں کی طرح ان پر پردے نہیں ڈالنے چاہئیں۔ کہنے لگی کہ یہ تو تم اچھی طرح سے جان گئے ہو کہ میرے اور روان کے درمیان محبت کی پیش قدمی بہت آگے نکل گئی ہے اور وہاں سے واپس نہیں آیا جا سکتا، اس لیے پیشتر اس سے کہ کوئی ناخوشگوار حادثہ رونما ہو، ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہو جانا چاہیے...... میں تم سے طلاق کی درخواست کرتی ہوں اور ہر قسم کی مالی، حقی، شرعی ذمہ داری سے آزاد کرتی ہوں۔ میں اپنا اٹیچی کیس اٹھاؤں گی اور اس گھر سے نکل جاؤں۔ پھر میں جانوں اور میری قسمت۔ میں جانوں اور میرا مستقبل!

میں نے کہا "پھر؟"

کہنے لگا "میں نے اس کو لاکھ سمجھایا، خوفناک مستقبل سے ڈرایا۔ عذاب الٰہی کی وعید سنائی۔ اپنے اکیلے رہ جانے کی درد بھری زندگی کا نقشہ کھینچا۔ اس کے پاؤں پڑا۔ رویا، اس کو مارا، مار مار کر اس کا کان ماؤف کر دیا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور جو فیصلہ اس نے کر رکھا تھا، اس پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہی۔"

"اور روان گراٹسمان؟...... وہ؟"

"اس سے میں نہیں ملا۔ نہ ہی اس نے مجھے فیس کیا۔ یہ دونوں شام کے وقت کسی ہوٹل میں ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ایک دوسرے کو حالات وواقعات سے آگاہ کرتے تھے۔ آئندہ کے پلان بناتے تھے لیکن میں وان سے نہیں ملا۔"

درانی نے کہا "ایک رات دھینگا مشتی اور مار کٹائی کے بعد جب میں نے گوماں کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھ کر اس کے نازک گالوں کو اپنے سلیپر سے پھینکایا تو اس نے روتے ہوئے کہا "تم چاہے مجھے جان سے مار دو، میرے ٹوٹے کر دو۔ میری لاش چیلوں اور کوؤں کے سامنے ڈال دو، کولہو میں چلوا دو، میں وان کو نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ میرے خوابوں کا شہزادہ اور میرے روشن مستقبل کا قطبی ستارہ ہے۔"

جب اس نے یہ کہا اور رو رو کر کہا تو میں نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور اس کا کندھا تھپک کر کہا "ہم کل صبح طلاق کے کاغذات مکمل کر لیں گے...... شادی میری قسمت میں نہیں۔"

"اور تم نے اس کو طلاق دے دی۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"اور یوں میں نے اس کو طلاق دے دی۔" درانی نے سر اٹھا کر فخر سے کہا۔

پھر ہم چائے پینے اور چیبنا چبانے لگے۔ بڑی دیر تک ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی اور ہم میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی۔ میرے پاس پوچھنے کو کچھ نہیں تھا اور اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ کمرے کا کلاک چل رہا تھا اور فقط اس کے پینڈولم کی آواز تھی جو تسلسل کے ساتھ آ رہی تھی۔

ہم دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کے سامنے نہیں تھیں۔ وہ کرسی کی پشت پر سر ڈالے چھت کو دیکھ رہا تھا اور میں چائے کی ٹرے میں بسکٹوں کو ترتیب کے ساتھ رکھ رہا تھا۔ ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اب ایسے موڑ پر آ گئے تھے جو واپسی کے لیے پہلے سے طے ہوتا ہے اور جہاں سے جدائی کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

اچانک وہ بڑے زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور اس کے قہقہے سے اتنا بڑا ڈرائنگ روم لبالب بھر گیا۔ وہ کرسی پر نیم دراز اسی طرح سر پیچھے ڈالے اور ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا اور اپنے بوٹ کی ایڑھی زور زور سے فرش پر مار کر اپنے قہقہے اونچے کرتا جا رہا تھا۔ دیوانگی کی ابتداء بھی انہی قہقہوں سے ہوا کرتی ہے اور انتہا بھی انہی پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ پھر قہقہے مارنے والا باقی نہیں رہتا...... میں اس کی ذہنی کیفیت سے خوفزدہ ہو گیا۔

اس نے اونچے اونچے ہنستے ہوئے کہا "اس حرامزادے کے ساتھ بھی اچھی ہوئی اس ماں کے یار ولندیزی سے۔ اس کا بھی ملکو ٹھپیا گیا اور ٹھیک ٹھپیا گیا...... ایسے خودرو حرامیوں کے ساتھ یونہی ہوا کرتا ہے اور اسی طرح ہوتا رہے گا۔"

جب اس نے سارے ہالینڈ کو، اس کی نیچی زمین اور اوپر چڑھتے ہوئے سمندر کو، اس کی پن چکیوں، لکڑی کے جوتوں، اور پنیر کے ڈھیلوں کو بے نقط سنا کر اپنا جی ٹھنڈا نہیں کر لیا وہ اسی دیوانگی کے ساتھ قہقہے لگاتا اور روان کی ماں، بہن کو ایک کرتا رہا۔

پھر اس کے قہقہے رُکے اور اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور اس احساس کے ساتھ کہ اس کمرے میں میرے علاوہ اور بھی کوئی ہے، وہ مسکرایا اور غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "کس کے ساتھ اچھی ہوئی؟"

کہنے لگا "اسی تمہارے یار روان کے ساتھ جس کا ناچ آگے بڑھ بڑھ کر دیکھتے تھے۔"

میں نے کہا "کیوں اس کو کیا ہوا؟"

کہنے لگا "گوماں نے اس سے بھی طلاق لے لی اور ایک بیلجیئن سے شادی کر لی...... ایک بڈھے بیلجیئن سے جو عمر میں گوماں سے تیس سال بڑا ہے۔"

میں نے کہا "تم سے کس نے کہا؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

کہنے لگا اس میں کہنے سننے کی کیا بات ہے۔ یورپ کی تجارتی دنیا میں سب کو معلوم ہے۔ سارے اخباروں میں

اس جوڑے کی نمایاں تصویریں چھپی ہیں۔ اطالوی اخباروں میں جرمن اور فرانسیسی اخباروں میں ہالینڈ اور انگلینڈ کے اخباروں میں اور بلجیم کے دو اخباروں نے تو اس پر خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں۔

میں اس کی یہ بات سن کر سکتے میں آ گیا اور اس سے مزید کچھ نہ پوچھ سکا۔ خود ہی کہنے لگا۔ "وہ بلجین بڈھا یورپ میں ایلومینیم کا سب سے بڑا صنعتکار ہے۔ اس کے اپنے ملک کے علاوہ سپین اور کانگو میں بھی کئی کارخانے ہیں۔ اس کے نام کی ہنڈی چلتی ہے۔

میں نے کہا "اور گوماں اس کو کہاں ملی؟"

"گوماں اس کو کہیں نہیں ملی۔ وہ گوماں کو ملا۔ جب وان ایلومینیم کے صنعتکاروں کی میٹنگ میں برسلز گیا تھا تو گوماں کو ساتھ لے گیا تھا۔ بابے نے اس ترت پھرت چلنت چڑیا کو دیکھا تو ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا۔" میں نے کہا۔

"ادھر اس حرامزادی نے بھی کانی ماری، تمہاری ہمشیرہ نے۔" وہ غصے سے بولا۔ "اور دونوں کی انٹ مل گئی..... اس بڈھے بابے کے سامنے اس ڈچ چوزے کی کیا حیثیت تھی۔ طلاق دینی پڑی!" پھر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فلسفیانہ انداز میں کہا "بھائی جان زندگی اور چیز ہے اور ناچ ناچنا کچھ اور ہے۔ اگر رقص کرنے سے زندگیاں بن سکتیں تو سب سے کامیاب لوگ رقاص اور طبلہ نواز ہوتے۔ اس نے ایک منٹ نہیں لگایا، تمہاری ہمشیرہ نے اور گاڑی بدل کے لوپ لائن والی ایکسپریس پکڑ لی۔"

"تو اب وہ برسلز میں ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "اور کہاں ہو گی مال زادی۔ برسلز میں رہتی ہے اور بابے بلجیم کے سارے کاروبار کی نگرانی کرتی ہے۔ تین ہزار کارکنوں میں اس بابے کے بزنس کو کنٹرول کرنا، کاروبار کی اونچ نیچ دیکھنا۔ نئے کانٹریکٹ حاصل کرنا اور ہمعصر کارخانہ داروں سے تعلقات بنا کے رکھنا یہ سب آپ کی ہمشیرہ کا کام ہے۔"

"اور بابا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی دفتر آتا ہے لیکن ایک صوفے پر نیم دراز ہو کر اونگھتا رہتا ہے۔ اس جہانگیر نے اپنی ساری سلطنت نور جہاں کے حوالے کر دی ہے۔ اب تو وہ اپنی محبوب کے حسن جہاں سوز کا نظارہ کرنے کے لیے دفتر جاتا ہے۔ اور اسے کوئی کام نہیں۔"

میں نے کہا "تم اسے ملے ہو؟"

"میری ملتی ہے جوتی۔" اس نے غصے سے کڑک کر کہا "میں درانی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ کوئی اچکا، بدمعاش یا چور بھکاری نہیں جو اس کے حضور گھگھیانے جاؤں..... لعنت!"

میں نے پوچھا یہ ساری باتیں ایسی تفصیل کے ساتھ تمہیں کیسے معلوم ہوئیں تو اس نے ہنس کر کہا "مجھے ہفتے کے ہفتے وان اس کے متعلق تفصیل سے لکھتا ہے اور اگر ممکن ہو تو اس کی ایک آدھ تصویر بھی بھیج دیتا ہے۔ وہ انٹرنیشنل کانفرنس میں ایلومینیم کے دوسرے نمائندوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ ایک سیشن کی صدارت کر رہی ہے۔ ڈنر پر ڈانس کر رہی ہے۔ غیر ملکی ساتھیوں کو اپنی اوڑھنی پر لگے شیشے دکھا رہی ہے۔ پریس میں کیٹ واک پر فیشن شو دیکھ رہی ہے..... لیکن میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ یہ ساری چیزیں میرے لیے ایک پرکاہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مجھے تو بس تجسس کے طور پر وان کے خطوں کا انتظار رہتا ہے کہ اس سالے پر کیا گزر رہی ہے۔"

میں نے کہا "اس سالے پر کیا گزر رہی ہے؟"

کہنے لگا "اس کا برا حال ہے۔ کاروبار اس کا ختم ہو گیا ہے۔ ماں باپ سے علیحدہ ہو گیا۔ ایک میوزیم میں نوکر ہے۔ وہاں دن رات کام کر کے دو وقت کی روٹی چلاتا ہے۔ آہیں بھرتا ہے اور مجنوں ہو گیا ہے۔ میں نے تو اس کو لکھ دیا ہے کہ جیسا بوو گے ویسا کاٹو گے۔ ہم درانی لوگ ہیں، دشمن کو معاف نہیں کرتے۔ لوگ ہماری تلوار ہی سے نہیں بچتے، ہماری آہ سے بھی اوٹ میں ہو کر چلتے ہیں..... اب بھگتو اور مزا لو۔"

میں نے کہا "اگر وہ معافی مانگ کر تم سے رجوع کرے تو کیا کرو گے؟"

کہنے لگا "میں اس کو معاف تو کر دوں گا لیکن اسے یہاں آ کر رہنا پڑے گا..... پاکستان۔"

میں نے کہا "بھائی وہ اتنا بڑا ڈھنڈورا اور ایسا عالمی کاروبار چھوڑ کر یہاں کیسے آ سکتی ہے۔ اس کے لیے مشکل ہو گی۔"

کہنے لگا "پھر میرے لیے بھی مشکل ہے کہ وہ وہاں رہے اور میں یہاں رہوں..... یہ تو بے غیرتی کی بات ہے۔"

میں نے کہا "اور اگر وہ تم کو اپنے پاس بلا لے برسلز..... پھر!"

کہنے لگا "برسلز میں میں کیا کروں گا۔ وہاں تو میرے پاس کوئی نوکری نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا "نہیں بھائی میرے..... اگر وہ تم کو اپنے کسی کارخانے میں کوئی اونچی پوزیشن دے دے کوئی جنرل منیجری یا   یا   تو پھر کیسا رہے؟"

کہنے لگا "یہ ٹھیک ہے۔ میں ہاتھ کی کر کے کھاؤں گا، کسی کے ٹکڑوں پر نہیں پلوں گا۔ اس شرط پر مجھے بلجیم جانے میں کوئی انکار نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا دیکھو، کچھ سوچتے ہیں۔ کوئی کرتے ہیں چارا....."

کہنے لگا "تم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہو؟ بغیر کسی مشکل کے بغیر کسی اڑچن کے، او بلیکیشن کے!"

میں نے کہا "یار حبیب اللہ خان، اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بس کوشش فرض ہے!"

بولا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے بڑی کوشش کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا "تو پھر اللہ نے ہمت کس لیے دی ہوتی ہے..... ایسی جگہوں پر ہی تو استعمال کی جاتی ہے۔"

وہ میری بات سن کر کافی مطمئن ہو گیا اور کہنے لگا "میں ایک ماہ پیشتر اپنی کمپنی کے کسی کام سے لندن گیا تھا۔ وہاں سے میں جہاز پکڑ کر دو دن برسلز بھی لگا آیا۔ اچھا شہر ہے اور کافی محنتی لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کوئی مشترکہ کاروبار شروع کیا جا سکتا لیکن میں نے زیادہ چھان پھٹک کر نہیں دیکھا..... دوسرے روز میری روانگی سے پہلے اس نے

پھولوں کا ایک زبردست بوکے میرے ہوٹل روم میں بھجوایا تھا۔"

"کس نے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ "کس نے؟"

"گوماں نے۔" اس نے ایک لمبا سا سانس لے کر کہا "بہت ہی خوبصورت دو ورقیہ کارڈ کے اندر سبز مارکر سے اس نے اپنے دستخط کیے تھے۔"

"ساتھ کوئی پیغام نہیں؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگا "پیغام تو کوئی نہیں تھا لیکن پھولوں کا اتنا بڑا گلدستہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس کے دل میں میرے لیے اب بھی محبت کے بے پناہ خزانے موجود ہیں اور اس کو میں ہر وقت یاد رہتا ہوں۔"

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ وہ درانی تھا جس نے میرے پاس روم آنے کے لیے وہی تاریخیں دی تھیں جو شہاب صاحب نے اپنے قیام روم کے لیے لکھ کر بھیجی تھیں۔ میں بھلا اس کو کیسے انکار کر سکتا تھا اور اس کا دل کیونکر توڑ سکتا تھا کہ پہلے ہی شکستہ خاطر ولایت اور پاکستان کے درمیان گھومتا رہتا تھا...... وہ تو خدا کا شکر ہو جو اس نے میرے کہنے پر اپنی آمد کا شیڈول بدل لیا ورنہ میرے لیے بڑی مشکل ہوتی۔

میری زندگی میں قابل ذکر اور توجہ طلب واقعات کا گراف کچھ ایسا عجیب ہے کہ اوپر تو چڑھ جاتا ہے، پھر اس کا کوئی اور چھور نہیں ملتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ معاملہ ہوتا ہوتا کیوں رہ گیا اور میں جو سیڑھی پر پہلا قدم رکھتے ہی ستانوے تک پہنچ گیا تھا، اٹھانوے پر کس طرح سانپ کے منہ میں آ کر پھر سے ابتداء پر پہنچ گیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ہوا کا جھونکا چلا گیا۔ تماشا ختم ہوا، ہال کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ قدم خود بخود ایگزٹ کی طرف اٹھنے لگے۔ دروازے سے نکل کر ایک مرتبہ پھر اسی زندگی میں داخل ہوگئے...... خواب گزر گیا، سامنے اصل سڑک آ گئی...... چلا چل جانب منزل چلا چل۔

اب شہاب صاحب آ رہے تھے اور میرے یہاں قیام کر رہے تھے تو دل ہر وقت دھڑ کتا رہتا تھا کہ اتنے بڑے آفیسر ہیں۔ ایسے سینئر رائٹر ہیں۔ اونچے عہدے پر براجمان ہیں۔ آئی سی ایس حکومت سے تعلق رکھتے ہیں، وہ میری قربت کیونکر پسند کریں گے اور مجھے کیسے برداشت کریں گے۔ ظاہر کہ ان کا ایک سرپرستانہ سا رویہ ہوگا اور وہ میری نگہداری سی کر کے واپس وطن چلے جائیں گے۔ جس طرح ہر بڑا آدمی دیار غیر میں اپنے ملکی طالب علموں سے کام لے کر ان سے پارسل بندھوا کر اور ٹرنک اٹھوا کر اس خدمت طلبی سے ان کو سرشار کر کے واپس چلا جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی ہوگا۔

اصل میں میری زندگی میں چند ایسے واقعات پیش آئے تھے جن میں میں ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اور وہ واقعات میری برتری کا حصہ نہیں بن سکے تھے۔

جب چارلی چپلن اپنی فلم لائم لائٹس کی بے پناہ کامیابی کے بعد روم آیا اور اٹلی کی حکومت اور اٹلی کے لوگوں نے اسے شرف مہمانی بخشا تو اس نے "فورو رومانو" میں اپنی مختصر سی تقریر کے ساتھ صرف ایک جھلک دکھانے کا وعدہ کیا...... لوگوں نے دل و جان سے قبول کیا کہ زندہ چارلی چپلن کی ایک جھلک اس کی سینکڑوں فلموں اور بیسیوں مجسموں پر بھاری تھی۔

چارلی چپلن روم آیا اور دفتروں میں چھٹی ہوگئی۔ سرکاری طور پر نہیں، ملازموں کی من مرضی سے۔ اس کی آمد کی خبریں، پریس کانفرنس، فورو میں حاضرین سے اس کا خطاب، ان سب مصروفیات کی رنگین فلمیں ہر سینما میں دکھائی گئیں۔ میں نے اور رام سنگھ تو مرنے بھی ان فلموں کو دیکھا اور چارلی چپلن کو، زندہ چارلی چپلن کو قریب سے دیکھنے کی حسرت دل میں لے کر خاموش ہوگئے۔ تو مرجی کو تو اس بات کا بہت ہی دکھ تھا کہ گھر میں آئی ہوئی گنگا تین روز کے بعد واپس جا رہی تھی اور ہم اس کے درشنوں سے محروم ہوگئے تھے۔

ویا سٹینا پر میرا ایک یار ایلیو موٹر مکینک تھا۔ اس کے ساتھ بڑی آسانی کے ساتھ ادھار چل جاتا تھا اور کئی مرتبہ وہ جان بوجھ کر بھول بھی جاتا تھا کہ اس کو ہاتھیوں کی زندگی کے بارے میں جاننے کا بہت شوق تھا اور میں نے اس کو ہاتھیوں کی جنسی زندگی کے بارے میں ایسی ایسی کہانیاں سنائی تھیں کہ اگر ہاتھیوں کو پتہ چل جاتا تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتے۔ ایلیو کافی کے دو کپ منگوا کے سامنے رکھ لیتا اور ہاتھیوں کے بارے میں پوچھتا چلا جاتا۔ اس کے اسسٹنٹ میری موٹر کے نقائص دور کرنے میں مصروف رہتے اور ایلیو ہمارے ہاتھیوں کے بارے میں گھستا چلا جاتا۔ میں کہتا، میرے والد کا ہاتھی بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور اب اس سے ٹھیک طرح سے چلا نہیں جاتا لیکن وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ ابا جی اس کے بجائے میرے کسی بھائی کے ہاتھی پر یا میری بڑی آپا کی ہتھنی موتی پر بیٹھنے کی کوشش کریں۔ اس سے برداشت نہیں ہوتا اور وہ سارے گلشن میں ایک طوفان مچا دیتا ہے......

اس روز میں اپنی "توپولینو" ایلیو سے آنکھ ملائے بغیر اس کے اسسٹنٹ کو دے کر وہاں سے کھسکا کہ میرے پاس اس روز ہاتھی کی کوئی مناسب کہانی نہیں تھی۔ میں نے کہا "میں ولا بر گیزے کا ایک لمبا چکر لگا کر دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آؤں گا اور اپنی گاڑی لے لوں گا۔"

جب میں ولا بر گیزے جانے سے پہلے "ویا وینے تو" سے گزرا کہ ایک نظر امیر اور شکیل اور تن آسان لوگوں کو ریستورانوں سے باہر مختصر کپڑوں میں دیکھتا جاؤں تو میں نے ایک چھوٹے سے مگر مضبوط ہجوم کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ مرد عورتوں کے اس مفتون ہجوم کے درمیان چارلی چپلن بیچارگی کے عالم میں ایک خوفزدہ چوہے کی طرح بھاگ رہا تھا اور اس کو حلقہ توڑ کر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا تھا۔

میں اپنے محبوب ترین ایکٹر کو اس حالت میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور ڈھڈ مار کر ہجوم کے حلقے کے اندر پہنچ گیا۔ میں نے اپنی مضبوط بانہوں کا کھلا حلقہ بنا کر چارلی چپلن کو اس کے اندر لے لیا اور ہر شدنی کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گیا۔ اپنے ایک حمایتی کو اس قدر قریب پا کر اسے تھوڑا سا حوصلہ ہوا اور اس نے گھگھیائی ہوئی آواز میں "ہوٹل ہوٹل" کہا اور اپنے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔

اس ہجوم میں سے ایک تنومند اطالین جوان چھڑپہ مار کر میرے پاس آ گیا اور اس نے میرا ہاتھ ایک طرف سے پکڑ لیا...... اب ہم دو ہو گئے اور جب دو ہوئے تو نہ صرف چارلی چپلن کو سہارا ہوا بلکہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہوئی۔ ہم ہجوم کی یورش، اس کے عتاب اور اس کے محلہ چنگال سے چارلی کو بچاتے حفاظت کناں اسے اس کے ہوٹل

کی طرف لے چلے۔ ہوٹل چند قدموں پر ہی تھا لیکن ایک مضبوط گروہ کا مقابلہ کر کے ایک گھرے ہوئے بلونگڑے کو اس کی حفاظت گاہ تک پہنچانا نہایت مشکل کام تھا...... لیکن ہم خدا کے فضل سے اس میں کامیاب ہوئے۔

ہوٹل کے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ہجوم باہر رک گیا اور حواس باختہ چارلی چپلن ہم سے ہمارے نام پوچھنے لگا۔ سالواتورے نے اپنا نام بتایا اور میں نے اپنا...... چارلی چپلن نے ہانپتے کانپتے ہمارا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کل شام پانچ بجے میرے ساتھ یہیں چائے پئیں اور مجھے عزت بخشیں۔ پھر اس نے میرا نام بڑی وضاحت سے اور اصل تلفظ کے ساتھ ادا کرتے ہوئے کہا "دیکھنا اشفاق بھولنا نہیں۔ ٹھیک پانچ بجے! ورنہ میں اور کاموں میں پھنس جاؤں گا سالواتورے، یاد رکھنا۔" ہم دونوں نے سر ہلا کر "شکریہ شکریہ" کہا۔ آگے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اتنے بڑے اعزاز کے بوجھ سے ہماری زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔

جب ہم گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تو چپلن نے ایک مرتبہ پھر پکار کر کہا "دیکھو اشفاق، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔" میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر یس سر یس سر لیکن پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ میرا نام اس وضاحت سے پکارتا تھا جیسے میرے بچپن کا ساتھی ہو اور ہم اکٹھے کھیلتے رہے ہوں...... فرسٹ ایئر میں میرے فارسی کے پروفیسر ہمدانی صاحب میرا نام اسی وضاحت سے پکارا کرتے تھے......!

اگلے دن ٹھیک پونے پانچ جب ہم ہوٹل پہنچے تو پتہ چلا کہ چارلی چپلن صاحب اس وقت اطالوی ایکٹرسوں اور ایکٹروں سے خطاب کر رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اعزاز میں ایک ریسپشن ہے۔ ہم نے کہا "ان سے کہہ دیجئے کہ سالواتورے اور اشفاق آئے ہیں۔ وہ خود ہی باہر آ جائیں گے۔"

سیکرٹری نے کہا "ایسا ناممکن ہے۔ اس وقت ان سے بات نہیں کی جا سکتی۔"

میں نے کہا "آپ ان تک ہماری چٹ پہنچا دیجئے، وہ خود ہی سمجھ جائیں گے۔"

سیکرٹری نے کہا "ایسے بڑے فنکشن میں تم لوگوں کی چٹ دینا اصول کے منافی ہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔"

سالواتورے نے کہا "ہم یہیں لاؤنج میں بیٹھتے ہیں، جب وہ فارغ ہو جائیں گے تو ان سے مل لیں گے۔ اگر ہم چلے گئے تو چپلن کو بہت افسوس ہوگا۔ دیکھ نہیں رہے تھے، وہ کس محبت کے ساتھ ہم سے التجا کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، جب یہ میٹنگ ختم ہو جاتی ہے تو ہم ان کو اپنا پیغام پہنچا دیں گے۔"

ہم دونوں لاؤنج میں بیٹھ کر رسالے دیکھنے لگے تھے۔ میٹنگ ختم ہوئی اور ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا قافلہ چارلی چپلن کو اپنے جلو میں لے کر کھانے کے ہال کی طرف چلا۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے ٹھہوکا مار کر اٹھے اور اس قطار کی طرف لپکے جس میں ہمارا گوہر تابدار جا رہا تھا۔ گارڈ نے ہاتھ بڑھا کر ہمیں روکا کہ ہیں ہیں...... پاگل ہو گئے ہو...... کدھر چلے جا رہے ہو؟

ہم واپس آ کر پھر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور رات کے دس بجے تک انتظار کرتے رہے۔
سوا دس بجے کے قریب ہم نے پھر اسی سیکرٹری سے گزارش کی کہ ایک مرتبہ جا کر چارلی چپلن کو صرف اتنا بتا دیں

کہ سالواتورے اور اشفاق لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ہمارے لیے کیا حکم ہے؟

سیکرٹری کو ہم پر ترس آ گیا اور وہ ہماری استقامت سے متاثر ہو کر ہمارا پیغام لے کر اندر صاحب کے پاس چلا گیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد خوش خوش مسکراتا ہوا آیا اور کہنے لگا "مبارک ہو، تمہارا پیغام ان کو دے دیا تھا۔ موسیو چپلن کہتے ہیں، میں ان ناموں کے آدمیوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا۔ یہ دونوں نام میرے لیے آؤٹ لینڈش ہیں!"

ہم دونوں نے اپنے اپنے بیگ اٹھائے اور باہر آ گئے۔ باہر آ کر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک لفظ بولے بغیر اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

بڑا اچھا اعزاز تھا لیکن نارس سا ہو کر رہ گیا۔

لیجو تی فرانس جا رہا تھا۔ تقریباً انہی ایام میں میرا پیرس جانے کا پروگرام تھا لیکن کسی رہنما کے بغیر یہ سفر فضول سا نظر آتا تھا۔ میں نے لیجو تی سے کہہ کر اور اس کی منت خوشامد کر کے کچھ ایسا کر لیا کہ جن دنوں میں پیرس میں چلوں، وہ بھی میرا ساتھ دے۔ اس نے کمال مہربانی سے دو دن کا آگا پیچھا کر کے تین دن ایسے نکال لیے جب ہم دونوں ایک ساتھ وہاں رہ سکتے تھے اور کافی حد تک ایک ساتھ وقت گزار سکتے تھے۔

لیجو تی یوں تو چینی آرٹ، ادب اور چینی کلچر کا سکالر تھا لیکن اس کا فرانسیسی ادب کا بھی گہرا مطالعہ تھا اور اس نے فرنچ میں کچھ ایسے تنقیدی مضمون لکھے تھے جن کا فرانسیسی سکالروں نے بطور خاص نوٹس لیا تھا۔ انہی دنوں فرانسوا ساگاں کی شہرہ آفاق تصنیف "بوں ژور تر یسی تس" مارکیٹ میں آئی تھی اور دیکھتے دیکھتے دو مہینے میں اس کے آٹھ ایڈیشن ختم ہو گئے تھے۔ لیجو تی نے اس پر ایک سیر حاصل مضمون لکھ کر "لوفگارو" کے سنڈے ایڈیشن میں چھپوایا تھا اور اس کے پاس مضمون کے حق میں اور اس کے خلاف خطوں کے انبار لگ گئے تھے۔ وہ فکشن کا آدمی تو نہیں تھا لیکن اس نے ساگاں پر تنقید کرتے ہوئے چند ایسی خیال انگیز باتیں کی تھیں جن کی طرف فرنچ مبصروں کی نظر بھی نہیں گئی تھی۔

جس شام ہمیں پلاس پگال جا کر تولولوطریک والی ونڈل کلب میں رات گزارنی تھی، اس شام اس نے کسی فرنچ مصنف سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور اس سے ٹائم طے کر رکھا تھا۔ ہمارے پلاس پگال جانے سے کوئی دو گھنٹہ پیشتر اس نے مجھے میرے پانسیوں سے لیا اور دریائے سین کے کنارے ایک پرانی وضع کے کیفے میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا "بس ذرا سی دیر کو ہم یہاں بیٹھیں گے اور پھر اگلی مہم پر چل دیں گے۔ اس کے بعد ساری رات تمہاری ہے۔"

دریائے سین کے کنارے پرانی کتابیں بیچنے والے، پرانی تصویروں اور فریموں کے کباڑیے، پرانی ڈسکوں، پرانے باجوں اور ٹوٹے پھوٹے سازوں کی بے شمار دکانیں ہیں۔ کچھ دکانیں مستقل ہیں۔ کچھ دن کے وقت فٹ پاتھ کے ساتھ لگا دی جاتی ہیں اور شام کو اپنا سودا سامان اٹھا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ کل دوسرا دن۔ ان دکانوں کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے بڑھتے ہوئے اور چھپے ہوئے ڈھابے میں جہاں کافی اور بیئر کے دور ہر وقت چلتے ہیں اور جہاں پورے فرانس کے آرٹسٹ، ادیب، شاعر، نقاد اور دوسرے فنکار جمع ہو کر اپنے اپنے خیال و افکار کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ اونچے، چیختے، مدھم، کومل اور میٹھے لہجوں اور رواں فرانسیسی میں۔

لیجو تی نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا ''ابھی سات منٹ باقی ہیں، وہ ختم ہو لیں تو پھر اندر چل کر ہم سارت سے ملیں گے اور جلدی فارغ ہو جائیں گے۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا...... میں سات منٹ تک بڑے غور سے ان کباڑیوں کے کھوکھوں اور نشستوں کو دیکھتا رہا جہاں آرٹ اور فن کے دلدادہ انہیں ایسی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کسی درگاہ پر زیارت کو آئے ہیں۔

وقت مقررہ پر جب ہم ریستوران کے اندر داخل ہوئے تو ایک طرف کچھ آرٹسٹ اپنے چوکھٹے سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھ رکھ کر اپنے ساتھیوں کو مرعوب کر رہے تھے۔ اس جگہ ایک شخص ہاتھ باندھ کر بائیں ٹانگ تہ کیے دائیں ٹانگ پر ایک کونے میں کھڑا تھا۔ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں کافی کے مگ، باقیوں کے پاس بیئر کے پکے جگ۔ وہ بار بار انہی کو منہ لگا کر بیئر پی رہے تھے اور ناموجود خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

کوئی ڈیڑھ گز چوڑی گیلری میں سے گزر کر ہم ایک کمرے کے سامنے پہنچے جس کا دروازہ نیم وا تھا۔ لیجو تی نے ہلکے سے دستک دی تو اندر سے آواز آئی ''آنترے! آنترے!!''

ہم اندر داخل ہوئے تو دریا کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس میز کرسی ڈالے دوہرے بدن کا ایک آدمی کھلے گریبان اور چڑھی ہوئی آستینوں کے ساتھ بیٹھا لکھ رہا تھا۔ اس کا کوٹ دیوار سے لٹک رہا تھا اور وہ سارے کا سارا اپنی میز پر جھکا ہوا تھا۔

ہماری آہٹ پاتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ لیجو تی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے فرانسیسی میں کہا ''یہ ہمارے بہت ہی پیارے دوست اشفاق احمد ہیں، پاکستان سے آئے ہیں اور مختصر کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے، دوسرا تیار ہے۔''

اس شخص نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ''آں شانتے۔ آں شانتے'' کہہ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس آدمی کا چہرہ بے حد سپاٹ اور آنکھیں کافی بھینگی تھیں۔ وہ ایک بور شخص تھا، شریف اور مہذب بور!

لیجو تی نے اس سے باتیں شروع کر دیں جن میں زیادہ ذکر اس کے مضمونوں کا تھا اور جن کو وہ ایک ایک کر کے پڑھ چکا تھا۔ پھر اس نے لیجو تی سے اپنے اختلاف کی بات کرتے ہوئے کچھ انداز سے بات کی کہ میں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ دونوں فرانسیسی میں گفتگو کر رہے تھے اور مجھے ان کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کچھ اسمائے معرفہ اور کچھ سیاسی تراکیب کے اشارے ضرور ملتے تھے لیکن نفس مضمون کی تفصیلات کا مطلق پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اول اول تو مجھے ان کی بات نہایت خوشگوار لگی لیکن بعد میں میں پھر بور ہو کر جمائیاں لینے لگا۔ اس بھینگے شخص نے ازراہ تشویف و خوشنودی مجھ سے پوچھا ''آپ کے افسانوی کردار اختیاری زندگی بسر کرتے ہیں یا اضطراری؟'' تو لیجو تی نے اطالوی میں ترجمہ کرنے کے ساتھ اختیاری اور اضطراری کی مختصر سی وضاحت بھی کی۔ میں نے کہا ''انہیں کہہ دیجیے کہ زندگی نہ تو اختیار ہے نہ اضطراری، زندگی تو زندگی ہے جو ہمیشہ بڑے سائز میں دستیاب ہوتی ہے۔ اب اتنے بڑے بڑے کے سامنے اتنا چھوٹا کیا کرے اور کدھر مرے۔''

اس نے میری بات کو ایک بڑے کی طرح پسند کیا اور بزرگ کے انداز میں داد دی۔ پھر اس نے مجھ سے میرے کرداروں کے بارے میں پوچھا کہ وہ عام طور پر تمہاری کہانیوں میں کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا ''میری کہانیاں زیادہ تر بچوں کے بارے میں ہیں۔''

''بچوں کی نفسیات کے بارے میں؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے کہا ''نہیں، بچوں کی روح کے بارے میں۔ ناآسودہ روح اور بے یقینی کے بارے میں...... میرا ایک کردار اپنے کتے کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور اپنے کتے سے بھی زیادہ گم ہو جاتا ہے۔ میرا ایک کردار اپنے پرکھوں کے بارے میں اپنی نانی سے بہت سارے واقعات سنتا ہے اور دکھی ہو جاتا ہے کہ وہ اب اس کے گرد کیوں موجود نہیں رہے۔ ایک اور بچہ ہے جس کا باپ اس کی بلی اپنے باس کو رشوت کے طور پر دے دیتا ہے۔ ایک لڑکا اپنے باپ سے ہر روز بلاوجہ پٹتا ہے اور پٹتا ہی چلا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ وغیرہ......''

انہوں نے میرے ان موضوعات کو بنظر استحسان دیکھا اور لیجو تی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔

کوئی آدھ گھنٹہ کی تیز و طرار بک بک کے بعد لیجو تی وہاں سے اٹھا اور اجازت چاہی، ہم دونوں نے اس بھینگے آدمی سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل آئے۔ باہر کی ہوا تازہ تھی اور فضا خوشگوار۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ ٹیوب سٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے اور تھکاوٹ کی وجہ سے خاموش تھے۔ ایک جگہ رک کر اس نے کون آئس کریم لی اور ہم اسے چاٹتے ہوئے پھر آگے جانے لگے۔ کون آئس کریم ختم ہوئی۔ ہم نے کافی راستہ طے کر لیا۔ ایک جگہ رک کر ہم نے کون کی چکنی دم کو کوڑے کی ٹوکری میں پھینکنے کے لیے سڑک کراس کی تو میں نے تھکاوٹ سے چڑ کر کہا ''ایک تو تم نے اس ہوٹل منیجر سے بھی گفتگو شروع کر کے سارا وقت ضائع کر دیا......''

لیجو تی نے کہا ''خدا کے واسطے، وہ ہوٹل منیجر نہیں، فرانس کا بہت بڑا ادیب ہے۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے، میں زبان تو نہیں سمجھتا لیکن وہ کافی ذہین آدمی دکھائی دیتا تھا...... مگر اس کے پاس اتنا سارا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

اس نے کہا ''کچھ خدا کا خوف کرو، یہاں کا بڑا نامی گرامی رائٹر ہے۔''

میں نے کہا ''میں کب کہتا ہوں کہ رائٹر نہیں ہے...... ہے اور ضرور ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسے بہت سے رائٹر ہیں جو ریلوے میں گڈز ٹرین کلرک ہیں اور اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار ہیں۔ میو ہسپتال میں کمپاؤنڈر ہیں اور سلسلہ وار ناول لکھ رہے ہیں۔ یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔ میں تو اپنے وقت ضائع کرنے کو رو رہا ہوں۔''

لیجو تی نے رک کر اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''وہ ہوٹل منیجر نہیں ہے، فل ٹائم رائٹر ہے اور اس ریستوران کے مالک نے اسے یہ کمرہ مستقل طور پر اس لیے دے رکھا ہے کہ یہ ایک عزت افزائی کی بات ہے۔ مالک کی توقیر ذات ہے۔''

میں نے کہا ''چلو فل ٹائم رائٹر سہی، لیکن ایسے تو بہت سے رائٹر ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے پاس تو گاڑی نہیں رک سکتی ناں۔''

اس نے جل کر کہا" یہ فرانس کا سب سے بڑا ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور دانشمند انسان ہے..... صرف فرانس ہی نہیں دنیا کا سب سے بڑا رائٹر ہے۔"

میں نے کہا" ہم نے تو کبھی اس کا نام نہیں سنا۔"

کہنے لگا" اگر تم نے سارت کا نام نہیں سنا تو تم جاہل ہو، پاگل ہو، پسماندہ ہو۔"

میں نے ذرا سوچتے ہوئے پوچھا۔" سارت سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

اس نے چڑ کر کہا" سارت سے میری مراد سارت ہے۔ اس نام کا کوئی دوسرا آدمی اس وقت روئے زمین پر موجود نہیں..... سارت!"

میں نے کہا" وہ تو..... سارتر ہے! ہمارا محبوب ترین آتھر۔"

اس نے جھلا کر کہا" سارتر تمہارے جیسے ان پڑھ اور فرانسیسی نا آشنا لوگ کہتے ہوں گے۔ اس کا نام سارت ہے..... سارت۔"

جب میں نے یہ سنا کہ میں سارتر سے مل کر اور اس سے ہاتھ ملا کر آیا ہوں تو میری تو روح فنا ہو گئی۔ میں نے لنچو تی سے کہا" ابھی واپس چلو، اسی وقت، اسی لمحے..... مجھے جا کر اس سے ملنا ہے اور بتانا ہے کہ اس کے بہت سے عاشق اور شیدائی میرے ملک میں موجود ہیں اور ہر وقت اس کے نام کی مالا جپتے ہیں۔ محمد حسن عسکری، ڈاکٹر اجمل، پروفیسر اکرم سی اے قادر، سارے غیر ترقی پسند ادیب، کافی ہاؤس میں بیٹھنے والے وکلا، شاعر، صحافی..... ہم تو ان کو پوجتے ہیں اور میں بھی ان میں شامل ہوں۔ ابھی واپس چلو۔ میں جا کر ان سے معافی مانگوں۔ ان سے معذرت کا اظہار کروں اور ان سے تحریری سرٹیفکیٹ لوں کہ میں ان سے ملا ہوں..... چلو چلو..... جلدی کرو۔"

لنچو تی نے ایک زہریلی بڈھی مائی کی طرح کولہے پر ہاتھ رکھا اور کہا" تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو، ہوش تو ٹھکانے ہیں۔ تم نے سارت کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ ایک دکاندار، چوکیدار، بھڑوایا چپڑاسی، بھک منگا یا اپنے جیسا دیوانہ۔ کیا سمجھتے ہو تم اس کو۔ دنیا کے عظیم فلسفی کو، اس سے روز روز کون مل سکتا ہے۔ کیسے مل سکتا ہے کیونکر مل سکتا ہے..... تمہارے سر میں جو اک گرام بھیجا تھا، وہ باقی ہے یا پگھل کر کنپٹیوں کے راستے نکل گیا۔"

لنچو تی کے بارے میں باؤ سائی مجھے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا" اوئے کس کے ساتھ یاری لگائے پھرتے ہو۔ اس کا تو نام بھی ڈبل گالی ہے، دفع کرواسے۔"

دیکھو جی کتنا بڑا اعزاز ملا تھا مجھے جو دیکھتے دیکھتے، میری نظروں کے سامنے ہوا میں تحلیل ہو گیا اور باقی کچھ بھی نہ بچا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے اپنی تین مہینے کی تنخواہ پادری سانتریلی کے نام لکھ کر ان سے درخواست کی کہ ریڈیو ٹرانسمیشن کا کام وہ سنبھالیں اور مجھے فرانس جا کر اپنی فرانسیسی کا کورس مکمل کرنے دیں۔ پادری جی نے رائے دی کہ مجھے اتنی بڑی رقم سے ہاتھ دھونے کے بجائے روم کی کسی فرنچ درسگاہ میں داخلہ لے کر اپنا کورس مکمل کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے فرانس جانا، وہاں رہنا، نئے سرے سے خرچہ کرنا، روم میں بھی اپنے کمرے کا باقاعدگی سے کرایہ دیتے جانا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔

لیکن میرے سر پر گرینوبل یونیورسٹی کا بھوت سوار تھا جہاں کل جہان سے لڑکے اور لڑکیاں مرد اور عورتیں، بڈھے اور بڈھیاں فرانسیسی پڑھنے آتے تھے اور فارغ التحصیل ہو کر ایک بہت ہی خوبصورت سرٹیفکیٹ اور رنگین تصویر والا نتائجی کارڈ لے کر جاتے تھے..... پھر اتنے عرصے بعد ایک مرتبہ اور طالب علمی کے مزے لوٹنا اور یونیورسٹی کے کمروں اور اس کے لانوں کی خوشبوؤں سے آشنا ہونا، کمال کا تجربہ تھا، آزادی، بےفکری، لاتعلقی، محفلیں، مجلسیں، سیمینار، چہلیں، ٹھٹھ گپیاں، اس کے مقابلے میں تین ماہ کی تنخواہ کی کیا حیثیت تھی اور نئے خرچ کیسے ڈرا سکتے تھے۔ میں نے یونیورسٹی خط لکھا اور داخلہ لے لیا۔

جس روز میں ڈپلومہ ان فرنچ کا کورس کرنے گرینوبل یونیورسٹی پہنچا تو غیر ملکی طلباء اور طالبات کا ایک جم غفیر رجسٹریشن آفس کے سامنے جمع تھا۔ جگہ جگہ ہم وطن طالب علموں کی ٹولیاں بیٹھی تھیں۔ کچھ اپنے یہاں کے مقبول گیت گا رہی تھیں، کچھ خالی تالیاں بجا رہی تھیں۔ ایک جگہ آئرش ٹولی نہایت ہی ناقص سالوک رقص کر رہی تھیں۔ رقص کیا تھا بس آوا جاوی تھی۔ لڑکیوں کی قطار لڑکوں کے اندر سے گزر جاتی تھی اور لڑکوں کی قطار لڑکیوں کے درمیان سے۔

میرے وطن کا کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ پاکستان کا نہ انڈیا کا۔ سب سے زیادہ تعداد امریکی سٹوڈنٹس کی تھی جن میں زیادہ لڑکیاں تھیں اور کم کم لڑکے۔ انگریز بھی کافی تھے لیکن ملے جلے۔ ان میں بزرگوں کی تعداد زیادہ تھی اور جوانوں کی کم۔ جرمنی سے زیادہ تر لڑکیاں آئی ہوئی تھیں جن کے چہرے بشرے، وجود اور ارادے سے ان کا نازی ہونا واضح تھا۔ ان کا گروہ الگ چلتا تھا اور الگ ہی رہتا تھا۔ چند سٹوڈنٹس جاپان کے تھے، کچھ ملائیشیا کے۔ تین سنگاپور سے آئے تھے اور چھ ہانگ کانگ سے۔

جب میں نے اپنا نام رجسٹر کروایا اور یونیورسٹی کے داخلے کا اجازت نامہ کھڑکی میں پیش کیا تو مجھے داخلہ تو فوراً مل گیا لیکن ہاسٹل کے داخلے کے لیے انہوں نے معذرت کر لی۔ اس وقت کوئی جگہ نہیں، سب فل ہے البتہ پرائیویٹ طور پر لینڈلیڈیوں کے یہاں کافی جگہ ہے، وہاں آپ ٹرائی کر سکتے ہیں۔

میں نے نوٹس بورڈ پر لگی ہوئی فہرست میں سے ایک نام چھانٹا، مادام جے مونٹے۔ اوردو کلو نمبر بارہ، گرینوبل۔ نقشے کر سڑک ڈھونڈی تو یونیورسٹی کے بالکل قریب تھی۔ بیگ اٹھایا اور وہاں پہنچ گیا۔

مادام مونٹے پینسٹھ ستر سٹھ برس کی دھان پان سی خاتون تھیں۔ بہت ہی نفیس اور بے حد شفیق۔ انہوں نے مجھ سے دو تین سوال کیے۔ میرا پاسپورٹ دیکھا، ہفتہ وار کرایہ بتا کر مجھے باہر کے بڑے دروازے اور گھر کی چابی دے دی اور میں دوسری منزل کے بڑے سے گھر کے ایک ترچھے کمرے کا کرایہ دار ٹھہر گیا۔ اندر واش بیسن لگا تھا لیکن غسل خانہ باہر تھا۔

مادام نے صبح سات بجے کافی کے لیے دروازہ کھٹکھٹایا اور میں ڈائننگ روم میں ان کے ساتھ ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ مادام جے مونٹے بالکل اکیلی رہتی تھیں۔ خاوند بائیس برس پہلے کسی حادثے میں فوت ہو گیا تھا۔ دونوں لڑکے اور ایک لڑکی بال بچوں والے تھے اور ساؤتھ آف فرانس میں رہتے تھے۔ مادام کے پاس اس کے خاوند کے چھوڑے ہوئے سکیورٹی

بانڈ تھے جن سے ان کو اچھی خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔

دو روز بعد یونیورسٹی کی کلاسیں شروع ہو گئیں اور ہم کو گروپوں میں بانٹ دیا گیا۔ کل تین سو طالب علم تھے سارے کے سارے غیر ملکی۔ میری سیٹ فیلو ایک جرمن لڑکی روتھ تھی۔ کچی عمر لیکن بڑے ہڈ کاٹھ کی۔ اس کی بنی میرے بازو آرام کے برابر تھی اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے کچھ بڑا تھا۔ جب میں نے ڈیسک پر رکھی ہوئی اپنی بانہوں کی طرف اشارہ کر کے ان کے متناسب ہونے کا اشارہ کیا تو وہ شرما کر بولی۔ ''مجھے ابھی ٹھیک طرح فرنچ بولنی نہیں آتی۔ پڑھ ضرور لیتی ہوں۔ سمجھ بھی جاتی ہوں لیکن بول نہیں سکتی۔'' میں نے کہا ''ہمارے ساتھ رہو گی تو بولنے بھی لگ جاؤ گی بلکہ بولتی ہی رہو گی۔ لکھنا پڑھنا سب فراموش ہو جائے گا۔ اس نے ہنس کر سر ہلایا جیسے سمجھ گئی ہو لیکن وہ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی۔

یوں تو ہماری ساری کلاسوں میں مزے کے ہنگامے رہتے تھے اور ہمیں شہر کے اندر مختلف مقامات پر جا کر کلاسیں اٹینڈ کرنی پڑتی تھیں لیکن مادام تائیوں کی تلفظ کی کلاس میں بڑا مزا آتا تھا۔ ایک تو یہ کلاس بہت بڑی تھی کہ اس میں تقریباً سو کے قریب طالب علموں کا اجتماع ہوتا تھا۔ دوسرے مادام بڑی کڑک دار، بارعب، سنجیدہ مزاج اور فرض شناس پروفیسر تھیں۔ وہ وجود کی چھوٹی، بدن کی دبلی، چہرے کی گوری، بالوں کی سنہری، ماتھے کی سلوٹی اور نظر کی عقابی تھیں۔ کلاس کے اندر گھوم پھر کر پڑھاتی تھیں اور تالی بجا کر سٹوڈنٹس کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ ان کے پاس اصول صوتیات کا ایک چارٹ تھا جس میں ای آئی او اور یو کی آوازوں کے مختلف شیڈ دیے گئے تھے۔ ہم کو ہر روز یہ نقشہ اپنی کاپی پر خود بنانا پڑتا تھا اور ان حروف کی آوازوں کی تجوید کر کے سنانی پڑتی تھی۔ اس کلاس سے اور اس استانی سے سبھی بھاگتے تھے لیکن چونکہ اس میں سارے ہی مزیدار لڑکے اور ساری ہی دلدار لڑکیوں کے گروہ تھے، اس لیے کوئی بھی اس کلاس سے ناغہ نہیں کرتا تھا۔

یہ وہی محبوب کلاس تھی جس نے پہلی مرتبہ مجھے کرکٹ کے کھیل سے روشناس کرایا اور مجھے اس گیم کا دولہا بنایا۔ ورنہ اس سے پہلے کرکٹ کے بارے میں میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا...... مادام تائیوں نے ہم سب کو ایک بڑے سے نیم دائرے کی شکل میں بٹھا رکھا تھا اور وہ فرانس کے مختلف علاقوں کی فرانسیسی کے تلفظ کی باریکیاں بتا رہی تھیں۔ بات چونکہ کلی تھی، اس لیے سارا بوجھ مادام پر تھا۔ ہم پرچیاں چلا چلا کر ایک دوسرے سے خوش گپیاں کر رہے تھے، فرانسیسی زبان کے پرخچے اڑا رہے تھے۔

ہم سب سے دور، آخری دائرے کے ایک اندھیرے سے کونے میں دو بڈھے انگریز ایک دوسرے سے سر جوڑے اور پھر ان دونوں سروں کو ایک ساتھ جھکائے کانوں میں پتلی سی تار کی دو الگ الگ ٹوٹنیاں لگائے لڑکیوں کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے۔ ہم سب نے ان کو پراسرار حالت میں دیکھ کر ان کی مدد کی اور ان کے آگے بیٹھی ہوئی لڑکیاں چوڑی چوڑی سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ مادام کے حساب سے وہ آج کلاس میں آئے ہی نہیں تھے اور ہمارے حساب سے وہ سب سے زیادہ موجود تھے کہ کسی انتہائی مفید کام میں مصروف تھے۔

جب کلاس ختم ہونے میں کوئی پانچ منٹ باقی رہ گئے تو مجھے کئی ہاتھوں میں گھومتی ہوئی ایک پرچی ملی جس پر لکھا تھا ''مسٹر پاکستان کے لیے!'' نیچے انگریزی میں پرانے بڈھے انگریز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی رواں تحریر تھی۔ ''آپ کو مبارک ہو، پاکستان جیت گیا۔ اوول تمہارا ہے۔'' نیچے انہوں نے ایک چوکھٹا بنا کر کسی فضل محمود کا نام لکھا تھا جو اوول کا ہیرو قرار پایا تھا۔ فضل محمود ایک دیسی نام تھا جس سے پاکستانی ہونے کا اشارہ ملتا تھا لیکن مجھے یہ نہیں پتہ چلتا تھا کہ وہ اوول کا ہیرو کیوں بن گیا ہے اور اگر وہ بن ہی گیا ہے تو پھر یہ اوول کیا چیز ہے!

کلاس کے خاتمے پر میں نے ان دونوں انگریزوں سے پوچھا کہ ''آپ نے یہ پرچی میرے لیے کیوں بھجوائی؟'' انہوں نے کہا ''ہم سر جھکا کر اور میڈم سے چھپ کر تھیلے میں ڈال کر لایا ہوا پورٹیبل ریڈیو سن رہے تھے۔ ایک ایئر پلگ میرے کان میں تھا اور ایک ایئر پلگ اس کے کان میں۔ ہم نے آخر کی ساری کمنٹری سنی۔ فضل محمود نے کمال کر دیا۔ سارا انگلستان اس کا دیوانہ ہو گیا ہے۔''

میں نے کہا ''کیوں ہو گیا ہے؟''

کہنے لگے ''اس کے کمال فن کی وجہ سے؟''

جب میں نے پوچھا ''اس کا کمال فن کیا ہے؟'' تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مایوسی سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا ''ہم بھی کتنے احمق تھے جو اس گدھے کو پرچی بھجوائی۔ اس کو تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ فضل محمود کون ہے۔''

اس واقعے کے بعد وہ جب بھی مجھ سے ملتے کنی کترا کر دوسری طرف کو نکل جاتے۔ مجھے وہ نوآبادیاتی نظام کے کٹر نمائندے نظر آتے تھے جو میری شکل سے نفرت کرتے تھے کہ اس نے ہندوستان آزاد کرا کے اپنا پاکستان کیوں بنایا اور برطانوی راج کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیوں ختم کیا؟ انگریز کے دل میں ہم لوگوں کے لیے نفرت کا جذبہ بدستور موجود تھا!

ہماری اس کلاس میں کہ اس کا دورانیہ سب سے لمبا ہوتا تھا، ہمارا ایک اندرونی حلقہ بھی تھا جس میں پانچ امریکی لڑکیاں، تین لڑکے، ایک ملائیشیا کی صبیحہ، دو سکاچ لونڈے اور میری سیٹ فیلو روتھ بھی شامل تھی۔ روتھ سب سے زیادہ نالائق اور سب سے پھسڈی لڑکی تھی لیکن چونکہ وہ میری ہم نشست تھی، اس لیے میں اسے اکیلی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ہمارا یہ گروپ باوجود اس کے کہ عددی اعتبار سے کثیر تھا لیکن مزاجاً بہت لطیف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوسروں پر اس کا کوئی بار نہ تھا۔ موج ہوا کے جھونکے کی طرح آتا اور پھوار سی بن کر نکل جاتا۔ بازار میں، سینماؤں میں، تھیٹر میں، یونیورسٹی کے اندر، فٹ بال سٹیڈیم میں، غرض ہر جگہ اس کی صحبت دلنشین اور مزاج شبنمیں تھا۔ سارا شہر ہم سے خوش تھا۔ بس ایک کیتھی کو ٹہوکے مارنے کی عادت تھی۔ وہ انگشت شہادت کا ایل بنا کر اس زور کا ٹھولا مارتی تھی کہ آدمی بلبلا اٹھتا تھا۔ ہم سے تو اس نے ایڈوانس معافی طلب کر رکھی تھی لیکن جیکی نے اسے یہ راہداری نہیں دی۔ کیتھی ٹھولا مارنے سے رہ نہ سکتی تھی اور جیکی بلبلانے پر قابو نہ پا سکتی تھی۔ دونوں کے درمیان چڑیوں کی لڑائی ہوتی، تھک ہار کر دونوں ایک دوسری کو کِس کرتیں اور پھر ہنس کر کپڑے جھاڑ لیتیں۔

ایک روز میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی لینڈ لیڈی سے پوچھا کہ میں اپنے دوست گھر پر لا کر ان کی کافی اور بسکٹ سے ضیافت کر سکتا ہوں تو اس نے بخوبی اس بات کی اجازت دے دی۔ میں نے کہا ''شاید پندرہ سولہ ہوں گے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ'' کہنے لگی چاہے بیس ہوں، کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارا بو فے ہال اتنے مہمانوں کو بخوبی سمیٹ سکتا

ہے اور ان کے آنے پر میرے مرحوم شوہر کی روح بڑی خوش ہوگی کیونکہ اس کو دعوتیں دینے کا اور اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلانے کا بڑا شوق تھا۔

میں نے آ کر حلقۂ یاراں میں اس کا اعلان کیا تو سب نے خوشی کے فلک شگاف نعرے لگائے اور جیکی، لنڈا اور کیتھی میرا گھر دیکھنے آ گئیں۔ کمرے کی گنجائش دیکھ کر انہوں نے اعلان کیا کہ بالکل تسلی بخش ہے اور مادام مونٹے سے ل کر وعدہ لیا کہ وہ پھر بھی یہاں آنا چاہیں تو ان کو روکا نہیں جائے گا۔

میری اس ضیافت میں اٹھارہ لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوئے اور سب نے چھوٹتے ہی یہ رٹا ڈال دیا کہ اگر ڈچ کرو گے تو ہم یہ دعوت قبول کرتے ہیں ورنہ ستھرے پانی کا ایک ایک گلاس پی کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان کو بہتیرا سمجھایا، سر پٹکا۔ اپنے کلچر کے رموز بتائے لیکن وہ نہیں مانے۔ چنانچہ متفقہ طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ کل یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر حساب کر لیا جائے گا اور لاگت وصول کر لی جائے گی۔

اس ضیافت میں ہم سب نے اپنے ملکوں اور علاقوں کے گیت سنائے۔ ناچ کے ٹوٹے بھی پیش کیے گئے لیکن صبیحہ کی مزاحیہ نظمیں سب سے نمبر لے گئیں۔ اس نے ہر استاد اور ہر استانی پر کمال کی چومصرعیاں لکھی تھیں جو ان کی شخصیتوں پر فٹ بیٹھتی تھیں۔ ہم نے تو ان چومصرعیوں کا فرانسیسی ترجمہ بھی سنا اور وہ بھی صبیحہ بیگم کا کیا ہوا۔ اصل ملائی میں تو وہ دودھاری تلوار ہوں گی...... میں نے حاضرین کو بتایا کہ میری زبان اردو اور صبیحہ کی زبان ملائی کا رسم الخط ایک ہی ہے۔ ہم دونوں کے حروف تہجی بھی ایک سے ہیں۔ اس کی زبان میں بھی عربی الفاظ کی آمیزش ہے، میری زبان میں بھی۔ یہ بھی دائیں سے بائیں کی طرف لکھتے ہیں، ہم بھی رائٹ سے لیفٹ کی طرف۔ سب نے ہماری خوشنودی کے لیے بھرپور تالیاں بجائیں۔

کراسانی، پانے رودر، ٹوسٹ اور کریکرز پر مادام مونٹے کا گھر بنایا ہوا مربہ اور مارملیڈ لگا لگا کر ہم کافی کی چسکیاں لے رہے تھے اور مادام کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ صبیحہ نے میرے پاس آ کر ہولے سے کہا'' اب ہم نے اپنی ملائی کا رسم الخط تبدیل کر لیا ہے۔ اب ہم اسے رومن حروف میں لکھتے ہیں اور تلفظ اور ہجوں کے معاملے میں انگریزی کے اصول برتتے ہیں...... اس وقت سوائے پرانے بزرگوں کے یا موجودہ سکالرز کے ملائی کا پرانا، عربی والا رسم الخط کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ گورنمنٹ نے سب کی آسانی کے لیے رومن سکرپٹ اختیار کر لیا ہے اور اب بڑی آسانی ہو گئی ہے...... لیکن اس سے ہمارا تھوڑا سا نقصان بھی ہوا ہے کہ ہمارا سارا ادبی سرمایہ اسی پرانے رسم الخط میں ہے جو ہم پڑھ ہی نہیں سکتے۔''

جیکی نے کہا'' یہ کیا گھس گھس کر خفیہ باتیں ہو رہی ہیں۔ ہم ایسا فاؤل کھیل کھیلنے نہیں آئے۔ ہمیں بتایا جائے کہ صبیحہ، اشفاق سے کیا کہہ رہی تھی۔''

اس پر سب نے فاؤل فاؤل کا شور مچایا تو صبیحہ نے ہنس کر کہا'' میں اس موٹے بھدے پاکستانی سے اظہار محبت کر رہی تھی اور یہ سمجھ نہیں رہا تھا۔ اس پر تم نے شور مچا دیا اور ہمارا ڈائیلاگ بیچ ہی میں رہ گیا۔'' اس پر کیتھی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر انگریزی میں کہا'' آرڈر آرڈر...... ایسے اچھے اظہار و اقرار کے لیے سب کو چھٹی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی بات باؤس کی

مرضی سے نہیں ہوگی۔''

اگلے دن روتھ نے مجھ سے پوچھا'' کیا واقعی وہ تم سے اظہار محبت کر رہی تھی؟''

میں نے کہا'' بکواس کر رہی تھی بالکل۔ سب کو الو بنا رہی تھی۔ تم نے اس کی چومصرعیاں نہیں سنی تھیں، وہ تو مخولیا لڑکی ہے...... مخولیا۔''

روتھ کی تسلی ہو گئی اور اس نے دل و جان سے یقین کر لیا۔ گو ہم دونوں کے درمیان کوئی بھی ایسی بات نہ تھی لیکن سیٹ فیلو ہونے کے رشتے سے ایک طے شدہ تعلق ضرور تھا۔ کوئی بھی ہمارا راستہ کاٹتا تھا تو ہمارا استحقاق مجروح ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد جیکی نے پہاڑ کی چوٹی پر ہماری دعوت کی۔ وہاں لوہے کے تاروں پر چلتے ہوئے ہنڈولوں سے جاتے تھے۔ ایک ہنڈولے میں دس بارہ مرد عورتیں ایک ساتھ کھڑے ہو جاتے تھے۔ بیٹھنے کے لیے کوئی سیٹ نہیں تھی۔ بچہ لوگوں کے باہر جھانکنے کے لیے ہنڈولے کی ایک دیوار میں پتلی پتلی جھریاں سی بنی تھیں۔ نیچے اترتے چڑھتے ان بنکروں کی جھری میں سے نشانہ باندھ کر نیچے کے مناظر دیکھا کرتے تھے اور سارے سفر میں اپنی ماؤں اور داداؤں کو شریک نظارہ کرنے کے لیے بلاتے رہتے تھے۔

پہاڑ کے اوپر بہت بڑی بستیاں آباد تھیں۔ یہاں زیادہ کٹری کا کام ہوتا تھا۔ جدھر مرغزاریں تھیں، وہاں دودھ، دہی، پنیر ڈبوں میں بند کیا جاتا تھا۔ لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے۔ زیادہ تر منڈولین اور گٹار بجاتے تھے۔

جیکی کی دعوت بڑے ٹھاٹھ کی تھی۔ وہ کسی بہت ہی بڑے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی کیونکہ اس کے پاس ٹریولر چیکس کی کئی کاپیاں تھیں۔ اس نے اپنی ضیافت کا انتظام ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کے ریستوران میں کیا تھا اور چار ساز بجانے والے تمام وقت ہمارے سروں پر کھڑے ساز بجاتے رہے تھے۔ یوں تو اس ٹکڑی میں سب سے غریب میں تھا لیکن مجھ سے بھی زیادہ غریب روتھ تھی۔ اس کا والد بلیک فارسٹ کا ایک تربیت یافتہ لکڑ ہارا تھا اور اس کے پاس بڑے درخت گرانے کا لائسنس تھا۔ یہ بات میں نے روتھ سے بڑی مشکل کے ساتھ نکلوائی تھی اور مجھے اس بات کی خوشی ہونے لگی تھی کہ یورپ کے گورے بھی غریب ہو سکتے ہیں۔

کیتھی کے پاس جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں کی بے پناہ کہانیاں تھیں۔ اس نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھ رکھی تھیں اور اس کا خیال تھا کہ امریکہ کی نو ریاستیں ہانٹڈ ریاستیں ہیں جن پر شیطان کی اور اس کے شطونگڑوں کی حکمرانی ہے۔ وہاں کے سارے گرجے عملاً بند ہو چکے ہیں اور لوگوں کا دین دھرم پر اعتماد اٹھ گیا ہے۔

ہمارے جو ساتھی جدید خیالات کے تھے، ان کو یقین تھا کہ لوگوں کو غریب رکھنے کے لیے مذہب پرانے بادشاہوں کی اختراع تھی جنہوں نے اپنے اپنے دور حکومت کو طویل تر کرنے کے لیے مذاہب کے ساتھ بہت ساری پھول کناریاں لگا کر انہیں دلچسپ اور توجہ طلب بنا دیا تھا۔ ہسپانوی اور پرتگالی رومن کیتھولک سٹوڈنٹس ان سے چونکھی لڑائی لڑتے تھے اور جب مشکل مقامات پر سب کی فرانسیسی ختم ہو جاتی تھی تو وہ اپنی اپنی زبان میں مندا بولنے پر اتر آتے تھے۔

کیتھی تو خیر ناستک تھی لیکن نورا اور جیکی کا مزاج دینی تھا۔ وہ پادریوں کے لطیفے تو سن جاتی تھی لیکن ایک خاص حد

سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ آئرلینڈ کے تینوں خوبصورت نوجوان حد درجہ مذہبی تھے اور مذہب سے کسی قسم کا مذاق برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب ان کے گورے گورے چہروں کو لال لال کرنا مقصود ہوتا تو ہم سب کے اوپر یا پوپ پر کوئی اوچھا وار کر کے پیچھے ہٹ جاتے اور وہ برنارڈ شا کی انگریزی میں ہم سب کو لتاڑتے۔

جیکی کا میرے ساتھ بڑا یارانہ تھا۔ وہ پاکستان کے بارے میں کچھ تو جانتی تھی لیکن اس سے زیادہ جاننے کی خواہش مند تھی۔ اس کو یہ تو معلوم تھا کہ سیالکوٹ میں فٹ بال بنتے ہیں لیکن وہ ٹکڑی ٹکڑی جڑ کر بالکل گول کیسے بن جاتے ہیں یہ عقدہ اس پر نہ کھلتا تھا۔ چونکہ وہ خود بارانی علاقے کی رہنے والی تھی کہ امریکہ میں سارے رقبے بارانی ہیں، اس لیے وہ پاکستان کے نہری علاقوں اور نہروں سے سیراب ہونے والے کھیتوں کا کوئی تصور نہیں رکھتی تھی۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ نہر کی ٹونٹیاں کھول کر کھیت کھیت سیراب کیا جا سکتا ہے۔ وہ برقعہ پوش عورتوں اور ان کے رشتہ دار مردوں کے بہت خلاف تھی کہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کو قید کر کے کیوں رکھا جاتا ہے! اس کے پاس ہماری عورتوں کی کچھ ایسی تصویریں بھی تھیں جن میں عورتوں کو پابہ زنجیر کر کے اور ان کے گلے میں لوہے کی ہنسلی ڈال کر ان سے کھیتوں میں کام لیا جا رہا تھا۔

جب ہماری کانووکیشن ہوئی اور ہمیں یونیورسٹی کی طرف سے مانگے کے گاؤن فراہم کر کے قطاروں میں کھڑا کر کے ڈگریاں دی گئیں اور ہماری کامیابی کا اعلان کر کے یونیورسٹی کو مہینہ بھر کے لیے بند کر دیا گیا تو وہ جو فلمی گانا ہوا کرتا تھا کہ آندھیاں غم کی یوں چلیں، باغ اجڑ کے رہ گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہماری ہوئی ہم تو ہم وہ جو چھوٹا شہر گرینوبل کا تھا، وہ بھی خاموشیوں میں ڈوب گیا اور اہالیان گرینوبل نے ہمارے رخت سفر باندھنے کا بڑا سوگ منایا۔ شہر کی چہل پہل کم ہونے لگی اور سٹوڈنٹس اپنے اپنے ذرائع سفر اختیار کر کے شہر سے رخصت ہونے لگے۔

ہمارا گروپ جس کا نام جیکی اور اینڈرسن نے کھل جا سم سم کے معنوں میں لاکلے (Laclef) رکھ دیا تھا۔ اس کے ارکان بھی واپسی کا بوریا بستر باندھ کر تیار ہو گئے۔ جمعرات کی شام ہم نے یونیورسٹی لان میں ایک الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا۔ کھانا پینا تو کیا تھا، رونا، آہیں بھرنا اور وعدے وعید کرنا ہی ہوتا رہا۔ جو لڑکے اور جو جوان بڑے مضبوط نظر آتے تھے اور جن کے کندھوں پر سارے گروپ کا بوجھ تھا، وہ بہت ہی بودے ثابت ہوئے اور بار بار چوری چوری آستینوں سے آنکھیں پونچھتے رہے۔ ہم جپھیاں ڈال ڈال کر اور گال چوم چوم کر ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے کہ شاید وہ رک کر ہمیں آواز دے اور ہم بھی رُک جائیں۔

اگلے روز جب میں مادام مونٹے سے رخصت ہو رہا تھا تو انہوں نے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ کافی ٹرے کے لیے کروشیے کا سیٹ اور گراس کا انمول آفٹر شیو لوشن نہایت ہی چمکدار پیرٹ گرین کاغذ میں لپیٹ کر دیا۔ میں نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ماما میں آپ کو ساری عمر یاد رکھوں گا اور باقاعدگی سے خط لکھتا رہوں گا۔"

مادام نے کہا "جو تجھ سے پہلے یہاں رہ کے جاتے رہے ہیں، وہ بھی یہی وعدہ کر کے جاتے رہے ہیں۔ ایسے وعدے ہوتے رہنے چاہئیں اور ان پر عمل رُکا رہنا چاہیے۔"

جب میں پاکستان واپس آ گیا۔ میری شادی ہو گئی اور ہم سمن آباد کے ایک کوارٹر میں رہنے لگے تو ایک صبح ہمارے گھر چھوٹے سے بیرونی برآمدے میں بم کا دھماکا ہوا اور میں دہشت سے تھرا کر برآمدے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔

میرے سامنے برآمدے میں صبح کا اخبار پڑا تھا اور اس کے فرنٹ پیج پر امریکہ کے صدر کینیڈی کی بڑی سی تصویر تھی اور اس کے ساتھ ہماری جیکی کھڑی تھی۔ اب اس کا پورا نام جیکو لین کینڈی تھا۔

میں نے اس کے نام ایک لمبا چوڑا یادوں سے بھرا اور تمناؤں سے لبریز مبارکبادی کا دعائیہ خط لکھا لیکن میری بیوی نے اسے پوسٹ کرنے سے منع کر دیا۔ ہمارے درمیان تھوڑا سا جھگڑا بھی ہوا لیکن بانو نے کہا "یہ ایک میراثی خط ہے جو آپ نے نواب صاحب کے نام لکھا ہے۔ اس میں ہمسری اور برابری والی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا اسے پھاڑ کر ایک دوسرا خط لکھ دیتا ہوں، خودی اور خودداری سے لبریز۔ آخر ہم دوست ہیں اور ایک دوسرے کے کلاس فیلو رہے ہیں۔

بانو ضد کی پکی اور ہٹ کی پوری ہے، اس نے مجھے دوسرا خط لکھنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ہم جیسوں کی طرف سے امریکہ کو جو بھی خط لکھا جائے گا، اس میں گھگھیا ہٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا اور ہماری ساری خودی اور خودداری میراثی پن میں ٹرانسلیٹ ہوتی جائے گی۔ اپنے در اور اللہ پر بھروسہ رکھو!

ایک مرتبہ پھر کیسے بڑے اعزاز کا چانس ملا تھا۔ وہ بھی نارس ہو کر بلبلے کی طرح بیٹھ گیا!

اب مجھے ایک اور اعزاز مل رہا تھا کہ ایک بڑا بلکہ بہت ہی بڑا آئی سی ایس آفیسر خود اپنے منہ سے کہہ کر میرے پاس آ کر ٹھہر رہا تھا اور روم کی سیر کے دوران مجھ سے باتیں کرنے کا خواہش مند تھا۔ یہ خدا کی ایک خاص عنایت تھی جو مجھ پر ہونے والی تھی اور جس کو ہر زاویے سے کیش کرنے کے لیے میں نے ذہن کے مختلف خانوں میں الگ الگ پروگرام طے کر رکھے تھے...... وہ پروگرام نہ بھی صورت پذیر ہوتے پھر بھی یہ کوئی کم اعزاز تھا کہ میں نے ایک آئی سی ایس آفیسر کی آشنائی کا دم بھرا تھا اور اسے اس قدر قریب ہو کر ہاتھ لگا کر دیکھا تھا۔

ایک آئی سی ایس آفیسر سے میری آخری ملاقات کئی برس پرانی تھی۔ جب میں نے جناب اختر حسین آئی سی ایس، ڈپٹی کمشنر فیروز پور کو پندرہ سولہ فٹ کے فاصلے سے دیکھا تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ہمارے شہر تحصیل مکتسر کا معائنہ کرنے آئے تھے اور انہوں نے عمائدین شہر کی درخواست پر ہمارے سکول میں ایک جلسے کی صدارت کی تھی۔

اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے بارے میں ایک خبر سارے شہر میں گشت کر رہی تھی کہ ڈپٹی کمشنر صاحب محکمہ مال کے بڑے ماہر ہیں اور انہوں نے یہ علم پٹواریوں کی ٹیوشن رکھ کر حاصل کیا ہے۔ ہم سکول کے چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی ایک دوسرے کو یہی بتاتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب محکمہ مال کے بڑے ماہر ہیں اور انگریزوں سے بھی زیادہ علم رکھتے ہیں۔ نہ ہم کو مال کا پتہ تھا، نہ انگریزوں کو دیکھا تھا۔ نہ ماہر ہی کا کوئی تصور ہمارے ذہنوں میں موجود تھا۔ ہم سب اس بات پر خوش تھے کہ ڈپٹی کمشنر ہمارے شہر میں تحصیل معائنہ کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

ہمارے سکول کے جلسے میں سٹیج پر صرف ڈپٹی کمشنر اختر حسین صاحب آئی سی ایس اور ان کا ماتحت ایک گورا

اسسٹنٹ کمشنر بیٹھا تھا اور کسی کو سٹیج پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ سامنے کرسیوں پر ہمارے علاقے کے سکھ، جاگیردار، نمبردار، سفید پوش اور ذیلدار بیٹھے تھے۔ ان سب نے آج اپنی اپنی پگڑیاں بڑے سلیقے سے باندھی ہوئی تھیں اور ان کے کھدر اور لٹھے کے تہبند دھوبی سے دھل کر آئے تھے۔ ان کے پیچھے مسلمان زمیندار تھے اور مسلمان اہلکار تھے جن کی تعداد سات آٹھ سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے پیچھے لکڑی کے بینچوں پر ساہوکار اور دکاندار بیٹھے تھے جن کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ پھر چھوٹے چھوٹے رقبوں کے دوسرے کسان تھے جو سر جھکا کر اور سینے پر ہاتھ باندھ کر بڑے باادب طریقے سے بیٹھے تھے۔ اس مجمع کے اردگرد ہمارے سکول کے بوائے سکاؤٹ وردیاں پہن کر اور لاٹھیاں پکڑ کر اٹین شن کھڑے تھے۔ سکول کے استادوں کو ان سکاؤٹوں کے درمیان گھومنے پھرنے اور حرکت کرنے کی اجازت تھی۔ شامیانے کے باہر سارے جلسے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہمارے تھانے اور سٹی پولیس کی نفری چونکہ کم تھی اس لیے ضلع ایس پی صاحب نے فیروز پور سے نئی گاردیں بھجوادی تھیں۔

ان گاردوں کے آنے سے پہلے ہمارے سکول کے پاس ہاکی گراؤنڈ میں ان کے لیے چھوٹے چھوٹے خیمے لگائے گئے تھے۔ ہر خیمے میں دو سپاہی اور ہر دس سپاہیوں کے بعد ایک حوالدار تھا جو اکیلا اپنے خیمے میں رہتا تھا۔ خیمے لگانے کے دوران ضلع سے ایک بڑا سا برمہ بھجوایا گیا جس کی بٹ کا قطر آٹھ انچ تھا۔ ایک بڑے سٹینڈ کے اندر لوہے کی پیچدار لاٹھ گھومتی تھی اور یہ برمہ ہاکی گراؤنڈ کی مضبوط زمین میں آٹھ انچ گول سوراخ کرتا جاتا تھا۔ ہم ہر روز سکول جانے سے پہلے پھر تفریح میں اس کے بعد پوری چھٹی پر اپنی زمین کے اندر گول سوراخ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ پولیس کے مستری نے بتایا کہ یہ سوراخ کم از کم ستر فٹ گہرا ہوگا اور اس پر پولیس گارد کے لیے بم پولسی بنایا جائے گا۔

جب سوراخ گہرے کھد گئے اور ان پر پتھر کی ایسی سلیبیں رکھ دی گئیں جن میں آر پار تالے میں چابی لگنے والے نشان تھے تو ہم سب بہت حیران ہوئے کہ گاردوں کے لیے ایسے بم پلس کیوں بنائے جاتے ہیں۔ مستری نے پتھر کی سلیب پر بیٹھ کر ہمیں ان کا طریقہ استعمال بتایا۔ ہم نے جا کر گھر بات کی۔ بہت بڑے بڑے سکھ سردار، اگروالی، بانئے، جینی دکاندار اور دو ایک مسلمان جاگیردار بھی ان کھڈیوں کو دیکھنے آئے اور انگریز کی عقل پر عش عش کرتے ہوئے گھر واپس چلے گئے۔ سردار سوہن سنگھ نے میرے اباجی سے کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں بھی گھر پر ایسی ہی کھڈی بنواؤں گا۔''

اباجی نے کہا ''سردار جی، یہ ڈیزائن تو خالص پولیس گارد کے لیے ہوتا ہے۔ جب وہ کسی بڑے آئی سی ایس کے دورے پر ضلع کانسٹیبلری سے نکلتی ہیں تو ان کے لیے ایسے بم پلس موقع پر تیار کیے جاتے ہیں۔''

تایا سوہن سنگھ نے کہا ''دیکھو جی ڈاکٹر صاحب، آئی سی ایس کتنا بڑا آفیسر ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو افسری ختم ہو جاتی ہوگی۔''

اباجی نے کہا ''اگر غور سے دیکھا جائے تو آئی سی ایس آفیسر وائسرائے سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ جو نقصان وہ پہنچا سکتا ہے، وہ وائسرائے بھی نہیں پہنچا سکتا۔''

یہی وجہ تھی کہ ہمارے سکول والے جلسے میں کل عمائدین شہر جمع تھے اور سب ٹکٹکی باندھے ہوئے اختر حسین

صاحب کو دیکھ رہے تھے اور اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ گوری رنگت اور بھورے بالوں والا ولایتی بلا اختر حسین صاحب کے ماتحت ہے اور جو حکم بھی وہ دیں، بلاچوں چرا بجالانے پر مجبور ہے۔

جلسے کے شروع میں، سب سے پہلے چھوٹے چھوٹے سکھ لڑکے اور لڑکیوں کا ایک گروپ اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے سامنے زمین پر کھڑا ہو گیا۔ ماسٹر جی نے زور کی ایک سیٹی بجائی اور انہوں نے کورس گانا شروع کر دیا:

تسیں آ وا اختر جی

میں عرض کراں ہتھ جوڑ کے

جب وہ ''میں عرض کراں'' کہتے تو اس کے ساتھ ہی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑ کر اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے سامنے سر جھکاتے۔ جن سرداروں کے یہ پوتے پوتیاں تھے وہ بڑے فخر سے چہرے اٹھائے ڈپٹی کمشنر صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے اور ہولے ہولے شاباش! شاباش! کہہ رہے تھے۔

ان کے بعد میری اور کلدیپ کے سکٹ کی باری آئی۔ اس سکٹ میں میں بندر اور کلدیپ بلا بنا تھا۔ ہم سٹیج پر بے معنی انداز میں اچھلتے پھدکتے تھے اور اپنے پیچھے کمر سے بندھی ہوئی دُموں کو ڈور کی کھینچ مار کر زور زور سے ہلاتے تھے۔ میری دُم اوپر کو اٹھتی تھی اور کلدیپ کی اندر کو گھستی تھی۔ ہمارے ان لایعنی کد کڑوں سے حاضرین محفل بہت محظوظ ہوئے اور بار بار تالیاں بجاتے رہے۔ گورا اسسٹنٹ کمشنر بھی مسکرایا لیکن اختر حسین آئی سی ایس صاحب اسی طرح ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سنجیدہ صورت بیٹھے رہے۔

ہمارے بعد میرے بڑے بھائی اسحاق کی باری تھی۔ وہ نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور بہت ہی اچھا تخلیقی فنکار تھا۔ اس نے ایک سرکس جوکر کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سر پر بوٹوں کے ڈبے کی ترمیم شدہ ٹوپی تھی۔ اس وقت وہ ایک مرغی چور کا رول ادا کر رہا تھا۔ اس سکٹ میں سب کچھ اسی کا تھا۔ موضوع، سناریو، ڈائیلاگ، مونولاگ اور نظم کے ٹوٹے۔ وہ جب وہ سٹیج پر آیا تو زور کی تالیاں بجیں۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے اختر حسین صاحب آئی سی ایس کی طرف منہ کر کے اونچی اور واضح آواز میں کہا:

منکہ ہوں اک مرغی چور

ہاتھوں میں رکھتا ہوں زور

پھر اسحاق بھائی نے ایک شاطر ایکٹر کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں تیز تیز نظریں دوڑاتے ہوئے پھدکیاں مارتے، ذرا جھک کر جب ماہی گیروں کے سے ہاتھ چلائے اور شوخیاں کرتے ہوئے اختر حسین صاحب آئی سی ایس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا

پاس کے ڈھیر پہ دھا گا دے کر پھینک دیتا ہوں کوڑی

جب پھنس جائے اس میں مرغی کھینچوں تھوڑی تھوڑی

اے دے ڈھیل

لے ڈھیل

ابے دے ڈھیل

لے ڈھیل

یہ ایک لمبا سا گانا تھا جس کے ساتھ نرت کرتے ہوئے اسحاق بھائی نے اپنے کمال ہنر کے ساتھ الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے، کھڑاک سے سٹیج پر گر کر جھپاک سے اس خیالی مرغی کو دبوچا کہ اس سے پھروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور خوف کی کنکناہٹ سے سارے تماشائی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر اختر حسین صاحب آئی سی ایس تیز تیز تالی بجاتے ہوئے ایسے بے باکانہ ہنسے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھ لیا۔

تحصیلدار صاحب اور نائب تحصیلدار صاحب، دونوں نے ایک ساتھ ہاتھ باندھ کر اوپر آسمان کی طرف اٹھا دیئے اور واہگرو اکال پرکھ کا شکر ادا کیا کہ ان کی تحصیل میں ان کے سکولی لڑکے کی وجہ سے ڈپٹی کمشنر صاحب ہنسے اور ان کے ساتھ گورا اسسٹنٹ کمشنر بھی ہنسا۔

اختر حسین صاحب آئی سی ایس کے بعد میں نے جو دوسرا آئی سی ایس دیکھا تھا، وہ قدرت اللہ شہاب تھا جو اسسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر رہنے کے بعد ٹریننگ پر دی ہیگ آیا ہوا تھا اور جس نے خود اپنے دست مبارک سے مجھے خط لکھا تھا کہ واپس جاتے ہوئے وہ چند روز میرے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔

کتنے بڑے اعزاز کی بات تھی اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں یہ اعزاز بھی نارس ہی نہ رہ جائے!

لمبی سیر پر جانے کے لیے میں پاؤں میں کینوس کے جوتے ڈال کر ابھی تسمے باندھ ہی رہا تھا کہ میرے دروازے کی گھنٹی بجی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک خوش رنگ خوش قد اور خوش اندام لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے سر پر کپڑے کی پھولدار ٹوپی تھی۔ بدن پر فریلوں والا گاؤن اور پاؤں میں نازک نازک کڈ شوز تھے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک بند چھتری تھی جس کی دستی بہت ہی لمبی اور بے حد نازک تھی...... میں نے اس لڑکی کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی اس سے کبھی ملاقات، نہ اس کے متعلق کچھ جانتا تھا۔

وہ اس طرح میرے سامنے کھڑی مسکراتی رہی اور میں گونگا بہرا اس پر نگاہیں گاڑے گم سم کھڑا رہا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے کہا "آؤ چلیں۔"

میں نے کہا "کدھر؟"

تو میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ چلنے کے لیے پلٹی جیسے اسے میرے ساتھ دینے کا یقین پیدا ہو گیا ہو۔ دو تین قدم اٹھا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں اسی طرح کھڑا تھا۔ اس نے پھر سر کے اشارے سے ساتھ چلنے کو کہا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔ اب اس کو بھی یقین ہونے لگا کہ اس نے غلط گھر کی گھنٹی بجا دی تھی اور اندر سے

دوسرا آدمی نکل آیا تھا۔

اس لڑکی کی شکل آنجلا سے بہت ملتی تھی بلکہ ایک لحاظ سے وہ عین مین اسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اگر آنجلا معذور نہ ہوتی اور اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی اور اس نے اطالوی لباس کے بجائے انگلش میموں جیسا لباس پہنا ہوتا تو وہ ہو بہو اس کی کاربن کاپی نظر آتی لیکن یہ کوئی اور لڑکی ہے۔ اس کا ماتھا کشادہ اور جلد کا رنگ سفید تھا۔ شاید ملائم اور ہموار ہونے کی وجہ سے اس کی جلد زیادہ سفید نظر آتی ہو یا قدرتی طور پر اس قدر سفید ہو۔ کچھ بھی ہو اس کی رنگت آنجلا سے مختلف تھی۔ پھر اس کے چلنے کا انداز بھی اوپرا سا تھا۔ اس کی کمر پتلی اور کولہے بھاری تھے۔ آنجلا کا پیٹ ذرا ذرا باہر کو نکلا ہوا تھا اور اس کی رانیں سوکھی ہوئی سی تھیں...... لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اور ایسے بین فرق کے باوصف وہ عین مین آنجلا ہی نظر آتی تھی۔ آنجلا کہ اس سے بھی زیادہ!

جب اس نے مجھے مقابل پایا تو انگشت شہادت کے کھونٹی نما اشارے سے مجھے ساتھ آنے کی تاکید کی تو میں اس اشارے کی حکم عدولی نہ کر سکا۔ گیارہ سیڑھیاں اتر کر جب میں نچلی فلائٹ پر پہنچا تو وہاں آنجلا کی والدہ کھڑی تھی۔ وہ دیوانہ وار لپک کر مجھ سے لپٹ گئی اور "دیکھو دیکھو دیکھو اشفاق، ہمارے ساتھ کیا معجزہ ہوا ہے۔" کہہ کر اونچے اونچے رونے لگی۔ اس کے اندوہناک گریہ کے دوران میں نے غور سے دیکھا تو ہمارے ساتھ آنجلا ہی کھڑی تھی۔ پھولدار کپڑے پہنے، ٹوپی میں اپنے ٹوکرا بھر بال چھپائے اور بند چھتری ہاتھ میں تھامے آنجلا اپنے پاؤں پر کھڑی تھی۔ میں نے اسے اس کی مسکراہٹ سے پہچانا اور اس کی ماں کے ہاتھ چھوڑ کر آنجلا کو گھٹ کے جپھی ڈال لی۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے گال باری باری ایک دوسرے سے ملا کر بڑے بڑے چمے دیئے۔

ہماری ہنگامہ خیزی اور خوشی کے نعروں کی صدائیں سن کر سینور ماریو کندوتی بھی نچلے فلیٹ سے اوپر آ گیا اور ہم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ میں اونچے بلکہ بہت ہی اونچے اونچے ماریو کو زور زور سے ہلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا "یہ آنجلا ہے؟ کیا یہ آنجلا ہے؟ کیا یہ وہی آنجلا ہے جو ہر وقت وہیل چیئر پر بیٹھی رہتی تھی۔ جو چلنے سے معذور تھی۔ مادرزاد اپاہج تھی؟" اور اس کا نانا سینور کندوتی موٹے موٹے آنسو گراتے ہوئے اثبات میں سر ہلائے جاتا تھا۔"

اس کرم گستری پر ہم سب کو جذباتی ہوتے دیکھ کر آنجلا کی ماں رونے لگی۔ پہلے تو اس کی آواز ہم تینوں کی سماعت تک محدود تھی۔ پھر اس میں اضافہ ہو گیا اور وہ اونچے اونچے بین اور شکرین کرتے ہوئے بھیں بھیں رونے لگی۔ ہم جس فلیٹ پر کھڑے تھے۔ وہاں کے دونوں گھروں کے دروازے ایک ساتھ کھلے اور اہل خانہ خوفزدہ ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

آنجلا کی ماں انہیں دیکھ کر اپنی گریہ وزاری پر قابو نہ رکھ سکی اور وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ روئے جاتی تھی اور ساتھ ساتھ ہاتھ باندھ کر اوپر آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے پکار کرتی جاتی تھی "ہمارے ساتھ معجزہ ہو گیا۔ ہمارے گھر معجزہ ہو گیا۔ ہمیں خداوند یسوع مسیح نے اپنا ملازم رکھ لیا۔ ہمیں عمر بھر کی نوکری دے دی۔ بی بی پاک مریم نے میری بیٹی کو اپنی کنیزوں میں رکھ لیا۔" پھر وہ اور زور زور سے رونے لگی اور ناک صاف کرتے ہوئے بولی "یہ میری بیٹی ازل کی لولی تھی، مادرزاد اپاہج تھی، پولیو زدہ بچہ تھی۔ اس پر رحم ہو گیا...... کرم ہو گیا...... یہ دیکھو...... یہ دیکھو...... آپ کے سامنے کھڑی ہے۔

بی بی مریم کی کنیز۔ ہمارے گھر میں رہتی ہے۔ بی بی مریم کی نوکرانی اور ان کی ملازمہ ہے۔ انہی کا سب کچھ ہے...... انہی کا دین ایمان ہے...... انہی کی کرپا ہے......"

دونوں گھرانے اپنے اپنے دروازوں میں پھنسے ہوئے ہم کو دیکھ رہے تھے۔ بنیان اور نیکر پہنے ایک بڈھا بابا اندر کو بھاگا اور کیانتی کی بوتل اٹھا لایا۔ اس کی پوتی نے بھاگم بھاگ باورچی خانے سے مختلف النوع جام نکالے اور پہلے ہم کو پھر سامنے گھر والوں کو دیئے۔

سب مل کر "آوے مریا" گانے لگے۔

اس وقت سینور ماریو کندوتی سب کو لے کر "تراس تیورے" کے ایک قدیم ریستوران میں لے جا رہا تھا جہاں اس کے خاندان کے سارے لوگ دعوت شکرانہ کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ مجھے بلانے کے لیے انہوں نے آنجلا کو بھیجا تھا اور خود سیڑھیوں کی نچلی فلائٹ پر رک گئے تھے۔ کتنا بڑا تعجب، کیسی حیرت، کیا ناقابل یقین بات تھی۔ ایسے بھی ہو سکتا ہے۔ کبھی ہوا، پھر بھی ہو سکے گا۔ ہوتا رہ سکے گا؟ مشکل اور ناممکن سی بات تھی۔ یہ بھی نظر کا دھوکا تھا۔ کوئی معجزہ یا چمتکار نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کوئی غیر مرئی قوت یا روحانی طاقت نہیں تھی۔ جسم کی دیرینہ خامی کسی وجہ سے کسی بدنی قوت کی کسی نئی رو سے عضلات یا اعصاب کی کارکردگی میں نئی تبدیلی کی وجہ سے کسی بدنی، برقی یا مقناطیسی روک کی بدولت خوراک تبدیل ہو جانے سے، روشنی میں نئے زاویہ کا انعکاس کی بدولت یا گرے وٹی کی کسی طاقتور رو کے اچانک مریض کے نیچے سے گزر جانے سے یہ حیران کن تبدیلی تو ہو سکتی تھی لیکن کسی روحانی، معجزاتی یا ملکوتی رہبری اور ہدایت و حکومت کی وجہ سے ہرگز نہیں۔

ہم رات گئے تک دھمال گیت گاتے اور مسیح ابن مریم کی شبیہ کی آرتی اتارتے رہے۔ آنجلا کی پھوپھی ایک موٹے پادری کو بھی بلا لائی تھی جو شراب کے نشے میں صبح تک مختلف قسم کے معجزات کی لڑیاں پروتا رہا اور ان کی ہسٹری بیان کرتا رہا۔ کسی نے بھی اس موٹے کی باتوں کا نوٹس نہیں لیا اور کھاتے، النڈھاتے اور گاتے بجاتے رہے!

اتوار کے روز یونیورسٹی میں اپنے لاکر سے ایمبیسی کی عنایت کردہ سگریٹوں کا ڈبہ نکال کر میں باہر جا رہا تھا کہ سامنے لان میں پروفیسر فیراکوتی اپنے بیمار کتے کو سیر کرانے جا رہے تھے۔ کتے کی کمر پر سفید فلالین کا جھول تھا اور دم ری باندھ کر پٹے سے جکڑی ہوئی تھی۔

میں نے قریب جا کر سلام کیا۔ اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔ ان کے کتے کی بیمار پرسی کی تو وہ کہنے لگے "کل ہمارے علاقے کے تین کتوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ یہ تو پھر کم زخمی ہوا، باقی دو کا برا حال ہے۔ ڈاکٹر نے پینسلین تو دے دی ہے لیکن خدشہ ظاہر کیا ہے کہ نمونیا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ایکس رے صاف نہیں ہے۔"

میں نے کہا "آپ فکر نہ کریں سر۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا اور جلد ٹھیک ہونے کے لیے دواؤں اور پلستروں ہی کی ضرورت نہیں ہوتی، کچھ اور عوامل بھی ہوتے ہیں جن سے بیماری آپ سے آپ دور ہو جاتی ہے۔"

وہ پلوٹو کی زنجیر ہاتھ میں تھامے غور سے میری بات سنتے رہے لیکن کچھ بولے نہیں۔

میں نے کہا "سر اس اسباب و علل کی دنیا میں کیا معجزہ بھی کوئی چیز ہے؟ کیا یہ پہلے بھی ہوتے رہے ہیں اور اب بھی ہو سکتے ہیں...... اور کیا یہ قدرت کے طے شدہ اصولوں اور کلیوں کو اس قدر آسانی کے ساتھ توڑ سکتے ہیں؟"

وہ پھر بھی خاموش رہے تو میں نے کہا "سر دوسرے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں ہمارا ملک بہت ہی موہوم پرست اور خرافاتی ہے۔ اس کے لوگ ایسے ضعیف الاعتقاد ہیں کہ آپ کی سائنس کے طے شدہ اور تصدیق کردہ اصولوں سے انحراف کر کے معجزوں، کرشموں، کراماتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا کیا بنے گا؟"

انہوں نے ہنس کر کہا "بننا کیا ہے، وہی کچھ بنے گا جو اس قسم کے لوگوں کا بنا کرتا ہے۔"

میں نے کہا "سر میرے ایک دوست ہیں...... بڑی عمر کے دوست۔ ان کی نواسی پیدائشی طور پر پولیو کی مریضہ تھی۔ بائیس برس تک وہیل چیئر پر بیٹھی رہی۔ ایک رات اس کی ماں نے خواب میں دیکھا کہ اس کو سینٹ فرانسس آف اسی سیزی بلا رہے ہیں۔ کوئی خاص مذہبی خیالات کی عورت نہیں ہے سر نہ ہی کوئی روحانی شخصیت ہے، بس ایسے ہی ایک گھریلو سی خاتون ہے۔ نہایت معمولی، مجھ سے ہاتھیوں کی کہانیاں سنا کرتی ہے......"

"پھر؟" پروفیسر نے شوق سے پوچھا۔

"پھر کیا پروفیسر صاحب۔" میں نے افسوس کا سر جھٹکتے ہوئے کہا "وہ اس کو وہیل چیئر میں بٹھا کر اور وین میں ڈال کر "اسی سیزی" لے گئی۔ وہاں کوئی پادری ہے جو اکیس سال سے سینٹ کے مزار پر چلہ کشی کرتا رہا ہے۔ اب اس میں ایسی مقناطیسی کشش پیدا ہو گئی ہے جس سے وہ لاعلاج مریضوں کا علاج کرتا ہے اور مایوس اور دکھی انسانیت کی دستگیری کرتا ہے۔"

"یعنی وہ اپنے علاج سے بیمار لوگوں کو ٹھیک کر دیتا ہے؟" پروفیسر فیراکوتی نے پوچھا۔

"علاج سے کیا سر، سواد اور مٹی۔" میں نے جل کر کہا "وہ ایسے ہی ماؤف بدن پر ہاتھ پھیرتا جاتا ہے اور کوئی بانی پڑھتا ہے ساتھ ساتھ اور مریض یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی بیماری دور ہو رہی ہے...... ایسے بھی ہو سکتا ہے سر؟"

"اور تمہارے دوست کی نواسی؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا "اس کا کیا بنا؟"

"وہ سر! پہلے تو اپنی کرسی میں بیٹھی کسمسائی۔ پھر دائیں بائیں تیزی سے گھومنے لگی۔ پھر اور اسی گھوم گردش میں اونچے اونچے رونے لگی اور آخر میں سر کو اس شدت کے ساتھ اوپر نیچے جھٹکنے لگی گویا گردن سے توڑ کر الگ کر دے گی۔ اس بے چینی اور کرب کی حالت میں کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے سر کو بڑے بڑے دائروں میں جھلانے لگی۔ اس کی ماں بتاتی ہے کہ وہ اپنے سر کو اتنی دور دور تک جھلا کر حلقے بناتی تھی کہ اپنے پاؤں پر قائم اس کا سارا وجود مرکز ثقل سے باہر نکل جاتا تھا، پھر بھی وہ کھڑی رہتی تھی۔ گرتی نہیں تھی۔"

"اور اب وہ ٹھیک ٹھاک ہے؟" پروفیسر صاحب نے پوچھا "چلتی پھرتی ہے؟"

میں نے کہا "اب تو وہ اپنے باپ کے ساتھ پنگ پانگ کھیلتی ہے اور اس کو ہرا دیتی ہے۔"

پروفیسر صاحب نے اپنے کتے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میرے لیے اس بات کو تسلیم کرنا اور اس واقعے پر اعتبار کرنا کافی مشکل ہے لیکن یہ بات ہمارے درمیان بڑی دیر سے چلی آ رہی ہے اور پتہ نہیں، یہ اختلاف ہم کو

ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر ابھی اور کب تک اور کہاں تک چلتا رہے۔''

میں نے کہا ''سر میں آپ کی بات نہیں سمجھا!''

کہنے لگے ''انسانی تاریخ کے اندر یوں بھی ہوا ہے...... بلکہ بدستور یوں ہوا ہے...... کہ سائنس کی نئی دریافتوں اور ایجادوں کو مذہبی اداروں اور دینی تحریکوں نے بڑی تاخیر کے ساتھ قبول کیا۔ وہ بڑی دیر تک اس ششں و پنج میں رہے کہ ایسے کیونکر ہو سکتا ہے اور یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے...... اسی طرح سائنس نے بھی صوفیانہ روشوں اور روحانی مہارتوں کو بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ، کافی دیر بعد، قابلِ توجہ سمجھا اور ان پر غور کرنے کے لیے وسعتِ نظری کا ثبوت دیا۔''

میں نے کہا ''سر! میرے حساب سے تو دونوں کو اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی!''

ہنس کر بولے ''کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم سب اس قدر کامل و بالغ ہیں اور ایسے پختہ کار ہو گئے ہیں کہ کسی تکنیک کے ماخذی خصائص، اس کی تاریخ، اس کے نیرنگ و افسوں سے بے نیاز ہو کر اونچی آواز میں پکار کر پوچھیں کہ کیا یہ واقعی درست ہے؟ کیا ہم تمہارے دعووں پر عمل کر کے مطلوبہ نتائج نکال سکتے ہیں۔ کیا تمہارا کہا ہم کو واقعی وہاں پہنچا سکتا ہے جہاں ہم جانا چاہتے ہیں اور جس کی ہم خواہش رکھتے ہیں؟''

''نہ ہم مان سکتے ہیں، نہ آواز دے کر پوچھ سکتے ہیں، نہ کسی کی بتائی ہوئی راہ اختیار کر سکتے ہیں تو پھر ہم کیا ہیں؟''

''ہم اپنی حسیات کا مجموعہ ہیں۔'' پروفیسر فیراکوتی نے کہا ''اپنے حواسِ خمسہ کے غلام اور بردے، انھی کے زور پر ہم نے دنیا کو دیکھا ہے۔ انھی کے زور پر جانا ہے اور انھی کے زور پر پہچانا ہے...... لیکن بدقسمتی سے ہماری حسیات محدود و مشروط ہیں اور دنیا کے بارے میں ہمارا نظریہ اور عقیدہ بہت ہی لمیٹڈ ہے لیکن یہ حقیقت ان لوگوں کے لیے بہت ہی حوصلہ شکن اور اضطراب انگیز ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی چیز مجھے دکھائی ہی نہیں دیتی، سونگھائی نہیں دیتی، سنائی نہیں دیتی، جسے میں چھو نہیں سکتا، چکھ نہیں سکتا، اس کو میں کیسے مان لوں کہ ہے اور میرے ساتھ ساتھ میرے اردگرد موجود ہے۔ اگر ہو بھی تو اس کا کیا فائدہ، جیسی ہوئی ویسی نہ ہوئی...... دفع کرو، چھوڑو...... بھول جاؤ اس الف لیلیٰ کو!''

''لیکن...... اگر!'' پروفیسر صاحب نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت ہزاروں تصویریں، لاکھوں نغمے، ان گنت آوازیں ہمیں گھیرے ہوئے ہیں لیکن ہمیں ان کا ادراک نہیں ہوتا، نہ کوئی نظر آتی ہے نہ سنائی دیتی ہے...... تو تم کیا کہو گے؟''

میں ان کی اس بات کا کیا جواب دے سکتا تھا بھلا!

کہنے لگے ''اسی طرح تم اس وقت توانائی کی لہروں میں جکڑے ہوئے ہو۔ انرجی نے تمہاری مشکیں کسی ہوئی ہیں لیکن تم کو پتہ نہیں چل رہا۔ محسوس نہیں ہوتا۔''

''محسوس یوں نہیں ہوتا کہ تمہاری حسیات میں وہ میٹر، وہ پیمانہ، وہ دیدگاہ موجود نہیں جو گھٹتی بڑھتی ڈگری دکھا کر تم کو مطمئن کر سکے کہ یہ ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہاں تمہارے پاس کوئی ریڈیو، کوئی ٹی وی، کوئی لہر پیما ہو تو تم اپنے اردگرد کی لہروں میں سے اپنی پسندیدہ لہر اختیار کر سکتے ہو۔''

''تمہارے پاس ان غیر مرئی چیزوں کا احساس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں لیکن ایک کتا بہت ہی ہلکی خوشبو، چاہے وہ کتنے پردوں میں ملفوف ہو، آسانی سے سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ اس میں ہیروئن ہے۔ اس میں چرس ہے۔ اس میں آفٹر شیولوشن، ہوانا کے سگاروں کا ڈبہ، چوکر کے سکٹ اور گوندی ٹیوب ہے!''

''بلی اندھیرے میں دیکھ سکتی ہے اور دور تک دیکھ سکتی ہے۔ پرندے دور کی حرکت پہچان لیتے ہیں اور تو اور یہ مکھی، یہ عام اور گھریلو مکھی، تمہارے میز پر بیٹھی ہوئی یہ بھی اچھی طرح سے جان جاتی ہے کہ تم اخبار کا طمانچہ یا پنکھیا کا تھپیڑا مار کر اسے ختم کرنے کی کوشش میں ہو۔ تو وہ تمہارے ارادے سے پہلے ہی بھانپ کر فوراً اڑ جاتی ہے لیکن انسان میں یہ صلاحیتیں موجود نہیں، ہم سب ان سے عاری ہیں!''

پروفیسر صاحب کہنے لگے ''پرانے وقتوں کے بھگت بھکاری اور سادھ، صوفی ایک ہی بات کہا کرتے تھے کہ یہ مادہ اور اس کے ساتھ وجود میں آئی ہوئی مادی زندگی دراصل توانائی ہی کا ایک روپ ہے۔ یہ سب شکتی ہے اور سارا سنسار شکتی کی لیلا ہے۔''

لوگ کہتے تھے، یہ بھگتوں کا وہم ہے!

پھر ڈھائی ہزار برس پہلے یونانی فلسفیوں نے کہا کہ زندگی ایٹموں کا مجموعہ ہے اور ایٹم توانائی کی ایک شکل ہے۔ چنانچہ اس نظریے کے تحت سائنسی گروہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے بھی کہا، زندگی توانائی ہے۔

تو لوگوں نے کہا ''کوئی ثبوت!''

اب سائنس دانوں کے پاس ایسے نفیس اور حساس آلات تو تھے نہیں جس کے زور پر وہ دکھا سکتے اور لوگوں کو ثبوت بہم پہنچا سکتے...... شرمندہ سے ہو کر رہ گئے۔

تو معترضین نے کہا ''جھوٹ''

پرانے بھگتوں اور سیانوں نے بھی یہی کہا کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت تو نہیں البتہ ہم اپنی کشفی زندگی سے بتا سکتے ہیں کہ مادہ دراصل شکتی ہی ہے۔

لوگوں نے کہا ''یہ بھی جھوٹ!''

بڑی دیر تک صوفی اور سائنس دان کے درمیان جھگڑا چلتا رہا مگر کوئی بھی گروہ اپنے دعوے کا ثبوت فراہم نہ کر سکا۔ پھر 1900ء میں ایک شخص آئن سٹائن نامی نے ریاضی کی ایک مساوات حل کر کے اعلان کیا کہ ''توانائی مادہ ہے۔'' $E=mc^2$ یعنی توانائی کو اگر روشنی کی رفتار کے مربع سے ''متعلق'' کر دیا جائے تو یہ مادے میں تبدیل ہو جائے گی۔

میرے لیے ان کی یہ باتیں سمجھنا کافی مشکل ہو رہا تھا کہ ان میں حساب اور ریاضی کے جبر یے آنے لگے تھے۔

انہوں نے کہا ''اس کلیہ کے بعد سائنس دانوں نے متفقہ طور پر اقرار کیا کہ پرانے وقتوں کے لوگ ایٹم کی جسامت اور شباہت کے بارے میں جو تصور رکھتے تھے، ایٹم اس سے بھی چھوٹا ہے اور دوسری طرف بہت ہی بڑا ہے یعنی جو ایٹم سینٹ پیٹر کے گنبد جتنا ہو گا اس کا مرکز نمک کے ذرے کے برابر ہو گا۔ ایٹم کی ٹھوس حالت کا 99.95 باقی سب کچھ اس

کے گرد گھومتا ہوا الیکٹران ہوگا لیکن نمک کے اس ذرّے کے گرد سارا خول الیکٹران کا ہوگا...... بچپن میں تم نے چولہے سے ایک سینک سلائی نکال کر تیزی سے گھما کر دیکھی ہوگی۔ ایک سلگتا ہوا دائرہ بنا کرتا تھا۔ اس دائرے کی حقیقت سلگتی ہوئی سینک سلائی کے تیزی سے گھومنے کے ساتھ وابستہ تھی ورنہ وہ دائرہ محض ایک التباسی تھا، ایک الوژن تھا۔

جس طرح سینک سلائی تیزی سے گھوم کر دائرے بناتی ہے، ایسے ہی الیکٹران اپنے مرکزے کے گرد چار سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گھوم کر ایٹم کو اس کا "اوپری وجود" مہیا کرتا ہے۔ جس طرح مرکزے کے گرد الیکٹران گھومتے ہیں اس طرح مرکزے کے اندر پروٹون اور نیوٹرون گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنی تیز رفتاری میں یہ الیکٹران کے بھی گورو ہیں چالیس ہزار میل فی سیکنڈ!

"چالیس ہزار میل فی سیکنڈ کے حساب سے گھومتے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا تو پروفیسر صاحب بولے "کچھ مدت تک تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ پروٹون اور نیوٹرون بھی ایسے ہی تیز رفتار چکر ہوتے ہوں گے جیسے سلگتی ہوئی سینک سلائی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو باقاعدہ وجود رکھتے ہیں اور سب اٹامک ذرات ہیں۔ اس دریافت کے بعد دنیائے سائنس میں ایک فساد برپا ہو گیا۔ وہ جو مادے کو ٹھوس اور زندگی کو سالڈ سمجھتے تھے، پھر شیر ہو گئے اور وہ جو زندگی کو توانائی گردانتے تھے پھر صفائی کے کٹہرے میں آ گئے۔"

"پھر پتہ چلا کہ یہ جو جوہری ذرات میں اٹامک پارٹیکلز ہیں جن سے پروٹون اور نیوٹرون کا ہیولا بنتا ہے، اصل میں پارٹیکل نہیں ہیں بلکہ موج ہیں، لہر ہیں، بس ارتعاش ہیں۔ ان میں کچھ بھی ٹھوس نہیں ہیں۔ ان کی حقیقت سالڈ نہیں ہے...... چنانچہ اب، اس وقت اس لمحے جب میں اور تم آمنے سامنے کھڑے ہیں، فزکس کے سامنے ایک مسئلہ ہے ایک بہت ہی گھمبیر اور اہم مسئلہ: کیا "سب اٹامک پارٹیکلز" ٹھوس ذرات ہیں یا صرف موجیں اور لہریں ہیں۔"

پروفیسر صاحب نے کہا "ابھی ہمارے آلات اتنے حساس اور درست و دقیق نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی کشفی طاقت ہے جو اصل حقیقت کھول کر بیان کر سکیں...... ہمارے پے در پے تجربوں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ کوئی جگہ زندگی کے بنیادی یونٹ موجوں کی صورت میں نظر آتے ہیں اور کئی مقامات پر یہ ذرات کی صورت میں اجاگر ہوئے ہیں۔ اب کیا اعلان کریں؟ موج کہ پارٹیکل؟"

چنانچہ اب تک یہی معلوم ہو سکا کہ سارا بکھیڑا تجربہ کرنے والوں کا ہے۔ اگر تو تجربہ کرنے والے کے ذہن میں، روح میں، بدن میں، تصور میں یہ بات جاگزیں ہے کہ یہ سب اٹامک پارٹیکلز ہیں تو اس کو پارٹیکلز ہی دکھائی دیں گے۔ ذرے ہی نظر آئیں گے اور اگر اس کے دھیان میں، اس کے خیال میں، اس کے گیان میں، اس کے بدن میں، اس کی آتما میں یہ تصور ہے کہ یہ موجیں ہیں، ارتعاش ہے، لہریں ہیں تو پھر اس کو وہ موجیں ہی دکھائی دیں گی۔ جب بھی وہ تجربہ کرے گا، سب اٹامک پارٹیکلز موجیں بن کر ہی اس کے سامنے آئیں گے۔

میں نے پہلی مرتبہ سائنسی تجربے کو اس قدر مجبور و معذور پایا تھا کہ وہ اصل حقیقت اجاگر کرنے کے بجائے تجربہ کرنے والے کی خواہش اور ہوس و وسواس کا تابع ہوا بیٹھا تھا لیکن شاید میں غلط سمجھا تھا کہ سائنس کی دنیا میں ایسا نہ کبھی ہوا تھا اور نہ ہی اس کی امید تھی۔

پروفیسر فیراکوتی کہنے لگے "یہاں تجربے پر اور علمی مشاہدے پر اور اس کے قدرتی نتیجے پر حقیقت کا اطلاق نہیں بلکہ تجربہ کرنے والے کی مرضی اور منشا کا اختیار ہے۔ یہ مشاہدہ کرنے والے کارشاس کے من چلے کا سودا ہے۔ موج چاہے موج دیکھ لے، ذرہ چاہے ذرہ...... موجی کو موجیں ملیں گی، ترابی کو ذرّے!"

کہنے لگے اس حیرت انگیز انکشاف نے دنیائے سائنس کا صدیوں پرانا اصول توڑ تاڑ کے خاک میں ملا دیا کہ تجربہ چاہے کہیں بھی کیا جائے، کبھی بھی کیا جائے، کوئی بھی کرے اس کے نتائج ایک جیسے برآمد ہوں گے!

یہاں سب اٹامک سطح پر سارا اختیار تجربہ کرنے والے کے تصرف میں آ گیا اور ایٹم نے اپنی روح تجربہ کرنے والے کے اختیار میں دے دی۔ اس کو گورو، مرشد اور مالک مان کر اور خود اس کا بردہ بن کر تھرکنے اور لہرانے لگا۔

پروفیسر فیراکوتی یہ کہہ رہے تھے اور میرے کانوں میں ریک بازار جالندھر میں تخت پوش جوڑ کر اوپر بیٹھے مبارک علی خان فتح علی خان کی آواز گونج رہی تھی۔

توہر دم می نمائی جلوہ من ہر باری رقصم
بہر رنگے کہ می رقصانیم اے یاری رقصم
اس کے ساتھ میرا اِک گھنگھرو باندھ کر ناچ رہی تھی
سارا مشرق اسی موضوع میں ڈوبا ہوا تھا:

مجھے بڑی دیر تک بے خبر پا کر وہ میرا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر شاید میرے اندر کا کلائڈ سکوپ بھانپ کر ہولے سے میرا کندھا چھو کر بولے "میں تم کو زیادہ پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن چونکہ تم نے معجزے اور کرامت کے بارے میں پوچھا ہے، اس لیے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک معجزے یا کرامت کے بارے میں ایک سائنس دان کی حیثیت سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نہ اس کا بطلان کر سکتا ہوں، نہ اس کی تصدیق کر سکتا ہوں۔ میں تو تم کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ہماری روزمرہ زندگی کے تعقل یا تصور ایٹمی سکیل پر بالکل معتبر اور موثر نہیں ہیں۔ نہ ہی ہم ان کو اپنے حساب سے درست اور صحیح کر سکتے ہیں۔"

مثال کے طور پر یہ کتاب جو اس وقت تمہارے ہاتھ میں ہے (بال جبریل تھی جو میں باؤ سائی سے ادھار مانگ کر لایا تھا) اس کتاب میں ٹھوس اور وزنی کے مقابلے میں خالی زیادہ ہے۔ اس کا قابل محسوس وجود کم ہے اور ناقابل محسوس خالی پن زیادہ ہے، یعنی وہی، پرانی بات کہ Some thing کے مقابلے میں Nothing زیادہ ہے۔ اس کتاب کے ایٹموں میں الیکٹرون ایسی تیزی سے گھوم رہے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو ایک ٹھوس وجود عطا کر رکھا ہے۔ انہی کی وجہ سے اس کتاب کی جلد، جلد کے ڈورے، حروف اور سیاہی عنوانات کی گرفت موجود ہے۔

یہ ایک دھوکا ہے، ایک Illusion ہے۔ اگر اس کتاب کے سارے الیکٹرون ایک ساتھ تہ کر کے گھومنا چھوڑ

دیں تو یہ کتاب خاک کی مٹھی بن کر تمہارے ہاتھ سے نیچے گر جائے گی۔ گرے گی نہیں بلکہ پکڑے پکڑے غائب ہو جائے گی...... جھر ریٹ! سب لوگ تالی بجاؤ۔"

پھر فوراً ہی کہنے لگے "میں تم سے کوئی مابعد الطبیعاتی بکواس نہیں کر رہا۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ایک طبیعاتی حقیقت، سائنسی حقیقت...... ہمارے اردگرد یہ سب کچھ یہ دیوار، پتھر، درخت، ہوائی جہاز، کار، سکوٹر، تمہاری کتاب تمہارا وجود، یہ سب اپنے مرکزے کے گرد الیکٹرون کی گردش اور اس کے ارتعاش سے وجود پذیر ہیں۔ ہم یہ گردش، موجود، یہ ارتعاش دیکھ نہیں سکتے کیونکہ ہماری حسیات ایسی قوی نہیں ہیں لیکن ہم یہ ضرور جان گئے ہیں کہ الیکٹرون کی گردش جاری رہے گی۔"

ان کے اس بے سود بھاشن سے ذرا سا زچ ہو کر میں نے کہا "سر! میں نے آپ سے ایک ضروری سوال پوچھنا تھا اور میں چاہتا تھا......"

لیکن میری بات بیچ ہی میں کاٹ کر انہوں نے پھر کہنا شروع کر دیا کہ "تو پھر یہ طے پایا...... وہی پرانی...... کہ اس کائنات میں "ہونے" کے مقابلے میں "نہ ہونا" زیادہ ہے۔ بلکہ وہ چیز جو ہمارے سامنے اپنے بھرپور اور بھاری بھرکم انداز میں موجود ہے، اس میں بھی "ہونا" کم ہے اور "نہ ہونا" بہت زیادہ...... اور ان اشیاء میں جو پچھلے لاکھوں کروڑوں سالوں سے ساکت و صامت نظر آتی ہیں، ان میں گردش کا اور مسلسل حرکت کا عمل جاری ہے۔ تمہارے ملک کا اتنا بڑا پہاڑ کے ٹو جو پروفیسر دیسیو کی پارٹی ابھی سر کر کے آئی ہے، اور جس کے لیے تم نے اطالوی، اردو کی ایک بنیادی لغت تیار کر کے دی تھی، یہ پہاڑ ہمالیہ سے بھی اونچا پہاڑ اربوں سال سے ساکت نظر آتا ہے لیکن یوں نہیں ہے۔ یہ مسلسل ارتعاش اور مدوجزر در موجود مسلسل حرکت میں ہے...... ہمارے اردگرد کی ساری چیزیں جو ٹھوس اور ساکن نظر آتی ہیں، ایسی نہیں ہیں جیسا کہ ہم انہیں دیکھ رہے ہیں، یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔"

"ہر طرح کی زندگی توانائی ہے۔ زندگی کچھ ہونے کا اور کسی وجود کا یا کسی دیہہ کا نمود و تظاہر ضرور پیش کرتی ہے لیکن ہے نہیں۔ حقیقت میں یہ بس توانائی ہے۔"

"اور تمہارے سوال کے جواب میں، میں بس اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ یہ توانائی انسانی تعامل کی انسانی انٹرایکشن کی جواب گوئی ضرور کرتی ہے، کیوں کرتی ہے، کیسے کرتی ہے، اس کا ہمیں کچھ بھی علم نہیں لیکن یہ انسان کی جواب دہندہ ضرور ہے۔ اس طریق تعامل میں، اس انٹرایکشن میں کیا راز ہے، اس کا بھید نہیں ملتا۔ میرا مطلب ہے اس وقت تک نہیں مل سکا ہے، آگے کی خبر نہیں۔"

یوم مقررہ پر شہاب صاحب دو بڑے بڑے اٹیچی کیس لے کر روم پہنچ گئے۔ ان کی خواہش کے مطابق میں نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ان کی رہائش کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ ہوٹل میرے گھر کے بالکل قریب تھا۔ جس قدر باغ جناح کی چوڑائی ہے، بس اسی قدر دور۔ چہل قدمی کرتے ہوئے آسانی کے ساتھ آ جا سکتے تھے اور راستے میں

نظارے بھی بہت تھے۔

میں نے ایک دن کی ملاقات میں نوٹ کیا کہ شہاب صاحب باتیں کرتے کرتے میرے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اترتے اور اپنے ہوٹل چلے جاتے پھر گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد واپس آ جاتے۔ میں نے ان کا ساتھ دینے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے منع کر دیا، پتہ نہیں کیا راز تھا! اور وہ وہاں کیا کرنے جاتے تھے۔

میں ان کے آئی سی ایس شپ سے جس قدر خوفزدہ تھا، اس سے ان کو بالکل الٹ پایا اور ان میں ایسی کوئی چیز نہ دیکھی جس میں راج پیرڈ کا طنطنہ، دبدبہ یا "ہے کالا مین!" کی پکار ہو۔ اس پکار کے نہ ہونے کا مجھے کچھ افسوس بھی ہوا کیونکہ میں تو سکول کے زمانے سے اس دبدبے کا متلاشی تھا۔ مجھے یہ تو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں کبھی بھی آئی سی ایس نہ بن سکوں گا لیکن اس بات کی پختہ توقع اور اس حقیقت کا کامل یقین تھا کہ میں کسی بڑے آدمی کا طباق، ساتھی، قریبی یا اس کا دم چھلا ضرور بن جاؤں گا۔

بڑا آدمی خود اپنی زندگی سے اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکتا جتنا اس کے اردگرد کے لوگ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کو کسی سے پوچھنا نہیں ہوتا۔ رائے نہیں لینی ہوتی، اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بڑے آدمی کو بتانا نہیں ہوتا۔ بس فائدے کے بھرے پرے میدان میں جا کر "ٹھاہ" کر کے ایک فائر کرنا ہوتا ہے، سامنے کے فائدے اڑ جائیں، کوئی بات نہیں، فائر کے دھکے سے تار پر بیٹھے ہوئے چند تلیئر تو بے ہوش ہو کر ضرور گر پڑیں گے، وہی سہی!...... اگلے دن پھر سہی۔ جب تک بڑے آدمی کا ساتھ ہے، یہ فائر ہوتے ہی رہیں گے۔ سب کو کانوں کان خبر بھی ہو جائے گی لیکن کوئی بھی اپنی حفاظت خود اختیاری کی وجہ سے اس خبر کا اعلان نہیں کر سکے گا۔

نیک شریف، انصاف پسند اور با اخلاق بڑا آدمی کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ مسجد کے مولوی، سٹیج کے سپیکر اور اخلاقیات کے پروفیسر بھی اس کی دوستی کے خواہش مند نہیں ہوتے۔ وہ اکیلا ہی اس دنیا میں آتا ہے اور اکیلا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کی بڑائی چھوٹی چھوٹی خودرو گھاس کی طرح ہوتی ہے جو ساری عمر سرسبز نہیں ہو پاتی۔ نہ اس قدر بڑھتی ہے کہ کوئی جرائم پیشہ اس کے اندر روپوش ہو سکے۔ نہ ایسا تناور درخت بن سکتی ہے، جس پر مچان باندھ کر جان داروں کا شکار کیا جا سکے۔

نیک شریف، بھلے مانس اور بے ضرر بڑے آدمی کا جنازہ بھی چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی موت کی خبر بھی ایک کالم دو انچ میں ختم ہو جاتی ہے۔

جب میں شہاب صاحب سے ملا تو مجھے اس بات کا بہت ہی افسوس ہوا کہ میرے خوابوں کا شہزادہ ایک بے چارہ اور قسمت کا مارا لکڑ ہارا ہے جو اپنی لاغری کی وجہ سے لکڑیوں کا بڑا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ بس ایسے ہی کھینچ تان کے وقت پورا کر رہا ہے۔ اپنی برادری کا کوئی نامی گرامی لکڑ ہارا بھی نہیں!

اپنے عہدے کے اعتبار سے وہ بڑا ضرور تھا لیکن اپنی عاجزی، افتادگی، شرافت اور تواضع کی وجہ سے ایک ایسا بے شاخ بارہ سنگھا دکھائی دیتا تھا جس نے اپنے سینگ خود ہی ضائع کر دیے تھے۔ وہ اب بھی پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی

پر کھڑا تھا لیکن تنہا تھا۔ کوئی بھی اس کا دوست، سنگی، ساتھی نہ تھا۔ کسی کو بھی اس سے کوئی کام نہ تھا۔ کسی کو بھی اس سے کوئی مطلب نہ تھا۔ بے سینگوں کی خوبصورت مادائیں بھی ترائی میں چر چگ رہی تھیں لیکن کوئی بھی اوپر سر اٹھا کر نہیں دیکھ رہی تھی کہ کون کھڑا ہے!

شہاب صاحب کو اعلیٰ درجے کے قیمتی لباس پہننے کا بہت شوق تھا۔ سرخ رنگ کی شوخ واسکٹ میں خالص سونے کے بٹن لگے تھے۔ ٹوٹل کی قیمتی ترین ٹائیاں باندھتے تھے۔ پاؤں میں کڈ شوز، یا پیٹنٹ لیدر کے موکیشن ہوتے۔ رومال، جرابیں، پن، گھڑی، ڈائری غرض ہر شے بیش قیمت استعمال کرتے لیکن اتنا بکھیڑا کرنے کے بعد ان چیزوں سے مالوف نہیں تھے۔ یہ ساری چیزیں ان کے جسم پر موجود ضرور ہوتیں لیکن ان پر سوار نہیں تھیں۔

دو دن کی بہت ہی طویل گفتگو اور روز و شب کی بک بک سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ وہ بڑا آدمی نہیں ہے جس کا مجھے بچپن سے انتظار تھا اور جس سے میں نے اپنے کامیاب اور روشن مستقبل کو وابستہ کر رکھا تھا جس سے مجھے کچھ یافت کی امید ہو سکتی تھی۔ کچھ ترقی کرنے کا سہارا مل سکتا تھا۔ کچھ آگے بڑھنے کی راہ نکل سکتی تھی لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اک سپاٹ سا بے وعدہ آدمی تھا جس کے پاس اپنے دینے کو بھی کچھ نہیں تھا۔ ان کی بے وقعتی دیکھ کر میں ان سے کٹنے کے بجائے ان سے کچھ بے تکلف سا ہو گیا۔ ان میں کوئی بات ضرور تھی جو مجھے روک کے رکھتی تھی۔ ان کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتی تھی۔ ان کی قربت کی طلب بنتی تھی۔

شہاب صاحب سے باتیں کرنے میں ایک عجیب طرح کا لطف تھا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بول رہا ہوتا، لطف برقرار رہتا۔ یہ ان کی موجودگی کا کمال تھا۔ ان سے ہٹ کر وہ لطف باقی نہ رہتا..... دو دن بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ کوئی بات، کوئی مختلف بات۔ ایسی بات جو وہ چھینی ہتھوڑی سے تراش کر میرے اندر اتارنا چاہتے ہیں لیکن ان کو حوصلہ نہیں پڑتا، یقین نہیں ہوتا۔ میرے اندر کا سرا پکڑائی نہیں دیتا۔

ایک دن مجھ سے پوچھنے لگے ''تمہارے پاس کونسا قرآن شریف ہے؟''

میں نے کہا ''جی وہی، وہی ایک عام سا قرآن شریف، جو عام طور پر گھروں میں ہوتا ہے جو میری والدہ پڑھا کرتی ہیں..... وہی ہے۔''

کہنے لگے ''یہ تو بڑی برکت والی بات ہے۔ بندے کے پاس وہی قرآن شریف ہونا چاہیے جو عام طور پر اس کے گھر میں پڑھا جاتا ہے۔''

ان کے چہرے سے صاف دکھائی دیتا تھا کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میرے پاس کوئی قرآن شریف نہیں، اصل میں کوئی بھی مسلمان ولایت اس لیے نہیں جاتا کہ وہاں جا کر تلاوت کرے۔ اس کو اور بھی بہت سے ضروری کام ہوتے ہیں جن کے لیے وہ گھر سے نکلا ہوتا ہے..... واپسی پر گھر پہنچ کر البتہ تلاوت کی جا سکتی ہے لیکن ولایت میں یہ کیسے ممکن ہے!

شہاب صاحب نے کہا ''میرے پاس ایک کتابی سائز قرآن شریف مولانا فتح محمد جالندھری کے ترجمے کا ہے۔ وہ میں آپ کے لیے چھوڑ جاتا ہوں۔ آپ اپنے قرآن شریف کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار اسے بھی دیکھ لیا کیجئے۔ بہت اچھا

اور آسان ترجمہ ہے۔''

میں نے کہا ''شہاب صاحب میرے پاس ہے جو اپنا۔ اس کے ہوتے ہوئے اس کی چنداں ضرورت نہیں، پھر آپ کو راستے میں بھی اس کی ضرورت ہوگی، گھر جا کر بھی.....''

میری بات کاٹ کر بولے ''میرے پاس ایک اور ہے مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجمے والا، میں آج کل وہ پڑھ رہا ہوں۔ دراصل مولانا اشرف علی تھانوی سے میری عقیدت ان دنوں کچھ زیادہ ہی گہری ہو گئی ہے۔''

''بہشتی زیور والے مولانا اشرف علی؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا تو انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہمارا گھر تھا تو دیندار لوگوں پر مشتمل لیکن ہم سارے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ پڑھے لکھے مسلمان کا مذہب دوسرے عام مسلمان سے کافی مختلف ہوتا ہے۔ اس میں منطق، دلیل، تعقل اور خودرائی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اصل میں تو خودرائی ہی ہوتی ہے اور منطق، دلیل اور تعقل سہاروں کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو خودرائی کا جھومر بغیر سہاروں کے ہی اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ ہمارے گھر میں بہشتی زیور کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور عورتوں کے مسائل کی جزئیات پر دل کھول کر ہنسنے کا سامان پیدا ہوتا تھا..... مجھے شہاب صاحب کی دانش پر تھوڑا سا افسوس ہوا۔ اگر وہ مجھ سے سمجھنا چاہتے تو میں ان کو دلائل سے قائل کر سکتا تھا کہ ان مولویوں کے پاس علم اور عقل نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔

دوپہر کے وقت میں نے اپنے چھوٹے سے سٹوو پر شہاب صاحب کے لیے آلو ٹماٹر اور شملے کی مرچوں کا سالن تیار کیا تھا۔ زیتون کے تیل کی ہیک چونکہ ان سے ذرا کم برداشت ہوتی تھی، اس لیے میں مکھن میں ان کا کھانا تیار کرتا تھا۔ کھانا کیا تھا، صبح و شام سبزیاں ترکاریاں یا رات کے وقت نمکین چاولوں میں آلو کے قتلے، گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے۔ مچھلی بہت پسند تھی لیکن پتہ نہیں چلتا تھا کہ کونسے روغن میں پکی ہے۔ اس لیے مجبور تھے۔ سٹیم میں، بھوبل میں یا دودھ میں پکی مچھلی کے دیوانے تھے اور ہمارے یہاں اس نوعیت کی مچھلی عام تھی۔

جب کھانا پکاتے پکاتے مجھے فون سننے کے لیے پانچ مرتبہ اندر جانا پڑا تو انہوں نے زچ ہو کر کہا ''آپ کے یہاں یہ بڑی مشکل ہے، گھر پر رہیں تو فون نہیں چھوڑتا، باہر جا کر بیٹھیں تو دل کی بات نہیں ہوتی، کیا کریں؟''

میں نے کہا ''سر سیدھی سی بات ہے۔ روم چھوڑ کر کہیں اور چلتے ہیں۔ چار پانچ دن کا سارا وقت ایک ساتھ گزاریں گے اور جتنی باتیں رہ گئی ہیں، ان کو ایک ہی دن میں سمیٹ لیں گے۔''

پوچھا ''روم سے دور؟..... کافی دور؟''

میں نے کہا ''سر اٹلی میں کافی دور تو کہیں بھی نہیں ہوتا البتہ فراغت کے لمحوں اور آسودگی کی جان کے کئی مراکز ہیں۔ آدمی ساری جدید سہولتوں کے ساتھ سولہویں صدی میں پہنچ جاتا ہے اور جب تک پسند کرے وہاں رہ سکتا ہے۔''

کہنے لگے ''ٹھیک ہے!''

پہلے میرا ارادہ پیزا کے پاس ایک چھوٹے سے سرسبز گاؤں فلیمنو میں جانے کا تھا لیکن صبح گاڑی میں سامان

رکھتے ہوئے میں نے ارادہ بدل لیا۔

جب ہم شہر سے نکلے تو شہاب صاحب نے پوچھا ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

میں نے کہا ''سر ہم اٹلی چھوڑ کر ایک دوسرے ملک میں جا رہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس آپ کا پاسپورٹ ہے؟''

انہوں نے کچھ پریشان ہو کر کہا ''پاسپورٹ تو میرے پاس موجود ہے لیکن کسی دوسرے ملک جا کر ہم اتنی جلدی کیسے لوٹ سکتے ہیں۔ میرے پاس صرف تین دن ہیں اور چوتھے روز میری سیٹ بک ہے۔''

میں نے کہا ''آپ فکر نہ کریں، ہم تین دن ختم ہونے سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ بڑا وقت ہے اور بڑی فراغت ہے۔ وہاں آپ کو موسم بھی اچھا ملے گا اور سٹیم کی ہوئی مچھلی بھی اعلیٰ درجے کی دستیاب ہوگی۔ بس آپ دیکھتے جائیں۔''

ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب میں نے ایک کیوسک سے کافی کی دو گرم گرم پیالیاں اور چینی کے دو بند لیے تو انہوں نے اپنی مخصوص دھیمی سی آواز میں پوچھا ''لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

میں نے کہا ''شہاب صاحب ہم چوڑائی کے رُخ اٹلی کو کراس کر رہے ہیں اور دو گھنٹے میں اڈریاٹک سمندر کے کنارے پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک چھوٹا سا، خوبصورت سا پیارا سا ملک ہے جس کے لوگ بڑے دھیمے اور میٹھے مزاج کے ہیں۔ آپ ان سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے۔''

انہوں نے اپنی جغرافیہ دانی پر زور دیتے ہوئے کہا ''ادھر تو شاید یوگوسلاویہ ہے، لیکن وہ تو اوپر ہے نارتھ کی طرف۔''

میں نے کہا ''یہ ملک اٹلی کے اندر واقع ہے اور اٹلی کی سرزمین سے الگ نہیں ہے۔ جس طرح ضلع لاہور کی تین تحصیلیں ہیں، لاہور میں لاہور، چونیاں، قصور اسی طرح اٹلی تین ملکوں پر مشتمل ہے۔ اٹلی میں اٹلی، ویٹی کن اور سان مرینو۔''

پوچھنے لگے ''یہاں بھی چونیاں اور قصور کی طرح اٹلی کی تحصیلیں ہیں؟''

میں نے کہا ''نہیں سر یہ پورے ملک ہیں۔ ان کا اپنا ٹکٹ اور سکہ ہے۔ اپنی اپنی حکومت ہے۔ اپنے اصول و قوانین ہیں اور اپنے سفیر ہیں۔''

میں موٹر چلا رہا تھا اور وہ حیرانی کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا ''اس وقت ہم سان مرینو جا رہے ہیں جو بحیرہ اڈریاٹک پر آباد ہے اور دنیا کا سب سے پرانا جمہوری ملک ہے۔ سقراط نے تو جمہوریت کا تصور ہی دیا تھا، یہ ملک بغیر کسی تبدیلی کے پچھلے گیارہ سو سال سے تواتر کے ساتھ جمہوری طرز پر حکومت اپنا کر چلا آ رہا ہے...... دنیا کا قدیم ترین جمہوریہ...... سان مرینو!''

شہاب صاحب نے کہا ''مجھے تھوڑا سا تو یاد پڑتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں اس ملک کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا میں ایک پیراگراف دیکھا تھا لیکن وہ پیرا بہت ہی چھوٹا تھا اور کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایسی بستی ملک کیونکر کہلا سکتی ہے۔''

میں نے کہا ''شہاب صاحب، یہ ملک کوئی چالیس مربع میل پر پھیلا ہوا ہے بلکہ شاید اس سے بھی کم اور اس کی کل آبادی انیس بیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔''

اس ملک کے بارے میں شہاب صاحب نے اور بھی چند سوال کیے لیکن میں ان کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

...ل میں میری استانی اور میں نے پہلے اٹلی چھوڑ کر یہاں آنے کا چند روز پروگرام بنایا تھا مگر ہماری وہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ ...اس کے بجائے میں شہاب صاحب کو ساتھ لے کر یہاں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں اس میں کیا راز تھا مگر وہ بات رہ رہ کر اپنے ...تی تبدیل کر کے میرے سامنے آ رہی تھی۔

اس وقت بھی ہم شہر سے باہر نکلے تو دیّا نومنتانا ہی کی طرف سے نکلتے۔ آج بھی ہم اسی راستے سے نکلے تھے۔ ...بھی میری گاڑی ہوتی، آج بھی میری ہی گاڑی تھی اور میں ہی چلا رہا تھا۔ جب بھی میں نے ٹینکی فل کرا کے گھر سے نکلنا تھا، آج بھی میں ٹینکی فل کرا کے چلا تھا۔ اس وقت بھی میرے دائیں ہاتھ میں میرے ساتھ کی سواری ہوتی، آج بھی ...ے دائیں ہاتھ ساتھ کی سواری موجود تھی۔ لیکن سواری سواری میں فرق تھا۔ استانی کے وجود میں ایک اور طرح کی کشش ...اور اس شخصیت میں ایک اور ہی قسم کی جاذبیت تھی۔ استانی کو تو میں ایک مدت سے جانتا تھا لیکن اس شخص سے میری ...طرح سے پہلی ہی ملاقات تھی...... اس عجیب و غریب کیفیت کے بارے میں میں نے اپنے سینئر ادیب سے کچھ پوچھنا ...تو گاڑی رمینی شہر کے اندر داخل ہوگئی۔ یہ اٹلی کا آخری سرحدی شہر تھا۔ اس کے بعد جمہوری سان مرینو کی مملکت شروع ہو جاتی تھی۔

رمینی شہر کے ساتھ ہی باہر سڑک پر نکلتے ہوئے دو تین کمروں پر مشتمل ایک اچھا سا سرکاری دفتر تھا جس کے اوپر ...جلی قلم سے درج تھا ''سان مرینو آنے والوں کا شکریہ! ہمیں میزبانی کا شرف عطا کرنے والوں کا شکریہ......! دفتر کے اندر ...ے اونچے سپیکروں پر اس وقت کے مقبول گانے بج رہے تھے۔''

یہ دفتر جو سان مرینو کا کسٹم آفس، امیگریشن آفس، انفرمیشن آفس اور ٹورازم آفس تھا۔ باہر سے تو یہ عمارت ...سی نظر آتی تھی لیکن اندر سے بڑی مرصع اور مزین تھی۔ جو شخص بھی اپنی موٹر میں سوار اس دفتر کے آگے سے ''بن جورنو'' ...والے'' ''چاؤ'' کہتا ہوا گزرتا اس کو سرحدی دفتر والے ہاتھ ہلا ہلا کر خوش آمدید کہتے اور ''فلائنگ کس'' دے کر اس کا ...بال کرتے۔ سیاحوں کی لدی پھندی خوبصورت بسوں کے اندر بے باک اور کم پوشاک لڑکیاں کورس میں گانے لگتیں۔ ...کے باہر لوگ نکل کر اس کورس میں مردوں کے ٹپے گا کر جواب دیتے۔ ڈرائیور بسیں آہستہ کر لیتے اور رینگتی ہوئی ...وں میں سے تیز تیز بھڑکیلے گانے باہر نکل کر سڑک پر دور دور تک پھیل جاتے جیسے ساری پٹاریاں ایک ساتھ کھل گئی ہوں۔

اس دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے بھی پورا بازو باہر نکال کر زور سے ''چاؤ'' کہا تو امیگریشن کے ...کارندے نے سیٹی بجا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ شہاب صاحب نے میری طرف ذرا گھبرا کر دیکھا تو میں نے کہا ''کوئی ...بات نہیں سرنام مقام پوچھ کر چلا جائے گا۔''

کارندے نے آ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور پوچھا ''راضی باضی! تگڑے! گھر میں سب خیر خیریت! بال بچے ٹھیک۔''

میں نے کہا ''سب ٹھیک ٹھاک۔ سارے مزے میں، اچھی صحت، اچھی گزر اوقات، خداوند یسوع مسیح کی ...ربانی، میں بھی اچھا۔ میرے یہ دوست بھی خیریت کے ساتھ۔ سب خیر!'' اس نے کھڑکی کے اندر ہاتھ ڈال کر شہاب

صاحب سے مصافحہ کیا اور ان سے بھی یہی پوچھا۔ ان کی طرف سے میں نے ایک بار پھر ساری بانی دہرائی اور ہم دونوں نے ''شکر! شکر!! شکر!!!'' کہہ کر ایک دوسرے کی تسلی کی۔

پھر اس نے پوچھا ''مادام اور بچے ساتھ نہیں آئے؟''

میں نے کہا ''وہ فرانس چلے گئے، چھٹیاں گزارنے۔''

کہنے لگا ''فرانس سے تو ہمارا سان مرینو لاکھ درجے اچھا ہے۔ وہ فرانس کیوں چلے گئے؟ چلو خیر، ان کی مرضی، ان کی پسند!'' پھر مجھے آنکھ مار کر بولا ''بیگمات کی پسند میں دخل نہیں دینا چاہیے، جو وہ کریں، وہی ٹھیک ہے۔''

میں نے کہا ''کیوں نہیں، کیوں نہیں...... آخر وہ بیگمات ہیں، ان کی نہیں مانی جائے گی تو گزارہ کیسے ہوگا۔''

اس قدر محبت آمیز گفتگو کے بعد اس نے سنجیدہ چہرہ بنا کر گھمبیر آواز میں کہا ''آپ کا پاسپورٹ؟''

میں نے آرام سے دونوں پاسپورٹ اٹھا کر اس کو دیئے اور وہ ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پہلے اس نے ایک ایک کر کے ہماری شکلیں پاسپورٹ کی تصویروں سے ملائیں۔ پھر کہنے لگا ''یہ پاکستان کونسا ملک ہے؟ میں نے تو کبھی نہیں سنا۔''

میں نے کہا ''بہت کم عمر ملک ہے۔ ابھی ابھی بنا ہے۔ آپ کو واقعی اس کا علم نہیں ہوگا۔''

اس نے کہا ''آپ کے یہ ساتھی کیوں نہیں بولے، کچھ ناراض ہیں؟''

میں نے کہا ''ان کو اطالوی نہیں آتی، اس لیے نہیں بولتے۔''

اس نے حیرانی کے ساتھ اپنا چہرہ کھڑکی کے لیول پر لا کر شہاب صاحب کو غور سے دیکھا اور تعجب بولا ''اطالوی نہیں آتی؟ کمال ہے، اتنے بڑے ہوگئے اور اطالوی نہیں بول سکتے...... اطالوی نہیں بول سکتے تو بات چیت کیسے کرتے ہیں۔ زندہ کیسے ہیں؟''

میں نے کہا ''اب ہمیں اجازت ہے؟''

بولا ''بالکل اجازت ہے۔ خوشی سے رہیے۔ خوشی سے سیر کیجئے۔ پہاڑوں کو دیکھئے، ہمارے ملک کی سیاحت کیجئے...... اسے اپنا ہی گھر سمجھئے، اپنا ہی ملک سمجھئے۔''

میں نے کہا ''شکریہ! شکریہ۔ آپ کی مہربانی، ذرہ نوازی، محبت!'' لیکن جب میں نے پاسپورٹ لینے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور کہنے لگا ''یہ آپ کو کل ملیں گے!''

میں نے کہا ''کہاں؟''

کہنے لگا ''آپ کے ہوٹل میں یا آپ کی پائیوں میں یا آپ جہاں بھی ٹھہرے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''آپ کو کیسے معلوم ہوگا کہ ہم کہاں ٹھہرے ہیں؟''

اس نے کہا ''یہ ہمارا ملک ہے...... سان مرینو...... دنیا کا سب سے چھوٹا ملک۔ اس میں ہر کوئی ہر کسی کو جانتا ہے اور ہر شخص دوسرے کو پہچانتا ہے۔ آپ کدھر گم ہو سکیں گے بھلا! فکر نہ کیجئے، آپ کے پاسپورٹ کل دوپہر تک آپ کے دروازے پر پہنچ جائیں گے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے، مسکراتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے سینور، کل سہی لیکن ان کو سنبھال کے رکھنا۔'' میں اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''بے فکر رہیں، یہ میری ذمہ داری ہے اور میں اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔''

جب میں نے موٹر سٹارٹ کر کے گیئر بدلا تو شہاب صاحب نے پریشان ہو کر کہا ''ہمارے پاسپورٹ!''

میں نے کہا ''مل جائیں گے سر، کوئی فکر کی بات نہیں۔ وہ ان کے کوائف اپنے رجسٹروں میں درج کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں لوٹا دیں گے۔''

انہوں نے بات سن تو لی لیکن ان کی تشفی نہ ہوئی۔

چوک میں ٹریفک کا سپاہی ہماری طرح کے گول پتھر پر کھڑا ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا۔ ہماری کار دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرایا اور ہم کو سلیوٹ کیا۔ پچھلے پندرہ منٹ سے چوک میں سے کوئی بھی سواری نہیں گزری تھی جس کو وہ اشارہ دے کر راستے پر ڈالتے۔ ہماری رہنمائی کر کے اسے خوشی ہوئی۔ میں نے اس کے قریب کار روک کر پوچھا ''یہاں کونسا ہوٹل بہتر ہے؟''

وہ پتھر سے نیچے اتر آیا اور کھڑکی میں سر ڈال کر بولا ''دو فرد ہو؟''

میں نے کہا ''ہاں۔''

کہنے لگا ''خواتین نہیں ہیں ساتھ؟''

میں نے کہا ''نہیں۔''

کہنے لگا ''ان کو بھی ساتھ لے آتے تو بڑا لطف رہتا۔ یہ جگہ تو مزے اڑانے اور موج میلہ کرنے کی ہے۔ تم نے یہ کیا کیا کہ خواتین کو پیچھے چھوڑ آئے۔''

میں نے کہا ''بس ایسے ہی ہے...... پھر کبھی سہی۔''

کہنے لگا ''ہوٹل تو بہت سے ہیں لیکن تمہارے قابل ہوٹل تی تانو ہے۔ صاف ستھرا۔ آٹھ سو برس پرانا۔ تاریخی عمارت، پہاڑ کے عین وسط میں، عالیشان نظارہ، خوبصورت راہ رو، دلفریب آتی جاتی لڑکیاں۔''

میں نے اس سے ہوٹل ''تی تانو'' کا پتہ پوچھ کر گاڑی پہاڑ کی چڑھائی پر ڈال دی۔

ہوٹل ''تی تانو'' یورپ کے اچھے، اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں سے تھا۔ اس کی دیواروں پر ''تورتا'' وائن کے خوبصورت اشتہار لگے تھے اور ساتھ بنسی کی کھینچ میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کی رنگدار تصویریں تھیں۔ یہ ہوٹل اپنی خوراک کی وجہ سے سارے ملک میں مشہور تھا اور اس کے مختلف النوع کھانے یورپی کوزین کے پسندیدہ کھانے تھے۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پر تیکھی مونچھوں والے نوجوان نے انگریزی میں پوچھا ''ڈبل بیڈ روم، الگ الگ بستر؟''

شہاب صاحب نے فوراً کہا ''دو سنگل روم، الگ الگ لیکن قریب قریب۔''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سیٹی بجائی اور رجسٹر ہمارے آگے دھکیل دیا۔

میں نے کہا ''پاسپورٹ تو ہمارے پاس ہیں نہیں......''

کہنے لگا" کوئی مضائقہ نہیں، ہم پاسپورٹ پر اتنا زیادہ اصرار نہیں کرتے۔ نہیں ہیں تو نہ سہی۔"

میں نے کہا" تھے ضرور لیکن وہ راستے میں امیگریشن والوں نے رکھ لیے۔"

اس نے حیرانی سے باری باری ہمارے چہروں کو دیکھا اور ہمیں کمرہ نمبر الاٹ کرنے کے بجائے فون کرنے لگا۔" پرونتو! پرونتو!! کی پارلا سکوزی......"

وہ فون پر پوچھ رہا تھا کہ فارن منسٹر صاحب گھر پر ہیں یا نہیں۔ ادھر سے پتہ چلتا تھا کہ نہیں ہیں۔ یہ کہہ رہا تھا کہ جب بھی آئیں انہیں فوراً ہمارے پاس بھیجیں...... آپ کی مہربانی۔ آپ کا شکریہ۔

پھر اس نے فون بند کر کے ہمیں اکاون اور باون نمبر دو کمرے دیے جو ساتھ ساتھ تو نہیں تھے، آگے پیچھے تھے۔ شہاب صاحب کا اٹیچی میں ان کے ساتھ باون نمبر میں چھوڑ آیا اور خود اکاون کے کونے میں اپنا تھیلا پھینک کر بستر پر دراز ہو گیا۔

میں کوئی ایسا خاص تھکا تو نہیں تھا لیکن بستر پر گرتے ہی نیند آ گئی اور میرا خیال ہے کہ میں کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھوڑے گھوک سویا رہا۔ شہاب صاحب نے بتایا کہ اس عرصے میں انہوں نے دو بار آ کر میرے دروازے پر دستک دی لیکن مجھے ایک بار بھی پتہ نہ چلا۔

جب ہم غروب سے پہلے، شہر کی سیر کو باہر نکلے اور کاؤنٹر پر اپنی اپنی چابی جمع کرائی تو کاؤنٹر کلرک نے کہا" فارن منسٹر صاحب بڑی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں...... ہم نے آپ کے کمرے میں گھنٹی دے کر اندازہ لگایا تھا کہ آپ سوئے ہوئے ہیں، اس لیے ہم نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

میں نے ذرا گھبرا کر دریافت کیا کہ فارن منسٹر صاحب ہماری تلاش میں کیوں آئے تھے تو اس نے لابی کے بڑے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہا" آپ خود یہ پوچھ لیجیے۔ وہ تو اس وقت سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ہم دونوں اس صوفے کی طرف بڑھے جہاں ایک موٹا آدمی بشرٹ پہنے کراس ورڈ پزل حل کر رہا تھا۔ وہ اپنے اخبار پر ہمارے بڑھتے ہوئے سائے کی چھایا دیکھ کر اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر بولا" میرا نام نکولا چندے ہے اور میں سان مرینو کا فارن منسٹر ہوں۔ میں آپ لوگوں سے معافی مانگنے آیا ہوں کہ میرے کارندے نے انتہائی حماقت کا ثبوت دے کر آپ سے پاسپورٹ لے کر رکھ لیے...... وہ ایک انتہائی درجے کا احمق اور حد سے زیادہ باتونی انسان ہے۔ باتیں کرنے کے شوق میں وہ کئی حماقتیں کر جاتا ہے اور آج تو اس نے کمال ہی کر دیا...... یہ رہے آپ حضرات کے پاسپورٹ اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے، میری منسٹری اور میرے سٹاف کو معاف فرما دیں گے...... ایسی تو کوئی بات ہی نہیں تھی، پاسپورٹ تو ہم مانگتے ہی نہیں، اس کا تو ہم تقاضا ہی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا" کوئی نہیں منسٹر صاحب۔ ہمیں تو یاد بھی نہیں تھا۔ اس نے پاسپورٹ مانگے، ہم نے دے دیے۔ فارن کنٹریز میں داخل ہوتے وقت ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔"

منسٹر صاحب دائیں بائیں موڑ کھا کر اعلیٰ سے اعلیٰ الفاظ میں معافی مانگ رہے تھے اور ہم کو بولنے کا موقع ہی نہ دیتے تھے۔ جب میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر ان کی معافیوں کا جواب دینے کی کوشش کی تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر

کہا" اچھا یہ بتایئے کہ چرواہے کو رات ریوڑ لے کر لوٹتے وقت روشنی کی ضرورت ہوتی ہے یا کتے کی؟" میں نے پہلے سنا بھرا تھا لیکن پھر سوچا کتے کا کیا فائدہ، اگر سارا راستہ اندھیرا ہے اور ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تو وہاں کتا کیا کرے گا۔ پھر میں نے اس کی جگہ چراغ بھرا لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ چراغ سے روشنی تو ہو گی لیکن خالی روشنی بھیڑیے یا ہائنے کا کیا مقابلہ کرے گی۔

میں نے کہا" منسٹر صاحب میرے خیال میں تو چراغ ہی ٹھیک ہے۔ روشنی ہو گی تو چرواہا کچھ دیکھ تو سکے گا اور نہیں تو اپنی بلم برچھی سے حملہ آور کا بدن تو پھاڑ سکے گا...... لیکن یہ میرا ذاتی خیال ہے......"

کہنے لگے" اچھا اگر یہاں چراغ رکھ دیں تو دوسری طرف " آبشار" ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ وہاں توپ ہونی چاہیے...... ایک منٹ ٹھہریے، میں آپ کو اشارہ پڑھ کر بتاتا ہوں۔"

میں نے لجاجت سے کہا" اس وقت ہم شام کا نظارہ کرنے جا رہے ہیں، پھر وقت نہیں رہے گا اور ہم تین دن سے زیادہ یہاں ٹھہر بھی نہیں سکتے کہ انہیں واپس جانا ہے۔"

کہنے لگے" ضرور ضرور...... میں آپ کو بالکل نہیں روکوں گا۔ سان مرینو کی شام ہی تو دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ آپ بحیرہ اڈریاٹک کی طرف منہ کر کے شام کا نظارہ کرنا، سمندر آپ کے بالکل قریب آ جائے گا۔ حالانکہ یہاں سے تیرہ چودہ میل کے فاصلے پر ہے۔"

آدھے ملک کا چکر لگا کر جب ہم ہوٹل لوٹ رہے تھے تو بڑے گرجے کے پاس ایک کافی ہاؤس، لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا، لوگ گانوں کی تانیں اُڑا رہا تھا۔ شہاب صاحب نے کہا" یہاں بیٹھ کر ایک ایک کپ کافی پیتے ہیں، بہت ہی اچھی خوشبو اڑ رہی ہے۔"

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد ہمیں تین کرسیوں والی ایک چھوٹی سی گول میز ملی۔ اس کی ایک کرسی پر پہلے ہی ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بخوشی ہم کو ساتھ بٹھانے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ یہ نوجوان تھوڑی انگریزی جانتا تھا لیکن اس کے فقروں کو سیدھا کر کے ان سے مطلب نکالنا کافی مشکل ہو جاتا تھا۔ شہاب صاحب محض اس کی خوشنودی کے لیے اس سے گفتگو کر رہے تھے لیکن میں مکمل طور پر زچ ہو چکا تھا۔

وہ انگلستان جا کر قانون پڑھنا اور بیرسٹر بننا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس مناسب رقم نہیں تھی۔ شہاب صاحب اس سے کہہ رہے تھے کہ اگر تم ایک مرتبہ زور لگا کر کسی طرح انگلستان پہنچ جاؤ تو تمہیں وہاں بہت کام مل جائے گا، پڑھ بھی لو گے اور روٹی بھی کما لو گے۔

اس نے بتایا کہ یوں تو برطانیہ ایک طرح سے ہمارا قرضدار ہے لیکن وہاں کے لوگ اور گورنمنٹ بہت چالاک ہے۔ وہ وعدہ کر کے مکر جاتے ہیں اور سخت نادہند قسم کے لوگ ہیں۔ شہاب صاحب کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جب جرمن فوجیں مختلف محاذوں پر شکست کھا کر واپس ہوئیں تو ان میں سے ایک بڑی ٹکڑی نے سان مرینو میں کچھ دن پناہ لی۔ انگریزوں کو پتہ چل گیا۔ ان کے جہازوں نے اسی ٹکڑی پر ایسی اندھا دھند بمباری کی کہ ہمارا آدھا ملک ادھیڑ کر رکھ دیا۔

ہمارا جانی نقصان تو کم ہوا البتہ مالی اور ملکیتی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ بڑی بڑی تاریخی عمارتیں ڈھہ گئیں اور سڑکیں اور راستے منسلکہ علاقوں سے کٹ گئے۔ سان مرینو کی ساری تجارت تباہ ہوگئی اور ملک دیوالیے کی حد تک پہنچ گیا۔ پھر ہمارے سیانوں کے اصرار پر برطانیہ نے کچھ لاکھ پاؤنڈ ہرجانہ دینے کا وعدہ کیا اور اس معاملے میں لکھت پڑھت بھی ہوگئی۔ مگر اب سات سال بیت چکے ہیں، ایک دمڑی تک نہیں ملی...... اگر وہ رقم مل جائے تو ہمارے کئی سٹوڈنٹس باہر کے ملکوں میں جا کر تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے ملک کا معیارِ زندگی بلند کر سکتے ہیں۔

"لیکن!" وہ لیکن کہہ کر خاموش ہو گیا اور اس کے چہرے سے مایوسی ٹپکنے لگی۔ شہاب صاحب نے پوچھا "کیا بات ہے؟" تو اس نے اپنی پیچیدہ انگریزی میں کہا "ایسے ملک کا قانون پڑھنے سے کیا فائدہ جو خود نادہندہ ہے اور اپنے معاہدوں پر عمل نہیں کرتا۔"

شہاب صاحب نے ایک اچھے آئی سی ایس آفیسر کی طرح انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیتے ہوئے اس کی بہت تشفی کی کہ علم کے میدان میں ان سے بہتر اور کوئی قوم نہیں، اس لیے ان کا علم حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔

اس نوجوان کے ذہن میں ایک عجیب سا انکار اترا اور وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا ہم سے ہاتھ ملا کر کافی پارلر سے باہر نکل گیا۔

جس لڑکی نے ہمارے سامنے کافی کا سامان لا کر رکھا، اس کا قد بت بہت ہی کمال کا تھا مگر شکل و صورت کی معمولی تھی۔ شہاب صاحب نے ایک دیسی آدمی کی طرح اس پر کوئی توجہ نہ دی لیکن میں جو ولایت میں رہ کر قد و گیسو کی قدر و قیمت پہچان گیا تھا، اسے دیر تک اور دور تک دیکھتا رہا۔ اس کا جسم ایسے موی مجسمے جیسا تھا جس میں ابھی ابھی جان پڑی ہو اور کسی نے اسے ہاتھ لگا کر بھی نہ دیکھا ہو۔ میں نے سوچا کہ جب وہ برتن اٹھانے آئے گی تو میں اسے اور غور سے دیکھوں گا، خاص طور پر جب وہ جھک کر برتن اٹھائے گی اور چھوٹے تولیے سے میز صاف کرے گی۔

شہاب صاحب نے کہا "مرد روزِ ازل سے عورت کی محبت میں گرفتار چلا آتا ہے اور اس کو سمجھ نہیں آتی کہ اس معاملے میں کیا کرے۔ دنیا کا ہر مرد ہر عورت سے خواہ وہ کہیں کی رہنے والی ہو، کسی بھی رنگت اور شکل کی ہو، کسی بھی سوشل اور اکنامک سٹیٹس کی ہو، مرد اس پر ضرور ریشہ خطمی ہو کر نکلے گا اور دور تک اسے یاد کرتا جائے گا۔"

میں نے کہا "سر اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا کا اتنا بڑا لٹریچر ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہوتا اور اس وقت تک مشکل سے دو سو تیرہ کتابیں چھپی ہوتیں۔ اب یہ جو آپ کتابوں کا ایک سمندر دیکھ رہے ہیں، اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں تو یہ سب عورت کے وجود ہی کی برکت سے ہے...... کیا دنیا میں کوئی لٹریچر عورت کے ذکر کے بغیر وجود میں آ سکتا ہے؟"

کہنے لگے "شاید تم ٹھیک کہتے ہو، بظاہر تو ایسا ہی نظر آتا ہے مگر حقیقت اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

پھر ہم ایسے ادب کے بارے میں باتیں کرنے لگے جس میں بھلے عورت کا مذکور تھا لیکن وہ اس کی چول نہیں تھی کہ سب کچھ اسی پر گھومے جاتا۔ ہتوپدیش تھے۔ کلیلہ و دمنہ الیسپ کی کہانیاں۔ بدھ جاتک اور باؤل کہانیاں۔ ان سے بڑا

لٹریچر اور کونسا ہو گا بھلا لیکن ایسے نہیں کہ عورت پر حلال ہوئے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کو بھی ذبح کیے جا رہے ہیں۔

شہاب صاحب نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ ادیب عام آدمیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ معاملے کی تہہ میں اتر کر اندر سے موتی اور مونگے تلاش کر کے لاتا ہے۔ ایسی گہری اور پیچیدہ جہتوں کی نشاندہی کرتا ہے جس پر عام انسان کی نگاہ کبھی پڑی نہیں ہوتی۔ ہر لکھنے والا اپنے اپنے انداز کا غواص ہوتا ہے جو بہت گہرا اتر کر بہت سی مستور چیزیں ڈھونڈ کے لاتا ہے اور انہیں اپنے اظہار کے تجزیے پر نمائشی انداز میں پیش کرتا ہے...... بڑا کمال ہے۔"

میں نے کہا "جناب کمال تو ضرور ہے لیکن ادیب عام طور پر انسان کے اندر کی غلاظتیں، کمینگیاں اور بدپرہیزیاں اور بے طواریاں تلاش کر کے لاتا ہے لیکن یہ پیشہ کچھ اچھا نہیں۔ جس طرح کھیلا کرنے والے خود بھی گندے اور بدبودار ہو جاتے ہیں اسی طرح ادیب کے بدپرہیز اور بداطوار ہونے کا خدشہ بھی ساتھ ہی لاحق ہو جاتا ہے۔ چور کے رازوں کو ایک چور ہی ڈھونڈ سکتا ہے اور بدمعاش اور سفلہ کرداروں تک ایک دوغلا اور کمینہ شخص ہی پہنچ سکتا ہے ورنہ اس کو کیسے پتہ چلے گا کہ جس شخص......"

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا "شاید آپ کے بیان میں تھوڑی سی شدت آ گئی ہے۔ میں ماہرِ نفسیات تو نہیں البتہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ضروری نہیں کسی پیشہ ور کا پیشہ اس کی شخصیت اور کردار پر بھی اثر انداز ہو۔ ایک قصاب اور جلاد رحمدل بھی ہو سکتا ہے اور ایک موسیقار اور رقاص ظالم و سفاک بھی ہو سکتا ہے۔"

میں نے ان کی بات سن تو لی، مان بھی لی اور اس کا کوئی جواب بھی نہ دیا لیکن اندر سے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ شہاب صاحب مجھ سے کچھ عقلی سی باتیں کر رہے ہیں، ان کے من میں کچھ اور ہے۔

تھوڑی دیر بعد برتن اٹھانے والی لڑکی آ گئی اور اس نے جھک کر جب میز صاف کی تو مزا آ گیا۔ وہ کچھ ایسی بیدِ پھینک لڑکی تھی کہ اس کے دل پھینک ہونے میں کوئی شبہ ہی نہ رہا تھا!

رات کے وقت ہم کھانا کھا کر، کافی پی کر، کمرے میں بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

شہاب صاحب نے خلافِ معمول کڑک کر پوچھا "کون ہے؟" تو باہر سے آواز آئی "نکولا پندے۔ فارن منسٹر۔"

شہاب صاحب اپنے صوفے سے چھلانگ مار کر اٹھے اور جھپاک سے دروازہ کھول دیا۔ فارن منسٹر نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ان سے ملیے۔ میرے شریک کار مار چیلو روموناوزیر داخلہ۔ یہ بھی آپ سے کل کے واقعے کی معافی مانگنے آئے ہیں کیونکہ وہ کارندہ جس نے آپ سے پاسپورٹ لیے تھے، ان کی منسٹری کا ملازم ہے اور آج کل عوضی پر ہماری منسٹری میں کام کر رہا ہے۔"

شہاب صاحب نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ آپ کیوں تکلف کرتے ہیں۔ معمولی سی بات تھی، آئی گئی ہو گئی۔ غیر ملکی سفر میں تو یہ معمولی سی بات ہے۔ کبھی پاسپورٹ رکھ لیے جاتے ہیں، کبھی بذریعہ ڈاک واپس بھیج دیے جاتے ہیں۔" پھر انہوں نے میری طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا "ان سے ملیے، میرے دوست اشفاق احمد، ہمارے ملک کے نامور کہانی نویس۔"

وزیر داخلہ نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگے ''مسٹر کہانی نویس، میں بہت ہی شرمندہ ہوں، میں کیا ہماری ساری گورنمنٹ، ساری کیبنٹ اس بات پر خجالت میں ڈوبی ہوئی ہے کہ ہم نے آپ کا پاسپورٹ آدھے دن تک اپنی نگہداری میں رکھے اور آپ کو پریشانی میں مبتلا رکھا۔''

میں نے کہا ''کوئی پریشانی نہیں حضرات۔ معمولی سی بات تھی، آپ نے خوانخواہ اسے اتنی اہمیت دے کر ایک اہم معاملہ بنالیا...... چھوڑ دیں...... دفع کریں، بھول جائیں!''

وزیر خارجہ نے کہا ''معمولی بات نہیں سر۔ اس سے ہمارے غیر ملکی تعلقات پر برے اثرات پڑ سکتے ہیں اور عالمی برادری میں ہمارے ملک کو ایک غیر مہذب ملک سمجھا جا سکتا ہے۔''

جب ہم دونوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو کہنے لگے ''سان مرینو، دنیا کے دوسرے مہذب ممالک امریکہ، فرانس، برطانیہ کی طرح عالمی برادری کا ایک اہم رکن ہے اور اس کا بھی ویسا ہی ایک ووٹ ہے جیسا امریکہ، برطانیہ اور فرانس کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے ملکوں میں ہمارے سفارتخانے نہیں ہیں۔''

وزیر داخلہ نے کہا ''ہماری اسمبلی نے کئی مرتبہ فیصلہ کیا کہ کم از کم امریکہ میں ایک سفارت خانہ ضرور کھول دیا جائے لیکن امریکہ میں مکانوں کے کرائے اس قدر زیادہ ہیں کہ ہم کوئی مناسب سی بلڈنگ کرائے پر نہیں لے سکتے۔''

شہاب صاحب نے کہا ''آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے...... میرا مطلب ہے آپ کے ملک کی اکانومی کس چیز پر مشتمل ہے۔''

وزیر داخلہ نے کہا ''ہماری آمدنی کا بڑا ذریعہ کھیتی باڑی ہے۔ اس میں تمباکو کی جنس سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس کے بعد ڈاک کے ٹکٹ ہیں......''

''ڈاک کے ٹکٹ!'' میں نے حیرانی سے پوچھا تو وزیر خارجہ نے فخر سے سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہمارے ملک کے ڈاک کے ٹکٹ دنیا بھر میں سب سے خوبصورت ہوتے ہیں۔ ہمارے فلیٹک آرٹسٹ دن رات نت نئے ڈیزائن بناتے رہتے ہیں اور ہمارا اسکیورٹی پریس بڑے سلیقے سے چھاپتا رہتا ہے۔ باہر سے آنے والے سیاح ہمارے پوسٹل سٹمپس کا ایک سیٹ ضرور خرید کر ساتھ لے جاتے ہیں اور انہیں اپنے البموں میں سجا کے رکھتے ہیں۔''

''یہ تو ٹکٹ جمع کرنے والوں کا کام ہوا۔'' میں نے کہا ''لیکن وہ......'' مگر دونوں منسٹروں نے ایک ساتھ ''نو! نو!'' کہتے ہوئے میری بات کاٹ کر کہا ''صرف ٹکٹ جمع کرنے والے ہی نہیں لے جاتے جو بھی آتا ہے، کم از کم ایک سیٹ ضرور لے کر جاتا ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے والے افراد اور ٹکٹ فروخت کرنے والے ادارے ہمارے ایکسپورٹ بیورو سے منگواتے ہیں اور سارا سال ہماری سپلائی جاری رہتی ہے دن رات!''

شہاب صاحب نے کہا ''تو گویا آپ کے یہ ٹکٹ تزئین و آرائش کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کا پوسٹل سروس سے کوئی تعلق نہیں۔''

وہ دونوں پھر ایک ساتھ بول اٹھے اور کہنے لگے ''ہمارا ڈاکخانہ دنیا کا معروف ترین ڈاکخانہ ہے جہاں سے موسم میں ہر طرح کی ڈاک کا اخراج ہوتا رہتا ہے۔ ہر ٹورسٹ بلا استثنٰی ایک ایک نشست میں سو سو خط اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو لکھتا ہے اور ان پر اپنی مرضی کے رنگا رنگ ٹکٹ چسپاں کر کے بھیجتا ہے...... ہمارا پوسٹل سسٹم دنیا کے ڈاک سسٹم میں اول نمبر پر ہے اور اپنی کارکردگی پر ہر سال جنیوا کنونشن سے شیلڈ لے کر آتا ہے۔''

میں نے کہا ''اگر ہم پاکستان خط لکھنا چاہیں تو جائے گا؟''

وزیر داخلہ نے کہا ''جائے گا اور اطالیہ کے ہر ڈاکخانے سے پہلے جائے گا۔ آپ مجھے ابھی خط دے دیں، میں کل صبح اپنی جوائس کے ٹکٹ لگا کر روانہ کر دوں گا اور سان مرینو کا بھجوایا ہوا خط دوسری کسی بھی ملک کی ڈاک کے مقابلے میں جلدی پہنچے گا۔''

ہم دونوں نے داد بھری نظروں سے حیرت کا اظہار کیا تو وزیر داخلہ نے کہا ''لکھیں، لکھیں، چاہے دو حرف ہی لکھیں۔ آپ کے گھر والوں والی کی تسلی ہو جائے گی۔ ٹکٹ ہم اپنے پلے سے لگائیں گے۔ آپ کے لیے ایک تحفہ! آپ کو کوئی خرچہ نہیں کرنا پڑے گا...... جلدی کریں...... ابھی لکھیں۔''

شہاب صاحب نے اس کی توجہ بٹانے کے لیے کہا ''اس کے علاوہ آپ کی کوئی اور ایکسپورٹ نہیں؟''

''کیوں نہیں! کیوں نہیں۔'' وزیر خارجہ نے کہا ''ہم ہر سال ایک ملین ڈالر کی تاش باہر کے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں...... دنیا کے بڑے بڑے قمار خانے اور ذاتی نوعیت کے جوئے خانے صرف ہمارے یہاں کی چھپی ہوئی تاش استعمال کرتے ہیں۔ وہ بھی ہمارے سکیورٹی پرنٹنگ پریس میں چھپتی ہے۔ اس کو اس ممکنہ حد تک فول پروف بنایا جاتا ہے کہ شاطر اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔''

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو میں نے کہا ''آئیے آئیے آجائیے!'' ہم سب کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ اتنے میں خوبصورت کلف لگی وردی میں ملبوس ایک فوجی شخص اندر داخل ہوا۔ وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ نے ایک ساتھ خوشی کا نعرہ لگایا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر کہا ''یہ دونوں اصحاب پاکستان سے آئے ہیں اور دونوں وہاں کے رائٹر ہیں۔'' پھر انہوں نے فوجی کی طرف اشارہ کر کے کہا ''جنرل ماسیمو سکالی چرو! کمانڈر انچیف آف سان مرینو فورسز۔''

ہم دونوں نے باری باری کمانڈر انچیف صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کے بیٹھنے کو آخری کرسی پیش کی...... کی ان کی نے ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ وہ نیچے لابی میں کافی پینے آیا تھا کہ صفائی کرنے والی لڑکی نے بتایا کہ اوپر دو پاکستانی آئے ہیں جن سے وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ ایک ساتھ ملنے آئے ہیں اور اس وقت دونوں اوپر بیٹھے ہیں۔

میں نے کہا ''آپ نے بہت اچھا کیا جو اوپر تشریف لے آئے۔ اس وقت ہم آپ ہی کے ملک کی باتیں کر رہے تھے۔ بڑا ہی خوبصورت اور بے حد تاریخی ملک ہے۔''

جنرل صاحب نے کہا ''ہماری فوج ہے تو مختصر سی لیکن اس ملک کے حساب سے بہت کافی ہے۔ چند مہینوں سے ہم اس میں بڑھوتری کے آرزومند تھے لیکن بجٹ میں گنجائش نہیں تھی مگر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ہمارے سنگ مرمر کی ڈیمانڈ

مشرق وسطیٰ میں اچانک بڑھ گئی اور ہم کو کثیر زرِ مبادلہ کی نوید مل گئی۔ ہم نے پرسوں ہی اپنی فوج میں دس جوانوں کا اضافہ کیا ہے جو بڑے اچھے نشانہ باز اور قابل شمشیر زن ہیں۔ ان کی تربیت کے لیے زیادہ زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔''

شہاب صاحب نے ایک ذہین بیوروکریٹ کی طرح پوچھا۔''جنرل صاحب آپ کی فوج کتنے نفوس پر مشتمل ہے؟'' تو انہوں نے فخریہ انداز میں سر اوپر اٹھا کر کہا''بارہ سو افراد پر...... لیکن اب وہ بڑھ کر بارہ سو دس ہو گئی ہے۔ سب کے سب سورما سپاہی اور اعلیٰ پائے کے آفیسر ہیں۔ یہ ایک مرتبہ ایڈوانس کر کے پسپا ہونا نہیں جانتے۔ جہاں ڈٹ جائیں ہیں، کٹ جاتے ہیں لیکن واپس نہیں پلٹتے۔''

شہاب صاحب نے کہا''آپ بہت خوش قسمت جرنیل ہیں جن کو ایسی اچھی فوج ملی ہے ورنہ دوسری جنگ عظیم کے بعد تو سب کرائے کے سپاہی بن گئے ہیں۔''

انہوں نے کہا''ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ہم دوسری جنگ عظیم میں نیوٹرل تھے، نہ اتحادیوں کے ساتھ نہ دشمنوں کے ساتھ۔ اس فیصلے سے ہم پر کافی مصیبت آئی لیکن ہم نے میدان نہیں چھوڑا اور ہماری ساری فوج نے ہر معرکے میں دل کھول کر دادِ شجاعت دی۔''

دادِ شجاعت کے بارے میں مجھے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ ایک فوجی مشاعرہ ہو رہا ہے اور سارے جوان سادہ داد دینے کے بجائے بڑھ چڑھ کر دادِ شجاعت دے رہے ہیں اور شاعروں کا دل گرما رہے ہیں...... اطالوی زبان میں بھی کچھ کچھ اسی طرح کی دادِ شجاعت کا محاورہ عام ہے جس کا مطلب شجاعت سے کچھ کم درجے کی بہادری اور بازاری بے خوفی ہوتی ہے۔

جنرل نے کہا''میں تو خیر بعد میں بھرتی ہوا لیکن میرے پیش رو آفیسر اور جوان بتاتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی بمبار طیاروں نے ہم پر شدید بمباری کی۔ ہماری فوج اس بمباری سے گھبرائی نہیں اور ڈٹ کر اس آفت کا مقابلہ کرتی رہی۔ ہمارے بہت سے جوان مارے گئے لیکن برطانیہ کا ایک حملہ آور جہاز ایک اٹیک میں کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے کریش کر گیا۔ اس کے دونوں آفیسر، پائلٹ اور گنر پیراشوٹ کے ذریعے نیچے اتر آئے۔ ابھی ہم ان کو گرفتار کرنے جا ہی رہے تھے کہ ان کے اپنے جہازوں نے اندھا دھند سٹریفنگ سے ہماری جوانوں کے ساتھ ان کو بھی جہنم واصل کر دیا لیکن ہم نے ان کی بڑی عزت افزائی کی۔ ان کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ سارے شہر میں ان کے جنازے کو گھمایا۔ جگہ جگہ جنازہ روکنے کے اعلان کیے۔ لوگوں نے کھڑکیوں اور دریچوں سے ان پر پھولوں کی بارش کی...... کیا آپ نے ان کے مزار دیکھے ہیں؟''

میں نے کہا''نہیں، ابھی تک تو ان کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ کل ضرور جا کر دیکھیں گے۔''

کمانڈر انچیف صاحب نے کہا''ان کے ساتھ ایک بڑا خوبصورت باغیچہ ہے۔ لڑکے لڑکیاں شام کو وہاں محبتیں کرنے آ جاتے ہیں اور صبح تک محبتوں میں مصروف رہتے ہیں...... ان دونوں قبروں کی نگہداشت اور اس باغیچے کی غور پرداخت کے لیے برطانیہ سے ایک سو پاؤنڈ ماہانہ وصول کرتے ہیں جو روم میں برطانوی ایمبیسی ہمیں پہلی کی پہلی بھجوا دیتی

ہے۔ بڑا یادگار مانومنٹ ہے، ضرور دیکھیے گا۔''

میں نے کہا''سر ہمارا پہلے ہی سے پروگرام ہے اور اس کے لیے ہم نے کل شام کا وقت مقرر کیا ہے۔''

پھر وہ تینوں ایک دم اچانک اٹھے اور ہم سے معذرت مانگ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ شہاب صاحب نے کہا''آپ بیٹھیں، میں ابھی اپنے کمرے سے ہو کر آتا ہوں۔''

شہاب صاحب جب بھی اپنے کمرے سے ہو کر آتے اُن کی آنکھیں سرخ اور چہرہ تمتمایا ہوا سا ہوتا۔ تھوڑی دیر تک وہ بات کرنے کے قابل نہ ہوتے۔ پھر جب گفتگو شروع کرتے تو ان کے منہ سے ہلکے ہلکے بھپارے سے اُٹھتے۔ میں نے اس قسم کی شراب کی خوشبو اس سے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ ایک ڈچ لڑکی جو باؤ سانی سے فارسی پڑھتی تھی، اس کے منہ سے البتہ ایسی سگندھ آیا کرتی تھی لیکن کبھی کبھی! شہاب صاحب بھی چونکہ ہالینڈ سے تشریف لائے تھے، اس لیے اس قسم کی شراب کے عادی دکھائی دیتے تھے۔ ان کا کوٹہ ان کے اٹیچی کیس میں بند تھا اور وہ مقررہ وقت پر جا کر اس میں سے ایک چسکی لگا آتے تھے۔

پتہ نہیں ان کو اسے چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی پڑھے لکھے تھے، میں بھی تعلیم یافتہ تھا۔ پھر ہم دونوں ادب کے طالب علم تھے۔ لکھنے لکھانے والے اس فعل کو چھپاتے نہیں بلکہ اجاگر کرتے ہیں۔ اس میں مبتلا نہ بھی ہوں تو بھی اس کا ذکر بڑے شوق و ستائش سے کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے اور اس کی ہر خطا قابل تقلید اور قابل معافی ہوتی ہے۔ پھر شہاب صاحب اپنا یہ فعل مجھ سے چھپا کیوں رہے ہیں اور اس پر شرمندہ ہو کر کنارہ کشی کا رویہ کیوں اختیار کر رہے ہیں؟ میں تو کچھ نہیں کہتا، مجھے تو اس قسم کے فعل اور ایسی زندگی دل و جان سے پسند ہے۔ پھر وہ کیوں گھبراتے ہیں اور خود کو چور کس لیے محسوس کرتے ہیں۔

اصل میں شہاب صاحب ایک متوسط گھرانے کے فرزند تھے۔ اس لیے ان پر آئی سی ایس کی قلعی ٹھیک سے نہ چڑھی تھی۔ جب تک وجود پر نخوت کے سہاگہ کا دھوڑا نہ دیا جائے تکبر کی قلعی پکڑ نہیں کرتی۔ پہلے چناخ پڑتے ہیں پھر ساری چمک دمک ختم ہو جاتی ہے۔ ایک اچھے بیوروکریٹ کے لیے اوّل تو ایک متکبر گھرانے کا فرد ہونا ضروری ہے، اگر نہ ہو تو خود اپنے اندر ایسے خناس کو جنم دینے کی احتیاط رہے جو ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی اس کو نہ چھوڑے۔ پہلے اوروں کو ڈراتا رہے پھر صاحب کے خاتمے کا باعث بن کر جنازہ گاہ تک اس کے ساتھ جائے۔

آپ کو زندگی میں بڑے اچھے اچھے اور پیارے پیارے بیوروکریٹ ملیں گے۔ ان کے چہرے شگفتہ اور آنکھیں روشن ہوں گی۔ بڑے خوش مزاج اور بذلہ سنج ہوں گے لیکن ان کے اندر بھی نخوت اور خناس کی چٹکی نخاس کی ڈبیہ میں بند کسی نہ کسی جیب میں موجود ہو گی۔ اچھی حالت اور خوشگوار موڈ میں بھی ڈبیہ نکال کر، چٹکی مار کر اندر سے خناس کی نسوار کی ایک چٹکی اٹھائیں گے اور دونوں نتھنوں میں باری باری لے کر اتنے زور کی چھینک ماریں گے کہ سارے ماحول کو خوفزدہ کر دیں گے۔ محفل میں کچھ لوگ سبحان اللہ، یرحمک اللہ کہیں گے، کچھ شرمندگی کی ہنسی ہنس کر کہیں گے''میں تو ڈر ہی گیا تھا'' باقی کے حاشیہ بردار سمجھائیں گے کہ اسی دبدبے نے تو ان میں بے خوفی پیدا کی ہے۔ ایسا سچا۔ آنسٹ، شفاف اور

بے خوف آفیسر آج تک اس محکمے میں آیا ہی نہیں...... مبارک ہو!

شہاب صاحب بڑے دبو، شرمیلے، محجوب اور دھیمے انسان تھے۔ ان کے اندر ڈرانے کی صلاحیت نہیں تھی رنج رسانی اور اذیت ارزانی کی صلاحیت سے بھی محروم تھے۔ چند روز میں میں نے بھانپ لیا کہ یہ تو مجھ سے بھی زیادہ کمزور اور ڈرپوک آدمی ہیں۔ ان کو آئی سی ایس ہونا زیب نہیں دیتا۔ وہ جو میں نے اپنے سکول میں ایک آئی سی ایس کی آمد کا دبدبہ دیکھا تھا اور جس شیر کا نقشہ اپنے تصور میں باندھا تھا، ان میں سے ایک بات بھی شہاب صاحب میں موجود نہیں تھی۔ میں ان سے کچھ مایوس سا ہو رہا تھا!

ادب پر بات کرتے ہوئے جب میں نے ان کی شاعری کی تعریف کی اور انگریزی شاعروں کے ترجموں سے لطف اندوز ہونے کا اظہار کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہ طالب علمی کا زمانہ تھا اور ایسی باتیں ہر طالب علم سے سرزد ہو جاتی ہیں، ان میں کوئی کمال کی بات نہ تھی۔

جب معاملہ ان کے معرکتہ الآرا ناولٹ پر آتا تو سر جھٹک کر کہتے، بڑی بھول ہوگئی۔ مجھے ایسا ناول لکھنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ مثبت کی بجائے منفی رنگ اختیار کر گیا، کاش میں اعلان کر سکتا کہ میرا اس ناول سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر پہاڑ کی ڈھلان پر کسی اونچی سی سنگلاخ چٹان کے ایک چھوٹے سے قہوے خانے میں اردو ادب کی عظمت اور جلالت کا ذکر ہوتا تو وہ ہوں ہاں کر کے بات آئی گئی سی کر دیتے، وہ گرمجوشی جوان سے پہلی ملاقات میں محسوس ہوئی تھی اور جس کا اظہار انہوں نے ایک سحر طراز مقرر کی طرح نظام ہوٹل میں کیا تھا، اب وہ مفقود تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی اور شہاب صاحب سے مل رہا ہوں جن کی صرف شکل پرانے شہاب صاحب سے ملتی ہے۔

کبھی کبھی گفتگو کے دوران وہ اپنی ہوں ہاں کے درمیان کچھ ایسے فقرے بھی چھوڑ جاتے جن کا بظاہر ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہ ہوتا لیکن رات کو سوتے وقت ان کی گونج دوسرے سارے مباحث پر چھا جاتی۔ ایک اور ہی دنیا جنم لے کر سامنے آ موجود ہوتی۔

میں بڑے سائز کے "ادبی دنیا" اس کے میراجی، اس کے نامور افسانہ نگار عاشق حسین بٹالوی کا ذکر مزے لے لے کر کر رہا تھا شہاب صاحب نے منمناتے ہوئے کہا "اشفاق صاحب! کسی شخص کو بھی اس کی شخصیت اور فردیت بنی بنائی نہیں ملتی۔ یہ اس کو محنت کر کے اور مشقت اٹھا کر بنانی پڑتی ہے۔ یہ رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ رحمت تو اس لیے کہ انسان کو مکمل آزادی عطا کرتی ہے کہ جو بھی راستہ چاہو چن لو، تمہیں اختیار ہے اور زحمت اس لیے کہ ہر دم اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ موت اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کسی وقت بھی مار گرائے گی اور انسان کچھ کیے بغیر انسان بنے بغیر اس دنیا سے چلا جائے گا۔"

میرے دل میں ان کی یہ بات سن کر ایک خوفناک سوال پیدا ہوا لیکن میرا سوال سننے سے پہلے انہوں نے کہا "آپ کو یہ تو پتہ ہے کہ آپ ہیں۔ آپ کا وجود موجود ہے لیکن آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں تو پھر آپ کس طرح سے اپنی رہنمائی کر سکتے ہیں؟ کیسے خود کو ڈرائیو کر سکتے ہیں کیونکر اپنا گیئر بدل سکتے ہیں...... دنیا میں سب سے بڑا عذاب بہروپ ہے یعنی آپ وہ بننے کی کوشش کریں جو آپ نہیں ہیں۔ گو ساری دنیا اس عذاب میں مبتلا ہے لیکن اس سے عذاب کی سختی میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ ہماری اکثریت، ننانوے فیصد لوگ بہروپ کے عذاب میں زندگی بسر کر کے چلے جاتے ہیں اور آگے چل کر بھی اس عذاب کا تسلسل قائم رہتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر......؟"

کہنے لگے "بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے آپ کو جانیں، خود کو پہچانیں، اپنی اصل کہنہ ڈھونڈیں اور اس کے مطابق زندہ رہیں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ ایسی زندگی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں۔ جان کار لوگ اسی کو دنیا میں جنت کہتے ہیں اور اسی کو سورگ کے جھونٹے بولتے ہیں۔"

میں نے کہا "شہاب صاحب، معاف کیجئے گا، ہم ادبی دنیا کی اور ادب کی بات کر رہے تھے اور ان بڑے لوگوں کا تذکرہ کر رہے تھے جنہوں نے علم کے دریا بہائے ہیں۔ جن سے ہم نے لکھنا سیکھا ہے اور جن کے افکار کی خوشہ چینی کر کے ہم یہاں تک پہنچے ہیں......"

"بے شک! بے شک!!" انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا "وہ واقعی کمال کے لوگ ہیں اور بڑی نامور ہستیاں ہیں لیکن اصلی علم کی نشانی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عاجز، دھیما، نربل اور فروتن ہوتا ہے۔ جو علم عاجز، دھیما اور نربل نہ ہو، وہ علم نہیں بے علمی ہے۔ دھوکا اور وسوسہ ہے۔ فریب خیال ہے۔ علم کا زوردار اظہار اور اس کا نمائشی انداز اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ علم اپنا نہیں کہیں سے اٹھایا ہوا اور چرایا ہوا ہے...... آپ نے کبھی سائنس دانوں کی تحریریں دیکھی ہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے کہا "سائنس دان اور صوفی چونکہ اپنے اوپر گزرے ہوئے واقعات اور اپنے پرکھے ہوئے مشاہدات کا اظہار کرتے ہیں، اس لیے ان کا علم بڑا سچا، سُچا اور دھیما ہوتا ہے۔"

میں چونکہ ان دونوں فرقوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا، اس لیے مجھے ان کی بات نے متاثر نہ کیا اور میں نے ان کے اس خیال کی تائید نہ کی۔

وزیر خارجہ سینور نکولا کی طبیعت پر ہمارے پاسپورٹ رک کے جانے کا ایسا بوجھ تھا کہ وہ دن میں کم از کم دو مرتبہ فون کر کے ہماری خیریت معلوم کرتا، آج شام اس نے کھانے پر بلایا تھا اور اصرار کیا تھا کہ میں گاڑی لے کر آؤں گا اور خود ساتھ لے کر جاؤں گا۔

ٹھیک سات بجے وزیر خارجہ اپنی "نیل ودیرے" گاڑی لے کر آ گئے۔ ان کی یہ گاڑی میری گاڑی سے آٹھ انچ لمبی اور چار انچ چوڑی تھی اور اس کے وائپر بٹن دبانے سے خود بخود چلنا شروع کر دیتے تھے۔ میری گاڑی میں سٹیئرنگ سے ایک طرف گراموفون جیسی چابی لگی تھی، جس کو گھمانے سے وائپر چلتے تھے۔ جب ونڈ سکرین بارش کی وجہ سے بالکل اندھی ہو جاتی تو گاڑی چلانے والا بار بار چابی گھما گھما کر وائپر چلا لیتا تھا اور پانی کی چادر اتار لیتا تھا۔ اگر بارش زیادہ تیز ہو جاتی تھی تو گاڑی سڑک کنارے روک لی جاتی تھی اور بارش کے رکنے کا یا اس کے مدھم ہونے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ تیز بارشوں میں روم کی سڑکوں کے کنارے میری جیسی گاڑیوں کی قطار لگ جاتی تھیں۔

وزیر خارجہ جب ہم کو اپنے ساتھ بٹھا کر ہوٹل سے باہر نکلے تو انہوں نے غلطی سے وائپر کا بٹن دبا دیا۔ وائپر نے دو تین دفعہ خشک شیشے پر ناصیہ فرسائی تو انہوں نے جان بوجھ کر معذرت کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا، بے خیالی میں بٹن دب گیا۔" وزیر خارجہ سینور نگولا پنڈے دنیا کے کسی بھی وزیر خارجہ کی طرح فراخ قدم، اکڑی گردن، مکلّف لباس اور ڈوری والی عینک کا حامل تھا۔ یہ ایک شیشہ مونوکل نہ تھی، دو شیشوں والی پوری عینک تھی مگر اس کی کمانیاں نہیں تھیں۔ یہ ڈوری سے بندھی گلے میں لٹکتی تھی اور لگاتے وقت دو شیشوں کی درمیانی چٹکی ناک پکڑ لیتی تھی۔ میں نے تجربے کے طور پر عینک لگا کر دیکھی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وزیر خارجہ نے کہا "شروع شروع میں ایک دو ہفتے ہلکا سا گریہ ہوتا ہے اس کے بعد پریکٹس ہو جاتی ہے۔"

جس ریستوران میں ہم کھانا کھانے لگے، وہ کوئی ہوٹل نہیں تھا، ایک لمبی چوڑی خوبصورت سی حویلی تھی جس کے برآمدوں میں نیزوں پر روغنی شمعیں روشن تھیں اور ملحقہ ہالوں میں انواع و اقسام کی اشیائے خورد و نوش جمع تھیں۔ ایک جگہ امریکی طرز کا باربی کیو تھا۔ دوسرے ہال میں اطالوی موسیقی کے ساتھ پیتزا اور پاستا کھانے والے تھے۔ ساتھ بڑے بڑے سان مرینو کی مقامی وائن "تورتا" کا چھت تک اونچا پہاڑ تھا۔ ایک زاویے میں سمندری خوراک کے کئی سٹال تھے۔ ایک قطار میں ایسے کھاجا سٹینڈ تھے جہاں سبزی خوروں کی طلب کا سامان بہم تھا۔

ایک دوسرے کو کراس کرتے برآمدوں کے پیچھے عجائب گھروں جیسے بڑے بڑے ہال تھے جہاں امراء کے کھانوں کا ٹھاٹھ بندھا تھا اور جہاں بجنے والی موسیقی خاص انہی ہالوں کے لیے ترتیب دی جاتی تھی۔

وزیر خارجہ نے کہا "آج آپ کو یخنی میں لپٹی اور بھوبل میں دم پخت ایسی مچھلی کھلاتے ہیں جس کے گوشت میں بادام کے شگوفوں کی سی خوشبو ہے......" شہاب صاحب مچھلی کا نام سن کر اور وہ بھی بھوبل میں پکی ہوئی کی خبر پا کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے پنجابی میں کہا "وزیر خارجہ کی تنخواہ ہمارے یہاں کے محمد دین ہیڈ کلرک سے زیادہ نہیں ہوگی، اس لیے اس پر مناسب بوجھ ہی ڈالنا۔ میرے خیال میں ایک مچھلی کافی رہے گی۔ باقی ہم روٹی توس اور خمیری وغیرہ ٹھونس کر پیٹ بھر لیں گے۔"

جب لڑکی آرڈر لینے آئی تو میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔ سفید چادر میں ملبوس دودھیا بدن کی لمبی سی لڑکی، ایک کندھا ننگا، دوسرے پر سے گزرتی ہوئی یک تہی چادر، کانوں میں آویزے، بالوں میں پھول، لمبی بانہوں میں بلور کے فقیرانہ کڑے۔ ہاتھ میں گول طلائی سینی میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ہیلن آف ٹرائے تھی جو ہماری خوشنودی کے لیے یہاں تک آ پہنچی تھی۔

وزیر خارجہ نے اسے تین مچھلیوں کا آرڈر دیا۔ تو میں نے کہا "ہم کچھ زیادہ ماہی شور نہیں ہیں۔ نہ ہی ہم کو اس کی عادت ہے۔ تین مچھلیاں زیادہ ہیں، ایک ہی منگوا لیجئے۔ یہاں اور بھی تو اچار چٹنیاں، مربے اور سلاد رکھا ہے وہ کس کام آئے گا بھلا۔"

وزیر خارجہ نے کہا "یہ مچھلی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہوتی، ایک ایک کھا کر بھی ہم بھوکے ہی رہیں گے۔ میرے

خیال میں تین کم ہیں بعد میں ہمیں اور منگوانا پڑے گی۔"

شہاب صاحب نے کہا "اس سے کہو کہ ایک ہی کافی ہے۔"

میں نے کہا "عرض کر دیا ہے سر! لیکن یہ نہیں مانتا، اس کے خیال میں آخر میں ایک اور منگوانی پڑے گی۔"

ہماری باتوں کی سن گن پا کر اس نے کہا "وہ لائے گی تو ایک ہی اور اپنی طلائی تھالی میں ڈالنے کے بعد واپس چلی جائے گی۔ پندرہ بیس منٹ بعد دوسری لے کر آئے گی اور پھر اتنی ہی دیر بعد تیسری۔ اس مچھلی کا ذائقہ بھی غضب کا ہے لیکن لوگ یہاں پر مچھلی کے پنجرے سے گوشت چھڑانے کا نظارہ کرنے آتے ہیں۔ یہ کام ان روا پوش لڑکیوں کو ہی آتا ہے اور کوئی نہیں کر سکتا...... وہ جب آئے گی تو آپ خود دیکھ لیں گے!"

شہاب نے گردن گھما کر دور دور تک پھیلے برآمدوں کا جائزہ لیا اور پھر کہنے لگے۔ بہت ہی عجیب سا آرکیٹیکچر ہے۔ ہوٹلوں کی شکل و صورت سے ماورا لیکن ان بھوجن گھروں نے اس میں کیا حسن پیدا کر دیا ہے۔ میں نے ایسی شاہی طعام گاہ اور کہیں نہیں دیکھی۔

وزیر خارجہ نے کہا "اپنے ساتھی کو بتایئے کہ اصل میں یہ طعام گاہ نہیں ہے بلکہ ہمارے ملک کی جیل کی بلڈنگ ہے۔ ملکی کانگریس نے زر کثیر خرچ کر کے اور معروف اطالوی آرکیٹکٹ سے نقشہ بنوا کر تعمیر کی تھی لیکن افسوس کامیاب نہ ہو سکی۔"

ہم دونوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا!

کہنے لگا "پورے تیئس سال تک یہ جیل خالی اور ویران پڑی رہی۔ سارے ملک میں کوئی کرائم ہی نہ ہوا کہ مجرم کو پکڑ کر اس میں قید کرتے، اس لیے نہ تو اسے استعمال میں لایا جا سکا اور نہ ہی اس کی کوئی افادیت رہی۔ چنانچہ آٹھ برس پیشتر قومی اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ اس بلڈنگ کو فروخت کر دیا جائے۔ پھر ہمارے ملک کے علاوہ پڑوسی ملک اٹلی سے بھی کچھ خریدار آئے لیکن کسی کے ساتھ سودا نہ طے ہو سکا۔ آخر کار اس جیل کے جیلر کی عرض داشت پر کہ میں نے تیئس برس تک اس جیل کی نگہداشت کی ہے اور ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کیے ہیں اس لیے جیل کی یہ بلڈنگ مجھے قسطوں پر فروخت کر دی جائے۔ کیبنٹ نے متفقہ طور پر اس عرضداشت کو منظور کر لیا اور جیل کی بلڈنگ جیلر کے حوالے کر دی۔"

ہم بڑے شوق سے اس کی کہانی سن رہے تھے اور میں حسب ارشاد بڑی تیزی کے ساتھ اس مکالمے کا ترجمہ کیے جاتا تھا۔ شہاب صاحب نے چھوٹے بچوں کی طرح کہا "پھر کیا ہوا؟"

تو وزیر خارجہ نے کہا "پہلے تو اس نے جیل کے گیٹ پر پھولوں کی فروخت کا اہتمام کیا اور خود گل فروش بن کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ساتھ والی ڈیوڑھی میں پیتزا کا تنور لگا لیا اور گتے کے ڈبوں میں پیتزا سپلائی کرنے لگا۔ بس اس ایک شاپ نے اس کی قسمت بدل دی۔ اور اس نے دو بڑی بیرکیں کھول کر وہاں پیتزا اور پاستا کا کام شروع کر دیا۔ کچھ میزیں اور کرسیاں بھی لگا لیں۔ لوگ شام کے وقت گھروں سے آنے لگے اور جیل خانے کا ابتدائی ونگ ایک اعلیٰ درجے کی طعام گاہ بن گیا۔"

''اس جیل خانے کا جو سٹاف بے کار اور بیروزگار پھر رہا تھا۔ وہ ایک وفد بنکر جیلر کے پاس آیا کہ ہمارے لیے بھی روزگار کا کوئی بندوبست کرو اور ہماری وفاداریوں کا بھی کچھ پاس کرو تو اس نے بندی خانوں کے پندرہ سپاہیوں کو بیروں کی وردی پہنا کر بیرے رکھ لیے جو تین بید مارنے والے شلاق زن تھے، ان کو آٹا گوندھنے اور پیڑے بنانے پر مامور کر دیا۔ دو پھانسی گھر کے جلاد تھے، انہیں گوشت کاٹنے اور قیمہ بنانے کا ہنر سکھا کر ملازم رکھ لیا۔ اس وقت پرانی جیل کا سارا سٹاف اس کا ملازم ہے۔ پچھلے تیس سال تو انہوں نے تنکا دہرا کر کے نہیں دیا لیکن اب بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں اور اس سارے کارخانے کی دیکھ بھال ان کے ذمے ہے۔''

شہاب صاحب پچھوانے لگے ''اب اس گل فروش اور نیک دل جیلر کا کیا حال ہے؟''

وزیر خارجہ نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا ''اب ایک طرح سے وہ اس ملک کا بے تاج بادشاہ ہے اور بڑے بڑے سرکاری افسر اور سیاستدان اس کی مٹھی میں ہیں، رشوتیں دیتا ہے۔ ملازموں پر جرمانے کرتا ہے۔ بھاری بھاری پگڑی لے کر کسی برآمدے کا ایک کونہ دکان کے طور پر دیتا ہے۔ پورا انکم ٹیکس نہیں دیتا۔ لڑکیوں کے ساتھ بدزبانی کرتا ہے۔ جب وہ جیلر تھا تو بہت ہی نفیس انسان تھا۔''

''وہ اس وجہ سے'' شہاب نے کہا کہ ''جیل خالی تھی اور اب بازار بھرا ہوا ہے، بھری ہوئی چیز طاقت کا سرچشمہ ہوتی ہے اور طاقت کبھی بھی سیدھی راہ پر نہیں رہتی۔ اسے سیدھا رکھنے کے لیے بڑے مضبوط بند اور قوی ہیکل ڈیم بنانے پڑتے ہیں۔''

سینور نکولا پندے نے کہا ''آپ کے دوست بالکل ٹھیک کہتے ہیں، شاید سب جگہ ایسے ہی ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ ہمارے ملک کے سب سے بڑے رائٹر ہیں اور انہوں نے......''

لیکن میری بات بیچ ہی میں رہ گئی کہ ہیلن آف ٹرائے مچھلی لے کر آ گئی۔

اس نے اپنی گول طلائی طشتری ہمارے سامنے رکھی۔ موی تھیلے سے مچھلی نکالی۔ اس کے اوپر کی پنی اتاری اور مچھلی کو دُم سے پکڑ کر ہمیں اس کی دونوں سائیڈیں دکھائیں۔ دم دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ کر اور بائیں بازو کو فرش کے متوازی کر کے اس نے لٹکتی ہوئی مچھلی کو اس طرح سے جھٹکا دیا کہ سارا گوشت نیچے رکھی ہوئی رکابی میں جمع ہو گیا اور ردا پوش لڑکی کے ہاتھ میں مچھلی کا خالی پنجر رہ گیا۔ اس نے پنجر کو اس موی لفافے میں ڈالا اور ''بھوک مبارک'' کہہ کر واپس چلی گئی۔

وزیر خارجہ نے کہا ''آپ نے جھٹکا دیتے وقت اس لڑکی کا بدن دیکھا تھا؟''

ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا ''نہیں...... ہماری توجہ تو صرف مچھلی پر تھی جو ایک ہی جھٹکے کے اندر تھالی میں قیمہ بن کر جمع ہو گئی تھی...... بدن کو کیا ہوا؟''

اس نے کہا ''یہاں لوگ مچھلی کھانے تو کم آتے ہیں، چادر کے نیچے لڑکی کے کھلے بدن کی نرت دیکھنے آتے ہیں...... تم نے بالکل کچھ نہیں دیکھا؟''

ہم نے یک زبان ہو کر کہا ''نہیں۔''

سینور نکولا نے کہا ''اچھا جب دوسری مچھلی لائے تو غور سے دیکھنا۔''

جب دوسری مچھلی آئی تو ہم نے اپنی نگاہیں ہیلن آف ٹرائے پر مرکوز کر دیں۔ ہمارے اس شعوری ارتکاز کو بھانپ کر وہ مچھلی سے پنی اتارتے ہوئے ذرا سا مسکرائی اور پھر مچھلی کو دم سے پکڑ کر اس نے دادطلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔

ہاتھ کے ایک خفیف سے جھٹکے سے اس کا سارا بدن سر سے پاؤں تک کچھ انداز سے دھڑکا کہ ہمیں ردا کے اندر سے بدن کی آواز آئی۔ اس اک ذرا سی حرکت سے مجھے ایسے لگا جیسے کسی گھابن نے خوف کی بو پا کر اپنی نشست سے پہلی چوکڑی بھری ہو اور پھر اس کا رم نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔

ہمیں حیرت میں گم دیکھ کر ہمارے میزبان نے کہا ''یہ بہت ہی مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ جس طرح بیلے ڈانس کے لیے چھوٹی بچیوں کو شروع سے تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح مچھلی جھٹکنے کا فن بھی اوائل عمری سے سکھایا جاتا ہے۔''

سینور نکولا نے اپنے حصے کی مچھلی کا ایک بڑا سا چمچ اپنی قاب میں ڈالتے ہوئے کہا ''ایسا ہی ایک روح و بدن کا امتزاج میں نے ترکی کے رقاص درویشوں میں دیکھا تھا۔ انہیں بھی بچپن سے پاؤں کے انگوٹھے میں کیل پکڑ کر بدن کو پھرکی بنانا سکھاتے ہیں۔ وہ بھی بڑا مشکل فعل ہے...... آپ نے دیکھا ہے؟''

ہم دونوں نے نفی میں سر ہلایا تو اس کو بڑا افسوس ہوا کہ وہ رقص ہمارے دیکھنے کی چیز تھی۔

بڑی دیر تک ہم اس حویلی کے بغلی دالان میں بیٹھے گپ کرتے رہے۔ سینور نکولا نے ہم کو بٹوے میں سے نکال کر اپنی فیملی کی تصویریں دکھائیں جن میں اس کے بچے، پوتے، بیٹے، بہوئیں بھی شامل تھے۔ ہمارے دیکھ چکنے کے بعد اس نے اس تصویر کو ایسے غور سے دیکھنا شروع کیا جیسے وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں سے محبت اور سپردگی کے چشمے پھوٹ رہے تھے اور وہ اپنی فیملی پر نثار ہو ہو جاتا تھا۔

سان مارینو کے لوگ بڑے خوش طبع، خوش شکل اور خوش بیان لوگ ہیں۔ بہت اچھی، بے حد خوشگوار، دلچسپ اور وضع دار باتیں کرتے ہیں۔ کسی سے لڑتے جھگڑتے، اونچا بولتے یا راستہ کاٹ کر آگے نہیں بڑھتے۔ سر ہلا کر، مسکرا کر سلام کرتے ہیں اور سر ہلا کر ہاتھ پھیلا کر سلام کا جواب دیتے ہیں۔ مالی طور پر خوشحال اور فارغ البال ہیں۔ یوں تو کھیتی باڑی، سنگ تراشی، پارچات بافی اور شیشہ سازی بھی ان کی آمدن کا ذریعہ ہے لیکن سب سے زیادہ آمدن ان کو ڈاک کی ٹکٹوں سے ہوتی ہے۔ اب تو تقریباً ہر تیسرے سان مرینوائی کے پاس اپنی ذاتی گاڑی ہے لیکن اگر یہاں ڈاک ٹکٹوں کی ٹریڈ ختم ہو جائے تو پھر اس کی ساری اکانومی برباد ہو کر اس ننھے سے ملک کی خوشحالی میں اندھیرے گھول دے گی لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ دنیا کے سارے ملک اور سارے ملکوں کے لاکھوں سیاح اس ننھے سے ملک سے بڑی محبت کرتے ہیں۔

یہ مہمان نواز، سلیقہ شعار، باوفا اور دل والے لوگوں کا ملک ہے۔ جب ابراہم لنکن نے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کی حمایت میں اپنے ہم وطنوں کے خلاف جنگ کی تو سب سے پہلے سان مارینو کے صدر نے ابراہم لنکن کو مبارکباد کا خط

لکھا اور اس کو دل کھول کر شاباش دی۔ ساتھ ہی اس نے ابراہم لنکن کو سان مارینو کے اعزازی شہری ہونے کی دعوت دے کر اس کا اجازت نامہ بھی روانہ کر دیا۔ ابراہم لنکن نے اپنے مخصوص انداز میں شاعری جیسی نثر لکھ کر سان مارینو کے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اپنی پہلی ہی فرصت میں اس عظیم ملک کی زیارت کے لیے ضرور حاضر ہوگا۔

اگر ابراہم لنکن ایک جانکاہ حادثے سے اچانک فوت نہ ہو جاتا تو وہ سان مارینو ضرور آتا کیونکہ یہ اس کے ایجنڈے میں شامل تھا اور وہ اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں سے اپنے ارادہ سفر کا تفصیلاً ذکر کیا کرتا تھا اور سان مارینو جانے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

ابراہم لنکن تو اس ننھے سے خوبصورت ملک کی زیارت نہ کر سکا لیکن اس کا مجسمہ آج بھی شہر کے بڑے چوک میں لگا ہے جس کی عزت سان مارینو کے لوگ اپنے ایک نامور سپوت کی طرح کرتے ہیں جس نے اس ملک کی شہریت قبول کر کے اسے اپنا وطن تسلیم کیا۔

فوجی لوگ بڑے سیدھے، دیانتدار اور مربوط وضع دار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کو زیادہ چل فریب نہیں آتے یا کم از کم اس زمانے میں نہیں آتے تھے۔ جب وہ سیاست میں دخیل نہ تھے...... ایک شام ہمیں کمانڈر انچیف صاحب بڑے چوک میں مل گئے۔ وہ اپنی جیپ میں راؤنڈ کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر گاڑی روکی اور ہوٹل چھوڑ آنے کی آفر دی۔ ہم نے کہا ہم تو سیر گشتی کے لیے باہر نکلے ہیں، ابھی واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

کہنے لگے ”تو پھر ہمارے ساتھ کافی کا ایک پیالہ پیجیے۔“

ہم نے عرض کیا ”چہ خوب! کافی ہی کی طلب میں ہم گھر سے نکلے تھے۔“

شہاب صاحب کو دو دن سے یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ ملک اچھا ہے۔ لوگ نیک اور نفیس ہیں، شریف الطبع اور ملنسار ہیں۔ ملک ہر طرح کے حسن سے مالا مال ہے۔ تموّل اور فراوانی ہے لیکن صرف ڈاک کی ٹکٹوں پر ساری اکانومی کا بوجھ ڈال کے بیٹھ رہنا دانائی نہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے۔ میں نے شہاب صاحب کی اس چنتا کا سی ان سی سے ذکر کیا تو اس نے قہقہہ مار کہا ”ڈاک کی ٹکٹوں کے علاوہ ہمارے یہاں معیشت کے اور بھی مضبوط سہارے ہیں۔ مثلاً کھیتی باڑی، اناج اور اعلیٰ درجے کا فروٹ، بے داغ سنگ مرمر کی برآمد، تمبا کو اس کے علاوہ اپنے استعمال کا کپڑا، ٹائلز اور شیشے کا سامان...... کچھ ایسی فکر کی بات نہیں...... وہ جو ڈاک کے ٹکٹوں کا معاملہ ہے تو وہ ہماری اوّل درجے کی آمدن ہے جس نے ہمارے ملک کی ستر فیصد معیشت کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے لیکن وہ بھی کچھ نہیں ہے...... ہم بڑے آسودہ حال لوگ ہیں۔“

کمانڈر انچیف کی یہ بات سن کر بھی شہاب صاحب کی تشفی نہ ہوئی۔ ان کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں رہی تھی کہ ڈاک کے ٹکٹ بھی ملکی معیشت میں کوئی اہمیت رکھ سکتے ہیں۔ وہ بڑے افسر تھے۔ اپنے مراسلات سپرنٹنڈنٹ، ہیڈ کلرک یا چپڑاسی کو دے دیتے تھے۔ وہی ان پر ٹکٹیں لگا کر سپرد ڈاک کر دیتے۔ شہاب صاحب نے تو کبھی اپنے پوسٹل سٹمپ کی شکل بھی دیکھی تھی۔ انہیں پتہ ہی نہ تھا کہ پاکستان میں ڈاک کا ٹکٹ چوکور بنتا ہے یا تکونا! انہیں تو بس کھلی کھلائی ڈاک مل جاتی تھی اور کھلے کاغذات بند ہو کر آپ سے آپ اپنی منزل پر روانہ ہو جاتے تھے۔

جب میں نے سی ان سی صاحب سے کہا کہ ”میرے ان ساتھی کی ابھی بھی پوری تسلی نہیں ہوئی۔“ تو انہوں نے قہقہہ مار کر کہا ”ایک اور ایکسپورٹ تو میں بھول ہی گیا۔ اس سے بھی ہمیں کافی آمدنی ہو جاتی ہے اور ایک خطیر رقم زرمبادلہ کے طور پر مل جاتی ہے۔“

پھر انہوں نے ذرا سوچ کر کہا ”ہم اپنے ملک سے طلاق ایکسپورٹ کرتے ہیں!“

”طلاق!“ میں نے چیخ کر کہا ”طلاق...... یہ جو شادی شدہ لوگوں کے درمیان ہوتی ہے...... تنسیخ نکاح؟“

کہنے لگے ”بالکل بالکل...... یہی...... تنسیخ نکاح...... ہمارے یہاں اس کے لیے الگ سے ایک کورٹ ہے جہاں صرف طلاق کے مقدموں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر وکیل، قانون دان اور مقنن بھی کام کرتے ہیں۔“

ہم بھونچکے سے بیٹھے تھے کہ شہاب صاحب نے کہا ”آگے پوچھو!“ میں نے عرض کیا ”آگے کیا پوچھوں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، شاید میں غلط سمجھ گیا ہوں۔“

ہمیں یوں سراسیمہ اور حواس باختہ دیکھ کر کمانڈر انچیف نے کہا ”کیتھولک مذہب میں طلاق کی اجازت نہیں ہے۔ ہم بھی کیتھولک ہیں لیکن ہم دیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”کیا دیتے ہیں سر؟“

کہنے لگے ”طلاق دیتے بھی ہیں اور دلواتے بھی ہیں۔ ہم مذہبی لوگ ضرور ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمہوریت پسند بھی ہیں۔ ہمارا ملک دنیا بھر میں سب سے پرانا جمہوری ہے۔ تیرہ سو برس قدیم۔ ایک مرتبہ بھی ہماری جمہوریت کے اندر نہ کوئی میڑھ آئی نہ انقلاب۔ ہم اپنے اصولوں کی ہموار سطح پر خوشگوار اور پرسکون کشتی رانی کر رہے ہیں۔ ہمیں آج تک کوئی تکلیف نہیں ہوئی...... ذرا غور فرمائیے یہ ازدواجی سمبندھ دو دلوں کا باہمی سودا ہے۔ جب تک خوشی سے رہیں، رہیں چشم ما روشن دلِ ماشاد مگر جب یہ سودا کڑوا ہو جائے اور پسند ناپسند میں بدل جائے تو پھر ایک دوسرے کو گرہ بند کر کے اور گانٹھ مار کے رکھنے سے حاصل؟ بہتر یہی ہے کہ دونوں آزاد ہوں اور خوشبودار فضاؤں میں سانس لیں، پھلیں، پھولیں، قلانچیں بھریں۔“

کمانڈر صاحب کی اس شاعرانہ گفتگو نے ہمیں متاثر تو بہت کیا لیکن ہم اس ایکسپورٹ کی تفصیلات سے واقف نہ ہو سکے۔

انہوں نے بتایا کہ ڈیڑھ سو برس پہلے ہماری قانون ساز اسمبلی نے تنسیخ نکاح کا قانون پاس کیا تو پوپ نے اس کا سختی سے نوٹس لیا، ہماری قانون ساز اسمبلی بھی اپنی جگہ ڈٹی رہی، چنانچہ دس سال بعد پوپ اس مطالبے سے از خود دستبردار ہو گئے اور ہمارا قانون پکے طور پر پاس ہو کر عمل میں آ گیا...... اب کوئی بھی کیتھولک، کسی بھی ملک کا رہنے والا، ہمارے ملک کی شہریت اختیار کرنے کے بعد عدالت میں تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کر کے طلاق حاصل کر سکتا ہے؟

”اور دوسری پارٹی؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”ان کو عدالت میں اصالتاً یا وکالتاً حاضری دینی پڑتی ہے۔ آنے جانے کا خرچہ ہم طلاق مانگنے والے سے

دلواتے ہیں۔ جج صاحب کے سامنے عدالت میں لین دین، چنگیر پوٹ، خرچی کے معاملات طے پاتے ہیں اور طلاق کا اعلان ہو جاتا ہے۔ اب دونوں آزاد ہیں، دوبارہ شادی کریں یا دفع کریں اس دھندے کو اور کوئی سنجیدہ کام کریں۔'' پھر کر کمانڈر صاحب ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا ''اور آپ کے ملک کی شہریت! وہ آسانی سے مل جاتی ہے؟''

فرمانے لگے ''ایک مہینہ مسلسل سان مارینو میں قیام کرنے کی شرط ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہاں کی شہریت مل جاتی ہے لیکن لوگ عام طور پر طلاق دینے کے لیے شہریت حاصل کرتے ہیں اور تو یہاں کوئی کام ہے نہیں، کوئی بڑی تجارت۔ بس یہی ایک کشش ہے!''

شہاب صاحب نے کہا ''پھر تو دور دور سے لوگ یہاں آتے ہوں گے؟''

کہنے لگے ''زیادہ تر اٹلی، فرانس، سپین اور پرتگال کے لوگ آتے ہیں۔ خرچہ تو کافی ہو جاتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جاتی ہے۔''

میں نے کہا ''اس سے تو سٹیٹ کو کافی آمدن ہو جاتی ہوگی۔''

کہنے لگے ''اب خود ہی اندازہ کر لو، ساری کیتھولک دنیا میں بس ایک ہماری ہی مناپلی ہے جیسے جوٹ میں تمہاری ہے، اس لیے آمدن تو ہوگی۔''

شہاب صاحب کو جوٹ کی بات سن کر بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے ہمارے ملک کے بارے میں جاننے پر کمانڈر انچیف صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

انہوں نے کہا ''میں تمہارے ملک کے دونوں بازوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ ہم فوجی لوگ ہیں۔ ہم کو ہر طرح کی معلومات کا علم ہونا ضروری ہے۔''

جب ہم اپنے ہوٹل کے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے تو شہاب صاحب نے سارے ملک پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا ''یہ تو ایک عجیب سا چاند نگر ہے۔ یہاں سے تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔''

میں نے کہا ''ایک مہینہ رُک جایئے اور شہریت حاصل کر لیجیے۔''

کہنے لگے ''وہ تو پھر شادی کے بعد ہی ہو سکتا ہے، خالی شہریت لینے سے فائدہ!''

چار دن بعد جب ہم اپنے بہت ہی پیارے دوستوں سے مل کر اور گال سے گال ملا کر اونچے اونچے چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہوئے تو شہاب صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا ''آج اچھی طرح سے پتہ چلا ہے کہ بادل اندوہگیں، دیدۂ خونبار...... کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ میں تو زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی جگہ چھوڑتے ہوئے آبدیدہ سا ہو گیا ہوں۔''

واپسی پر جب ہم سان مارینو کے خوش آمدیدی استقبالیہ کے آگے سے گزرے تو فوج کے ایک چاق و چوبند دستے نے ہمیں گارڈ آف آنر دیا اور گارڈ کے تینوں چاق و چوبند سپاہیوں نے ہوا میں فائر کر کے ہم کو الوداعی سلامی دی۔

جب ہم اٹلی کی سرحد میں داخل ہو گئے تو شہاب صاحب نے کہا ''دراصل یہ ملک اے حمید کے دیکھنے کا ہے۔

اگر کہیں وہ ہفتہ دس دن یہاں رہتا تو اپنے لنکا دیس کے کولمبو کو بھول جاتا اور اس کے سماوار ٹھنڈے پڑ جاتے۔ کاش کسی طرح سے وہ یہاں آ کر رہ سکے اور اس ملک پر اپنے طرز کی کہانیاں لکھ سکے۔'' پھر انہوں نے اچانک میری طرف دیکھ کر کہا ''آپ نے اے حمید کو کیسا پایا؟''

میں نے کہا ''میں اس سے بڑی محبت کرتا ہوں اور میری یہ محبت صرف اس کی تحریروں کی وجہ سے ہے۔ وہ ایک اچھا افسانہ نگار ہی نہیں، ایک اچھا یار اور ایسا ماہ تنہا خرام ہے جو ساتھ چلتے چلتے غائب ہو جاتا ہے۔ میں واقعی اس سے بڑی محبت کرتا ہوں۔''

شہاب صاحب نے پوچھا ''کیا اسے معلوم ہے کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں؟''

میں نے کہا ''ہم بہت کم ملے ہیں، اس لیے میں نے اس سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔''

کہنے لگے ''اس کا اظہار ہونا چاہیے کہ اس کا حکم ہے!''

میں ان کی یہ بات سمجھ نہ سکا کہ کس کا حکم ہے۔ کیسا حکم ہے اور کس ضمن میں آیا ہے۔ نہ میں نے ان سے پوچھا، نہ انہوں نے اس کی وضاحت کی۔

واپسی پر جب بارش تیز ہو گئی اور ڈرائیو کرتے ہوئے وائپر کی ہتھی بار بار گھمانا میرے لیے مشکل ہو گیا تو میں نے گاڑی سڑک کنارے کھڑی کر دی اور شہاب صاحب سے کہا ''آپ نے وزیر خارجہ کی گاڑی دیکھی تھی۔ اس میں کیا اچھا سسٹم تھا کہ وائپر بٹن دبانے سے خود بخود چلتے رہتے تھے۔ ڈرائیور مزے سے ڈرائیو کر سکتا اور اس کا شیشہ بھری بارش میں بھی صاف رہتا تھا۔''

شہاب صاحب نے کہا ''میرا خیال ہے اگر تم چاہو تو اپنی گاڑی میں یہ تبدیلی کروا سکتے ہو۔ میں نے ہالینڈ میں بہت سی پرانی گاڑیاں دیکھی تھیں جن سے ہتھی نکال کر وہاں آٹومیٹک سسٹم لگا دیا گیا تھا۔ ایک چھوٹی موٹر ہی تو ہوتی ہے جو وائپر چلانے لگتی ہے اور کیا کرنا ہے۔''

میں نے کہا ''دیکھیے شہاب صاحب سائنس نے کس قدر ترقی کی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک بلکہ ایک چھوٹا سا شہر تھا مگر اس میں انسانی آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ ٹیلی فون، تار، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹریفک کنٹرول لائٹس، فلی آٹومیٹک موٹریں، گیس، بجلی...... کیا کیا بتاؤں اور کیا کیا گنواؤں...... کیا یہ ساری چیزیں کبھی ہمارے ملک میں بھی آ سکیں گی۔ کبھی ہمارا پاکستان بھی ایسا ترقی یافتہ ملک ہو سکے گا۔ اس چھوٹے سے ملک جیسا جو ہماری تحصیل پاکپتن سے بھی چھوٹا ہے۔''

شہاب صاحب نے کہا ''ہو جائے گا، ہو جائے گا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ ابھی تو ابتداء ہے۔ بہت سے کام ہونے ہیں، بہت سے کرنے ہیں۔ بہت سے شروع ہونے ہیں، آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا۔''

بارش کم ہو گئی تھی۔ میں نے گاڑی ایک دھچکے سے سڑک پر ڈالی اور چڑ کر کہا ''کیا ہو جائے گا۔ کب ہو جائے گا، کہاں ہو جائے گا۔ اس ویرانے میں، جہالت کے جنگل اور قلت و کمیابی کے ریگستان میں...... ایک تو یونیورسٹی ہے سارے ملک میں...... ایک شہاب صاحب، ایک! اور آٹھ فیصد شرح تعلیم ہے۔ اس سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں...... خاک ہو

جائے گا،سواد اور مٹی ہو جائے گا۔"

شہاب صاحب نے کہا" بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن کیا کیا جائے ،ہم بڑی طویل غلامی سے حال ہی میں نکلے ہیں......"

میں نے کہا" سر! کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ پاکستان میں کبھی سائنس کا دیا روشن ہو سکے گا۔ یہ ملا لوگ یہ ملونٹے اس کی اجازت دیں گے۔ کیا یہ مستیزیے سائنسی علوم کے پھیلاؤ کو پھیلنے دیں گے؟ بتائیں ناں ذرا۔ آپ تو ارباب بست کشاد میں سے صاحب اختیار ہیں......"

شہاب صاحب نے کہا" سائنس اللہ کا عطا کردہ ڈسپلن ہے اور اس کی بڑی نعمت ہے لیکن سائنس بنی نوع انسان کے لیے امن، مسرت، فلاح اور خوشیوں کا پیام نہیں لا سکی۔ یہ انسانوں کے لیے آسائش کا سامان ضرور مہیا کر سکی ہے۔ انسان کو جسمانی آسانیاں عطا کر سکتی ہے لیکن یہ ساری آسانیاں اور ساری آسائشیں انسان کے دکھوں کو دور نہیں کر سکتیں۔ وقتی طور پر انسان کو ریلیف ضرور ملتا ہے لیکن جلد ہی یہ رحمت زحمت میں بدل جاتی ہے اور انسان پھر پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایسی آسائشیں اس کی بیچارگی اور تہی دستی کا علاج نہیں کر سکتیں۔ اس کو وقتی ریلیف ضرور دے دیتی ہیں...... ان آسائشوں کے عادی ہونے کے بعد ہم مزید آسائشوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں اور رہٹ کا یہ چکر چلتا ہی جاتا ہے۔"

میں نے ڈرائیونگ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا پورا چہرہ گھما کر شہاب صاحب کو دیکھا کہ یہ کیسی احمقانہ بات کر رہے ہیں لیکن انہوں نے پلٹ کر میری طرف نہ دیکھا اور شیشے میں سے سامنے دیکھتے ہوئے بولے" ان خوشیوں اور آسائشوں کا ساز و سامان جس قدر بدن پر بڑھتا جائے گا، اسی نسبت سے اندر کھوکھلا ہوتا جائے گا۔ اندر کی مفلسی بڑھتی جائے گی۔"

پھر وہ ذرا رکے اور ہلکے سے میری جانب جھک کر بولے۔" اور یہ جن ملاؤں اور ملونٹوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، انہوں نے باہر کی زندگی سے آنکھیں موند کر اندر کا نقارہ بجانا شروع کر دیا۔ انہوں نے حقیقت کا سامنا کرنے کی بجائے آنکھوں پر اندھیاریاں باندھ لیں اور طرز کہن کے غیر تحقیق شدہ اعتقادات کو زندگی کی بنیاد بنا لیا۔ انہوں نے تو آپ کے نزدیک لٹیا ہی ڈبو دی۔"

"اصل میں دونوں ہی ایک جیسے ضدی ایک سے جاہل ہیں۔ زندگی نہ صرف اندر ہے اور نہ محض باہر۔ یہ اندر اور باہر دونوں ہی ہے...... جو شخص زندگی کے صرف اندر کا داعی ہے، وہ مرکز پر بیٹھا محیط سے بالکل بے نیاز ہے اور جو محیط کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے، اس نے اپنا مرکز کھو دیا ہے۔ بھلا مرکز کے بغیر کبھی بھی کوئی محیط ہو سکا ہے؟"

میں کچھ کہنے لگا تو انہوں نے کہا" زندگی عطا کرنے والا سانس نہ صرف اندر کھینچے والا ہوتا ہے باہر جانے والا بھی ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی ہوتا ہے۔ دونوں کے سہارے زندگی چلتی ہے۔ صرف ایک کا عمل اختیار کریں گے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ حیات کا سلسلہ رک جائے گا۔"

پھر وہ خاموش ہو گئے اور بڑی دیر تک اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میرے لیے باہر کا راستہ تو نیا تھا ہی اب اندر بھی ایک نئی پگڈنڈی پیدا ہو گئی۔ میں نے اس طرح سے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ نہ میرا مطالعہ تھا، نہ مشاہدہ۔ نہ میرے اندر اس طرح سے تجزیہ کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اس وقت میں کچھ سوچتا، کچھ بولتا، زیادہ لڑتا جھگڑتا، اعتراضوں پر اعتراض کرتا چلا جا رہا تھا اور خاموش تھا!

میرے چہرے پر ناخوشی کے آثار دیکھ کر انہوں نے کہا" اصل میں مذہب سائنس کے خلاف نہیں۔ اگر ایسا کوئی مذہب ہے تو پھر وہ مذہب نہیں ہے۔ جس طرح مذہب سائنس کے خلاف نہیں ہے، اسی طرح مذہب کبھی دنیا کے خلاف نہیں ہوتا۔ دنیا مذہب کے خلاف ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے لیکن مذہب کبھی بھی دنیا سے متصادم نہیں ہوا۔ مذہب پورے کا پورا اور سارے کا سارا آزاد اور غیر متنازعہ ہوتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی مذہب نزاعی اور تکراری ہے تو وہ مذہب نہیں ہے کچھ اور ہے۔ جہاں بھی تکرار ہو گی، نزاع سے ہو گی۔ وہاں امن نہیں ہو گا، شانتی نہیں ہو گی اور مذہب سلامتی اور اسلام کا اور امن و امان کا دوسرا نام ہے۔"

سائنس نے اس دنیا میں بڑا کام کیا ہے اور بڑا نام پیدا کیا ہے۔ اس کے اندر ہونے والی لگاتار ریسرچ نے اسے ایک بلند مقام پر پہنچا دیا ہے لیکن انسان کے اندر کی آگ ویسے ہی جل رہی ہے۔ اندر وہی پرانا دھواں دھنک رہا ہے۔

باہر کی ترقی اور باہر کی دریافت اور بیرون در کی یافت نے انسان کو تباہی کے اور قریب کر دیا ہے...... وہ ذہن اور وہ وجود جو پریشان ہے جھگڑالو ہے اور مکمل طور پر مایوس اور خائف ہے، وہ دوسروں کو اذیت پہنچا کر اور عذاب دے کر ہی خوش ہو سکے گا۔ اس کے اندر دوسروں کو دینے کے لیے بس یہی ایک تحفہ ہے۔ عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں...... وہ بھی اذیت ناک تحفے لوگوں کو دے کر خوشی محسوس کرے گا۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

میں شہاب صاحب کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور ان کو بیچ میں ٹوکنا نہیں چاہتا تھا ورنہ میرے پاس بھی بہت سے ایسے دو دھارے دلائل اور چوکھی حجتیں تھیں کہ میں ان کے مکالمے کا ناطقہ بند کر سکتا تھا......

انہوں نے کہا" انسان خواہش و غرض و غایت کا مارا ہوا ایک ایسا جانور ہے جس کی طلب اور ضرورت کبھی بھی پوری نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنے آپ سے ہٹ کر کچھ اور ہونے کا خواہش مند ہے۔ انسانوں کے درمیان ایک ایسی دوڑ لگی ہے کہ ہر انسان یہ بھول چکا ہے کہ وہ اصل میں کیا ہے اور اس کے مزاج کے شناختی کارڈ پر کیا کوائف درج ہیں...... اپنے آپ سے بڑھ کر اور اپنی ذات سے مختلف ہو کر کچھ اور ہونا ایک ناممکن الحصول عمل ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، جو کچھ بیج ہی نہیں ہے، وہ درخت میں کدھر سے آ سکتا ہے۔ درخت تو اپنے بیج ہی کا ہو گا اور وہ اس پر ساری عمر خوش بھی رہے گا لیکن انسان اپنی موجودہ صورت سے خوش نہیں ہوتا۔ اپنے دیئے گئے وجود پر راضی نہیں ہوتا۔ اس سے مطمئن نہیں رہتا۔ ہر وقت کچھ اور ہونا چاہتا ہے...... چنانچہ انسانی معاشرے کی ساری خرابی کی بس ایک یہی وجہ ہے۔ انسان جب اپنا موازنہ دوسروں سے کرتا ہے تو حسد، کرودھ، غم میں مبتلا ہو کر لڑائی، مار کٹائی اور جنگ و جدال پر اتر آتا ہے۔ جنگ و جدال زندگی کا چلن نہیں، یہ زندگی نہیں۔ یہ تو زندہ موت ہے! چلتی پھرتی لاشوں سے زندہ اور خوشحال معاشرے کیسے تعمیر کیے جا سکتے ہیں!"

انسان میں خواہش، غرض و غایت، طلب اور چاہ کیوں پیدا ہوتی ہے تو اس بیماری کی ایک ہی جڑ ہے۔ احساسِ کمتری!...... اپنے اندر ہر شخص اپنے آپ کو کمزور، نالائق، ذلیل سمجھتا ہے۔ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ اندر خالی ہے اور تہی ہے لیکن اس خالی اور ویران گھر کو آباد کرنے کے بجائے وہ وہاں سے بھاگتا ہے اور پھر ساری عمر بھاگتا ہی رہتا ہے۔ اپنے خیالی دشمنوں سے لڑتا ہے، بڑی بڑی جنگیں آراستہ کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں مول لیتا ہے۔ انقلابیوں کی جھڑپیں اور گوریلوں کے یدھ مرتب کرتا ہے۔ دست بدست بھی لڑتا ہے۔ گولہ بارود سے بھی لڑتا ہے اور دور بیٹھ کر اپنے ڈرائنگ روم سے بھی جدال کرتا ہے۔

میں نے حوصلہ کر کے کہا ''شہاب صاحب میں نے آپ سے سائنس اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں پوچھا تھا لیکن آپ کسی اور طرف ہی چل نکلے۔ کیا آپ لوٹ کر پھر اس موضوع کی طرف آ سکتے ہیں؟''

''ضرور ضرور! کیوں نہیں، کیوں نہیں۔'' شہاب صاحب نے معذرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تو یہی بات سوچ رہا تھا کہ بیسویں صدی انسانیت کو ایسی چوٹی پر لے کر پہنچ چکی ہے جہاں سے شعوری عمل کا ایک اور راستہ کھلنے والا ہے۔ اعتقاد کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور ایک بہت بڑی تبدیلی کی خبر کا ضمیمہ شائع ہونے والا ہے۔ ہم اپنے ماضی کی دلدل سے تو نکل آئے ہیں لیکن ابھی ہماری پنیری مستقبل کے اندر نہیں لگ سکی...... اصل میں ہم انسان کے ایک نئے ارتقائی دور میں داخل ہونے والے ہیں۔ اب انسان، صورت میں تو ویسا ہی رہے گا لیکن معنوی طور پر اس میں عظیم اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہو جائیں گی۔ دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے اور جاننے والے لوگ جان گئے ہیں۔ انسان اب وہ نہیں رہے گا جیسا کہ اب ہے۔''

''سائنس نے پرانے خیالات اور فرسودہ اعتقادات پر ضربِ کاری لگائی ہے۔ اس نے ذہنوں کو آزاد کر کے ایک نئے مذہب کی طرف رجوع کیا ہے۔ ایسا مذہب جو اندھے بہرے اعتقاد کے بجائے تفکر اور تدبر پر اپنی بنیادیں استوار کر رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت جلد مذہب شعور بزات کی سائنس بن جائے گا اور یہ سب کچھ اس عہد کے سائنسی عمل کی بدولت ہو گا۔''

''مذہب کی سائنس ازل سے روشن فکر بزرگوں اور روشن ضمیر بابوں کے اختیار میں رہی ہے لیکن یہ عوام اور لوگوں کے عمومی گروہوں میں نہیں پھیل سکی لیکن اب سائنس کی برکت سے اصل، صحیح اور سچے مذہب کو عروج حاصل ہو گا اور اساطیری عقیدے ختم ہو جائیں گے۔ سائنس کی آتش مذہب کے اندر سے ہر طرح کی ملاوٹ جلا کر اسے زرِ خالص بنائے گی اور مذہب اس کے شکرانے کے طور پر انسانی شعور کو مطلوبہ نور عطا کرے گا اور انسان بڑی آسانی کے ساتھ اس مقامِ موعود پر پہنچ جائے گا جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

پھر انہوں نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور کہا ''پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کے نظریئے کو وسعت عطا کرنے کے لیے سائنس اور سائنس کی حکمت اور اس کے گیان کی اشد ضرورت ہے۔ اصل اور صحیح سائنس کے ماخذ مصدر کی، بی ایس سی، ایم ایس سی، ایم بی بی ایس اور انجینئرنگ سائنس کی ڈگریوں کی نہیں!''

میں نہ اس وقت بولا، نہ گھر آ کر کوئی بات کی۔ نہ شہاب صاحب کی بی ایس سی کی ڈگری کا مذاق اڑایا۔ نہ اس گفتگو کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ ان کے اور میرے درمیان ایک شدید اختلاف اور وسیع پھیلاؤ تھا۔ اس پر کسی قسم کا بھی پل نہیں باندھا جا سکتا تھا۔ نہ کسی اور ذریعے سے باہمی ملاقات ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں ایک اچھے اور شریف النفس میزبان کی طرح اسے پی ہی گیا۔

اگلے روز شہاب صاحب کی دن کے گیارہ بجے فلائٹ تھی اور وہ وطن واپس جا رہے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں سوائے ایک مرتبہ کے اور کبھی اتنی اداسی محسوس نہ کی تھی۔ وہ کمال احتیاط کے ساتھ اپنا سامان باندھ رہے تھے اور میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے حکم نہیں تھا کہ میں ان کی چیزوں کو ہاتھ لگاؤں یا ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ مجھے صرف اٹیچی کیس تیار ہوتے دیکھنے کی اجازت تھی۔

اپنا بڑا بکس بند کرنے کے بعد انہوں نے مجھے تین کتابیں دیتے ہوئے کہا ''مجھے اندیشہ ہے کہ میرے سامان کا وزن زیادہ نہ ہو جائے، اس لیے یہ کتابیں آپ اپنے پاس رکھیں، اور واپسی پر احتیاط کے ساتھ لے آئیں۔''

ان میں ایک تو مولوی فتح محمد جالندھری کے ترجمے والا قرآن شریف تھا۔ دوسری ایک چھوٹی سی کتاب مولانا اشرف علی تھانوی کے وظیفوں کی تھی اور تیسری نہایت ہی نامانوس سی کتاب ''فوائد الفواد'' تھی جس کا میں نے کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ مولانا اشرف علی سے میں یوں واقف تھا کہ ان کی بہشتی زیور ہمارے گھر میں موجود تھی جسے میری بہنیں اور کبھی کبھی اماں پڑھا کرتی تھیں۔

جب میں نے کتابیں بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی گود میں رکھ لیں تو انہوں نے کہا ''میں یہاں سے سیدھا قاہرہ جا رہا ہوں۔ اس کے بعد واپس جاؤں گا۔''

میں نے کہا ''قاہرہ! یہی اہرامِ مصر اور ابوالہول والا؟''

کہنے لگے ''ہاں۔''

میں نے کہا ''شاہ فاروق والا۔''

کہنے لگے ''ہاں۔''

میں نے پوچھا ''جہاں مصر کے مشہور بازار ہوتے ہیں؟''

ہنس کر کہنے لگے ''بالکل وہی۔''

میں نے کہا ''سر! وہاں جانے سے مطلب! اب سیدھے سجاد گھر جائیے، مصر کی سیر پھر کبھی سہی۔''

کہنے لگے ''پھر میں بذریعہ آبی جہاز جدہ جاؤں گا''

میں نے کہا ''جدہ؟''

کہنے لگے ''ہاں۔''

میں نے کہا" جو حاجیوں کی آمدورفت کے مشہور ہے؟"

کہنے لگے" بالکل وہی۔"

میں نے کہا" وہاں آپ کا کیا کام؟"

کہنے لگے" میں حج کرنا چاہتا ہوں اور حج کے بعد وطن واپس جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا" حج!"

کہنے لگے" ہاں!"

میں نے پوچھا" وہ جو بڑی عمر کے لوگ کیا کرتے ہیں...... وہی؟"

کہنے لگے" بالکل وہی!"

میں نے کہا" اتنی گرمی میں...... صحرا کے اندر...... وہ تو آپ برداشت نہیں کرسکیں گے۔"

کہنے لگے" احتمال مجھے بھی ہے کہ برداشت نہ کرسکوں گا لیکن دل بہت چاہتا ہے اور دل کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔"

میں نے کہا" شہاب صاحب اول تو اس عمر میں حج کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہے تو پھر ذرا ٹھہر جائیے گا اور سردیوں میں کیجئے گا۔"

بڑی لجاجت سے بولے" اب میں نے ضروری کاغذات بھی جمع کرا دیے ہیں۔ فیس بھی ادا کر چکا ہوں۔ اجازت بھی مل گئی ہے۔ معلم کا نام اور پتہ بھی موصول ہو گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خوش دلی سے اجازت دے دیں۔"

لو بھلا میں کون تھا اجازت دینے والا، کیا پدی کیا پدی کا شوربہ، میری بھلا کیا بساط تھی ان کو اجازت دیتے گی۔

میں آبدیدہ سا ہو گیا۔

شہاب صاحب کہنے لگے" اجازت طلب کرنا ہمارے یہاں کا ایک معروف طریق معاشرت ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں ہوتا۔ محبت اور عقیدت کی بات ہوتی ہے۔ بڑے بڑے جید بزرگ چھوٹے چھوٹے صاحبزادگان سے دست بستہ اجازت طلب کر کے خانقاہوں سے نکلا کرتے تھے...... یہ محبت و موانست کی بات ہوتی ہے ورنہ کون چھوٹا اور کون بڑا۔"

میں پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، ان کی یہ بات سن کر سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ وہ شرمیلے اور جھینپو سے آدمی صرف ایک قدم آگے بڑھا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

اصل میں یہ بات نہیں تھی۔ بات کچھ اور تھی۔ پانچ چھ دن ایسی قربت کے بعد اگر بکری کا بچہ بھی آپ سے جدا ہونے لگے تو آپ اسے گود میں اونچا اٹھا کر ٹھوڑی سے دبانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ تو میرے ساتھی، میرے محسن، میرے مہمان تھے۔ ان کی جدائی کیسے شاق نہ گزرتی بھلا!

میں ان کو ان کے ہوٹل میں چھوڑ کر گھر آ گیا کہ یہ ان کی خلوت کا وقت تھا اور مجھے ان کے سارے اوقات یاد ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں وہ اس تنہائی میں کیا کرتے تھے!

رات کا کھانا ہم نے وہیں کمرے میں سٹوو جلا کر اور آلو، ٹماٹر، شملے کی مرچ اور بٹن مشروم ڈال کر پکایا اور پلیٹ میں ڈال کر اوپر سیاہ مرچ کا دبیز دھوڑا دیا...... (اس کھانے کو وہ اپنے آخری دم تک یاد کرتے رہے اور مجھے اعلیٰ درجے کا باورچی تسلیم کرتے اور کراتے رہے!)

شہاب صاحب کے چلے جانے کے بعد اگلا پورا ہفتہ بڑی اذیت میں گزرا۔ میں رویا تو نہیں البتہ گریہ کی کیفیت ہر وقت طاری رہی۔ میرے ساتھیوں کو ٹھیک سے سمجھ نہ آیا کہ یہ سب کیا ہے لیکن اس قدر ضرور جان گئے کہ بھائی کسی مشکل میں ہے!

فراق کا ایک ایسا ہی دور مجھ پر پہلے بھی آیا تھا جب میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت تو میں مرتے مرتے بچا تھا اور میرے گھر والے کافی پریشان ہو گئے تھے لیکن یہاں مرنے جینے والی بات تو نہیں تھی البتہ جدائی کے دکھ نے دل پر خاردار تار کا ایک چھلو سا چڑھا دیا تھا جو دل کو ہر وقت زخمی کرتا رہتا تھا......!

جو کتابیں شہاب صاحب میرے پاس چھوڑ گئے تھے، ان میں سے قرآن شریف اور وظائف کی کتاب تو میں نے ایک نئے خاکی کاغذ میں لپیٹ کر ان پر ربر بینڈ چڑھا کر الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں رکھ دیا البتہ "فوائد الفواد" نامی کتاب کو کھول کر ادھر ادھر سے پڑھا۔ یہ کسی خواجہ حسن دہلوی کی کتاب تھی جو اس نے اپنے مرشد کے ارشادات کو جمع کر کے مرتب کی تھی۔ مرشد اس کے کوئی نظام الدین اولیاء صاحب تھے جن کا نام کچھ مانوس سا تھا۔ میں نے اپنے قصبے میں برسات کے موسم میں قوالوں کو گاتے سنا تھا جن کے گانوں میں ان کا نام بار بار آتا تھا۔ پھر میں نے تاریخ ہزارہ میں بھی ان کا ذکر دیکھا تھا لیکن وہ اس قدر تھوڑا تھا کہ اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اصل میں میں ادب کا طالب علم تھا اور ادب میں چونکہ اس قسم کے لوگوں کا کوئی ذکر اذکار نہیں ہوتا، اس لیے میں ان سے واقف نہیں تھا۔

ادب کے علاوہ مجھے تاریخی واقعات اور تاریخی افکار کا بہت اچھا علم تھا اور میں تاریخی کرداروں خاص طور پر مغلیہ عہد کے لوگوں، ان کے شہروں، ان کے گلی محلوں اور ان کے اندرون خانہ واردات سے بہت قریب سے واقف تھا۔ میں نے ان کی زندگیوں کو نزدیک سے دیکھا تھا اور ان واقعات کی ساری جزئیات جانتا تھا جو ان پر وارد ہوئے تھے لیکن ان لوگوں کے ناموں تک سے ناواقف تھا جو "فوائد الفواد" جیسی کتابوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کا ذکر نہ تو اپنی کہانیوں میں نہ کبھی نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، ظ۔ انصاری، مہاشہ سدرشن یا منشی پریم چند نے کیا تھا نہ بعد کے آنے والے کرشن، بیدی، منٹو، عصمت، ندیم، رشید جہاں، اشک، غلام عباس اور عسکری جیسے عظیم افسانہ نگاروں نے کیا تھا۔ ہماری پڑھت اور ہمارے مطالعے میں ایسے لوگ آئے ہی نہ تھے، اس لیے ہمارے نزدیک ان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

فراغت کے اوقات میں میں جب بھی "فوائد الفواد" کو ادھر ادھر سے دیکھتا تو سناٹے میں آ جاتا۔ یہ سارے کا

سارا ٹولہ علم اقتصادیات سے بالکل بے بہرہ تھا اور اس کو معاشیات کی الف بے سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ اپنی آمدن کو اور اپنی بچت کو سنبھال کر رکھنے کے بجائے ضرورت مندوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور خود بالکل خالی ہاتھ ہو کر واپس گھر جا کر نئے سرے زندگی شروع کر دیتے تھے۔

ایسے لوگ کس طرح سے ترقی کر سکتے تھے اور اپنے بدحال معاشرے کی کیونکر تعمیر کر سکتے تھے۔ یا تو کسی نے ان کو بتایا سمجھایا نہیں تھا یا انہیں مکتب میں اور درسگاہ میں یہ علم نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ یہ کتاب پڑھتے ہوئے کسی کسی جگہ تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے ان لوگوں کو اپنی محنت کی کمائی اور اپنے خون پسینے کی بافت کے ساتھ کوئی ہمدردی ہی نہیں تھی۔ اپنے بال بچے اور گھر والے اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کرنے کے بجائے دو وقت کی روٹی پر محصور و محدود کر دیئے گئے تھے۔ اپنے گھر کا معیار زندگی بلند کرنے کے بجائے دوسروں کی ضرورتوں کی ٹوہ لگاتے پھرتے تھے۔

میں کبھی تاریخ کا طالب علم تو نہیں رہا لیکن اس کتاب کو پڑھ کر میرا یہ خیال یقین میں تبدیل ہو رہا تھا کہ ایسے لوگوں نے اپنے معاشرے کی معاشی، معیشتی اور اقتصادی زندگی پر برے اثرات ڈالے اور اپنے سماج کو ساہوکارانہ اور سرمایہ دارانہ بنیادوں پر استوار نہیں ہونے دیا۔ لوگوں کے درمیان ازمنہ قدیم کی اخوت اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کی کوشش میں لگے رہے اور ترقی کرنے سے معذور ہو گئے۔ تجارت کا یہ حال تھا کہ عام بردہ فروش بھی ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے بجائے رزق حلال کی تلاش میں سرگرداں تھے...... لکھا تھا

قدم بوسی کی دولت نصیب ہوئی۔ حضرت شیخ عثمان خیر آبادی رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا وہ بہت بڑے بزرگ تھے۔ انہوں نے قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔

وہ غزنی میں رہتے تھے۔ سبزی پکاتے اور بیچتے۔ شلغم، چقندر اس قسم کی چیزیں دیگ میں پکاتے اور بیچتے تھے...... اگر کوئی شخص آپ کے پاس آتا اور کھوٹا درہم دے کر جو کچھ آپ کے پاس پکا ہوتا، اسے خریدنا چاہتا تو وہ اس سے کھوٹا درہم لے لیتے۔ اگرچہ انہیں پتہ ہوتا کہ درہم کھوٹا ہے لیکن وہ خریدار کے منہ پر کچھ نہ کہتے۔ نیز جو کھرا درہم لاتا، اسے بھی اسی طرح پورا سالن دیتے۔ حتیٰ کہ لوگوں کو گمان ہونے لگا کہ وہ کھوٹے اور کھرے میں امتیاز ہی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بہت سے لوگ آتے اور انہیں کھوٹے درہم دے کر چلے جاتے، وہ انہیں کھرا سمجھ کر لے لیتے۔ مگر ان پر ظاہر نہ کرتے اور انہیں سالن دے دیتے۔ جب ان کے انتقال کا وقت آیا تو انہوں نے اپنا منہ آسمان کی طرف کیا اور کہا ''اے خداوند تعالیٰ! تو دوسروں سے زیادہ آگاہ ہے کہ لوگ مجھے کھوٹے درہم دیتے تھے اور میں انہیں کھرا مان کر قبول کر لیتا تھا اور ان کو رد نہیں کرتا تھا۔ اب میں تیرے پاس اپنی کھوٹی عبادت لے کر حاضر ہو رہا ہوں، تو اسے اپنی عنایت سے قبول فرما لینا۔ اس کو رد نہ کرنا، تیری مہربانی!''

بعد ازاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک صاحب دل

درویش ان کے پاس آیا اور ان کی دیگ میں سے سالن طلب کیا۔ شیخ عثمان نے کفگیر دیگ میں ڈالا کہ اس سے شوربہ نکالے تو جب اسے باہر نکالا تو وہ موتیوں اور ہیروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر درویش نے کہا ''او بھائی میں انہیں کیا کروں!'' جب شیخ نے پھر کفگیر ڈالا اور دیگ سے باہر نکالا تو سرتاسر سونا برآمد ہوا۔ اس نے درویش نے کہا ''وہ سب سنگ ریزے تھے اور یہ سب سنگ ہے۔ میرے کس کام کے!...... اس دیگ میں سے کوئی دوسری چیز نکالو جو میں کھاؤں۔'' تیسری مرتبہ شیخ نے کفگیر دیگ میں ڈال کر نکالا تو وہی سبزی برآمد ہوئی جو اس دن انہوں نے پکائی تھی۔

اس درویش نے جب یہ دیکھا تو شیخ عثمان سے کہا کہ اب اس سے زیادہ تمہیں اس دنیا میں نہیں رہنا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ چند دنوں کے اندر اندر شیخ عثمان رحمتہ اللہ علیہ اس دنیا سے رخصت کر گئے۔

ان دنوں میں باقاعدگی کے ساتھ فٹ بال پول خریدا کرتا تھا۔ تنخواہ معمولی تھی لیکن میں اس کا ایک بڑا حصہ اس فٹ بال لاٹری پر خرچ کر دیتا تھا۔ اکیلا میں ہی نہیں ہمارے محلے کے سارے لوگ خریدتے تھے۔ ڈاکٹر بالدی، فیوریتی، ریانا، جواجی، سانیتا، جوپے، مارچا، ہم سب بیٹھ کر نتائج کے ساتھ اپنے نمبر ملاتے تھے اور خاک سیاہ ہو جاتے تھے کہ ہر بار ہر کسی کی ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی...... امیر ہونے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔ ہر کوئی ہر وقت اسی خیال میں رہتا تھا کہ اسے دولت ملے، بے شمار ملے اور چھپر پھاڑ کر ملے۔ میں نے تو آج تک نہیں سنا تھا کہ کوئی شخص اس دنیا میں ایسا بھی ہے جس کو دولت سے اور روپے پیسے سے رغبت نہ ہو اور وہ کڑچھے میں زر و جواہر اور سونا دیکھ کر اسے لینے سے انکار کر دے۔ میں نے تو آج تک جتنی کتابیں پڑھی تھیں اور جتنا لٹریچر کھنگالا تھا، اس میں انسان کی جبلتوں کے لاکھوں شیڈ بیان کیے گئے تھے۔ کہیں ایسی باتیں نہیں تھی جو اس کتاب میں نظر آئیں۔ دولت تو دولت یہ لوگ اپنی کسی خصوصی نعمت کو بھی بانٹنے یا پوری کی پوری اٹھا دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ لاہور میں ایک صاحب تھے جنہیں ''شیخ زندہ دل'' کہتے تھے۔ وہ بڑے بزرگ تھے۔ عید کے دن جب لوگ عید کی نماز پڑھ کر واپس لوٹے تو ان بزرگ نے آسمان کی طرف منہ کیا اور کہا ''آج روز عید ہے۔ ہر بندے اور بچے نے اپنے آقا، خواجہ اور بڑے سے عیدی لی ہے۔ مجھے بھی عیدی عطا ہو!''

جب انہوں نے یہ بات کہی تو آسمان سے ریشمی کپڑے کا ایک ٹکڑا نیچے آیا جس پر لکھا تھا کہ ہم نے تجھے دوزخ کی آگ سے فلاح دی!

جب لوگوں نے یہ دیکھا تو برکت حاصل کرنے کے لیے ان بزرگ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگے اور ان کی بہت عزت و تکریم کی۔ اسی دوران ان بزرگ کے دوستوں میں سے ایک دوست ان کے پاس آیا اور ان سے کہا ''آپ نے حضرت رب العزت سے عیدی لے لی،

اب مجھے آپ عیدی دیجئے۔"

اس بزرگ نے جب یہ بات سنی تو ریشمی کپڑے کا وہ ٹکڑا اپنے اس دوست کو دے دیا اور کہا "جاؤ یہ تمہاری عیدی ہے۔ کل قیامت کے دن میں جانوں اور دوزخ!"

محنت سے حاصل کی ہوئی چیز کو یوں الللے تللے کر کے ضائع کر دینا یہ بھی تو کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ پہلے اپنا حق اس کے بعد اپنی ذات کا حق، پھر اپنے وجود کا حق، اس کے بعد اگر کچھ بچے یا باقی رہ جائے تو اپنے خویش و اقارب کو دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اپنی ضرورت کے مقابلے میں دوسرے کی ضرورت کو اہم جاننا اور اسے مقدم گردانا علم اقتصادیات کے کسی بھی نوشتے میں موجود نہیں...... یہ کیسے لوگ تھے اور انہیں کیا ہو گیا تھا کہ دوسروں کا حق اپنے حق پر فائق سمجھتے تھے اور دوسروں کی زندگی برقرار رکھنے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دیتے تھے۔

پھر دولت کمانے اور رزق جمع کرنے کی طرف بھی ان کا کوئی دھیان نہیں تھا لیکن آنے والے وقت اور مستقبل سے پورے طور پر غافل ہو کر زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ ان کو پنج سالہ منصوبہ بنانے کی سمجھ تھی، نہ کوئی اقتصادی پلان مرتب کرنے کا علم تھا۔ بس جو زندگی میں مل گیا، اسی پر کفایت کر لی، جو جھولی میں گر گیا، اس کو نعمت کا پہاڑ سمجھ کر قبول کر لیا۔ عجب بے فکرے لوگ تھے کہ رزق کی تلاش میں سرگرداں نہ تھے اور مال و متاع کے حصول کے پیچھے بھاگتے دوڑتے نہ تھے۔ جو سامنے آ گیا اسے قبول کر لیتے تھے اور اپنی اس کم کوشی کو شیری اور پلنگی کا نام دیتے تھے۔

فرمایا مولانا حافظ الدین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ جس طرح شکاری کتے کو شکار کے لیے سدھایا جاتا ہے اسی طرح چیتے کو بھی شکار کرنا سکھاتے ہیں۔ البتہ چیتے کے ساتھ یوں شکار کیا جاتا کہ اسے شکار کی آمد و رفت کے راستے پر لے جاتے ہیں اور جب شکار نزدیک آتا ہے تو چیتے کو اس پر چھوڑ دیتے ہیں۔ چیتا جست لگاتا اور شکار پکڑ لیتا ہے۔ اس کے برخلاف کتے کو بہت دوڑنا پڑتا ہے۔ وہ شکار کے پیچھے دور دور تک دوڑا چلا جاتا ہے۔

مولانا حافظ الدین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ آدمی کو چند خصلتیں چیتے سے سیکھنی چاہئیں۔ ان میں سے ایک خصلت یہ ہے کہ چیتا کتے کی طرح رزق کے پیچھے بھاگتا نہیں۔ اگر اس کے سامنے کوئی چیز میسر آ جائے تو لے لیتا ہے ورنہ چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے چیتا جب شکار کے لیے نکلتا ہے تو اگر شکار ہاتھ آ جائے تو شکار کر لیتا ہے لیکن اس کا پیچھا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے لیے بہت زیادہ دوڑتا ہے...... اسی طرح آدمی کو بھی چاہیے کہ ضرورت کے مطابق رزق طلب کرے۔ نہ تو وہ بہت زیادہ طلب کرے اور نہ اس کے پیچھے پیچھے مارا مارا پڑے۔

یہ تو ہوئی اقتصادیات اور معاشیات کے علم کی کمی اور مستقبل کو کسی نامعلوم طاقت کے سپرد کر دینے کا نام۔ ان لوگوں نے اپنی جبلت اور خواہش کے خلاف بھی بند باندھ کر اپنی فطرت کا رخ موڑنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ فطرت اور جبلت تو اللہ کی مخلوق ہے۔ خدا نے ہر شے کی فطرت اور اس کے مزاج کو اپنی مرضی سے

اور اپنے حکم سے وضع کیا ہے۔ اس کے آگے بند باندھنے یا اس پر پابندی لگانے کو میں خدا کے کاموں میں دخل دینے کے مترادف سمجھتا تھا لیکن وہاں لکھا تھا:

ایک دفعہ ایک شخص دہلی سے اجودھن کی طرف روانہ ہوا تا کہ وہاں جا کر شیخ الاسلام بابا فرید گنج شکر کی خدمت میں تائب ہو...... راستے میں ایک لڑکھڑاتی ہوئی مطربہ اس کے ساتھ ہو گئی۔ وہ مطربہ بہت چاہتی تھی کہ اس شخص کے ساتھ اس کا تعلق ہو جائے اور وہ اسے پھانس کر اپنے راستے پر لگا لے لیکن وہ شخص چونکہ سچی نیت کے ساتھ تائب ہونے کے لیے اجودھن جا رہا تھا، اس لیے اس نے اس بدکار عورت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

راستے کی منزلوں میں سے ایک منزل پر ایسا بھی ہوا کہ وہ شخص اور مطربہ دونوں ایک ہی بہلی میں سوار ہوئے۔ وہ مطربہ آگے کھسک کر اس شخص کے نزدیک ہو گئی۔ اب چونکہ دونوں کے درمیان کوئی حجاب مانع نہ تھا، اس لیے اس حالت میں اس شخص کا دل چاہا کہ اس مطربہ سے بات کرے یا اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے۔ یہ فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ اس شخص نے دیکھا کہ ایک آدمی آیا اور اس نے اس کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا اور کہا تم توبہ کی نیت سے بابا فرید کی خدمت میں جا رہے ہو، یہ کیا حرکت ہے؟ وہ شخص فوراً متنبہ ہو گیا اور اس کے بعد اس نے اس عورت کی طرف نہ دیکھا نہ کسی قسم کی توجہ دی۔

الغرض جب وہ شیخ الاسلام بابا فرید کی خدمت میں پہنچا تو سب سے پہلی بات جو حضرت شیخ بابا فرید نے ان سے کہی، وہ یہ تھی کہ خدا تعالیٰ نے اس مشکل وقت میں آپ کی بڑی نگہداشت کی۔

میں جو کہ ایک بہت ہی چھوٹا افسانہ نگار تھا اور ابھی اس میدان میں بلوغت کو نہ پہنچا تھا۔ میں بھی لڑکھڑاتی مطربہ پر کمال کا بھڑکیلا افسانہ لکھ سکتا تھا لیکن اگر کہیں منٹو یا عصمت آپا اس پلاٹ پر ہاتھ ڈالیں تو "رتھ مستیالی" کے عنوان سے دنیائے ادب کو ایک یادگار کہانی دے کر جائیں لیکن افسوس کہ ایسی کتابیں ان کی نظر سے نہ گزری تھیں ورنہ وہ ایسے واقعات کے نفسیاتی تجزیے کے بعد انسانی فطرت پر ایک شش جہات تجسس زمانے کو عطا کرتیں۔

بھلا یہ کس طرح سے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک چنچل، نٹ کھٹ، شوخ مطربہ، ایک جوان آدمی کی ران سے ران ملا کر رتھ میں بیٹھی رہے اور جوان رعنا کی جبلت اپنے پورے پنجے کھول کر اس پر حملہ آور نہ ہو۔ کیسی ناقابل یقین اور انہونی سی بات ہے کہ وہ رتھ میں دو راتیں اور ایک دن کا طویل سفر گزار کر ویسے ہی دھلے دھلائے برآمد ہو جائیں۔ کم از کم ادب کی دنیا میں تو ایسے کبھی نہیں ہوا۔ ان مرشدوں، شیخوں، خواجوں، مخدوموں اور درویشوں کی زندگیوں میں ایسا ہوتا ہو تو ہمیں معلوم نہیں۔ معلوم ہو بھی تو ہمیں یقین نہیں۔ یقین ہو بھی جائے تو ہمارا اندر نہیں مانے گا۔

"فوائد الفواد" کی دنیا کے سارے آدمیوں کی ہر بات نرالی تھی۔ کوئی بھی ہم سے نہیں ملتا تھا۔ شکل و صورت وضع قطع، کلام و پیام، زندگی کا چلن اور انداز زیست ہم سے بالکل مختلف بلکہ ہمارے عین برعکس تھا۔ اس طرح کوئی شخص زندہ رہ

سکتا ہے بھلا؟ لکھا تھا۔

چند لمحے قضا وقدر کی طرف سے جو کچھ ہوا، اس کو تسلیم کرلے اور اس پر راضی ہو جائے۔
نہ شکوہ کرے، نہ طعنہ البتہ دے نہ ردّ وقدح کرے۔ اس موقع پر آپ نے ایک حکایت بیان کی کہ
ایک درویش بیٹھا ہوا تھا۔ ایک مکھی آئی اور آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی۔ درویش نے اس مکھی کو اڑایا
اور وہ پھر آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھر اسے اڑایا اور وہ پھر آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی۔
جب درویش نے تیسری مرتبہ اسے اڑایا اور وہ تیسری مرتبہ آ کر اس کی ناک پر بیٹھ گئی تو درویش
نے کہا "اے خدائے بزرگ و برتر، میں چاہتا ہوں کہ مکھی میری ناک پر نہ بیٹھے اور تو چاہتا ہے کہ
میری ناک پر بیٹھے۔ میں نے اپنی خواہش چھوڑی اور جو تیری خواہش ہے اس سے موافقت کر لی۔
اب میں اس مکھی کو اپنی ناک سے نہیں اڑاؤں گا۔" جب درویش نے یہ کہا تو مکھی اس کی ناک پر
نہیں بیٹھی!

یہ کام چور اور بے عمل لوگوں کی نشانی ہے۔ ہمارے مشرق میں اور ہماری تیسری دنیا میں کروڑوں افراد ایسے ہیں جنہوں نے کوشش، جدوجہد، عمل پیہم اور مسلسل محنت کا راستہ چھوڑ کر تسلیم و رضا اور فقر و استغنا کی چور بیٹھک دریافت کر لی ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی اس بے عملی کے منڈپ میں گزار کر "فوائد الفواد" جیسے لوگ اس دنیا میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے لوگوں کے قصے میں نے اپنے ماموں نذر کی زبانی سنے تھے لیکن بزرگوں کی جذباتی اور رقیق باتوں کا نہ کبھی میں نے بطلان کیا نہ ان پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ بس ہر وقت یہی پیش نظر رہتا تھا کہ اگلے وقتوں کے ہیں، یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو جو ے ولغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں!

گو اگلے وقتوں کے یہ سارے لوگ اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے لیکن ان کے احوال پڑھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا کہ انہیں اقتصادیات کے اسرار و رموز سمجھانے والا کوئی شخص بھی اس وقت موجود نہ تھا جو زر، افراط زر کے اصول ان کے ذہن نشین کرا کے انہیں ایک اچھی، خوشحال اور خوشگوار زندگی بسر کرنے پر مائل کرتا۔ یہ سارے لوگ یوں تو بڑی سمجھداری اور دانش کی باتیں کرتے تھے لیکن مال و دولت، دنیا اور رشتہ و پیوند کے سلسلے میں ان کا نشانہ ہر بار چوک جاتا تھا۔ چوک کیا جاتا، ان کا کوئی ہدف ہی نہیں تھا۔ بس ایسے ہی زندگی کی چاند ماری میں مصروف تھے، ایک حکم اور ایک فرض سمجھ کر ورنہ ان کو اس تعلق سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔

پھر کچھ دیر یہ گفتگو رہی کہ آدمی کو چاہیے کہ کسی سے کوئی چیز نہ مانگے، نہ زبان سے
مانگے، نہ دل میں یہ سوچ کہ اگر فلاں شخص مجھے کوئی چیز دے تو بڑا اچھا ہو لیکن اگر بغیر مانگے اور
بغیر اس کی خواہش کیے کوئی چیز اس کے پاس آئے تو وہ جائز ہوگی۔
پھر اسی کتاب میں لکھا تھا کہ:
ایک دفعہ کا ذکر ہے میں ایک ایسی جماعت کے پاس سے گزرا جو صوفیا کے لباس میں

ملبوس تھی۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا "میں نے رات اس طرح کا خواب دیکھا
ہے......" دوسرے نے اس کی تعبیر کرتے ہوئے کہا "یہ تو بڑا ہی اچھا خواب ہے جو تم نے دیکھا
ہے...... تمہارے حالات اچھے ہو جائیں گے۔ تمہیں اسباب دنیا مہیا ہوں گے۔ اور تمہاری
معیشت بہتر ہو جائے گی۔" میں نے چاہا کہ اس شخص سے کہوں کہ اے خواجہ! جس لباس میں تم ہو،
کیا اس لباس والے خوابوں کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں جیسی تم نے کی؟...... پھر میرے دل میں
خیال آیا کہ میں کون ہوں کہ اس طرح کی بات ان سے کہوں۔ یہ جانیں اور ان کا کام، چنانچہ میں
نے کچھ نہ کہا اور ان بزرگوں سے الگ ہو گیا۔

اس وقت چونکہ ہم کو نئی نئی آزادی ملی تھی اور ہم پارلیمانی جمہوریت کی عظیم نعمت سے بہرہ ور ہو رہے تھے، اس لیے بادشاہوں اور بادشاہت کے تصور سے اور ماضی کے اس خیال سے جن کے اندر بادشاہوں کی حکومتیں رہی تھیں، تھر تھر کانپ رہے تھے۔ شہنشاہیت اور ملوکیت کے اندر بادشاہوں نے جو ظلم انسانوں پر روا رکھے تھے، انہیں یاد کر کے ہماری روحیں کانپتی تھیں لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ ایسے تاریک ادوار گزر گئے تھے اور نسل انسانی امن و آشتی کے گہوارے میں جھوم رہی تھی۔

"فوائد الفواد" میں ایک ظالم اور جابر بادشاہ کا قصہ درج تھا کہ:

خلفاء میں سے ایک خلیفہ نے ایک نوجوان کو قید کر لیا۔ اس نوجوان کی ماں خلیفہ کے
پاس آ کر آہ وزاری کرنے لگی اور خلیفہ سے درخواست کرنے لگی کہ میرے بیٹے کو چھوڑ دو، وہ بے
قصور ہے۔

خلیفہ نے کہا، میں نے حکم دیا ہے کہ تیرا بیٹا اس وقت تک برابر قید میں رہے جب تک
کہ میری آل اولاد میں سے ایک فرد بھی باقی ہے۔ پھر اس نے خوفناک آواز میں کہا "کان کھول
کر سن لو بڑھیا کہ جب تک اس علاقے میں میرے خاندان کی حکومت ہے، تیرا بیٹا قید خانے سے
باہر کی ہوا میں سانس نہیں لے سکے گا۔"

بوڑھی عورت نے جب یہ بات سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا منہ
آسمان کی طرف اٹھا کر کہا "خلیفہ نے تو اپنا حکم سنا دیا، اب تو کیا حکم دیتا ہے کہ تیرے حکم کی منتظر
ہوں۔"

خلیفہ نے یہ بات سنی تو اس کا دل پگھل گیا۔ اس نے بڑھیا کے بیٹے کو رہا کرنے کا حکم
صادر فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرمان بھی جاری کیا کہ ایک قیمتی گھوڑا بڑھیا کے بیٹے کو مع خلعت کے دیا
جائے اور اس نوجوان کو گھوڑے پر سوار کر کے سارے بغداد میں پھرایا جائے اور اس کے آگے
آگے یہ اعلان کیا جائے کہ یہ نوجوان اللہ کے خلیفہ کی مرضی کے خلاف خود اللہ کی طرف سے آزاد کیا

گیا ہے اور یہ خلیفہ کی مرضی کے خلاف اللہ کی بخشش ہے۔

پھر اسی طرح کتاب میں ایک جگہ مجھے تھوڑی سی امید کی کرن نظر آئی لیکن آخری فقرے تک پہنچتے ہوئے وہ بھی ماند پڑ گئی۔ لکھا تھا:

> ترک دنیا یہ نہیں کہ کوئی شخص کپڑے اتار کر برہنہ ہو جائے اور لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے۔ ترک دنیا یہ ہے کہ وہ لباس بھی پہنے، کھانا بھی کھائے۔ البتہ جو کچھ اس کے پاس آئے اسے خرچ کرتا رہے، جمع نہ کرے۔ اس کی طرف راغب نہ ہو اور دل کو کسی چیز سے وابستہ نہ کرے۔

اب یہ بھی عجیب دورُخی ہے کہ کپڑے اتار کر برہنہ نہیں ہونا، لنگوٹ باندھ کر اور بھبوت مل کر جنگل میں بھی نہیں بیٹھنا۔ دنیا کو تیاگنا نہیں۔ اس دنیا میں انہی لوگوں کے درمیان رہنا ہے لیکن اس دنیا سے دل نہیں لگانا اور دل نہ لگانے کا آسان نسخہ یہ بتایا ہے کہ جو کچھ کمائے جو کچھ پاس آئے، اسے خرچ کرتا رہے۔ جمع نہ کرے۔ اس کی طرف توجہ نہ دے اور دل کو کسی چیز سے وابستہ نہ کرے!...... اب آپ ہی خیال فرمائیے کہ اس طرح سے کوئی ملک کوئی معاشرہ، کوئی گروہ ترقی کر سکتا ہے؟ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کا دامن چھوڑ کر زندگی بسر کرنا اور کرہ ارض پر سکونت اختیار کر کے اس خاکداں سے وابستگی ترک کر کے زندہ رہنا کبھی ممکن ہو سکتا ہے!

یہ سارے منطقی دلائل، دن بھر، قدم قدم پر میرا دامن تھام کر چلتے اور ہر ہر گام پر میرا خیال یقین میں تبدیل ہوتا رہتا لیکن جب رات آتی اور میں اپنے کمرے کی بتی بجھا کر بستر پر لیٹ جاتا تو باہر کی سٹریٹ لائٹس میری کھلی کھڑکی سے اندر داخل ہو کر در و دیوار پر کچھ عجیب قسم کے نقشے بنانے شروع کر دیتیں۔ میں پچھلے ڈیڑھ برس سے ان روشنیوں کا عادی مزے سے میٹھی نیند سوتا تھا اور کبھی مجھے اس بات کا احساس تک نہ ہوا تھا کہ میرے سامنے کی دیوار اور پاؤں سے اوپر کی چھت پر کچھ تصویریں بھی بنتی ہیں۔ ان میں حرکت بھی ہوتی ہے اور ان کے کچھ مطالب بھی ہیں۔

ان سایوں کو دیکھتے دیکھتے میں ایک ایسے وہم میں مبتلا ہو گیا کہ یہ سائے نہ صرف حرکت کرتے ہیں بلکہ بولتے بھی ہیں، میرے ساتھ نہیں، آپس میں گفتگو کرتے ہیں اور ان کی میٹنگیں ہوتی ہیں۔ اب وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں تھی، اٹلی کے بیچارے ڈاکٹر اسے کہاں سے فراہم کرتے! میں اس بیماری سے نکل نہ سکا۔ دن کو تو بالکل ٹھیک ٹھاک پورے طور پر نارمل رہتا لیکن رات کے وقت میرے کمرے میں ان سایوں کا میلہ سا لگ جاتا۔ پرانے سایوں میں کچھ نئے سائے آ کر شامل ہو جاتے۔ بیٹھے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ کھڑے ہوئے ایک طرف ہو کر راستہ دے دیتے۔ کچھ باہر نکل جاتے اور کچھ تھوڑی دیر بعد اسی راستے سے اندر آ جاتے۔

وہ کوئی انسانی شکلوں کے سائے نہ تھے۔ نہ ہی ان پر جانوروں کے وجود کا گمان ہوتا تھا، نہ ہی وہ اساطیری پیکر تھے۔ ان کا ڈول عجیب سا تھا۔ آپ انہیں سائے بھی نہیں کہہ سکتے، وہ کچھ علامتیں اور نشان سے تھے جو اپنی نشوونما کا انتظار کر رہے تھے...... میں ان سے کچھ اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ اس عین الیقین نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہمارے

حقیقت کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی ہے جس کا ہمیں پورا پورا ادراک نہیں۔ وہ جداگانہ اصلیت ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے اردگرد ہمارے قرب و جوار میں رہتی ہے لیکن ہمیں اس کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید وہ لوگ جو ''فوائد الفواد'' میں نظر آتے ہیں، ان کو اس حقیقت کا احساس ہو اور ان کو دونوں حقیقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنے کا فن آتا ہو اور ہم ان کے کرداروں کو اس لیے اچھی طرح سے نہ سمجھ سکتے ہوں کہ جب وہ ہمارے والی حقیقت سے نکل کر دوسری حقیقت میں داخل ہوتے ہوں تو ہماری گرفت سے نکل جاتے ہوں۔ غالباً ان کی ساری کیمسٹری تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ایک نئی ریاضیاتی مساوات میں ڈھل جاتے ہوں۔ یہ اور ایسی اور بہت سی بے معنی باتیں میرے اندر سے ہو کر جھنجھناتی ہوئی باہر نکل جاتیں جیسے شہوت کی لہر سارے بدن کی بنیادیں ہلا کر باہر نکل کے ارتھ ہو جاتی ہے۔

میں نے آپ سے کہا ناں کہ وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں تھی، اس لیے میں تھکا ہارا مشکلوں کا مارا جوں توں کر کے زندگی گزار رہا تھا۔ اوپر سے کچھ ان ہونے واقعات اس طرح سے ہو گئے تھے کہ ان سے پنڈ نہیں چھڑایا جا سکتا تھا۔ یہ واقعات میری محبوبہ کے وہ پیارے بچے تھے جنہیں لے کر وہ میرے گھر آ گئی تھی۔ اب میں ان کو گھر سے نکال تو نہیں سکتا تھا۔ وہ تو ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے بھی اچھے لگنے لگے تھے اور میری خوش آغوش کی طرح میرے بھی پیارے ہو گئے تھے...... بھلا آپ بھی یقین کر سکتے ہیں کہ بچپن سے پولیو کی شکار آنجلا اکیس برس بعد اٹھ کر اپنے پاؤں پہ کھڑی ہو جائے۔ سینٹ فرانسس آف اسزی کے مزار پر یہ کرامت رونما ہوا اور وہ اپنی وہیل چیئر وہیں چھوڑ کر پاؤں چلتی ہوئی آ کر اپنے نانا کی موٹر میں بیٹھ جائے۔ یہ سینٹ فرانسس جو گھر سے نکل کر جنگلوں میں جا بیٹھے تھے اور جانوروں سے باتیں کرتے تھے۔ ان کو ہمیشہ پیار سے مخاطب کیا کرتے کہ سن بہن لومڑی میری بات سن! بیٹا بھیڑیئے ذرا رک تو سہی، میں نے کئی دن سے تجھے دیکھا نہیں۔ خداوند سب کا پیٹ بھرتا ہے۔ اس قدر حرص و ہوا اچھی بات نہیں۔ آ جا بھائی بھالو آ جا...... اکیلے بیٹھے بیٹھے آدمی کا دل اُداس ہو جاتا ہے۔ میں نے تو تمہیں کئی دن سے نہیں دیکھا۔ اس گھنے اور سنسان جنگل میں اتنی دیر تک کون اکیلا رہ سکتا ہے۔ پھر چڑیوں، چکوروں، سارسوں اور کچھوؤں سے بھی ان کے طویل ڈائیلاگ ہوتے۔

آنجلا کے گھر والوں نے ایک مرتبہ پھر آسیزی جانے کا پروگرام بنایا کہ سب مل کر ایک مرتبہ پھر سینٹ کا شکریہ ادا کر سکیں اور آنجلا ان کے مزار پر مراقبہ کر کے مستقبل کی زندگی کے لیے تقویت حاصل کر سکے۔ جب سے آنجلا چلنے پھرنے لگی تھی، وہ لوگ سات مرتبہ سینٹ کے مزار پر حاضری دے آئے تھے۔ اب کی بار انہوں نے مجھے بھی زبردستی اپنے قافلے میں شامل کر لیا۔ میرا ایسی چیزوں پر بالکل اعتقاد نہ تھا اور میں مافوق الفطرت چیزوں پر اعتبار کرنے کو ذہنی، فکری، عقلی اور روحی کمزوری خیال کرتا تھا لیکن جب سے شہاب صاحب کے ساتھ ان کی قربت میں چھ سات روز گزارے تھے، میری توجہ کافی حد تک پلٹ کر ادھر ہو گئی تھی۔ گو انہوں نے نہ تو اس موضوع پر کوئی بات کی، نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ نہ مجھے نماز پڑھنے کی تلقین کی نہ حج پر ساتھ لے جانے کے لیے اکسایا۔ ہم تو کچھ اور ہی باتیں کرتے رہے۔ خراب خراب، ناگفتنی، جنسی ادب کے فروغ کے متعلق اور آزادی اظہار کی ضرورت کے متعلق۔ بس واپسی پر انہوں نے کچھ باتیں کی تھیں جو مذہب سے زیادہ سائنس کے بارے میں تھی۔ پھر یہ کیا ہونے لگا تھا کہ گاڑی پیچھے کو چلنے پر زور مارنے لگی تھی۔ مجھے ذرا

لگ رہا تھا کہ میں رجعت پسند ہو جاؤں گا اور جہاں سے دنیا چلی تھی، اس پتھر اور دھات کے زمانے میں پہنچ جاؤں گا۔

ہم نے کوسٹر کے اندر سبزی، چیز اور ٹیونا کے سینڈوچز کھائے اور تھرموس سے گرم گرم کافی پی۔ آنجلا کی ماں نے جلدی جلدی ساری چیزیں سمیٹ کر انہیں ڈبے میں پیک کیا۔ سر پر سیاہ رومال باندھا۔ پرس سے دعاؤں کی ایک چھوٹی سی کتاب نکال کر آنجلا کو دی اور دوسری خود پڑھنے بیٹھ گئی۔ آسیزی قریب آ رہا تھا۔ میں نے سر سے ٹوپ اتار کر زانو پر رکھا تھا اور آنجلا دونوں ہاتھوں کی کنگھی گود میں ڈال کر سیدھی ہو کے بیٹھ گئی تھی۔

میں نے سائیں فرانسس کے مزار کے سامنے کھڑے ہو کر دل ہی دل میں کہا ''کہو سائیں بابا مزاج اچھے ہیں؟ طبیعت خوش ہے؟ کیسا وقت گزر رہا ہے اور اب کن مدارج میں ہو۔ میری ان باتوں کا تو کیا جواب ملتا البتہ مجھے سائیں بابا کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ اپنے امیر کبیر باپ کے گھر میں عیش و عشرت کا لڑکپن گزار رہا تھا۔ نہ کوئی جھگڑا نہ جھیڑا نہ فکر نہ فاقہ، عیش ہی عیش، سرور ہی سرور۔

پھر ایک روز اس لڑکے کو بخار چڑھا اور لمبا ہی چڑھتا گیا۔ بڑے معالج بدلے لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ماں باپ کو جان کے لالے پڑ گئے۔ بخار ٹوٹا تو نہیں بیاری میں تبدیل ہو گیا۔ اس بیاری کے بخار نے بچے کو بالکل لاغر اور پامال کر دیا۔ والدین ڈاکٹروں کا پیچھا چھوڑ کر بچے سے دعا کرانے کے لیے اسے گاؤں کے گرجے میں لے گئے۔ وہاں نوجوان فرانسس کو مراقبہ میں یوں محسوس ہوا جیسے یسوع اس کے سامنے کھڑے کہہ رہے ہوں ''فرانسس واپس جاؤ اور میرے اس خراب خستہ گھر کو تعمیر کرو۔ دیکھتے نہیں ہو کہ سارے کا سارا ایک خرابے میں تبدیل ہو رہا ہے۔''

فرانسس اپنے گھر سے باپ کی نقدی چرا کر گرجے کی مرمت کے لیے مزدور اور مستری لے آیا اور اپنی نگرانی میں اس کی مرمت شروع کرا دی۔ باپ کو اپنے جمع جتھے میں سے جب ایک بھاری رقم کی کمی کا احساس ہوا تو اس نے نوجوان فرانسس پر سرقہ کا مقدمہ دائر کر کے اسے بشپ کی عدالت میں پیش کروا دیا...... یہاں سے باپ بیٹے کے درمیان ایک اصولی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں ماں نے شوہر کا ساتھ دیا کہ اس کا مستقبل دولت اور پرسکون زندگی سے وابستہ تھا۔

بشپ کی عدالت میں جب فرانسس کا مدعی باپ اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہا تھا تو فرانسس نے اپنے گھر کا عطا کردہ ریشمی لباس اتار کر وہ پھینکا اور اس کی جگہ ایک مزدور کی گدڑی پہن کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک علامتی لڑائی تھی جس میں فرانسس نے ہار نہ مانی اور ساری دنیا کے کہنے کے باوجود اپنی بات پر ڈٹا رہا...... اس کے بعد اس نے کسی قسم کی مذہبی تربیت یا فقہی مطالعے کے بغیر حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ جس کی بنیاد محبت اور صرف محبت تھی۔ فرانسس کی ساری طاقت اس کی سادگی اور معصومیت میں تھی۔ اس کو محبت پر اندھا یقین تھا اور اس کے سوا اس کا کوئی اور سہارا نہ تھا۔ محبت! محبت! محبت! بے غرض و غایت بغیر مقصود و مطلب، بغیر حرص و طلب صرف ہوا کے جھونکے جیسا تعلق اور نکہت گل جیسی قرابت!

سینٹ فرانسس آف آسیزی نے غریبی اور مفلسی کے ساتھ ایک گہرا تعلق پیدا کر لیا تھا اور وہ ہر وقت بے مائیگی اور بے زری کے گن گاتے تھے کہ پھانک اور پھکڑ لوگ آزاد، بے باک اور بے غم ہوتے ہیں۔ کسی کے محتاج اور دست نگر نہیں

ہوتے۔ ان کا سارا فلسفہ فقیری پر فخر کی بنیاد پر قائم ہے جو بے زری کی آزادی کو زرداری کی غلامی پر ترجیح دیتا ہے۔

جب آنجلا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور میں سینورواندی کا ہاتھ پکڑ کر گرجے کے اندر داخل ہوئے اور سینٹ کے مزار کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی فتح بلائی اور پھر وہ دونوں اور پوتی نواسی گھٹنوں کے بل ہو کر سر جھکا کے دعا مانگنے لگے تو میرے اندر ایک شدید جھنجھنی سی پیدا ہوئی، پتہ نہیں یہ اس ماحول کا اثر تھا۔ اس معجزے کا رد عمل تھا جس نے آنجلا کو اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا تھا۔ یا یہ اس خوف کا کچوکا تھا جو مجھے آنکھ مار کر کہہ رہا تھا کہ کچھ ہوش کر کیا کر رہا ہے یا شاید گرجے کے اندر آکسیجن کم تھی جس نے مجھے منہ بھر کے سانس لینے پر مجبور کر دیا تھا یا میرے اندر کچھ نہیں ہوا تھا اور باہر سے کسی کپکپی نے مجھے پکڑ لیا تھا، کچھ تھا ضرور جس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہ جھنجھنی ختم نہیں ہوئی تھی۔ خوفزدہ لڑکی کے پاؤں سے نکلی ہوئی جھانجھر کی طرح ڈھلوان چٹان پر بجتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا کیونکہ میں اس یاترا پر اندر سے کافی ڈر گیا تھا۔ پھر اٹلی میں بالعموم اور روم میں بالخصوص ایسے ایسے کہنہ مقامات کے ارد گرد سے گزرنا پڑتا تھا جہاں اور کچھ نہیں تو تاریخ ہی لوٹ لوٹ کر حملے کرتی رہی تھی۔ جب رومی اور یہودی مسیحیوں پر ظلم کرنے سے رک جاتے تو پھر تاریخ آگے بڑھ کر کچھ ایسے حالات پیدا کر دیتی کہ نیک نفس راہب اور برگزیدہ خلوت نشیں اپنی اپنی گوشہ گیریوں کے اندر ہی ختم ہو جاتے...... شہر روم کی سطح کے اندر بے شمار ایسے قبرستان ہیں جہاں ہزاروں لاکھوں عیسائی عارف، شیروں، چیتوں کے پھاڑے عیسائی غلام اور خوفزدہ چھپے ہوئے عوام دفن ہیں۔ جب ان چھپے ہوئے گروہوں کا کوئی فرد مر جاتا تھا تو وہ اس کو وہیں اپنے قریب اپنی گپھاؤں اور کمین گاہوں میں دفن کر لیتے تھے...... سینٹ اگنیز، سینٹ کالکس ٹس اور سینٹ سیبتاں کے گرجوں میں دور دور تک ایسے کیٹا کومز پھیلے ہوئے ہیں جن میں پرانے مردوں کی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے انبار لگے ہیں۔ نوجوان، شرارتی، فراخ نظر اور آسان گیر قسم کی لڑکیاں جب اپنے محبوبوں کے ساتھ ان گرجوں میں آتیں تو دیواروں کے ساتھ ساتھ لمبی لمبی کھڑکیوں سے ران یا کولہے کی کوئی بڑی سی ہڈی یا کھوپڑی اٹھا کر اپنے منگیتروں سے کہتیں یہ تمہارے پڑدادا کی کھوپڑی معلوم ہوتی ہے۔ تیسری صدی عیسوی کا یہ مذہبی بڈھا کانا تھا جبھی اس کی ایک ساکٹ سکڑی ہوئی ہے۔ لڑکے کولہے کی ہڈی اٹھا کر اپنی محبوبہ سے کہتے یہ تمہاری سکڑ نانی کے کولہے ہیں جو اپنی چوڑائی کی وجہ سے واضح اشارہ کرتے ہیں کہ تمہاری سکڑ نانی ایک بدمعاش عورت تھی اور اس کے اپنے گاؤں سے بھی باہر کئی یار تھے۔ پھر وہ زور کا ایک قہقہہ لگاتے اور کوئی پادری اپنی تسبیح ہاتھ میں لیے ان کے قریب آ کے اپنا تسبیح والا پنجہ اوپر اٹھاتا اور کچھ کہے بغیر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ اس پر وہ پہلے سے بھی زیادہ اونچا قہقہہ لگاتے اور پوچھتے ''پادری جی اس ران کی ہڈی والے کی روح کہاں گئی؟'' پادری غریب اس بات کا کیا جواب دیتا! موٹے موٹے چپلوں والے گورے گورے پاؤں اٹھاتا واپس اپنے صومعہ میں چلا جاتا۔ ان دنوں چونکہ میری زبان بھی خوب چلتی تھی، اس لیے میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس ناسزا گوئی اور توہین مقدمات میں برابر کا شریک ہوتا۔

لیکن اب مجھے ان کیٹا کومز سے اور زیر زمین پھیلے ہوئے ان قبرستانوں سے خوف آنے لگا تھا۔ پہلے جو میرا چہرہ بارے کا پورا ادھر تھا، اب آہستہ آہستہ رخ بدلنے لگا تھا اور مجھے اس بات کا سخت افسوس تھا کہ میں ترقی خواہ ہونے کے

بجائے اور یورپ سے استفادہ کرنے کے بجائے واپس اپنی ماں کی گود کی طرف دیکھنے لگ گیا تھا۔ اس قدر اوپر پہنچ کر پھر نیچے کی طرف دیکھنے لگ جانا اور نیچے کے نظاروں میں کھو کر ان میں انہماک پیدا کر لینا کیسے انحطاط، کس قدر پستی اور تنزل رتبہ کی بات ہے! لیکن پے در پے کچھ واقعات نے کچھ بولتے اور کچھ خاموش واقعات نے مجھے مجبور سا بنا کے رکھ دیا تھا۔ اب میں زیادہ مزاحمت نہیں کرتا تھا۔ مدافعت نہ کرتا تھا اور معترضین کی صف سے نکلتا جا رہا تھا۔

جب میں نے آنجلا کے معجزے کا واقعہ پروفیسر انگاریتی کو سنایا اور ان سے خرق عادت اور کرامت وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے سر جھکا کر کہا ''فلسفی اور دانشور تو معجزے کی تردید کرتے ہیں اور اس تردیدی اور ابطالی دعوے میں سب سے اول نمبر پر ڈیوڈ ہیوم ہے جو ایک بہت ہی لائق اور عمیق فلسفی ہونے کے رشتے سے ہیں۔ اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم بھی اس کا ساتھ دیں لیکن سائنس دانوں کا رویہ فلسفیوں سے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کوئی بات، کوئی واقعہ، کوئی حادثہ قانون قدرت کے خلاف رونما نہیں ہو سکتا۔ ''لاز آف نیچر'' طے شدہ ہیں اور ان میں کسی صورت میں بھی رد و بدل نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ ہم سارے ''لاز آف نیچر'' سے واقف نہیں ہیں اس لیے ہم اس ممکنہ صورت سے اجتناب نہیں کر سکتے کہ ایک نامعلوم ''لا آف نیچر'' نے طے شدہ قانون قدرت پر سبقت حاصل کر کے اسے ناکارہ کر دیا اور اس کی جگہ خود متمکن ہو کر قائم ہو گیا۔''

میں نے کہا ''استاذی مکری آپ کی یہ بات بالکل دل کو لگتی ہے اور اس میں منطقی جواز نظر آتا ہے لیکن یہ معجزہ اصل میں ہے کیا؟''

انہوں نے ذرا رکتے رکتے کہا ''میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فعل، کوئی عمل یا کوئی واقعہ جو فوق بشری بینش یا مافوق انسانی خبر گیری کی دلالت دے...... میرا مطلب ہے دلالت ضمنی فراہم کرے، اس کو ہم معجزے اور کرامت کی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔''

''لیکن سر! ہیوم کہتا ہے......'' میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی ''کہ انسان کتنی بھی شہادتیں فراہم کر لے، وہ معجزے کو ثابت نہیں کر سکتا...... شاید یہی وجہ ہے سر کہ بڑے بڑے دانشوروں اور سائنس دانوں نے بھی اس مفروضے پر بلا تحقیق ایمان رکھا اور اس کے وجود کو اپنے لیبارٹری میں لے جا کر پرکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

پروفیسر انگاریتی نے آنکھیں بند کر کے اور سر اوپر اٹھا کے کہا ''اس کی وجہ شاید یہ ہے...... اور یہ میری سوچ نہیں پروفیسر رکٹ کا نظریہ ہے کہ آج کی خلاف عقل، بعید از قیاس اور غیر اغلب باتیں آنے والے کل کی بنیادی سچائیاں ہوں گی۔ دنیا کے سب سے بڑے سائنس دان نیوٹن کو اپنا نظریہ متعارف کرانے کے لیے اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ اس نے رنجیدہ ہو کر گلوگیر انداز میں کہا ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو انسان کوئی نئی شے سامنے لانے کا تہیہ ہی نہ کرے اور اگر کر لے تو پھر ساری عمر اس عذر داری اور اس کی تائید کا غلام بن کر گزارے۔''

میں نے کہا ''مائیسترو (meastro) جب ہمارا گیلیلو زمین کی گردش کا دعویٰ کر بیٹھا تھا تو اس پر کیا گزری تھی۔''

انہوں نے بات کاٹ کر کہا ''یہ بات تو ساری دنیا جانتی ہے اشفاق! لیکن جب گیلیلو بیچارہ اپنی دور بین ٹھیک کر کے کہتا تھا، اس میں ایک مرتبہ دیکھو تو سہی تم کو دور کی چیزیں نزدیک نظر آئیں گی اور ستارے تمہارے بالکل قریب

آ جائیں گے تو بڑے بڑے جید عالم اور نامی گرامی فلسفی یہی کہا کرتے تھے کہ ہم نے بڑی دیکھی ہیں ایسی مرلیاں۔ خوب بجتی ہیں۔ تیری مرلی تو بجنے کی بھی نہیں، اس میں تو پھونک مارنے کو بھی کوئی سوراخ نہیں! چل بھاگ یہاں سے...... تم مضبوطی سے جمی ہوئی دھرتی کو حرکت میں لا کر ''لا آف نیچر'' کو توڑنا چاہتے ہو؟ تم احمقوں کے سردار اور جاہلوں کے سرخیل ہو۔''

میں نے کہا ''سر ہمارے گالوانی کو بھی تو لوگ چوراہوں پہ نعرے مار مار کے چھیڑا کرتے تھے کہ مینڈک کا نچیا آ گیا۔ مینڈک کا مداری آ گیا اور اب گلوینو میٹر کے بغیر کوئی لیبارٹری کوئی ورکشاپ مکمل ہی نہیں۔''

''فرانس کی رائل سائنس اکیڈمی کے چیئرمین نے کہا......'' یہ بات کہہ کر پروفیسر انگاریتی رکے اور بولے ''فرانس کی رائل سائنس اکیڈمی ہے یا خالی سائنس اکیڈمی؟''

میں نے کہا ''سر خالی سائنس اکیڈمی آف فرانس ہی ہوگی۔ رائل کا لفظ ان کے ذیل میں کہیں بھی نہیں آتا۔''

کہنے لگے ''سائنس اکیڈمی آف فرانس کے چیئرمین نے کہا کوئی عقل کی بات کرو، اور سائنس دان ہوتے ہوئے فرضی باتیں چھوڑ دو۔ اڑن کھٹولے اور اڑن غالیچے صرف کہانیوں میں مل سکتے ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں نہیں۔ فزکس کا سیدھا سا اصول ہے کہ ہوا سے بھاری کوئی شے ہوا میں اڑ نہیں سکتی۔ پھر ہوائی جہاز بنانے کی باتیں کیوں ہو رہی ہیں۔ افسونوں کی جنت سے باہر نکل آؤ اور الف لیلوی باتیں چھوڑ دو۔ ہوائی جہاز کا بننا ''لاز آف نیچر'' کے خلاف ہے۔ قدرت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنا قانون توڑنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

''لیکن اس اصول کو توڑ کر ہوائی جہاز بنا......'' میں نے کہا ''اور اب تک اڑ رہا ہے اور اب تو اس کی اڑانیں کرۂ ارض کے ارد گرد روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔''

کہنے لگے ''اب نفسیات دان یہاں تک کہتے ہیں کہ ذہن انسانی حتیٰ کہ لاشعور ذہن، بدن پر اور وجود پر اور جسم پر پوری طاقت سے حاوی ہے اور اس کا اختیار دوسری تمام چیزوں سے قوی تر ہے جن کو سائنس دان میکینکل تھیوریوں کی بنا پر آج تک مادے کے حوالے سے قوی اور بااختیار سمجھتے رہے...... چنانچہ بہت سے سائنس دان اب شیکسپیئر کے اس ڈائیلاگ کے قائل ہو گئے ہیں جو ہیملٹ میں کہتا ہے کہ سن اس دنیا میں زمین و آسمان کے مابین بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو نہ تو ہم جانتے ہیں اور نہ فی الحال انہیں سمجھ ہی سکتے ہیں...... اب باہر سے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کافی مشکل ہے کہ کونسے واقعات معجزے کے ذیل میں آتے ہیں اور کونسے قدرتی نوعیت کے ہیں۔''

پروفیسر انگاریتی نے اسکندریہ میں اپنی جوانی کے ایام کو یاد کرتے ہوئے کہا ''اسلام اصول نظری اور فرض علمی کے طور پر معجزے کو تسلیم کرتا ہے لیکن پیغمبر خداؐ نے معجزے دکھانے سے کلی طور پر انکار کر دیا اور اپنی امت کو بتایا کہ اللہ اپنی قوت کاملہ سے کچھ بھی کر سکتا ہے لیکن ایسا سب کچھ اس کے اختیار میں اور اس کی قدرت میں ہے۔''

پھر انہوں نے رکتے رکتے کہا ''میرا ذاتی خیال ہے کہ عقیدے، اعتقاد اور دلیل واستدلال میں کوئی اختلاف نہیں، میرا مطلب ہے سائنس اور اعتقاد و ایمان میں کوئی تضاد نہیں، کوئی ضد نہیں۔ وہ خدا بزرگ و برتر جو اپنے آپ کو

آشکار کرتا ہے (وحی یا کلام کے ذریعے) وہی خدا ہے جس نے یہ طبعی دنیا بنائی ہے اور اس کے ساتھ انسانی ذہن بھی تخلیق کیا ہے تو ایسا خدا، نعوذ باللہ اپنے آپ کی مخالفت یا اپنی خلاف گوئی نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ معجزے اور کرامات قدرت کی راہ میں ایک مداخلت یا قوانین قدرت کی روش و جہت میں توقف اور تعطیل ضرور ہیں لیکن یہ قوانین قدرت کا بطلان نہیں کرتے اور یہ کسی مذہبی ضرورت کے تحت عمل میں آتے ہیں۔"

پروفیسر انگاریتی کمال کے استاد تھے۔ اپنی تعلیم تو وہ کسی بھی لحاظ سے پوری نہ کر سکے تھے لیکن ان کی نظر بڑی عمیق اور مربوط بہ موضوع ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ ان کو کشف بھی ہوتا تھا۔ وہ شاعر کے علاوہ ایک صاحب کشف بزرگ بھی تھے جن کی صحبت میں بہت سے اسرار آپ سے آپ کھلتے جاتے تھے۔

میں جب ان کے گھر سے لوٹا تو ہفتہ کی شام ہونے کی وجہ سے ٹریفک کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ جو کورسو اور تو کے درمیان سان کارلو گرجے کے پاس راستے کی ایک قینچی سی بنتی ہے وہاں کافی دیر رکنا پڑتا ہے اور بتی کے انتظار میں صبر کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ بتی کی تبدیلی کے انتظار میں قینچی پر کھڑے کھڑے مجھے نیلا گنبد میں ربڑ کی مہریں بنانے والوں کی دکان اچانک یاد آ گئی جہاں سے میں روز گزرا کرتا تھا۔ گورنمنٹ کالج سے واپسی پر میرے گھر کا رستہ نیلا گنبد سے ہو کر لی ہاؤس تک جاتا تھا۔ یہاں گھنٹہ دو گھنٹے گزارنے کے بعد میں اے جی آفس کے پہلو میں واقع اپنے گھر پہنچتا۔ ہر روز ماں سے جھگڑا ہوتا کہ میں نے روٹی نہیں کھانی نہ پکایا کریں۔ ہر روز وہ میرے لیے روٹی پکاتیں اور رات کو وہی کھا کر سو جاتیں۔ میں قینچی شش راہے پر کھڑا اپنے گھر کو، اپنی ماں کو اور مہریں بنانے والی اس دکان کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک بڑے سائن بورڈ پر بہت ہی بڑی قینچی بنی تھی اور اس کے نیچے جلی قلم سے "اُدھار محبت کی قینچی ہے" لکھا تھا۔ میں اس بورڈ کو دیکھ کر ہر روز چڑتا تھا کہ یہ سلوگن اب اتنا پرانا ہو گیا ہے، اس میں کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی۔ پھر مولوی صاحب نے اسے اپنی دکان پر کیوں لٹکا رکھا ہے۔ ہر شام اتنے بڑے بورڈ کو اٹھا کر اندر رکھتے ہیں اور ہر صبح آ کر پھر لٹکا دیتے ہیں۔

اب میرے شش راہے کا راستہ کھل گیا تھا اور مجھے وہ بزرگ یاد آنے لگے تھے جن کے پاس تین چار مرتبہ میرے اباجی اور میرے ماموں نذر محمد مجھے پکڑ کر لے گئے تھے۔ ان کا قیام ربڑ کی مہروں والی دکانوں کے پیچھے تھا اور وہ نیلا گنبد مسجد میں درس دیتے تھے۔ بڑے اچھے، شفیق، حلیم، خوش وضع اور خوش پوش بزرگ تھے۔ چہرے پر طمانیت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آنے جانے والوں کے ساتھ بڑی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ ملتے لیکن دین کے معاملے میں بڑے سخت تھے اور اس میں کسی قسم کی رعایت دینے پر مائل نہ ہوتے تھے۔ تقریباً سارا لاہور ان کا گرویدہ تھا اور ان کا درس سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ خود میرے ماموں جو اوکاڑہ میں قیام پذیر تھے، محض ان کا درس سننے کے لیے لاہور آتے اور پھر الٹے پیروں واپس چلے جاتے۔

اباجی نے اور ماموں نذر نے بڑی کوشش کی کہ میں بھی ان کی طرح اس بزرگ کا گرویدہ ہو جاؤں لیکن وہ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دراصل اس زمانے میں ہر ذہین طالب علم تھرڈ ایئر میں سوشلسٹ ہو جاتا تھا۔ کوئی کوئی کمیونسٹ بھی بن جاتا اور کندھے پر تھیلا لٹکا کر موٹے موٹے سٹریپ کے چپل پہن کر اور آنکھوں پر لائبریری فریم کی عینک

لگا کر اپنے ساتھیوں میں کچھ اونچے درجے کی چیز بن جاتا تھا۔ ٹی ہاؤس میں ہم مذہب کی خرابیوں، فتنہ سازیوں اور تخریب کاریوں کے قصے بیان کیا کرتے۔ ان دنوں ہر گفتگو اس فقرے سے شروع ہوتی کہ "مذہب عوام الناس کے لیے افیون ہے" اور آخر میں اسی فقرے پر ختم ہو جاتی۔ پھر ہم اپنے اپنے گھر چلے جاتے اور مضبوط جلد کی، سفید کاغذ والی، تصویروں سے مزین وہ سستی کتابیں پڑھتے جو روس سے آتی تھیں اور ڈیڑھ دو روپے میں مل جاتی تھیں۔ ایسی کتابوں کی لاگت تو پچاس ساٹھ روپے سے کم نہ ہوتی لیکن ماسکو اشاعت گھر انہیں مالی کمک دے کر برائے نام قیمت پر بیچتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مولویوں کے درس، جمعہ کی نمازیں، دینی جلسے، رجعت پسندی کے بے معنی نمونے نظر آتے تھے۔

ماموں نذر نے بتایا کہ یہ جو مفتی صاحب ہیں، یہ ایک بزرگ کے شاگرد ہیں جو دنیائے اسلام کے بہت بڑے عالم تھے۔ وہ بزرگ یہاں سے بہت دور تھانہ بھون میں رہتے تھے اور ان کا نام اشرف علی تھانوی تھا۔ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے چوٹی کے عالم تھانہ بھون آ کر مولوی صاحب سے تربیت حاصل کرتے رہے ہیں اور واپس جا کر ان کے پیغام کو دنیا بھر میں پھیلاتے رہے ہیں۔ پھر میرے ماموں نے اپنی محبت کا ہاتھ عقیدت کے دل پر رکھ کر کہا "اور یہ جو ہمارے مفتی محمد حسن صاحب ہیں، یہ مولانا اشرف علی تھانوی کے چہیتے شاگردوں میں سے ہیں۔"

مجھے اور میرے بڑے بھائی کو شہر بھون کے ساتھ "تھانہ" کے لفظ نے بڑے منفیانہ انداز میں متاثر کیا اور ہم ہر رات تھانہ تھانہ اور بھون بھون کے نعرے لگانے لگے۔ میری ماں اور میری آپا کو یہ بکاریں کچھ اچھی نہ لگیں۔ انہوں نے اپنے دھیمے انداز میں ہمیں روکنے کی کوشش کی لیکن ہم اور شیر ہو گئے۔ میرے بڑے بھائی نے بتایا کہ اس علاقہ میں ایک بڑا تھانہ ہے جہاں مولویوں اور ملوانوں کو بلا کر بید سے ان کی مرمت کی جاتی ہے اور الٹا لٹکا کر ان کی چھترول ہوتی ہے۔ میں نے کہا "یار بھائی! وہاں تو ہمارے پیارے ماموں بھی گئے تھے، بیعت ہونے!" تو بھائی نے کہا "ان کی بھی مرمت ہوئی تھی اور پورے چھ روز تک ان کو تھانہ میں رکھا گیا تھا۔" مجھے اس بات پر تھوڑا سا افسوس بھی ہوا لیکن ہم کیا کر سکتے تھے۔ یہ ماموں جان کا اپنا چوائس تھا۔

یہ جو مفتی محمد حسن صاحب تھے، ان کی ٹانگ پر کوئی پھوڑا تھا۔ بہت ہی زہریلے قسم کا جس کی جڑیں ان کی ٹانگ کے اندر دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ میرے اباجی اور ماموں جب بھی ملتے، جہاں بھی ملتے اور جب بھی کوئی بات کرتے، وہ مفتی صاحب کی بیمار ٹانگ کے بارے میں ہوتی۔ میرے اباجی چونکہ امراض جلدی کے ماہر ڈاکٹر تھے، اس لیے انہوں نے اپنا پورا زور لگا کر تین مرتبہ ایسے مرہم تیار کیے جن سے شفا لازمی تھی اور جن کی دو پٹیوں کے بعد ہی مفتی صاحب کی بیمار ٹانگ میں صحت مندی کے آثار نمایاں ہو جانے تھے لیکن ان کی ہر پٹی ناکام رہی اور ہر مرہم بیماری کا بال بھی بیکا نہ کر سکا..... یہ دونوں بزرگ مفتی صاحب کی ماؤف ٹانگ کا اس دردمندی کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور اس ذکر میں ان کی بیماری کی ایسی ایسی تفصیلات سامنے آتی تھیں جنہیں سن کر ہم جیسوں کے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔

اباجی بتاتے تھے کہ مفتی محمد حسن صاحب کی ٹانگ پر ایک ایسا زہریلا پھوڑا تھا جس سے کچی رطوبت خارج ہو ہو کر ان کی ساری ٹانگ میں سرایت کر گئی تھی۔ اس زہر نے پوری پنڈلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جلد کی حالت ایسی

ہوگئی تھی جیسے بھڑوں کا چھتہ ہو۔ یہ ایسا کریہہ اور تکلیف دہ منظر تھا کہ مفتی صاحب کسی کو اپنی بیمار ٹانگ دیکھنے نہیں دیتے تھے۔ کمرہ بند کر کے یا تو خود اس کی مرہم پٹی کرتے یا کسی معتقد سے کراتے۔ میرے والد نے کئی مرتبہ ان کے ناسور کو دیکھا تھا اور بحیثیت ایک ڈاکٹر کے جو کچھ بھی اس لیے تجویز کیا تھا، وہ سب اکارت ثابت ہوا تھا اور ٹانگ کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جارہی تھی۔

مفتی صاحب ایک شدید اور جانکاہ تکلیف میں سے گزر رہے تھے اور ان کے چاہنے والے اس صورتحال سے اور بھی پریشان ہوتے تھے کہ جب مفتی صاحب سے بیماری کا حال پوچھا جاتا تو ہمیشہ "الحمدللہ" کہہ کر یہی فرماتے تھے کہ پہلے سے بہتر ہے۔ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے۔ باقاعدگی سے درس دیتے اور آنے والوں کے ساتھ حق میزبانی خندہ پیشانی کے ساتھ ادا کرتے۔ میرے اباجی کا خیال تھا کہ ٹانگ فوراً کٹنی چاہیے کیونکہ ناسور کا زہر سارے جسم میں پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ حکیم محمد حسن قریشی اور ڈاکٹر جمعیت سنگھ، پروفیسر میڈیکل کالج لاہور کی بھی یہی رائے تھی۔ اس کے علاوہ اور بہت سے معالجین تھے جن کی یہی رائے تھی کہ ٹانگ فوراً کاٹ دینی چاہیے۔

چنانچہ معالجین کے اصرار پر مفتی صاحب ٹانگ کٹوانے پر رضامند ہوگئے۔

سرجری میں لے جا کر اور مفتی صاحب کو آپریشن ٹیبل پر لٹا کر جب ڈاکٹروں نے انہیں بے ہوش کرنے کے لیے ٹوپی چڑھانا چاہی اور ٹیکہ دے کر بے سدھ کرنے کی تیاری کی تو مفتی صاحب نے فرمایا "اس کی ضرورت نہیں، مجھے میرے حال پر چھوڑ کر اپنا کام شروع کیجیے۔"

اب ڈاکٹر، سرجن، انتھیسی اسسٹنٹ حیران کھڑے ہیں اور مفتی صاحب اصرار کر رہے ہیں کہ داروئے بیہوشی دینے کی چنداں ضرورت نہیں، آپ اپنا کام جاری کریں۔

سب ڈاکٹر حضرت کے جاننے اور ماننے والے تھے جو نہیں جانتے تھے، ان پر مفتی صاحب کے روحانی جاہ و جلال کا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ وہ بھی کچھ نہ بول سکے۔ چنانچہ مجبوراً بے ہوش کیے بغیر ران کاٹنا شروع کی۔ ڈاکٹر امیر الدین سرجن ران کاٹ رہے تھے۔ انتھیسی اسٹ نبض ہاتھ میں لے کر خوفزدہ بیٹھے تھے اور چھوٹے ڈاکٹر اور طالبعلم حیرت سے یہ انوکھی سرجری دیکھ رہے تھے۔

اس آپریشن میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا اور مفتی صاحب جس بشاشت کے ساتھ آپریشن روم میں داخل ہوئے تھے، اس سے بہتر پررونق اور منور چہرہ لے کر سٹریچر پر باہر نکلے......ایک مرتبہ باتوں باتوں میں مفتی صاحب نے خود بتایا کہ جب میری ٹانگ کاٹی گئی تو ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ میں جانبر نہیں ہوسکوں گا۔ ڈاکٹر امیر الدین صاحب بھی گھبرائے ہوئے تھے اور ٹانگ کاٹ رہے تھے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر بھی خوفزدہ تھے اور ٹانکے لگا رہے تھے اور کرنل ڈاکٹر ضیاءاللہ صاحب نبض ہاتھ میں لیے حیران ہورہے تھے کہ ابھی زندگی کے آثار باقی ہیں۔ وہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں بھی پریشان ہوں گا لیکن میرے لیے تو یہ یوم عید تھا۔

کوئی صاحب جوان کے آپریشن کے بعد بیمار پرسی کے لیے آئے تھے، ان سے کہا "دیکھیے حضرت! انسان پر

جو حالات آتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایسے حالات جو طبیعت کے مطابق ہوں اور خوش کن ہوں۔ دوسرے وہ حالات جو طبیعت کے منافی ہوں اور ناگوار ہوں تو ان حالات میں عبدیت یہ ہے کہ یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ مجھے قرب عطا فرمانا چاہتے ہیں۔ خوشگوار حالات پر تو شکر کروں گا اور ناگوار حالات پر صبر کروں گا۔"

یہ سب باتیں میرے ماموں اور میرے اباجی نے میری بڑی آپا کو بتائی تھیں جو مفتی صاحب کی معتقد اور گرویدہ تھیں اور ان کے بارے میں ایک ایک بات سنبھال کے رکھتی تھیں۔ ان کی کاپی میں مفتی صاحب کے بہت سے ملفوظات بھی درج تھے جنہیں وہ باقاعدگی کے ساتھ پڑھ کر یاد کیا کرتیں۔

مفتی صاحب کی ٹانگ کٹنے کے بعد مجھے اپنے دونوں بزرگوں کی معیت میں صرف ایک بار ان سے ملنا نصیب ہوا اور اس مرتبہ مجھ پر ان کے عزم و استقلال اور خدا پر کامل اعتقاد و اعتماد کا بڑا رعب طاری تھا۔ کچھ عجیب بات تھی کہ جب تک میں ان کی خدمت میں حاضر رہا، میرے اندر کوئی منفی خیال اور باہر کوئی گستاخ جملہ وجود میں نہ آسکا۔

اب میں پروفیسر انگاریتی کے گھر سے اپنے گھر کو جارہا تھا اور راستے میں سڑکوں کی قینچی سے ادھار کی قینچی پر ہوتا ہوا حضرت مفتی محمد حسن کے نیلا گنبد میں پہنچ گیا تھا اور مجھے آنجلا کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب کی زندہ ٹانگ کٹنے کا معجزہ ایک ایک تفصیل کے ساتھ سامنے آرہا تھا جس میں حضرت نے کلوروفارم لینے کے بجائے یا بے ہوش کے برعکس اپنے آپ کو پورے کا پورا اللہ کے حوالے کر دیا تھا اور پورے کے پورے ہوش و حواس کے ساتھ سرجنوں اور ڈاکٹروں سے اپنی زندہ ٹانگ کٹوائی تھی۔ میں اس کو جب بھی ایک معجزہ قرار دیتا تھا، میرے ماموں ٹوک کر اسے بزرگان دین کی کرامت کہہ کر میری تصحیح کرتے!

ان دونوں واقعوں کا میں چشم دید گواہ تھا، پھر بھی میری عقل تسلیم نہ کرتی تھی کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ یہ میری تربیت کا اثر تھا۔ میرا مشاہدہ کچھ اور تھا اور میری تربیت اس سے مختلف انداز میں ہوئی تھی۔ میں اپنے مشاہدے پر غور کرنے کے بجائے اپنی تربیت کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ ہر بچ ڈال تربیت و تہذیب کی ہری ڈال پر رٹو طوطا ایک ہی بول بول رہا تھا۔ ہر جھونٹے پر ایک سے پر تول رہا تھا۔ اوپر نیچے ڈول رہا تھا۔ "جگ جگ جی! جگ جگ جی" پیرزادہ ابراہیم حنیف کہا کرتے تھے "بھیڑوں میں بھیڑ بلی رہ، آرام سے گزر ہو جائے گی، اپنا راستہ الگ سے طے کرو گے تو گلے کی بھیڑیں روند کے مار دیں گی۔ بھیڑیے کی ضرورت ہی نہ رہے گی......"

پھر اس کم عمری میں مجھ پر ایک اور حملہ ہوا۔ وطن سے دور، عزیز و اقارب سے پرے اور اپنوں سے بعید مجھ میں اس حملے کو برداشت کرنے کی تاب تو نہ تھی لیکن سہ گیا اور اس یورش سے زندہ و سلامت برآمد ہو کر پھر اپنے کام کاج میں لگ گیا...... سر الیگزینڈر فلیمنگ ہماری یونیورسٹی میں لیکچر دینے آئے تھے اور انہوں نے شعبہ سائنس میں تین بصیرت افروز لیکچر دے کر سب پر اپنی ذہانت کا سکہ جما دیا تھا۔ مزاج کے نرم، گفتگو کے دھیمے، آواز کے سریلے، انداز کے شرمیلے اور مسکراہٹیں بکھیرنے کے تخیر تھے۔ گو ان کا موضوع میرا سبجیکٹ نہیں تھا پھر بھی ان کی باتوں میں کچھ ایسی موہنی تھی کہ میں ان کے تینوں لیکچروں میں حاضر رہا اور ان پر اپنی عقیدت نچھاور کرنے کو بار بار رجسٹر کراتا رہا۔

دراصل وہ عمر کے آخری حصے میں روم اور روم کے گرجے اور روم کی مذہبی اور روحانی فضا سے لطف اندوز ہونے آئے تھے اور جیسا کہ دستور ہے کہ کوئی اتنا بڑا آدمی شہر میں آئے اور اس شہر میں ایک دانش گاہ بھی ہو تو اور اس بڑے آدمی کی شہرت اور عزت علم کی بنا پر ہو تو طالب علم اور اساتذہ ایسے ودوان کو اپنی یونیورسٹی ضرور کھینچ لاتے ہیں کہ علم کے بھنڈارے کچھ دان دکھشنا ہم کو بھی عطا ہو۔ چنانچہ ہم نے سر فلیمنگ کو بھی اپنی یونیورسٹی میں کھینچ لیا۔

سر الیگزینڈر فلیمنگ صرف ایک عام سائنس دان اور سائنسی علوم کے استاد ہی نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے ایک مہاودوان اور عالم باعمل تھے۔ انہوں نے پینسلین جیسی شے دریافت کر کے انسانیت پر بہت بڑا احسان کیا تھا اور لاکھوں، کروڑوں، اربوں انسانوں کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد فاتح اور مفتوح فوجوں کے سارے زخمی ایک اسی دریافت کے سہارے زندہ تھے اور اسی کی آس پر صحت کامل کی امید لیے وقت شفا کے منتظر تھے۔

مجھے چونکہ مشاہیر سے ملنے کا، ان کے قریب جانے کا، ان سے ہاتھ ملانے اور بات کرنے کا شوق شروع ہی سے ہے، اس لیے میں پروٹوکال کی پرواہ کیے بغیر دوسرے لیکچر کے آخر میں سر فلیمنگ کے قریب پہنچ گیا اور ان سے ایک خصوصی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے تھوڑے سے وقت کی درخواست کی۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میری درخواست قبول تو کر لی لیکن ساتھ ہی یہ دریافت فرمایا کہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟

میں نے کہا ''سر میں نے آج تک کوئی نوبل انعام یافتہ شخص نہیں دیکھا۔ میری آرزو ہے کہ اسے قریب سے دیکھوں اور کم از کم آدھ گھنٹہ اس کی معیت میں گزاروں۔ مجھے یہ بہت ہی اچھا لگتا ہے...... کہ سر......''

وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور کہنے لگے ٹھیک ہے ٹھیک ہے کوئی بری بات نہیں۔ میں خود تمہاری طرح اسی بات کا خواہش مند ہوں لیکن میری بھی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی، بالکل تمہاری طرح!

میں نے کہا ''سر آپ تو خود نوبل انعام یافتہ ہیں، آپ کو کیا ضرورت ہے کسی اور انعام یافتہ سے ملنے یا اس کے قریب جانے کی۔ آپ تو خود سمندر ہیں۔''

کہنے لگے ''ہوں تو میں نوبل انعام یافتہ لیکن مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے اور اپنے آپ کو جاننے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ میری بھی یہ حسرت ایسے ہی چلی جا رہی ہے...... خیر کوئی بات نہیں۔ تم کل میرے ہوٹل آ جانا۔ شام چار سے پانچ بجے تک فارغ ہوں، اس کے بعد مجھے تاریخی مقامات کی سیاحت کے لیے جانا ہے۔ اب بتاؤ تمہارے لیے یہ وقت مناسب ہے۔''

''کوئی سا وقت بھی مناسب ہے سر۔'' میں نے چیخ کر کہا ''اور شام چار سے پانچ بجے تک کا وقفہ تو آئیڈیل ہے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

انہوں نے مجھے اپنے ہوٹل کا نام اور پتہ دیا۔ تیسری منزل پر اپنے کمرے کا رخ سمجھایا اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر اساتذہ کرام کے ساتھ لابی میں چلے گئے۔

جب میں واپس گھر پہنچا اور بوٹ اتار کر بستر پر کمر سیدھی کرنے کو جھکا تو بوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے مجھے

اچانک احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا جھک ماری اور کس لیے اتنے بڑے آدمی کے ساتھ وقت طے کر لیا۔ میں اس سے کیا بات کروں گا۔ کیا پوچھوں گا اور کس طرح گفتگو آگے بڑھاؤں گا۔ اگر میرا اور اس کا سبجیکٹ ایک ہوتا تو بھی کوئی بات تھی یا کم از کم مجھے ابتدائی سائنس کی الف بے معلوم ہوتی تو بھی کچھ دیر گفتگو ہو سکتی لیکن اس صورتحال میں کیا ہو سکتا ہے بھلا۔ تھوڑی دیر ''ہاں جی! ہاں جی'' اور ''بہتر بہتر'' کہہ کر مجھے اجازت مانگنی پڑے گی اور میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے مجھے اجازت مل جائے گی...... لیکن میں بھی کیا کر سکتا تھا، مجھے مشاہیر سے ملنے کا شوق ہی اس قدر تھا کہ میں ایک مڈل سکول کی ایک احمق سی جذباتی لڑکی کے وجود میں ڈھل جاتا ہوں۔ نوبل پرائز کا نام سن کر تو میری سٹی گم ہو جاتی تھی۔ ''گڈ ارتھ'' مجھے ذرا بھی اچھی نہیں لگتی تھی لیکن چونکہ اس کی مصنفہ کو نوبل پرائز ملا تھا۔ اس لیے میں مرعوب ہو کر ساری کتاب اسے پکڑ کر کسٹرائل پینے کے انداز میں ختم کر گیا تھا۔ ان بڑے لوگوں سے اس درجہ مرعوب ہونے کی بس ایک ہی وجہ تھی کہ میرے اندر خود کوئی ایسی خوبی نہ تھی جس کا سہارا لے کر میں مرعوبیت کے باوجود ساتھ کی گلی میں سے ہو کر باہر نکل جاتا۔ اگر میں طبلے پر آڑا چوتالا بجا سکتا یا استاد اللہ بخش جیسا درخت بنا سکتا یا حضرت علامہ جیسا ''ساقی نامہ'' لکھ سکتا یا ایسے میں کھڈی پر بیٹھ کر دوہرے تار کا کھدر بن سکتا یا محمد بخش مسلم جیسا خطبہ دے سکتا یا رفیق حسین جیسا افسانہ بنا سکتا یا جدا سیج کی طرح بند نالی کا ڈکا کھول سکتا تو پھر میں بڑے آدمیوں سے کبھی بھی اتنا مرعوب نہ ہوتا لیکن میری ذات میں کوئی خوبی اور میرے اندر کوئی گن نہ تھا۔

میں ٹھیک چار بجے سر فلیمنگ کے ہوٹل پہنچا تو وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں ہماری یونیورسٹی میں ابھی ایک اور لیکچر دینا تھا جس کے نوٹس بنا کر انہوں نے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے بولے ''یہ ذرا مشکل اور لطف موضوع ہے لیکن تمہارے شعبہ سائنس میں بڑے بلا کے پروفیسر موجود ہیں جو فوراً بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور بڑے پیچیدہ سوال پوچھتے ہیں۔ مشکل صرف زبان کی ہوتی ہے جس سے کئی مرتبہ خلط مبحث ہو جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''سر ابلاغ کی راہ میں تو ایسی مشکلات ہوں گی لیکن گمبھیر لیکچروں کی غلطی کا امکان کم ہوتا ہے کہ بات ہموار طور پر آہستگی کے ساتھ ہوتی ہے اور تفہیم کے لیے وقت بھی کافی ہوتا ہے۔ البتہ سیاسی میٹنگوں میں جہاں ساتھ کے ساتھ ترجمے ہوتے ہیں وہاں غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ضرور رہتا ہے۔''

پیشتر اس کے کہ وہ میرے آنے کی غرض و غایت دریافت کرتے میں نے کہا ''سر فلیمنگ یہ ہوٹل جس میں آپ ٹھہرے ہوئے ہیں، آپ کی شان کے شایان نہیں ہے۔ اگر آپ ہماری یونیورسٹی کو اطلاع کر دیتے تو ہم کسی بہتر جگہ آپ کی اقامت کا بندوبست کر دیتے۔''

انہوں نے کمرے میں، اوپر سے نیچے ایک گول سی نگاہ دوڑائی اور پھر کہنے لگے ''نہیں! میرے حساب سے تو اچھا خاصا ہوٹل ہے اور اس میں ضرورت کی ہر شے میسر ہے اور عین مرکزی مقام پر ہے جہاں سے میں اردگرد کے علاقے پیدل گھوم کر بھی دیکھ آتا ہوں اور البتہ تھوڑا سا مہنگا ضرور ہے۔''

میں نے کہا ''سر! آپ جیسے بادشاہوں کو مہنگائی سے کیا غرض، آپ تو پینسلین کے موجد ہیں، اس کے کھوجی

اور انکشاف کرنے والے ہیں۔ آپ کو روپے پیسے کی کیا پروا؟"

کہنے لگے "بات تو ٹھیک ہے۔ ہونا تو ایسا ہی ہے لیکن میرے ساتھ دھوکا ہو گیا۔ جب دنیا کو میرے اس کارنامے کا علم ہوا اور مجھے نوبل پرائز کے لیے چن لیا گیا تو دنیا کے دوا دارو کے تجارتی ادارے میری طرف بھاگے۔ سب سے پہلے ایک امریکی ادارے نے رجوع کیا اور مجھے دس فیصد رائلٹی کی آفر دی۔ مجھے ان کی آفر پر دلی رنج ہوا کہ محنت میں نے کی، لیبارٹری میں جان تو میں نے ماری اور یہ مجھے دس فیصد رائلٹی پر ٹرخا رہے ہیں۔ خود کچھ کیے کرائے بغیر نوے فیصد آمدن کے مالک بن رہے ہیں اور اصل مالک کو اس کے جائز حق سے محروم کر رہے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔"

میں نے دل ہی دل کے اندر تالی بجا کر کہا "آپ نے خوب کیا، ان ظالم تاجروں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔"

کہنے لگے "میں چند روز اڑا رہا تو میرے وکیل نے کہا الیگزینڈر رتم پڑ تا لگا کر تو دیکھو کہ تمہاری دس فیصد رائلٹی کی قدر بنے گی۔ میں نے کہا دیکھ لو...... چنانچہ ایک میڈیسن کمپنی کی معرفت اندازہ لگوایا گیا تو پتہ چلا کہ میری رائلٹی کتنے لاکھ پاؤنڈ ماہانہ بنے گی۔ سالانہ نہیں ماہانہ!"

میں نے خوش ہو کر پوچھا "کتنی تھی سر؟"

کہنے لگے "کچھ بہت ہی زیادہ تھی۔ ہالینڈ اور بلجیم کے سالانہ بجٹ کو ملا کر تقریباً اس جیسی۔ میرے لیے تو اتنی رقم کو سنبھال کر رکھنا بھی ناممکن تھا۔"

میں نے کہا "سر اس سے آپ کچھ رفاہی کام شروع کر دیتے۔ بچوں کے لیے سکول، عورتوں کے لیے کڑھائی سلائی کے لیے دستکاری ادارے، بوڑھوں اور بے یار و مددگار لوگوں کے لیے اپاہج خانے...... یہ بڑے ثواب کے کام ہیں۔"

کہنے لگے "ٹھیک ہے، ہیں تو بڑے ثواب کے کام لیکن میں ان کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک فیصد رائلٹی پر اکتفا کر کے ایک فرم سے وعدہ کر لیا کہ "نسخہ" بس تمہیں کو دوں گا اور پینسلین دنیا میں تمہی بناؤ گے لیکن ایک شرط ہے کہ معاہدہ نامہ میں تیار کروں گا اور ساری شقیں میری ہوں گی، وہ مان گیا۔"

"اس کو اور کیا چاہیے تھا سر!" میں نے کہا "اس نے تو ماننا ہی تھا۔"

کہنے لگے "رات میں اپنا ٹائپ رائٹر نکال کر منشیوں کی طرح بیٹھا اور بڑے غور اور انہماک سے شرطیں ٹائپ کرنے لگا۔ شرطیں کچھ سخت تھیں اور ساری میرے حق میں تھیں۔ میں نے رک کر ان کا جائزہ لیا تو خود کو ایک آمرانہ حیثیت میں پایا۔ میں نے اپنے طور پر حساب لگا کر دیکھا تو ایک فیصد کے حساب سے بھی مجھے اتنی رقم مل رہی تھی کہ کل ساری عمر بھی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتا تھا۔ اس نے بڑھ بڑھ کر میرے گلے کا ہار ہوتے جانا تھا اور دیمک کی طرح مجھے چاٹنا شروع کر دینا تھا۔ اس کے مقابلے میں میں صرف زندہ رہنا چاہتا تھا اور کچھ سیر و سیاحت اور کچھ مزید تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مائی ڈیئر فیلو! میں نے آدھی رات کے وقت ایک معاہدہ لکھا کہ میری یہ دریافت میری ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ ایک عطیہ ہے جو مجھے امانت کے طور پر ملا ہے۔ اس دریافت کا عطا کنندہ خدا ہے اور اس کی ملکیت پوری خدائی کی ہے۔ میں اس دریافت اور اس انکشاف کو نیچے دیے گئے فارمولے کے مطابق عام کرتا ہوں اور اس بات کی قانونی،

جذباتی اور "ملکیتی" اجازت دیتا ہوں کہ دنیا کا کوئی ملک، کوئی شہر، کوئی انسان، معاشرہ جہاں بھی اسے بنائے، وہ اس کا انسانی اور قانونی حق ہوگا اور میرا اس پر کوئی اجارہ نہ ہوگا۔"

مجھے ان کے ماضی کے اس فیصلے کا اعلان اپنے حال میں سن کر دلی صدمہ ہوا۔ اتنی بڑی دولت جاریہ سے یوں احمقانہ طور پر کنارہ کش ہو جانا اتنے بڑے سائنس دان کو زیب نہیں دیتا تھا۔ آخر اسے اپنے عزیز و اقارب، اپنی اولاد اور آئندہ نسلوں کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔ یہ اس شخص نے کیا کیا۔ اس سے تو میرے ملک کے ان پڑھ، جاہل، بے علم، گنوار زمیندار بھی سیانے ہیں جو آخرت پر پکا ایمان رکھتے ہوئے بھی ساری عمر اپنی آل اولاد کے لیے اندوختہ جمع کرتے رہتے ہیں اور ان کو مال و دولت کے محفوظ حصار میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔

میں تھوڑی دیر سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا تو سر فلیمنگ نے ہنس کر کہا "اب تم ہی کہو کہ میرے جیسا نادار شخص اعلیٰ درجے کا ہوٹل کیسے افورڈ کر سکتا ہے......؟" پھر انہوں نے چونک کر کہا "یہ بھی کوئی ایسا برا ہوٹل نہیں ہے۔ اس دنیا کی کثیر آبادی کو تو رہنے کے لیے جھونپڑی تک میسر نہیں، ہم تو پھر اس خوبصورت محل نما عمارت میں آرام سے بیٹھے ہیں۔"

مجھے ابھی تک ان کی رائلٹی کے ضائع ہو جانے کا غم کھائے جا رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ دنیا کے ہزاروں دوا ساز ادارے جو پینسلین کے جہاز کے جہاز تیار کر کے اربوں پاؤنڈ کما رہے تھے، کچھ تو حیا کریں اور ایک سادہ لوح انسان کو کچھ تو مان دیں اور اس کی کچھ تو مالی امداد کریں جس نے اپنی دریافت کو عطیہ خداوندی سمجھ کر اسے انسانیت پر نچھاور کر دیا!

میں نے کہا "سر! آپ کو یقین ہے کہ پینسلین کی دریافت عطیہ خداوندی تھی اور اس میں آپ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ آپ کی کوئی محنت نہ تھی۔ آپ کی کوئی ریسرچ نہیں تھی؟"

کہنے لگے "میں اسے دنیا تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ضرور تھا۔ ایک آلہ ضرور تھا لیکن میں اس کا موجد یا مخترع نہیں تھا۔ صرف اس کا انکشاف کرنے والا تھا اور یہ انکشاف بھی میری محنت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ خداوند کا کرم اور اس کی عنایت تھی...... اصل میں جتنے بھی انکشافات اور دریافتیں ہوتی ہیں وہ خدا کے حکم سے اور خدا کے فضل سے ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ رکے اور تین چار سیکنڈ کے وقفے کے بعد بولے "معاف کرنا تم خدا پر ایمان رکھتے ہو یا نہیں؟"

میں نے کہا "بالکل رکھتا ہوں سر اور پورے کا پورا رکھتا ہوں...... وہ تو دراصل ہے ہی ہمارا آپ یورپ والوں کو تو ہم نے ادھار دے رکھا تھا، سو اب اس کی واپسی شروع ہو گئی ہے۔"

کہنے لگے "میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ تم سے بہت سارے نوجوان، خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے اپنے علم کے زور پر خدا سے منحرف ہو گئے ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ تم بھی انہیں میں سے ایک ہو لیکن تمہارے بیان نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا ہے۔"

میں نے کہا "سر! علمی اور عقلی طور پر تو میں اپنے دہریے دوستوں کے ساتھ شامل ہوں لیکن جذباتی طور پر میں اب بھی خدا کا بندہ ہوں اور اس سے وابستہ ہوں۔"

ہنس کر کہنے لگے "بس بس!! اس ذیل میں جذباتی وابستگی ہی کی ضرورت ہے، سو ہے۔ رہے علم و عقل تو ان کے نشانے بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی کچھ ایسی فکر نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا "سر فلیمنگ جب میرے ایمان کا بھید آپ پر کھل گیا ہے، کیا آپ اپنے بیان کی وضاحت فرمائیں گے کہ اصل میں جتنے بھی انکشافات اور جتنی بھی دریافتیں اور جتنی بھی ایجادیں ہوتی ہیں، وہ خدا کے حکم سے ہوتی ہیں؟"

کہنے لگے "خدا علیم مطلق ہے اور اس کو کائنات کے اندر اور کائنات سے باہر کی ہر شے کا علم ہے، وہ اپنی مرضی سے، اپنے حساب سے اور اپنے ارادے سے انسانوں پر علم منکشف کرتا رہتا ہے۔ علم اسی کا عطا کردہ ہوتا ہے، نام بندے کا ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا "اس کا ثبوت؟"

فرمانے لگے "اگر انسان اپنی کوشش، محنت، جدوجہد اور لگن کے ساتھ کسی نادر یافت کو دریافت کرنے پر تل جائے تو وہ اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس دریافت کے "اترنے" کا حکم نہ ہو جائے۔"

ان کی بات پیچیدہ تو نہیں تھی البتہ نئی تھی۔ اس لیے میں اس کو ٹھیک سے سمجھ نہ سکا، مسکرا کر بولے۔ "خدا علیم مطلق ہے اور اس کے پاس ہر شے کا علم ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اور جب پسند کرتا ہے اور جب مناسب خیال کرتا ہے اس علم کو دنیائے انسان کو عطا کر دیتا ہے۔ نہ پہلے نہ بعد میں، ٹھیک وقت مقررہ پر، اپنے حکم کی ساعت کے مطابق...... میں نے اس اصول کو لندن کے ایک مقامی سکول میں بچوں کی آسانی کے لیے یوں سمجھایا تھا کہ خدا کے آستانے پر ایک لمبی سلاخ کے ساتھ علم کی بے شمار پوٹلیاں لٹک رہی ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے اور جب مناسب خیال فرماتا ہے، قینچی سے ایک پوٹلی کا دھاگا کاٹ کر حکم دیتا ہے کہ "سنبھالو! علم آ رہا ہے...... " ہم سائنس دان جو دنیا کی ساری لیبارٹریوں میں عرصے سے جھولیاں پھیلا کر اس علم کی آرزو میں سرگرداں ہوتے ہیں، ان میں سے کسی ایک کی جھولی میں یہ پوٹلی گر جاتی ہے اور وہ خوش نصیب ترین انسان گردانا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "سر! پھر تو مزے ہیں۔ آدمی منہ اٹھا کر علم کی پوٹلی کے انتظار میں بیٹھا رہے اور جونہی پوٹلی قریب آئے، اسے کاٹی مار کر لے بھاگے۔"

کہنے لگے "اس سے پتنگ تو لوٹے جا سکتے ہیں، علم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کے لوگ آج تک پتنگ ہی لوٹتے رہے، علم پر دسترس حاصل نہ کر سکے...... علم کا اتار صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اپنی لیبارٹریوں کے اندر علم کی آرزو میں رقص بسمل میں تڑپتے رہتے ہیں۔ ایک وقت مقررہ پر ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے اور ان کے کسی ساتھی کو "سر" مل جاتا ہے۔ یہ بھید ان سب کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے اور یہ مشترکہ ملکیت ان کی معرفت دنیائے انسان میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ کام ہمارا ہوتا ہے حکم اس کا۔ محنت ہماری ہوتی ہے، آرزو وہاں سے چلتا ہے۔ کوشش ہم کرتے ہیں، مختاری اس کی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ہم صرف محنت، کوشش اور جدوجہد کے زور پر کامیاب ہو جائیں۔ سر مارتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا لیکن مارتے رہنا پڑتا ہے کہ سر مارنے والے ہی کے پاس پیغام پہنچتا ہے، دریا کنارے بنسری بجانے والے کے پاس

نہیں۔ پوٹلی وہیں گرتی ہے جہاں جھولی پھیلی ہوئی ہو۔ یہ بات الگ کہ جھولی میں ایک ہی پوٹلی اترتی ہے اور وقت مختار کل کی طرف سے معین ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "سر! یہ پوٹلی گورے کی جھولی میں ہی کیوں گرتی ہے، کالے کی جھولی میں کیوں نہیں گرتی؟"

کہنے لگے "اس کے نزدیک گورے اور کالے میں کوئی فرق نہیں، سب اس کی مخلوق ہیں۔ وہ جب علم کی پوٹلی کاٹ کر نیچے روانہ کرتا ہے تو کالے کو بھی آواز دیتا ہے کہ جھولی پھیلاؤ علم آ رہا ہے۔ دامن کشادہ کرو، نئی بات بھجوائی جا رہی ہے۔ اس پر کالا ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ہے کہ دامن کدھر سے پھیلاؤں، میں نے تو آج قمیص ہی نہیں پہنی، حد درجہ گرمی تھی...... پھر وہ پیراشوٹ پوٹلی اپنا راستہ تبدیل کر لیتی ہے اور ان ہزاروں، لاکھوں رقص کناں سائنس دانوں کے اوپر لہرانے لگتی ہے جو کئی سال سے اپنی آرزو کے چہرے اوپر اٹھائے اور اپنی عمل کی آنکھ پینل پر جمائے بے چینی سے جھوم رہے تھے۔"

میں نے کہا "آپ یہ کس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ عطا سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں انسانی عمل کی کوئی خوبی نہیں۔"

کہنے لگے "کوشش، عمل اور جدوجہد سے کچھ نہیں ہوتا مگر کرتے رہنا چاہیے کہ یہی انسان کا کمال اور یہی اس کی خوبی ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات کہ علم اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور علیم مطلق کے حکم سے عطا ہوتا ہے اور ایک مقررہ وقت پر جاری کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی سائنسی توجیہہ میرے ذہن میں نہیں آتی۔ انسان اپنی زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اس کے علم میں تدریجی طور پر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ اپنے علم کی سیڑھیاں ایک ایک طے کر کے بلندیوں کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ اس میں ڈیٹ کس طرح سے مقرر کی جا سکتی ہے۔"

کہنے لگے "بدن کی، ماحول کی اور روح کی ارتقائی منازل ایک ترتیب سے چلتی ہیں اور ان میں ذیل بندی سے ایک تسلسل سے ترقی ہوتی چلی جاتی ہے لیکن ذہن انسانی کسی ڈسپلن کا پابند نہیں ہوتا۔ خیال کے دانے کسی مالا میں پروئے نہیں ہوتے۔ فکر اور تمثال میں صف بندی نہیں ہوتی۔ ذہن انسانی شاخ بہ شاخ ایک بندر کی طرح چھلانگیں مارتا رہتا ہے۔ کوئی بات پہلے ذہن میں آ جاتی ہے، کوئی بعد میں۔ سوچ ارتقائی منازل طے کرنے کی پابند نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایجاد اور اختراع کی دنیا میں انسان نے بہت سی ایسی چیزوں کو تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی جو آج تک مکمل نہیں ہو سکیں اور جواب کی انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ بہت سی ایسی ہیں جن کی بابت اس نے سوچا بھی نہ تھا اور وہ گھڑی گھڑائی اس کے قدموں میں آن گریں۔ کچھ خواب میں منکشف ہوئیں، کچھ رویا میں فارمولا بن کر سامنے سکرین پر آ گئیں۔ کچھ کھلی آنکھوں کے سامنے رونما ہو کر اپنا بھید بتلا گئیں۔ انسان ہل چلا سکتا ہے، زمین تیار کر سکتا ہے۔ پانی دے سکتا ہے۔ بوائی کر سکتا ہے لیکن بیج کو پھاڑ کر اس میں سے بوٹا پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ علم، علیم مطلق کے پاس ہے اور اگر اس نے چاہا اور پسند فرمایا تو یہ بوٹا پیدا کرنے کا علم بھی انسان کو عطا کر دے گا مگر اپنی مرضی سے اپنی پسند سے اور اپنے منتخب وقت کے مطابق۔"

"میں تو ایک موٹی سی بات جانتا ہوں اور میرے مشاہدے میں لوٹ لوٹ کر یہی حقیقت نمایاں ہو رہی ہے کہ

علم انسان کے اندر سے نمودار نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اوپر سے عطا ہوتا ہے...... انسان کی کتنی آرزو کی تھی کہ ہوا میں اڑے لیکن خدا کی بالکل مرضی نہ تھی کہ وہ اڑے، چنانچہ سینکڑوں ہزاروں انسان اس کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا اور پھر جب علم اُتارا گیا اور ایک خاص وقت آنے پر ہوا پیمائی کا اصل اصول ذہن میں ڈالا گیا تو بات شیشہ ہوگی اور انسان پہلی ہی فلائٹ میں سمندر پار کر گیا۔''

میں نے کہا ''سر فلیمنگ! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تجربے کر کر کے اور اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ سیکھ کر انسان بالآخر کامیابی کی منزل پر پہنچ جاتا ہے...... اور پھر......''

''ضروری نہیں، ضروری نہیں۔'' انہوں نے بات کاٹ کر کہا ''انسان غلطیوں پر غلطیاں کیے جاتا ہے، سبق سیکھے جاتا ہے لیکن کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔ اردگرد غلطیوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ ڈھیروں ڈھیر غلطیاں جمع ہو جاتی ہیں لیکن کامیابی کی منظوری کہیں اور سے ملتی ہے۔''

پھر ذرا رُک کر بولے ''ایک بیماری ہے، عام لوگ اس سے اتنے آگاہ نہیں ہیں لیکن ڈاکٹر، سائنس دان، ماہرینِ طب اس سے حد درجہ خائف ہیں اور اس کے علاج کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ دنیا کے ہر بڑے ملک کی لیبارٹری اور سائنس کے ہر بڑے معاملہ میں اس پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ لاکھوں پاؤنڈ ہر مہینے اس ریسرچ پر لگ رہے ہیں اور ہزاروں ماہر اس پر ریسرچ کا ڈیٹا اکٹھا کر کے آپس میں نوٹس ملا رہے ہیں لیکن اس بیماری کا کوئی اور چھور ہی نہیں ملتا۔''

''اور علیم مطلق کے پاس اس بیماری کا علاج ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے ''بالکل ہے، بلاشک وشبہ ہے اور سو فیصد تیر بہدف ہے لیکن انسان کو اپنی کوشش اور جدوجہد سے اس کی الف بے بھی معلوم نہیں ہو سکی۔''

میں نے کہا ''سر! کونسی ہے وہ ایسی موذی بیماری جس کا کوئی بھید ہی اب تک نہیں مل سکا۔''

کہنے لگے ''اس کو کینسر کہتے ہیں اور یہ بیماری بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کے ہر خطے میں پھیل رہی ہے۔ دنیا بھر کے ماہرین طب اور بڑے بڑے سائنس دان دن رات اس کے علاج کی دریافت میں لگے ہیں اور ابھی تک خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔''

''اور ایک وقت آئے گا کہ اس موذی مرض کا علاج ایک پوٹلی میں بندھا بندھایا پیراشوٹ میں رکھا ہوا آئے گا اور اس وقت جو طلبگار قسمت والا ہوگا اسے حاصل کر لے گا۔''

آج دس نومبر ہے اور میں یہ سطور مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ پہلے بھی میں یہاں سے اپنے بچوں کو خط لکھتا رہا ہوں اور آج بھی میں یہ پیڈ اسی غرض سے لے کر آیا ہوں کہ یہاں بیٹھ کر اپنے بڑے بیٹے کو خط لکھوں گا جو امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ میڈیسن شہر میں مقیم ہے۔ میرا ارادہ تو اُسی کو خط لکھنے کا تھا لیکن یہاں آ کر میرا رخ تبدیل ہو گیا ہے۔

مسجد نبویؐ کے کھلے صحن میں جو آج سے چند سال پہلے بالکل کھلا تھا' ہم نیلے آسمان تلے بیٹھ کر مغرب کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب اس کھلی جگہ پر دبیز نائلون کی چھ بڑی بڑی چھتریاں تنی ہیں جن سے روشنی اُسی طرح سے اتر کر صحن مسجد میں پھیل رہی ہے جیسے کھلے صحن میں پھیلا کرتی تھی۔ ان چھتریوں کے اجلے پنکھوں نے اڑان کے پر پھیلا کر اپنی ساری سفیدی نیچے منتقل کر دی ہے اور فرش پر بچھے ہوئے سرخ کبودی قالین اور واضح ہو گئے ہیں۔ اچھے سٹوڈیو کے ماہر فوٹو گرافر ایک سفید چھتری سے فلیش اجال کر پورٹریٹ میں جو بولتا بولتا سا تاثر دیتے ہیں ایسا ہی کچھ ان سفید چھتریوں نے کیا ہے۔ ان سے منعکس ہونے والی روشنی اس صحن خانہ میں متکلم سی ہو گئی ہے۔ میں تو اس آواز کو ٹھیک سے نہیں سن سکتا البتہ سمجھنے والے کہتے ہیں کہ روشنی کا درود وسلام اسی زبان اور اسی لسان میں ہوتا ہے اور اس کے لحن کی یہی صورت ہے۔

آج سے چند برس پہلے جب شہاب مجھے اور بانو کو پکڑ کر یہاں لایا تھا تو مسقف مسجد کے اندر کے سارے ستون براؤنش ریڈ تھے۔ اب یہ سارے سفید ہو گئے ہیں۔ وہ بھی بڑے موہنے تھے یہ بھی کمال دلکش ہیں۔ اندر اصحاب صفہ کے چبوترے کے پیچھے حضرت عباس والے دو جڑواں ستونوں کے ساتھ شہاب کے بیٹھنے کی مستقل جگہ مقرر تھی۔ وہ نماز سے بہت پہلے یہاں آ کر بیٹھ جاتا اور پھر اگر کسی ضروری کام سے اٹھنا نہ ہوتا تو عشاء تک اسی جگہ بیٹھا رہتا۔ میری اس کی دوستی ضرور تھی لیکن ہمارے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ سکون وسکینت کا ایک ٹھنڈا یخ تودا تھا اور میں بے چینی اور بیقراری کا ایک فربہ ستون تھا۔ وہ یقین وعمل کا ایک سفید ستون تھا اور میں تشکیک وگمان کا ایک ایسا بگولا جس کو کسی پل کسی دم قرار نہ ہو۔ اصل میں وہ جانتا تھا اور میں نہیں جانتا تھا۔ جس کو پتہ ہو گاڑی اس پلیٹ فارم سے اتنے بجے چلے گی اور انٹر کلاس کا ڈبہ یہاں آئے گا اور ڈبہ خالی ہو جانے کے بعد چھوٹی سیٹ کس جانب کی کھڑکی کے پاس ہوگی' اس مسافر کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ اٹھ اٹھ کر اور بھاگ بھاگ کر قلیوں سے' بابوؤں سے' مسافروں سے اور خوانچے والوں سے پوچھا نہیں کرتا آرام سے اپنی ٹرنکی پاؤں کے پاس رکھے ٹین کی بڑی چھت کی گولائی کو دیکھتا رہتا ہے۔ اپنی سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ اُس سوچ میں جس کا سفر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی اور ہی جہت سے ہوتا ہے۔ شہاب بھی اپنی گٹھڑی گود میں رکھے ہر جگہ

اطمینان سے بیٹھا رہتا اور جب وقت آتا تو اسی طمانیت کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور دھکا کھائے اور دھکا دیے بغیر مطلوبہ دروازے میں داخل ہو جاتا۔ اصل میں اس کو گٹھڑی سنبھالنے کا اور قدم قدم چلنے کا ہنر آ گیا تھا۔ وہ اپنی راہ پر رواں تھا' نہ بھاگتا تھا' نہ رکتا تھا' نہ کہنیاں مارتا تھا۔ نہ کھینچتا تھا نہ کھنچتا تھا۔ بس چلے جاتا تھا کسی دعوے اور نمائش کے بغیر۔ رہبری اور رہنمائی کے بغیر۔ بار بار نقشہ کھول کر ڈائریکشن دیکھے بغیر۔ اصل میں اس کی ڈائریکشن کسی اور طرف سے آتی تھی۔ ہماری گہری دوستی کے باوصف ہمارے مزاج نہ مل سکے کہ میری ڈائریکشن ایک دوسرے محاذ سے وابستہ تھی۔ میں لوگوں سے منسلک تھا۔ انسانوں کے Approval کا خواہشمند تھا۔ عوام الناس سے اپنی کارکردگی کا داد طلب تھا۔ شہاب کی ہاٹ لائن کہیں اور تھی۔ وہ لوگوں کا احترام کرتا تھا۔ ان سے محبت کرتا تھا۔ ان کے دکھ سکھ میں شرکت کرتا تھا لیکن ان کی رضامندی کا طلبگار نہیں تھا۔

اس وقت مجھے سامنے کے جڑنواں ستونوں کے ساتھ ٹیک لگائے اس کا وجود محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے سچ مچ وہ بالکل اسی طرح جس طرح پہلے ہوتا تھا۔ میں نے اصحاب صفہ کے چبوترے پر دو نفل ادا کیے۔ خدام روضہ شریف جو پاکباز حرم سرا کے گروہ پر مشتمل تھا ان سے مصافحہ کیا۔ سب سے بڑی چیف خواجہ سرا کے ہاتھ کو بوسہ دیا کہ بڑے بڑے جید عالم اور فقیہ شہر جو سنہری حاشیوں والے جبے میں ملبوس تھے' لوگ دروازے میں داخل ہو کر اصحاب صفہ کے چبوترے پر بیٹھے ہوئے اس قد آور خواجہ سرا کے ہاتھ کو بوسہ دیتے تھے۔ میں نے بھی حوصلہ کر کے یہی کیا اور انہوں نے بھی مہربانی فرما کر میری خواہش کے سامنے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

آج یہ چبوترہ ان سے بالکل خالی ہے صرف ایک صاحب باقی رہ گئے ہیں جو اس وقت سب سے چھوٹے تھے۔ میں ان کو مشکل سے پہچانتا ہوں اور میرے ذہن میں ان کی جوانی کے نقوش اسی طرح سے محفوظ ہیں جب میں نے ان کو ان کے گروہ میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس وقت یہ مجھ سے کوئی دو تین سال چھوٹے تھے۔ اس حساب سے اب وہ ٹھیک ستر برس کے ہوں گے۔

خواجہ سراؤں کا ہماری تاریخ میں اور تہذیب میں بڑا اونچا مقام ہے۔ یہ زندگی کے جس شعبے کی طرف بھی نکلے بہت اونچے مقام پر پہنچے۔ شجاعت' شرافت' بزرگی' تقدس اور عفت میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ محلات کے اندر' پورے ہتھیاروں سے لیس حرم کی حفاظت کا کام انہی کے سپرد تھا۔ مشکل اور پیچیدہ جنگی مہموں میں جب لڑائی ترازو کے تول تل جاتی تھی اور شاہی فوجیں پسپا ہونے لگتی تھیں تو مغل بادشاہ اور خاندان غلاماں کے حکمران اکثر کسی خواجہ سرا جرنیل کو کمک دے کر روانہ کرتے تھے اور وہ ہر محاذ پر خود بے جگری سے لڑ کر اور اپنے سپاہیوں کو حکمت اور چابکدستی سے لڑا کر ہاری ہوئی بازی جیت لیتا تھا۔

میں نے اپنے ملک کے کئی تاریخ دانوں بشمول ڈاکٹر اشتیاق قریشی کے خواجہ سراؤں کی طاقت اور تیور اور عام شجاعت کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔ بلکہ انہوں نے میرے اس سوال کو تعجب اور تمسخر کے انداز میں لپیٹ دیا۔ ڈاکٹر اجمل نے البتہ اس قدر بتایا کہ چونکہ یہ لوگ قدرتی طور جنسی ہوتے ہیں اور Sublimation کی بنیاد پر زندگی بسر کرتے ہیں اس لیے ان میں انسانیت کی ارفع اور اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ رجولیت سے عاری اور سنگل ٹریک کارکن ہونے کی وجہ سے ان کی توجہ اپنے ہدف کے ساتھ استوار رہتی ہے اور کوئی محرک یا

کوئی جاذبیت ان کو ان کے مقصد سے منحرف نہیں ہونے دیتی۔ بڑے بڑے سورمے' پہلوان اور شمشیر زن لنگوٹے کے سچے ہوتے ہیں اسی طرح بزرگ صوفی اور اللہ والے روحانیت کی منزلیں جلد طے کر لیتے ہیں اور بڑی پختگی کے ساتھ ان پر قائم رہتے ہیں۔ ہمارے کمزور اور کمتر درجے کے لامتناہی معاشرے نے ایک روز بیٹھ کر یہی سوچا کہ اپنے سے بہتر اس مخلوق کو کچھ اس انداز سے پامال کیا جائے کہ پھر رہتی دنیا تک ان کے فخر کا سر اونچا نہ رہ سکے۔ چنانچہ ڈاکٹر اجمل نے کہا "میرا خیال ہے کہ کمزور بودے اور کرائے کے کھشتریوں نے اپنے پروپیگنڈے کے زور پر اسی مخلوق کو بدنام اور پراگندہ کرنا شروع کیا اور شاہی درباری ہتھکنڈوں کے زور پر انہیں کچھ سے کچھ بنا دیا۔ آج ہندوستان اور پاکستان میں جس ناگفتہ بہ حالت میں یہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں ان سے چماروں' بھنگیوں اور مردار خوروں کی حالت کہیں بہتر ہے۔

اس وقت مجھے وہ سہ پہر یاد آ رہی تھی جب میں نے شہاب کا پہنچہ کھینچ کر اُسے اٹھانے کی کوشش کی تھی کہ چلو اصحاب صفہ کے چبوترے پر تم بھی جا کر نفل ادا کر لو۔ میں وہاں بڑی مشکل سے جگہ بنا کر آیا ہوں اور ایک عرب صوفی کو اپنے پاکستانی صوفی ہونے کا یقین دلا کر آیا ہوں کہ ابھی میں اپنے بڑے بھائی کو لاتا ہوں۔ اس کے لیے یہ جگہ محفوظ رکھنا۔" اس نے کمال مہربانی سے ایک انگلی اٹھا کر ہامی بھر لی ہے کہ ایک منٹ سے زیادہ نہ لگانا ورنہ میرا ذمہ ختم اور میرا اختیار ختم!

لیکن شہاب نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا کہ اتنے بڑے مقام پر اور ایسی اونچی جگہ بیٹھ کر میں نفل نہیں ادا کر سکتا۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ بلکہ یہ بھی کسی کے کرم سے رعایت ملی ہوئی ہے کہ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ تم جاؤ اور اس جگہ بیٹھ کر اور نفل ادا کرو اور زیادہ دعائیں مانگو۔"

مجھے اس کی بات پر غصہ بھی آیا اور کفران نعمت پر افسوس بھی ہوا لیکن وہ ایسا ہی تھا۔ صبح بھی جب میں نے اُس کو بتایا تھا کہ چلو حضورؐ کے محراب میں لوگ نفل ادا کر رہے ہیں تم بھی میرے ساتھ چلو میں جگہ بنوا دوں گا اور ایک دو دھکے لگا کر محراب خالی کرا دوں گا لیکن وہ نہیں مانا اور شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا "یار حضور کی محراب میں کھڑے ہو کر نفل پڑھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ وہاں تو حضرت ابوبکرؓ کو بھی تھرتھری آ گئی تھی میرا کیا منہ ہے جو اس جگہ کے قریب بھی جاؤں۔ میری شکل دیکھتے ہو یہ اس محراب میں کھڑے ہونے کے قابل ہے۔ تم جاؤ اور وہاں جا کر نفل پڑھو اور اس مسجد کی بہاریں جتنی بھی لوٹ سکتے ہو لوٹ لو۔ ایسا موقع بار بار ہاتھ نہیں آتا۔ ہر ہر مصلّے سے' ہر کونے سے اور ہر صف سے' جہاں جہاں موقع ملے اپنا حصہ بٹور لو اور جو حصہ تمہارا نہیں ہے وہ بھی ہتھیا لو۔ ایسا چانس ہر روز نہیں ملا کرتا۔

میں آ کر چپ چاپ اسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے پرانے ستونوں والا وسیع و عریض والان کھلا ہے اور ستونوں پر محرابوں کے اوپر گول سنہری دائروں میں دائیں سے بائیں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام لکھے ہیں۔ ان کے بعد اسی گھیر کے دائرے میں اللہ جل جلالہٗ کا متبرک نام اسی ہاتھ کی خطاطی میں لکھا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ہے۔ آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور پھر حضرت امام حسین علیہ السلام کا اسم گرامی ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے بعد حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام کندہ ہے۔ شہاب نے

اپنے لیے یہی جگہ مقرر کر رکھی ہے اور وہ نماز کے طے شدہ وقت سے بہت پہلے یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے اور عشاء تک یہیں بیٹھا رہتا ہے۔ اس دوران میں بازاروں میں جا کر گھوم پھر بھی آتا تھا۔ کھانا بھی کھا لیتا تھا۔ شام کی چائے پی کر تھوڑی دیر آرام بھی کر لیتا تھا اور جب مغرب کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتا تھا تو وہ اسی جگہ اسی اطمینان اسی مسکراہٹ اور اسی اذن و اجازت کے ساتھ بیٹھا ہوتا جو اس نے مجھے مزے کرنے کے لیے دے رکھی ہوتی تھی۔

میں جب بھی مدینے شریف آیا اور جتنی مرتبہ مسجد نبویؐ میں حاضری دی اس کا معاوضہ میں نے اسی دنیا میں وصول کر لیا۔ میں نے واپس جا کر اپنے دوستوں ہم وطنوں اور ہمعصروں کو وہ واقعات ضرور سنائے جس سے میرا روحانی اور ارفع مقام ان کی نگاہوں میں بلند ہوتا اور جنہیں سن کر ان کو افسوس ہوتا تھا کہ کاش ان کے ساتھ بھی یہ معاملات گزرے ہوتے اور انہوں نے بھی ایسے بلند مقامات تک رسائی حاصل کی ہوتی۔

میرا حرمین شریفین کا سفر پاکستان سے لے کر واپسی تک معجزات و کرامات سے لبریز ہوتا۔ ویزے کا حصول اس میں شدید اڑچن۔ پاسپورٹ کا بغیر ویزے کے لوٹا دیا جانا اور میرا شکر نعمت کے ساتھ پاسپورٹ وصول کر لینا کہ حکم نہیں ہے۔ جب حاضری لگے گی اس وقت بلاوا آئے گا۔ پھر اچانک سعودی ویزن آفس سے فون موصول ہونا۔ میرا پاسپورٹ منگوایا جانا۔ معذرت کرکے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرکے میرا ویزا لگنا اور میرا سفر پر روانہ ہونا۔ ریاض محمود شاہد حسین عقیل احمد عکسی اور الطاف کا اس فلائٹ سے رہ جانا اور مجھ بعد میں آنے والے کو سیٹ مل جانا۔

جدہ ایئرپورٹ پر سعید سے اچانک ملاقات ہونا۔ اس کا زبردستی اپنے گھر لے جانا۔ سامان رکھنا۔ کھانا کھلانا اور پھر اُسی طرح حالت احرام میں سعید کا مجھے اپنی مرسڈیز میں مکہ شریف لانا' عمرہ کروانا اور صبح فجر کی نماز کے بعد واپس جدہ لا کر سلا دینا۔ میری روحانی برتری کا کتنا بڑا کمال ہے۔

باب ملتزم پر دعائیں مانگتے ہوئے ایک عجیب طرح کا احساس ہونا کہ فلاں دعا تو قبول ہو جائے گی اور فلاں رہ جائے گی۔ اس مقام پر دوستوں' دشمنوں' عزیز رشتہ داروں اور قابل نفرت لوگوں کے لیے بھی خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگنا۔ حطیم میں دوگانا نفل ادا کرنے کے بعد جب غلاف کعبہ پر دونوں ہتھیلیاں لگا کر اُسے بوسہ دینا اور اس پر اپنا چہرہ ملنا تو دونوں ہتھیلیوں کا غلاف کے ساتھ چپک جانا۔ جیسے غلاف کعبہ مجھے تھوڑی دیر اور توقف کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔

میرے بابا جی حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نور والے کا بڑا سخت آرڈر تھا کہ جس خوش نصیب کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ وعلیہ وسلم کا دیدار نصیب ہو وہ ہرگز اپنے دوسرے بھائیوں سے اس کا تذکرہ کر کے تسلی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ خود تو اس اعلان سے اونچی کرسی لگا کر بیٹھ جائے گا لیکن سننے والے اپنے آپ کو کس قدر خوار و زبوں اور پست و پسماندہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ انہیں یہ زیارت نصیب نہ ہو سکی۔ سوچیں گے کہ چونکہ ان میں کوئی کمال نہیں' کوئی روحانی رفعت نہیں اس لیے وہ محروم رہے' محروم چلے آئے اور اسی طرح سے چلے جائیں گے۔

لیکن اپنے تقدس اور اپنی بزرگی کا اظہار دولت' طاقت' علمیت اور شجاعت سے بھی قوی تر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے سے بڑے مرتبے والا انسان بھی پھنس جاتا ہے اور جب ایک مرتبہ پھنس جاتا ہے تو پھر اس کی رہائی کی کوئی

صورت باقی نہیں رہتی تا آنکہ اس پر کوئی خاص فضل ہو' کوئی فیض اس کو پورے طور پر آزاد نہ کرا دے۔

میری طبیعت شروع ہی بحث مناظرے پر مائل رہی ہے اور میں نے اپنی زندگی کے اولیں سال مسلم لیگ کے پرجوش رکن کی حیثیت سے مخالف پارٹیوں کے ساتھ بحث مباحثے میں گزارے ہیں۔ اس تربیت نے اور اسی سیاسی ماحول نے مجھے اپنا حق مانگنے اور اپنی آرزو پوری کرانے میں بڑا پختہ کر دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اپنا حق چھوڑو نہیں اور اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند رہو۔

یہاں مسجد نبویؐ میں مغرب کی نماز کے وقت جب ہم ذرا لیٹ ہو گئے اور پہلی رکعت گزر گئی تو میں نے بھاگ کر ایک صف کے اندر سے گزرنے کی کوشش کی کہ سامنے والی صف میں جگہ کافی تھی۔ میری کوشش کو دو قوی ہیکل کندھوں نے آپس میں جڑ کر مجھے آگے جانے سے محروم کر دیا۔ اگر میں ان کے ساتھ دائیں یا بائیں ایک کوشش کہیں بھی کرتا تو مجھے بڑی آسانی سے راستہ مل جاتا لیکن میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ واپس پلٹا' جوتا پہنا اور عورتوں والی سائیڈ پر اپنی بیوی کو لینے چلا گیا۔ چونکہ وہ بھی میرے ساتھ پہلی رکعت کھو چکی تھی اس لیے اس نے بھاگ کر عورتوں کی جوتیوں میں ہی نیت باندھ لی وہاں ایک بڑی عمر کی عورت اور بھی کھڑی تھی۔ جواب بانو قدسیہ کو تسبیاں مار مار کر کہہ رہی تھی" ہے حجہ اجہ!! ہذا احرام.. ہذا احرام.." لیکن وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے اپنی نماز پڑھے جا رہی تھی اور اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ اس کا نام لے کر آواز بھی دی لیکن نماز میں کوئی جواب تھوڑی دیا کرتا ہے۔ وہ اسی حرم میں ڈوبی جوتیوں پر بیٹھی نماز پڑھتی رہی اور پھیلتی سی گئی۔

اپنے بھانویں میں نے کافی مسافت طے کر لی تھی لیکن منزل کا کوئی اور چھور نہیں ملتا تھا۔ منزل تو خیر دور کی بات تھی یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ سفر شروع ہو کر کہاں تک پہنچ گیا ہے اور ابھی آگے کیا باقی رہ گیا ہے۔

ڈیرے کے لوگ بابا جی کی وجہ سے میری عزت تو بہت کرتے تھے لیکن مجھے اپنا ساتھی اور ہم سفر خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ یہ اس درس گاہ کا باقاعدہ طالب علم نہیں ہے۔ نہ اس نے فارم داخلہ جمع کرایا ہے اور نہ ہی باقاعدگی سے فیس ادا کرتا ہے۔ کسی بھی رجسٹر میں اس کا اندراج نہیں اور کسی بھی کھاتے سے اس کے کوائف معلوم نہیں کیے جا سکتے۔ یہ بس ایک اتفاقی اور کیثرول سٹوڈنٹ ہے جو وقت آنے پر ایک عارضی طالب علم کی حیثیت سے امتحان دے گا اور پرائیویٹ بی۔ اے کرے گا۔ میں وہاں تھا ضرور لیکن وہاں کا نہیں تھا۔ میں بابا جی کو ایک استاد مانتا تھا' ایک سکالر سمجھتا تھا' وقت کا عظیم ترین دانشور گردانتا تھا لیکن انہیں اپنا گرو یا اپنا مرشد مانتے ہوئے میرے اندر رکاوٹیں پیدا ہو جاتی تھیں۔

جب بھی میں اُن کے آگے ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر انہیں اپنا مرشد سائیں ماننے کے لیے آگے بڑھا میرے اندر پرانے زنگ کی زنگ آلودہ بریکیں لگنے سے اتنا شور اٹھا کہ میں خود گھبرا کر ایک طرف کو ہو گیا اور اپنی انا کو بلا روک ٹوک پہلو سے

گزر جانے کے لیے راستہ دے دیا۔

اصل میں گرو ُسدھی موت ہوتا ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنا موت کی وادی میں داخل ہونا ہے۔ جو کوئی کم مرشد کی طرف جاتا ہے اپنی موت کی تلاش میں رواں ہوتا ہے۔ ایسی موت کی تلاش میں جس میں کچھ بچتا ہی نہیں سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے۔ راکھ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ ہونے کا کوئی نشان ہی باقی نہیں رہتا۔ دوسری موت میں تو انسان کا جسم مر جاتا ہے۔ وجود فنا ہو جاتا ہے۔ بدن ختم ہو جاتا ہے لیکن شعور باقی رہتا ہے۔ جو آگے جاتا ہے ایک نئی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ ایک اور زندگی کا "لمس" حاصل کرتا ہے مگر مرشد اختیار کرنے کی موت تو سبھی کچھ لے ڈوبتی ہے اس میں شعور بھی باقی نہیں رہتا۔ سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ بس لافانی عنصر باقی رہ جاتا ہے۔!

بابا جی کے ڈیرے پر جانا موت سے کم نہ تھا۔ شہاب نے لکھا تھا "اب تو تم خوش خوش ہر روز ڈیرے پر چار مزے مزے کے کھانے کھا رہے ہو اور اصیل مرغ کی طرح گردن پھلائے پھرتے ہو لیکن تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ تم اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھود رہے ہو۔"

واقعی مرشد کا سب سے بڑا ظلم یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی انا کو مار کر بھسم کر دیتا ہے۔ آپ اس کو بچانے کی کوشش کرتے ہو۔ اس انا کے گرد آکسیجن ٹینٹ اٹھاتے ہو۔ اسے بادام چھوہارے کھلا کر موٹا کرتے ہو۔ یخنی پلا کر مقابلے میں لاتے ہو اور مرشد ظالم تم سے بغلگیر ہوتے وقت شیوا جی کا پنجہ تمہارے وجود کے افضل خان میں اتار کر تمہیں ڈھیر کر دے گا۔ ختم کر دے گا۔ اپنے مرشد سائیں کے پاس جانے والا ہر بدنصیب اپنی خوار و پریشان اور دردمند انا کو صحت عطا کروانے کے لیے آتا ہے۔ اپنی زخمی فاختہ کو ہلدی چونہ لگوانے کے لیے پیر کے دوارے آتا ہے اور ہر طرف سے تو اس کی انا مجروح ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کا سارا وجود چھلنی ہو چکا ہوتا ہے۔ ایک ایک زخم پر سو سو پھاہے ہوتے ہیں اور طبیب ایسا ظالم ملتا ہے کہ نبض دیکھتے دیکھتے' تم کو تمہاری بیماری کو تمہارے وجود کو تمہارے مدعا کو ہی خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ یہ مرشد لوگ صرف کشتہ بنانے کے فن سے ہی آشنا ہوتے ہیں اور ان کو کچھ آتا ہی نہیں۔

میں اپنا کشتہ بنوانا نہیں چاہتا تھا اس لیے بابا جی سے دور رہا۔ چونکہ میں وہاں آنے والے سارے لوگوں سے زیادہ تعلیم یافتہ' زیادہ ہنرمند' زیادہ روشن خیال اور زیادہ صاحب فکر تھا اس لیے میں کیکر کی سوکھی ٹہنی پر بیٹھا کانے کوے کی طرح گردن گھما گھما کے ان ٹکڑوں کو دیکھا کرتا تھا جو میرے سامنے ڈالے جاتے تھے۔ کئی کبوتر' فاختائیں' پودنے پدے اور کھٹ بڑھئی پکڑے جا چکے تھے لیکن میں محفوظ تھا۔

مرشد کو مرشد ماننا' اس کی بیعت کرنا' اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ایک اعتراف ہے۔ ایک اقرار ہے' ایک عہد نامے پر انگوٹھا لگانا ہے کہ میں نے اپنا آپ تمہارے حوالے کیا۔ اب میرے ساتھ جو چاہے کرو جس طرح سے چاہے رکھو۔ زندہ یا مردہ' قلندر کے بھالو کی طرح یا مداری کے بندر کی طرح۔ میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ نچواؤ گے تو ناچوں گا۔ دو گے تو کھا لوں گا۔ پہناؤ گے تو پہن لوں گا۔ خود کچھ نہیں کروں گا۔ خود کچھ نہیں مانگوں گا۔ خود نہیں بولوں گا۔

میرے بائیں گال پر آنکھ کے عین نیچے ایک بڑا سا مسہ ہو گیا تھا۔ ٹی وی پروگراموں میں جب ڈیڈی کیمرہ مین

زوم ان کرتا تو ساتھ ہی پکار کر کہتا "سر جی! اس سائیڈ سے نہ لیں۔ گال پر سوکھا سہوڑہ چہرے سے بھی پہلے آ جاتا ہے۔ بہت برا لگتا ہے۔" کچھ عرصہ تو نثار حسین رائٹ سائیڈ کا پروفیل لیتا رہا پھر اُس نے کہا "اشفاق صاحب اس کا کچھ بندوبست کریں یوں بھی گہری جڑوں والا مسہ ٹھیک نہیں ہوتا۔"

طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک روز بانو مجھے سرجن کے پاس لے کر گئی تو ڈاکٹر احسان نے مجھے سرجری میں لے جاتے ہوئے بانو سے کہا "آپا آپ کی حد اس دروازے پر ختم ہو جاتی ہے۔ اشفاق صاحب کو پورے کا پورا میرے حوالے کرنا پڑے گا اور مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔" بانو رک گئی۔ سرجن مجھے لے کر اندر آ گیا۔ وہ دن میری زندگی کا خوفناک ترین دن تھا۔

میں آپریشن ٹیبل پر لیٹ چکا تھا اور میں نے اپنا جسم' اپنا وجود' اپنی جان اور اپنی انا سب کچھ سرجن کے حوالے کر دیا تھا۔ صرف حوالے ہی نہیں کر دیا تھا بلکہ خوش دلی سے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر احسان سے یہ شرط نہیں باندھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب میں نے اپنا آپ' آپ کے حوالے کیا۔ اپنا تن من دھن آپ کی سپرداری میں دیا لیکن میں اپنے شعور کو اپنے تصرف میں رکھوں گا اور آپریشن تھیٹر کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر اپنا آپریشن ہوتا دیکھوں گا کہ کس طرح سے مجھے بیہوش کرتے ہو' کس آلے کے ذریعے بلڈ پریشر پر نگہ رکھتے ہو۔ کس نشتر سے میرے چہرے پر شگاف دیتے ہو۔ کیسے گند اور رسولی نکالتے ہو اور پھر کس طرح سے ٹانکے لگاتے ہو۔ میں تمہارے سر پر موجود رہنا چاہتا ہوں۔ کوئی پتہ نہیں تم سے کوئی کوتاہی ہو جائے اور دنیا میرے قیمتی وجود سے محروم ہو جائے۔"

میں اپنے سرجن پر تو یہ شرط عائد نہ کر سکا لیکن بابا جی کو اپنا معالج مان کر بھی ان کے ساتھ اس بات پر ڈٹا رہا کہ میں اپنے سیلف کو کسی صورت میں بھی اُن کے حوالے نہیں کروں گا اور خودی بیچ بغیر غریبی میں نام پیدا کروں گا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میں بڑی ہشیاری اور دانشمندی کے ساتھ بابا جی سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن میرے پاس ان کو چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ کوئی دلیل نہیں تھی جو میری انگلی پکڑ کر مجھے اس دروازے سے باہر نکال لاتی جہاں میں خود بڑے شوق سے داخل ہوا تھا۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ میری اس سوچ کے ساتھ بابا جی کے رویے میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے میرے ساتھ علمی اور دینی باتوں کی خوراک میں کمی کر دی تھی۔ ڈائیلاگ بھی مسکراہٹوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ میرے تکنیک کے ترکشوں کے آگے' جن میں ایک ترکش میرا تھا اور بہت سے لوگوں کے فراہم کردہ تھے انہوں نے اپنی گفتگو کی اوٹ گرا دی تھی اور اپنا خاموش وجود میرے سامنے کر دیا تھا۔ اس میں نہ کوئی تعلیم تھی نہ تدریس نہ ڈائیلاگ نہ ملفوظات۔ بس خالی ایک وجود تھا جس میں کھڑکیاں سی کھلی تھیں۔ دریچے وا تھے اور دروازوں کے کواڑ غائب تھے۔ وہ ایک تجریدی تصویر سی بن گئے تھے جس کے اندر لنگر کھلے تھے۔ کھانا پک پک کر باہر آ رہا تھا۔ مسافر بسرا کرنے کے لیے اندر جا رہے تھے۔ صحن میں صفیں تھیں۔ کچھ لوگ نفل پڑھ رہے تھے' کچھ دسترخوان بچھا کر کھانا کھا رہے تھے اور کچھ گٹھلیاں پڑھ رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ مرشد ایک بہت ہی سمجھدار' عقلمند اور زیرک بابا ہوتا ہے۔ وہ تم کو دانش سے قائل نہیں کرتا

کیونکہ دانش کی ایک حد ہوتی ہے اور دانش تم کو دور تک نہیں لے جا سکتی۔ تمہارا سارا سامان اٹھا کر پہاڑ کے دامن تک لے جا سکتی ہے اس سے آگے کام نہیں دیتی۔ چوٹی تک پہنچنے کے لیے پہلے ٹٹو سے کام لینا پڑتا ہے پھر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ پیدل چلنے کا راستہ بھی مسدود ہو جاتا ہے پھر گند پھینک کر اور کیلیں ٹھونک ٹھونک کر اوپر اٹھنا پڑتا ہے۔ ان بابوں کو ان مرشدوں کو اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کہاں تک ساتھ دے گی اور کب تک ساتھ دے گی۔ اس لیے وہ آپ کو دانش سے قائل نہیں کرتے۔ پھر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دانش سے اور عقل کی باتوں سے تو تم سمجھ جاؤ گے کیونکہ اس میدان کے تم پرانے شہسوار ہو اور اس معاملے میں تو تمہاری کافی پریکٹس ہو چکی ہے۔ علم سے تو تم قائل ہو ہی جاؤ گے کہ اس گھسے پٹے پر تمہاری عقل صدیوں سے چکر کاٹ رہی ہے لیکن یہ قائل ہونا تمہارے اندر کوئی تبدیل پیدا نہیں کر سکے گا۔ تم عقلی طور پر معقول ہو جاؤ گے لیکن اصلی طور پر نہیں۔

میں بابا جی کے ملفوظات سن سن کر عقلی طور پر بالکل چت ہو چکا تھا۔ میرے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ تھے جو عقیدت کے فرش پر نیم مردہ پڑے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کے اندر سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں اٹھتی تھیں اور پھر معدوم ہو جاتی تھیں۔ ان کے ذہنوں میں انقلاب آ چکا تھا لیکن اُن کے رویے وہی تھے جن کے سروں پر گوٹے والی ٹوپیاں سجا کر یہ لوگ ڈیرے کے اندر داخل ہوئے تھے اور اپنے رویوں کو انہوں نے کھیلنے کھانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز جب بابا جی وضو کرنے کی غرض سے مسجد کی تپنی پر بیٹھے تھے میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا

"حضور! باطن کا سفر مرشد کی معیت کے بغیر بھی کیا جا سکتا ہے؟"

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گئے۔ میں نے دوبارہ پھر یہی سوال کیا تو انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "کیا جا سکتا ہے لیکن وہ صرف ایک ہی راستہ ہے۔"

پھر وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور میرے ریسونگ سینٹر کے ٹیون ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولے "وہ راستہ ہے عاجزی کا اور انکساری کا۔ حضرت آدم کی اُس سنت کا جب وہ شرمندگی کا سر جھکائے اور عجز کے ہاتھ سینے پر باندھے اللہ کے حضور میں حاضر ہو کر بولے کہ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔" بابا جی نے کہا "بس ایک یہی طریقہ ہے اور یہی رویہ ہے جسے اپنا کر مرشد کے بغیر باطن کا سفر کیا جا سکتا ہے۔ پھر آپ درختوں سے، پرندوں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے درس لے سکتے ہیں۔ پتھروں سے، بادلوں سے، ٹھوکروں سے گیان حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ساری دنیا آپ کو سبق دے سکتی ہے، ساری کائنات آپ کو رمز آشنا بنا سکتی ہے۔"

ہمارے اردگرد، ڈیرے پر (میرے حساب سے) دو تین افراد ایسے تھے جو باطن کے سفر میں کب کے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ ان کو نہ تو منزل کی پروا تھی اور نہ ہی منزل کا کوئی علم تھا۔ وہ بس سفر میں دلچسپی رکھتے تھے اور خوشی خوشی اپنی مسافت طے کیے جا رہے تھے۔ وہ دیوانے اور مستانے لوگ تھے۔ مجھے اپنی طرف ملتفت پا کر خوش ہوتے۔ ہاتھ لہرا کر میری توجہ کا جواب دیتے اور پھر آگے نکل جاتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ وہ اوباش لوگ یاد آ جاتے جو جنسی لذت حاصل کرنے کے لیے جنسی فعل میں مبتلا رہتے تھے۔ ان کے سامنے کسی تخلیق کی، بچے کی یا اولاد کی منزل نہیں ہوتی محض اس فعل

کے کیے جانے کا لپکا ہوتا ہے۔ جس طرح جوگنگ کرنے والوں کے سامنے بس جوگنگ کیے جانے کا ٹارگٹ ہوتا ہے اسی طرح اوباش لوگ بے دراو بے مقصود دھنیے کے تار پر اپنی جان دھنکتے جاتے ہیں اور اسی کو لذت کی معراج گردانتے ہیں۔ یہ لوگ... یہ اوباش اور بدچلن لوگ جب خوش قسمتی سے پٹڑی بدل کر باطن کے سفر میں اتر جائیں تو اُسی دیوانگی اور شوریدہ سری کے مومینٹم میں سب سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اپنی ذات کو اور خوبی کے ساتھ دھنکتے ہیں!

اپنی منزل پر نگہ رکھنے والے اور پھر اپنی منزل کو پا لینے والے لوگ عام طور پر درمیانے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی لہک یا لپک جھپک نہیں ہوتی۔ بدن پھینک کر بھاگنے والے گھوڑے کی لچک نہیں ہوتی۔ صرف اپنے ہدف کو پا لینے کی خواہش ہوتی۔ وہ جو لہو گرم رکھنے کا بہانہ ہوتا ہے وہ ان میں مفقود ہوتا ہے۔ بھلا کوئی منزل کو کس طرح سے پاسکتا ہے اور وہ منزل ہی کیا ہوئی جو پانے والے کے تصرف میں آ گئی۔

یہ وہ دن تھے جب میں نے ڈیرے پر بہت کچھ دیکھا۔ ایسی چیزیں جو اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھیں لیکن اتنا سارا مشاہدہ کرنے کے باوجود اور اتنا سارا کچھ دیکھنے کے باوصف میں نے کچھ سیکھا نہیں تھا۔ میرے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسے دس دس پندرہ پندرہ سال یورپ میں گزارنے اور اپنے ہاتھ سے سارے کام کرنے کے بعد جب ہماری خواتین واپس وطن آتی ہیں تو تیرہ دن کے بعد اُسی بیگماتی نظام کا شکار ہو جاتی ہیں جن میں تین گھریلو ملازم، دو سرکاری کارندے، دو دھوبی اور ایک سرونٹ کوارٹرز میں بٹھایا ہوا درزی ہر وقت بیگم صاحب کے اشارہ ابرو کے ساتھ چیلوں کی طرح بندھے ہوتے ہیں۔ بیگم صاحبہ یورپ کے اعلیٰ معاشرتی نظام اور مغرب کے خودکار سیاسی سسٹم اور نجی ملازموں سے پاک معاشرے کا ذکر بھی کیے جاتی ہیں اور اکرم کو بلا کر حکم بھی دیتی جاتی ہیں کہ ٹرالی واپس لے جاؤ۔ آیا کو بتا دو کہ بچوں کو آج کوکر واپس نہیں دینے اور رانی کو بھیجو کہ گیلی ٹاکی لا کر یہاں فرش پر پھیرے، بچوں نے بھورے چورے گرا دیئے ہیں اور نظام دین صاحب کے پاس چلا جائے آج شیشے صاف نہیں کروانے۔ پھر وہ اپنی سہیلیوں کو بتاتی ہیں کہ ولایت میں چاہے کوئی گورنر کی بیوی ہو اپنا کام اسے خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ کہیں کہیں بڑے بڑے گھرانوں میں ایک "ہیلپ" ضرور ہوتی ہے جو ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ آتی ہے اور بیگم صاحب کے اڑے تھڑے کام کرنے میں ان کی مدد کرتی ہے اور شام کو چالیس ڈالر لے کر چلی جاتی ہے۔

میں نے ڈیرے پر بہت کچھ دیکھا تھا۔ انسانی برتری کی بہت سی مثالیں قریب سے آ گئی تھیں۔ بابا جی کو خلوت جلوت میں دور سے اور قریب سے دیکھا تھا۔ میرے پاس بہت سے واقعات، بہت سی کہانیاں، بہت سے قصے جمع ہو گئے تھے لیکن جس تبدیلی کی غرض سے میں وہاں گیا وہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اس تبدیلی کے کوئی آثار بھی نمودار نہیں ہوئے تھے۔ گفتگو کے معاملے میں البتہ میں قریب قریب لسان العصر ہو گیا تھا اور اٹھتے بیٹھتے ایسی باتیں کرنے لگا تھا جس سے میرے اردگرد کے لوگ اس خوشگوار شک میں مبتلا ہو گئے تھے کہ میں تصوف کی بہت سی منازل طے کر گیا ہوں اور اب آخری تین چار باقی رہ گئی ہیں۔ اپنے جاننے والوں اور اردگرد کے لوگوں میں ایسی غلط فہمی کے عام ہونے سے طبیعت میں ایک خاص قسم کی بشاشت پیدا ہو گئی تھی اور میں ریشم کے کیڑے کی طرح ایک انجانے سرور کے کوئے میں لپٹا جا رہا تھا۔ اس کے

ساتھ ساتھ کبھی کبھی طبیعت پر بہت بھاری بوجھ بھی پڑ جاتا تھا کہ یہ تو سب گفتگو ہے۔ قال ہی قال ہے اس میں عمل کا تو ہم بھی نہیں اور تم وہ ہو نہیں جس کا تم دعوئی کرتے ہو اور تم ہر وقت وہ کہتے رہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔

ایک روز جب میرے ضمیر کا بوجھ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو میں نے باباجی سے پوچھا ''حضور! اس زندگی میں قال کا بھی کوئی مقام ہے کہ یہ انسان کو پستی کی طرف لے جانے ہی کا ایک ذریعہ ہے۔'' کہنے لگے ''قال کا بڑا درجہ ہے کہ اس سیڑھی کی بدولت اوپر کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا ''حضور میں تو قال کو ایک بے معنی اور لایعنی شے سمجھتا ہوں کہ منافقت میں اتارنے کی ایک کھنچی ہے جو انسان کو تحت السرائے میں اتار دیتی ہے۔''

سنجیدگی سے کہنے لگے ''بیٹا! آپ کی بیوی آپ پر محض قال سے حلال ہوئی ہے۔ ورنہ آپ نے کوئی تلوار چلا کر نیزہ بازی دکھا کر یا ہزار بندوں کو کھانا کھلا کر تو اُسے نہیں جیتا تھا۔ آپ نے سادہ سا لفظ بولا ''ہاں جی قبول' اور ہماری بیٹی آپ کی بیوی بن گئی۔ قال کا بڑا مقام ہے لیکن کچھ لوگ اس سیڑھی کے پہلے ڈنڈے پر ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اوپر چڑھ کر نظارہ نہیں کر سکتے اور آخری پیغام آ جاتا ہے۔''

اب یہ ایک اور دھچکا تھا۔ ہم تو ساری عمر عمل کو ہی شرف انسانی کا تاج سمجھتے رہے تھے اور دنیا بھر کے دستاویزی علم میں اسی کا چرچا ملتا تھا۔ لیکن اب ایک اور بات ایک بہت ہی پکی اور مستحکم بات اس علم کا راستہ کاٹ کر گزر گئی تھی اور اس نے میرے ذہن پر گہری لکیر چھوڑ دی تھی۔

واقعی اس وقت ساری دنیا آزادی عمل کے لیے نہیں آزادی اظہار کے لیے تڑپ رہی تھی۔ اظہار عمل سے مقدم ہے۔ عمل سے معتبر ہے۔ بولنے کی اور بولتے چلے جانے کی طلب اتم ہے۔ جس کو یہ مل گئی اُس کو دنیا میں کسی اور شے کی حاجت نہ رہی۔ اصل میں گفتگو ہی ایک ایسی چابی ہے جو سوسائٹی کے اندر داخل ہونے کا بند دروازہ کھولتی ہے۔ آپ صرف گفتگو کے ذریعے لوگوں سے متعارف ہوتے ہیں' اسی کی بدولت اُن کے دوست بنتے' اسی سے ان کا دل جیتتے ہیں اور اسی ہتھیار سے انہیں قتل کرتے ہیں۔ عمل سے اور اپنے کسی فعل سے آپ لوگوں کے دل نہیں جیت سکتے۔ محض عمل کے ذریعے آپ کسی معاشرے کا حصہ نہیں بن سکتے۔ صرف کارکردگی آپ کو کسی گروہ کا ممبر نہیں بنا سکتی۔ جب تک آپ بولیں گے نہیں' اظہار نہیں کریں گے' بیان نہیں دیں گے' گفتگو نہیں کریں گے آپ اپنے گروہ سے پرے پرے اور دور دور رہیں گے۔ جونہی آپ بولنا شروع کریں گے ایک گروہ انسانی فوراً آپ کے گرد جمع ہو جائے گا۔ اگر آپ اور بولیں گے' بہتر بولیں گے اور بے تکان بولیں گے تو آپ کے ارد گرد جمع ہونے والا چھوٹا سا انسانی گروہ پھیل کر سمندر بن جائے گا اور آپ دو دنوں کے اندر اندر قلزم کنٹرول بن جائیں گے۔ انسانی زندگی میں قال کا بڑا مقام ہے اور صاحبان قال صاحبان حال سے اور صاحبانِ عمل سے ہمیشہ بازی لے جاتے ہیں۔ اس کرہ ارض پر جتنے بڑے بڑے ادارے' جس قدر وسیع دفتر اور جو بھی خوبصورت عمارتیں نظر آئیں گی ان کا تعلق صرف قال سے اور گفتار سے ہوگا۔ دنیا بھر کے ملکوں کے اسمبلی ہال' ان کی عدالتیں' ان کے ہال' ان کی عبادت گاہیں' ان کے تھیٹر' سینما گھر' فورم پھر یو این او کی عمارت' سلامتی کونسل کے ہال اور دفاتر

ملک ملک پھیلے ہوئے ان کے ذیلی ادارے' ہر مقام پر گفتگو کے مخصوص اور قال کے لیے مختص ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لوگ فریڈم آف ایکسپریشن کے لیے لڑتے ہیں' فریڈم آف پرفارمنس کے لیے کوئی جھگڑا نہیں کرتے۔ اپنے اظہار کے لیے' اپنی گفتار کے لیے' اپنے بیان کے لیے' اپنے بھاشن کے لیے آزادی مانگتے ہیں لیکن اپنے عمل کے لیے' اپنی کارکردگی کے لیے' اپنے عمل کے لیے کوئی لائسنس نہیں مانگتے۔ حقیقت میں قول کا درجہ فعل سے بلند تر ہے یعنی انسانی زندگی کا بلند ترین مقام قول ہی سے وابستہ ہے۔ ایتھنز کے فورم سے لے کر آج کی یونیورسٹیوں تک۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے سات آٹھ لٹھ بند قسم کے دھوتو سے لوگ ڈیرے پر آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ''ہم بابا سائیں فضل شاہ صاحب کی زیارت کرنے آئے ہیں اور ان کی چوکی بھرنا چاہتے ہیں۔''

سب لوگ' اپنی اپنی جگہ حیرت سے ان کا منہ تکنے لگے اور کسی نے اُن کی بات کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ انہوں نے پھر کہا ''جناب ہم لیہ سے آئے ہیں اور باباجی کی چوکی بھرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضور کو اطلاع ہو جائے تو ہمارا آنا بارور ہو جائے۔'' ڈاکٹر صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے لگے۔

ان کے ہاتھوں میں پرانے کھیسوں اور پھٹی ہوئی چوتہیوں کے اندر بندھے ہوئے سامان سے یہ ضرور پتہ چلتا تھا کہ ان میں آلات موسیقی لپٹے ہوئے ہیں لیکن ان کی شکلوں سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ قوالوں کا طائفہ ہے اور سر سنگیت کے اسرار کا محرم ہے۔ میں نے ان سے اپنی نسبی شرافت کا زبانی اظہار کرتے ہوئے کہا ''بیٹھ جاؤ۔'' تو وہ وہیں راستے ہی میں اکڑوں بیٹھ گئے اور میری طرف شکر گزار نظروں سے دیکھنے لگے۔

سیکرٹری صاحب کو ان کی بیچارگی پر ترس آیا تو انہوں نے تھڑے کے پاس پڑے ہوئے سرس کے تنے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اس پر بیٹھ جاؤ۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ہم سب کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے ہوئے تنے پر بیٹھ گئے۔ یہ تنا کئی سال سے اسی جگہ' اسی طرح سے پڑا تھا اور اس پر سے کئی بارشیں' کئی دھوپیں' کئی آندھیاں اور گند گوبر کے بے شمار تودے گزر چکے تھے۔ اس کے ساتھ بھینس' بکریاں اور ان کے بچے بندھتے تھے اور اکثر تند خو لوگ اس پر ایک پاؤں جما کر دوسرے سے تکرار بھی کر لیتے تھے۔

لوگ مکے جائیں' مدینے جائیں' تیرتھ یاترا کر آئیں' تخت پر بیٹھیں' ہوائی جہاز میں اڑ لیں۔ اسمبلی سے ہو آئیں' ہائی کورٹ کی منصفی کر لیں' گٹر میں اتر کر ماپے ڈھولے گا لیں رہتے ایک جیسے ہی ہیں۔ ڈیروں پر آنے والے طالبان حق اور باطن کے مسافر بھی ڈبکیاں ہی کھاتے رہتے ہیں اور قدم قدم پر ان کے گوڈے لگتے رہتے ہیں۔ محبت اور مدارت کے معاملے میں ان کا رویہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کرسمس کے روز گورے پادریوں کے چہرے پر پیار اور پریم کے آثار اور لاڈ اور Love کے تریڑے۔

بابا جی اندر سے برآمد ہوئے تو انہوں نے ان کی وضع قطع، شکل وصورت اور لطف و کرم کی لو سے پہچان کر دونوں ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔ وہ سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیے۔

بابا جی نے پکار کر کہا "او بھئی خدا کے بندو! نورو الو! وہاں کہاں بیٹھ گئے۔ یہ چار پائیاں بچھی ہیں، بنچ پڑا ہے، دری بچھی ہے، اس پر بیٹھو۔ ڈیرے پر آ کر دوریاں نہیں کھیلا کرتے، ساتھ ساتھ رہا کرتے ہیں۔"

وہ اپنی اپنی گٹھڑی اٹھا کر، سیدھی قطار میں ایک ساتھ آگے بڑھے اور بابا جی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے بڑی عمر کے آدمی نے جس نے سر پر مفلر لپیٹا ہوا تھا اور کندھوں پر بڑے بڑے سوراخوں والی نسواری لوئی کی بکل ماری ہوئی تھی، ہاتھ باندھ کر بولا "حضور! ہم لیہ سے آئے ہیں اور سرکار کی چوکی بھرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے علاقے کے مشہور قوال ہیں لیکن اب وہاں کوئی کام نہیں رہا۔ حضور سے دُعا کرانے آئے ہیں۔"

دوسرے نے کہا "حضور ہمارے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں....!" وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا گلا بند ہو گیا اور رگیں سی پھول گئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اخبار سے نظریں اٹھا کر انہیں بھرپور انداز میں دیکھا اور ایک لفظ بولے بغیر کہا "اوئے لاؤ! لیہ میں قوال نہیں ہوتے، دوسرے تمہاری شکلیں اور تمہارے وجود ایسے بکھد اور ناقص ہیں کہ کم از کم تم قوال نہیں ہو سکتے۔"

جب وہ آرام وسکون کے ساتھ اپنی اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھ گئے تو بابا جلال لنگر کے سامان کی چنگیر لے کر آ گیا۔ قوالوں کے آگو نے کہا "حضور کھانا تو ہم کھا کر آئے ہیں۔"

بابا جی نے کہا "تم تو جان کار ہو بھائی، ڈیروں پر کھانا کھا کے نہیں آیا کرتے۔ آ کے کھایا کرتے ہیں۔ اب تھوڑا کچھ تو چکھنا پڑے گا۔ نہیں تو ہماری ریت ٹوٹ جائے گی۔"

ان سب نے بسم اللہ! بسم اللہ!! کہہ کر سالن کے کٹورے اپنے سامنے رکھ لیے اور روٹیاں ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گئے۔

صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بھوکے ہیں۔ آج کے نہیں، اُس دن کے جب انہوں نے سفر شروع کیا تھا۔

بابا جی اُن کے پاس جا کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے بھی اپنے خرگوش ایسے کان کھڑے کر کے کان کا انٹینا ادھر کو گھما دیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اصل میں ان کے باپ دادا قوال تھے اور اپنے زمانے میں افریقہ کے کئی ملکوں کے چکر لگا آئے تھے۔ جالندھر اور شام چوراسی میں ان کے ددھیال اور ننھیال کی پکی حویلیاں تھیں۔ ان کے ماما ہر بلوچے کے میلے میں دھرپد کی راگداری کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور ہر سال نئے رنگ اور نئی سوچ سے کرتے تھے۔ اب ہم لیہ میں بھٹہ پر اینٹیں پاتھنے کا کام کرتے ہیں اور ٹھیکیدار کے ہاتھوں رہن ہیں اور ہم میں سے یہ چھوٹا "اونی ٹوپی والا" یہ تحصیل میں چپڑاسی ہے اور اس کی بیوی زنانہ سکول میں بلاوی ہے۔ بس یہی ہم میں خوشحال ہے۔ باقی سب کی حالت آپ کے سامنے ہے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد بابا جی نے اُن سے کہا "لو بھئی ابھی چوکی بھر لو پھر سب کو اپنے اپنے کام پر جانا ہے، حاضری کم ہو گئی تو تم لوگوں کو مزا نہیں آئے گا۔"

فوراً دریاں، صفیں، کمبل اور بورے بچھ کر سٹیڈیم تیار ہو گیا۔ بابا جی کے لیے ان کا رتی کا گدا بچھ گیا۔ ہم سب ان کے اردگرد نیم دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے اور ہمارے سامنے قوالوں نے بڑے ادب کے ساتھ دو زانو ہو کر اپنی گٹھڑیاں کھولنی شروع کر دیں۔ ایک کھیس سے ایسا بارمونیم برآمد ہوا جس کے اندر چھ سات پتیاں تھیں۔ باقی سریں دبانے پر باجہ دھوپ میں سوئے ہوئے بڈھے بابے کی طرح منہ سے پھونک چھوڑ دیتا تھا۔ ساری چابیاں ٹک ٹک ٹک ایسے زور سے بجتی تھیں کہ باجے سے صرف انہی کی آواز آتی تھی۔ پھونک بھرنے کی دھونکنی میں بہت سے غیر مرئی سوراخ تھے اس لیے ان کا پنکھا تیزی سے چلانا پڑتا تھا۔ کچھ پردے ایک مرتبہ انگلی سے دب کر خود اوپر نہیں اٹھتے تھے انہیں ہر بار اٹھانا پڑتا تھا۔

طبلوں کے کھیس میں سے صرف ایک طبلہ برآمد ہوا۔ بایاں.... اُس کا پڑا موسموں کے تغیر و تبدل کی وجہ سے ڈھیلا ہو چکا تھا۔ جب طبلچی نے اسے نیسٹ کیا تو اُس میں سے گمک کے بجائے جھائیں جھائیں کی صدا بلند ہوئی۔ اس نے کھسیانی بلی کی طرح طبلے کی بدیاں نوچنا شروع کر دیں لیکن اُن میں کساوٹ پیدا نہ ہوئی۔

ہیڈ قوال نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر دست بستہ بابا جی سے اجازت طلب کی اور اشارہ پانے پر الاپ شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ چھوٹے قوال نے آنس بھری۔ پھر باجے والے نے ایک دو ہزہ الاپا اور قوالی کا ٹیک آف شروع ہو گیا۔ بابا جی نے جھوم کر اور سر ہلا کر انہیں داد دی اور وہ شہ پا کر اور بھی گرم ہو گئے۔

سیکرٹری صاحب نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اور اُسے ہاتھوں کے کٹورے میں رکھ کر بابا جی کے سامنے پیش کیا۔ پیشتر اس کے کہ بابا جی اسے اچھی طرح سے ہاتھوں کے تصرف میں کرتے بڑا قوال اُسے اچک کر سلام کرتا ہوا طبلے والے پاؤں اپنی صف میں پہنچ گیا۔ پھر بابا جی نے اپنی گودڑی سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اپنی چٹکی میں پکڑا اور ہیڈ قوال اُسے چٹکی سے کھینچا مار کر لے گیا۔ بابا جلال نے بھی حضور کی وساطت سے ایک روپیہ دیا۔ لیکن زیادہ تر بابا جی ہی رقم لٹاتے اور روپے اڑاتے رہے۔ جیبوں کے کونوں کھدروں سے کچھ اٹھنیاں، چونیاں برآمد ہوئیں وہ بھی آپ نے ان کے حوالے کر دیں۔ پھر اٹھ کر اندر گئے اور نوٹوں سے جیبوں بھر لائے۔ میں نے اور ڈاکٹر صاحب نے انہیں کچھ کہا تو نہیں البتہ ایک دوسرے سے نگاہیں ملا کر بابا جی کے اس فعل پر خاموش تنقید ضرور کی۔ کئی مرتبہ حضور ایسی باتیں کر جاتے تھے جن پر ہمیں اپنے دل کی گہرائیوں سے پرسکوت تنقید کرنا پڑتی تھی اور بڑے ادب کے ساتھ بے صدا احتجاج کرنا ضروری ہو جاتا تھا۔

اس وقت قوال جو "گا" رہے تھے وہ بابا بلھے شاہ کی ایک کافی تھی جس میں تین صوفیوں کا کلام ایک ساتھ چل رہا تھا۔ حضرت سلطان باہو کا، حضرت شاہ حسین کا اور حضرت میراں بھیکھ صاحب کا۔ بیچ بیچ کے کسی مصرعے میں ایک آدھ ٹکڑا یا چند الفاظ بابا بلھے شاہ کے بھی آ جاتے تھے۔ میں جب بھی ان قوالوں کی آواز، ادائیگی یا کلام پر ناک بھوں چڑھاتا، بابا جی روپے کا، پانچ کا یا دس کا نوٹ میری طرف بڑھا کر سر سے اثبات کا اشارہ کر کے فرماتے "جاؤ اور جا کر انہیں دے کر آؤ" میں طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے اٹھتا اور ہیڈ قوال صاحب کی جھولی میں نوٹ پھینک کر واپس آ جاتا۔

طبلے والا، دوسرا طبلہ نہ ہونے کی وجہ سے اسی ایک بائیں کو دونوں ہاتھوں سے "بجا" رہا تھا اور ساتھ ساتھ بول

بھی اٹھالیتا تھا۔ ہارمونیم والا زیادہ تر انہی سروں پر رہتا جن کی چپنیاں کام کرتی تھیں لیکن راگداری کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اُسے تھوتھے پردوں پر بھی جانا پڑ جاتا تھا لیکن یہ ایسے تھوتھے پردے تھے جو گھنا باجنے سے معذور تھے۔ وہ سارے سرگم ٹک' ٹکا ٹکا بجا کر آگے نکل جاتے تھے اور بایاں بجانے والا ان سے پیچھے رہ جاتا تھا۔

جب سارے سامعین نے اور خاص طور پر ڈیرے کے سارے سٹاف نے لیہ سے آنے والے ان معزز قوالوں کی کارکردگی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ایک دوسرے سے نظریں ملا کر ناراض سے چہرے بنائے تو میں نے باباجی کی طرف جھک کر کہا "سماع ہمارے مذہب میں جائز ہے؟"

باباجی نے میری طرف غور سے دیکھا اور اپنا بھاری بھرکم ہاتھ میری کلائی پر رکھ کر بولے "ان لوگوں کے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں اور یہ بڑی دور سے بڑی آس لے کر آئے ہیں۔ اگر تو اس قوالی سے ان کے اہل و عیال کا کچھ بن جائے تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔"

"لنگر"

مجھے کھانے پکانے کی ترکیبوں سے بڑا لگاؤ ہے۔ اب پکانے میں تو کوئی ایسی دلچسپی نہیں رہی لیکن ترکیبوں کے ساتھ اب بھی بڑا شغف ہے۔ گھر میں کوئی رسالہ ہو انگریزی کا یا اردو کا میں اس کے آخر میں کھانے پکانے کی ترکیبوں کو اب بھی پڑھتا ہوں۔ ٹی وی پر کھانے پکانے کے پروگرام چونکہ زیادہ وقت لے لیتے ہیں اس لیے میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔

میرے باباجی سائیں فضل شاہ صاحب جب حیات تھے تو ان کے ڈیرے پر بڑا لنگر چلتا تھا۔ لوگ دور دور سے یہاں آ کر کھانا کھاتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے صاحب حیثیت لوگ بھی ہوتے تھے۔ چھابڑی فروش اور مزدور بھی اور سڑکوں کے خاکروب بھی۔

لنگر کا یا عوامی ضیافت کا کسی اور مذہب میں چلن نہیں ماسوائے سکھ مذہب کے۔ ہندوؤں میں' عیسائیوں میں' یہودیوں میں' بودھوں میں لنگر کا ایسا رخ نہیں ہے جیسا مسلمان صوفیوں اور درویشوں کے یہاں ہے۔ ہمارے گھروں میں بھی اس کے اثرات موجود ہیں اور پرانی آبادیوں میں اب بھی بیبیاں خاص دنوں یا تہواروں پر حلوہ' ٹکیاں' پوریاں اور کھیر وغیرہ پکا کر اردگرد کے گھروں میں پہنچایا کرتی ہیں۔

لیکن لنگر کا اصل فلسفہ اور اس کی صحیح حقیقت بابوں کے پاس رہ کر ہی معلوم ہوتی ہے۔

صبح صبح ڈھیر ساری سبزیاں منڈی سے لا کر اور انہیں بڑی سی چارپائی پر پھیلا کر باباجی ان کے پاس کھڑے ہو کر خوش کن لہجہ میں فرمایا کرتے تھے "واہ جی واہ۔ قربان جائیں۔ اس نیبو کو دیکھو اور ک پر نظر کرو' ہرا دھنیا دیکھو بغیر کسی

اعلان کے بغیر کسی خواہش کے بغیر کسی انعام کے بغیر کسی دکھاوے کے کیا اعلیٰ درجے کی خوشبوئیں چھوڑ رہے ہیں۔ بس اس کی توقع انسان سے ہے کہ جو روح اُس میں پھونکی گئی تھی بغیر کسی دکھاوے کے اور بغیر کسی شیخی کے اور بغیر کسی اعلان کے خوشبو چھوڑتا جائے اور اردگرد کو مالا مال کرتا جائے۔ پھر وہ کہتے دوسری سبزیاں بھی خوشبو دے رہی ہیں لیکن وہ ذرا شرمیلی ہیں۔ اس کدو کی اپنی خوشبو ہے۔ بینگن کی بھنڈی کی' گاجر کی' ساگ کی۔ یہ اپنی اپنی خوشبو کے ذریعے آپ سے بات کرتی ہیں۔ ان کی باتیں سنا کرو۔ جواب دیا کرو۔ باورچی خانے میں بیٹھا کرو۔

فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی لنگر ضرور پکایا کرو۔ پکانے والا اشیائے خوردنی اور ماحضر کے ساتھ ساتھ اپنا آپ بھی کھانے والے پر نثار کرتا ہے۔ اپنا آپ بھی پیش کرتا ہے۔

تائی تیلن نے آپا کو ساگ پکانا سکھایا

ہر بڑے ڈیرے پر ایک بڑا لانگری موجود ہوتا ہے۔ ہمارے باباجی کے ڈیرے پر بھائی احمد علی صاحب ہیڈ لانگری تھے۔ میں نے ساڑھے بارہ برس ان کو کسی سے کوئی بات کرتے نہیں دیکھا۔ سلام کا جواب بڑی محبت اور متانت سے دیتے تھے لیکن پھر اپنے چولہے کے ساتھ محو تکلم ہو جاتے تھے۔ جس طرح جلترنگ بجانے والا اپنے ساز کی پیالیوں میں پانی بڑھاتا گھٹاتا رہتا ہے بھائی احمد علی چولہے میں لکڑیوں کو آگے پیچھے کرتے رہتے تھے۔ اس موومنٹ سے ان کے دیگچے کے اندر کی آواز بھی تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ چھوٹے لانگری (جو ہر روز بدلتے رہتے تھے) ان کی آنکھ کے اشاروں کو سمجھتے تھے اور اس خاموشی کے ساتھ کام کرتے تھے جو خاموشی بھائی احمد علی صاحب تقسیم کرتے تھے۔

باباجی نے بتایا کہ اگلے وقتوں میں لوگ گدائی کر کے اور اپنے علاقے کے گھروں پر جا کر صدا لگا کر رسد اکٹھی کر کے لاتے تھے اور لنگر میں شامل کرتے تھے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ معزز سردار' تعلقدار' سرکاری ملازم' مزدور' منشی' مقتدی' مدرس' پیشہ ور۔ گدائی کرنے سے ان کے تکبر میں کمی آتی تھی اور وہ ابلیس کی جماعت سے نکل کر سجدہ کرنے والوں کے جیش میں شامل ہو جاتے تھے۔

اب بھی لوگ خواجہ اجمیری کی درگاہ پر بڑی دیگ میں رسد ڈالنے کے لیے گھروں سے سودے لے کر آتے ہیں۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں گدائی کر کے کچھ رسد لے کر ڈیرے پر جاؤں گا اور لنگر میں شامل کروں گا تاکہ پرانی رسم کا اعادہ ہو۔ گھر کے پھاٹک سے باہر نکل کر جب میں نے ادھر ادھر دیکھا تو میرا حوصلہ نہ پڑا۔ میں اتنا بڑا آدمی ایک معزز اور مشہور ادیب کس طرح کسی کے گھر کی Bell بجا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں مانگنے آیا ہوں۔ میں چپ چاپ آ کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ لیکن چونکہ یہ خیال ذہن میں جاگزیں ہو چکا تھا اس لیے میں پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور بیوی کے پاس جا کر کہا "مجھے اللہ کے نام پر کچھ خیرات دو گی۔" وہ میری بات نہ سمجھی اور حیرانی سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے کہا مجھے اللہ کے نام پر کچھ آٹا خیرات کر دو۔ اس نے تعجب سے پوچھا تو میں نے کہا باباجی کے لنگر میں ڈالنا ہے۔ کہنے لگی ٹھہرئیے میں کوئی مضبوط سا شاپر تلاش کرتی ہوں۔ میں نے کہا شاپر نہیں میری جھولی میں ڈال دو۔

کیونکہ ایسے ہی مانگا جاتا ہے۔ وہ پھر نہیں سمجھی۔ جب میں نے ضد کی تو وہ آٹے کا ایک بڑا ''بول'' بھر لائی۔ میں نے اپنے کرتے کی جھولی اس کے آگے کر دی۔ اس نے آٹا میری جھولی میں ڈالتے ہوئے سر جھکا لیا اور آبدیدہ ہو گئی۔ پھر وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہاں سے دو بڑے بینگن اور ایک چھوٹا سا کدو لے کر آئی اور انھیں آٹے پر رکھ دیا۔ ہم دونوں کے شرمندہ شرمندہ اور غمناک چہروں کو ہمارا چھوٹا بیٹا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا محبوب لیمن ڈراپ تھا اور وہ اس سے چپٹا ہوا کاغذ اتار رہا تھا جب اس نے باپ کو جھولی پھیلائے دیکھا تو اس نے اپنا لیمن ڈراپ میری جھولی میں ڈال دیا۔ ہم دونوں میاں بیوی کی ایک ساتھ چیخ نکل گئی۔ جب کوئی گدائی کرتا ہے تو بھکاری اور داتا کے درمیان ایک نہ سنائی دینے والی چیخ ضرور ابھرتی ہے۔ بھکاری اپنی دریوزہ گری پر پشیمان ہوتا ہے اور داتا اپنی بے حقیقتی اور ناشدنی پر شرمندہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا موٹر کا دروازہ کھول کر مجھے اس میں بٹھا دو۔ کار کی چابی سلاٹ میں لگا دو اور جب میں سیٹ پر بیٹھ جاؤں تو گاڑی کا دروازہ بند کر دو۔

میں کھلی جھولی میں آٹا ڈالے آہستہ آہستہ کار چلاتا ڈیرے پر پہنچ گیا۔ باباجی کھڑے تھے مجھے جھولی دیکھ کر زور کا نعرہ لگایا۔ رحمتاں برکتاں والے آ گئے۔ نور والے آ گئے۔ منگتے آ گئے۔ منگتے آ گئے۔

میں نے سر جھکائے شرمندہ شرمندہ جھولی ان کے آگے کر دی۔ سراج تندورچی نے آٹا لے لیا۔ سبزی بھائی احمد علی کے حوالے کر دی۔ میں نے کہا اس میں ایک لیمن ڈراپ بھی ہے۔ بھائی احمد علی نے کہا بسم اللہ اس کا تو انتظار تھا۔ انہوں نے لیمن ڈراپ کا ریپر اتار کر بھنڈارے کے کھد بد پکتے کڑاہے میں ڈال دیا۔

باباجی نے کہا ''لنگر کے اندر بھنڈارے کے ساتھ ہزاروں لاکھوں آدمی وابستہ ہوتے ہیں اور لنگر کی کڑی بڑی دور تک جاتی ہے۔ یہ جو آٹا اشفاق صاحب لائے ہیں اس کے پیچھے ہزار سے زیادہ آدمیوں کی لائن لگی ہے۔ گندم بونے والے گندم اگانے والے نہر کا پانی سپلائی کرنے والے محکمہ نہر کا سارا عملہ۔ اگر ٹیوب ویل سے کھیت سیراب ہوا تو ٹیوب ویل کے مستری' کارندے' منشی' ڈیزل کی کمپنی' ڈیزل بردار جہاز' جہاز کا عملہ' ڈیزل نکالنے والے' صاف کرنے والے' سپلائی کرنے والے' منڈی کے آڑھتی' مزدور' پلے دار' آٹا پیسنے کی مل' مل کے مزدور' پلاسٹک کے تھیلے' پلاسٹک کا کارخانہ' کارخانے کے کارندے' چولہے پہ کام کرنے والے' لکڑی لانے والے لکڑہارے' جنگل رکھوں کے مالک' محکمہ جنگلات' ایندھن ڈھونے والے ٹرک' ٹرک کے مالک' ڈرائیور' کلینر...... پھر ہنس کر بولے یہ تو لاکھوں آدمیوں سے بھی بڑھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا حضور برتن بنانے والے۔ کچے برتن' پکے برتن' تام چینی کے برتن' مٹی کے برتن' پلاسٹک کے برتن' حضور لاکھ کے قریب تو یہی ہو گئے۔ فرمانے لگے دیکھو لنگر میں کیا برکت ہے کیا یک جہتی ہے۔ وحدت میں کل ہے۔ کل میں وحدت ہے۔

لنگر کے باہر کھانے والا کھانا نہیں کھاتا اخبار سامنے رکھ کر خبریں زہر مار کرتا ہے۔ ہوٹل کے ریڈیو پر بجنے والا میوزک سنتا ہے۔ احباب کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ کھانے کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہوتا۔

الگ الگ رہنے والا' الگ الگ سوچنے والا' اپنی ذات سے بھی الگ ہو جاتا ہے اور دوسروں سے بھی دور ہو جاتا ہے۔

روم کے کافی ہاؤس میں ایک معزز شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا آپ مشرق کے لوگوں کے ساتھ تو ہمیشہ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن کو عقل قبول نہیں کرتی لیکن کبھی کبھی مغربی دنیا میں بھی ایسے ہو جاتا ہے لیکن ہم اس کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ عقل اس کو قبول نہیں کرتی۔

کہنے لگا میں ریس کورس میں اپنے آخری سولیرے ہار کر جب باہر نکلا تو مجھے قریبی غسلخانے میں جانے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ وہاں گیا تو وہ سرکاری غسلخانہ تھا اور وہاں سولیرے (اٹھنی) کا سکہ ڈال کر دروازہ کھولا جا سکتا تھا۔ میری ساری جیبیں خالی تھیں اور میں غسلخانے کا دروازہ کھولنے سے معذور تھا۔

سڑک کنارے میں نے پارک میں بنچ پر بیٹھے ایک شخص سے آ کر اٹھنی مانگی تو اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے بڑی احتیاط کے ساتھ اٹھنی نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں بھاگا بھاگا پھر غسلخانے میں آیا اور ابھی اٹھنی Slot میں ڈال کر دروازہ کھلوانے والا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور اندر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کھلے دروازے کا پٹ تھام کر کھڑا ہو گیا کہ ایسے ہی اندر آ جایئے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اندر داخل ہو گیا۔

غسلخانے میں داخل ہونے کے بعد میں نے جلدی سے فراغت حاصل کی اور بھاگ کر پارک کی طرف گیا کہ اس شخص کو اٹھنی واپس کر دوں جو میں نے استعمال ہی نہ کی تھی۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا اور جا چکا تھا۔

میں نے عادتاً وہ اٹھنی سامنے لگی لاٹری مشین میں ڈال کر ہینڈل گھمایا تو اس کے جواب میں دس روپے کا ایک سکہ خانے میں آ گرا۔ میں نے دس روپے پھر مشین میں ڈال کر ہینڈل گھمایا تو سو روپے میرے تصرف میں آ گئے۔ سو روپے کی خطیر رقم لے کر میں پھر اس کورس کی طرف بھاگا۔ وہاں سے سب سے کمزور اور نامقبول گھوڑے پر میں نے پورے سو روپے لگا دیئے۔ بکی بھی مجھے منع کرتا رہا کہ دس روپے لگا لو سو بہت زیادہ ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں جانے دو۔

حیرانی کی بات ہے وہ نامقبول گھوڑا جھنڈی جیت گیا اور مجھے دس ہزار روپے مل گئے۔ وہ رقم لے کر میں گھر آ گیا۔ اگلے دن میں نے اخبار میں دیکھا کہ ایک ڈوبی ہوئی کمپنی کو زندہ کرنے کے لیے پھر شیئر فلوٹ کئے گئے ہیں۔ میں نے وہ دس ہزار سارے کے سارے اس بیمار کمپنی میں لگا دیئے۔ چھ مہینے تک ان حصوں کی شکل و صورت ویسی ہی رہی لیکن چھ مہینے کے بعد ان میں بڑھوتری کے آثار پیدا ہوئے اور میرے شیئرز دس لاکھ کے ہو گئے۔ وہاں سے میں نے باقاعدہ بزنس شروع کر دی اور چلتے چلتے میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں آپ سب لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اتنی ساری دولت' ایسی شہرت کمانے کے بعد مجھے آج تک ایک ہی چیز کی حسرت رہی اور وہ اب تک پوری نہیں ہوئی۔ میری آخری خواہش ہے....

میں نے کہا ''مجھے معلوم ہے آپ چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس آدمی کو ڈھونڈ نکالوں جس نے مجھے غسلخانہ کھولنے کے لیے اٹھنی دی تھی۔''

اس نے کہا ''نہیں مجھے اس شخص سے ملنے کی آرزو ہے جس نے میرے لیے دروازہ کھولا تھا اور کہا تھا
اندر آجایئے۔''

اصل میں جو آدمی آپ کے لیے کوئی دروازہ کھولتا ہے وہ آپ کا محسن ہوتا ہے اور جو دروازہ کھول کر کھڑا
کہ آپ داخل ہو جائیں وہ محسن عظیم ہوتا ہے اور اُس نے آپ کو ایک نئی جگہ تلاش کر کے دی ہوتی ہے۔

اماں جمعدارنی نے اندر آکر میری بیوی سے کہا ''بی بی! کل پانچ آدمی آئے ہیں۔ چار تو جوان ہیں پر ایک
عمر کا ہے۔''

میں اُس شیشے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا اور مجھے دفتر کے تین چار ایسے کام یاد آ رہے تھے جن کا کیا
آج ہی ضروری تھا۔ میں نے پوچھا ''ان کو کچھ دیا ہے؟''

اماں نے کہا ''لال دین ان سے پوچھ کر آیا ہے۔ نہ تو انہوں نے چائے پینی ہے نہ ہی شربت۔ وہ ڈیرے
ورد کر کے اور لسی پی کر چلے تھے۔ اب وہ دوپہر کے وقت صرف روٹی کھائیں گے اور شام کے کھانے سے پہلے پہلے
جائیں گے۔''

اماں جمعدارنی کی اس تفصیلی انفرمیشن سے میں بہت خوش ہوا اور بانو کے پاس جا کر بولا ''بہتر یہی ہے کہ تم
تک اماں کو اپنے پاس رکھ لو۔ یہ لکڑہاروں پر نگہ بھی رکھے گی اور تمہیں ان کی تفصیلات بھی بہم کرتی رہے گی۔ کاریگر لوگ
ہوتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی واردات ضرور کرتے ہیں۔''

میری بیوی نے چڑ کر کہا ''میں اسے گھر پر نہیں رکھوں گی۔ یہ لالچی بلی اُن سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور
اسے شروع سے جانتی ہوں۔ آپ آرام سے دفتر جائیں اور یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں سب پر نگہ رکھوں گی اور ہر
سے نمٹ لوں گی۔''

میں کوٹ انگلی پر لٹکا کر باہر نکلا تو پانچوں لکڑہارے پلاٹ میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور ایک دوسرے سے
کیے بنا اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر بڑا لکڑہارا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے بولا ''لو جی ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے ہیں۔ میرا
وریام ہے۔ یہ دو میرے بھتیجے ہیں۔ ایک میرا بھانجا ہے اور ایک میرے استاد کا بیٹا ہے۔ ہم انشاء اللہ شام تک فارغ
ہو جائیں گے اور آپ کے آنے تک سارا کام نپٹا لیں گے۔''

میں نے کہا ''میں تو اس کام کو ٹھیک سے سمجھتا نہیں۔ جو آپ مناسب سمجھیں وہی کریں میں البتہ شام سے
پہلے گھر پہنچ جاؤں گا۔''

اس نے کہا ''میں نے سلطان سے طے کر لیا تھا۔ ٹھیہ ہمارے شاہیں پتر غریب غربا کے گلی آپ کی۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے جو کچھ سلطان نے آپ سے طے کر لیا، وہی میں نے اُس کو سمجھایا تھا آپ کام شروع
میں شاید دوپہر کے وقت کھانا کھانے آؤں تو آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔''

یہ کہہ کر میں نے کوٹ موٹر میں رکھا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور دفتر روانہ ہو گیا۔ راستے بھر سوچتا گیا کہ یا اللہ یہ گلی کیا
کس کام آتی ہے اور میں اسے رکھ کر کیا کروں گا۔ ان سے پوچھا اس لیے نہیں کہ اس میں میری دانشوری پر حرف

دفتر پہنچنے سے ذرا سا پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر وہ فائل نہیں تھی جس سے آج کے ضروری کام
تھے۔

میں نے وہیں سے گاڑی موڑی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب میں نے گھر کے کھلے پھاٹک کے باہر گاڑی روکی تو بابا وریام دونوں ہاتھ باندھے سمبل کے تنے کے پاس
اور اس کے چاروں نوجوان نائب لکڑہارے سینے پر ہاتھ باندھے سر جھکائے اس کے پیچھے کھڑے تھے۔ بابے کے
دکھ اور کرب کے آثار نمایاں تھے اور وہ نیچی نظروں سے تنے کے ہالے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بندھے ہوئے
اور ڈبڈباتی آنکھوں سے چہرہ ذرا اوپر اٹھا کر درخت کے تنے پر نگاہیں گاڑ دیں اور اونچی آواز میں کہا:

سمبل بادشاہ! جنگلاں بناں کیا راجیا! تیرے پرکھ تجھ سے راضی رہیں! تیری نسل کا رستوں راہوں ندیوں دریاؤں
تیرے پھلار میں پنچھی پکھیروں کے آہنوں کی بستیاں آباد اور تیری چھاؤں میں ڈھور ڈنگر دلشاد رہیں۔ ہم
امر کے تحت تیرے حضور میں آئے ہیں اور امر کی مجبوری میں تیرے سامنے کھڑے ہیں۔ آج تیرے کاٹنے کا
ہے اور امر کے سامنے جتنا مجبور تو ہے اتنے ہی مجبور لکڑہارے ہیں۔ ہم کو اذن دے کہ اگلے جہان تیرے اور
درمیان حق حقوق کا جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے اور ہم غریب مارے نہ جائیں۔ ہماری نسلوں پر بھار نہ پڑ جائے.....

پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کھول کر تنے پر رکھے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا۔ پھر پلٹ کر بولا ''مبارک
اذن ہو گیا۔ میرا کلہاڑا دے راجن!''

اس کے بھانجے نے پیچھے ہٹ کر بابے وریام کا کلہاڑا اٹھایا اور اس کا پھل چوم کر بابے کو پکڑا دیا۔ بابے نے
سے اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں کہا ''بسم اللہ، اللہ اکبر، اللہ اکبر.....اللہ اکبر اور پھر تھالے کے پاس سمبل کے
لگایا اور پھر اسی طرح تک پیچھے کھڑے چھوٹے لکڑہارے کا اللہ اللہ کا ورد اونچی آواز میں کرتے جاتے تھے۔

میں نے دیکھا بابا وریام نے اپنے کلہاڑے کے ٹھیک ٹھیک منطبق نشانوں سے سمبل کے نچلے تنے میں کٹھی
ہلا ڈال دیا۔ پھر اُس نے پیچھے ہٹ کر اپنا کلہاڑا چھوٹے لکڑہارے کو دے دیا۔

مجھے گیٹ کے پاس کھڑے دیکھ کر اُس نے میرے قریب آ کر فخر سے کہا ''بڑا شہ جوان اور پاکباز رکھ ہے۔
اٹھارہ فٹ کے قریب ہو گی۔''

اس وقت مجھ پر کھلا کہ گلی کیا ہوتی ہے اور اس پر کس کا حق ہوتا ہے۔

میں ان کی اس گوربانی سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے جذبات میں آ کر اعلان کر دیا کہ ٹہنے بھی آپ کے۔ شاخیں اور پتر بھی آپ کے اور ساتھ ہی یہ اٹھارہ فٹ والی گلی بھی آپ کی۔ وہ سارے کے سارے میرا یہ اعلان سن کر حیرت میں آ گئے اور مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

بابا وریام نے کاسو سے کہا "لے تو جلدی سے جا اور گلی اٹھانے کا بندوبست کر۔"

کاسو الٹے پاؤں پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

پھر بابا وریام نے راجن سے کہا "تو اوپر چڑھ کر دیکھ کوئی پنچھی پکھیرو چینگر بوٹ آنڈہ بچوں تو کسی آلنے میں نہیں۔"

راجن اپنا کلہاڑا ساتھ لے کر اس قد آور درخت پر ایسے چڑھ گیا جیسے ہم لفٹ پکڑ کر چوتھی منزل پر جاتے ہیں۔ اس نے درخت کی پھننگ پر کھڑے ہو کر سارے سمبل پر نظر دوڑائی اور بولا "کچھ نہیں ماما۔ کوئی بھی نہیں۔"

وریام نے کہا "بسم اللہ کر کے ٹہنے کو ٹک لگا اور ساتھ کے ٹہنوں کو بچا۔ ان کو الٹا کلہاڑا نہ لگ جائے" راجن نے کہا تو فکر ای نہ کر ماما آج کوئی پہلی بار تو درگاہ پر نہیں چڑھا جو سائیں بادشاہ کو سٹ پھیٹ مار دوں گا۔"

میں نے کہا "آپ لوگوں کو اتنی اونچائی پر چڑھتے ہوئے کچھ حفاظتی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس طرح سے ڈس بیلنس ہونے کا خطرہ ہے۔"

وریام نے کہا "نہیں سرکار۔ صدق یقین ہو تو درخت لکڑ ہارے کی آپ حفاظت کرتا ہے۔ آج تک کسی رکھ نے لکڑ ہارے کو گرایا نہیں۔ کسی کی نیت بد ہو تو پھر دوسری بات ہے۔"

میں نے اندر سے کرسی منگوالی۔ دفتر فون کر دیا کہ آج نہیں آؤں گا۔ سامنے لان میں اڈا جما کر بیٹھ گیا اور اپنے سمبل کو کٹتے دیکھنے لگا۔

درختوں اور انسانوں کا ہزاروں لاکھوں برس کا ساتھ ہے۔ شاید جب انسان کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تھا تو درخت بھی دوتا ہو کر انسان کے سامنے جھک گئے تھے۔

درخت کٹتا دیکھ کر بہت سے لوگ ہمارے پھاٹک کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے' عورتیں بھی' بچے بھی اور بوڑھے بھی۔ میں نے بشیرے کو آواز دے کر پھاٹک بند کرنے کے لیے کہا تو وریام نے منع کر دیا کہ بعض بعض ٹہنا مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ گرتے وقت پہلو بدل لیتا ہے۔ بند پھاٹک پر گرے گا تو پھاٹک کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے اس لیے اس کو کھلا ہی رکھیں۔

دو بڑے بڑے ٹہنے کاٹ کر راجن نیچے اتر آیا تو بابے نے کمالے سے کہا یہ آ ڑا ٹہنا تیرے سوا اور کسی سے نہیں کٹے گا۔ پیر رکھنے کی جگہ تنگ ہے اس کو بھی مارے گا تو کٹے گا نہیں تو گلی کے ساتھ ہی لگا رہے گا۔

کمالا لانگڑ کس کے اور دونوں ہاتھ کانوں سے لگا کر تنے پر چڑھ گیا اور راجن اُسے کراس کر کے نیچے اتر آیا۔

کمالا سمبل پر ایسے کھڑا تھا جیسے ہوا میں کھڑا ہو۔ اس نے الٹے پہلو سے کلہاڑا گھما گھما کر ٹہنے پر ضربیں لگانا شروع کیں تو بڑے بڑے چھوڑے اور چھوٹی چھوٹی چپریں ہوا میں راکٹوں کی طرح اڑنے لگیں۔

اماں جمعدارنی گھر سے کھیس لے آئی تھی اور گرتے ہوئے چھوڑے اٹھا اٹھا کر لان پر بچھے ہوئے کھیس میں ڈال رہی تھی۔

بابا وریام اپنا حقہ اٹھا کر میرے پاس آ گیا تھا اور لان میں بیٹھ کر اوپر دیکھنے لگا تھا۔ اس نے مجھے متوجہ کیے بغیر اپنے بھتیجے کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا "بڑا صبر مند بر چھ ہے۔ خوش مزاج اور دیالو۔ کس طرح سے اپنی دیہہ کے ولے زمین پھینک رہا ہے جیسے ہاتھی پر بیٹھا کوئی بادشاہ دونوں طرف مہریں لٹاتا جا رہا ہو۔"

ایک روز یوں ہوا کہ ہمارے گھر کے سامنے بڑے احاطے میں جہاں ہمارے مویشی اور گھوڑے بندھتے تھے کہیں سے ایک بلا آ گیا۔ اس کے پیچھے چھوٹے بڑے آوارہ کتوں کا ایک غول ہمارے پھاٹک کے نیچے سے کمریں گھسا تا اور لوٹنیاں کھاتا اس کے تعاقب میں لپکا اور اسے احاطے کے اندر کچی دیوار کے ساتھ ساتھ بھگانے لگا۔ اگر بلا ایک جست بھر کر گوندنی کے پیڑ پر چڑھ جاتا اور اونچے دوشاخے میں بیٹھ کر اپنے دونوں پنجے نیچے لٹکا دیتا تو کتے بھونک بھونک کر چلے جاتے اور اس کی جان بچ جاتی لیکن اُس بیچارے سے جست بھری نہ جا سکی اور وہ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ پاگلوں کی طرح بھاگتا رہا۔ اصل میں زندگی اور موت کے درمیان بس ایک جست ہی کا فاصلہ ہوتا ہے۔ جو زندگی کے سپرنگ بورڈ پر پورا بوجھ ڈال کر اور آخری فیصلے کا پورا ابھار لے کر ایک لمبی زقند بھر جانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ زندگی اور موت دونوں کی حدوں سے آگے گزر کر ایک اور ہی وادی میں داخل ہو جاتے ہیں جس کے جغرافئے کا تو ہم کو علم نہیں البتہ اس کی تاریخ سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

اس بلے کا رنگ بھورا اور جسم پر پیلے رنگ کی بڑی بڑی دھاریاں تھیں۔ بھاگتے ہوئے اُس کا سارا جھبرا سرسوں کے باسی پھولوں کا گٹھا دکھائی دیتا تھا جو کمیٹی کی گند گاڑی میں تیزی سے اوپر نیچے اچھل رہا ہو جسے کمیٹی کا ٹریکٹر اندھا دھند بھگائے لے جاتا ہو۔

جب ایک لمبے کتے کا گندا پنجہ بلے کی کمر پر پہنچ گیا تو بلا تڑپ کر کچی دیوار پر کودا اور اپنے خوف کے جوش میں منڈیر تک پہنچ گیا۔ اس کی بوتھی دیوار کے عین اوپر آ گئی اور اس نے دیکھا کہ کھیتوں میں لالائیں جل پانی کر کے واپس گھروں کو جا رہی ہیں۔ کوؤں کی ڈاریں اپنے گھونسلوں کو آ رہی ہیں اور گوندا چمار اپنے ننگے پوتے کو کندھوں پر بٹھائے اس کی دونوں کلائیاں اپنے کھردرے ہاتھوں میں پکڑے اس سے چھوٹی چھوٹی تالیاں بجواتا بھیرو پن گاتا چلا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ پیلے بلے نے ہیزل بلاڈ کے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دیکھا اور پھر ناخن نہ اڑنے کی وجہ سے زمین پر گر

گیا۔ کتوں نے اُسے پھر دائرے میں بھگانا شروع کر دیا اور بلے کا سارا وجود بالکل باسی ہو گیا۔

جب آوارہ کتے گولڈن بلے کو مار کر لیے جاتے تھے تو اس کی دیہہ کا سونا آخری ڈبکیں مار رہا تھا اور فتح مندی کے جھولے کے مریضوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے اور کمزوری کی وجہ سے اپنے پیچھے ایک دوسرے سے مارتے اور ہچکولے کھاتے جا رہے تھے۔

کیا کوئی دنیا کی اس دوڑ میں، لمبی چھلانگ مارے بغیر، تیرتی ہوئی زقند بھرے بغیر ابد میں جھانک کر دیکھ سکتا ہے۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ ہیزل بلاڈ کی کلک کی طرح!

ایک روز یوں ہوا کہ ہم ڈیرا پاک میں آڑی ترچھی بچھی ہوئی کھاٹوں پر بیٹھے، لیٹے اور نیم دراز تھے۔ نومبر شروع تھا اور بڑا ہی خوشگوار جانا پہچانا موسم تھا کہ اچانک پورب سے کالی گھٹا کا ایک پہاڑ آسمان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس پہاڑ کے آگے آگے خوفزدہ پرندوں کی قطاریں تھیں جو تیزی سے اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب بڑھ رہی تھیں اور ان کے اور کالی گھٹا کے درمیان فرق تیز رفتاری کے ساتھ مٹتا جا رہا تھا۔ سیکرٹری صاحب نے کہا "تیز بارش آ رہی ہے چارپائیاں اندر کر لیں۔"

ہم اٹھنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "فکر کی بات نہیں ہے۔ موٹی دل دار گھٹا ہے گزر جائے گی۔ نہ گزری تو یہیں گر گرا کر برس جائے گی۔ نہ برس سکی تو اوپر ہی اوپر اودے اودے بادل بن جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

ہم خوش ہو گئے کہ اٹھنے سے اور کھاٹیں اٹھانے سے جان بچی۔ لیٹ کر نظارا کرنے کا موقع ملا اور اتنا سارا گہرا اودا رنگ ایسی کثرت سے اتنی دیر تک دیکھنے کا وقت ملا۔

پہلے تو موٹے موٹے بوندے ہمارے چہروں اور ماتھوں اور ہاتھوں پر پڑے۔ پھر لمبی لمبی دھاریں اترنے لگیں۔ ہم چارپائیاں اٹھا کر اندر کو بھاگے۔ ہمارے اندر تک پہنچتے پہنچتے سارے سر بھیگ گئے اور ہم میں سے طرح طرح کی خوشبوئیں آنے لگیں۔

بابا جی لنگر کی تھمی کے پاس کھڑے ہم کو اندر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بابا جلال کو اونچی آواز دے کر باقی کی لالٹینیں جلانے کا حکم دیا کیونکہ سب کو یقین تھا کہ بجلی چلی جائے گی اور پھر ڈیرے کے ڈوگھے کرے میں صرف چوکھیا دیے کی روشنی رہ جائے گی۔

چوکھیا دیا ڈیرے پر مغرب کی اذان کے وقت جلا دیا جاتا تھا اور اس کی روشنی سے دیواروں پر چھوٹے آدمیوں کے سائے بھی بڑے ہو جاتے۔ دن کے وقت اس دیئے کے کڑوے تیل کی خوشبو سارے کوٹھے میں پھیلی رہتی اور اس کمرے سے جو تکیہ، گدا، لحاف یا رضائی باہر لائی جاتی اس کے اندر سرسوں کے تیل کی خوشبو رچی ہوتی جس سے صاف پتہ چل جاتا کہ یہ ڈوہنگے کوٹھے سے آیا ہے۔

یہ دیا غالباً تانبے کا تھا جو لوہے کے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچے سوئے پر اس طرح سے فٹ تھا کہ دونوں اب ایک ہی دھات کے دکھائی دیتے تھے۔ تیل، کالک اور میل کا کوٹ دیئے کی بیس سے لے کر اوپر تک چڑھا ہوا تھا جو چاروں بتیوں کی روشنی میں اور بھی چمکدار ہو جاتا تھا۔ مغرب کے وقت یہ دیا باقاعدگی سے جلا دیا جاتا اور بجلی کے بلب اس کے بعد روشن ہوتے۔ بلبوں کی روشنی کے باوصف یہ دیا صبح تک اسی طرح سے جلتا رہتا۔ رات کو اٹھنے والا کوئی نہ کوئی بالکا اس میں تیل کے دو تین بڑے بڑے گھونٹ غٹ غٹ ڈال کر پھر اپنی جگہ جا کر سو جاتا۔ میں نے بابا جی سے اس دیے کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود اس کے جلائے جانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا "ہمارے پیر سائیں خدا بخش صاحب رحمتہ اللہ علیہ اپنے ڈیرے پر اسی طرح کا دیا روشن کر کے رکھا کرتے تھے۔ ہم نے بھی ان کے تتبع میں ویسا ہی دیا بنا کر روشن کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "حضور! اُس زمانے میں تو خیر بجلی نہیں تھی اور گھاسلیٹ کے لیمپ بھی عام نہیں ہوئے تھے اُس وقت تو دیا ٹھیک تھا لیکن اب اُس کی کیا ضرورت ہے؟" تو آپ نے فرمایا "ہم اسے اپنے لگتوں کی چاہت میں روشن کرتے ہیں۔ فائدے نقصان کے لیے نہیں چونکہ حضرت خدا بخش صاحب کے ڈیرے پر ایسی روشنی تھی اس لیے وہ یہاں بھی ہونی چاہیے کیونکہ یہ ڈیرا اور یہ روشنی اُنہی کے کمال کا الحاق اور انہی کی برکت کا تسلسل ہے۔ اس لیے یہاں وہی کچھ ہونا چاہیے جو وہاں ہوتا رہا ہے۔ ابھی ساری لالٹینیں پوری طرح روشن نہیں ہوئی تھیں کہ بجلی بجھ گئی اور سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ دو تین لالٹینوں اور اندر پڑے چوکھیا دیے کی روشنی میں ہم ایک دوسرے کے ہیولے دیکھ سکتے تھے لیکن کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ ایسی موسلا دھار اور بھیانک بارش میں نے اپنی زندگی میں کل تین مرتبہ دیکھی ہے اور اس کے گھبرا دینے اور دل دہلا دینے والے نقوش میرے دل پر اب بھی ویسی ہی گرفت رکھتے ہیں جیسے سیلاب کے نرغے میں آنے والے روز رکھتے تھے۔

پچھلی اور پہلو والی گلیوں سے پانی کے ریلے ڈیرا پار کر کے اندر داخل ہو رہے تھے اور سارے احاطے میں گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ سامنے پکی سڑک کی طرف پانی کے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بابا جلال اور سیکرٹری صاحب نے بکریاں جلدی جلدی کھول کر اندر چھوٹی کوٹھڑی میں کھڑی کر دی تھیں پانی میں شرابور ہو جانے کی وجہ سے اور ڈر کے مارے وہ اپنے قد سے آدھی رہ گئی تھیں۔ آسمان سے پانی کی آبشاریں بجلیوں کی طرح ٹوٹی پڑتی تھیں اور اندر احاطے میں پانی کے بڑے بڑے لہریئے چل رہے تھے۔ اتنے میں جھپاک سے ڈوہنگے کوٹھے کا چوکھیا دیا بجھ گیا اور ہم سب کے دل بیٹھ گئے۔ بھائی علی محمد نے اپنی دھیمی، بے خوف، ملائم اور سریلی آواز میں کہا "پانی حضور کے کوٹھے میں داخل ہو رہا ہے۔" ہم سب ادھر کو لپکے تو دیکھا کہ کوٹھے کے اندر پانی تیزی سے داخل ہو رہا ہے اور فرش پر رکھے ہوئے گھی، آٹے، گڑ، شکر اور سوکھی راشن کے سارے کنستر اس میں ڈوب چکے ہیں۔ پانی کی یہ باڑھ کوٹھے کے موکھے میں سے آ رہی تھی جس نے کٹیلی دھار سے موکھے کا گھیر بہت بڑا کر دیا تھا۔ اس کے قریب ایک ٹینگی ٹیڑھی بے تکی شہتیری تھی جس نے چھت کی ایک طرف کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ اب یہ شہتیری ذرا سی دیر میں تیورا کر گرنے والی تھی اور اس کے ساتھ آدھی چھت کے بیٹھ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

ہم نے اکلوتی لالٹین اوپر اٹھا کر دیکھا تو شہتیری کو اپنے مقام سے پھرے ہوئے اور پانی کے دھارے کو موکے کی سرنگ میں پوری طاقت سے گزرتے پایا۔ ہر طرف ایک شور مچا تھا اور ہم سب بے بس کھڑے تھے۔ جوں جوں ہماری بے بسی بڑھ رہی تھی ہماری آوازیں اور مشورے اونچے ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر کہیں سے کوئی مضبوط سی لکڑی مل جائے جسے عموداً کھڑی کر کے ہم گرتی ہوئی شہتیری کو ٹیک دے سکیں تو یہ مصیبت رفع ہو سکتی ہے۔ بیکری صاحب کا خیال تھا کہ ''اگر کوٹھے میں داخل ہوتی آبشار کو کسی طرح سے روکا جا سکے تو شہتیری اپنا وزن سنبھالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔''

باباجی کہہ رہے تھے کہ اللہ علیم مطلق ہے اس کو پتہ ہے کہ کب اور کس وقت بارش بھیجنی ہے اور کتنی بھیجنی ہے۔ کس پر دباؤ ڈالنا ہے کس کو دباؤ سے نکالنا ہے۔ اس لیے ہر وقت اس کی رحمت کے طلبگار رہو۔ مشکل کے وقت زیادہ رحمت کی امید رکھو۔

میرے لیے یہ بات سمجھنی بہت مشکل تھی کہ کسی مصیبت کے وقت رحمت کیسے آ سکتی ہے۔ کیونکہ اگر مصیبت پر رحمت کی بارش ہونے لگے تو مصیبت مصیبت نہ رہے راحت بن جائے اور مصیبت چونکہ اُسی طاقت کی طرف سے بھیجی جاتی ہے جس کے پاس رحمت کے خزانے ہوتے ہیں اس لیے وہ عذاب بھیج کر اس کے ساتھ علاج کیونکر بھیج سکتا ہے۔ میرا مطلب کیوں بھیجے۔ اپنے پلین کو خود ہی کیوں ختم کرے۔ اپنے پیکیج ڈیل میں تبدیلی کیوں کرے۔ میرا ذہن چونکہ ایک اور طرح کے علم سے مزین ہے۔ جس میں پیکیج ڈیل' ڈپلومیسی' ڈائیلاگ' اصولوں پہ سمجھوتہ کے واضح خطوط کھنچے ہیں اس لیے میرا ان سے الگ ہو کر سوچنا بہت ہی مشکل ہے جو چیزیں میری معلومات کے نمونے پر پوری نہیں اترتیں وہ میرے صاحب سے تمام کے تمام غلط اور بے معنی ہیں۔ وہ ہیں ہی نہیں۔ کبھی ہوتی ہی نہیں۔ ہو ہی نہیں سکتیں۔

اتنے میں کسی نے زور سے نعرہ مارا ''نور والے! نور والے!!'' اور ہم سب خاموش ہو گئے۔ رضا صاحب نے بوچھاڑ سے اونچی آواز نکال کر کہا ''حضور ہمارا شہتیر جو ہے اتنا لمبا' ایسا مضبوط' اس کی ٹیک دے دیتے ہیں۔''

سب نے مل کر ہپ ہپ ہرے کے انداز میں ''نور والے'' کا نعرہ لگایا۔ ہر ایک سمجھ گیا لیکن مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ ایسے گھپ اندھیرے' برستی بارش' تاریک شہر' چھپی ہوئی مخلوق اور سہمی ہوئی خدائی سے ہم کیسے شہتیر مانگ کر لا سکتے ہیں اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسے خطرناک موسم میں کوئی مست ملنگ کوئی مست فکر اپنی زندگی کی پروا کیے بغیر ٹرک' ٹرالی یا ٹھیلے پر شہتیر لاد کر ہمیں پہنچا سکتا ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ گرتی ہوئی چھت کو اس وقت کسی قسم کا سہارا دیا جا سکتا ہے۔ کراماتیں ضرور ہوتی رہی ہیں لیکن بڑھتے ہوئے سیلابوں کے آگے کراماتوں کی ڈامیں کبھی بھی نہیں باندھی جا سکیں۔ کم از کم میرے مطالعے میں اور میری معلومات میں ایسی کراماتیں کہیں بھی نظر نہ آتی تھیں۔

ڈیرہ پاک پر ڈاکٹر صاحب کی جھگی کے پیچھے اور غسل خانوں کے سامنے جہاں بکریاں بندھتی تھیں ایک بہت ہی پرانا شہتیر پڑا تھا جو تین چوتھائی سے زیادہ مٹی میں دبا ہوا تھا۔ اس شہتیر کے ساتھ موٹے موٹے رسوں کے کئی ہالے تھے جن کے ساتھ بکریوں کی رسیاں باندھی جاتی تھیں۔

جب ہم شہتیر اٹھا کر ڈونگے کوٹھے کی چھت بچانے جا رہے تھے تو باباجی نے فرمایا ''صاحبو! یاد رکھو کہ سب پہلے موجود ہوتا ہے صرف دیکھنے والی آنکھ اور تلاش کرنے والی نگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشکل پڑنے سے پہلے اس کا ازالہ کرنے کا سامان پہلے سے مہیا کر دیا جاتا ہے۔ یہ شہتیر کئی سالوں سے یہاں پڑا تھا اور اس وقت کا سبب بنا کر پہلے ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کی رحمت کا شکریہ ادا کرو اور رک کر دعائے قلندری مانگو! پھر فرمایا دعائے قلندری یہ ہے کہ ''یا اللہ شیطان اور شرارت سے محفوظ رکھیو۔ رحمت سے محروم نہ رکھیو۔'' ہم سب نے ایک مدہم لالٹین کی روشنی میں یہ دعا کی اور اس شہتیر کو ڈونگے کوٹھے کی چھت کا سہارا بنا کر ٹیک کے طور پر کھڑا کر دیا۔

پھر کئی سال وہ شہتیر سردھڑ کی بازی لگا کر اور چھت کو اپنے آپ پر پورا تول کر اسی طرح کھڑا رہا جس طرح سے اس کو کھڑا رہنے کا علم دیا گیا۔

ایک روز یوں ہوا کہ ہم ڈیرے پر مختلف ٹکڑیوں میں بٹے بیٹھے تھے اور اپنی اپنی دنیا میں محو تھے کہ ایک شخص روتا پیٹتا' دھائیں مارتا رکشا سے اترا اور سیدھا آ کر باباجی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی کھلی موٹی پگڑی گردن میں لٹک رہی تھی اور اس کی آنکھیں روتے رہنے سے سوج کر باہر آ گئی تھیں۔ پہلے تو وہ لحہ بھر ہاتھ باندھ کر اسی طرح کھڑا رہا پھر اس نے اپنی پگڑی اتار کر باباجی کے قدموں میں رکھ دی اور آخر میں ایک زور کی ہُنھ مار کر سجدے میں گر گیا۔ اس کو سجدے میں پڑا دیکھ کر کسی نے میری روح کے رخسار پر ایک زناٹے دار طمانچہ مارا۔ میں گڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور سجدے میں گرے ہوئے پہلوان کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر پیچھے کو کھینچا لیکن مجھ سے اس کی بھاری دیہہ اٹھائی نہ جا سکی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور اپنا ماتھا زمین پر مار رہا تھا۔ خدا کے علاوہ کسی اور وجود کو سجدہ کرنے سے انسان کے سارے اعمال تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ شرک میں مبتلا ہو کر کافر سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے کوئی مشرک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ پہلوان کو دیکھ کر مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی اور اندر ہی اندر میری باچھیں کھل گئیں کہ میں دینی اور اخلاقی اعتبار سے نہ صرف ایک اچھا مسلمان تھا بلکہ اس شخص سے بہتر انسان بھی تھا۔ وہ ایک کمزور' بودا' بے یقین اور بے دین شخص تھا جو اتنا تنومند اور مضبوط ہونے کے باوجود ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور جس نے ہم سب کے سامنے اپنے آپ کو اسلام کے دائرے سے خارج کر لیا تھا۔

باباجی نے آگے بڑھ کر اس شخص کو زمین سے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگا کر پوچھا ''بخار ابھی اترا نہیں؟'' اس نے زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا ''بچہ مر رہا ہے سائیں جی' کوئی کوئی سانس باقی رہ گیا ہے۔ میری واپسی تک وہ بھی نکل گیا ہو گیا۔'' اس نے تیزی کے ساتھ اپنی پیشانی کو پیٹا اور تڑپ کر باباجی کے قدموں سے لپٹ کر ان کے پاؤں چومنے لگا۔

میرے لیے یہ بڑی عبرت کا مقام تھا۔ ایک انسان ایک انسان کے پاؤں چوم رہا ہے' اس کی خوشامد کر رہا ہے اور اس کے سامنے عاجزیاں کر رہا ہے۔ مجھے پہلوان کے بچے کی زندگی کے بجائے اس کی عاقبت کی فکر پڑ گئی جو اپنے اس تن

وتوش کے ساتھ میرے سامنے دوزخ کا ایندھن بنا ہوا تھا۔

میرے سامنے بابا ابراہیم کی سفید ڈاڑھی والا کالا چہرہ گھوم گیا جسے میرے بزرگوں نے سات تووں کی سیاہی اتار کر سرسوں کے تیل میں حل کر کے اُس کے منہ پر کالک ملی تھی اور اس کے پیر تیل سے رنگے تھے۔ پھر اس کو گاموں کمہار کی گدھی پر بٹھا کر سارے گاؤں کا چکر لگوایا تھا۔ ہم چھوٹے بچے ٹین کھڑکاتے اس گدھی کے آگے آگے چل رہے تھے اور ہمارے بڑے امام مسجد صاحب کے ساتھ گدھی کے دونوں جانب لعنت اللہ! لعنت اللہ کہتے جا رہے تھے۔ بابے ابراہیم کو خود مولوی صاحب نے اس کے گھر کے کچے چبوترے پر ایسی حالت میں دیکھ لیا تھا جس سے اُس پر حد لازم ہو گئی تھی۔ بابا ابراہیم کا گھر کچا تھا اور اس کے صحن خانہ کی دیوار بھی کچی تھی۔ عام آدمی تو گلی میں چلتے ہوئے اس کے گھر اندر نہیں جھانک سکتا تھا البتہ مولوی صاحب 'شہابو پیچا اور کرتار سنگھ کھاتی کی نکہ نہ چاہتے ہوئے بھی بابا ابراہیم کے گھر میں چلی جاتی تھی۔

مولوی صاحب نے دیکھا کہ بابا ابراہیم اپنے ڈیڑھ سالا پوتے جمال کو چھوٹے پیڑھے پر سامنے بٹھائے اس کے کنگن والے پاؤں چوم رہا ہے اور دونوں گھٹنے زمین پر اس طرح سے لگائے ہوئے ہیں جیسے وہ اس کو سجدہ کر رہا ہو۔ مولوی صاحب نے اس واقعہ کی خبر میرے والد اور ذیلدار صاحب کو کر دی۔ بابا ابراہیم کو بلا کر پوچھا گیا تو اس نے فخریہ اس بات کا اقرار کر لیا کیونکہ اس کے بیٹے کے گھر جمال پورے نو برس بعد پیدا ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں کی انجمن اسلامیہ نے بابے ابراہیم کا شرک دور کرنے کے لیے ایک فیصلہ کیا اور ہمارے ہاتھوں میں کنستر اور ڈنڈے پکڑا دیے۔

جب میں آٹھویں میں پڑھتا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے لیے اسپغول کا چھلکا لے کر آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اصطبل والی گلی میں سوڈھیوں کی حویلی کے چھوٹے دروازے کے ساتھ نتھو لاری کا بیٹا سیفا اور کرم چند عرائض نویس کا پوتا بکرم یوں لگے کھڑے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں ان کو اس طرح چور سے بنے دیکھ کر رک گیا اور بڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ جب میری ڈھٹائی کے آگے ان کی کارروائی بڑی دیر تک رکی رہی تو بکرم نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر دروازے کے اندر جھانکنے کے لیے کہا۔ نیلے رنگ کے دروازے کی چنا برابر گانٹھ نکلی ہوئی تھی اور اندر بڑے کمرے کے پرانے قالین پر چمڑے سے منڈھا بڑا سا مونڈھا رکھا تھا اس مونڈھے پر ہمارے ضلع کی مشہور کنجری صندلاں بیٹھی تھی۔ میں صندلاں کنجری کو اور اس کے نام کو اُس دن سے جانتا تھا جس دن وہ قطبے وٹو کی نیائیوں میں گوٹے والا گھگھرا پہن کر ناچی تھی۔ اس روز مسٹر بسمتھ اسسٹنٹ کمشنر ہمارے گاؤں آئے تھے اور انہوں نے ہی لوگوں کا دل خوش کرنے کے لیے اس ناچ کا حکم دیا تھا۔ یہ ناچ سارے ہندوستان میں منائی جانے والی اُن خوشیوں کا ایک حصہ تھا جو ہمارے شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی کی خوشی میں منائی جا رہی تھیں۔

میں نے نیلے دروازے کی گانٹھ نکلی موری میں سے دیکھا کہ صندلاں کنجری سرخ رنگ کا گوٹے والا ڈوپٹہ اوڑھے اپنے بالوں میں چڑیاں نکالے بیٹھی ہے اور اس نے پیتل کے تین بڑے بڑے کلپ اپنی کنپٹی سے اوپر لگا رکھے ہیں۔ وہ پان کا آدھا پتہ اپنی ہتھیلی پر رکھے اس پر آہستہ آہستہ کتھا لگا رہی ہے اور اس نے اپنی ٹانگ فرش پر آگے کو پھیلا رکھی ہے۔ علاقے کا خونخوار تھانیدار مقدر شاہ دونوں گھٹنے ٹیک کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہے اور اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر صندلاں کی

رکابی ایڑی سے اور ٹو سے بڑی مضبوطی کے ساتھ رکھی ہے۔ صندلاں پان لگاتے ہوئے مسکرا رہی ہے اور تھانیدار رکابی پکڑے ہوئے رو رہا ہے۔ اس کی ہچکی بندھی ہوئی ہے اور ان ہچکیوں کی ذرت میں اُس کا سارا بدن کانپ رہا ہے۔

بابا جی اُس فریادی پہلوان کے ساتھ اُس کے گھر چلے گئے اور میں بڑی دیر تک اکیلا بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور اس کے پیچھے وہ کون سا جذبہ ہے جو انسان کو اس طرح سے مجبور کر دیتا ہے کہ وہ پیر پکڑ لیتا ہے۔ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ پائے بوس کرنے لگتا ہے لیکن یہ عقدہ مجھ پر کھل نہ سکا۔ ڈاکٹر صاحب سرخ چائے کا لبریز پیالا لے کر خود میرے پاس آئے اور بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن ان کی باتیں میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند پھاڑ کے میری سوچ کی محدود ترپ پر لینڈ نہ کر سکیں اور میں ہاں جی ہوں جی' اچھا جی ہی کرتا رہا۔

ایک روز یوں ہوا کہ میں ڈیرے میں سڑک کی جانب چارپائی کھینچے دھوپ میں بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ موسم اچھا تھا۔ وقت وافر تھا۔ اخبار کا چھاپہ بہتر تھا میں بڑے غور اور دلجمعی کے ساتھ خبروں کو اس طرح سے کرید رہا تھا جیسے گند کے ڈھیر پر مرغی اپنے پنجوں سے روڑی پھرولا کرتی ہے۔ اتنے میں بابا جی ہاتھ میں خالی لوٹا پکڑے ادھر آ گئے۔ میرے قریب کھڑے ہو کر فرمایا "بیٹا اخبار اس قدر غور سے نہ پڑھا کرو یہ اخبار نہیں ہوتا 'اکھوتے بھار' ہوتا ہے۔ اس سے نظر بھی کمزور ہو جاتی ہے اور روح پر بھی بوجھ بڑھ جاتا ہے۔"

میں نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا "یہ جی بس ایسے ہی.... کوئی خاص نہیں بابا جی.... کبھی کبھی.... کہیں سے مل جاتا ہے تو اس توجہ سے پڑھتا ہوں ورنہ مجھے تو وقت ہی نہیں ملتا.... لائیے مجھے لوٹا دیجئے میں بھر لاتا ہوں۔"

فرمایا "دھوپ اچھی ہے' چارپائی ٹھکانے سر بچھی ہے۔ سرخ چائے تیار ہو رہی ہے اور آپ کو چھٹی ہے' ایسے اچھے حال کو لوٹے بھرنے میں ضائع نہ کریں۔ ہم آپ سے ہر حال میں راضی ہیں......"

آپ آگے نلکے کی طرف چلے گئے اور میں اسی طرح کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ انہوں نے نلکے کی ہتھی گیڑی۔ تھوڑا سا پانی لوٹے میں ڈالا۔ اس کو چھلکایا اور پانی زمین پر انڈیل دیا۔ پھر انہوں نے ایک ہاتھ میں لوٹا پکڑے پکڑے گیڑا اور سارا لوٹا بھر کر نلکے سے ذرا دور تنور والی جھگی کے پاس چلے گئے اور وہاں چھوٹی سی چبوتری پر بیٹھ کر وضو فرمانے لگے۔

بابا جی وضو کرنے پر خصوصی توجہ دیتے تھے اور بڑی احتیاط اور بڑے اہتمام سے وضو کرتے تھے۔ یہ وضو ایسا نہیں ہوتا تھا جیسے ہم محتاط اور دیندار لوگ کیا کرتے ہیں کہ انگلیوں کی خلال صحیح ہو۔ ڈاڑھی کے اندر پانی چڑھایا جائے۔ کانوں کے پیچھے مسح کے ہاتھ اس طرح سے لوٹائے جائیں کہ ساری گردن پر پانی کا پوتا پھر جائے۔ پھر پاؤں کی ایڑی کہیں سے سوکھی نہ رہ جائے۔ ٹخنے کا جزیرہ اوپر ہونے کی وجہ سے گیلا ہونے سے محروم نہ ہو جائے۔

آپ کا وضو کچھ مختلف سا تھا۔ ابتدا' انتہا اور اس کے درمیان کے ارکان بالکل ہمارے جیسے تھے۔ پانی استعمال

کرنے اور اعضاء دھونے کی ڈرل وہی تھی لیکن وضو کے اندر انہماک کچھ ایسا تھا جیسے گہرے مراقبے میں چلے گئے ہوں اور وضو سے ہی انہوں نے حضوری کی ابتدا کر دی ہو۔ وہ وضو ایسا تھا جیسے غسال مردے کو غسل دیا کرتے ہیں۔ جن کی ساری توجہ اور ساری مرکزیت سامنے کی میت ہوتی ہے۔ باباجی وضو کیا نہیں کرتے تھے۔ اپنے آپ سے باہر نکل کر سائیں نور شاہ صاحب کو وضو کرایا کرتے تھے۔ ان کی میت کو غسل دیا کرتے تھے۔ انہیں صاف ستھرا کر کے سجا بنا کے مکٹ سجا کے انہیں اپنی بینتی اور عاجزی کی سامگری سے خوشبودار کر کے انہیں اٹھا کر لے جاتے تھے۔ جیسے انہیں اپنی سفارش کے لیے بڑی سرکار کے روبرو لے جا رہے ہوں۔

آدمی گندا ہو یا مندا۔ ناٹا ہو یا لمبا۔ موٹا ہو یا پتلا۔ وبی ہو یا عیبی۔ اُس کو پرارتھنا کی سیڑھی پر چڑھنے کے لیے سیس کنانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے بغیر حاضری ممکن ہی نہیں۔ اور ایک مرتبہ جب حاضری ہو جائے تو کہتے ہیں کہ حضوری کا لمحہ بھی آ جاتا ہے۔ یہ رسم آج کی نہیں صدیوں پرانی ہے۔ اپنے وجود کو بنا سنوار کر، ہار سنگھار کر، عطر پھلیل لگا کر اور اپنے ہاتھ سے پانی کے چھاپے لگا کر گلے میں رسی ڈال کر محراب تلے لے جانا ہوتا ہے۔ جب وجود سر جھکاتا ہے تو رسی والا پکار کر کہتا ہے'' ہے داتا! بلیدان کی بھیک ہے۔ سیس کنانے کی آ گیا ہو۔ پرارتھنا پوری ہو جائے۔ ارداس ہے! ارداس ہے! ارداس ہے!!! لیکن وجود رکوع میں رہتا ہے اور وجود کے مالک کی کوک پکار پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ اس طرح اپنے مینڈھے کی رسی پکڑے پکڑے بلبلاتا رہتا ہے اور سندھیا کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے وجود کی رسیاں پکڑے جوق در جوق عبادت کدوں سے نکلتے ہیں اور اپنے اپنے جانوروں کو کمال احتیاط سے ہنکاتے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا تو نہیں پر سنا ہے کہ کبھی کبھی کسی خوش قسمت کے مینڈھے کو رکوع کے اندر سیس دینے کا اذن مل جاتا ہے اور اس کا مالک وہیں اس وقت اُسی قربان گاہ پر اپنے وجود کو خود غسل دے کر آگے پیش کر دیتا ہے اور اس کی گلے کی رسی نکال کر گول گول لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے اور گھر کی طرف چلا جاتا ہے۔ موتو قبل انتموتو.....موتو قبل انتموتو۔ لوگ پوچھتے ہیں'' آج بٹ صاحب کو مغرب کے وقت نہیں دیکھا۔'' مولوی صاحب کہتے ہیں'' عشاء کے وقت تشریف لائیں گے تو پوچھیں گے۔ شاید کسی ٹینڈر کے سلسلے میں باہر چلے گئے ہوں۔'' لیکن عشاء کے وقت جب بٹ صاحب آتے ہیں تو بٹ صاحب وہ نہیں ہوتے ہمارے والے۔ وہ دوسرے والے ہو چکے ہوتے ہیں حالانکہ ان کی رہائش وہی ہوتی ہے بنگلہ نمبر 36 'ایم بلاک ڈیفنس ایکسٹینشن.....فیز ٹو.....!

وضو کرنے کے بعد باباجی سیدھے لنگر چھپر تک پہنچ گئے اور دھلے ہوئے پیالوں کے اندر سے پانی جھاڑ جھاڑ کر ان کے مینار بناتے گئے۔ اس روز شلجم گوشت کا پتیلا پک رہا تھا اور اس کے ساتھ گڑ کے چاول تیار ہو رہے تھے۔ میاں سراج نے آ کر تندور تپانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی بے تکی آواز میں سلطان باہوؒ کے ابیات گا رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوکھی ہوئی خاردار جھاڑیوں کو ٹکوئے سے کاٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی موٹی شاخ کلہاڑی کے پھل تلے سے پھدک کر اس کے ہاتھ پر لگتی تو وہ خاردار جھاڑی کو ایک گندی سی گالی دے کر کانٹا چبھنے والی جگہ کو اپنے موٹے اور بھدے ہونٹوں سے چوستا اور پھر زمین پر تھوک دیتا۔ دراصل میاں سراج چبھن کی وجہ سے اپنا ماس نہیں چوستا تھا بلکہ اپنے وجود کو بوسہ دینے کے موقعے تلاش کرتا تھا۔ وہ بڑا مضبوط، تنومند، گٹھا ہوا کسرتی جوان تھا لیکن اُس کو اپنی دیہہ بڑی پیاری تھی۔

میں نے اخبار اچھی طرح سے تہہ کر کے اس کا ایک طمانچہ سا بنا لیا تھا۔ بالکل ویسا طمانچہ جیسا نقلیں کرنے والے بھانڈ لطیفے کی پنچ لائن پر اپنے ساتھی کو مارا کرتے ہیں۔ میرے کھڑے زانو پر اور چارپائی کے پھٹے ہوئے پائے پر جو مکھی بھی آ کر بیٹھتی تھی میں اس کا تسلی سے نشانہ لے کر اور پوری آنکھیں کھول کر جھکیلے ہاتھ سے زور کا اخباری طمانچہ مارتا تھا۔ شاذ و نادر ہی کوئی مکھی بچ کر جاتی تھی۔ اگر کوئی بچ بھی جاتی تھی تو تھوڑی دیر بعد واپس زانو پر یا پائے پر پہنچ جاتی تھی۔

میں ایک مکھی کا نشانہ لے ہی رہا تھا کہ میرے سامنے ایک قد آدم سایہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو باباجی کھڑے تھے۔ آپ نے بڑی سنجیدگی سے مجھے مخاطب کر کے فرمایا'' یہ مکھیاں آپ کے ذوق کشتن کے لیے بنائی گئی ہیں جو آپ انہیں اس بیدردی سے ہلاک کر رہے ہیں۔''

میں چوروں کی طرح ان کے سامنے کھڑا تھا اور کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ ان کی اس ترکیب'' ذوق کشتن'' نے مجھے بالکل نہتا کر دیا تھا اور میرے پاس اپنی دفاع کے لیے صرف یہی فقرہ رہ گیا تھا کہ حضور! یہ جراثیم پھیلانے والی مخلوق ہے اور اس سے اللہ کے بندوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ آپ نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور فرمایا'' مکھی انسان کی محسن ہے۔ بیٹا کرم فرما ہے اور چونکہ محسن کو مارنے کا کوئی دین دھرم بھی اجازت نہیں دیتا اس لیے مکھی کو مارنا بھی اپنے مہربان کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔''

میں نے آپ کے منہ سے کئی نئی اور مختلف باتیں سنی تھیں۔ کئی ایسے ارشادات سنے تھے جو ہمارے آزمودہ اور طے شدہ اصولوں کے منافی تھے۔ کئی ایسے اعلان سنے تھے جن سے ہماری زندگی کے چلن کا بطلان ہوتا تھا۔ کئی ایسے نظریے برداشت کیے تھے جن کا بلند پایہ کتابوں اور ولایتی انسائیکلو پیڈیوں میں دوسری طرح کے اندراج تھے۔ ان کی کئی ایسی باتیں برداشت کر لی تھیں جن کے تسلیم کرنے کی امہات الکتب میں سخت مناہی تھی۔ لیکن یہ مکھی کے محسن ہونے کا نہ تو فلسفہ میری سمجھ میں نہ آیا اور نہ ہی میرا دل اس بات کو مانتا کہ اسے مارا نہ جائے اور ختم نہ کیا جائے۔

باباجی نے فرمایا'' مکھی تمہاری چوکیدار ہے جو ہر وقت خبردار، پہرے دار بولتی رہتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سرخ جھنڈی ہے اور یہ ہمیں صرف اتنا بتانے کے لیے آتی ہے کہ یہاں گند ہے، غلاظت ہے، ناپاکی ہے، کوڑا ہے، اس جگہ کو فوراً صاف کر لو اور سارے کام چھوڑ کر یہاں کی صفائی کی طرف توجہ دو۔ لیکن تم انسان ہو، غافل مخلوق ہو، ابھی معلوم ہوا ہے ابھی بھول جاؤ گے۔ اس لیے میں اس وقت تک یہاں سے نہیں ہلوں گی جب تک تم اس جگہ کو صاف اور پاک نہیں کر لو گے۔ میں بڑی دور سے آئی ہوں اور تم کو صرف اطلاع دینے کے لیے آئی ہوں۔''

میں صبح جب ڈیرا پاک پر آیا تھا تو لنگر چھپر کے نیچے کونے میں ایک خستہ پونڈے کا بڑا سا ٹکڑا کھڑا تھا۔ میں نے بھائی علی احمد صاحب سے پوچھا کہ یہ گنا کس کا ہے تو انہوں نے اپنی مخصوص سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا'' آپ کے انتظار میں رات سے یہاں کھڑا ہے۔ آپ ہی کا ہے۔ آپ پر نثار ہونے کے لیے بے قرار ہے۔'' میں نے گنے کا وہ ٹکڑا اٹھا لیا اور

دھوپ میں آ کر اس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پونڈے کے چھلکے کو ہونٹوں میں پکڑ کر بھی کھینچو تو ٹوری بھر چھلکا بڑے مزے سے آ تا ہے۔ میں مزے لے لے کر گنا چوستا رہا اور اس کے چھلکے اور پھوک چارپائی کے سامنے پھینکتا رہا۔

میں نے نیچے جھک کر چھلکے پھوک اور گنے کا کوڑا اٹھانا چاہا تو آپ نے ہاتھ آگے کر کے مجھے روک دیا۔ بابا جلال کو آواز دی۔ وہ بجلی کی طرح لپکا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر کوڑا اپنی جھولی میں ڈالنے لگا۔

فرمایا" جونہی یہ جگہ صاف ہو جائے گی اور مکھیوں کے طے کردہ معیار کے مطابق صاف ہو جائے گی تو وہ اس جگہ سے چلی جائیں گی۔ پھر وہ اسی صورت میں لوٹ کر یہاں آئیں گی اگر یہاں ایک دانے کے برابر بھی گندگی ہوئی۔" پھر مسکرا کر فرمایا" جھنڈی والے کو' ریلوے پھاٹک والے کو' چوکیدار کو' پنسال نویس کو' ٹریفک کے سنتری کو مارنا نہیں چاہیے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے وہ آپ کو خطرے سے آگاہ کرتا ہے اور خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔"

جب بابا جلال سارا کوڑا اٹھا کر اور اچھی طرح سے جھاڑو دے کر چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ مکھیاں ایک ایک کر کے وہاں سے وداع ہو رہی ہیں اور ان کے جانے میں کبھی نہ لوٹ کر آنے کی اڑان ہے۔

باباجی کی یہ بات میں نے عقلی طور پر تو مان لی لیکن جذباتی طور پر میں اسے تسلیم نہ کر سکا۔ حال ہی میں میرے چچازاد نے فیصل آباد میں جراثیم کش دواؤں کی ایجنسی لی تھی اور اس کو بلدیہ کی طرف سے ڈی ڈی ٹی سپلائی کرنے کا بہت بڑا آرڈر موصول ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ مکھی مار دواؤں کی ایک بہت بڑی انڈسٹری کل عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ لاکھوں ہزاروں خاندانوں کی زندگی اور ان کا مستقبل وابستہ ہے۔ کیا اس انڈسٹری کو ختم کر دیا جائے۔ پھر غریب ممالک کو اربوں ڈالر کی امداد جراثیم کش ادویات کے لیے دی جاتی ہے۔ اس سے کئی سرکاری' نیم سرکاری اور نجی ادارے چلتے ہیں بلکہ چھوٹے ملکوں کی تو گورنمنٹیں بھی اس ایڈ کے سہارے چلتی ہیں تو کیا صرف ایک مکھی کی خاطر اتنی بڑی ایڈ کو بند کر دیا جائے۔ ان لوگوں کو صرف اپنے مقامی اور ناکارہ وسائل کے اندر محدود کر دیا جائے جو پستی سے ترقی کی طرف اور ترقی سے ترقی پذیری کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن باباجی چونکہ رموز مملکت سے آشنا نہیں ہیں اور اقتصادی دباؤ کے عالمی اصولوں کو جانتے نہیں ہیں اس لیے آپ پیسٹی سائیڈ کے ایکٹ کو سمجھ نہیں سکتے۔

اس دن کے بعد سے میں نے آج تک کبھی کوئی مکھی نہیں ماری۔ جھاڑو دینا سیکھ لیا ہے۔ ٹاکی بھی مار لیتا ہوں اور لمبی ٹیوب لگا کر فرش بھی دھو لیتا ہوں۔

ایک روز یوں ہوا کہ ڈیرا پاک کے سامنے سے ایک شخص کچھ بکرے ہنکاتا ہوا گزرا۔ باباجی اس وقت بادام روغن نکلوا رہے تھے۔ بکروں کو جاتے دیکھ کر آپ نے کسی لڑکے کو بکروال کے پیچھے بھگایا اور اسے ڈیرے پر منگوا لیا۔ بکرے نہایت ہی خوبصورت اور اچھے پلے ہوئے تھے۔ سیاہ کسے ہوئے بدنوں پر دھوپ کی روشنی میں وہ بوسکی کے تھان دکھائی دیتے تھے۔ چار دوندے تھے اور تین کھیرے لیکن اپنے قدبت کے اعتبار سے بھی چوگے چھگے نظر آتے تھے۔ باباجی نے

بکرے پسند کر کے ان کی قیمت دریافت کی تو ان کے اندازے سے زیادہ نکلی۔ انہوں نے جو قیمت پیش کی وہ بکروال کو منظور نہ تھی۔ بڑی دیر تک سودا اوپر نیچے ہوتا رہا لیکن چرواہا مانا نہیں اپنی ضد پر اڑا رہا۔ کچھ لوگ جو وہاں موجود تھے انہوں نے بتایا کہ یہ لنگر کے لیے چاہئیں ذاتی استعمال کے لیے نہیں لیکن باباجی نے انہیں سختی سے منع کر دیا کہ لنگر کا بوجھ ڈال کر اس کو مجبور نہ کیا جائے کیونکہ اس دباؤ میں آ کر اگر بکروال مان گیا تو یہ ناحق ہوگا۔ لیکن وہ بکروال صاحب بھی ایسے ضدی تھے کہ انہوں نے کسی بات کی بھی پروا نہ کی اور اُسی قیمت پر اڑے رہے جو انہوں نے پہلے بتائی تھی۔ باباجی نے اپنی بھلی بھلی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا" اچھا بھئی آپ کی مرضی۔ مال آپ کا ہے۔ سودا آپ کا ہے۔ حکم آپ ہی کا چلے گا۔ ہم مجبور ہیں آپ کے حکم کے مطابق نہیں دے سکتے۔"

جب بکروال بکرے لے کر چلنے لگا تو آپ نے فرمایا" بھائی آپ کا ہمارا سودا نہ بن سکا۔ یہ منظور نہ تھا لیکن یہ بکرے تو ڈیرے کے مہمان ہیں انہیں ہم نے خود آواز دے کر بلایا ہے۔ انہیں تو ہم بغیر کھائے پیئے نہیں جانے دیں گے۔"

بکروال نے کہا" مجھے دیر ہوتی ہے باباجی۔ میں زیادہ رک نہیں سکتا۔"

فرمایا" بس پانچ منٹ کی بات ہے اس کے بعد چلے جانا۔" اتنے میں بکروال کے لیے ایک بڑی سی ٹرے میں گلابی چائے کا پیالا۔ رس بسکٹ' پھینیاں اور امرتیاں لگ کر آ گئیں۔ وہ مونڈھے پر ٹرے گود میں رکھ کر بیٹھ گیا اور اونچی آواز میں بولا" لو بھئی بکرے او! آپ کی وجہ سے ہم کو کیا کیا نعمتیں مل گئیں۔ اب آگے تمہاری قسمت۔"

حضور نے فرمایا" ان کی قسمت بھی اچھی ہے بابا۔ ڈیرے پر جو آ گئے ہیں۔ جو اس ڈیرے پر آتا ہے اچھی قسمت والا ہی ہوتا ہے۔"

اتنے میں بابا جلال سر پر برسیم کا گٹھا اٹھائے اور اپنی جھولی میں دو اڑھائی سیر چنے ڈالے آ گیا۔ اُس کے پیچھے اعظم تھا جس نے بھاگ کر قریبی بیر بیری سے کلہاڑی کے ساتھ سبز سبز شاخیں کاٹی ہوئی تھیں۔

بکرے اور ان کا مالک بڑی دیر تک بیٹھے اپنی اپنی خوراک کھاتے رہے اور جب وہ چلنے لگے تو باباجی ان کو دروازے سے باہر سڑک کے دوسرے کنارے تک چھوڑنے گئے۔

ایک روز یوں ہوا کہ میں اپنے گلبرگ والے پرانے دفتر میں بیٹھا منسٹری کے ان خطوں کا جواب لکھ رہا تھا جو میرے خیال میں منسٹری کو نہیں بھجوانے چاہئیں تھے۔ ان خطوں کی زبان اور ان کے مضمون کا لب ولہجہ کچھ ایسا تھا جس کا میں عادی نہ تھا۔ عادی کیا مجھے ایسی عبارت سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔ میں نے ایسے تحریری جھڑکے اپنی زندگی میں کبھی سنے ہی نہ تھے۔ سامنے کے جھڑکے بیسیوں مرتبہ سنے تھے اور انہیں خوش اسلوبی سے برداشت بھی کیا تھا لیکن تحریر کے اندر ایسی ہتک آمیز گفتگو سننا میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ ہتک آمیز تحریر پڑھتے ہوئے چونکہ ہتک کرنے والا سامنے موجود نہیں ہوتا اس لیے وہ فقرے پڑھتے ہوئے اپنی ہتک خود ہی کرنی پڑتی ہے۔ یعنی ظالم کا روپ بھی خود ہی اختیار کرنے کی مجبوری ہوتی

ہے۔ جب انسان ایک ہی وقت میں خود ہی ظالم خود ہی مظلوم اور خود ہی مجبور بنا کھڑا ہو تو اس کی حمایت کو کوئی نہیں آتا۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پراچین دور کی دھوپ جلی چٹان ہو جس کے اندر تین گہری دراڑیں پڑ کر نیچے تک اتر گئی ہوں۔ وہ چٹان ویسی کی ویسی کھڑی ہو اور دیکھنے والے بھی اس کو ایک چٹان ہی سمجھتے ہوں۔ ایک تہدید آمیز خط پڑھتے وقت ہر ہر ذلت آمیز فقرے کے ساتھ اپنی بے عزتی خود کرتے جانا مر جانے کا مقام ہے۔ اس خود سے انسان میں گہرے شگاف پڑ جاتے ہیں۔ ساری شخصیت جزامی ہو جاتی ہے اور زخموں کے اندر سے سفید سفید مادہ ہر وقت رستا رہتا ہے۔ کسی اور کو یہ مادہ نظر نہ آئے۔ بو نہ آئے۔ گھن نہ آئے دوسری بات ہے لیکن اپنے آپ کو یہ کوڑھ ہر وقت دکھائی دیتا رہتا ہے اور ستم کی بات یہ کہ اس کوڑھ پر ترس کھا کر کوئی خیرات بھی نہیں دیتا۔

میں تین چار مرتبہ خط پڑھ کر اپنی بے عزتی کر چکا تھا اور ابھی اپنے آپ کو اور کھڑکانے کا ارادہ تھا کہ رشید چودھری میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ رشید چودھری کے بات کرنے کا اور بات نہ کرنے کا ایک اپنا ہی انداز ہے۔ جب وہ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے خاموش ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور جب وہ چپ بیٹھے ہوتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہیں لیکن آپ ان کی بات سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں ان کی معیت میں بہت چوکس رہتا ہوں اور ان کی بات پکڑنے کے لیے ہر لحظہ پتاں بھار ہو کر گزارتا ہوں۔ وہ دوپہر میرے لیے بڑی ہی تکلیف دہ دوپہر تھی جب اپنی منسٹری کے سیکرٹری کے نام میرے محبت نامے کا جواب مجھے سیکرٹری کے پی۔ اے کی طرف سے مل رہا تھا۔ اس خط کی میں دوسری باتیں تو آپ کو بتا نہیں سکتا البتہ اس کا واحد شفیق، خلیق اور شائستہ جملہ سنائے بغیر نہیں رہوں گا کہ

I am obliged to state categorically that the Secretary has no desire to develop a friendship with you. In view of this, I am sure you will agree that it is inconsistant with gentlemanly standards of conduct to inflict one's company where it is not wanted.

چودھری رشید صاحب کے پاس گیان کا اگر پورا ایک باب نہیں تو اس کے کچھ ورق ضرور موجود ہیں۔ وہ جس دفتری کام کے لیے میرے پاس آئے تھے مجھے اس کا علم تھا کیونکہ وقت اور مقام ہمارے درمیان فون پر طے ہو چکا تھا۔ پھر ان کے ہاتھ میں وہ کاغذات بھی تھے جن کے بارے میں ہم کو گفتگو کرنا تھی۔ پھر میرے مہتمم جماعت کا انٹرکوم پر مجھے بتا دینا کہ ہم کو تیسری شق منظور نہیں ہے اس بات کی بین دلیل تھی کہ وہ پہلے سے طے شدہ کام کے لیے میرے پاس تشریف لا رہے ہیں۔

لیکن انہوں نے کرسی پر بیٹھ کر میرے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنی فائل میز پر رکھ دی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھی بنا کر انہیں ایک دوسرے سے پیوست کیا۔ پھر شاید کچھ بولے یا شاید نہیں بولے۔ میری سمجھ میں اس لیے نہیں آیا کہ گو میں اس خط کی وجہ سے ذہنی طور پر پتاں بھار کھڑا تھا لیکن میں چودھری صاحب کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

پھر چودھری صاحب نے گلا صاف کر کے بہت اونچی آواز میں کہا ”آپ نے میری بات کی طرف توجہ نہیں

دی۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور ایک شانتی نکیتن ہے جہاں نور والے لوگ رہتے ہیں اور شبنم جیسی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی زخمی ہو، آزردہ ہو، غمگین ہو یا لاچار ہو۔ وہاں اس کا علاج ہو جاتا ہے۔ وہ ذہنی مریض کا بھی علاج کرتے ہیں اور بدنی طور پر پتھر ہو جانے والے کی دوا دارو بھی کرتے ہیں۔ آپ اٹھیں اور ابھی میرے ساتھ چلیں۔“

میں ٹک ٹک چودھری صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔ مجھے سب سے بڑا افسوس اس بات کا تھا کہ چودھری صاحب نے میری زخم خوردگی کو بھانپ لیا تھا اور اب وہ علاج کی غرض سے مجھے وہاں لے جانا چاہتے تھے۔ مجھے ان کی اس ٹیلی پیتھی میں اپنی ذلت محسوس ہوئی اور میں نے ان کے ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا میں کسی ایسے شانتی نکیتن میں جانا نہیں چاہتا جو مجھے میری خودی سے علیحدہ کر دے اور مجھے اپنی راہوں کو خود اجالنے سے محروم کر دے۔

چودھری صاحب نے کہا ”یہ آپ سے کس نے کہا کہ وہ خودی شکن ہیں۔ وہ تو سیدھے سادے اللہ کے پیارے ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ اللہ کے پیارے کون ہیں۔“

چودھری صاحب نے کہا ”یہ اپنے آپ کو ”نور والے“ کہتے ہیں اور نور والے کہلاتے ہیں۔ حضور کا اسم گرامی حضرت فضل شاہ صاحب ہے اور یہ جالندھر شریف سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔“

جالندھر کے ساتھ مجھے شریف کا لفظ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور وہ بھی چودھری رشید صاحب کے منہ سے۔ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا ”پھر کسی دن رکھیں گے رشید صاحب۔ کسی اچھے سے ’کھلے سے‘ دن۔ جس دن طبیعت امنگ پر ہو اور آرزو جوان ہو اور خواہش کے گھوڑے کا رخ کسی شانتی نکیتن کے سیتل ساگر کی طرف ہو۔“

رشید صاحب نے کہا ”آج سے اچھا اور کون سا دن ہو سکتا ہے۔ آج جمعہ ہے۔ سردی شباب پر ہے۔ دھوپ کھلی ہوئی ہے اور ڈیرے پر جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔ آج ہی چلتے ہیں۔“

مجھے جمعے اور ڈیرے سے دونوں سے اجتناب تھا اور رشید صاحب یہ دونوں الفاظ ایک ہی فقرے میں بول گئے تھے۔ میں نے پوچھا ”یہ ڈیرا کیا بلا ہے؟ قلندروں اور مچھندروں کا مسکن!“

رشید صاحب نے کہا ”وہاں سبھی کچھ ہے‘ قلندر بھی مچھندر بھی۔ سیکرٹری صاحب بھی‘ ڈاکٹر صاحب بھی‘ میاں صاحب بھی‘ دیوان صاحب بھی۔ ڈیرا ایک پوری زندگی ہے‘ ایک کل ہے۔ وہاں سبھی کچھ ہے۔ آپ اٹھیں تو سہی۔“

میں نے کہا ”دیکھیے چودھری صاحب باوجود اس کے کہ میں اس وقت غم خوردہ ہوں اور باوجود اس کے کہ مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے اور باوصف اس کے کہ آپ جیسا مخلص دوست مجھے ساتھ لے جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں جا نہیں سکتا۔“

”لیکن کیوں؟“ چودھری صاحب نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہم ان چیزوں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔“ میں نے کہا ”ہمارا گھرانہ فراست اور فلسفے کا گھرانہ ہے اور

ہم پشتوں سے پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ معاصرالامرا کی دوسری جلد میں ہمارے بزرگوں کے نام بولتے ہیں اور ہم جب سے اس رنگ میں چلے ہوئے آج یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب ہم خانقاہوں میں جا کر پیروں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔ یہ ہماری خوداری کے منافی ہے۔ ہمارے وجود کی توہین ہے۔ ہم میں صاحب السیف بھی تھے اور صاحب القلم بھی۔ سردار بھی تھے اور رسالہ سردار بھی۔ ہم حکمران بھی رہے اور حکمرانوں کے صلاح کار بھی لیکن ہم کبھی کسی آستانے پر سر جھکانے نہیں گئے۔ تبادلہ خیال کرنے ضرور گئے ہیں۔ کم از کم پچھلی دس پندرہ پشتوں سے ہم نے ایسا نہیں کیا۔"

چودھری رشید حیرت زدہ میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا "میں تصوف کو اور صوفی ازم کو اسلام کے منافی سمجھتا ہوں۔ شرع نے جو ہم کو بتلا دیا ہے' سمجھا دیا ہے اس کے علاوہ باقی ہر شے بدعت ہے اور ہمارا گھرانہ بدعت کے سخت خلاف ہے' اور ہم صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے پابند ہیں۔ اسی میں ہماری فلاح' اسی میں ہماری ترقی اور اسی میں ہمارا مستقبل پوشیدہ ہے۔ یہ تصوف اور گیان' چودھری صاحب! ان لوگوں کو اختراع ہے جو زندگی سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جو گریز کا راستہ اختیار کرنے کو خدا کی عطا کردہ زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی راہیں خود استوار نہیں کر سکتے۔ سن لیجیے چودھری صاحب! مجھے اپنا مستقبل خود بنانا ہے اور اپنی راتوں کو خود منور کرنا ہے۔ میں اقبال کا شاہین ہوں۔ رائی کھیت کی جاں بلب مرغی نہیں ہوں۔ میں امیں ہوں میں۔ گھوں گھوں گھوں..... ٹھاٹھاٹھا....."

چودھری رشید نے بڑے سادھارن طریق پر کہا "چلئے آج جمعہ تو وہیں پڑھ لیتے ہیں۔ کھانا کھا کر آ جائیں گے۔"

میرا چودھری صاحب کے ساتھ ایک کام پھنسا ہوا تھا اس لیے میں مجبور ہو گیا۔ کمرے سے اٹھ کر کر اپنی ٹوپی نکالی اور چودھری صاحب کو رہنما کے طور پر ساتھ بٹھا کر آگے نکل گئے۔

نہر کنارے چلتے چلتے جب دھرم پورے کا پل آیا تو چودھری صاحب نے دائیں مڑنے کو کہا۔ دائیں مڑ کر میں نے سامنے نظر ڈالی تو ایک چھوٹا سا گروہ ڈھول بجاتا دھمال ڈالتا سبز چادر ہاتھوں میں تانے میاں میر صاحب کی درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے جا رہا تھا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے چودھری صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا زیادہ دور نہیں۔ بس سامنے ہی ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سامنا بھی آ گیا۔

میاں میر صاحب کے آستانے کو اندر کی طرف جانے والی سڑک کے سامنے ایک بڑا سا کالا بورڈ لگا تھا جس پر جلی الفاظ میں لکھا تھا "نور والوں کا ڈیرا۔"

یہ دو ڈھائی کنال کا مربع نما قطعہ زمین تھا جس کے اردگرد پختہ اینٹوں کی چار دیواری تھی۔ سامنے سڑک کی جانب دیوار مشکل سے دو ڈھائی فٹ اونچی ہو گی لیکن پہلوؤں کی جانب چار دیواری قد آدم اونچی تھی۔ اس چار دیواری کے اندر چھپر اور پھونس کی جھونپڑیاں تھیں جو بیشتر چار دیواری کی ٹیک پر بنی ہوئی تھیں۔ یہیں بائیں ہاتھ پر ڈھینگا کوٹھا تھا جو سطح زمین سے ڈھائی تین فٹ نیچے تھا اور جس کے اندر چھت پر کڑیوں میں کنڈے ڈال کر ہاتھ سے کھینچنے کا پنکھا لگایا گیا تھا۔

اس ڈھینگے کوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹا سا ڈھارا تھا جس میں چار پانچ بکریاں بندھی تھیں۔ اس ڈھارے کے ساتھ ایک کھلا چھپر تھا جس میں دو بڑے بڑے چولہے تھے اور کھانے پکانے کے برتن رکھے تھے یہ ڈیرے کا لنگر تھا جہاں دن رات آگ جلتی تھی اور ہر وقت کچھ نہ کچھ پکتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ سیکرٹری صاحب کی جھگی تھی۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا موٹے اور مضبوط چھپر کا کوٹھا تھا۔ لیکن یہ تفصیل تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی جب میں نے باقاعدگی سے وہاں جانا شروع کیا۔ اُس روز تو ہم ایک کھلے اور لمبے چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے تھے جہاں دو تین چار پائیاں آڑی ترچھی پڑی تھیں اور ایک پھٹی پرانی دری اور موٹا سا پرانا قالین قبلے کی نیڑھ میں بچھے ہوئے تھے۔ کچھ آدمی چار پائیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ قالین پر۔ ایک دو نفل پڑھنے میں مشغول تھے۔

چودھری صاحب نے ایک ایک آدمی کے ساتھ باری باری دونوں ہاتھوں والا مصافحہ کیا اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ ساتھ ساتھ میرا نام بھی بتاتے گئے اور میں بھی ان سے مصافحہ کرتا گیا۔ گرے سوٹ کے اندر میری سرخ ڈبیوں اور پیتل کے چمکدار بٹنوں والی واسکٹ کو بھی حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں کسی نے کہا "ڈاکٹر صاحب آ گئے ڈاکٹر صاحب آ گئے۔" اور سب اپنی اپنی جگہوں پر چوکس ہو گئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اکہرے بدن کا ایک نوجوان' سیاہ ڈاڑھی تیل سے چمکائے' سنہرے فریم کا چشمہ اور اونچی دیواروں کی جناح کیپ نما ٹوپی سر پر لگائے خراماں خراماں ہماری جانب آ رہا تھا۔ اس کے کپڑوں میں صرف کلف لگی سفید شلوار نمایاں تھی۔ باقی سب کچھ ایک چترالی کوٹ نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا جس کا رنگ گہرا براؤن تھا اور جو کہیں کہیں پیلی جھلک بھی دے رہا تھا۔ چودھری صاحب ڈاکٹر صاحب کی طرف لپکے اور بڑی سپردگی کے ساتھ ان سے ملے۔ جھک کر مصافحہ کیا اور پیچھے پلٹ کر قدرے اونچی آواز میں ان سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب نے لمحہ بھر ٹھٹک کر میری طرف دیکھا۔ ذرا رکے۔ بیزل بلاؤ کے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے جانچا اور پھر بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔

یہ میری اور ڈاکٹر صاحب کی پہلی ملاقات تھی اور ہم نے اپنی پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ ہم نے دو مختلف چار پائیوں پر آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے سے باتیں شروع کر دیں اور تھوڑی ہی مدت میں کئی موضوعات الانگ گئے۔ ڈاکٹر صاحب کو بات کرنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ ان کا انداز بیاں مربوط اور ادائیگی تسلسل انگیز تھی۔ ہر بات دھیمی سی دلیل میں لپٹی ہوتی جس سے سننے والا نہ تو چوکنا ہوتا اور نہ ہی اپنے آپ کو مضروب و ذلیل خیال کرتا۔ انہیں سامع کی توجہ جذب کرنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا جیسے کمرے کے پیچھے لمبے برآمدے میں کوئی جھانجھ بجا کر چل رہا ہو اور کمرے کے جالی والے روشندان سے جھنک جھنک کی قدم قدم آواز دم بدم آ رہی ہو۔ ان کا چہرہ تانبے کے پتیلے کی طرح مضبوط اور ان کی آنکھیں بہت گہرے اتر جانے کی غماز تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن وہ ان کی اپنی نہ تھی۔ حکم کے تحت لگی تھی کہ "کسی کو اپنے قد سے مرعوب نہیں کرنا۔ ہمیشہ مسکراتے رہنا ہے۔"

ڈاکٹر مجھ سے میرے بارے میں' میرے دفتر کے بارے میں اور اردو کے مستقبل کے بارے میں پوچھتے رہے اور میری وضاحت کے دوران ان ساری چیزوں کو اپنے ایک ایک فقرے کی ٹکور سے کم اہم بناتے گئے جو میرے نزدیک

بہت ہی اہم تھیں۔ میں اس چیز کا عادی نہیں تھا اس لیے میں نے ڈاکٹر صاحب کے ان جھٹکوں کو پہلی ہی ملاقات میں پلے باندھ لیا جنہیں لوگ عام طور پر پسند نہیں کیا کرتے۔ میں نے سوچا ان کے ساتھ خوب رہے گی اور چونچا چونچی میں لطف آیا کرے گا۔

میں اور ڈاکٹر صاحب مصروف گفتگو تھے کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بھی جلدی اٹھے اور فرمانے لگے "حضور آ گئے۔" میں نے مڑ کر دیکھا وہاں "حضور" قسم کے کوئی بھی صاحب نہ تھے ایک خوبصورت اور مسکراتا ہوا بابا کھڑا تھا جس نے سر پر چوگوشیہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ گھٹنوں تک گرم فلالین کا لمبا سا کرتہ تھا۔ نیچے لال پٹی والا لٹھے کا تہبند بہت سی جیبوں والی ایک واسکٹ اور گلے میں ایک نیم گرم صافہ گہرے سرخ رنگ کا۔ موٹے موٹے پاؤں میں پرانی وضع کے چرمی سلیپر تھے۔ میں نے اس حضور کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس بابے سے زیادہ خوبصورت مرد میں نے اپنی زندگی میں اُس وقت تک نہ دیکھا تھا۔ میں گل حمید' صدر ایوب خان' اور والنٹینو کے حسن سے بڑا متاثر تھا لیکن یہ صورت تو کچھ اور ہی تھی۔ ایسا حسن مجھے کسی وجود پر کسی تصویر میں' کبھی خواب میں بھی نظر نہ آیا تھا۔ میری سٹی گم ہو گئی۔ چودھری صاحب نے سر جھکا کر کہا "حضور یہ ہمارے اشفاق صاحب ہیں۔ اشفاق احمد صاحب۔"

حضور نے ایک مکھم سا نعرہ لگایا "نور والے" اور پھر تالی بجا کر بولے "رحمتاں والے برکتاں والے۔ خدا کی مہمان لو وَجی یہ اشفاق صاحب بھی ہمارے جانی جان ہیں۔ نور والے۔"

میرے مصافحے کے لیے بڑھتے ہوئے ہاتھ ویسے ہی رہ گئے اور آپ نے میرا کندھا تھپتھپا کر کہا "آتے جاتے رہا کریں۔ بزرگان دین سے میل جول رکھیں۔ رحمتوں والے' برکتوں والے۔"

اتنے میں کسی نے پوچھا "حضور جمعہ کی اذان کہیں؟"

فرمایا "اشفاق صاحب کو کھانا کھلا دیا ہے؟"

میں نے عرض کیا "حضور کوئی جلدی نہیں جمعہ کے بعد کھا لیں گے۔"

فرمایا "جمعہ کے ادب میں کہہ رہے ہو یا ابھی بھوک نہیں۔"

میں نے کہا "جناب کوئی خاص وجہ نہیں۔ بس بعد میں ہی سہی۔"

باباجی نے اشارہ دیا۔ رضا صاحب نے اذان دینی شروع کی اور ہم جہاں کھڑے تھے ویسے ہی کھڑے رہے۔ جمعہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھایا اور جمعہ پڑھنے کے بعد ہم سب لنگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ لنگر کے پاس پہنچ کر باباجی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "پت! آپ اندر چلیں' بڑے کوٹھے میں مہمانوں کو بھی وہیں لے چلیں۔ سیکرٹری صاحب' اعظم صاحب' حاجی صاحب۔ سب لوگ وہیں چلیں وہیں بیٹھیں۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے باباجی کے ڈوہنگے کوٹھے کے اندر قدم رکھا۔ باہر سے مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ کمرہ گہرا ہے اور اس کا فرش باہر کی سطح سے ڈھائی تین فٹ گہرا ہے اور اس کے اندر اترنے کے لیے دہلیز کے ساتھ فٹ بھر کا زینہ بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ خود کمرے میں اترے۔ ان کے بعد

چودھری صاحب اور پھر آہستہ آہستہ سبھی لوگ اندر آ گئے۔

اندر اچھا خاصا اندھیرا تھا اور دروازے سے کھچی ہوئی تار کے ساتھ بجلی کا ایک مدھم سا لاٹو روشن تھا جو مشکل سے چالیس کینڈل پاور کا ہو گا۔ کوٹھے کے اندر دروازے کے ساتھ ساتھ دور تک کنستر' ڈبے' ڈولن' بوریاں' تھیلے اور ڈرم پڑے تھے جن کے اندر اجناس' گڑ' تیل' اچار' مربے' مٹھائیاں' مکھانے' چھوہارے اور کھانے پکانے کے مسالے رکھے ہوئے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے ان تھیلوں بوروں کے ساتھ ساتھ بے شمار بستر پڑے تھے اور کونے میں تین چار کھاٹیں کھڑی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دروازے کے عین سامنے' کمرے کے زیادہ منور حصے میں جہاں ایک پرانا کمبل اور اس کے ساتھ ایک کہنہ رلی بچھی ہوئی تھی ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ایک سبز پوش بزرگ جن کا لمبا کرتہ اور جھاڑو دیتی دھوتی دونوں ہی گہرے سبز رنگ کے تھے پلاسٹک کا ایک تہہ شدہ دسترخوان لے کر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سبز پوش بزرگ کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ "اس مخلوق کا نام بابا جلال ہے اور آپ اس ڈیرے کے ناسئی اور شرلوگوں میں سے ایک ہیں۔" میں نے چہرہ اٹھا کر بابا جلال کی طرف دیکھا تو نہ وہ مجھے ناسئی نظر آئے اور نہ ہی شر۔ البتہ ان کی حیثیت عرفی میں ان دو انگریزی الفاظ کے استعمال سے ان کی شکل بڑی مضحکہ خیز ہو گئی جہاں انہوں نے چھوٹے سے شلغم جیسے چہرے پر بہت لمبی مہردار ڈاڑھی لٹکا رکھی تھی اور حریری چوگوشیہ ٹوپی کے ساتھ پیپر کلپ لگا کر ایک عام سا پھول اٹک رکھا تھا۔ جب دسترخوان بچھ گیا تو بڑی عمر کے ایک اور بزرگ پانی کا جگ اور سٹین لیس سٹیل کے گلاس لے کر آ گئے۔ یہ بڑے مضبوط جثے کے بزرگ تھے اور ڈیرے کے خادم دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا "مہر صاحب روٹی کھالی ہے؟" تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا "جی جناب کھالی ہے!"

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"جس طرح جناب ارشاد فرمائیں۔" انہوں نے کہا۔

"تو پھر آپ چلیں۔" ڈاکٹر صاحب نے رکھائی سے کہا "دیر ہو رہی ہے۔ لمبا فاصلہ ہے اور آپ کی سواری بھی قابل اعتماد نہیں۔"

"بہت بہتر جناب!" انہوں نے نیازمندی سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

اتنے میں بابا جلال ڈونگوں' پلیٹوں' چمچوں اور روٹیوں کا تھال بھرے اندر آ گیا اور اپنا تھال دسترخوان پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک ایک کر کے پلیٹیں مہمانوں کے آگے چنیں' روٹیوں والا چوخانہ رومال نکال کر درمیان میں رکھا اور دونوں ڈونگوں کے ڈھکنے کھول دیئے۔ شلغم گوشت پکا تھا اور گرم گرم شوربے سے بھاپیں اٹھ رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میری پلیٹ میں آدھ آدھ پاؤ کی دو بوٹیاں' دستی کی ایک لمبی سی نلی اور چوسنے والی ہڈی کا ایک چمچا ڈال دیا۔ میں نے بہتیرا شور مچایا۔ نہ نہ کی۔ تھالی آگے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے اور کوئی سیر بھر ملبہ میری رکابی میں ڈال دیا۔

آرام کرنے کی اجازت عنایت فرمائیں تو مجھ پر احسان ہوگا۔" انہوں نے بڑی خوشی سے اور خوشدلی سے اجازت دے دی اور میں کنستروں، ڈبوں، بوریوں اور اچار کے مرتبانوں کے درمیان ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔

میرا اس وقت کا لیٹنا کچھ اس طرح کا تھا گویا میں غسل کے تختے پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے گرد یہ کنستر، ڈبے اور مرتبان گرم پانی سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں کافور، عرق گلاب اور نیم کے پتوں کا ابلا ہوا پانی شامل ہے اور ان سے ابھی مجھے غسل دیا جانا ہے۔ اردگرد کے لوگوں کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں لیکن وہ خود میرے قریب نہیں آ رہے۔ ان سب کو غسال کا انتظار ہے جو ابھی تک پہنچا نہیں ہے اور اس کے بیٹے نے آ کر بتایا ہے کہ اباجی کھانا کھا کر سو گئے ہیں اس لیے کوئی آدھ گھنٹے تک آئیں گے۔

جب میں سو کر اٹھا تو گہری شام ہو چکی تھی۔ ڈھینگے کوٹھے کے اندر، میری چارپائی سے ذرا دور چوکھا دیا جل رہا تھا اور باہر سے لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا اور چارپائی سے ٹانگیں نیچے اتار کر سوچنے لگا کہ آج یہ میرے ساتھ کیا ہوا!

میرا خیال ہے کہ خرکاروں کے کیمپ میں سپلائی کیا جانے والا لڑکا جب پہلی مرتبہ سو کر اٹھتا ہوگا تو اس کے ذہن میں بھی ایسے ہی خیال آتے ہوں گے۔ میں نے نیلی کناری والے تانے کے تہمد کو جو سوتے میں، کھلنے کے برابر ڈھیلا ہو گیا تھا پھر کس کر باندھا اور باہر آ گیا۔

باہر ڈیرے پر روشنی ہو چکی تھی اور لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بے شام کا کھانا کھا رہے تھے۔

ایک روز یوں ہوا کہ ابن انشا کراچی سے آیا اور مجھے ایک کہانی سنانے لگا۔ اُسے چین سے اور چین کے پرانے ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اُس نے کچھ چینی نظموں اور کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا تھا اور کچھ چھوٹے چھوٹے چینی ملفوظات کو نظمایا بھی تھا۔ اُس روز انشا جی کے اچانک کہانی شروع کر دینے کی کوئی خاص وجہ مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ بس اسی قدر خیال رہا کہ انہوں نے تازہ تازہ کہیں سے پڑھی ہوگی اس لیے مجھے سنانے پر مجبور ہو گئے۔

بولے: چین کے ایک گاؤں میں ایک بڈھا چینی رہتا تھا جس کے پاس نہ کھانے کو پوری روٹی تھی اور نہ تن ڈھانپنے کو پورا کپڑا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس عہد کے بادشاہ بھی اس سے رشک کرتے تھے اور اس کی خوش قسمتی کے تذکرے اپنے درباروں میں کیا کرتے تھے۔ اس بڈھے کے پاس ایک نہایت ہی خوبصورت سفید گھوڑا تھا جس کا ثانی اُس عہد کی ساری دنیا میں اور کہیں نہیں تھا۔ ایسا خوبصورت، صحتمند، جواں سال اور کھلے قدموں کا گھوڑا جب جنگل سے شام کے وقت گاؤں میں داخل ہوتا تو یوں محسوس ہوتا گویا بادل کا ایک بڑا سا سفید ٹکڑا آسمانوں سے اتر کر آبادی کے اندر چلا آیا ہے اور لوگوں کے درمیان رحمتیں بکھیرتا جا رہا ہے۔

بادشاہوں نے بڈھے کو اس گھوڑے کی منہ مانگی قیمت دینے کا وعدہ کیا۔ اپنی اپنی سلطنتوں کے پسندیدہ قطعے اُس کے نام کرنے کا یقین دلایا لیکن وہ بڈھا نہ مانا اور یہی کہتا رہا "بادشاہ سلامت! یہ گھوڑا نہیں ایک شخص ہے۔ میرے گھر کا رکن ہے۔ ایک فرد ہے۔ میں اس کس طرح سے بیچ سکتا ہوں۔ کیسے اپنے گھر کے ایک فرد کا سودا کر سکتا ہوں۔ مجھے جان کی امان دے کر معاف کیا جائے اور میری حفاظت فرمائی جائے۔"

بڈھا غریب تھا اور غریب کو ہر طرح کا لالچ ہوتا ہے اور ہر غریب اپنی زندگی جلد سے جلد بتانے کے لیے دن رات سکیمیں بنایا کرتا ہے لیکن یہ بڈھا کچھ احمق قسم کا بڈھا تھا۔ اس کو اپنی زندگی بتانے اور زندگی کی لیٹ نکالنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔ اس نے ہر مرتبہ گھوڑا بیچنے سے انکار کر دیا۔

ایک صبح جب وہ اٹھا تو اس نے دیکھا کہ سفید گھوڑا اپنے کوٹھے میں نہیں ہے اور تھوڑی دور کے بعد اس کے سموں کے نشان بھی غائب ہیں۔ گاؤں کے لوگوں نے اکٹھے ہو کر اس بوڑھے پر لعن طعن کی اور یک زبان ہو کر کہا "کنگلے جھڑوس اب خوش ہے، جب تجھے اس گھوڑے کی منہ مانگی رقم ملتی تھی۔ زمینیں، مربعے اور ہیرے جواہرات ملتے تھے تو نے انکار کر دیا۔ اب پچھتا رہا ہے کہ گھوڑا بھی گیا اور ہاتھ بھی خالی رہے۔"

بوڑھے نے کہا "دیکھ لو۔"

لوگوں نے کہا "بدقسمت انسان ہیں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ گھوڑا ایک نے ایک دن چوری ہو جائے گا اور تو ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔ آخر تیرے جیسا کنگلا جسے ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر ہوتی ہے اس قدر قیمتی گھوڑے کی حفاظت کیونکر کر سکتا تھا۔ اچھا ہی ہوا تیری یہی سزا ہونی چاہیے تھی۔"

بوڑھے نے کہا "اتنی دور کیوں جاتے ہو اور ایسی ایسی نتیجے کیوں نکالتے ہو۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ گھوڑا اپنے تھان پر نہیں ہے۔ کوٹھے کا دروازہ کھلا ہے اور گھوڑا نا موجود ہے۔ اتنی بات تو حقیقت سے تعلق رکھتی ہے باقی سب طرّے اور اندازے ہیں۔ اس میں بدقسمتی یا کم قسمتی کی کیا بات ہے۔ کیوں مجھے طعنے سے دیتے ہو اور کیوں مجھے برا بھلا کہتے ہو اور یہ نتیجہ کدھر سے نکالتے ہو کہ یہ بدقسمتی کی بات ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ گھوڑا تھا۔ اب نہیں ہے۔"

لوگوں نے کہا "بدنصیب بڈھے ہم کوئی فلسفی یا عالم فاضل لوگ تو نہیں ہیں البتہ تجھ سے سیانے ہیں۔ او مورکھ! سیدھی سی بات ہے جسے ایک بچہ بھی سمجھتا ہے کہ پہلے تیرے پاس ایک بیش بہا خزانہ تھا۔ اب نہیں رہا۔ اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہوگی۔"

بڈھے نے سر جھٹک کر کہا "آپ چاہے کچھ بھی کر لیں میں آپ لوگوں کے منہ نہیں لگوں گا لیکن اپنی بات میں پھر بھی دہراؤں گا اور آخری دم تک اس پر قائم رہوں گا کہ کوٹھا خالی ہے اور گھوڑا چلا گیا ہے۔ باقی اور میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی ہے۔ نفع ہے یا نقصان ہے۔ بہتری ہے یا بربادی ہے۔ گھوڑے کا چلے جانا کسی پوری بات کا ایک حصہ ہے پوری بات نہیں ہے پتہ نہیں پوری بات کیا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے۔"

لوگ ہنسے اور انہوں نے بوڑھے کا ٹھٹھا اڑایا کہ بڈھا پاگل ہو گیا ہے۔ سیانوں نے کہا کہ اتنے بڑے نقصان پر

کوئی بھی پاگل ہو سکتا ہے۔ یہ بیچارا تو ایک مفلس اور قلاش بڈھا ہے۔ اس کا کوئی قصور نہیں! اور سیانوں کی بات تم بھی کرو درست جو شخص اس بڑھاپے میں جنگل سے لکڑیاں چن چن کر لاتا ہو اور گھر گھر جا کر بیچتا ہو کہ رات کی روٹی کے لیے گھر والوں کے لیے مٹھی بھر آٹا آ جائے اس کا اتنا بڑا خزانہ لٹ جائے تو اسے پاگل ہی ہونا ہوا۔

اکیس دن بعد آدھی رات کے وقت بڈھے کا سفید گھوڑا واپس آ گیا۔ دراصل وہ چوری نہیں ہوا تھا' رسہ کھلا پا کر جنگل کی طرف نکل گیا تھا اور دور کہیں نامعلوم وادیوں میں اتر گیا تھا۔ اکیس دن کی دشت نوردی کے بعد جب وہ گھر واپس لوٹا تو اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ بارہ جنگلی گھوڑوں کا ایک غول تھا جن کے حسن اور جوانی پر نگاہیں نہیں ٹکتی تھیں۔

گاؤں کے لوگ پھر بڈھے کے دروازے پر جمع ہو کر کہنے لگے "بڑے میاں واقعی تم سچے تھے اور ہم جھوٹے۔ گھوڑے کا چلے جانا بدقسمتی نہیں تھی بلکہ خوش قسمتی تھی۔ بہت بڑی خوش قسمتی۔ ایسے خوبصورت اور اعلیٰ درجے کے گھوڑے کسی شہنشاہ کے اصطبل میں بھی نہ ہوں گے۔ ہم لوگ تم سے اپنے کہے کی معافی مانگنے آئے ہیں اور آپ کو آپ کی خوش قسمتی پر مبارکباد دینے آئے ہیں۔"

بڈھے نے ہنس کر کہا "اب کی بار پھر آپ اپنے اختیار سے باہر نکلے جا رہے ہیں اور ایک مرتبہ پھر اپنے مفروضوں اور اندازوں میں گھر کر بات کر رہے ہیں اور حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ گھوڑا چلا گیا تھا اب واپس آ گیا ہے اور جو واپس آیا ہے تو اپنے ساتھ بارہ گھوڑے اور لے آیا ہے۔ اس واقعہ پر ہم کوئی فیصلہ کیونکر دے سکتے ہیں کہ یہ اچھی بات ہے یا بری! خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی۔ یہ تو بس ایک خبر ہے۔ ایک ٹوٹا ہے۔ ایک جزو ہے۔ اصل بات اور اصل کل پتہ نہیں کیا ہے۔ پھر میں کس طرح سے کہوں کہ یہ خوش قسمتی ہے بدقسمتی۔

لوگوں نے حیران ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر کہا "جب تک مجھے پوری بات کا علم نہ ہو جائے سارا کل میرے سامنے نہ آ جائے میں کس طرح سے حکم لگا دوں کہ اچھا ہوا یا برا ہوا۔ میں اپنی کم علمی کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔ کوئی تجزیہ نہیں کر سکتا۔ کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ میں اپنی بے فیصلگی کے اندر خوش ہوں مجھے ایسا ہی رہنے دیجیے۔"

اس مرتبہ لوگوں نے ڈر کے مارے بڈھے کے ساتھ کوئی بحث نہ کی کہ شاید پہلے کی طرح اب بھی وہ ٹھیک ہی ہو۔ انہوں نے اپنے اپنے سر جھٹکے اور اس کے دروازے سے چلے گئے۔

اس کنگلے بڈھے کا ایک نوجوان بیٹا تھا۔ بہت خوبصورت' بڑا بانکا۔ بڑا چھبیلا۔ لڑکیاں اُسے چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھیں اور وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ بڈھے کو بھی یہ بیٹا بہت پیارا تھا۔ ایک تو بڑھاپے کی اولاد دوسرے اکلوتا بیٹا۔ بڈھا اُسے نظر بھر کر دیکھتا بھی نہ تھا۔ اس لڑکے نے ان بارہ جنگلی گھوڑوں کو سدھانے کی ٹھانی اور انہیں سواری بنانے کے لیے لگا میں رسے اور پھندے بنانے لگا۔ کھلے باڑے میں تین چار دن کی کوشش کے بعد نوجوان کی محنت پلے پڑنے لگی اور وہ سفید گھوڑے سے پھدک کر چند قدموں تک جنگلی گھوڑوں پر بھی پیٹھ سواری کرنے لگا۔ ایک روز سب سے منہ زور جنگلی ابلق نے جو پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتا تھا اُس خوبرو جوان کو ہوا میں اچھالا اور گدے کی طرح زمین پر پھینک دیا۔ اس کی

ران کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا۔

گاؤں کے لوگ اس خوبرو کی معذوری کی خبر سن کر بڈھے کے گھر پر آئے اور افسوس کرنے لگے کہ واقعی آپ ٹھیک کہتے تھے۔ ہم جن گھوڑوں کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھے تھے وہ ایک بہت بڑی زحمت ثابت ہوئی۔ کیا بیٹھے بٹھائے چاند سے چہرے کو گہن لگ گیا۔ اور وہ بھی اس عمر میں کہ تمہارا آخری پہرا ہے اور یہی تمہاری اکلوتی اولاد ہے۔ جب بڑھاپے کا سہارا ہی کمزور پڑ جائے تو بڑھاپا کس طرح سے بسر ہو۔ پہلے تو تم صرف غریب ہی تھے اب بے سہارا بھی ہو گئے ہو۔

بڈھے نے کہا "بھائیو! آپ پر تو نتیجے نکالنے کا بھوت سوار ہے اور آپ ہر وقت حتمی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اتنی دور نہ جایا کرو اور اتنی دور نہ جاؤ۔ صرف اس قدر کہو کہ لڑکے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ بس! ہمیں کیا معلوم کہ یہ سہارا ہے یا سہارا نہیں ہے۔ پہلے مضبوط تھا اب معدوم ہے۔ پہلے توقع تھی اب تاسف ہے۔ یہ تو بس ایک خبر ہے۔ ایک ٹوٹا ہے۔ ایک ٹکڑا ہے اس سے آپ نے پورا کل کیسے تیار کر لیا۔ پوری کہانی کیونکر بنا لی!"

پھر بڈھے نے کہا "آپ کا شاید کچھ اور خیال ہو لیکن میرا مشاہدہ اور میرا تجربہ یہ ہے کہ زندگی ہمیشہ ٹکڑوں میں اور ٹوٹوں میں ملتی ہے اور فیصلہ کل کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ میرے سامنے کل موجود ہی نہیں پھر میں فیصلہ کیسے دوں اور حتمی بات کس طرح سے کروں۔"

اس واقعے کے چند ماہ بعد بڈھے کے ملک پر کسی قریبی بادشاہ نے حملہ کر دیا اور دونوں ملک جنگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ ملک میں جبری بھرتی کا نقارہ بج گیا اور شاہی کارندے گاؤں گاؤں قریہ قریہ جا کر صحتمند لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنے لگے۔ جب وہ بڈھے کے گاؤں پہنچے تو ہر قابل کار مرد کو میدان جنگ میں لے جانے کے لیے رتھوں میں ڈالنے لگے۔ ماسوائے گاؤں کے چند بوڑھوں اور سفید گھوڑے والے بوڑھے کے نوجوان بیٹے کے جس کی ران کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔

سارے گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ بوڑھے باپ اور بوڑھی مائیں بین کر رہی تھیں۔ سارا گاؤں صحتمند مردوں سے خالی ہو چکا تھا اور بیویاں اور بہنیں دیواروں کے ساتھ لگ لگ کر دھاڑیں مار رہی تھیں۔ روتے سسکتے اور کراہتے ہوئے لوگ بڈھے کے دروازے پر پہنچے اور نوحہ کرتے ہوئے بولے "تو واقعی خوش نصیب ہے اور تیرے کرم ہم سب سے اچھے ہیں۔ تیرا نوجوان بیٹا تیری آنکھوں کا نور اور بڑھاپے کا سہارا ہمیشہ کے لیے تیرے پاس رہا اور ہمارے سارے مرد جنگ کی بھٹی میں جھونک دیے گئے۔" پھر انہوں نے اونچے اونچے بین کرتے ہوئے یک زبان ہو کر کہا "یہ جنگ لمبی ہو گئی ہے اور ہمارے محاذ پر گھمسان کا رن پڑا ہے۔ ہمارے لوگوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آئے گا اور تم اپنے بیٹے کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کرو گے۔"

بوڑھے نے چڑ کر کہا "تم لوگوں سے بات کرنی فضول ہے۔ تم بات سے بات نکالنے کے عادی ہو گئے ہو اور آگے ہی آگے چلتے جاتے ہو۔ خود ہی نتیجے نکالتے ہو اور خود ہی فیصلے صادر کرتے ہو اور آپ ہی حکم بن بیٹھے ہو۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہارے گھروں کے مرد جنگ پر بھیج دیے گئے ہیں اور میرا بیٹا نہیں لے جایا گیا۔ اب کوئی کس طرح سے کہہ سکتا ہے

کہ یہ خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی۔ اتنی چھوٹی سی خبر پر کوئی کس طرح سے فیصلہ دے سکتا ہے کیونکہ پوری حقیقت تو سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم ہی نہیں۔"

یہ حکایت سنا کر انشا جی تھوڑی دیر تو خاموش رہے پھر اپنے مخصوص انداز میں میرا کندھا ہلا کر بولے "میاں کیا سمجھے؟"

میں ابھی دبدھا میں تھا تو مسکرا کر بولے "اس بڈھے کی باتوں میں نہ آ جانا۔ ہر فیصلہ خود ہی کرنا اور ہر نتیجہ خود ہی نکالنا ورنہ شرف انسانی سے محروم ہو جاؤ گے۔ انسان کی عظمت اسی بات میں ہے کہ اُسے اصل حقیقت کا علم ہو یا نہ ہو وہ قول فعل عطا کرنے میں ذرا بھی احتراز نہ کرے۔ اس بڈھے چینی کے چکر میں نہ پھنس جانا اور اپنے دعوؤں اور فیصلوں کا علی الاعلان اظہار کرتے رہنا ورنہ دنیا تمہیں جاہل' بے علم' گاودی اور نالائق سمجھنے لگ جائے گی۔ ویسے تم میں یہ آثار شروع سے موجود ہیں اور تم نے ان کا مداوا کرنے کی کوئی ترکیب نہیں ڈھونڈی۔

ایک روز یوں ہوا کہ میں اپنے دفتر میں ہونے والی ایک میٹنگ کے درمیان کچھ گڑبڑا سا گیا اور میٹنگ کی فریکوئنسی سے نکل گیا۔ سارے صوبوں کے دو دو نمائندہ سکالر میز کے گرد جمع تھے اور بورڈ کے کسی آئندہ منصوبے پر بڑی دردمندی کے ساتھ بحث کر رہے تھے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا اور ان سے کچھ کہے سنے بغیر موڑ لے کر دفتر سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر تو میں بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا پھر اچانک میرے ذہن میں بابا جی کا خیال ایسے ابھرا جیسے کسی نے میرے دماغ کے اندر انگلی بڑھا کر گھنٹی بجائی ہو اور مجھے طلب فرمایا ہو۔

حضرت سائیں فضل شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ چولہے کے پاس مونڈھے پر بیٹھے ایلومونیم کے بڑے دیگچے میں کڑچھا چلا رہے تھے اور نیچے جھک جھک کر آگ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ میں چھپر کے ایک کونے میں اینٹوں کی برجی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور حضور کو دیکھنے لگا۔

ڈیرے کے سب لوگ بابا جی کو حضور کہہ کر پکارتے تھے اور اسی نام سے ان کا ذکر کرتے تھے۔ مجھے اس لفظ سے کچھ ایسی وابستگی تھی کہ میں انہیں کبھی بھی اس القاب سے یاد نہ کر سکا اور ہمیشہ رکا رکا سا رہا۔ ایک مرتبہ میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ اگر میں انہیں حضور کے بجائے صرف بابا جی کہہ کر بلایا کروں تو انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ میری درخواست سن کر بابا جی کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور انہوں نے لہک کر تالی بجاتے ہوئے کہا "لو وئی... وا جی... جس لفظ کو سننے کے لیے ہماری طبیعت دیر کی خواہشمند تھی اس کا اذن اشفاق صاحب کو مل گیا ہے۔" پھر آہستہ سے فرمانے لگے "جب تک اوپر سے اجازت نہ ہو خطاب نیچے اتر ہی نہیں سکتا۔ آج سے ہم آپ ہی کے بابا جی نہیں بھی کے بابا جی ہیں۔"

لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب مجھے "بابا جی" کہنے کی اجازت مل گئی تو میرا دل "حضور" کہنے کو تڑپنے لگا اور میں اپنے ہی تقاضے کے پھندے کا شکار بن گیا۔

لنگر خانے کے چھپر کی برجی سے لگے لگے میں نے آہستہ سے کہا "حضور" اور میرے اندر سے ٹیں ٹیں کرتے طوطوں کا ایک اتنا بڑا غول نکلا کہ دنیا کے بڑے سے بڑے جنگل نے آج تک اتنی بڑی تعداد میں اتنا زیادہ شور مچانے والے طوطوں کا ایسا جھنڈ کبھی نہیں دیکھا۔ دراصل ڈیرہ پاک کے گرد چکر لگانے والے طوطوں کا یہ جھنڈ مجھے شرمندہ کر رہا تھا کہ جس لفظ کی ادائیگی سے تم آج تک بچتے رہے تھے' خوش ہوتے رہے تھے اور اپنے رویے پر ناز کرتے رہے تھے وہ بت کس طرح سے خود بخود منہ کے بل گر کے سجدہ ریز ہو گیا ہے۔ ایک ایسے شخص کے سامنے جو پڑھا لکھا نہیں۔ صاحب جاہ و حشم نہیں۔ طاقتور نہیں۔ کسی فوجی' سیاسی' نظریاتی' ثروتی' شرافی سلسلے سے منسلک نہیں۔ کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتا بلکہ پکا بھی نہیں۔ کچے کوٹھے میں رہتا ہے۔ کچے کچے کھانے کھاتا اور کھلاتا ہے اور جس کے سامنے کوئی کچا نہیں پڑتا شرمندہ نہیں ہوتا۔ خوف نہیں کھاتا۔ پھر میں کیوں اس کے سامنے عاجزی کا اور ادب کا اور سپردگی کا اعلان کروں۔ میں جو ایک اکائی ہوں۔ ایک کل ہوں۔ ایک پورا فرد ایک پوری دنیا ہوں۔ میں کیوں اس کو اپنے سے بہتر اپنے سے اعلیٰ اپنے سے برتر جانوں۔ میں ایک صاحب حیثیت' صاحب الرائے' صاحب تصنیف اور صاحب سرکار ہوں۔ میں کیوں وہ کچھ کروں جو ان پڑھ جاہل' روایت پرست اور قدامت پسند لوگ کرتے ہیں۔

میں نے اپنے علم اور دبدبے اور فضیلت اور خاندانی نیک نامی کی شمشیر جوہر دار نیام سے نکالی اور اُسے فضا میں اونچا ہاتھ کر کے لہرایا' گھمایا او کڑکایا اور اس کڑک سے ایک کڑک دار آواز نکلی "حضور" بابا جی نے سر اٹھا کر دیکھا اور کڑچھی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور جلدی جلدی تال بجا کر فرمانے لگے "رحمتاں برکتاں والے شاناں والے۔ ذکر اذکار والے۔ ہمارے جانی جان آ گئے... آ وجی آ و... بیٹھو جی بیٹھو۔ خوشیاں آ گئیں روشنائیاں پھیل گئیں۔"

میں کچھ کہے سنے بغیر' سر جھکائے اور کندھے سکوڑے ایک قریبی مونڈھے پر بیٹھ گیا اور معذرت کے ان جملوں کو باسی ہاروں کی طرح سلجھانے لگا جن کے ذریعے میں بابا جی پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پچھلے چند مہینے میں سرکاری مصروفیتوں کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا اور میرا زیادہ وقت لاہور سے باہر گزرا.... میرے سامنے چھوٹی سی گول میز رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا "آپ ہر وقت یہیں ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس ہمارے اردگرد اس ڈیرا پاک پر.... آپ فکر نہ کیا کریں اور طبیعت پر بوجھ نہ ڈالا کریں اشفاق صاحب.... آپ ہر وقت ہمارے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔"

میں کچھ کہنے لگا تو فرمانے لگے "بیٹا زندگی میں کام ہی اتنے ہوتے ہیں کہ کوشش کے باوجود کھلا نہیں جاتا۔ اپنے پیاروں سے ملا نہیں جاتا لیکن کام کرنے بھی ضروری ہیں۔ ان کا بھی حکم ہے۔ ان کے بھی بڑے درجات ہیں پر ہمارے پیارے' ہمارے جانی جان ہمارے ساتھ ہی ہوتے ہیں ہمارے پاس ہی رہتے ہیں چاہے برس ہا برس تشریف نہ لا سکیں۔

میں اپنی جگہ شرمندہ ہوں اور معذرت کے لیے مناسب فقرے تلاش کر رہا ہوں اور آپ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی میری خفت دور کیے جاتے ہیں اور مجھ سے ایسے مل رہے ہیں جیسے کل شام ہی میں نے ان کی خدمت میں حاضری

دی ہو۔ میں نے کئی مرتبہ درخواست کی کہ مجھ پر کبھی تو نفرین کیجئے۔ کبھی تو برا بھلا کہیے۔ کبھی تو سرزنش کیجئے کہ ہاں بھائی بڑے آدمی ہوگئے اب کیوں ہم سے ملنے لگے۔ یا ٹھیک ہے جہاں جہاں بھی رہو خوش رہو۔ تمہاری طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی رہے اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ فقرانہ آئے صدا کر چلے۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔''

آپ میری باتیں سن کر خوش ہوتے رہے اور چھوٹی چھوٹی تالیاں بجاتے رہے۔ اس روز کدو اور چنے کی دال پکی تھی۔ آپ نے ایک چھوٹی سی رکابی میں خصوصی طور پر خالص گھی کڑکایا اور اس میں کدو دال کڑچھی سے ڈال کر میرے سامنے رکھ دی۔ خمیری روٹیاں تھیں۔ چینی کے پیالے میں تازہ مکھن تھا ساتھ پودینے کی چٹنی تھی۔ تازہ کٹی ہوئی مولی کے ٹکرے تھے اور آخر میں میٹھی میٹھی سرخ چائے تھی بیحد گرم اور ملائی کی تہہ میں لپٹی ہوئی۔

اتنے میں پانچ چھ آدمیوں کا ایک گروہ آ گیا۔ ان کے ساتھ ایک برقع پوش خاتون بھی تھی۔ وہ اپنے ساتھ لنگر کے لیے ایک چھوٹی سی چتکبری بکری لائے تھے۔ سب نے جھک جھک کر باری باری باباجی کے قدم چھوئے' مٹھی میں دس دس کے نوٹ چھپا کر پیش کیے۔ پھر دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ آپ نے نوٹ واسکٹ میں ڈال لیے۔ آواز دے کر بابا جمال کو بلایا اور اس گروہ کو بمعہ چتکبری بکری کے بابا جلال کے حوالے کر دیا۔ بابا جلال سب کو ہانکتا ہوا بوڑھی کے نیچے لے گیا اور انہیں بے تکی بچھی ہوئی چار پائیوں پر بے تکے انداز میں بٹھا دیا۔

باباجی نے ان لوگوں کے لیے الگ الگ کٹوریوں میں کدو دال ڈال کر اور ساتھ نئی اور پرانی روٹیوں کا چھابے میں ایک مینار لگا کر کھانے کے لیے بھیج دیا۔ میں نے اپنے سامنے کے مکھن والے کٹورے کو سرکاتے ہوئے کہا ''باباجی یہ بھی بھجوا دیجئے۔ میں تو کھا چکا۔''

فرمایا ''کوئی بات نہیں پڑا رہنے دو۔''

میں نے کہا ''حضور! بابا جلال چٹنی اور مولی تو لے کر ہی نہیں گیا''

فرمایا ''کوئی بات نہیں۔ چٹنی مولی بغیر ہی ٹھیک ہے۔''

میں اپنی تجاویز پر کچھ شرمندہ سا ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا تو آپ نے چینی کی ایک پیالی میں آلو بخارے کی میٹھی چٹنی بھر کر اُسے میرے سامنے رکھ کر فرمایا ''کھاؤ۔ جگر کے لیے مفید ہے۔''

اس سے پہلے بھی میں نے نوٹ کیا تھا کہ باباجی مجھ کو اور مجھ جیسے اور ''معزز'' لوگوں کو تو کھانے کے لیے اچھی اور عمدہ چیزیں دیتے تھے لیکن عوام الناس کو اور کم حیثیت لوگوں کو بچا کھچا' روکھا پھیکا کھانا برتا دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ ایسے سیدھے تھے کہ معمولی قسم کے کھانے کو لے کر بھی ہم سے زیادہ خوش ہوتے اور روٹی' رکابی' دال اور گلاس ہر شے کو الگ الگ بوسہ دے کر پھر کھانا شروع کرتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سبی میلہ کے کارکنوں کی طرف سے ہمیں ایک بار پھر دعوت نامہ موصول ہوا کہ اب کی بار سبی میلہ میں ضرور آئیں اور گزشتہ سالوں کی طرح معذرت کر کے ہمیں ٹرخانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ دعوت نامہ ہم دونوں کے لیے تھا اور پچھلے تین سال سے اس قسم کے دعوت نامے باقاعدگی سے آ رہے تھے۔ کچھ ہماری سستی' کچھ مصروفیات' کچھ بے حسی اور کچھ زعم لاتعلقی' ہم ہر مرتبہ معافی مانگ کر معاملہ آگے بڑھا دیتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ بانو نے اپنے متاع غرور کا نشہ کچھ ایسی بیدردی کے ساتھ کھینچا کہ میں نے میلے پر جانے کا ارادہ پکا کر لیا۔ میں نے سوچا کہ دور افتادہ لوگوں کو چونکہ اپنے مشاہیر سے ملنے کا شوق زیادہ ہوتا ہے اس لیے ان کی آرزو پوری کرنے کے لیے ہمیں سبی جانا ہی چاہیے۔

میں کیمرے میں فلم ڈلوا لایا اور اپنے ریکارڈر کے لیے چھ نئے کیسٹ بھی خرید لیے۔ بانو نے چار روزہ قیام کے لیے مناسب کپڑے تہہ کر کے بکس میں رکھ لیے اور پڑوس کی لڑکی سے درسی جغرافئے کی کتاب منگوا کر اس سے سبی کے بارے میں ابتدائی معلومات بھی حاصل کر لیں۔ بانو قدسیہ کسی دور دراز سفر پر جانے سے پہلے عالی کے برعکس جغرافیائی اور تاریخی معلومات پہلے حاصل کرتی ہیں۔ عالی سفر سے واپس آ جانے کے بعد انسائیکلوپیڈیئے کھنگال کر دیکھا کرتا ہے کہ وہ کدھر گیا تھا اور کہاں رہا تھا اور کیوں رہا تھا اور اس علاقے کی وجہ شہرت کیا ہے!

سفر سے دو روز پیشتر میں ڈیرے پر سلام کرنے گیا تو باباجی غسل فرما کر دھوپ میں بیٹھے تھے اور اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر بادام روغن مل رہے تھے۔ میں سلام کر کے پائینتی پر بیٹھ گیا تو فرمانے لگے ''آج کا دن بھی کیا نورانی دن ہے کہ بڑے بڑے نور والوں سے لمبی لمبی ملاقاتیں ہو گئیں۔ صبح ڈاکٹر غلام علی آئے تھے۔ دوپہر کے وقت حنیف رامے' ان کے بعد میاں قادر بخش' پھر ساغر صدیقی اور اب آپ۔ سارا دن ہی روشن ہو گیا۔'' پھر انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ''نور والے'' کی للکار بلند کی اور ذرا سے پیچھے ہٹ کر بولے'' کھلے ہو کر بیٹھو آرام کے ساتھ۔''

میں ذرا سا کھل کر آرام کے ساتھ ہو بیٹھا تو مسکرا کر بولے ''پوچھو کیا پوچھتے ہو؟'' میں نے کہا ''سرکار پرسوں میں سبی جا رہا ہوں' میلہ دیکھنے۔ اگر حضور کی طرف سے اجازت ہو تو چار دن کے لیے ہو آؤں؟''

فرمایا ''ضرور! ضرور!! لیکن اکیلے نہ جانا بی بی کو بھی ساتھ لے جانا۔ اس کی سیر ہو جائے گی۔''

میں نے کہا'' وہ بھی جا رہی ہے سرکار کیونکہ میزبانوں نے اُسے بھی خصوصی دعوت دی ہے۔''

فرمانے لگے ''سبی کا علاقہ بھی نور و نور علاقہ ہے۔ لوگ جانوروں سے محبت کرتے ہیں اور ان کو اپنی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ جو جانوروں سے محبت کرتا ہے اس کو انسانوں کے قریب ہو کر رہنے کا علم عطا ہو جاتا ہے خواہ وہ انسان کتنے ہی کڑوے اور کسیلے ہی کھردرے کیوں نہ ہوں۔''

میں نے کہا ''حضور! اول تو چار دن' حد سے حد پانچ دن بعد واپس آ کر پوری رپورٹ دوں گا اور اس عرصے میں دعا کا طلبگار رہوں گا۔''

فرمایا ''تم سب کے لیے دعا ہی دعا ہے۔ ہر وقت دعا' ہر گھڑی دعا۔ ہر آن دعا' اللہ آسانیاں عطا فرمائے۔''

میں سلام کر کے' مصافحہ کر کے اور گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر چلنے لگا تو سیکرٹری صاحب باباجی کی مخصوص کنگھی لے کر آ گئے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔ جب میں غسل خانے کے

آگے سے گزر کر گیٹ پر پہنچا تو باباجی نے آواز دے کر مجھے واپس بلا لیا۔ میں انہی قدموں پر پلٹ کر سیدھی راہ جانے کے بجائے چبوترہ ناپ کر فوراً ان کے سامنے پہنچ گیا۔

باباجی نے فرمایا "اشفاق صاحب! بسی کے لوگوں نے محبت کے جذبے سے مغلوب ہو کر آپ لوگوں کو اپنے پاس بلایا ہے۔ ان کی محبت کا جواب محبت سے دینا اور اُن کو علم عطا کرنے نہ بیٹھ جانا۔ پڑھے لکھے لوگ بے علم لوگوں کو اپنے علم کا بوجھ اٹھوانا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ ایسے نہ کرنا بلکہ ان کو اپنی محبت کا میوہ عطا کرنا۔ انہیں اینٹیں اٹھوانے پر مجبور نہ کر دینا۔"

میں نے کہا "جیسے آپ فرماتے ہیں ویسے ہی ہوگا اور جس طرح سے آپ نے حکم دیا ہے اسی پر عمل ہوگا" لیکن اندر ہی اندر میں سوچ رہا تھا کہ محبت تو میرے پاس ہے ہی نہیں وہ میں انہیں کدھر سے لا دوں گا۔ چند قبالے علم کے البتہ میرے پاس موجود ہیں جن میں دیسی علم بھی ہے، ولایتی بھی، قدیم بھی اور جدید بھی۔ ان کے چند نمونے میں نے اپنے بریف کیس میں پہلے ہی رکھ لیے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں۔ رہی محبت کی بات تو، محبت تو میرے پاس اپنے گھر والوں کو دینے کے لیے نہیں میں بسی کے لوگوں کو کدھر سے دے دوں گا!

ایک روز یوں ہوا کہ ساہیوال کا سردار سکندر خان اپنی پوری سج دھج کے ساتھ ڈیرے پر پہنچ گیا اور باباجی کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھ کر ملازموں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ساتھ اُس کے دو نوکر بھی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا اور دوسرے کے ہاتھ پر ایک بھاری بھرکم باز بیٹھا تھا جس کی آنکھوں پر چمڑے کی ٹوپی چڑھی تھی اور جو ہر آواز کے ساتھ گردن گھما کر ادھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ وہ کچھ بھی دیکھ نہ سکتا تھا!

میں اور بابو معراج باباجی کے پاس ململ کا ایک رومال پکڑ کر بیٹھے تھے جس کے دو کونے میرے ہاتھ میں تھے اور دو بابو معراج کے ہاتھ میں۔ باباجی اُس رومال میں کچھ کاڑھا سا ڈال کر چھان رہے تھے جس کی کثافت کی وجہ سے اُسے لکڑی کی ایک چمچی سے ہلایا جا رہا تھا۔ چولہے سے کاڑھے کی کڑچھی بھرنے والے بھی باباجی تھے اور ململ کی پونی میں لکڑی پھیرنے والے بھی آپ ہی تھے۔ میرا خیال ہے کوئی جوارش تیار ہو رہی تھی یا کوئی رُب بن رہی تھی جسے اُس مریضہ کو دینا تھا جو ساتھ والی بکریوں کی کوٹھڑی میں ٹوٹی چارپائی پر بیٹھی تھی۔

سردار سکندر خان نے اُسی طرح سینے پر ہاتھ باندھے باندھے سر جھکا کر کہا "حضور میرا دل صاف ہو گیا ہے اور سینہ کھل گیا ہے۔" پھر اس نے ذرا سا اور جھک کر کہا "میرے وجود پر رحمتوں، برکتوں کی بارش ہونے لگی ہے۔"

اس کے اٹیچی کیس والے گولے نے سر ہلا کر اس حقیقت کی تائید کی اور اٹیچی کیس زمین پر رکھ کر وہ بھی اپنے مالک کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے کے لیے ایسا کرنا مشکل تھا کیونکہ اس کے چمڑے کے دستانے پر باز بیٹھا

تھا جو کافی وزنی تھا اور جو ڈیرے کی فضا میں داخل ہونے کے بعد گھبرا سا گیا تھا۔

سردار سکندر خان نے کہا "حضور ساری بدی چھوڑ دی۔ سارے گناہوں سے منہ موڑ لیا۔" باباجی اسی طرح رومال کی جھولی میں لکڑی پھیر کر جوارش چھانتے رہے اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔

سکندر خان نے کہا "حضور سائیں صاحب بدی سے، برائی سے اور گناہ سے نفرت اسی درگاہ کا صدقہ اور اسی دربار کا عطیہ ہے۔ آپ کی ایک نگاہ نے مجھ کتے کمینے کو پاک صاف کر کے نیکی اور ثواب کے اونچے تخت پر بٹھا دیا ہے اور میری ساری دنیا بدل دی ہے۔"

میں نے دیکھا سکندر خان کے اس اعلان کا باباجی کی طبیعت پر کچھ بوجھ سا پڑ گیا تھا اور وہ ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکنا چاہ رہے تھے لیکن ان کے ہاتھ میں چمچی تھی اور چھاننے پٹنے کا بہت سا کام باقی تھا ابھی وہ اپنے ہاتھ کو فارغ نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

سردار سکندر خان نے کہا "حضور بڑے گناہ کیے۔ بڑے عیب کمائے، بڑی بربادیاں کیں لیکن اب رحمتوں کے دروازے کھل گئے۔ اب پاکی ہی پاکی ہے۔ صفائی ہی صفائی ہے۔ سارے گناہ چھوڑ دیے۔ سارے کوڑا پرادھ۔ پاپ گناہ دفع کر دیے۔ ساری بدی برائی چھوڑ دی، سارے گناہ جھاڑ دیے۔"

باباجی نے ململ کی پوٹلی میں لکڑی چلانی چھوڑ کر سر اوپر اٹھایا اور بڑی محبت کے ساتھ کہا "سکندر خان! جہاں اتنا زور لگا کر بدی برائی چھوڑ دی ہے اب یہ نیکی بھی چھوڑ دو اور آزاد ہو جاؤ۔ اس نئے گھمنڈ سے تو وہ پرانے والا تکبر ہی اچھا تھا۔"

سردار سکندر خان بات سمجھے بغیر چھوٹا چھوٹا سر ہلا کر "جو حکم حضور! جو حکم سرکار!!" کہتا گیا اور بڑی دیر تک کہتا گیا۔ بابو معراج نے شرارت سے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

ڈیروں پر بڑے بڑے احمق، غبی، بیوقوف، لکڑ سرے اور دھوتو قسم کے لوگ بھی آتے ہیں اور بڑے شاعر، چالاک، پھرتیلے، خرانٹ اور کائیاں لوگ بھی آتے ہیں۔ پاکیزگی کی ان محفلوں کے عین درمیان کمال کے خود غرض، مکار، تھرتھرے، موقع پرست اور خود خواہ بندے بھی جمع ہو جاتے ہیں اور بھونڈ، بدھو، لولے، کملے اور سیدھے لوگ بھی دیواروں اور دروازوں کے ساتھ جگھٹے لگا لیتے ہیں۔ جس طرح اس بھری پری دنیا میں ہر طرح کے لوگ ساتھ ساتھ آباد ہوتے ہیں اسی طرح ڈیروں پر بھی ہوتا ہے۔ ڈیرے اور درگاہیں اس بڑی بڑی دنیا کے چھوٹے نمونے ہوتے ہیں۔ اس وسیع و عریض خاکدان کے منی ایچر، زیر سٹیپ، نشان انگوٹھے، مائیکروفش ما مائیکروفلم!

جب چھاننے پٹنے کا کام ختم ہو گیا تو باباجی نے ہم دونوں کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا "جاؤ۔ ادھر جا کر ڈاکٹر صاحب اور سیکرٹری صاحب کے پاس بیٹھو ادھر اور بھی جانی جان جمع ہیں۔"

ہم ادھر بڑے چبوترے پر آ کر بیٹھ گئے جہاں ڈاکٹر صاحب اور سیکرٹری صاحب کے ساتھ دو اور جوان بیٹھے تھے جنہیں ہم نے اس لیے پہلے ڈیرے پر نہیں دیکھا تھا۔ اتنے میں رحیم یار خان کا میاں مثنوی بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ

میں کینوس کا ایک بڑا سا تھیلا تھا جس کے اندر کچھ ایسی اشیائے خوردنی کا پتہ چلتا تھا جو اپنی چکنائی کی وجہ سے چادر اور چار دیواری سے باہر نکل پڑتی تھیں۔ میاں مثنوی نے ہم سب سے بڑی تپاک کے ساتھ ملایا اور پھر چوکڑی مار کر صف پر بیٹھ گیا۔

میں نیا نیا اس پلٹن میں بھرتی ہوا تھا اور ابھی کچا رنگروٹ تھا۔ میرے دل میں زندہ رہنے کی آرزو اور ترقی کرنے کی ہوس تھی اور میں ایک ایسے ماحول میں آوارہ ہوا تھا جہاں ان دیکھے خدا کی اندھی پرستش ہوتی تھی اور ہر کام کو منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا لیکن میرے پاس میری عقل' میری دانش اور میرا تجربہ تھا اور میں ان کے مقابلے میں دنیا کی ہر شے ہیچ سمجھتا تھا اس لیے میں کچھ الجھ سا گیا تھا۔ میری کیفیت ''نو گرفتار بھڑکتا ہے تہہ دام ابھی'' والی نہیں تھی بلکہ ایک ایسے عقیل' فہیم اور دور اندیش رہنما کی سی تھی جو اپنی قوم کو یا کم از کم اپنے معاشرتی گروہ کو زندگی کے ہر شعبے میں ترقی یافتہ دیکھنے کا خواہشمند تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ان لوگوں کے بارے میں جاننے کا آرزومند بھی تھا جو باطن کے مسافر تھے اور جنہوں نے اندر کی منزلیں طے کرنے میں کمال حاصل کیا تھا۔ نرالی وضع کے نرالے رہنے والے پتہ نہیں کونسی بستی کے باشندے تھے کہ ان کی تاریخ ان کے جغرافیے اور ان کے اذکار میں بلا کی کشش تھی۔ میں نے بڑی دور اپنے وطن کی سرحدوں سے بہت پرے سات سمندر پار ولایت کے علاقوں میں بھی ان کی کہانیاں سنی تھیں اور لق و دق سمندروں میں جدید ترین جہازوں پر سفر کرتے ہوئے تربیت یافتہ باوردی ملاحوں سے بھی ان کے قصے سنے تھے۔ میں اپنے وطن کے سنجیدہ اور ثقہ ادیبوں کے درمیان ایک ایسے چنچل لے پالک بچے کی طرح پرورش پا رہا تھا جس کی نگہداشت کا ذمہ معاشرے نے ان کے سر ڈال دیا ہو اور وہ ایک نمک حرام اور ناخلف بچے کو اپنی محبت بھری آغوش میں پال رہے ہوں۔ میرے بزرگ رہنماؤں میں سے میرے استاد صوفی تبسم' میرے محسن محمد نظامی' عابد علی عابد' امتیاز علی تاج' ذوالفقار بخاری بطور خاص مجھ سے نالاں تھے کہ اس نے ولایت میں ایسی کامیاب زندگی بسر کرنے کے بعد واپس آ کر ایسی فرسودہ دقیانوس اور پشت الحال روشنی اختیار کر لی کہ پیروں' فقیروں اور بابوں کے ڈیروں کے چکر لگانے شروع کر دیے اور ان کو بھی اتنا ہی مان دینا شروع کر دیا جتنا صاحبان عقل و دانش اور گیان و دانوں کو دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بالکل ناآشنا تھے کہ میری کیفیت دھوبی کے کتے کی سی تھی اور میں اپنی تھوتھنی اگلے پنجوں پر رکھ کر ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہا تھا۔ نہ بھونکتا تھا نہ دم ہلاتا تھا۔

حضرت سائیں صاحب باباجی نور والے نے مجھے پڑھنے کے لیے ایک ذکر دیا تھا۔ اسے اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' وضو بے وضو' گندے مندے' پاک ناپاک ہر حالت میں اندر ہی اندر پڑھنا تھا اور مست رہنا تھا۔ یہ ورد ''یاددددد'' کا ورد تھا اور اس کے ساتھ اعداد و شمار کی کوئی پابندی نہیں تھی بس اندر ہی اندر اس ذکر کی لہروں میں پھیلتے جانا تھا اور اس کی خوشبو میں اس طرح سے سمٹتے جانا تھا جو پھول کی جان اور نسیم سحری کے اعلان میں ہوتی ہے۔ نظر تو نہیں آتی البتہ اس کی موجودگی کا جادو ہر زندہ وجود کو کیلتا رہتا ہے۔

آج میں باباجی سے اس ذکر کی بات کرنے ہی آیا تھا کہ ایک مہینے کی وظیفہ گزاری کے بعد مجھے اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا اور میں وہیں کا وہیں تھا۔ نہ تو مجھے فضا میں سے پھول اترتے نظر آئے تھے۔ نہ میں آنے والے

واقعات کے آثار سے واقفیت حاصل کر سکا تھا۔ نہ میرے اندر کشف کی کوئی کیفیت پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی مرے مالی حالات پہلے کے مقابلے میں بہتر ہوئے تھے۔ البتہ ایک بات ضرور ہوئی تھی کہ مجھے کسی کے بتانے پر اللہ کا یہ پیغام ضرور مل گیا تھا کہ خدا کہتا ہے ''تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔'' چنانچہ میں جب تخلیئے کے عالم میں ذکر میں مشغول ہوتا تو مجھے صاف پتہ چل جاتا کہ اس وقت اللہ میاں فرشتوں کے ساتھ میرا ذکر کر رہا ہے اور میری بابت کچھ ضروری باتیں طے کر رہا ہے اور میرے ذکر کی وجہ سے عرش معلی پر اس وقت میرا چرچا ہے۔ میں نیچے بیٹھا ''یاددددو''، ''یاددددو''، ''یاددددو''..... ''یاددددو!'' پڑھ رہا ہوں اور اوپر اللہ میاں فرما رہا ہے کہ ''یہ جو اشفاق ہے اس کی صحت کچھ ٹھیک نہیں۔ پہلے کے مقابلے میں اور بھی موٹا ہو گیا ہے۔ پہلے جھوٹ کم بولتا تھا اب تحریر میں اور تقریر میں دونوں میں اضافہ کر لیا ہے۔ اب بانو کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسے ہی الجھ جاتا ہے حالانکہ وہ بڑی شریف اور کہنے کار بی بی ہے۔'' فرشتے سر جھکائے' پر بستہ عجز و ادب کی رنگین مورتیوں کی طرح اس گفتگو میں شامل ہیں اور میری وجہ سے خوش ہیں کہ حضوری کا لمبا وقفہ عطا ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر میں اپنے ذکر کو اور بھی طویل کر دیتا تا کہ اللہ بھی میرا ذکر لمبا کرتا جائے جس طرح حضرت موسیٰ نے اللہ سے کلام کرتے ہوئے اپنے مکالمے کو بے ضرورت لمبا کھینچ دیا تھا اور اپنے عصا کی صفات بیان کرنا شروع کر دی تھیں' ایسے ہی میں لمبے لمبے ورد کرتا!

میرے لیے یہ کس قدر حیرانی' فخر' گھمنڈ اور فرحت کی بات تھی کہ میرا ذکر اوپر ہو رہا تھا اور اسے لمبے سے لمبا کرتے جانا میرے اختیار میں تھا۔ بس ایک ڈھنیے کی تانت تھی جو میرے اندر بج رہی تھی اور جس کا دوسرا سرا مافوق السماکسی اور ہی طرب کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ میں آج باباجی سے اس ذکر کی بات کرنے ہی آیا تھا لیکن پہلے ان کے پاس بابو معراج دین بیٹھا تھا پھر اب سردار سکندر خان آ گیا تھا۔ کچھ عورتیں ان سے تعویذ لینے کے انتظار میں بیٹھی تھیں اور ابھی وہ اپنی جوارش بھی پورے طور پر تیار نہیں کر پائے تھے۔

میاں مثنوی حسب سابق ڈاکٹر صاحب کے ساتھ الجھا ہوا تھا اور مولانا روم کے درجات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ سیکرٹری صاحب بڑی دلچسپی سے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے اور لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ دونوں غلطی پر ہیں اور حقیقت کا اصل راز صرف اُن کے پاس ہے۔

میاں مثنوی کہہ رہا تھا ''ڈاکٹر صاحب مجاہدات کے بغیر حجاب کو دور کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے بڑھ کر اوپر چڑھ کر' پورا زور لگا کر رسہ کھینچنا پڑے گا پھر ہی پردہ اٹھے گا اور پھر ہی سٹیج نمودار ہوگی اور پھر ہی کھیل دکھائی دے گا اور ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے مجاہدے کرنا' رومین اسٹ لوگوں کا کام ہے۔ کرتی پٹھوں کا فلسفہ ہے۔ اہل دل مشقت کے حوالے نہیں ہوتے۔''

میاں مثنوی بولا ''اور سب سے بڑا مجاہدہ ان لوگوں میں گھل مل جاتا ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اس سے بڑا مجاہدہ اور کیا ہوگا کہ انسان صرف صالح دوستوں میں بیٹھے اور ڈاکٹر صاحب! صالح دوستوں کا دیکھنا اس نفس کا گداز ہونا اور اس نفس کا گداز کرنا ہے۔

میں نے کہا "میاں! میرا صالح دوستوں کے ساتھ دل نہیں لگتا۔ ان کی دوستی میں کوئی رس نہیں ہوتا۔ کوئی بارک اور بدمعاشی نہیں ہوتی۔ دلچسپی کی واردات نہیں ہوتی۔ میں ان کے ساتھ کیسے دل لگاؤں..... میرا ذکر تو آج کل اوپر ہوتا ہے لیکن میری اس سے دلبستگی نہیں رہی۔ نہیں رہی کیا۔ میری دلبستگی اُس سے ہو ہی نہیں سکی۔ میں اپنا ذکر یہاں سننا چاہتا ہوں۔ یہاں کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے حلقے کے لوگوں میں اپنے حلقے سے ملحق حلقوں میں۔ اپنے دشمنوں میں۔ اپنے عزیز رشتہ داروں اور اپنے شریکے کے لوگوں میں۔ میں حلقہ اربابِ ذوق میں اپنا ذکر سننا چاہتا ہوں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین میں اپنا ذکر چاہتا ہوں۔ کتابوں، رسالوں، تنقیدی مضمونوں میں اپنا نام دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ کالموں میں اپنی مورت کی چھاپ کا خواہشمند ہوں..... میں نے اوپر ذکر کروا کے کیا لینا ہے!"

"اور اگر اللہ کے یہاں بھی تمہارا ذکر ہوتا رہے تو کوئی بری بات ہے؟" میاں نے پوچھا۔

میں نے کہا "دیکھ میاں مجھے اس پر اعتراض تو کوئی نہیں۔ بلکہ میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے لیکن درحقیقت میں اپنا زیادہ ذکر یہاں چاہتا ہوں۔ میں اپنا محلہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں اسی بدرو کے کنارے رہنا چاہتا ہوں جس میں سے ہر وقت بال صفا پوڈر کی بو آتی رہتی ہے۔ اسی گھر کے اندر جس کی ٹونٹی رواں ہے اور اس کے منہ پر پرانے دستر خوان کی لیر بندھی ہے۔ انہی لوگوں کے درمیان جو اچھا کھاتے اور مندا بولتے ہیں۔ جو غیبت کے ڈکار مارتے ہیں اور تکبر کی ریاح میں لوٹتے پوٹتے رہتے ہیں۔ میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں محلہ 'گنگا مندر' کوچہ ماشکیاں کی رہائش ترک کر کے کسی پر بہار کالونی میں جا کر آباد نہیں ہو سکتا۔ میں ایک رائٹر ہوں۔ میرا رول معاشرے کی غلاظتوں کی نشاندہی کرنا اور معاشرے کی گندگیوں کا تجزیہ کرنا ہے۔ میری نظر دور تک پہنچتی ہے اور ہر کونے کھدرے کا جائزہ لیتی ہے۔ باغ میں کوئی ہوا خوری کے لیے جاتا ہے۔ کوئی پھول سونگھنے اور پھل کھانے کی غرض سے جاتا ہے۔ کسی کو حسنِ گلستاں کھینچ کر اپنے اندر بلا لیتا ہے لیکن سور جب بھی باغ میں داخل ہوتا ہے سیدھا گندگی کے ڈھیر پر پہنچ کر غلاظت سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیتا ہے۔ میں لطف اندوزی کا مارا ہوا ہوں اور لطف میں رہنا چاہتا ہوں۔"

رسوئی ڈھارے سے باباجی کی آواز آئی اور سیکرٹری صاحب، جوتی پہنے بغیر، ننگے پاؤں ان کی طرف بھاگے۔

میاں مثنوی نے کہا "اشفاق صاحب اس طرح سے بھاگنے والے لوگ انعام یافتہ ہوتے ہیں۔ صاحب اثمار۔ پھلوں سے لدے ہوئے اور یہ سب معیت کا اثر ہوتا ہے۔ گھلے ملے ہونے کا۔ ایک ساتھ ہونے کا۔"

میں نے کہا "میاں مجھے تیری بات سمجھ میں نہیں آئی تو جب بھی بات کرتا ہے پہیلیوں میں کرتا ہے اور تیری پہیلیاں اصل کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔"

میاں ہنس پڑا اور تالی بجا کر بولا "رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع میں داخل ہونا، عاجزوں، مسکینوں اور لرزنے والوں کے ساتھ ہو کر رہنا ہے۔ کیا تو نے دیکھا؟" میاں تن کر بیٹھ گیا "کہ پھل نہ درخت کے ڈالے کو لگتا ہے نہ اس کے مضبوط تنے کو۔ پھل جب بھی لگتا ہے لرزنے والی شاخ کو لگتا ہے اور جہاں بھی لگتا ہے کانپتی ہوئی ڈالی کو لگتا ہے۔ جس قدر شاخ رکوع میں جانے والی ہو گی اسی قدر زیادہ پھل کی حامل ہو گی اور فائدہ درخت کو اس کا یہ کہ پھل کی وجہ

سے کلہاڑے سے محفوظ رہتا ہے اور تنا بھی۔ درخت کی بھی عزت ہوتی ہے اور درخت کی وجہ سے سارا باغ بھی عزت دار بن جاتا ہے۔" پھر اُس نے ہنس کر کہا "کہو کیا ارادہ ہے؟" میں نے کہا "میں اپنی ہی گلی میں رہوں گا۔ محلہ تبدیل نہیں کروں گا۔"

میری نظروں کے سامنے میرا ایک دوست تھا۔ میرا بہت ہی پیارا اور دلی دوست قدرت اللہ شہاب جو میری نظروں کے سامنے محلہ بدل کر چکا تھا اور پورے کا پورا اپنے پرانے محلے کا محلہ گنگا مندر، کوچہ ماشکیاں سے نکل کر ایک خوبصورت، خوشگوار اور خوش نگاہ علاقے میں منتقل ہو چکا تھا۔ ہمیشہ اعلیٰ سے اعلیٰ آکسفورڈ سٹریٹ کا سوٹ زیب تن کیے، بڑے پھن والی سرخ ٹائی سونے کی پن سے لگائے۔ جیب سے نکونا رومال کنگرو کے بچے کی طرح باہر نکالے اور کنڈ لیدر کے شوز کا پو راز ور تھروٹل پر ڈالے وہ اپنی مرسیڈیز اتنی تیز چلاتا تھا کہ کئی کئی فٹ وہ ہوا میں تیر جاتی تھی۔ لیکن اُس کے اندر، اندر بھی اگلے اندر، دل کی آخری کوٹھڑی میں مسلسل ایک ٹنگنی چلتی رہتی تھی جس کی آواز سوائے اُس کے یا اُن ہستیوں کے اور کسی کو نہیں آتی تھی جو اس کا ذکر بڑی بارگاہ میں آرام سے سنا کرتی تھیں۔ وہ بڑا چالاک اور بہت ہی خود غرض انسان تھا۔ ہر وقت ایک چھری اور رسی لے کر اپنے نفس کے پچھورے کو ساتھ ساتھ لیے پھرتا کہ جونہی کوئی مناسب اوٹ نظر آئے اس کے پچھورے کو ذبح کر کے امر کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ لیکن! میں اس کی بجائے اُس کے پچھورے کی داد دیتا ہوں جو ہر وقت اس کے ہر حکم پر سر جھکائے "میری ہیڈا اے لٹل لیمب" کی طرح بڑی خوشدلی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چلا کرتا تھا۔

جب کبھی میں شہاب سے پوچھتا کہ اس دنیا اور اس کی آلائشوں میں پھنسے ہوئے انسان کو خدا کب یاد رہ سکتا ہے تو ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کرتا کہ میاں جس طرح ایک سشن سپرد قیدی کو جیل کے اندر رہتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، روتے بسورتے، پانی پیتے، گلاس انڈیلتے، کان میں انگلی چلا کر "خا" کرتے۔ نظریں اوپر اٹھا کر ہوائی جہاز دیکھتے ہر وقت ایک ہی دغدغہ لگا رہتا ہے: پھانسی پھٹے اور سولی کے رسے کا! اسی طرح واصل حق کو بھی ایک ہی دغدغہ لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے سشن سپرد ہو جاتا ہے۔

ہم دونوں اپنی اپنی بیویوں کو بڑی گرمجوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کرتے چھوڑ کر کافی پینے نکلے تھے اور شہاب نے اپنی کار کا رخ مری کی طرف موڑ دیا تھا۔ چھرہ پانی کے قریب اس نے مجھے پریشان سا دیکھ کر اتنا کہا کہ "ایک ایک کپ کافی پینے کے بعد ابھی آ جاتے ہیں اور پھر کہیں ان دونوں کو ساتھ لے کر باہر کھانے کو چلتے ہیں۔ خوب مزا رہے گا۔"

وہ مری کی ایک چھوٹی سی کوٹھی کے بے حد خوبصورت ڈرائنگ روم میں بڑے ہی قیمتی قالین پر مراقبے کے انداز میں بیٹھی تھی اور ستمبر کے آخری ہفتے کی سردی ایک پلی ہوئی بھوری لومڑی کی طرح اس کی دہلیز سے لگی کھڑی تھی۔ ہماری آمد پر اس نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر ہمیں غور سے دیکھا اور پھر "کافی شہاب؟" پوچھ کر اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ شہاب نے کہا "یہ میرا بہت ہی پیارا دوست ہے اشفاق! اس کے ساتھ میں نے پورے چار دن اور چار راتیں روم کے کوچہ و بازار میں

گھوم کر گزاریں اور پھر میں اپنے گناہ بخشوانے مکہ چلا گیا۔ اس نے اپنی آنکھوں کی مسکراہٹ اور چہرے کی جھلکار سے ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا" بس اب رہنے دو۔" اور اندر کافی بنانے چلی گئی۔

وہ کوئی اڑتیس چالیس برس کی ایک خوبرو اور خوش قامت خاتون تھی جو کسی دردناک رومانوی ناول کے برآمدے سے نکل کر ساتھ والے دروازے سے اگلے چیپٹر میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر پروقار پراسرار اور پرکشش خاتون تھی کہ میں اس کے بارے میں شہاب سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ کافی کے دو کپ بنا کر لائی اور طشت قالین پر رکھتے ہوئے بولی" میں نے ابھی آپ کے آنے سے کوئی پانچ منٹ پہلے اپنے حصے کی کافی پی لی ہے کیونکہ میرا خیال تھا کہ آپ وقت پر پہنچ جائیں گے لیکن آپ پہنچ نہیں سکے۔"

شہاب نے کہا" آج کچھ میرا ارادہ نہیں تھا۔ پھر میری گاڑی کی بریکیں بھی کچھ لوز تھیں اور موسم بھی کوئی ایسا فرینڈلی نہیں تھا۔ لیکن گھر سے باہر نکلے تو ارادہ بن گیا۔"

وہ پھر اسی طرح مراقبے کے انداز میں بیٹھ گئی اور شہاب حرم کعبہ کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔ بالکل اسی سیدھے اور غیر موثر انداز میں جس طرح پہلی مرتبہ حج یا عمرہ پر جانے والے لوگ بیان کرتے ہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے شہاب کی باتیں سنتی رہی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ان باتوں سے مرعوب نہیں ہوئی اور اس بات کا انتظار کرتی رہی کہ وہ کوئی اور بات کرے اور وہ اپنی آنکھیں کھول کر توجہ سے اس کی بات سنے! لیکن شہاب کو اس بات کے علاوہ اور کوئی بات آتی ہی نہیں تھی یا اس کے علاوہ کوئی اور بات کرنے کا حکم ہی نہیں تھا۔ یا اس موضوع کے علاوہ اور سارے موضوعات اس سے سلب کر لیے گئے تھے۔ ایسے ہی اناڑی آدمیوں کی طرح بول رہا تھا اور الو سا لگ رہا تھا۔

شہاب میں اور تو سب خوبیاں تھیں لیکن ایک بات بڑی گندی تھی کہ وہ موٹر بہت تیز چلاتا تھا اور اس بات کا دھیان نہیں رکھتا تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اترائی میں دھند کاٹ کر جب ہم لارنس کالج سے ذرا آگے نکلے تو پھر دھند نے ہمیں گھیر لیا۔ آگے سڑک نظر آنی بند ہو گئی تھی۔ سامنے کا پونے آٹھ کا سڑک کا چکر کوئی سوا کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ وہاں سے چکر کاٹ کر سڑک کافی نیچے پہنچ جاتی ہے اور پھر آگے کا سفر آسان اور سیدھا ہو جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری گاڑی ہوا میں اڑی اور کوئی تین چار سو فٹ تک اسی طرح سے ہوا میں پیرتی ہوئی" دھم" کر کے سڑک پر گری اور آگے کا سیدھا اور آسان سفر شروع ہو گیا۔ شہاب نے مسکرا کر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا" گھبرا گئے؟"

میں نے کہا" ہاں!"

ہنس کر بولا" تم سمجھے ہو گے گاڑی ہوا میں اڑ رہی ہے؟"

میں نے کہا" ہاں۔"

کہنے لگا" میاں گھامڑ۔ گاڑیاں سڑکوں پر چلانے کے لیے بنائی جاتی ہیں ہوا میں اڑنے کے لیے نہیں۔ اڑنے

کے لیے ہیلی کاپٹر ہوتے ہیں یا ہوائی جہاز۔"

میں نے کہا" پہلے تو اسی طرح سے ہوتا تھا لیکن آج ایک انوکھا مشاہدہ کیا۔ تم کوئی جن وغیرہ تو نہیں ہو۔"

کہنے لگا" پینڈو آدمیوں کے دماغ بھی کس قدر سادہ ہوتے ہیں جو انہونی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ میاں! یہ گاڑی ہے اور اپنے پہیوں پر چل رہی ہے۔ پوری سڑک چاروں پہیوں کی گرفت میں ہے اور چاروں ٹائر نئے ہیں۔"

جلد ہی ہم واپس گھر پہنچ گئے۔ ہماری بیویاں ابھی تک اُسی کمرے میں بیٹھی اُسی گرمجوشی سے باتیں کر رہی تھیں۔

جب میاں مثنوی نے کہا" میں اب حضور سے اجازت لے کر واپس جاتا ہوں۔" تو میں نے جلدی سے کہا" پہلے مجھے اجازت لے کر رخصت ہو لینے دو تم بعد میں چلے جانا۔"

میں باباجی کے پاس رسوئی ڈھارے میں پہنچا تو آپ اکیلے ہی تھے۔ میں نے کہا" باباجی مجھے اجازت ہے؟" فرمایا" اس قدر جلدی؟"

میں نے عرض کیا" حضور ایک ضروری کام ہے اور ہمیں حلقہ ارباب ذوق کی میٹنگ میں جانا ہے۔ میری بیوی اس کی صدارت کر رہی ہے اور وہاں ادب پر ایک اہم مباحثہ ہو رہا ہے۔"

آپ نے غور سے میری طرف دیکھا اور انگلی اٹھا کر کہا" نوٹ! مباحثہ ہمیشہ کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور ذکر نفس کے لیے کیا جاتا ہے۔" پھر فرمایا" جاؤ! اجازت ہے لیکن جلدی جلدی آتے رہا کرو یہاں سب کو انتظار ہوتا ہے۔"

میرے ساتھ ایک اور بھی عجیب حادثہ متصادم ہے کہ میں علمی طور پر انسانیت کی محبت میں شدت سے مبتلا ہوں اور انسانیت کے شرف کے لیے بہت کچھ لکھتا ہوں۔ اس کے دکھ درد کا برملا اظہار کرتا ہوں اور اس پر ہونے والے ظلم اور زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہوں لیکن آدمی مجھے اچھے نہیں لگتے۔ میرے اردگرد بسنے والے لوگ' میرے دوست' میرے ہمسائے' میرے عزیز' میرے ہمعصر' میں ان کو پسند نہیں کرتا اور ان پر کڑی نکتہ چینی کرتا رہتا ہوں۔ جو انسان میرا ہم خیال نہیں وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ جو میرا ہم حال نہیں اس سے میں گفتگو کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ میں کیا کروں اور کس سے کہوں اور کون میری دستگیری کرے کہ مجھے" انسانیت" سے' یعنی اس لفظ سے' میرا مطلب ہے انسانیت کی ایبسٹریکشن (Abstraction) سے تو والہانہ عشق ہے لیکن اس کی زندہ اکائیوں کے آڑے وقت میں میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ان پڑھ' جاہل اور ناخواندہ انسان تو مجھے انسان ہی نہیں لگتے اور میں میر تقی کی طرح ان سے بات کرنے کی بعض اوقات خیال کرتا ہوں۔ اس پر بھی میں انسانیت سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں اور انسانیت کا جھنڈا لے کر چل رہا ہوں۔

اب میں اس تضاد سے نکل جانا چاہتا ہوں لیکن کوئی میری مدد نہیں کرتا۔ ادھر باہر نکلنے کے سارے راستے بند

پڑے ہیں ادھر میں انسانیت کی تجرید سے پیار کر کر کے لاغر ہو رہا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھے سمجھائیں کہ اسلام جو اخوت' مساوات اور بھائی چارے کا دین ہے اور علم نافع پر اس قدر زور دیتا ہے وہ علم مجھے کیسے حاصل ہو اور میں انسانیت سے کیونکر محبت کر سکوں اور اپنے علم کو کیونکر عمل میں ڈھالوں کہ خود بھی اسلام کے قریب ہو جاؤں اور دوسروں کے لیے بھی موم بتی روشن کر جاؤں؟ لہٰذا سب سے پہلے میں نے صوفی ازم کی طرف توجہ دی کہ ڈیروں پر دستگیری' معافی' بردباری کا علم بڑے آسان طریقے سے سکھایا جاتا ہے لیکن عجیب سی بات ہے میں جس کو کھیل بچوں کا سمجھا تھا کچھ اس کا بھی نہ نکلا۔

صوفی لوگ کہتے ہیں کہ اگر صوفی ازم کا علم حاصل کرنا ہو تو صوفیوں سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ کتابوں سے اور بات چیت سے اور لیکچروں سے یہ علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ محبت کرنے کے لیے ایک محبوب ہونا چاہیے۔ ایک محبت کرنے والا درکار ہے۔ کتاب کے ذریعہ آپ محبت کا سبق نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اس کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی' حساب اور اکنامکس گرامر اور زباندانی دماغ سے تعلق رکھنے والے علم ہیں۔ یہ کتاب کے ذریعہ یا سمعی اور بصری (Audio Visual) آلات کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں لیکن دل کی باتیں دل کے Apparatus پر ہی موصول کی جا سکتی ہیں۔ اگر ان کو جاننے کے لیے دماغ کا آلہ استعمال کیا جائے تو Short Circuit ہو جاتا ہے۔ پھر انسان کے اندر ایسا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی روشنی بھی وہاں اجالا نہیں کر سکتی۔

میں صوفی ازم کا ایک چھوٹا سا اور معمولی سا طالب علم ہوں۔ آپ کی طرح میں نے بھی اس مضمون پر کچھ کتابیں پڑھی ہیں اور اس کو دماغ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیشہ ناکام رہا ہوں۔ لیکن آپ کے مقابلے میں میں ذرا سا زیادہ خوش قسمت ہوں کہ مجھے چند صوفیوں کی محبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے اور ان کی توجہ سے اور ان کی محبت کی وجہ سے اس Frequency کو کس حد تک محسوس کرنے لگا ہوں۔ گویا محسوس کرنا اور یہ جاننا علم کی حد سے آگے نہیں جا سکا۔ کیا میں اس تجربے اور مشاہدے کو کبھی دل سے محسوس کر سکوں گا؟ کیا میں ان کیفیات کو سچ مچ پا سکوں گا؟ کیا یہ محسوسات کبھی میری قسمت کا ایک حصہ بن سکیں گے؟ یہ ایسے سوال ہیں جو پہلے مجھے پریشان کرتے تھے۔ اب نہیں کرتے۔ میں وہ خوش قسمت کلر بلائنڈ ہوں جو کوئی رنگ نہ دیکھ سکے لیکن اس کا پورا ایمان ہو اور پختہ یقین ہو کہ واقعی اس دنیا میں رنگ بھی ہوتے ہیں۔ میں نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا اور لوگ تو دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ کلر بلائنڈنیس دور ہو جائے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگر نہ ہو سکے تو کوئی گلہ نہیں' کوئی شکوہ نہیں۔ کسی پر کوئی زور نہیں۔

آپ کہیں گے یہ عجیب بات ہے۔ ہم کسی ایسے علم کو ماننے کے لیے تیار نہیں جو ہماری عقل میں نہ آ سکے۔ جس کو ہم نہ سمجھ سکیں۔ جس کو ہم محسوس نہ کر سکیں۔ میں کہوں گا آپ بچے ہیں۔ ایسے بچے جس کی عمر چھ سال سے زیادہ نہیں اور جو اس بات پر ضد کر رہا ہو کہ میں نہیں مانتا کہ Sexual Pleasure (شہوت) بھی کوئی چیز ہے۔ اگر ہے تو مجھے کتاب میں سے پڑھ کر سمجھائیے۔ ڈایا گرام بنا کر اس کی تفصیل بتائیے۔ سلائیڈ دکھا کر اس کی لذت بتائیے۔ میں کہوں گا پیارے بچے جب تم چودہ سال کے ہو جاؤ گے تو میرے بتائے بغیر' میرے سمجھائے بغیر' کوئی کتاب پڑھے بغیر یہ بات تمہاری سمجھ میں

خود بخود آ جائے گی لیکن اس دور کا ہر پڑھا لکھا اور اس نا تعلیم یافتہ انسان خاص طور پر مغرب کا آدمی اس بچے کی طرح ضد کر رہا ہے اور اپنے میں وہ Frequency پیدا کیے بغیر اس سگنل کو Receive کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کے لیے اس کے پاس کوئی Antenna موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا کے لوگ خاص طور پر امریکہ کے لوگ ان یوگیوں' جادوگروں' مداریوں اور بازی گروں کا شکار ہو رہے ہیں جو روحانی کرتب دکھا کر سادہ لوگوں کو لوٹ رہے ہیں اور صاف دل لوگوں کو ٹھگ رہے ہیں لیکن صاف دل لوگوں کا درجہ ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ وہ وقت قریب ہے جب سادہ لوگ اور صاف دل لوگ جیت جائیں گے اور یوگی اور جادوگران سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

ایک بات یاد رکھنے کی ہے اور وہ بہت ہی اہم ہے کہ تصوف یا صوفی ازم اور روحانی طاقت یا Spiritulism دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ایک کا دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً جو آدمی کراماتیں دکھائے' عقل کے خلاف Uncanny واقعات عمل میں لائے ضروری نہیں کہ وہ صوفی بھی ہو لیکن اس کے الٹ ہر پورے صوفی میں کراماتیں دکھانے کی طاقت موجود ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کراماتیں دکھائے یا نہ دکھائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تصوف یا صوفی ازم ہے کیا چیز اور اس کا انسان سے یا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے۔ مختصر طور پر یہ جان لیجیے کہ تصوف ایک علم ہے جس کا موضوع ہے کہ ان طاقتوں اور ہستیوں کی حقیقت معلوم کی جائے جن پر ہمارے مذہب کی بنیاد قائم ہے اور جن کو دیکھے بغیر اور جن کا ثبوت دیئے بغیر ہم پر فرض ہے کہ ہم ان کو مانیں۔ وہ طاقتیں اور ہستیاں ہیں اللہ' فرشتے' الہامی کتابیں' رسول' قیامت کا دن اور حیات بعد الموت لیکن اگر اصل طریقے پر دیکھا جائے تو صوفی ازم کی بنیاد ایک ہی بات پر ہے کہ اللہ کیا ہے۔ کیسا ہے۔ کس طرح کا ہے اور مخلوق سے اس کا کیا تعلق ہے۔ قرآن میں وہ اپنے ہاتھ' آنکھ' کان' روح اور نفس کا ذکر کرتا ہے تو یہ سب کیا ہے۔ اس سے اللہ کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس کے ہاتھ' کان' آنکھ اور روح و نفس ہماری طرح کے ہیں یا کسی اور طرح کے۔ اگر ہماری طرح کے ہیں تو پھر وہ ایک جسم رکھتے ہوئے ہر جگہ حاضر و ناظر کس طرح سے ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

صوفی کے علم کی بات مجھے دیر سے سمجھ آئی جس طرح آپ کو دنیا کا علم سیکھنے کے لیے سب سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھنا پڑتا ہے اور ایک پہلوان یا Atheletee بننے کے لیے ورزش کرنی پڑتی ہے اسی طرح صوفی ازم کا علم حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے آپ کو اپنی زندگی ظاہری اور باطنی دونوں طرح پاکیزہ بنانی پڑتی ہے۔ ہر طرح کی گندگی سے خواہ وہ اندرونی ہو یا بیرونی دور ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اپنے اخلاق اور اپنے کردار سے ہر طرح کا ٹیڑھا پن دور کرنا پڑتا ہے۔ یعنی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جتنی اخلاقی برائیاں ہیں وہ سب دور ہوں اور جتنی خوبیاں ہیں وہ سب پیدا ہو جائیں۔ اس کام کے لیے کچھ ریاضت اور کچھ مجاہدہ (Exercise, Drill, Struggle) کرنا پڑتا ہے۔ جب ان چیزوں میں پختگی اور پکا پن پیدا ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں انہی کی جھلکیاں ملنے لگتی ہیں یا گیان حاصل ہونے لگتا ہے۔

تصوف یا صوفی ازم اور دوسرے علموں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اور علم تو پہلے حاصل کیے جاتے ہیں اور پھر ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن تصوف میں اس کے الٹ ہے۔ اس میں پہلے عمل کیا جاتا ہے اور پھر علم حاصل ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ صوفی ازم میں پہلا حکم سننا ہے۔ پھر اس پر ایمان لانا ہے۔ اس کے بعد عمل کرنا ہے اور اس عمل کے دوران جا نا خود بخود وارد ہونے لگتا ہے۔ علم خود بخود حاصل ہونے لگتا ہے۔

لیکن یہ باتیں بہت لمبی ہیں۔ یہ تو ایک سمندر ہے۔ ایک عمر میں سمندر کے اوپر اوپر کی سیر نہیں ہو سکتی اس کے اندر کا کیا پتہ چل سکتا ہے بھلا۔

مشرق کے لوگ اور مشرق کے ملک بڑے خوش قسمت ہیں کہ رات کی تاریکی اور رات کے اندھیرے کے بعد سب سے پہلے ان کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے مشرق میں اجالا ہوتا ہے۔ جب بھی روشنی ہو جانے کا عمل ہے تو سب سے پہلے مشرق روشن ہوتا ہے۔ مشرق اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہے کہ اس کے دامن میں سارے پیغمبر پیدا ہوئے ہیں۔ انہی پیغمبروں نے ساری دنیا کو دین دھرم' خدا اور اس کی کائنات کا تصور دیا ہے۔ پنجاب بھی مشرق کا ایک حصہ ہے اور چونکہ یہ علاقہ سپاٹ ہے' میدان ہے' چٹیل ہے اس لیے اس پر روشنی آسانی سے اور خوبی سے پھیلتی ہے۔ اس روشنی نے پنجاب کو بڑے صوفی' بڑے سنت سادھ' بڑے بزرگ اور بڑے مرشد دیے ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیم سے نہ صرف یہاں کے لوگوں کی روحانی اور ایمانی زندگی تر و تازہ رہی ہے بلکہ ان کو دنیا اور دنیا کے کاروبار میں بھی بڑی بلندیاں ملی ہیں۔

صوفی عالم فاضل' فلسفی' منطقی نہیں۔ وہ مذہب اور دین کی باریکیوں اور خدا کے وجود اور اس کے ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں تعلیم نہیں دیتے۔ وہ اس کے ساتھ عشق کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں اور ساتھ ساتھ ترکیب بھی بتاتے ہیں۔ سب سے آسان ترکیب سادہ اور موٹی موٹی زبان میں انہوں نے اپنے علاقے کے لوگوں کو یہ بتائی ہے کہ تم جیسے کیسے بھی ہو' جس حالت میں بھی ہو' جتنے گندے بھی ہو اس کی پروانہ کرو بس خدا کے ساتھ لگ جاؤ۔ اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے پہلو کے بل لیٹے ہوئے اس کے نام کا ذکر کرو اور اس کو اپنے ساتھ سمجھو۔ وہ تمہاری خرابیاں اور تمہارے گندو برائیاں خود دور کرے گا اور تمہارے لیے خود ہی کوئی راہ متقرر کر دے گا۔ مولوی' پنڈت' پادری' پریچر Pastor صوفی کے الٹ تعلیم دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے پاک صاف بنو' نیک بنو' با اخلاق بنو' Be a Good Boby بنو۔ شریف بنو اس کے بعد تم اس قابل ہو گے کہ تم خدا کے حضور میں جا سکو اور اس کے ساتھ ملاپ کر سکو۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ نیک اور شریف بننے کی کوشش میں انسان ساری زندگی گزار دیتا ہے لیکن اپنی مرضی اور پریچر کی کسوٹی Touch Stone کے مطابق کبھی بھی نیک نہیں بن سکتا۔ اس کے اپنے خالق سے دوری ہی رہتی ہے اور وہ اس راز کو پانے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتا جس کے لیے اس کی روح بے قرار ہے۔ وہ اس کے درشنوں سے دور رہتا ہے' جس کے لیے اس کا دل ہر وقت دھڑ کا رہتا ہے۔

سیدھے سادے لوگوں نے اپنے صوفیوں سے پوچھا کہ ہم خدا کے پاس جا کر کہاں بیٹھیں۔ ہمیں تو اس کا ایڈریس بھی معلوم ہی نہیں۔ نہ ہی ہم اس کا ٹیلیفون نمبر جانتے ہیں کہ اس سے رابطہ حاصل کر سکیں تو صوفیوں نے بتایا کہ اس تک پہنچنے کے لیے تمہیں ایک گائیڈ کی ضرورت ہے اور رہنما کی حاجت ہے اور اس رہنما کو مرشد کہتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا کیا آپ بھی اتنے بڑے درجے پر اور اتنے بلند مرتبے پر مرشد ہی کے ذریعے پہنچے ہیں تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا ''ضرور' بے شک' یقیناً' بے شبہ'' اور سلطان باہو نے کہا

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہو
اندر بوٹی مشک مچایا جاں پھلن پر آئی ہو
جیوے مرشد کامل باہو جیں ایہہ بوٹی لائی ہو

(اللہ کا نام' اللہ کا اسم' پہلی مرتبہ میرے دل میں میرے مرشد نے بویا۔ جس طرح باغبان چنبے کی بوٹی زمین میں بوتا ہے پھر اس بوٹی کو نفی اثبات کا پانی ملا کر اس کی ہر ہر رگ میں اور ہر ہر پتے میں پہنچاتا ہے اور جب وہ بوٹی اس پانی سے پھلنے پھولنے پر آئی اور اس کے اندر ہزاروں پھول نکلتے تو میرے اندر خوشبو کا ایک طوفان مچ گیا۔ خدا بھلا کرے میرے مرشد کا خدا سلامت رکھے اس کو جس نے میرے اندر یہ بوٹی کاشت کی۔)

پھر کہتے ہیں!

ایہہ تن میرا چشماں ہووے میں مرشد دیکھ نہ رجاں ہو
لوں لوں دے مڈھ لکھ لکھ چشماں اک کھولاں اک کجاں ہو
ایناں ڈٹھیاں دی جر نہ آوے فیر ہو رکتے دل بھجاں ہو
مرشد دا دیدار اے باہو مینوں لکھ کروڑاں حجاں ہو

(اے کاش میرا یہ سارا جسم آنکھیں بن جائے اور ہر وقت ہر گھڑی میں اپنے مرشد کو دیکھتا رہوں۔ میرے ہر ہر مسام کے نیچے ایک ایک آنکھ ہو' کبھی اس کو کھولوں کبھی اس کو بند کروں اور حیرت کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہے۔ اگر اس قدر دیکھنے سے اور مسلسل دیکھنے سے بھی مجھ کو صبر نہ آئے' قرار نہ آئے' چین نہ آئے تو پھر میں اور کس طرف بھاگوں لیکن نہیں مجھے اور کس طرف بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو اپنے مرشد کا دیدار لاکھوں اور کروڑوں حجوں سے زیادہ ہے۔)

بابا بلھے شاہ کہتے ہیں!

آ' عنایت قادری جی چاہے میرا
میں اڈیکاں کر رہی کدی آ کر پھیرا

(اے میرے مرشد اے شاہ عنایت میں کب سے آپ کے انتظار میں ہوں اور بالکل رہ گیا ہوں۔ کبھی مجھ پر کرم کرو میری طرف بھی آؤ۔)

یا پھر!

پیر پیراں بغداد ا ساڈا مرشد تخت لہور
ایہو ای تسی دی آکھو آپ گڈی آپ ڈور
میں دسناں آں تسی پکڑ لیا و بلھے شاہ دا چور
میری بکل دے وچ چور

(کہتے ہیں کہ پیروں کا پیر حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سب سے بڑا پیر ہے۔ مرشد میرا لاہور میں ر
غور سے دیکھو تو پتنگ بھی وہی ہے اور ڈور بھی وہی ہے۔ یعنی اوپر چڑھا ہوا بھی وہی ہے اور اوپر چڑھانے والا
میں بتاتا ہوں۔ اگر تم مجھ پر مہربانی کرنا چاہتے ہو تو میرے چور کو پکڑ لاؤ۔ اس نے مجھے بہت نقصان پہنچایا
رلایا ہے۔ وہ میرا مرشد شاہ عنایت ہے۔)

یا پھر!

عرش منور ملیاں بانگاں سنیاں تخت لہور
شاہ عنایت کنڈیاں پایاں لک چھپ کچ داڈور
نی میری بکل دے وچ چور

(پیغام تو آسمانوں سے آتا ہے لیکن سنا لاہور میں جاتا ہے۔ شاہ عنایت نے میرے مرشد نے میر
ماہی گیر (Angular) کی طرح ڈوری ڈالی ہوئی ہے۔ میرے دل کو تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح کھینچتا ہے لیکن
میں کیا کروں کدھر جاؤں۔ شاہ حسین بھی یہی کہتا ہے کہ جس نگری وچ ٹھاکر ناہیں اوہ کاکر کو کر بستی ہے۔)

یعنی جس بستی میں جس شہر میں کوئی مرشد نہیں، ہادی نہیں، وہ بستی کتوں اور مرغوں کی بستی ہے جو خوا
رہتے ہیں، خوامخواہ بانگیں دیتے رہتے ہیں۔ اک شور مچا رہتا ہے۔ آوازوں کی Pollution سے بھرا رہتا ہے۔

آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ ایک آدمی پر اس قدر اعتبار کر لینا۔ اس کے حوالے اپنا سب کچھ کر دینا
ایمان لے آنا، اس کے آگے دم نہ مارنا۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا یہ کہاں تک جائز ہے۔ اس سے تو اپنی شخص
خودی کی نفی ہو جاتی ہے لیکن پنجاب کا صوفی کہتا ہے کہ نال شرابیں رنگ مصلاحے گر و آکھے تینوں۔ اگر تمہارا گر
تم سے یہ کہے کہ اپنے مصلیٰ کو اپنے جائے نماز کو اور اپنی نماز پڑھنے والے جگہ کو شراب میں غسل دے دو۔ شراب
ایسا ہی کرو کیونکہ گرو تم سے بہتر جانتا ہے۔ گورو تمہارا بھلا چاہتا ہے۔ گورو تمہیں منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے

آپ کی آسانی کے لیے ایک اور مثال سے واضح کر دوں تاکہ آپ کو اچھی طرح سے سمجھ آجائے
اہمیت کیا ہوتی ہے اور آپ میں سے سب لوگ گورو کو کس قدر اہم جانتے ہیں۔ جب آپ کا گورو آپ
Please fasten your seat belts تو فوراً اپنی پیٹیاں باندھ لیتے ہیں۔ اس وقت کوئی یہ سوال نہیں کرتا
ایسا کیوں کیا۔ یہ میری شخصیت کے خلاف ہے۔ میں نے ابھی کھانا کھایا ہے۔ میرا پیٹ پھولا ہوا ہے۔ یہ معدے
بہت نقصان دہ ہے۔ نہ ہی آپ میں سے کوئی پائلٹ کیبن میں جا کر اس سے بحث کرنے لگتا ہے کہ میں پیٹی نہیں
گا۔ میں کوئی بکری ہوں، کوئی جانور ہوں، میں انسان ہوں۔ پھر آواز آتی ہے۔ extinguish your
cigerettes۔ آپ فوراً اپنا سگریٹ بجھا لیتے ہیں حالانکہ آپ نے ابھی سلگایا تھا۔ ابھی مزا آنے لگا تھا لیکن
آرڈر دے دیا کہ بجھا دو۔ آپ نے بجھا دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ پائلٹ آپ سے بہتر علم ر
بلندی کا بھی اور پستی کا بھی۔ پرواز کا بھی اور گھومنے کا بھی چڑھنے کا بھی اور اترنے کا بھی۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ہمار

ہے۔ اس لیے آپ بیسویں صدی میں ہونے کے باوجود اور اس قدر پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اس کی ہر
ہیں۔ یہ جسم کو بچانے کے لیے، زندگی برقرار رکھنے کے لیے ہے لیکن جب روح کا مسئلہ آتا ہے تو ہم میں سے ہر
دمی یہی کہتا ہے کہ مجھے اپنی روح کی پرواز کے لیے کسی پائلٹ کی ضرورت نہیں۔ یہ کام میں خود کر لوں گا کتاب
گا۔

لیکن ایسے کبھی نہیں ہوتا۔ کیا آپ ایئرپورٹ پر جا کر کسی ایسے پائلٹ کے جہاز میں بیٹھنا پسند کریں گے جو یہ
فلائنگ پر دو درجن کتابیں پڑھی ہیں اور میں نے اپنے کمرے میں ہر ہوائی جہاز کا ڈایا گرام لٹکایا ہوا ہے لیکن
ج تک کسی جہاز کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ ہی کبھی Cock pit میں بیٹھا ہوں۔ نہ ہی اس کو اڑایا ہے۔

اگر ہم روحانیت کی بات چھوڑ دیں اور صوفی ازم کی اونچی اور اعلیٰ حقیقت پر بھی بات چیت نہ کریں تو میں کہوں گا
ن کی بدولت معاشرتی اور سماجی طور پر لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ صوفی لوگ جو ہمارے گاؤں میں بستیوں
ں میں شہروں میں ہوئے اور جواب بھی ہیں یہ اپنے اپنے علاقے کی آبادی کے لیے Psychiatric کا کام
ں۔ ان کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں سائیکوانلسٹ کا کوئی کاوچ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی Tranquilizer بھی
یتے۔ یہ اپنے سلوک سے، اپنے برتاؤ سے، اپنی نرمی سے لوگوں کو ذہنی پریشانیوں اور دماغی بیماریوں سے دور رکھتے
رکھتے چلے آئے ہیں۔ پاکستان کے لوگ ذہنی طور پر اور دلی طور پر بڑے پرسکون اور فارغ البال ہیں۔ وہ غریب
ان کے پاس روپے پیسے اور اناج کی کمی ہے۔ ان کے یہاں بھوک ہے۔ بیماری ہے لیکن ان کے یہاں بے چینی نہیں،
نہیں۔ بے خبری نہیں، خدا سے دوری نہیں۔ جن لوگوں سے آپ روز ملتے ہیں جو آپ کو پڑھانے آتے ہیں جو
پھر دیتے آتے ہیں یہ اصل لوگ نہیں ہیں۔ یہ Reading, Writing, Rioting لوگوں کا ایک گروہ ہے اور
ساری بیماریاں چمٹی ہوتی ہیں جو مغربی دنیا میں عام پائی جاتی ہیں۔ اب ہمارے یہاں بھی دماغی امراض میں اضافہ
ہے۔ ہم بھی بے امن ہو گئے ہیں۔ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ طبقہ بھی تھری آرز کا شکار ہو گیا ہے۔ ہمارا ٹریفک بھی
گستاخ ہو گیا ہے۔ ہم بھی مادی تقاضوں کے پیچھے بھاگنے لگے ہیں۔ ہم نے بھی اپنی روح اور روح کی آسودگی اور
سکون کو بڑے سستے داموں فروخت کر دیا ہے۔

مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے بات کہاں سے شروع کروں۔ محسوس کرنے والی چیز کو حصوں میں اور
میں نہیں جانا جا سکتا۔ شاعری پر تنقید یا اس کی خوبیاں اور حسن بیان کرنا بڑی احمقانہ بات ہے۔ شاعری یا تو دل کو لگ
ہے یا نہیں لگتی۔ جو لگ جاتی ہے وہی شاعری ہے۔ آپ تمہید کے طور پر دیباچے کے طور پر Preface سمجھ کر ایک
سوچنے کے لیے رکھ لیجئے کہ تصوف کے میدان میں اور صوفی ازم کی دنیا میں ایک رہنما کی ایک ہادی کی ایک مرشد کی
دی کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے بغیر آپ صوفی ازم کے صحافی اور کالم نگار تو بن سکتے ہیں لیکن اس علم سے یا اس
نیا سے خود لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مجھے معلوم نہیں اس علم کو کون اور کیسے تلاش کرے گا؟ لیکن آپ کے ملک میں،
کے شہر میں، آپ کی بستی سے باہر، آپ کے اردگرد سے دور اس کا ذکر ضرور ہو گا۔ ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ اور پھر یہ

تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ہوتا ہی رہے گا۔ آنے والی باتیں اس دیباچے کی ایک کڑی ہوں گی۔ اس کا ایک سلسلہ ہوگا۔ میں اور آپ پھر قریب ہوں گے اور قریب ہی رہیں گے۔ انسان انسان سے اتنی جلدی جدا نہیں ہوتا اتنا دور نہیں ہوتا۔ ہماری روحیں تو ہمارے رب کا امر ہیں۔ اس کا حکم ہیں پھر ہم اس کے حکم سے پرے کیسے جاسکتے ہیں۔ روحانی طور پر ہم ساتھ ساتھ ہی رہیں گے۔ ہمیشہ ہمیشہ۔

ڈیروں پر ایک مدت گزارنے کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچا کہ مجھ میں کسی کو اپنا مرشد سمجھ لینے کی ہمت نہیں ہے۔ مغربی تعلیم نے مجھے خودسر' خود اعتماد اور خودکار بنادیا تھا۔ میرے لیے دوسرے کا مشورہ' رائے اور سمجھاوٴنہ صرف دخل اندازی تھی بلکہ مکمل آزادی گنوانے کے مترادف تھی۔ میں دنیاوی علوم میں تو استاد کی دست گیری برداشت کرسکتا تھا لیکن اقلیم قلب میں کسی رہنما' ہادی یا گائیڈ کا متکلف نہ ہوسکتا تھا۔ میں نے اللہ کے علم کے لیے اپنی ہاٹ لائن ایجاد کر رکھی تھی۔ اعلیٰ تعلیم نے مجھ سے 'ماننے' کی صلاحیت چھین لی تھی۔ کچھ سال صوفی ازم کی کتابیں اور سائنسی دنیا کو تاہٹ کرنے میں گزر گئے۔ میں دو راستوں کا مسافر ہوگیا اور اپنی انا کو سمت نما بناکر علم نافع کی تلاش میں لگا رہا لیکن علم حاصل کرنے کا طریقہ غالباً یہ نہ تھا۔

گرو تمہاری ہڈیاں تمہارا خون تمہارا گودا بن جائے۔

بس تم باقی نہ رہو۔ گرو رہ جائے....تم ہی گرو ہو کر رہ جاوٴ۔

اصل میں روحانی دنیا کے اندر علم کی منتقلی نہیں ہوتی۔

علم دینے والے کی منتقلی ہوتی ہے۔

وہ سارے کا سارا آموجود ہوتا ہے اور تم نہیں رہتے ہو۔ تم ختم ہوجاتے ہو۔

اس میں مرشد کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

تمہارا فائدہ البتہ ہوجاتا ہے بلکہ سارے کا سارا تمہارا ہی فائدہ ہوتا ہے۔

یہ مرشد لوگ' بڑے ڈاہڈے لوگ ہوتے ہیں۔

ان کی شکلوں پر اور ان کی مسکراہٹوں پر نہ جانا۔

یہ میٹھے میٹھے لوگ بڑے ظالم اور بڑے سخت ہوتے ہیں۔

کوئی ان کے قریب آنے کی کوشش کرے تو یہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں' ایسی ایسی شکلیں بناتے ہیں کہ لوگ ان سے متنفر ہوکر دور ہوجاتے ہیں۔

اگر کسی حلقے میں یا کسی زاویے میں کوئی شخص کسی نئے آنے والے سے کہے کہ "بچ کے رہنا یہ پیر چالاک ہے اور مکار ہے اور دغاباز ہے۔"

تو آنے والا پیر کا اعتبار نہیں کرے گا بلکہ اس شخص کا اعتبار کرلے گا حالانکہ اس نے اُس شخص کو پیر برابر بھی نہیں جانا ہوتا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ جب بھی کسی نے یہ کہا کہ یہاں غلط ہے۔

اس جگہ دال میں کچھ کالا ہے تو آپ نے فوراً اسے تسلیم کرلیا۔ اس کے آگے سر جھکا دیا۔

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ اچھا ہے۔ یہ خوب ہے۔ یہ نیکی ہے۔

تو تم رک جاتے ہو۔ خاموش ہوجاتے ہو۔ ماننے سے انکار کردیتے ہو۔

برائی پر تم کو پورا یقین ہے۔ سو فیصد اعتماد ہے۔

شیطان پر اور ابلیس پر پورا یقین ہے۔ لیکن خدا پر نہیں۔

انگریزی میں ایک محاورہ ہے: Too good to be true

یعنی یہ اس قدر اچھی بات ہے کہ سچ ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی کہے: Too bad to be true

بہت بری اور بہت خراب کبھی بھی بہت بری نہیں ہوتی۔ غلط نہیں ہوتی۔ ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتی ہے۔

تم نے انسانیت پر اس قدر بے اعتباری شروع کردی ہے۔

اس قدر بے اعتمادی کا اظہار کردیا ہے کہ اب تم کو اس کی طرف سے کوئی اچھی خبر ٹھیک ہی نہیں لگتی۔

اگر کوئی آکر آپ سے یہ کہے کہ فلاں نے معراج انسانیت حاصل کرلی ہے اور جلوہ حقیقی سے روشناس ہوگیا ہے۔

تو تم کبھی بھی یقین نہیں کروگے۔ سنوگے اور کہوگے یہ سب افسانہ ہے۔ گپ ہے۔

ایسا کبھی ہوا ہی نہیں پھر اب کس طرح سے ہوسکتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کو جلوہ حقیقی نظر آجائے جب ہم کو کبھی نظر نہیں آیا۔ جس چیز کا تجربہ ابھی تک مجھے نہیں ہوا وہ کسی اور کو کس طرح سے ہوسکتا ہے۔

نطشے کہتا ہے کہ خدا کوئی ہے نہیں (نعوذ باللہ) خدا کس طرح سے ہوسکتا ہے جب میں بندے کی صورت میں یہاں موجود ہوں۔

اگر کوئی خدا ہوتا تو میں خود ہوتا اور میں چونکہ خدا نہیں ہوں اس لیے خدا بھی پیدا ہی نہیں ہوا۔

تم لوگوں کے بارے میں مثبت باتیں سوچ ہی نہیں سکتے۔

کتنی بھی کوشش کرلو تم لوگوں کے بارے میں شک میں ہی مبتلا رہوگے۔

اگر مارے باندھے یقین کرنے پر مجبور بھی ہوگئے تب بھی تمہارے دل کے کسی گوشے میں شک گزرتا ہی رہے گا۔

اگر کوئی شخص آ کر تم سے کہے فلاں شخص فراڈ ہے۔ بے ایمان ہے تو تم فوراً تسلیم کر لو گے۔

بغیر کسی تحقیق کے بغیر تبصرے کے۔ سو فیصد مان لو گے کہ وہ شخص فراڈ ہے۔ لیکن اگر مہاتما بدھ بھی پہاڑ سے اتر کر آپ کے پاس آ جائے اور کہے میں بدھا ہو گیا ہوں۔ مجھے نروان حاصل ہو گیا ہے۔ مجھ پر فضل ہو گیا ہے تو تم کبھی بھی تسلیم نہیں کرو گے۔

کرو گے کیا..... کر ہی نہیں سکو گے۔ چاہے کتنا بھی زور لگاتے رہو۔

اصل میں انسان کا سارا اعتماد ابلیس پر ہے۔ وہ شیطان کو تسلیم کرتا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے۔ پکے دہریے ہوتے ہیں۔

وہ ابلیس کو ضرور مانتے ہیں۔ ابلیس کے خلاف کبھی کوئی دلیل نہیں لاتے۔ لیکن ابلیس کو ماننے اور تسلیم کرنے والے کی عقدہ کشائی نہیں ہو سکتی۔ وہ چیلا نہیں بن سکتا۔

اگر تم غلط کے خلاف اور ابلیس کے خلاف کوئی روک بنا سکتے ہو' منفی رویے کے خلاف ایک قلعہ تعمیر کر سکتے ہو..... تو پھر تم چیلا بن سکتے ہو۔ پھر تم گرو پکڑ سکتے ہو۔ لیکن اگر تم نفی کے اختیار میں ہو' نہ سننے والے ہو تو گرو تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔

گرو پکڑنے والے کو اگر راستے میں کوئی تانگے والا' پان والا' مزدور' قلی' حلوائی' بھٹیارا یہ کہہ دے کہ بھائی صاحب کہاں جا رہے ہو۔ وہ تو ایک فراڈ ہے۔ ایک غلط انسان ہے۔ جھوٹا پیر ہے تو پھر تم اس تک پہنچ ہی نہیں سکتے ہو۔

جس شخص کو گرو سے دلچسپی ہو۔ روحانی دلچسپی ہو ذہنی ہو۔ روحانی موضوعات سے لگنا ہو۔ روحانیت سے شغف ہو وہ گرو تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس میدان میں دلچسپی اور رغبت کوئی معنی نہیں رکھتے۔

یہاں تو صرف پیاس کی ضرورت ہے۔ شدید اور جان نکالنے والی پیاس۔

جب گرو کسی کو یہاں دیکھتا ہے تب ہی وہ اس کو پانی کا گلاس دیتا ہے۔

پانی سے دلچسپی رکھنے والے کو کوئی بھی گلاس بھر کر نہیں دیتا۔ پیاسے کو دیتا ہے۔

اوپر نگاہ سے کبھی کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔

برتاؤ بالکل بیرونی چیز ہے۔ اس سے آدمی کے اندر کا اندازہ نہیں ہوتا۔

برتاؤ اور سلوک سمندر کے اوپر کی لہریں ہیں۔ اندر کیا ہو کسی کو بھی نہیں معلوم۔

اوپر کی نگاہیں اوپر ہی رہ سکتی ہیں۔ لہریں ہی دیکھ سکتی ہیں۔

اصل میں ساری حسیات ہی بے معنی ہیں۔

کبھی کسی چیز کو بصارت سے معلوم نہ کرنا۔ اپنی کسی حس سے نہ پرکھنا۔ کیونکہ ہر شے کا ایک اندر بھی ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ پتھر کی مورتی کا بھی ایک اندر ہوتا ہے۔

اور ایک گرو' ایک آقا' ایک مرشد تو پوری کائنات ہوتا ہے۔

اس کے قریب جاؤ تو اس کے باہر کی آنکھوں سے نہ دیکھو۔

اگر تم نے اُس کو صرف دیکھ کر جاننے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے۔

تمہارا حال ابو جہل جیسا ہو جائے گا جس نے حضورؐ کو صرف آنکھوں سے دیکھا اور دیکھنے سے ہی پرکھنے کی کوشش کی۔

اور محروم رہ گیا۔

اس بیچارے کو سمجھ ہی نہ آ سکا کہ وہ کتنی بڑی کائنات کے حضور میں بیٹھا ہے۔ ہر روز دیکھتا ہے اور یقین سے دور ہوتا جاتا ہے۔

پھر..... کچھ لوگ ایسے ہیں جو کانوں کے ذریعے پرکھتے ہیں۔

سن کر اندازہ لگاتے ہیں۔

زبان خلق کو خدا کا نقارہ سمجھتے ہیں۔

کانوں سے تم کیا سن لو گے۔ کیا سمجھ لو گے۔

یہ کوئی عام موسیقی تو ہے نہیں جو تم کانوں سے سن لو گے۔ یہ الخذ باجہ ہے۔ الخذ باجہ ان کانوں سے کس طرح سے سنا جا سکتا ہے۔

کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگر ان پر اعتبار کر بھی لے تو بھی دل نہیں مانتا۔ کسی بڑے نے کر لیا تو سر تسلیم تو خم کر لیا مگر اندر سے بیزار دل رہے۔ یہ کیفیت میری میرے باباجی کے ساتھ تھی۔ باباجی نور والے کبھی کبھی کوئی بات ایسی کر جاتے تھے جو اصولاً سر سے گزر جانی چاہیے مگر وہ شمشیر برہنہ لے کر سامنے کھڑی ہو جاتی تھی۔ میں بھی ایسا ضدی کہ خم ٹھونک کے مقابلے میں کھڑا ہو جاتا اور "میں نے مانوں" کے نقارے پر زور کا ڈنکا بجاتا۔ اس بات سے وہ بہت خوش ہوتے کہ میں ایک کمزور بھگوڑے کی طرح ہاں کہتا کہ بات میرے سر سے گزر گئی۔

فرمانے لگے۔ وقت اور ماحول کیسا بھی طاقتور کیوں نہ ہو آدمی کے لیے خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ یقین ادھر ادھر منڈلاتا رہتا ہے لیکن نیزہ گاڑ کر حتمی انداز میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کہنے لگے جس طرح نیکی کے لیے ہر وقت خطرہ موجود ہے برائی کے لیے بھی ہے۔ ہم نے کہا برائی کے لیے ضرور ہے مگر نیکی اٹل ہے۔ ٹروتھ مستحکم ہے۔ حق کو خطرہ نہیں۔

آپ مسکراتے رہے اور ہم جھگڑا کرتے رہے۔

بولے بکرا پاک ہے طیب ہے۔ ٹروتھ ہے۔ حق ہے۔ درخت کے ساتھ بندھا ہے اگر حلال ہو جائے تو نعمت ہے اگر جھٹکا ہو جائے تو گڑبڑ ہے۔ ہمارے کسی کام کا نہیں۔ وہی پاک عیب' ٹروتھ حق نجاست میں تبدیل ہو گیا۔

اس بات کو تقریباً پچیس برس کا عرصہ گزر گیا۔ حال ہی میں ہمارے دوست شہزاد احمد نے ایک کتاب لکھی ہے

شوماخر (عہد حاضر) فلسفیوں کو اردو داں طبقہ سے روشناس کرانے کے لیے چپ چاپ اپنی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ شوماخر کو آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اس اقتصادیات کے ماہر نے جب ایک چھوٹی سی کتاب Small & Beautiful لکھی تو اقتصادیات جیسے خشک مضمون سے روح کی بالیدگی کا سامان پیدا ہو گیا۔

اب شہزاد صاحب کی کتاب کے آخر میں پہنچ کر میرے سامنے باباجی نور والے کا ڈیا پھر سے روشن ہو گیا اور طیب پاک حلال بکرا میرے سامنے آ گیا۔ آپ کے سنانے کو اس کتاب کی چند سطریں میں نے ایک چپ پر لکھ لیں۔

یہ پیراگراف دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں بھولے بسرے واقعے کے پرانے کواڑ کھل گئے۔ یہ آج سے پچپن برس پہلے کا واقعہ تھا۔ 48ء کے شروع میں میرے دل میں صحافی بننے کا شوق چرایا اور میں نے حاجی صالح محمد صدیق کی شاگردی اختیار کر لی۔ میرے استاد بڑے شفیق بڑے بیبے اور بزلہ سنج انسان تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں ڈر نہیں لگتا تھا کہ وہ ان کے پاس اپنی برتری کی پخی نہیں تھی۔ رات کو خبروں کا ترجمہ کرنا' کاتبوں کو دیے جانا' چائے پیتے جانا اور ٹکے ٹکے کی باتیں کیے جانا۔ آدھی رات کاپی جوڑ کر خراماں خراماں چلتے گھر آ کر سو جانا۔

جس طرح مفلس کی قبا میں ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں اسی طرح ہر گھڑی اور ہر لحظہ اور ہر آن اس کرۂ ارض پر بسنے والے ہر شخص کی روح میں کچھ نہ کچھ بویا جاتا ہے۔ دور دراز سے ہر قسم کے اڑتے ہوئے بیج اس تک پہنچتے رہتے ہیں اور اس کے اندر کاشت کرتے رہتے ہیں۔ کچھ بیج تو راستے میں ہی رہ جاتے ہیں اور کاشت کے مقام تک پہنچ نہیں پاتے اور کچھ روح میں یا ذہن میں گر کر نشو و نما حاصل کرتے ہیں۔

اصل میں جو روح آزاد اور جو وجود Free نہیں ہوتا' جو غلام اور قیدی ہوتا ہے اس میں کوئی بیج داخل ہو کر نشو و نما حاصل نہیں کر سکتا۔ جو ذہن اپنی لذتوں کا غلام اور جو روح اپنی خواہشوں کی قیدی ہوتی ہے وہ ایک بنجر زمین کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں خوشی اور خورسندی اور سرورِ ازل کا پودا پروان نہیں چڑھ سکتا۔

اللہ بھی قیدی وجود کے اندر آزادی کا پودا نہیں لگا سکتا اس لیے کہ قیدی وجود کو آزادی سے بڑی نفرت ہوتی ہے۔

میرا مقصدِ اولیٰ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ میں لذت' کامیابی' صحت' زندگی اور دولت کے لیے مارا مارا پھروں حتیٰ کہ مجھے دانش' علم' نیکی اور خوبیوں کی تلاش میں بھی نہیں جانا چاہیے۔ اسی طرح منطیانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے دکھ' تکلیف' مایوسی' ناکامی' علالت' خودکشی وغیرہ کی طرف بھی رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے تو بس اللہ کی رضا تلاش کرنی چاہیے لیکن چاہیے جو اللہ نے میرے لیے منظور کی ہے اور مجھے عطا کی ہے۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ بابا لوگ کچھ ایسے بے دھیان اور بے تعلق بھی نہیں ہوتے کہ ان کو دنیا کی چیزوں کا علم ہی نہ ہو اور پتہ ہی نہ چلتا ہو کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے (بیٹری' ریڈیو' ٹیلی فون' گیس بجلی) کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں اور ہواؤں اور خوشبوؤں اور دلفریبیوں سے بھی بے نیاز نہیں ہوتے۔ آپ کا خیال ہوگا کہ وہ ہر وقت مولا سے لو لگائے گیان دھیان میں ڈوبے رہتے ہیں اور ان پر مراقبے کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ لیکن آپ کے خیال کے مطابق نہیں ہے حقیقت میں یونہی ہے کہ وہ خدا کے اندر اس قدر گہرے اترے ہوتے ہیں کہ ان کو خدا کی بنائی ہوئی ہر شے کا حقیقی علم ہوتا ہے۔ وہ ہر شے اور ہر شخص کے احوال سے واقف ہوتے ہیں اور خالق سے خلق کی طرف کا سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ بابا لوگ دنیا کے بارے میں دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور ان کی باتوں میں خدا کا حوالہ تک نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں دنیادار لوگ اپنی پاکیزگی جتانے کے لیے اپنی باتوں میں خدا کا تعلق پیدا کرتے رہتے ہیں کہ کیا اللہ کی شان ہے۔ کیا اس کی صفت ہے' کیا اس کا کمال ہے' کیا اس کی بڑائی اور کیا کبریائی ہے۔ مذہب سے متعلق جتنی بھی فرسودہ اور چالو ترکیبیں ان کو یاد ہوتی ہیں وہ انہیں اپنی گفتگو میں استعمال کرتے رہتے ہیں اور ایک عام آدمی ان کی گفتگو سے یہی نتیجہ نکالتا رہتا ہے کہ مذہب میں ضرور کوئی خرابی ہے یا کوئی ٹیڑھ۔ اس میں کوئی پھندا لگا ہوا ہے جو نظر نہیں آتا۔

بابے جانتے ہیں کہ دنیا' مادہ' حرص ہوس جو کچھ بھی خدا نے بنایا ہے سب درست ہے سب ٹھیک ہے۔ کوئی شے باطل نہیں ہے۔ لیکن غرض مند لوگ دنیا میں اور دنیا کی آلائشوں' مصروفیتوں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں اور ہر وقت اپنی اور اپنی ذات کی ظاہرا یا پوشیدہ تعریف و توصیف میں لگے رہتے ہیں۔ اصل میں جب تک خدا کے ساتھ گہرا تعلق نہیں ہوگا اس کی بنائی ہوئی دنیا میں قدم قدم پر تضادات ملتے رہیں گے۔ جو کچھ اس نے بنایا ہے ہم کو اس کی طرف کھینچتا رہے گا۔ اسی کی مصنوعات ہم کو اس کی قدرتیں ہم کو جھلکیاں رہتی ہیں۔ کبھی کبھی اس کی قدرتوں میں ہمیں اس کا پرتو نظر آتا ہے کبھی کبھی ان ہی قدرتوں میں اس کا وجود نہیں ملتا۔ کبھی ہم کو ان میں خوشی محسوس ہوتی ہے کبھی وہی خوشی رنج میں بدل جاتی ہے۔ اس کائنات میں' چونکہ ہم حق سے ناواقف ہیں' کچھ کچھ جنت نظر آتا ہے کچھ کچھ دوزخ۔ یافت کی خوشی کے ساتھ نایافت کا رنج رہتا ہے۔

باغِ امید ہے یوں چمن پاس کی باس جوں ہم بوئے گلاب اور اناس کی باس

اصل میں جو کوئی بھی اپنی پوجا کرتا ہے اور اپنی ذات کی عبادت میں مصروف رہتا ہے وہ فنا کی نہ ہونے کے بعد موت کی پرستش کرتا ہے اور ناسوت کی پرستش دوزخ ہے!

وہاں نیم کا ایک درخت تھا جو درخت ہونے کے ناتے اپنے اللہ کی شان بیان کر رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی درختگی پر نازاں تھا اور ہر وقت جھومتا رہتا تھا۔ ٹھنڈک بکھیرتا رہتا تھا۔ یہ درخت اپنے اللہ کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے اپنی جڑوں کو اندر ہی اندر پھیلا رہا تھا اور اپنے پتوں کی گھنیری چھتریاں تیار کر رہا تھا۔ اس کے پتے اور شاخیں ہوا میں اور روشنی میں ایسا ہیولا پیش کر رہی ہوتیں کہ اس سے پہلے نہ کوئی درخت ایسا تھا اور نہ ہی شاید آگے چل کر پورے کرۂ ارض پر ایسا کوئی درخت ہو سکے گا۔ اور یہ جو ہریل اس وقت پتہ نہیں کہاں سے آ کر اس کی شاخوں میں بیٹھ گیا

تھا۔ اسی حکم کے تحت آیا تھا جس حکم کے تحت اس درخت کی نمو ہوئی تھی اور اسی طرح' اس بادل کے ٹکڑے کے نیچے اس مقررہ شاخ پر اس کی نشست کا طے ہوا تھا اور وہ خوشی خوشی یہاں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی موجودگی ہی اللہ کی شان تھی اور اسی پرندے کا ہریل پن ہی اس کو اپنے ہونے کا اعزاز بخش رہا تھا۔

ہر قسم کے گناہ کی ابتدا اس مفروضے سے ہوتی ہے کہ میرا جھوٹا وجود' وہ وجود جو صرف میری انا پرست خواہشوں کے اندر لپٹا ہے یہی میرا اصل ہے اور یہی میرا حقیقی وجود ہے۔ اسی کے لیے مجھے دنیا کی ہر شے حاصل کرنی ہے اور اس کو خوش کرنے کے لیے مجھے ہر وقت تگ و دو کرنی ہے۔ اس خیال کے پیش نظر میں لذتوں' خواہشوں' عزتوں' طاقتوں اور محبتوں کو مجتمع کرتا رہتا ہوں۔ میں اپنے اس بے حقیقت وجود کو ڈھانپنے کے لیے دنیا کی ہر شے اوڑھنے میں لگا رہتا ہوں۔ جیسے مصر کی قدیم حنوط شدہ لاشوں پر پٹیاں لپٹی ہوتی ہیں میں بھی اپنے اردگرد پٹیاں لپیٹ کر اپنے مردہ جسم کو حنوط کرتا رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری بے حقیقی مجھے اسی طرح کی لپیٹا لپیٹی سے حقیقت میں تبدیل کر دے گی۔ خدا کی تلاش میں صرف ایک ہستی ہی میری مدد کر سکتی ہے اور وہ خود خدا ہے۔

مگر تم اپنے خیالات سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنی توجہ ایک نقطے پر مرکوز کر کے مراقبے کے گہرے مرکز میں میں اتر جاؤ اور تصور کی روشنی میں نور کے ہالے میں خدا کی تلاش کرو پھر بھی تم خدا کو نہیں پا سکو گے۔ کوئی بھی جسمانی کوشش اور روحانی عمل تمہیں اس کے قریب نہیں لے جا سکے گا۔ یہ تو اُسی وقت ہوگا جب خدا خود اپنا نام لے کر تمہاری روح کے مرکز میں پکارے گا اور خود تمہیں اپنا نام بتا کر تعارف کرائے گا۔ خدا کی دریافت دراصل خدا ہمیں دریافت کرے کا نام ہے۔ ہم کبھی بھی بہشت میں نہیں جا سکتے کیونکہ ہمیں پتہ ہی نہیں بہشت کہاں اور اسے کون سا راستہ جاتا ہے۔ وہ خود عرش بریں سے اتر کر ہماری رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں سارے راستوں سے روشناس کراتا ہے۔ دراصل وہ جسے اپنے علم میں حصے دار بناتا ہے وہی اس کو جان سکتا ہے۔

میں جب کبھی خدا کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو اپنے آپ ہی کو خوش کرتا ہوں۔ یعنی اس کے دشمن کو خوش کرتا ہوں۔

میں نے خود غرضی کے اندر جنم لیا ہے اور میں اسی خود الفتی کے درمیان زندہ ہوں۔ وہ لوگ جو خدا کو بالکل نہیں جانتے اور جن کی زندگیاں اپنے محور کے گرد ہی گھومتی ہیں وہ جب بھی خدا کو تلاش کرنے کے لیے نکلے اپنی ذات اور اپنے آپ کو تلاش کر کے گھر لے آئے! لیکن یہ بھی مشکل ہے کیونکہ میرا وقت اس ادھیڑ بن میں گزرتا ہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے تمہارے پاس نہیں۔ جو میں ہوں وہ تم نہیں ہو۔ میں نے وہ کچھ حاصل کر لیا ہے جس کی تمہیں ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لیے تم کرب میں ہو اور میں خوشی میں ہوں۔ میری تعریف ہوتی ہے اور تم سے نفرت کی جاتی ہے۔ میں زندہ ہوں تم مردہ ہو۔ میں کچھ ہوں جب کہ تم کچھ بھی نہیں ہو اور چونکہ تم کبھی بھی نہیں ہو اس لیے میں اور زیادہ "ہوں۔" اس طرح میں اپنی زندگی

اپنے اور تمہارے فرق کے درمیان ہنسی خوشی بسر کر رہا ہوں۔

جب ایک متکبر انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ میں ایک عاجز اور حقیر فقیر انسان ہوں اس وقت اس کی روح کا دم واپسیں ہوتا ہے۔ ایسے انسان کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔

اس دنیا میں کوئی مقام تنہائی کا اور Solitude کا نہیں ماسوائے اپنے اندر کے مقام کے اور اندرونی سکون صرف اس شخص کو ملتا ہے جو دوسرے لوگوں کے درمیان اپنی جگہ تلاش کرتا ہے اور دوسرے لوگوں سے ہم آہنگ ہو کر رہتا ہے۔ خدا نے ہم کو عقل' دانش' ذہانت' خوبصورتی اور تقویٰ صرف ہمارے استعمال کے لیے نہیں دیا۔ یہ ساری خدائی کے لیے ہے۔ جب ایک عضو کو تقویت عطا کی جاتی ہے تو وہ صرف اس کے لیے ہی مخصوص نہیں ہوتی بلکہ اس سے سارا وجود مستفید ہوتا ہے۔

ولی اللہ اور خدا رسیدہ لوگ اپنی تقدیس اور بزرگی کو اس لیے پسند نہیں کرتے کہ ان کی بزرگی انہیں ارفع مقام عطا کرتی ہے اور ہم لوگوں سے برتر سطح پر رکھتی ہے بلکہ وہ اپنی تقدیس سے اس لیے محبت کرتے ہیں کہ یہ ان کو عام لوگوں کے قریب تر لاتی ہے اور ان کو عام لوگوں کی ماتحتی میں داخل کر دیتی ہے۔ ان کو اولیائی دی ہی اسی وجہ سے جاتی ہے کہ ہماری خدمت کریں اور ہمارے کام آئیں۔ اولیا اللہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی طرح ہوتے ہیں کہ بیماروں سے اچھے ہوتے ہیں اور اپنی اچھی صحت اور توانائی کے باعث اور عطائے صحت کے فن کی بدولت بیماروں کی خدمت کرتے ہیں۔ اولیاؤں کو اپنی اولیائی پر اس لیے خوشی ہوتی ہے کہ انہیں اولیائی کی عطا سے ہر شخص کو Admire کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کو ایک ایسی نظر عطا ہو جاتی ہے جو ایک جرائم پیشہ خونی کے وجود میں اچھائی تلاش کر لیتی ہے۔ اس عمل سے وہ دوسروں کو پرکھنے کے بوجھ سے آزاد ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو Condemn نہیں کرتے۔ عاجزی سب سے بڑی نعمت ہے اور اسی کی بدولت انسان آزادی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ جب تک آپ اپنے تصوراتی وجود کی پشت پناہی کرتے رہیں گے اس کا Defence کرتے رہیں گے آپ کو سکون قلب میسر نہیں آ سکے گی۔ جب تک آپ اپنے آپ کو سنجیدگی سے لیتے رہیں گے اور سوچتے رہیں گے کہ آپ کی نیکیاں اہم ہیں اور اس لیے اہم ہیں کہ وہ آپ کی نیکیاں ہیں اس وقت تک آپ اپنے تکبر اور اپنی منافقت کے قیدی رہیں گے۔ اس مقام پر آپ دوسرے لوگوں کی خرابیاں' برائیاں اور ان کے پاپ ڈھونڈتے رہیں گے۔

خدا نے ہم کو خوبیاں اور خصوصی Talent اور نیکی کا اس لیے نہیں دیا کہ ہم اسے وقت بے وقت استعمال کر سکیں یہ سب کچھ اس لیے مرحمت فرمایا ہے کہ ہم اسے دوسرے لوگوں میں تقسیم کر سکیں۔ (میں اپنے پاؤں اس لیے نہیں دھوتا کہ میرے چہرے سے خوبصورت نظر آئیں)۔

عاجزی کے اندر ہی آزادی ہے بلکہ یہی سب سے بڑی آزادی ہے۔ جب تک آپ اپنے خیال وجود کی حفاظت کرتے رہیں گے اور اس کو تقویت پہنچاتے رہیں گے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتے رہیں گے آپ اطمینان قلب سے بہرہ ور نہ ہو سکیں گے۔

جب کسی شخص کو اس کی عاجزی اور Huminity اس کے وجود' اس کے کام' اس کی شہرت سے علیحدہ کرتی رہے

گی اس کو پتہ چل جائے گا کہ مکمل خوشی اور مکمل خورسندی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب ہم اپنے آپ کو اور اپنے وجود کو فراموش کر دیتے ہیں۔ (نشہ + بھنگ + چرس + پاؤڈر) جب ہم کو اپنے آپ کی' اپنے وجود کی' اپنی کارکردگی کی' اپنی شہرت کی اور اپنے انا کی خبر نہیں رہتی تو ہم خالی خولی بانسری کی طرح صاف ستھرے اور تھوتھے ہو کر خدا سے وابستہ ہو سکتے ہیں۔ صرف اس کے لیے' محض اس کی ذات کے لیے' جو شخص غریب نہیں' ننگا بچا اور نادار نہیں اس کی روح غیر شعوری طور پر خدا کے بجائے اپنی شو بھا کرنے اور اپنی مہما گانے کی فکر میں لگی رہے گی۔ وہ شخص اس لیے نیک ہوگا کہ اپنی نیکی کو دیکھ کر خوش ہو سکے اور اس کے درشن کرتے ہوئے اس کی توصیف کر سکے۔

اکثر اوقات آپ نے یہ بھی تجربہ کیا ہوگا کہ بہت ہی نیک اور بے حد مقدس آدمی بڑے اڑب ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ گزارا کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کبھی کبھی ایسے لوگوں کو اجازت دے دیتا ہے کہ وہ اپنی تقدیس اور بزرگی حاصل کر چکنے کے بعد بھی اپنی کمزوریاں' خامیوں اور اپنی شخصیت کے داغ دھبوں کو اسی طرح برقرار رکھ سکیں۔ ایسا کرنے سے ان کی بزرگی دوسروں پر ظاہر نہیں ہو پاتی اور کئی مرتبہ خود اپنے آپ پر بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس داغدار شخصیت اور ایسا روگی وجود رکھنے سے لوگ ان پر آوازے کستے رہتے ہیں۔ ان کی برائیاں بیان کرتے ہیں اور ان پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اس سے ان میں عاجزی' رقت' سلوک اور سبھاؤ پیدا ہوتا ہے اور اس عمل سے ان کے درجات بلند ہوتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر کریں کہ ابھی آپ بزرگی میں داخل نہیں ہوئے۔ یہ بڑا جوکھوں کا کام ہے لیکن سچی بات یہی ہے کہ اصل کام بزرگی اور تقدس ہی ہے باقی سب جھوٹ ہے۔ جو لوگ دوسروں کے ساتھ اپنا موازنہ ترک کر دیتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ مسابقے سے اور مقابلے میں داخل نہیں ہوتے وہ بہت جلد اللہ والے ہو جاتے ہیں۔

صاحب بصیرت تنہائی کی زندگی اس لیے نہیں بسر کرتا کہ وہ لوگوں سے جدا ہونا چاہتا ہے یا ان کی بک بک سے پرے ہو کر سکون کے لمحات گزارنا چاہتا ہے۔ وہ تو صحرا میں یا گپھا میں یا پہاڑ کی غار میں رہ کر تنہائی کی زندگی اس لیے بسر کرتا ہے کہ اُسے لوگوں کو معلوم کرنے کا اور انہیں محسوس کرنے کا ڈھنگ عطا ہو جائے۔ وہ ان کی بہتر طور پر خدمت کر سکے اور اچھے انداز میں نگہداشت کر سکے لیکن یہ اس کی ثانوی خواہش ہوتی ہے۔ اصل خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ وہ خدا کو پا سکے اسے ڈھونڈ سکے اور اس سے قریبی علاقہ پیدا کر سکے۔

تنہائی میں داخل ہونے کا ایک ہی رستہ ہے اور وہ بھوک اور پیاس پیدا کر کے اور روزے کی کیفیت سے دوچار ہو کر پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص ایک ایسی سمت میں بڑھ جاتا ہے جو افق کے اُس پار ہوتی ہے۔ اس مقام پر کوئی جہت باقی نہیں رہتی جسے وہ اختیار کر سکے۔ وہ ایک ایسی بستی میں اتر جاتا ہے جس کا مرکز تو ہر جگہ' ہر علاقے اور ہر رقبے میں ہوتا ہے لیکن اس کا محیط Circumference کہیں بھی نہیں ہوتا۔ اس محیط بیکراں سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے سفر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ سکون اور سکوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبھی اس کی گیرائی کا علم ہو سکتا ہے۔ اب اسی سکون اور اسی سکوت میں پیچیدہ اور Activitiy کا علم شروع ہوتا ہے۔ یہیں آپ کو پہلی بار اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ حرکت کے بغیر عمل کیسے وجود میں آ سکتا ہے اور سکوت میں عمل در عمل کی تیزی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ وہ شدید محنت کیسے اختیار کی

جا سکتی ہے جو مکمل اطمینان اور بے کارکردگی کے اندر سے جنم لیتی ہے۔ وہ نظر جو گھپ اندھیرے کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک سیرابی Fulfillment جس کی حدیں Infinits تک پہنچتی ہیں۔

یوں تو ایسی تنہائی اور ایسی علیحدگی دنیا کے کسی بھی مقام' کسی بھی جگہ' کسی بھی گوشے میں مل سکتی ہے لیکن بابوں نے اس کے کچھ اصول متعین کر رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے کم از کم ایک کمرہ' ایک کوٹھڑی یا ایک تہہ خانہ ہو جہاں کوئی بھی آپ کو تلاش نہ کر سکے' کوئی بھی آپ کے پیچھے نہ آ سکے۔ آپ کو ڈسٹرب نہ کر سکے۔ آپ سے کسی قسم کا رابطہ نہ کر سکے۔ آپ اپنے اردگرد لپٹے ہوئی دنیا کے سارے بکتر بند اور پٹیاں اور کسی ہوئی پٹیاں کھول کر آرام سے بیٹھ سکیں۔ لوگوں کی جانب سے اور لوگوں کی طرف کھلنے والی ساری نظریں سارے آوازیں سارے ذائقے مسدود ہو جائیں اور آپ صرف آپ ہو کر بیٹھ جائیں۔

جب آپ کو ایسی جگہ مل جائے تو اسے خوشی سے قبول کر لیں اور اس کے ساتھ محبت کرنا سیکھیں اور اگر اسے وقتی طور پر چھوڑنا بھی پڑے تو چھوڑ کر اور اپنا کام کر کے جلدی سے واپس اسی جگہ آ جائیں۔ کچھ بھی ہو اور کیسی بھی راحت ملے کسی اور مقام کو اس جگہ پر ترجیح نہ دیں۔ بس یہی آپ کی غار رحمت اور غار سفیر ہے۔

یہ تو ہوئی باہر کی تنہائی کا دعویٰ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کو اندر کی تنہائی اس وقت تک نصیب نہیں ہوگی جب تک آپ اپنے ساتھ پکا عہد کر کے اس پر سختی سے عمل نہ کریں کہ ان تمام تعلقات اور رشتوں اور ناتوں کو اور ان تمام منطقوں کو ترک نہ کر دیں کہ جو وقت اور Space زمان و مکاں کے اندر آپ نے پھیلا رکھے ہیں۔

جہاں تک ممکن ہو ہلے گلے اور خوش فکری اور خوش طبعی کی محفلوں سے گریز کریں۔ ایسی محفلوں سے اجتناب کریں جہاں لوگ ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور ان کی ٹانگ کھینچنے کے لیے جمع ہوتے ہیں جہاں لوگ دوسروں کا ٹھٹھا اڑانے اور دوسروں کی تضحیک کرنے اور اوپر سے تالیاں بجانے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ دوستی کے جھوٹے دعوے اور یگانگت کے کوڑے بھرم رکھنے کا عکس مہیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تحریروں سے ان کی کتابوں اور رسالوں سے گریز کریں۔ ہاں اگر آپ کو یہ یقین ہو کہ آپ اپنے مسلک پر سختی سے کاربند ہیں تو یہ دیکھنے کو کہ ان دنیاداروں کے درمیان کیا ہو رہا ہے ان کی تحریریں دیکھ لیں مگر صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے۔ اخبار تفریح اور معلومات کا ذریعہ نہیں ہیں۔ یہ عقوبت خانے اور شاہی قلعے ہیں جو صبح ہی صبح آپ کو شکنجے پر کس لیتے ہیں اور پھر دن بھر آپ کو درے مارتے ہیں۔ اسی طرح ریڈیو اور ٹی وی سے بھی اجتناب کریں۔ ان کے گانے اور ان کے اعضائے بدن کے کرب اور کسرت سے بھی پرہیز کریں اور جس بدنی دکھ میں یہ رقص کرتے ہیں اس سے عذر کریں۔ وہ بظاہر بڑا لذیذ نظر آتا ہے لیکن اندر کرب سے بھرا ہوا ہے۔ کبھی ان کے سگریٹ نہ پئیں۔ جو مشروبات یہ پیتے ہیں وہ نہ پئیں اور جن کھانوں کو یہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور تعریف کر کر کے کھاتے ہیں وہ بھی نہ کھائیں۔ تمہارے باطن کا سفر رک جائے گا۔ ان کے رسالوں اور اخباروں میں چھپی ہوئی تصویریں دیکھ کر اپنی زندگیوں کو مشکل میں نہ ڈالیں۔ اپنی نظر صاف رکھیں' کان بند رکھیں اور ذہن پاکیزہ رکھیں۔ اللہ کی پیدا کردہ صاف شفاف ہوا میں سانس لیں۔ کام کریں محنت کریں لیکن اللہ کے آسمان تلے' ان لوگوں کی چھتوں تلے' ان کے ہوٹلوں

اوران کی محفلوں میں نہیں۔

جس طرح کئی شاعر نہیں اسی طرح بہت سے مذہبی لوگ مذہبی نہیں ہوتے۔ وہ ساری عمر کوشش بھی کرتے رہیں تو بھی اپنے دعوے کو نہیں پہنچ پاتے۔ ایسے لوگ اپنے ذہنوں اور بدنوں کو ابھار ابھار کر اور للکار للکار کر تھکا دیتے ہیں۔ دوسرے شاعروں کے اور دوسروں بزرگوں کے لبادے اوڑھ اوڑھ کر دکھاتے ہیں لیکن ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔

اصل میں لوگ اپنے آپ کو جلد سے جلد بڑا ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسے محدب شیشے کی تلاش میں ہوتے ہیں جو ان کی شخصیت پر رکھ کر انہیں بڑا ثابت کیا جائے۔ یہ ضرورت ان کو اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ جلد سے جلد پاپولر ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن تیزی اور تاولی سے نہ بڑے آرٹسٹ پیدا ہوتے ہیں نہ بڑے بزرگ!

بڑے بزرگوں اور بڑے بابا لوگوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان میں عاجزی بھی ہوتی ہے اور Integrity بھی۔ اور یہ دونوں آمیختہ ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ اور ایک بھگت دوسروں سے اس وجہ سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ Humble ہوتا ہے۔ عاجز ہوتا ہے اور عاجزی کی پہچان یہ ہے کہ انسان اس صورت میں نظر آئے جس صورت حال میں وہ خدا کے سامنے پیش ہوا ہو۔ جو شخص ہر وقت خدا کی حضوری میں پیش رہتے ہیں وہ اندر سے بہت سے عاجز ہوتے ہیں اور ایک بھگت کی نشانی یہ ہے کہ لوگوں کے انداز نشست و برخاست۔ ان کے رنگا رنگ کھانوں' ان کے مکانوں اور ان کی تفریح گاہوں اور ان کی تصویروں اور کیلنڈروں سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے اندر یہ خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی کہ میں اس طرح سے رہوں یا یہ سب کچھ میرے پاس بھی ہو۔ وہ تو ہر وقت ایسی چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے ایسے مکانوں اور محلوں اور میناروں اور فرنیچر اور ڈیکوریشن اور سیڑھیوں اور لفظوں کی کھوج میں رہتا ہے جو اُسے خدا سے واصل کر سکیں۔

نیکی کا تصور لوگوں کو اپیل نہیں کرتا۔ اصل میں وہ نیک ہو کر رہنا پسند نہیں کرتے۔ اچھے ہو کر زندگی گزارنا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر ان کو یہ بتایا جائے کہ حضرت علامہ نیک عمل کو عملی ذہانت کی عادات اور ان کی خواص تصور کرتے تھے تو وہ آپ کے ان کہے ہوئے الفاظ پر البتہ کان دھریں گے۔ اصل میں وہ ہر اُس شے کے خیال سے خوش ہوتے ہیں جو ان کو چالاک بنانے کا عہد کرے۔ ہمارے ذہین کوؤں کی طرح ہوتے ہیں وہ ہر چمکتی ہوئی شے کو اٹھا کر اپنے گھونسلوں میں لے آتے ہیں۔ ان کے گھونسلے ایسی تکلیف دہ اشیاء سے بھرتے جاتے ہیں اور وہاں آرام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے لیکن وہ اور چمکدار چیزیں جمع کرتے جاتے ہیں

لیکن..... ایک شاعر اپنی ذات کے اندر داخل ہوتا ہے محض اس واسطے کہ وہ کچھ تخلیق کر سکے اور ایک صوفی اس لیے خدا میں داخل ہوتا ہے کہ وہ بھی کسی روز تخلیق کیا جائے۔

میں ولایت سے لوٹ کر آیا تو دو خواہشیں تھیں۔ بہت زیادہ فیشن ایبل' اپ ٹو ڈیٹ اور ماڈرن ہو کر رہنے کی خواہش اور روحانیت کے علم کو سمجھنے کی آرزو۔ فیشن ایبل ہونے کے لیے میں نے گالف کی سکیم اپنا لیا اور Irons کا ایک

سیکنڈ ہینڈ ہاف سیٹ خرید لیا۔ روحانیت کے لیے حضرت سائیں بابا جی نور والے کے ساتھ تعلق گانٹھ لیا۔

عجیب اتفاق سے کہ بابا جی کا ڈیرا گالف گراؤنڈ کے بالکل ساتھ تھا۔ ادھر سے نکلے ادھر چلے گئے۔ ادھر سے جی بھرا تو ادھر آ گئے۔ میرے لیے دونوں ہی کام مشکل تھے۔

ان دنوں بابا جی کے ایک ارشاد پر کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں پر میرا جھگڑا چل رہا تھا۔ لاڈلا تھا۔ رعایت ملتی تھی۔ ارشاد میں طرح طرح کے کیڑے نکالتا تھا۔ موجودہ Imperical علم کی مثالیں بیان کرتا تھا۔ بابا جی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ کبھی جھڑکی نہیں دی۔ سرزنش نہیں کی۔ محفل سے نہیں نکالا۔ کوئی فتویٰ نہیں لگایا۔ ہنستے رہتے اور میری بیہودہ گوئی سنتے رہتے۔ میں Cause of Effect کا بندا تھا۔ دلیل کا پروردہ تھا۔ ان کی بات کیسے مان لیتا۔

ڈیرے پر بہت سی باتیں بے دلیل بھی ہوتی تھیں۔ ثبوت مانگو تو مہیا نہیں کیا جاتا تھا۔ اعداد و شمار کا کوئی رواج نہیں تھا۔ Sampling سے وہ لوگ ناواقف تھے۔ ہم لوگ مشاہدے کے منطق کے اور قیاس کے علمبردار تھے۔ پھر ہم بغیر جانے بوجھے بغیر تجربہ کیے کیسے مان لیتے کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔ بڑی مشکل تھی۔ بڑے امتحانی دن تھے۔ روز روز آتے تھے اور گھبرا دیتے تھے اور الجھا لیتے تھے۔

ایسی ہی سردیوں کی ایک دوپہر میں ڈیرے سے اٹھ کر گالف گراؤنڈ چلا گیا۔ صبح کی دھوپ' خوشگوار ٹھنڈی ہوا۔ سردیوں کا موسم' چھٹی نہ ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ گراؤنڈ میں۔

میں نے گیم کھیلنے کے بجائے ایسے ہی گھومنا پسند کیا۔ سردیوں کے موسم میں ایسی خوشنما دھوپ اور خوشگوار موسم کم ہی ملتا ہے۔ ایک ٹکڑی گالف کھیل رہی تھی۔ میں بھی ان تک پہنچ گیا۔ ایک سنہرے بالوں والا انگریز اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور Agent the hole کھیل رہا تھا۔

میں نے دیکھا کیڈی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے بدن کے ساتھ چھوتا ہوا سا۔ پھر وہ گیند کے پاس پہنچ کر اس گورے کو مطلوبہ Stick دے کر پیچھے ہٹ جاتا۔ وہ شاٹ کھیلتا اور اپنی گیند کی شوکر میں نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھتا اور مطلوبہ مقام کی طرف چل دیتا۔

ہم اس کی گیم سے لطف اندوز ہوتے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ گورا تھا پھر سنہرے بالوں والا تھا۔ پھر گیم ان کی وضع کردہ تھی اس نے تو اچھا کھیلنا ہی تھا۔

جب گیند Green پر پہنچی تو Hole سے کوئی پندرہ فٹ دور تھی۔ پندرہ نہ سہی بارہ فٹ دور ہوگی اس سے کم نہیں۔

کیڈی نے اُسے پٹر نکال کر دیا۔ اس نے پٹر گرین پر رکھ کر اس پر اپنے بدن کا ذرا سا بوجھ ڈالا۔ پھر وہ ذرا نکلا۔ لیکن وہ گیند کی سیدھ میں نہیں تھا۔ پھر اس نے پٹر دو تین مرتبہ گرین پر بجایا اور اپنا رخ سیدھا کیا پھر اس نے کم تولے سیدھے سبھاؤ بال کو ٹھوکا دیا اور وہ سیدھا چلتا ہوا جا کر ہول کے اندر اتر گیا۔ ہم سب نے تالیاں بجائیں۔ گورے نے ہاتھ اوپر اٹھا کر اور سر جھکا کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور گھوم کر ہمارے سامنے سر جھکا کر اوپر اٹھایا۔ ہم نے دیکھا گورا اندھا تھا اور اس کی آنکھوں کی دونوں پتلیاں غائب تھیں۔

اکرام صاحب نے حیران ہو کر کہا ''مسٹر Osuald آپ بالکل نابینا ہیں پھر آپ گولف کس طرح سے کھیل سکتے ہیں؟''

گورے نے ہنس کر کہا یہ آپ کو احمقانہ بات لگے گی لیکن یہ ہے حقیقت You have to be blind to see۔

جب تک آپ کثیر المقاصد ہیں اور آپ کی توجہ اردگرد کی بے شمار چیزوں پر ہے آپ اپنے ٹارگٹ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ جب آپ نے اردگرد کی اشیا سے منہ موڑ لیا تو آپ کی توجہ ایک مرکز پر مرکوز ہو گئی۔ یہ مرکز Blindnes سے حاصل ہوتا ہے۔ بھیتر کا پٹ تب کھلے جب باہر کے پٹ دے بند۔

اسواللہ کی گالف کی وجہ سے اس کو کھیلوں کا سامان فروخت کرنے والی ایک دکان میں نوکری مل گئی۔ دکان گھر سے دور تھی۔ اکیلا ایک میل کا سفر کر کے ٹرام کے ذریعے بڑے چوک میں پہنچ کر اترتا۔ سیدھے ہاتھ کو مڑ کر جب اُسے ایک بیکری سے تازہ تازہ ڈبل روٹیوں کی خوشبو آنے لگتی تو وہ سمجھتا کہ صحیح مقام پر پہنچ گیا ہے۔

وہاں سے آگے پٹرول پمپ اور ڈیزل کی خوشبو آنے لگتی۔ یہاں سے بائیں گھوم کر وہ اصل سڑک پر آ جاتا۔ پھر سڑک پر چلتے ہوئے وہ جب تیسرے سپیڈ بریکر پر پہنچتا تو دکان کے قریب ہوتا۔

بڑے سال ادھر کی بات ہے کچھ ایسا ہی موسم تھا۔ گرمیاں جا رہی تھیں اور سردیوں کی آمد آمد تھی لیکن ابھی سردیاں بہت دور تھیں جس طرح سے وہ دور تھیں اسی طرح سے گرمیاں بھی کافی دور ہو چکی تھیں۔ بہار کا موسم تھا۔ اور پھر حیدر آباد میں تو کسی قسم کا موسم ہو بہار ہی کا موسم ہوتا ہے خصوصاً شام کے وقت۔ ہم دونوں میاں بیوی حیدر آباد میں تھے اور یہ شام ہماری بالکل آزاد تھی۔

میں نے بانو سے کہا بھٹ شاہ چلتے ہیں۔ سائیں کو سلام کرتے ہیں۔ سلام کر کے واپس آ جاتے ہیں۔ یہ تھوڑی دور تو ہے۔ ہم اپنے میزبان سے اس کی موٹر اور خوش الحان ڈرائیور لے کر بھٹ شاہ روانہ ہو گئے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار پر پہنچے تو وہاں لوگوں کا اژدہام تھا اور رات کے دس بج چکے تھے۔ مزار کے سامنے کھلی چاردیواری میں ٹھنڈے فرش پر بیٹھے پرانی وضع کے موسیقار شاہ کا کلام سنا رہے تھے۔ بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ بہت سے لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ سو رہے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کو ساتھ لپٹائے کچھ سو رہی تھیں کچھ سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ عجب گھر کا سا سماں تھا۔ سب لوگ آنگن میں موجود تھے اور چاند کی روشنی سب پر یکساں پڑ رہی تھی۔ ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ شاہ کی وائی شروع ہوئی ایک خادم وحات کے بڑے سے گلاس میں تولہ ڈیڑھ تولہ دودھ ڈال کر لایا اور اس نے ہم کو ایک ایک گلاس دیا۔ بانو نے گلاس میں جھانک کر دیکھا دودھ تھا۔ پھر اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے ایک جانکار سیانے کی طرح کہا ''شاہ کی وائی شروع ہوتی ہے تو سب زائرین کو تھوڑا تھوڑا دودھ پلاتے

ہیں۔ یہ برکت کی بات ہے۔ پی جاؤ۔ اس نے ایک ہی لمبا سا گھونٹ بھرا اور سارا دودھ پی گئی۔ میرے دودھ میں ایک چھوٹا سا تنکا تھا۔ اس نے مجھے بہت ستایا۔ جب وہ قابو میں نہ آیا تو میں تنکے سمیت دودھ پی گیا اور مجھے اس فتح مندی پر بڑی خوشی ہوئی۔

بانو نے کہا ''آپ یہاں بیٹھیں میں درگاہ کا چکر لگا کر آتی ہوں۔''

جو معاف کر سکتا ہے وہ اس پل کو توڑتا ہے جو اسے انسانوں سے اور مخلوق خدا سے ملاتا ہے اور لوگوں سے جوڑتا ہے۔ بہت ممکن ہے اس کی اپنی زندگی میں ایک ایسا وقت جائے کہ اسے لوگوں سے ملنے کی ضرورت پڑے تو وہ ان سے کیسے ملے گا۔ اس نے تو پل توڑ دیا ہو گا اور خود اپنے ہاتھوں سے توڑا ہو گا۔

برداشت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب ہم اکثریت میں ہوتے ہیں اور جرات کا اس وقت جب ہم اقلیت میں ہوتے ہیں۔

ایک نرس نے مجھے بتایا اس کا نام فرخندہ بڑی ذہین بڑی شفیق تھی کہ اکثر لوگ خواہ مخواہ زندگی کی راہ پر چلتے ہوئے موت سے خوفزدہ رہتے ہیں حالانکہ موت بھی زندگی کی طرح ایک قدرتی اور خوشگوار شے ہے۔ میری ساری زندگی میں بھی ایک ہی مریضہ ایسی آئی جو موت سے بے حد خوفزدہ تھی۔ اس نے اپنی بہن سے کچھ ایسی زیادتی کی تھی کہ اب اس کا بڑا مشکل تھا۔ جو لوگ عمرہ کے سفر پر جانے سے پہلے معافیاں مانگ لیتے ہیں اور خوش خوش روانہ ہو جاتے ہیں اسی طرح زندگی کے سفر پر جانے سے پہلے جنہوں نے روانگی کے کاغذات پر معافی کا ویزا لگوا لیا ہوتا ہے ان کی آنکھوں میں ایک عجب طرح کی چمک ہوتی ہے اور وہ عجیب خوشگوار اور خوبصورتی سے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارے بابے کہتے ہیں کہ بندے کا گناہ اللہ کے گناہ کے مقابلے میں بہت بڑا اور بہت سخت ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی انسان کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور اس کی ناخوشی کا موجب بنتے ہیں تو پھر جب کبھی آپ کو ہوش آتا ہے اور آپ معافی مانگنے کے موڈ میں ہوتے ہیں تو اس آدمی کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا کہ کدھر سے آیا تھا اور کدھر گیا۔ لیکن اگر آپ خدا کا کوئی قصور کرتے ہیں کوئی اللہ کا گناہ آپ سے سرزد ہوتا ہے تو اللہ سے بڑی آسانی سے معافی مانگ لیتے ہیں کہ ہر وقت موجود ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔

اس نے کہا مر رہی ہوں۔ آخری وقت ہے معاف کر دو۔ کہا میں نے معاف کیا لیکن اگر میں صحت یاب ہو گیا اور تو بچ گئی تو پھر اس سے کہہ دینا کہ اپنا سنبھالا کر لے میں اسے چھوڑنے کا نہیں۔

اگر آپ کا سفر لمبا ہے اور آپ تیزی سے سفر کرنا چاہتے ہیں تو Travel light! اپنے وجود سے ساری نفرتیں

ساری کدورتیں' گلے شکوے' ماضی کی کہانیاں' نامعافیاں اور انتقامی آرزوؤں کے بوجھ اتار کر چلیں۔ بڑا مزا آئے گا سفر آسانی سے کٹے گا۔

آپ مجھ سے اکثر صوفی کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ صوفی کون ہوتا ہے۔ کیا ہوتا ہے اور اس کی تعریف کیا ہے۔ میں کہتا ہوں صوفی 'صوفی ہوتا ہے۔ اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی اس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا کوئی مترادف نہیں' کوئی ہم معنی لفظ نہیں۔ آپ صوفی بن سکتے ہیں۔ صوفی رہ سکتے ہیں۔ صوفی کو جان سکتے ہیں لیکن ذہن کے زور پر عقل کی' زور پر کتاب پڑھ کر ڈکشنری میں دیکھ کر صوفی کی تفسیر نہیں کر سکتے۔ صوفی کو جاننے کے لیے صوفی بننا ضروری ہے۔ آپ اس کا ذائقہ چکھ سکتے ہیں لیکن اس ذائقے کو سمجھ نہیں سکتے۔

اگر آپ تصوف کا نوالہ نہیں توڑ سکتے تو اسے چکھ تو سکتے ہیں لیکن اس کے چکھنے سے پیاس اور بڑھے گی اور آپ رک نہیں سکیں گے۔

تصوف ایک انوکھا سحر ہے جو کسی دوسرے فرد سے آپ میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ کتاب سے یا ڈکشنری دیکھ کر حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا ایک سلسلہ ہوتا ہے ایک لڑی ہوتی ہے اور یہ لڑی سے لڑی میں منتقل ہوتا جاتا ہے۔

"بابے اور ڈیرے"

جب میں بابا لوگوں کا ذکر کرتا ہوں تو آپ کے ذہن میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا قصوروار میں ہوں۔ آپ سمجھتے ہیں بابا ایک جٹا دھاری بڑی عمر کا آدمی ہوتا ہے جس نے ٹخنوں تک لمبا چغہ پہن رکھا ہے۔ سر پر چوگوشیا ٹوپی ہے۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالائیں ہیں اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سر جھٹک کر اللہ ہو کے نعرے مارتا ہے اور ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو خوفناک نظروں سے دیکھتا ہے۔ ایسے بابے عام زندگی میں بھی ہوتے ہیں لیکن اس کاسٹیوم اور اس انداز کے لوگ زیادہ تر فلموں' ڈراموں اور تحریری افسانوں میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ بابے نہیں ہوتے' میری طرح کے غرض مند لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک مخصوص بہروپ بھرا ہوتا ہے۔

جو شخص: مرد یا عورت' جوان یا بوڑھا' بچہ یا ادھیڑ۔ کسی دوسرے کو آسانی عطا کرے اس کو ہم بابا کہتے ہیں۔ یہ بابے وقتی بھی ہوتے ہیں' لمحاتی بھی' عارضی بھی اور مستقل بھی۔ کچھ ساری زندگی میں ایک مرتبہ کسی دوسرے کو آسانی سے ہمکنار کرتے ہیں کچھ عمر بھر لوگوں کی مشکلات آسانیوں میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ کچھ کبھی کر دیتے ہیں کبھی نہیں۔ یہ سب بابوں کی ذیل میں آتے ہیں۔ انسان کی مشکل کو آسانی میں تبدیل کرنے والا بابا کہلاتا ہے۔ خواہ وہ تھری پیس سوٹ پہنتا ہو' جو گر جینز پہنتا ہو' لمبا چغہ پہنے' گلے میں مالائیں ہوں' ہاتھ میں تسبیح ہو یا گھون مون موٹا ہو یا سوکھا پتلا سینک سلائی ہو۔

باباجی کو ہم پر ایک اعتراض تھا کہ ہم دنیادار لوگ رہبانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور خانقاہوں کی طرح مخلوق خدا سے مل جل کر نہیں رہتے۔ ہم کو لوگوں سے ملتے ہوئے خوف آتا ہے اور ہم ان کو پرے پرے رکھ کر زندگی گزارتے ہیں۔ دفتروں میں پی اے ہوتے ہیں' چپراسی ہوتے ہیں۔ اردلی ہوتے ہیں۔ گھروں میں بیویوں کو ملازموں کے حوالے کرتے ہیں۔ ان کی ساری خدمت ان سے کرواتے ہیں۔ وہ خود بھی الگ الگ رہنا پسند کرتی ہیں۔ ڈاکٹر کے پاس جانا' بازار جانا' اماں کے گھر جانا' گروسریاں لینے جانا' وغیرہ وغیرہ۔ میں ان کی یہ بات سن کر بہت ہی حیران ہوا کیونکہ ساری کتابوں میں اور سارے لٹریچر میں اور ساری تاریخ میں یہی لکھا ہے کہ صوفی لوگ راہب ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں سے لاتعلق ہو کر تسبیح پھیرتے ہیں۔ اللہ سے لو لگتے ہیں' بندے سے منہ پھیرتے ہیں۔ لیکن یہاں آ کر ایک اور ہی شگوفہ کھلا کہ ہم دنیا دار لوگ راہب' بے تعلق' بے عمل اور بے...... بے ہوتے ہیں۔

فرمایا لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا اور ان کی ضرورتیں پوری کرنا ہی عبادت ہے۔ وہ آپ کی محبت سے اور شفقت سے محروم رہیں گے تو معاشرے میں کال پڑ جائے گا اور آپ کی ضرورتیں بھی رک جائیں گی۔ صرف منہ سے بات کر کے لوگوں کی خدمت نہیں ہوتی اس میں عمل بھی ہونا چاہیے۔ ہمارے جتنے بھی ادیب اور شاعر تھے عملی زندگی بسر کرتے تھے۔ امام غزالی پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صاحب مال ہوئے لوگوں سے ملے جلے۔ شیخ اکبر ابن عربی' فریدالدین عطار' رومی' ادھر ہندوستان میں داتا صاحب' معین الدین چشتی حضرت بختیار کاکی یہ سب لوگ کام کرتے تھے۔ مخلوق خدا کے کام آتے تھے۔ ان کی بہتری کے لیے ان کے ہاتھ بٹاتے تھے۔ کیونکہ یہ حضور کی سنت تھی اور یہ سب لوگ اس سنت پر عمل کر کے ہی آگے بڑھ سکتے تھے۔

میں نے کہا ہم شاعر اور ادیب بندوں ہی کی خدمت کرتے ہیں۔ انہی کے غم میں گھلتے ہیں۔ انہی کے گن گاتے ہیں۔ جتنے بھی ایڈیٹوریل لکھے جاتے ہیں' کالم رقم ہوتے ہیں' افسانے تحریر ہوتے ہیں' شاعری ہوتی ہے' غزلیں' نظمیں' مرثیے ترانے لکھے جاتے ہیں سب لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ فیض صاحب کسی تنور سے روٹیاں لگوا کر لا رہے ہیں' نور بی بی بیوہ اور اس کے بچے بھوکے ہیں اور ان کا کام کرنے والا کوئی نہیں۔ قتیل شفائی کسی کو پیٹھ پر لاد کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں نہیں لے جاتے۔ میں اور ممتاز مفتی کسی یتیم کی فیس جمع کرانے نہیں جاتے۔ ہم انسانوں کے لیے نہیں انسانیت کے لیے کام کرتے ہیں اور یہ افراد کے لیے کام کرنے سے بہت بہتر کام ہے۔ ہم سسٹم بدلتے ہیں' بڑے کام کرتے ہیں' آپ لوگوں کی طرح لنگر نہیں کھلاتے پھرتے۔

فرمایا چھت پر چڑھنے کے دو طریقے ہیں ایک تو سیڑھی لگا کے زینہ بہ زینہ اور دوسرا پھٹا لگا کے ڈھلوان پر آگے بڑھ بڑھ کے اوپر اٹھ کے۔ سیڑھی والا تو یہ دیکھے گا کہ میں اتنے ڈنڈے چڑھ گیا اور اتنے باقی ہیں اور پھٹے والا دیکھے گا ابھی چھت دور ہے اور ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ یہی حال دین کا ہے کچھ لوگ تو سمجھتے ہیں کہ اللہ کی طرف بڑھنے میں

چڑھ گئے اس کا شکر ہے اور ہمیں بھی شاباش ہے کہ ہم نے اتنی کوشش کر لی۔ اب دو تین ڈنڈے اور باقی ہیں
میں گے۔ لیکن پہنچنے لگا کر چڑھنے والا کہتا ہے کہ ابھی تک پتہ نہیں کہ کتنی منزل اور رہ گئی ہے۔ جب تک اوپر
نہیں پہنچا جاتا یہی سمجھیں گے ابھی سفر جاری ہے۔

بابا جی نے پوچھا "ایک تیز رفتار گھوڑا ایک سست رفتار گھوڑے سے دس گنا اچھا کیوں ہوتا ہے۔"
"وہ اس لیے سرکار" چھوٹے صوفی نے کہا کہ "اس کی رفتار سست رو گھوڑے سے دس گنی ہوتی ہے۔"
"شاباش! لیکن اگر وہ اپنی راہ سے بھٹک جائے تو پھر وہ دس گنا تیزی سے بدراہ پر بھی نکل جاتا ہے۔" باباجی نے کہا۔
"ہاں جی یہ تو ہے سرکار۔"
"لیکن ایک بات نہ بھولنا بچہ کہ جب اس تیز رفتار راہوار کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ غلط راستے پر آ گیا ہے تو پھر وہ دس گنا تیزی سے سرپٹ بھاگ کر صحیح منزل کی طرف بھی نکل جائے گا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب ایک پاک دل انسان نادم ہوتا ہے اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے تو اپنی منزل اس تیزی سے دوبارہ حاصل کر لیتا ہے لیکن سست رو آدمی سے یوں نہیں ہوتا۔

"جو پاک کا ساتھ دیتا ہے وہ پاک ہو جاتا ہے۔"

میں نے مفتی سے پوچھا کہ یہ جو تم ہر وقت کسی نہ کسی صوفی کی بات کرتے رہتے ہو اور اس کا نام لے کر اس کا ذکر کرتے ہو تو تم کو اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ کہنے لگا اس سے مجھے ایک جسمانی Setisfaction ہوتی ہے گویا میرے وجود کے اندر ایک Tangible وزن در آیا ہے اور میں پہلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو وزن دار سمجھنے لگا ہوں۔ میں نے کہا وہ کس قسم کا وزن ہوتا ہے .... کہنے لگا یوں لگتا ہے جیسے کچے سونے کا ایک بڑا سا ڈلا ہو جو تکلیف کا باعث نہ ہو اور بدن کی بے وزنی دور کرتا ہو۔

قول کی حد تک نفس راضی رہتا ہے جب عمل کی حد شروع ہوتی ہے تو نفس بھاگتا ہے کیونکہ نفس خدمت کو قبول نہیں کرتا۔ (جب میں پہلے روز گیا تو پوچھا کیا کرتے ہو افسانہ نگار ہوں .....)
نفس انسانی وجود میں ایک کنٹرول کرنے والا پرزہ ہے۔ گراموفون گورنر پنکھے کا ریگولیٹر اے سی کا یونٹ کنٹرول' گاڑی کا سٹرنگ' جہاز کا جائروسکوپ' انسانی وجود کے اندر نفس ایک ریگولیٹر سمجھ لیں جو موقع کی مناسبت سے وجود کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ اس قدر سیانا اور چالاک ہوتا ہے کہ اس کو کسی قسم کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ آپ اپنا

گھر چھوڑ کر کسی کے حوالے کر کے مری سوات گئے۔ اپنے ملازموں کے سپرد کر کے گئے تو اس کی نگہداشت کرنے والے مالک بن گئے اور آپ سے پوچھنے لگے آپ کون ہیں۔ مکان آپ کا ہے۔ وجود آپ کا۔ ذات آپ کی ہے۔ نفس اس کا مالک بن کر ٹانگ پر ٹانگ رکھا بیٹھا ہے اور آپ کی منڑافنگ کر رہا ہے۔
نفس کی مرغوب ترین غذا قول ہے۔ بات کرنا' باتوں کے مینا تو تے بنانا' گفتگو کرنا' مضمون پڑھنا' مضمون لکھنا' کام تیار کرنا' دردمندی کے قصے بیان کرنا یہ سب قول ہے۔ گفتگو ہے' اس کا حال سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسی گفتگو سے اور بیان سے نفس بہت راضی رہتا ہے۔ سیاستدانوں کے لیکچر' مضمون نگاروں کے مضمون' دردمندوں کی دردمندی کی جائیں۔ اس سے سب کا نفس راضی ہوتا ہے' سننے والے کا بھی اور سنانے والے کا بھی۔

بابوں کے ڈیروں پر محبت کا بڑا ذکر ہوتا ہے۔ نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ حرف میں بھی اور عمل میں بھی۔
ایک دن میں نے پوچھا جناب یہ محبت ہوتی کیا ہے۔ باباجی نے فرمایا محبت دوسرے کے اندر چھپی ہوئی خوبی کا نقاب اتارنے کا نام ہے۔ جس شخص میں جو کوئی بھی خوبی ہے اس پر ایک چھلکا چڑھا ہوتا ہے۔ اس کی خوبی نظر نہیں آتی۔ اس چھلکے کو اتارنے کا نام محبت ہے۔ پردہ ہٹانے کا نام محبت ہے۔ سٹیج روشن کرنے کا نام محبت ہے۔
مائیکل اینجلو نے کہا پتھر کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ تودا سا ہوتا ہے۔ مجھے اس میں ایک تصویر نظر آتی ہے۔ میں غیر ضروری پتھر اتار کر پرے پھینکتا ہوں اور نیچے سے مجسم یا دیوتا نکل آتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔
بابوں کو Worthynes کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ خوبی خصائص تلاش کر لیتے ہیں۔ ایسی خوبی جس کا صاحب خوبی کو بھی علم نہیں ہوتا۔
بابے خرابی تلاش نہیں کرتے۔ کچھ عجیب سا علم ہوتا ہے۔ زندگی پر منطبق ہوتا ہے۔ کتاب میں نہیں ملتا۔

1933ء کے شروع کی بات ہے۔ میونخ کے ایک موسیقار نے آئن سٹائن کو بلجیم اکیڈمی کی معرفت خط لکھا اور موسیقار اور فنکار جس طرح سے ہوتے ہیں اس خط میں اپنے غموں کا اور دکھوں کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ دنیا کیا ہے اور میں کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ تو آئن سٹائن نے اس کو بڑے سبھاؤ سے جواب دیا کہ "میں وہی شخص آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں جس کے نام آپ نے بلجیم اکیڈمی کی معرفت مراسلہ ارسال فرمایا تھا۔ سنو بھائی اور میری مانو.... کبھی اخبار نہ پڑھا کرو۔ بس کچھ دوست ایسے بنالو جو تمہاری طرح سوچتے ہوں اور تمہارے ہم خیال ہوں۔ ہو سکے تو پرانے زمانے کے بڑے لوگوں کی تحریروں کا مطالعہ کرو کانٹ ہے' گوئٹے ہے' لیگ ہے.... پھر دوسرے ملکوں کی کلاسیکی تحریریں ہیں' ان سے لطف اٹھاؤ اور جب فراغت ہو تو میونخ کے گردونواح کے قدرتی حسن سے دلفریب مناظر سے تسکین بھی حاصل کرو۔ ہر وقت اس بھلاوے میں رہو کہ تم زندہ ہو اور مریخ کی مخلوق کے درمیان رہتے ہو لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کے گہرے جذباتی اور قلبی تعلق سے پرہیز کرتے رہو۔ اور پھر بھائی کچھ جانوروں کے ساتھ دوستی ضرور لگانا اس مخلوق سے بڑا پیار ملتا ہے۔ اتنا

کچھ کرنے سے تم ایک مرتبہ پھر ہشاش بشاش اور خوش باش ہو جاؤ گے پھر دنیا کو اور کوئی چیز تمہیں دق نہیں کر سکے گی۔

ہاں ایک بات اپنے ذہن میں رکھ لو اور پکی کرکے گانٹھ دے لو کہ دنیا میں ہر نفس اور شریف اور بھلا انسان ہمیشہ اکیلا اور تنہا ہی ہوتا ہے۔ تنہا یوں ہوتا ہے کہ علیحدگی میں بہتری اور بہتر اور شرافت کے ماحول سے لطف اندوز ہوتا رہے۔ میں گہری اور رفاقت کے جذبات سے سرشار تمہیں سلام بھیجتا ہوں۔

آئن سٹائن

آئن سٹائن کے نیچے دیئے گئے بیان پر ستمبر 1937ء کی تاریخ درج ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے یہ نوٹ کس کے لیے لکھا اور یہ بیان کہاں دیا۔ نہ ہی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کونسا تقاضا تھا جسے پورا کرنے کے لیے اس نے یہ تحریر لکھی۔ آئن سٹائن خط لکھنے اور خطوں کے جواب دینے کا بہت پابند تھا۔ کسی معمولی سے معمولی شخص کا خط موصول ہونے پر وہ اسے جواب ضرور بھجواتا تھا خواہ وہ جواب چند سطروں پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو۔

ایک اندازے کے مطابق آئن سٹائن نے اپنی یہ تحریر ''ونسٹن کی مجلس دینیات'' کی درخواست پر لکھی تھی لیکن یہ بات یقین سے نہیں کی جا سکتی۔ آئن سٹائن لکھتا ہے کہ:

ہمارا یہ عہد سائنسی افہام و تفہیم اور سائنسی کلیات کی تشہیر اور پھر ان دریافتوں کے تکنیکی طور پر صورت پذیر ہونے اور عملی شکل میں فراہم کرنے کا ایک درخشندہ عہد ہے۔ اس وقت کون ہے جو سائنسی معرکوں پر خوش نہ ہو۔ ان پر فخر نہ کرتا ہو اور ان کی قصیدہ گوئی میں مصروف نہ ہو لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ علم' ہنرمندی' کارروائی اور سائنس اور تکنیک ہی وہ ذرائع نہیں ہیں جو انسانیت کو خوشی' خوشحالی' وقار اور شادمانی سے سرفراز کر سکیں۔ اس وقت ہمیں گروہ انسانی کو شرف انسانی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے ان بزرگوں کے ارشادات کو ہر حال میں سائنس دانوں اور معروضی حقائق کے ماہروں سے بلند تر مقام پر رکھنا ہوگا جنہوں نے اخلاقی معیار اور انسانی اقدار کے اصول طے کیے ہیں۔ میرے حساب سے انسانیت کے محسنوں مہاتما بدھ' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات' سائنس دانوں' موجدوں اور تکنیکی ماہروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر انسان کو اپنی عزت' اپنی خوشیاں' اپنی بقا اور اپنا شرف عزیز ہے تو پھر اس کو پوری قوت اور بیداری کے ساتھ ان بزرگوں کے ارشادات گرامی کی حفاظت کرنا ہوگی اور ان کو ہر عہد میں زندہ رکھنا پڑے گا۔ خوشی اور خورسندی کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔

شہنشاہ شاہجہان نے ہاتھ سینے پر باندھ کر اور سر جھکا کر کہا ''یا حضرت میاں جیو آپ یہ اشرفیاں اپنے پاس رکھیں اور انکار نہ کریں۔''

فرمایا ''مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ کم از کم فی الحال ضرورت نہیں۔ جب بھی ان کی ضرورت ہوگی میں دارا کو تحریر بھیج کر منگوا لوں گا۔''

شاہجہان کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے درد بھرے لہجے میں کہا ''شاہا! میں مفلس اور بے نوا شخص ہوں۔

میرے پاس سوائے دولت کے اور کچھ بھی نہیں۔ باقی ہر طرف سے میری جھولی خالی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں صرف یہ اشرفیاں ہی پیش کر سکتا ہوں۔ چونکہ میرے پاس دینے کے لیے اور کچھ بھی نہیں اس لیے اگر آپ انہیں قبول نہیں فرمائیں گے تو میں سمجھوں گا آپ نے مجھے قبول نہیں فرمایا۔ میری ذات کو رد کر دیا ہے۔ مجھے منسوخ فرما دیا ہے۔ اگر میرے پاس دولت کے علاوہ اور کچھ ہوتا تو میں دل و جان سے حضور کو نذر پیش کرتا۔

بابا کون؟

ساہیوال کے سٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں ہم نے باباجی سے پوچھا: ''ہم ٹرین سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں۔''

فرمایا: ''ایک منٹ کی دیر ہو جانے سے تم سب کچھ ضائع کر دیتے ہو۔'' (سب کچھ ضائع ہو جاتا ہے)

مفتی نے کہا اور یہ جو تار برقی ہے۔ بابو صاحب گرٹ گرگٹ کر رہے ہیں' یہ کیا سکھاتا ہے۔

فرمایا: ''ہر ہر لفظ کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔''

مسعود نے کہا ''اور ٹیلی فون؟''

فرمایا: ''جو کچھ یہاں بولو گے آگے وہی سنائی دے گا۔''

کسی سخت نشست والی کرسی یا سٹول پر بیٹھو اور اپنی کمر اور گردن سیدھی رکھو۔ نشست اس طرح کی ہو کہ سر کمر اور چوتڑ ایک سیدھ میں رہیں۔ لیکن اگر آپ کمل آسن میں بیٹھ سکیں تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں۔ مگر اس میں بھی ریڑھ کی ہڈی کو سیدھ میں رکھنا ہوگا۔ اول اول کچھ مشکل پیش آئے گی مگر اس سے گھبرانا نہیں۔ نیچے کا دھڑ اس طرح سے ہو جیسے پسلیوں کے پنجرے نے سارا نیچے کا بدن اٹکا رکھا ہے۔ جب مشق ہو جائے گی تو پھر اس آسن میں خود ہی لطف آنے لگے گا اور یہ نشست آسان ہو جائے گی۔ آپ گھنٹوں اس طرح بیٹھے رہیں گے اور ذرا بھی تکان نہ ہوگی۔

اس کے بعد پرانایام طریق پر سانس لیں اور اپنے آپ کو مشق کے لیے تیار کر لیں۔ پرانایام کے وقت کھلے ہوئے گلابی رنگ کا تصور کریں اور اس کو اندر کھینچیں اور اسی طرح باہر نکالیں۔ یہ رنگ مشق ایک سے مشق سات تک کے لیے ہے۔

کمرے میں تیز اور آنکھوں کو چندھیانے والی روشنی نہ ہو لیکن مناسب روشنی ضرور ہو جس میں آپ رنگوں میں تخصیص کر سکیں۔ بھرے پیٹ پر کوئی مشق نہ کی جائے۔ تھکے ہوئے ہوں یا نیند آ رہی ہو تو مشق کو کسی اگلے وقت پر اٹھا رکھیں۔

سب سے ضروری چیز وقت کی مدامت ہو۔ دونوں وقت مقررہ اوقات میں مشق کریں۔ یعنی سات بجے صبح اور سات بجے شام کو پھر انہی اوقات کو نبھانے کی کوشش کریں۔ آگے پیچھے ہونے سے نقصان کا احتمال ہے۔

مشقوں کو باقاعدگی سے شروع کرنے سے پہلے ان کی طرف ذہنی سفر کرنا بہت ضروری ہے۔ پہلے اپنی کرسی پر بیٹھ کر اردگرد کی چیزوں کو غور سے دیکھیں اور ان کو پانچ منٹ کے اندر اندر اپنے ذہن میں بٹھالیں۔ پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگانا چاہیے۔ لیکن پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ یہ سفر کرنا چاہیے۔ چیزوں کے نام دہرانے کی بھی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے ان پر نگاہ ڈالتے جائیں۔ خودکلامی منع ہے۔

اس کے بعد آرام سے اٹھیے اور آہستگی سے باہر نکل جایئے۔ برآمدے میں یا دوسرے کمرے میں جاتے وقت اپنے اردگرد توجہ کے ساتھ اور غور کے ساتھ دیکھتے جایئے۔ اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد واپس لوٹئے اور آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جایئے۔

کرسی پر بیٹھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیجیے ہوسکے تو کانوں کو بھی ڈاٹ لگا کر بند کیجیے۔ اس کے بعد پھر یہی عمل کیجیے مگر ذہنی طور پر۔ کرسی سے اٹھے بغیر۔ اسی طرح چیزوں کا جائزہ لیجیے۔ اسی طرح باہر نکلئے۔ اپنی منزل تک پہنچئے اور واپس آیئے۔ منزل تک جاتے جاتے ان سب چیزوں کو دیکھئے۔ جو آپ نے ملاحظہ کی تھیں۔ اس مشق میں سب چیزوں کو ''دیکھتے'' ہوئے آپ کے سامنے دھندیا دھبے یا خلا نہیں ہونا چاہیے۔

اس مشق کو بار بار کیجیے حتیٰ کہ آپ کو سارا سفر آنکھوں دیکھا معلوم ہونے لگے۔ جب یہ مشق خوب بہم پہنچے اور آپ اس پر حاوی ہو جائیں تو اپنے سفر کو پھیلاتے جائیں۔ ذرا دور تک دوسرے کمروں میں جائیں۔ پھر گھر کے پھاٹک تک۔ اس کے بعد باہر سڑک پر اور پھر سڑک کے آخری کونے تک۔

جب آپ باہر سڑک پر نکلیں تو صرف بڑی بڑی اشیاء کو دیکھیں جو ایک فٹ سے بڑی ہوں۔ باڑیں، باغ، درخت، بنچ، گھر دروازے وغیرہ لیکن کھڑکیوں کو گننے کی کوشش نہ کریں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کا سر اونچا ہو کر تھکنے نہ پائے۔

اس کے بعد آپ قریبی بس سٹاپ پر جائیں یا جانا شروع کر دیں اور واپس آ کر اس کی ذہنی تصویر کشی کریں۔ لیکن یہ سفر پندرہ منٹ سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے بعد آپ آنکھیں اور کان کھول کر اس سفر کی تصویر کشی کی مشق کریں۔

جب آپ سفر میں چیزیں اخذ کر رہے ہوں تو ذہن سے دوسرے ہر طرح کے خیالات سختی سے نکال دیں اور اپنے کام پر دھیان رکھیں۔ اس میں کچھ مشکلیں پیش آئیں گی جن کی تفصیل یہ ہے:

1- راہ چلتے ہوئے کسی موٹر کا ہارن یا کوئی سیٹی یا آواز آپ کو متاثر کرے گا۔ تیز آواری سے متاثر نہ ہوں۔

2- ہر طرح کی گفتگو سے احتراز کریں۔ بے معنی اور لایعنی فقرے اور لفظ نہ بولیں نہ سوچیں۔ اس سے آپ کو اپنی گفتگو کی مشاقگی میں مدد ملے گی اور آپ کی سوچ پہلے سے بہتر ہو جائے گی۔

3- پہلے پہل ذرا سی تھکن اور سردرد ہوگی۔ لیکن اس میں اعصابی تناؤ یا مشکل میں مبتلا نہ ہوں۔ بس سیدھے سبھاؤ۔ آرام سکون سے رہنے کی کوشش کریں۔ اس سے آپ کو اپنی خواہشوں اور اپنے نفس پر کنٹرول کرنے کا موقع ملے گا اور آپ کی بیٹری چارج ہونے لگے گی۔ اب ذرا اجتناب کی کوشش کریں:

مثلاً سینما جانے کا پروگرام منسوخ کر دیں۔ یا تفریح کے پروگرام کو فسق کر دیں۔ اپنی پسند کی چیز سامنے دیکھ کر اس سے اجتناب کریں۔ (روزہ کی کیفیت پیدا کریں)۔ پان کی طلب کو پس پشت ڈال دیں۔ گھر جانے کے لیے لمبا راستہ اختیار کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مشق نمبر1

آرام کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر گھڑی کی سوئی کو دیکھیں۔ توجہ اور نظر صرف سوئی کی نوک پر رکھیں۔ اس وقت کسی چیز کا خیال نہ کریں۔ اس وقت نہ تو گھڑی کو دیکھیں نہ ڈائل پر نگاہ کریں۔ نہ ہی ہندسوں کو ملاحظہ فرمائیں۔ اس وقت نہ تو آپ کے ذہن میں گھڑی کا رنگ ہو نہ اس کا میک ہو نہ اس کی شکل ہو نہ کچھ اور ہو۔ بس سوئی کی نوک پر نگاہ ہو۔ کوئی لفظ آپ کے ذہن میں یا زبان پر نہ ہو۔ جہاں جہاں آپ کا ذہن بھٹکے اس وقت کو چھوڑ دیں اور جہاں جہاں مرکوز ہوا ہو اس کو لکھ لیں۔

پہلے دو تین ہفتوں میں مرکوز توجہ کے وقت کو تین سے ضرب دے کر دیکھیں۔ اگر چالیس سیکنڈ تک مرکوز رہے تو گویا حاصل ضرب 120 ہوگا۔

یہ آپ کی پہلی منزل ہوتی۔

لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے صراحی ذہن سے بڑا جھگڑا ہوگا لیکن ہمت نہ ہاریں آپ کو دو منٹ پورے کرنے ہیں اور ضرور کرنے ہیں۔ دوسری مشق اس وقت تک نہ کی جائے جب تک پہلی مشق کی خوب مشق نہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ البتہ ایک ضمنی مشق کر سکتے ہیں جس کی تفصیل نیچے دی جا رہی ہے۔

مشق نمبر 1/A (ضمنی مشق)

یہ مشق توجہ بر صدا سے متعلق ہے۔ اس مشق کو پہلی مشق کے فوراً بعد کرنا چاہیے۔ یا پھر دوسرے وقت کرنا چاہیے۔ یعنی صبح کے وقت مشق نمبر ایک اور شام کو مشق 1 الف۔

ایک صدا لیجیے جس کا جسم سے کوئی تعلق نہ ہو۔ سب سے بہتر نام الرحیم ہے۔ اپنی گھڑی میں وقت نوٹ کر لیجیے اور الرحیم کا ذکر خفی شروع کر دیجیے۔ پوری توجہ ذکر خفی کے اندر پیدا ہونے والی ''آواز'' پر مرکوز کر دیجیے۔ اس وقت سوائے اس اسم کے آپ کے لیے اور کچھ بھی موجود نہ ہونا چاہیے۔ نہ اندر نہ باہر۔

گھڑی میں دیکھیے کہ کب تک آپ اس ذکر پر جمے رہے اور خیال بھٹکا نہیں۔ اس وقت کو تین سے ضرب دیجیے۔ یہ وقت آپ کا مقصود ہوا پہلی مشق کی طرح سے۔

اگر پہلے دن پورا ایک منٹ آپ کا صحیح توجہ کے ساتھ اسم کے ساتھ وابستہ رہا تو آپ نے کمال کیا۔ (اگر کچھ مشکل پیش آئے تو اس مشق میں آنکھیں بند بھی کی جاسکتی ہیں)۔

ان دونوں مشقوں کو دس منٹ تک کی پرسکون اور بے شورش توجہ سے وابستہ کرنا ہے۔ یہ ایک بڑی ابتدا ہے اور

بڑا کمال ہے۔ آپ اپنے آپ میں ایک عجیب فرق محسوس کرنے لگیں گے لیکن ابھی تو کچھ مشقیں باقی ہیں جن کو اختتام تک پہنچانا ہے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ اونٹوں اور انسانوں کا ایک کارواں ایک لق و دق صحرا میں سے گزرا اور خوش قسمتی سے ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں اُسے پانی کے حصول کے لیے ایک گہرا سوراخ ملا جو صحرا کے بیچوں بیچ دور تک چلا گیا تھا۔ انہوں نے اس سوراخ میں لمبے لمبے رسوں پر چرس اور ڈول اتار کر دیکھے لیکن نہ ڈول واپس آئے نہ رسّے۔ کچھ لوگوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر کہا ہمیں نیچے اتار دیجئے ہم جا کے اس سوراخ کی ٹوہ لگا کے آتے ہیں۔ آپ کے لیے پانی لاتے ہیں اور نہیں تو اپنی جان آپ پر قربان کرتے ہیں۔

جب پہلا آدمی اس زمینی درز کے اندر اترا تو دیر تک اس کا اتہ پتہ معلوم نہ ہوا۔ اوپر والوں نے رسّہ ہلایا آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ رسّہ اوپر کھینچا تو آخری سرا کھلا تھا اور سورما اس حلقے میں نہیں تھا۔ پھر حوصلہ کر کے دوسرا آدمی اترا۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پھر تیسرا' چوتھا اور پانچواں اور جب چھٹا آدمی اس زمین دوز بھٹ میں اترنے لگا تو قافلے کے ایک سیانے نے اس کا راستہ روک کر کہا "ٹھہرو اب مجھے نیچے جانے دو اور اندر کی خبر لانے دو' اس طرح تو ہمارے آدمی ایک ایک کر کے ضائع ہوتے رہیں گے۔"

قافلے والوں نے بادل نخواستہ بابے کی کمر سے رسّہ باندھا اور اسے مورے کے اندر سرکانا شروع کر دیا۔ کوئی دو فرلانگ کی عمودی مسافت طے کرنے کے بعد جب سیانا سطح آب پر اترا تو اس کے کنارے ایک عظیم الجثہ عفریت کھڑا تھا۔ اس نے بابے کو دیکھ کر خوشی کا نعرہ لگایا اور کہا آخر تم بھی آ گئے۔ اچھا کیا۔ میری آرزو پوری ہوئی۔"

سیانا چپ چاپ دست بستہ کھڑا رہا۔

عفریت نے کہا "میں تمہیں اسی صورت میں واپس جانے دوں گا اگر تم میرے سوال کا جواب دو گے اور میری تسلی کرو گے۔"

سیانے نے اثبات میں سر ہلایا اور اسی طرح کھڑا رہا۔

عفریت بولا "اس کائنات میں سب سے افضل اور اعلیٰ مقام کونسا ہے جہاں زندگی بھرپور انداز میں بسر کی جا سکے۔"

سیانے نے سوچا اگر میں کسی خوبصورت دلفریب شہر کا نام لیتا ہوں جہاں دنیا بھر کے ٹورسٹ کشاں کشاں جاتے ہیں تو یہ اپنے مسکن کے حوالے سے ناراض ہو جائے گا۔

اگر میں عرش بریں اور جنت اور بہشت کا ذکر کرتا ہوں تو ایک عفریت کا اُدھر گزر ہی ممکن نہیں رہا۔

سیانے نے سر جھکا کر کہا "صاحب سوراخ! اس کائنات کا اعلیٰ ترین مقام وہ ہے جہاں آپ خوش رہیں' سکھی رہیں اور پرباش رہیں چاہے وہ اس کرۂ ارض کے اندر ایک بل ہی کیوں نہ ہو۔"

عفریت نے کہا "دنیا میں تم سے بڑھ کر اور کوئی سیانا نہیں جو بات کی کنہ کو پہنچ گیا ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تم کو بھی آزاد کرتا ہوں اور تمہارے ساتھیوں کی بھی خلاصی کرتا ہوں جن کو میں نے ابھی ابھی قید کیا ہے۔ جتنے چرس بو کے ڈول تم نے اندر اتارے میں سب پانی سے بھر کر تمہارے ساتھ کرتا ہوں اور ان کو اوپر پہنچانے کا بندوبست کرتا ہوں۔

چنانچہ عطا ہمارے قافلے کا وہ سیانا ہے جو ہمیں دیر دیر تک دور دور کی سیر کراتا ہے لیکن اس کا دل دھرتی کے اسی ٹکڑے پر اٹکتا ہے جس کو پاکستان کہتے ہیں۔

ایک فقیر رند مشرب مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا مولوی بابا ہم کو شراب پلوا۔ شاہ صاحب نے ایک روپیہ اس کی نذر کیا اور فرمایا کہ جو چاہو سو کھاؤ پیو۔ تم کو اختیار ہے۔ وہ بولا "ہم نے تو آپ کا بڑا نام سنا تھا لیکن آپ تو قید میں ہیں۔"

شاہ صاحب نے فرمایا "صاحب من کیا آپ قید میں نہیں ہیں؟" کہا "نہیں' ہم تو رند مشرب لوگ ہیں۔ کدھر کی قید اور کدھر کی پابندی۔ ہم آزاد ہیں اور آزادی کے پرستار ہیں۔"

آپ نے فرمایا کہ اگر کسی روش کے قیدی نہیں ہو تو آج غسل کرو۔ جبہ پہنو۔ عمامہ باندھ کر مسجد میں چلو اور نماز پڑھو۔ ورنہ جتنے تم رندی کی قید میں مبتلا ہو اسی طرح ہم شریعت غرا کی قید میں پابند ہیں۔ تمہاری آزادی ایک خیال خام ہے۔"

یہ بات سن کر نہایت چپ ہوا اور شاہ صاحب کے قدم پکڑے کہ "دراصل ہمارا خیال غلط تھا جو ہم آزادی کا دم بھرتے تھے۔"

انسان کو جس چیز میں کمال ہوتا ہے اس پر مرتا ہے۔ چنانچہ دھنتر وید کو سانپ پکڑنے میں کمال تھا۔ اس کو سانپ نے کاٹا اور مر گیا۔ ارسطو سل کی بیماری میں مرا۔ افلاطون فالج میں۔ لقمان سرسام میں اور جالینوس دستوں کے مرض میں حالانکہ انہی بیماریوں کے علاج میں کمال رکھتے تھے۔ اسی طرح جس کو جس کی محبت ہوتی ہے اسی کے خیال میں جان دیتا ہے۔ قارون مال کی محبت میں مرا۔ مجنوں لیلیٰ کی محبت میں۔ اسی طرح طالب خدا کو خدا کی طلبی کی بیماری ہے وہ اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔

تگ بن کتا دیکھے' سیس بھاری جنا دیکھے' جوگی کن پھٹا دیکھے' چھار لائے تن میں مٹی ان بول دیکھے' سیوڑ ارچھول کرت کلول دیکھے۔ بن کھنڈے بن میں بیر دیکھے سور دیکھے۔ گنی اور کور دیکھے۔ مایا کے بھرپور دیکھے۔ پھول رہے دمن میں ادھو کے سکھی دیکھے۔ گنی اور کور دیکھے۔ مایا کے بھرپور دیکھے۔

ایک شخص بیمار پڑا۔ نزع کی نوبت پہنچ گئی۔ گھنگھرو بولنے لگا۔ شہر میں مرنے کی خبر دوڑ گئی۔ جس نے سنا افسوس کیا۔ لیکن قدرت خدا کی لوٹ پوٹ کر بچ گیا۔ دوست یار مبارکباد دینے آئے تو بولا" یہ تو مقام تعزیت ہے نہ کہ جائے تہنیت۔ کیونکہ موت کا مزا بھی چکھ لیا اور مرنا بدستور رہا۔

سید وزیر علی کو تقریر و مباحثے کا بڑا شوق تھا۔ ہر ایک سے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز آ کر فخریہ بیان کرنے لگے۔ میں نے فلاں شخص کو گفتگو میں بہت معقول کیا۔ ہم نے کہا "صاحب وہ تو معقول ہوا لیکن یہ بتاؤ کہ تم کیا ہوئے؟" اس دن سے توبہ کی کہ آئندہ کسی سے بحث مباحثہ نہ کروں گا۔

کسی شخص نے کشائش رزق کا وظیفہ پوچھا۔ ارشاد ہوا کہ اگر وظائف پر روزی موقوف ہوتی تو دنیا میں ملاؤں سے زیادہ اور کوئی امیر نہ ہوتا لیکن وظیفہ تو اس معاملہ میں الٹا اثر کرتا ہے کیونکہ دنیا ایک میل کچیل ہے اور نام خدا صابن۔ بھلا صابن سے میل کیونکر بڑھ سکتا ہے۔ تم نے کسی وظیفہ خواں کے گھر پر ہاتھی گھوڑے موٹر گاڑی دیکھی ہے۔ خدا کا نام تو صرف اس لیے ہے کہ اس کی برکت سے دنیا کی محبت دل سے دور ہو جائے۔ نہ اس لیے کہ آدمی دنیا میں زیادہ آلودہ ہو۔ پھر اس کو ایک وظیفہ بتلا کر کہا گھر پر پڑھا کرنا خدا کے گھر میں دنیا طلبی کا کیا کام مسجد میں نہ پڑھنا۔

آدمی کب اور کس لیے "اپنوں" سے جدا ہوتا ہے اور کس لیے دوری اختیار کرتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ میں الگ ہو کر اپنوں کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں۔ خدمت کے تصور کو بہت احتیاط کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھنا چاہیے۔ میرے ساتھ بھی کچھ اسی طرح سے ہوا کہ میں نے سوچا میں لوگوں کی خدمت زاویے سے بڑھ کر کر سکتا ہوں۔ ایک ماسٹر صاحب کی جیب میں ایک سنہری جیبی گھڑی تھی۔ وہ سکول سے آتے جاتے اس کی زنجیر کھینچ کر وقت دیکھا کرتے تھے۔

فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس گھڑی کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کاش میں بھی ایک آدمی کے بجائے بہت سارے لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ ان کو وقت بتا سکوں۔ ان کی رہنمائی کر سکوں۔ اس نے ایک روز رو رو کر خلوص دل سے دعا کی اور اگلے روز وہ گھڑی ماسٹر صاحب کی جیب سے نکل کر اڑ کر گھنٹہ گھر کے اوپر جا کر چپک گئی۔ اتنی اونچائی پر پہنچتے ہی اس کی حیثیت معدوم ہو گئی اور وہ ہستی سے نیستی میں چلی گئی ہونے سے نہ ہونے میں پہنچ گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس زاویے کی نسبت کوئی اور بہتر کام کر سکتا ہوں اور لوگوں کے کام آ سکتا ہوں لیکن میرا حال بھی گھڑی والا ہوا اور میں ہونے سے محروم ہو گیا۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ اکثر یونہی ہوتا ہے۔ وہ بڑا کام کرنے کی امید میں روزمرہ کے چھوٹے کام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

لیکن پورے طور پر ایسے نہیں ہوا۔ ہم جب ایک دوسرے سے مل لیے۔ ایک دوسرے کو جان گئے تو ہم ایک دوسرے کی ذات کا حصہ بن گئے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہوں گے۔ ایک دوسرے کی بھول کے اندر بھی ایک دوسرے کو بھولے نہیں۔ آپ کو لگتا ہے میں بھی ایسے یہ سوچا کرتا تھا۔ لیکن ایک روز چھ ماہ کی طوالت کے بعد جب شرمندگی کے ساتھ بابا جی سے ملنے گیا تو انہوں نے میرے زبان کھولنے سے پہلے فرمایا "جس وقت تم سڑک کنارے اپنے خیالوں میں مگن جا رہے ہو۔ گاڑی میں سفر کر رہے ہو، جہاز کے اندر بیٹھے ہو تو اس وقت تم اپنے گردوں کو، اپنے جگر کو اور اپنے قلب کو بالکل بھول چکے ہو۔ تم کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ اور اس جیسے سینکڑوں اعضاء موجود ہوتے ہیں لیکن ان کی رگ رگ کا احساس نہیں ہوتا۔ تمہارے لاشعور میں بھی نہیں ہوتا کہ تمہاری کمر کے اندر ریڑھ کی لاٹھ ہے جس نے وجود کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے۔ اس ساری فراموشی کے اندر اور اس ساری لاتعلقی اور ناشناسی کے اندر اور بے خیالی کے دائرے میں یہ سارے اعضائے بدن تمہارے جسم کا ایک حصہ بن کر موجود ہوتے ہیں۔ تم کہیں بھی رہو۔ کتنے بھی بھولے رہو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جس قدر ہم تمہاری یاد کے اندر ہیں اسی قدر ہم فراموشی کے اندر بھی موجود ہیں۔

☆ فرمایا غصہ فرو کرنے کا ایک آزمودہ علاج یہ ہے کہ مغضوب علیہ کو اپنے پاس سے جدا کر دیا جائے یا خود اس کے پاس سے جدا ہو جائے اور کسی کام میں لگ جائے۔

☆ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ خیر چاہتے ہیں تو ایسے اسباب غیب سے پیدا فرما دیتے ہیں جس سے اس کے امراض نفسانیہ مثلاً "حب جاہ" کا علاج ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس پر کوئی مرض مسلط ہو جاتا ہے یا کوئی عدو مسلط کر دیا جاتا ہے جو اس کو بدنامی کی ایذا پہنچاتا ہے۔ اس بدنامی سے وہ شخص رسوا ہوتا ہے۔ اول اول تو یہ نفس کو نہایت ناگوار گزرتا ہے مگر جب وہ صبر و رضا اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس میں ایسی قوت تحمل کی پیدا ہو جاتی ہے کہ بدنامی کو بڑے شوق سے برداشت کرنے لگتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو قبول عام اور عزت نصیب فرماتے ہیں جس میں اس کو ناز نہیں ہوتا۔ اب گویا جاہ عظیم میسر ہوتی ہے اور جاہ پسندی فنا ہو جاتی ہے۔

☆ فرمایا صوفی اور درویش صبر اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کر لیں کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ سارا معاملہ اس کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں۔

☆ فرمایا کہ خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اس وقت مطلوب و محمود ہے جب کہ دین کے لیے مفید ہو اور نااتفاقی اسی صورت میں مذموم ہے جس دین کے لیے مضر ہو۔ اگر اتفاق دین کو مضر ہو اور نااتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت نااتفاقی ہی مطلوب ہو گی۔

☆ فرمایا کہ شہرت سے دینی اور دنیوی دونوں طرح کا نقصان ہوتا ہے مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار و طلب سے حاصل ہو۔ جو شہرت غیر اختیاری ہو وہ نعمت ہے!

☆ فرمایا کہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ نزع ذکر کی حالت میں نماز میں مشغول ہو جانے سے رنج بہت کم ہو جاتا ہے۔

☆ جہاد اشاعت اسلام کے لیے مقرر نہیں ہوا بلکہ حکومت اسلام قائم کرنے کے لیے شروع ہوئی۔

☆ فرمایا ایسا کوئی کام نہ کرو جس سے دین کی سبکی ہو۔

☆ فرمایا کہ حزن سے جس قدر جلد مراتب سلوک کے طے ہو جاتے ہیں مجاہدہ سے اس قدر جلد طے نہیں ہوتے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔

☆ فرمایا معراج کی حقیقت ہے قرب حق اور قرب حق کسی خاص صورت کے ساتھ بندھا ہوا نہیں۔ اس میں صورت عروج کی ہوتی ہے جیسے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا اور کبھی صورت نزول کی ہوتی ہے جیسے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ہوا۔

☆ فرمایا: قلندر اس شان کے بزرگ کو کہتے ہیں جو خدا سے کامل محبت رکھتا ہو۔ خدمت اور اطاعت میں پوری مشقت اٹھاتا ہو اور کسی کی ملامت سے نہ ڈرتا ہو۔

☆ اسلام نہ ترک تعلقات کی تعلیم دیتا ہے نہ انہماک فی الدنیا کی اجازت دیتا ہے بلکہ تعلقات میں اختصار کی تعلیم دیتا ہے۔

☆ ایک مرتبہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے حضرت حاجی صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میں ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا مولانا ابھی تو پوچھ ہی رہے ہو اور پوچھنا دلیل تردد کی ہے۔ اور تردد دلیل خامی کی ہے اور خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں۔

میری سوچ میں یہ تبدیلی کچھ عرصہ پہلے اچانک آئی۔ میں بھی آپ کی طرح چھپے ہوئے لفظ کو بہت توقیر کی نظر سے دیکھتا تھا اور ریڈیو ٹیلیویژن کو ادنیٰ کام سمجھتا تھا۔ پھر ایک تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔

میرا بڑا بیٹا جو ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہے اور وقت کی بدلتی ہوئی لہروں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس بات پر بہت ہی مغموم رہتا ہے کہ میں نے اب تک اس عہد کی سب سے بڑی ایجاد کمپیوٹر پر توجہ نہیں دی اور توشہ علم سمیٹے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ اس نے کئی مرتبہ مجھ کو بڑے ہی شگفتہ اور دھیمے انداز میں کمپیوٹر کی عادات و اطوار سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے اور متعدد مرتبہ اپنے کمرے میں لے جا کر اس کی کارکردگی سمجھانے کی جرأت بھی کی ہے لیکن مجھے اس کی الف بے تک سے شناسائی حاصل نہیں ہو سکی اور میں بالکل کورے کا کورا رہا۔

ایک دن اُس نے ڈرتے ڈرتے بڑے ادب سے کہا کہ ابا ایک سال اور تک جس شخص کو کمپیوٹر کا استعمال نہیں آئے گا وہ شخص جاہل اور ان پڑھ سمجھا جائے گا تو میرے دل میں واقعی خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے بڑی لجاجت سے اُس کے کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں سوچا کہ وہ سندیں اور ڈگریاں جو ہم نے ٹھنڈی راتوں کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر حاصل کی ہیں وہ آن واحد میں ختم ہو جائیں گی اور ہم کمپیوٹر ناآشنا لوگ ایک مرتبہ پھر ان پڑھ لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے۔ ہم تو خیر بہت ہی چھوٹے لوگ ہیں۔ ہمارے بڑے اور ہمارے علم دوست پرکھ غالب، شیکسپیئر اور سقراط بھی سوفٹ ویئر سے ناآشنائی کی بنا پر بے علم ہو جائیں گے اور ہمارے دیکھتے دیکھتے لائبریریوں اور کتب خانوں سے نکال دیئے جائیں گے۔ اس عبرتناک سین نے ہمیں کچھ اس طرح سے دھمکایا کہ ہم نے کمپیوٹر کے سبق لینے شروع کر دیئے۔ ابھی ہم نے اس کی چالوں اور چابیوں اور روشنیوں سے روشنائی کی ابتدائی منزلیں ہی طے کی تھیں کہ کمپیوٹر سے ایک کام آن پڑا۔ ہمیں اپنے حال ہی میں ریٹائر ہونے والے دوست محمد صدیق بے خوف کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ سے آگاہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کے پاس نقد جمع پونجی کس قدر ہے اور اس نے بینکوں اور بانڈوں میں کتنی رقم چھپا رکھی ہے۔

محمد صدیق بے خوف ایک بہت ہی سچا اور نڈر انسان ہے اور اس کو سچ بولنے کا جنون ہے۔ اس کے اسی جنون کی وجہ سے سارے دوست اس سے ڈرتے ہیں اور کنی کتراتے ہیں۔ ساتھ ہی اس کو اپنی درویشی اور فقیری پر بھی بڑا ناز ہے۔ وہ منصور، سقراط اور شمس تبریز کو اپنے ساتھیوں میں سے خیال کرتے ہیں اور ان کی کارکردگیوں کو اپنے شعروں میں استعمال کر کے سارا کریڈٹ خود لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہی ضروری سمجھا کہ کمپیوٹر کے ذریعے ان کے باطن کا ECG کر کے اصل حقیقت معلوم کی جائے اور دودھ پانی الگ کر دیا جائے۔ لیکن جب اپنے صاحبزادے کی مدد سے ہم نے محمد صدیق کے بارے میں بیخوف ہو کر چند مستند اندازے اُس میں فیڈ کرنے شروع کیے تو کمپیوٹر بڑی صحت اور صفائی کے ساتھ ان کو نگلتا گیا اور جب آخر میں ہم نے نتیجہ حاصل ضرب معلوم کرنا چاہا تو کمپیوٹر نے گھوڑے کی ڈھائی پٹ چال چل کر پوچھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے جو کچھ داخل کیا ہے وہ درست ہے؟"

میں نے کہا "بالکل' سو فیصد درست اور حق ہے۔"

پردہ سکرین پر آیا "یا تم گدھے ہو یا حاسد ہو۔"

ہم نے ذرا غصے میں اپنے بیٹے کی طرف دیکھا تو اس نے خفت کے ساتھ سر جھکا لیا اور بولا "ابا! یہ کمپیوٹر کا انداز ہے۔"

میں نے کہا "میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی مشین پر اور ایسے ڈبے پر جو ہمیں گدھا اور حاسد سمجھے۔ اس سے کہو کہ ہم خاندانی آدمی ہیں اور ایسی زبان کے متحمل نہیں ہیں۔"

میرے بیٹے نے کھٹ کھٹ کر کے کلیدی تختے پر انگلیاں چلائیں اور میری بات کمپیوٹر تک پہنچا دی۔ کمپیوٹر نے کہا ایک مرتبہ پھر ہوش مندی کے ساتھ سارا ڈیٹا فیڈ کرو پھر بتاؤں گا کہ تم کون ہو۔ ہم نے دوبارہ محمد صدیق بیخوف کے بارے میں سارا ڈیٹا فیڈ کیا تو کمپیوٹر نے کہا تمہیں یقین ہے کہ سب کچھ درست ہے۔ ہم نے کہا ہاں۔ بولا ایک مرتبہ پھر دیکھ لو۔ کیا پہلا ڈیٹا صاف کر دوں۔ Erase کر دوں۔ ہم نے کہا "ہاں۔" کہنے لگا "پھر سوچ لو۔" بلکہ تین مرتبہ سوچ کر بتاؤ۔ تم ذرا سے بھاگ قسم کے لوگ ہو۔ میں نے اپنے بیٹے کو جھڑک کر کہا اٹھاؤ اس لعنتی شے کو اور نکال باہر کرو میرے گھر سے۔ جو شے بڑوں کا ادب اور لحاظ کرنے سے قاصر ہو اور بزرگوں کو اس طرح سے جھڑکتی ہو اس کا کوئی مستقبل نہیں۔

میرے بیٹے نے ڈرتے ڈرتے کہا "ابا یہ سائنسی دور ہے اور اب ہمیں اس سے آگے ہی آگے جانا ہے۔ زمانہ ہر لحظہ بدلتے رہنے کا نام ہے۔" میں نے کہا "ٹھیک ہے یہ زمانہ ہر لحظہ بدلنے کا نام ہے اور سائنسی دور کو آگے چل کر اور نت نئی ایجادات کرنی ہیں لیکن اتنا میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ جب ہم اسد اللہ خان غالب کی ہزار ویں برسی منا رہے ہوں گے

اس وقت یہ لعنتی شے کمپیوٹر موجود نہیں ہوگی البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ سائنسی ترقی کی وجہ سے اس وقت ہر گھر میں ایسے ٹوتھ برش ضرور موجود ہوں گے جو ایٹمی توانائی سے چلتے ہوں گے اور بغیر ہاتھ ہلائے آپ کے دانتوں کو صاف کر کے منہ سے باہر نکل کر واپس طاقچے میں پہنچ جاتے ہوں گے۔

سائنسی ترقی کے متعلق میرے دل میں اُسی روز اُلجھن پیدا ہوگئی تھی لیکن اتنی بات میرے ذہن میں ضرور آ گئی کہ اب وقت تفکر، تعقل، تدبر کا آ گیا ہے۔ اپنے رویوں کی چھان پھٹک بہت اہم اور ضروری ہے اور سوچنا پڑے گا کہ علم کیا ہے۔ اس کی ترویج کو وسعت دینے اور سمت عطا کرنے کے لیے کیا کچھ اور کہاں تک کرنا ہوگا۔ علم غیر نافع کو علم نافع سے علیحدہ کرنے کے لیے کونسی ایجنسی ہوگی اور علم میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کون سے ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے ہم ڈیرے کے ایک کونے میں آڑی ترچھی منجیاں ڈالے گنڈیریاں چوس رہے تھے اور خوش گپیوں میں خرافات ملا کر زبان و بیان کے چسکے لے رہے تھے کہ ہمارے سامنے ایک گھون مون سا آدمی آ کر کھڑا ہوگیا۔ کربڑی ڈاڑھی، آنکھوں میں سرخ رنگ کا سرمہ، نیلی زین کا ٹائٹ کرتہ اور پاجامہ۔ پیروں میں بغیر تسموں کے فلیٹ بوٹ۔ چہرے پر ہوائیاں۔ خوفزدہ کرنے والی آنکھیں۔ ایک ہاتھ میں رعشہ دوسرے میں رنگیل ڈنڈا۔ ہونق سی شکل، ہونٹوں پر کچھ جھڑکیاں، کچھ گالیاں، ساتھ ساتھ گانے کے بول۔ اگر وہ آدمی گھوڑا ہوتا تو ساری زندگی نہ سدھایا جاسکتا۔ ساری عمر چکر کاٹتا رہتا۔ گھسے پر لگا رہتا لیکن گاڑی میں جوتنے کے کام نہ آتا۔

اس نے ڈنڈے کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا اور میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُس کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب، سیکرٹری صاحب اور رضا صاحب اُسی طرح بیٹھے گنڈیریاں چوستے رہے۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اُس نیلی پوش کو دیکھا نہیں تھا اور اگر دیکھا تھا تو اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اگر وہ پہلے بھی ڈیرے پر آتا رہا تھا اور یہ لوگ اس سے واقف تھے تو انہوں نے جان بوجھ کر اس سے اغماض کیا تھا۔ کچھ عجیب سی بات تھی کہ اُس کے ہونے نہ ہونے کا ان لوگوں پر کوئی اثر پڑا تھا۔

جب میں ڈرا ڈرا اور سہما سہما اس کے پاس کھڑا تھا تو اس نے اپنے ڈنڈے کو میرے کندھے پر مار کر کہا "محمود علی اس طرح یہاں نہ آیا کر۔"

میں نے کہا "میرا نام محمود علی نہیں اور میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آتا۔"

اُس نے دو مرتبہ اپنے ڈنڈے سے میرا کندھا ٹھکورا اور ایک عجیب سی زبان میں گالی دے کر کہا "تیرا نام محمود علی ہی ہے اور تو مجھ سے اپنا نام چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی ذات اور اپنے نام کی حقیقت اس پر واضح کرنا چاہی لیکن اس نے رنگیل ڈنڈے کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

کہنے لگا "جس قدر فاصلہ ہوگا اسی قدر آسانی ہوگی۔ جس قدر دوری ہوگی اتنی ہی آگاہی ہوگی لیکن یہ آگاہی موت سے پہلے حاصل نہیں ہوگی۔"

موت کا لفظ سن کر میں خوفزدہ ہوگیا تو اس نے کہا "ذات کا زوال موت سے پہلے حاصل نہیں ہوگا۔ جب تک اپنے آپ کو مار نہ لوگے فنا نہیں کر لوگے یہ کیفیت مل نہ سکے گی۔ محمود علی! پرانے کو مارنا پڑے گا اور نئے کو جنم دینا پڑے گا۔"

پھر وہ ہنسا اور اپنی ہنسی میں ایک بے معنی سی گالی دے کر بولا "پرانے اعتقاد، پرانے وجود، پرانی تعلیم، پرانی یاری اور پرانی دشمنی کو ختم کرنا پڑے گا۔ ہے حوصلہ؟"

میں نے اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر مڑ کر دیکھا سب لوگ مزے سے گنڈیریاں چوس رہے تھے اور نیچے چھوک پر مکھیوں کا ایک جم غفیر جمع ہوگیا تھا۔

اس نے ہولے سے پھر کہا "محمود علی۔ کاکا محمود علی یہاں کیوں آتے ہو۔ کیا لینے آتے ہو۔ کس سے ملنے آتے ہو۔ کون ہے جو تمہاری یہاں مدد کرسکتا ہے۔ بھاگ جاؤ۔ سب کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ جاتے جاتے راستے میں اپنے آپ کو بھی چھوڑ جانا۔ اگر وہ تمہارے پیچھے آنے لگے تو اور زور سے بھاگنا۔ اگر وہ بھی اور زور سے بھاگے تو اس کو دھکا دے کر اوپر سے ایک ڈنڈا مارنا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "باباجی آپ کون ہیں؟" تو اُس نے مجھ سے بھی زیادہ ڈر کر کہا "میں ایک مفرور ہوں اور تمہیں آزاد کرانے آیا ہوں۔ جلدی کرو اور میرے ساتھ بھاگ چلو۔ یہ جگہ بڑی خطرناک ہے اور اس میں بھگیاڑ رہتے ہیں۔ تم محمود علی میمنے ہو اور تمہاری کھال بڑی نازک ہے۔"

میں نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ماتا بھری نگاہوں سے مجھے چمکار کر کہا "تم بھاگ جاؤ میں تمہاری سلامتی کے لیے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ جب تک تم دور نہیں نکل جاؤ گے میں یہیں کھڑا رہوں گا۔ یہ لوگ میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے۔"

میں نے کہا "باباجی میں حق اور سچ کی تلاش میں یہاں آیا ہوں اور جب تک مجھے اس دوارے سے کچھ مل نہیں جاتا میں یہ جگہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے کہا "محمود علی حق نہ تو سیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی سکھایا جاسکتا ہے۔ حق بولا بھی نہیں جاتا اور جو کچھ بولا جاتا ہے وہ حق نہیں ہوتا۔ بولی جانے والی بات سچ کی بابت ہوسکتی ہے سچ نہیں ہوتی۔ سچ میں اترا جاسکتا ہے سچ اوڑھا نہیں جاتا۔ بولو کنوئیں میں اترو گے؟ تمہاری ماں کنوؤں میں آوازیں دیتی پھرے گی وے میرا محمود علی کدھر گیا، میرا لعل کدھر گیا۔ ڈوبنا ہے؟ ہے اتنی ہمت۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر صاحب نے اونچی آواز میں کہا "اس کو ایک چونی دے کر آ جاؤ اشفاق صاحب، یہ ساری گنڈیریاں ختم ہو جائیں گی۔"

میں نے اس کو اٹھنی نکال کر دی تو وہ خوش ہو کر مجھے دعائیں دینے لگا "اللہ تجھے خوش رکھے، آباد رکھے، حکم حاکم

قائم۔ اونچے مراتبے۔ جوڑیاں آباد۔ چنگ بھاگ ساوے۔"

وہ دعائیں دیتا چلا گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے پاس آ کر پوچھا "ڈاکٹر صاحب یہ کون تھا۔"

انہوں نے بے پروائی سے کہا "ڈیروں پر ایسے لوگ آتے ہی رہتے ہیں ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔"

میں نے پوچھا "لیکن یہ تھا کون؟"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "سیمنٹ کے خالی تھیلے اکٹھے کرتا ہے اور ردی والوں کے پاس جا کر بیچ دیتا ہے۔ اکیلا آدمی ہے بھیک بھی مانگتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن وہ تو عجیب وغریب باتیں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور اس کی باتوں میں بڑی گہرائی تھی۔"

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا "ڈیروں پر عجیب وغریب باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن ان پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اصل بات صرف گرو کے پاس ہوتی ہے اور اسی کے حاصل کرنے کا حق ہے۔ دوسری باتیں اصل بات سے اکھاڑنے کے لیے آتی ہیں اور کم وبیش بھی لوگوں کو اکھاڑ کر لے جاتی ہیں آپ صرف اپنی گنڈیری پر دھیان رکھیں۔"

اتنے میں باباجی چوگوشیا ٹوپی پہنے اپنی مخصوص نورانی مسکراہٹیں بکھیرتے اُدھر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں سرخ سیاہ حاشیے والا ایک دسترخوان تھا جس پر رزق کے بارے میں فارسی کے دو شعر لکھے ہوئے تھے۔ آپ نے وہ دسترخوان میری طرف بڑھا کر کہا "یہ تحفہ حال پر آپ کے لیے عطا ہوا ہے۔ لیہ سے ہمارے ایک جانی جان آئے ہیں جو اپنے ہاتھ سے دسترخوان ٹھیکنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ ان کی محبت کا تحفہ ہے۔"

میں نے کہا "حضور یہ تحفہ تو وہ آپ کے لیے لائے ہیں۔"

مسکرا کر فرمایا "پیارو جان لو کہ سائل کے آنے سے پہلے اس کا مقصود موجود ہوتا ہے۔ جلوت میں نہ ہو تو خلوت میں ہوتا ہے۔ اگر دونوں جگہ نظر نہ آئے تو سائل کے پلے میں بندھا ہوتا ہے۔ کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دو۔ جان لو بھیجنے والا علیم مطلق ہے۔"

گھر سے چلتے وقت بانو نے مجھ سے کہا تھا "اگر آج آپ جلدی آ جائیں تو مجھے اچھرے لے چلیں ایک دسترخوان لینا ہے کھلی روٹیاں سوکھ کر لکڑی ہو جاتی ہیں۔"

ابھی پچھلے جمعے کی بات ہے کہ میں اخبار پڑھ پڑھا کر اور نہا دھو کر مزے سے کرسی پر بیٹھا تھا تو میں نے اچانک محسوس کیا کہ میں کس قدر مزے میں ہوں اور کس آسانی کے ساتھ یہ وقت گزار رہا ہوں۔ پھر میرے ذہن میں آسان آسان چیزوں کی پھواری پڑنے لگی اور میں مزید آسان چیزوں کے نقشے بنانے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس دنیا میں نکتہ چینی سب سے آسان شے ہے کہ اس کے لیے نہ تو کوئی محنت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کچھ خاص ذہن رکھنے اور خصوصی طور پر صاحب دماغ ہونے کی احتیاج ہے۔ احمق سے احمق انسان بھی بڑی آسانی کے ساتھ نکتہ چیں بن سکتا ہے اور مشکل سے مشکل کام پر دل کھول کے تنقید کر سکتا ہے۔ پھر میں نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں تعمیری کام کرنے والوں کے مقابلے میں نقادوں اور نکتہ چینوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے حالانکہ اصل کام کسی شے کو بنانے یا کسی بگڑی ہوئی چیز کو ٹھیک کرنے میں ہے۔ کسی ایک چیز، کسی ایک شے کو لیکن ایسا ہوتا نہیں لوگ ایک شے کو ٹھیک کرنے کے مقابلے میں ایک لاکھ چیزوں پر نکتہ چینی کرنے کو افضل گردانتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غلطی پکڑنا اور غلطی کی نشاندہی کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے لیکن یہ بات بھی ہر حال میں یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان غلطی بھی کرتا ہے اور ناکام بھی ہوتا ہے اور اپنی ترقی کے راستے پر رک بھی جاتا ہے لیکن اس ساری کائنات میں صرف خدا کی ذات وہ ہستی ہے جو نہ تو کبھی غلطی کرتی ہے اور نہ ہی کبھی ناکام ہوتی ہے۔ جو لوگ ہر وقت دوسروں کی غلطیاں پکڑنے میں مصروف رہتے ہیں یا جو ہر وقت اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر افسوس کرتے رہتے ہیں وہ نعوذ باللہ اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگ جاتے ہیں اور جب اُن سے خدا نہیں بنا جاتا' کہ ایسا ممکن ہی نہیں تو پھر وہ شیطان بننے کی کوشش کرنے لگتے ہیں اور اس میں اپنا اور دوسروں کا نقصان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

مدینے شریف میں ایک مرتبہ سندھ کے ایک زائر سے ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنی عمر کے پچیس چھبیس سال قدر خواہ عاصیاں اور پناہ دار گنہ گاراں کے حرم کی سیڑھیوں پر گزار دیے تھے۔ ہم نے پوچھا سائیں آپ بڑے خوش قسمت ہیں جو اس دربار میں حاضری دیتے ہیں۔ ہمیں فرمائیں کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟" مسکرا کر کہنے لگا "بابا ہم یہاں گرتے ہیں اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر گرتے ہیں اور پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غلطی کرتے ہیں اور معافی مانگتے ہیں۔ معافی مل جاتی ہے تو پھر بھول چوک ہو جاتی ہے۔ پھر توبہ تلا کرتے ہیں' پھر رحم ہو جاتا ہے۔"

ہم نے کہا "سائیں! یہ عجیب کیفیت ہماری سمجھ سے باہر ہے!"

فرمایا "بابا مومن کی شان یہی ہے کہ وہ گرے تو پھر اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ لغزش کھائے تو پھر اپنی جگہ پر قائم ہو جائے۔ مومن وہ نہیں ہوتا کہ کبھی ٹھوکر ہی نہ کھائے۔ غلطی ہی نہ کرے۔ مومن وہ ہوتا ہے کہ ٹھوکر کھائے لیکن پھر اپنی جگہ پر مستعد ہو جائے۔"

ہم نے جب ان کو ایک مختلف مقام پر پایا تو ان سے دعا کی درخواست کی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "اللہ سائیں مجھے ایسی طاقت عطا فرما کہ جن چیزوں کو میں تبدیل نہ کر سکوں ان کے لیے اپنی جان عذاب میں نہ ڈالوں اور جن کو میں تبدیل کر سکوں ان کے لیے مجھے جرأت عنایت فرمائی جائے۔ ساتھ ہی مجھے وہ عقل بھی عطا فرمائی جائے جو ان دونوں حقیقتوں کے درمیان فرق کر سکے تاکہ میں بیکار اور بے یار و مددگار بھٹکتا نہ پھروں!"

ڈاکٹر عبداللہ ڈینئل کا جنت میں داخلے کا فارمولا

ڈاکٹر صاحب بڑے دنوں کے بعد اچانک ایک روز ڈیرے پر تشریف لائے اور کچی زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے اور باباجی کی ٹانگیں دبانے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے جنت میں داخلے کا ایک فارمولا تیار کیا ہے اور اس پر

بزرگانِ دین کی منظوری چاہتے ہیں۔

فارمولا یہ ہے:

(1) باقاعدگی سے عبادت کی جائے۔ عبادت اللہ سے رابطہ قائم کرنے کا بلاواسطہ ذریعہ ہے اور اُسے خدا کے ساتھ ہوٹ لائن کا درجہ حاصل ہے۔

(2) خدا کے پیدا کردہ سارے جانداروں سے محبت (Cherish) کی جائے۔ آپ اتنے Harmless بن جائیں جیسے گیاہ ہوتی ہے جو پاؤں تلے پامال ہوتی رہتی ہے۔

(3) اپنے خیالات کو پاک صاف رکھیں اور اپنی گفتگو کو اس سے بھی زیادہ پاکیزہ بنا کر رکھیں۔ گالی' گندفقرہ' مروڑ بیان میں نہ لائیں۔

(4) اپنی وضع قطع دینی بنا کر رکھیں۔ لباس حلیے خرام اور قیام میں خدا کے احکامات کے مطابق عمل کریں اور اس کے بتائے ہوئے Symbols (سمبل) استعمال کریں۔

(5) اپنے آپ کو روپے پیسے' دولت ثروت کے معاملات سے دور رکھیں۔ زیادہ کمانے' زیادہ خرچ کرنے اور زیادہ جمع کرنے سے احتراز کریں۔ اپنے وجود کے سٹور میں وہ جمع جتھہ محفوظ کر کے رکھتے رہیں جو اگلے جہان میں کام آنے والا ہو۔

(6) بائبل کا مطالعہ ہر روز کریں اور باقاعدگی سے کریں۔

(7) گندی عادتیں چھوڑ دیں اور یک قلم چھوڑ دیں۔ اس معاملے میں چاہے ہپناٹزم سے کام لیا جائے کسی دوست سے کوئی عمل کرائیں لیکن منفی عادتیں بالکل ترک کر دیں۔

(8) جسمانی طور پر چاق و چوبند رہیں۔ ہر روز نہائیں' دانت صاف کریں' اچھے کپڑے پہنیں۔ ناخن تراشیں' بال کٹوائیں' بن ٹھن کر رہیں۔ آپ کا بدن آپ کے خدا کی بارگاہ ہے۔ وہ شہ رگ کے پاس رہتے ہیں۔

ارشادات حضرت الحاج امداداللہ شاہ صاحب مہاجر مکّی

1- صوفی وہ ہے جو سوائے اللہ کے دنیا و خلق سے مشغول نہ ہو اور رد و قبول خلق کی پروا نہ رکھے اور مدح اور ذم اس کے نزدیک برابر ہو اور ملامتی وہ ہے جو نیکی کو چھپاوے اور بدی کو ظاہر کرے۔

2- فقر اختیاری وہ ہے کہ واسطے رضائے حق کے ہو۔ یہ دولتمندی سے بدرجہا بہتر ہے۔ فقیر حقیقی وہ ہے جو اپنے نفس سے بھی محتاج ہو۔ یعنی مالک اپنے نفس کا بھی نہ رہے کیونکہ جس قدر فقیر کا ہاتھ ہر چیز سے خالی ہو گا اسی قدر اس کا دل ماسوائے اللہ سے خالی ہو گا۔

3- ہرگز ہرگز دنیا کے گرد نہ جاؤ اور دل کو اس کا گرویدہ نہ بناؤ۔ دنیا کی مثال مثل آدمی کے سائے کے ہے۔

اگر کوئی سایہ کی طرف متوجہ ہو تو وہ اس کے آگے آگے بھاگتا نظر آئے اور اگر سایہ کو پس پشت کرے تو خود پیچھا نہ چھوڑے اور آدمی کے پیچھے پیچھے آئے۔ یہی حال دنیا کا ہے جو کوئی دنیا کو پس پشت ڈالتا ہے اس کو ترک کرتا ہے۔ دنیا اس کا پیچھا کرتی ہے اور جو کوئی طلب دنیا میں کوشش کرتا ہے اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔

4- طالب راہ حق کو ضروری ہے کہ اولاً ماہیت و غایت و حقیقت تصوف کی معلوم کرے۔ بعد ازاں ان کے اعتقادات اور آداب ظاہری و باطنی کو سمجھے۔ خاص خاص اصطلاحات صوفیا کی جو انہی کے کلمات میں پائی جاتی ہیں ان کو جانے اس سلسلے میں آداب المریدین مصنفہ حضرت ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردی بہت عمدہ ہے۔ اس کا مطالعہ کرے۔

5- کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے باعتبار مراتب مردمان کے تین معنی ہیں۔ لا مطلوب' لا معبود' لا موجود الا اللہ اور یہ سب مراتب سے اعلیٰ ہے۔

6- کفر مظہر ایمان ہے و برعکس اس کے اگر کفر مخلوق نہ ہوتا کوئی ایمان کو کیونکر جانتا۔

7- خوشبو لگاتے وقت سب نیتوں سے عمدہ نیت یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہو۔

8- دعائے سلطان عادل مستجاب ہوتی ہے۔

9- دعا کی چار قسمیں ہیں۔ اول دعائے فرض۔ مثلاً نبی کو فرض ہوا کہ اپنی قوم کی..... مدد واسطے دعا کر۔ پس اس پر دعا کرنا فرض ہے۔ (2) دعائے واجب جیسے دعائے قنوت۔ (3) سوم دعائے سنت جیسے بعد تشہید ادعیہ ماثورہ۔ (4) دعائے عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں۔

چونکہ دعا میں تذلل ہے اور تذلل حق تعالیٰ کو محبوب ہے لہٰذا الدعاء فسخ العبادۃ وارد ہوا ہے۔

10- رویت حق تعالیٰ کی اس عالم میں ممکن ہے۔ بصارت ظاہری سے یہ رویت ممکن نہیں۔ پس عارف نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھا ہے تو اس کی غلطی ہے۔

11- ایک دم میں وحدیت حاصل کرنے کے لیے خدمت کرنی چاہیے۔

12- بزرگوں کے حضور میں دل کی نگہداشت کرنی چاہیے بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے حالات کی چھان بین میں رہتے ہیں یہ امر مذموم ہے۔

13- وظائف میں عدد طاق عمدہ ہیں۔ نو ہوں یا گیارہ۔

14- تمام لطائف بالائے عرش ہیں۔ تصور کرنا چاہیے کہ ان کے حقائق سے فیض ہوتا ہے۔

15- انسان کا ظاہر عبد ہے اور باطن حق۔

16- جو کچھ ایک نگاہ میں حاصل ہوتا ہے دیرپا نہیں ہوتا اور جو ریاضت سے رفتہ رفتہ حاصل ہوتا ہو قائم رہتا ہو۔

17- اصل ذوق و شوق محبت ہو کشف و کرامات ثمرات زائدہ ہیں۔ ہوتے ہوتے نہ ہوتے نہ ہوتے۔

18- تمام فنون میں پندار اور خودنمائی ہوتی ہے اور پندار حجاب ہے چونکہ علم میں زیادہ پندار ہو اس لیے العلم حجاب الاکبر کیا گیا ہو۔ غیبت میں پندار ہو اور زنا میں عجز و انکسار۔ حضرت آدم اور ابلیس دونوں سے خطا ہوئی۔ آدم علیہ السلام بوجہ

عجز و انکسار کے مقبول ہوئے اور ابلیس اپنے علم کے پندار اور حجاب سے مردود ہوگیا۔ فرمایا گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں باہی اور جاہی۔ آدم علیہ السلام کی خطا باہی ہے اور ابلیس کی جاہی۔ زنا گناہ باہی ہے اور غیبت جاہی اس لیے بیا شد ہو۔

19- اویسیہ وہ گروہ ہو کہ کسی بزرگ کی روح سے مستفیض ہوا ہو۔ بیعت عثمانی بھی اسی نوع سے ہو کہ جنگ حدیبیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان کی غیبت میں بیعت لی۔

20- صورت نیکوں کی اختیار کرنی چاہیے۔ سیرت اللہ تعالیٰ درست کر دے گا کیونکہ وہ واہب و فیاض ہو۔

21- کوئی جگہ اولیا اللہ سے خالی نہیں۔ جب اولیا اللہ باقی نہ رہیں گے قیامت واقع ہوگی۔

22- صوفیہ نے اذکار اس لیے مقرر کیے ہیں کہ انسان صفات بشریہ سے نکل کر متصف بصفات اللہ ہو جائے۔ پس کوشش کرنی چاہیے۔

23- اشغال و اذکار کے لیے استعمال مغزیات و مرکبات ضرور رکھنا چاہیے۔ آسان نسخہ یہ ہے۔ شکر سفید ایک سیر روغن زرد ایک سیر۔ مرچ سیاہ دو تولہ۔ سنوف کر کے سب ایک جا کر لے۔ ایک دو تولہ علی الصباح کھالیا کرے۔

24- عارف کو نعمائے دنیوی سے بھی ترقی ہوتی ہو کیونکہ نعمائے دنیوی عکس نعمائے اخروی ہیں۔

25- رزق جستجو سے حاصل نہیں ہوتا مگر کرنی چاہیے یہی معنی عبدیت کے ہیں۔

26- جو خود محتاج اور قائم بالغیر ہو در اصل وجود نہیں ہو جیسے کاغذ پر جو حروف لکھے جاتے ہیں وہ کاغذ سے قائم ہیں دراصل بے بنیاد ہیں۔

27- ظاہر میں خلق کے ساتھ رہنا چاہیے اور باطن میں حق کے ساتھ۔ اگر پانی کشتی کے اندر آوے غرق ہو جاوے۔ اگر باہر رہے باعث نجات کشتی ہو۔

28- ایک قطرہ منی نکلنے سے تمام بدن نجس ہو جاتا ہو کیونکہ منی ہر ہر جزو اور اعصاب سے نکلتی ہے بخلاف پیشاب کے کہ اس کے واسطے ایک مقام مقرر ہے۔

29- عذاب و ثواب اس جسم پر نہیں ہے بلکہ جسم مثالی پر کہ خواب میں نظر آتا ہی ہوگا۔ نیز روح اعظم جو انسان پر کہ ایک تجلی حق ہے عذاب نہ ہوگا۔ وہ مثل آفتاب کے ہے اور روح حیوانی مانند چراغ کے۔

30- کچھ موجود نہیں ہے۔ سب فنا ہے۔ جس کے اول و آخر فنا ہے اس کی حالت متوسط کا کیا اعتبار۔

31- جب گیان حاصل ہو جاتا ہے تمام اعتراض جاتے رہتے ہیں۔

32- اس زمانے میں جہاں ذرا سا اثر ذکر کا قلب پر ہوتا ہے قبل اس کے پختہ ہونے کے دوسرے لطیفہ پر متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے فائدہ نہیں ہوتا۔

33- گدا سخاوت کا آئینہ ہے۔ جیسے چہرے کے حالات بدون آئینہ کے معلوم نہیں ہوتے ایسے ہی صفت کرم مخفی ہو بدون گدا کے۔

34- پستی عجیب چیز ہے۔ زمین میں کہ پستی ہے کیسے کیسے پھول اگتے ہیں اور پہاڑوں میں اور پتھروں میں

بدون رخصت کے کچھ پیدا نہیں ہوتا اور پانی پستی میں ہوتا ہے اس سے کیا کیا فائدے ہیں۔

35- عورت مظہر مرد کی ہے اور مرد مظہر حق ہے۔ عورت آئینہ مرد ہے اور مرد آئینہ حق۔ پس عورت مظہر و آئینہ حق ہے اور اس میں جمال ایزدی ظاہر و نمایاں ہو ملاحظہ کرنا چاہیے۔

36- نیستی اور عدم ایک لذیذ چیز ہے ہر شخص اپنے عدم کا عاشق ہے۔ جب تعب ہوتا ہے سونا اختیار کرتا ہو اور نیند ایک قسم کا عدم ہے۔

37- اخلاق جبلیہ زایل نہیں ہوتے البتہ درویشوں کی صحبت سے اس میں تہذیب آ جاتی ہے۔

38- فقیر کو چاہیے کہ نہ طمع کرے نہ منع کرے۔

39- لذت دیدار بہت دور ہو طالب کو لذت نام کافی ہے۔

40- جوانی میں خوف اور پیری میں رجا اور امید کو غالب ہونا چاہیے۔

41- مرض بھی رزق ہے اس کو نعمت خیال کرنا چاہیے۔

42- نیت شریعت و طریقت کی مثل وضو اور نماز کے ہے۔

43- اکثر لوگ ناشکری کی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم ذکر و شغل کرتے ہیں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا حالانکہ خدا کی لو میں لگ جانا اس کی یاد میں مشغول ہونا بڑی نعمت ہے۔ اگر خداوند کریم خود جذب نہ فرماتا تو کوئی کیسے اس کی یاد تازہ کرتا۔ بندہ کو بندگی کرنی چاہیے۔ خداوندی خدا کے اختیار میں ہے۔

44- بدون مجاہدہ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

45- عاشق کے رنج و راحت مرض و صحت دونوں یکساں ہیں۔ جو لطف و مزا یار کے انعام و اکرام میں ہے وہی لطف چین اس کے قہر و ایذا میں ہے۔

46- خدا سے دعا مانگتے رہو کہ وہ ہم غربا کو اپنے ابتلا و امتحان سے محفوظ رکھے۔ رزق کا کفیل و ذمہ دار خدا ہے۔ ہم پر تمام مصائب ہمارے اعتقاد سے ہیں۔ اسماء اللہ میں سے ہم کو ایک رسم کی بھی معرفت حاصل نہیں۔

47- سبب کا مرتکب ہونا توکل کے منافی نہیں ہے۔

48- جس طرح راحت و آرام نعمت ہے اسی طرح بلا بھی نعمت ہے۔ (ایک شخص کا ہاتھ خراب تھا۔ بہت کرب میں تھا۔ دعا کروانے کے لیے آیا حاجی صاحب نے فرمایا: سب لوگ دعا کریں کہ اے اللہ اگر چہ ہم کو معلوم ہے کہ یہ تکلیف بھی نعمت ہے لیکن ہم لوگ اپنے ضعف کی وجہ سے اس نعمت کے متحمل نہیں ہو سکتے اس نعمت کو مبدل بہ نعمت صحت فرما دیجئے۔

49- عارف کامل کی یہی نشانی ہے کہ رنج کی بات سے اس کو رنج ہوتا ہے لیکن وہ اس سے راضی ہے۔ رنج اور رضا ایسے باہم ہوتے ہیں جیسے کریلوں میں مرچیں کہ بہت ڈالی جائیں تو سی سی ہوتا ہے۔ ناک اور آنکھوں سے پانی بہتا ہے اور مزا بھی آتا ہے پس لذت اور کلفت دونوں جمع ہو سکتی ہیں۔

50- فرمایا کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے۔ دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں؟

51- اگر تم سے کوئی مناظرہ کرے تو تم کبھی مناظرہ نہ کرو۔ اس سے دل سیاہ ہوتا ہے۔

52- فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو عاشق احسانی ہیں صفات بحث کے ساتھ ہمیں محبت کہاں۔ (خدا کے ساتھ محض اس کے احسان اور انعام کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔)

53- خداوند تعالیٰ اپنے بندے سے بجز شکستگی و خستگی کے اور کچھ نہیں چاہتے۔ غرض ان کی بارگاہ میں بجز تضرع و زاری کے کوئی کامیابی کا طریقہ نہیں۔

54- اکثر لوگ ناشکری کی وجہ سے محروم رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم ذکر و شغل کرتے ہیں اور کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا حالانکہ خدا کی لو میں لگ جانا اور اس کی یاد میں مشغول ہونا ہی بڑی نعمت ہے۔

55- ملفوظات مشائخ و مکتوبات کا مطالعہ مرد کو شیر بناتے ہیں اور نامرد کو مرد۔

56- اپنے اوقات کو ہر گھڑی و ہر دم ذکر و شغل میں مشغول رکھیں اور ہمیشہ خلوت کو محبوب جانیں اور اغیار کی محبت سے بھاگتے رہیں۔ اگر کثرت اشغال و اذکار سے کبھی طبیعت پر ملال گزرے تو کتب اخلاق و سلوک جیسے احیاء العلوم و کیمیائے سعادت و مثنوی مولانا روم و مکتوبات حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا مطالعہ پیش نظر رکھیں۔

57- جب طالب محبوب ترقی کرتا ہے تو چونکہ پرتو جمال محبوب حقیقی ہر شے میں ظاہر ہے۔ دل طالب کا ہر جانب خصوصاً حسینان جہاں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور لذت لیتا ہے۔ ایسی حالت میں طہارت اور خلوت اپنے پر واجب جانے۔ ہر وقت باوضو رہے اور جس وقت وضو ٹوٹے فوراً کر لے۔ مخلوق سے دور رہے اور ناجائز کھانے سے پرہیز کرے۔

58- عشق مجازی حقیقت پر تو اس وقت تک ہے کہ معشوق مجازی سے وصال نہ ہو ورنہ نقصان عاشق ہے۔ یعنی طالب حق کو چاہیے کہ مجاز میں حقیقت کو دیکھے اگر مجاز کا غلبہ ہو تو اس کے دفع کی صورت یہ ہے کہ نفی و اثبات کے ذکر کے وقت معشوق مجازی کی صورت اپنے قلب میں تصور کرے اور کلمہ لا کو اندرون دل سے تمام شدت و قوت سے کھینچ کر اور الا کو داہنے مونڈھے پر پہنچا کر اور سر کو پشت کی طرف کر کے تصور کرے کہ محبوب مجازی کی صورت اور اس کی محبت کو دل سے باہر نکال کر پس پشت ڈال دیا ہے اور سانس کو چھوڑ کر لفظ الا اللہ قوت اور زور کے ساتھ دل پر مارے اور ملاحظہ کرے کہ انوار الٰہی اور محبت کو دل میں لایا ہوں۔ اسی کشاکش اور دمادم کے ساتھ ذکر کرے اور چند روز عمل کرے۔ انشاء اللہ چند عرصہ میں عشق مجازی عشق حقیقی بن جائے گا۔ خاطر جمع رکھیں۔ نیز پانچ سو بار ہر روز اللہ الصمد پڑھے اور بعد نماز عشاء ایک سو ایک بار یا عزیز اور اسی قدر یا ارحم الرحمین پڑھے۔

59- ہوس و خواہش باکرہ اور حسین نوعمر سخت مرض ہے اور مانع سلوک ہے۔ اس سے پناہ ڈھونڈنی چاہیے۔ اس کا علاج طعام لذیذ کا ترک (2) اور روزہ رکھتا ہو (3) اور ذکر اسم ذات کی کثرت ہو (4) بعد نماز صبح اور بعد نماز شام ایک سو بار لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم مع بسم اللہ کے مدام پڑھیں اور (5) پانچ سو بار اللہ الصمد بھی روز مرہ ورد ہو۔

60- تواضع نفاق کے ساتھ ممنوع ہے۔

☆ خدا

☆ مذہب

☆ روحانیت

☆ تصوف

☆ تصورِ شیخ، یا مرشد، گرُو

☆ فرد

☆ فرد اور ارتقاء

☆ انسانی فطرت

☆ کامیابی کے گرُ ترقی

☆ حقیقت اور سچ

☆ ملفوظات ارشادات

خدا

خدا

ہر شخص کا خدا کے بارے میں ایک اپنا ہی تصور ہے۔ لیکن تصور خدا نہیں ہے۔ خدا تصور سے الگ ہے اور الگ الگ تصورات سے خدائے واحد کا کوئی تعلق نہیں۔ خدا کے بارے میں اس وقت علم ہوتا ہے جب انسان خدا کو وحدہ لاشریک سمجھنے لگے۔ لفظی طور پر نہیں روحانی اور سری طور پر اس سے آشنا ہو جائے۔ خدا ایک کل ہے ایک وحدت ہے۔ لیکن میکینکل ذہن سے سمجھ میں نہیں آ سکتا کیونکہ میکینکل ذہن ایک اکائی کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ دوئی والا اور کثیر الافعال ذہن ایک خدا کو نہیں سمجھ سکتا۔ ایک 'پورا' اور کل ذہن ہی اس کو واحد اور لاشریک سمجھ سکتا ہے۔

ایک کل ذہن ایک Whole mind بجائے خود آزادی اور فارغ البالی ہے۔ آدمی یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس کے ذہن کا ایک جزو ہی سارا ذہن ہے جیسے کوئی یہ سمجھ لے کہ ڈنمارک ہی ساری دنیا ہے.....ایک حصے یا ایک جزے کو کل سمجھ لینا ہی راہ کی سب سے بڑی اڑچن ہے۔ اس سے احتراز لازمی ہے۔ یادبود اور memory انسان کو آزادی عطا نہیں کر سکتی۔ غلط رو اور بے راہ رو یادا انسان کو غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔ کچھ لوگوں کے ذہن یادداشتوں سے اٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ ان کے زور پر ہی خدا کی پوجا کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان یادداشتوں کو ہی خدا سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ خدا ماضی کی یادوں کا حصہ نہیں ہے۔ خدا ایک کل ہے جو سارے زمانے پر ایک کل کی حیثیت میں ہی پھیلا ہوا ہے۔

(1)۔ لوگوں کے ساتھ مل کر رہنے میں بھی مزا ہے اور ساتھ ہی ان سے خوف بھی آتا ہے کہ وہ ہر دم ہمارے تحفظ کو دھمکاتے رہیں گے اور اُسے خوفزدہ کرتے رہیں گے۔

تم کو ان لوگوں کا مرہون منت ہونا چاہئے جو تمہارے امان کو یا جسے تم تسکین خاطر کہتے ہو اُس کو دھمکاتے ہیں اور اس کے لیے خطرہ ہیں۔ یہ لوگ تم کو ایک بنیادی سبق سکھانے پر مامور ہیں۔ یاد رکھو کہ جو امان اور جو تحفظ خطرے میں گھرا ہوا ہو اور دھمکایا جا سکے وہ امان نہیں ہوتا Security نہیں ہوتی۔

(2)۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو لوگوں میں صرف اچھائی ہی ڈھونڈنی چاہئے۔

یہ بھی اپنے آپ میں اور اپنی مصنوعی نیکی میں تفاخر پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اچھائی آ سکتی ہے۔ دیکھی

جا سکتی ہے لیکن صرف برائی کا مطالعہ کر کے۔ کسی چیز سے آنکھیں چرانے والا اس کے مطالعے سے محروم رہ جاتا ہے۔

ذہن کا اور intellect کا سارا وجود اور اس کی اساس "ناں" پر قائم ہے۔ جب تک آپ میں نہ کہنے کی صلاحیت ہے اس وقت تک آپ Intellect کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی وقت تک آپ دانشور ہیں۔

جوں جوں انسان دانشور ہوتا جاتا ہے اُس کے لیے "ہاں" کہنا مشکل ہوتا جاتا ہے۔

اگر تم "نہ" کہہ رہے ہو تو ذہن کام میں مصروف ہے اور عمل ہو رہا ہے۔

جب آپ نے "ہاں" کہہ دیا تو وجود ٹھہر گیا۔ عمل رُک گیا۔ سکون شروع ہو گیا۔

ایمان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی..... نہ حق میں نہ خلاف۔

جن لوگوں نے خدا کو عقل سے اور دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی (اور ولایت میں اس پر بڑا کام ہوا اور اب بھی ہو رہا ہے)۔

اور جن لوگوں نے خدا کے وجود کو دلیل سے ثابت بھی کر دیا اور لوگ اس کو مان بھی گئے انہوں نے خدا کو دلیل کے تابع کر دیا۔ دلیل کو خدا سے افضل کر دیا۔ دلیل خدا سے بڑی ہو گئی۔

لیکن جو خدا دلیل سے ثابت ہو گیا..... وہ دلیل سے رد بھی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اس دنیا میں جتنے بھی دہریے اور خدا کو نہ ماننے والے ہیں وہ خدا کو ماننے والے دلائل پسند لوگوں کی وجہ سے ہیں۔

دینی لوگوں نے خدا کے بارے میں کبھی کوئی دلیل نہیں دی۔ انہوں نے خدا کو اوڑھا ہے خدا کو اختیار کیا ہے اپنایا ہے..... تم خدا کو دیکھ نہیں سکتے لیکن اُن لوگوں کو دیکھ سکتے ہو جنہوں نے خدا کو اختیار کر رکھا ہے۔

جب کسی خدا رسیدہ شخص سے ملاقات ہوتی ہے تو آپ کی عقل اور آپ کی دانش آپ کو یہ نہیں بتلاتی کہ اس آدمی کو پکڑ لو۔ یہ شخص روحانی ہے خدائی ہے.....

خدا رسیدہ آدمی کو دیکھ کر آپ کا دل کچھ اور طرح سے دھڑکنا شروع ہوتا ہے۔ آپ کا دماغ نہیں آپ کا دل اُس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔

ذہن دلیل اور برہان یا تو ثابت کر سکتا ہے یا نا ثابت کر سکتا ہے اور جس وقت وہ کوئی چیز ثابت بھی کر رہا ہوتا ہے اُس وقت وہ "چیز" کے بجائے اپنے آپ کو ہی ثابت کر رہا ہوتا ہے۔ اپنی ہی گا رہا ہوتا ہے۔

خدا کے وجود کو ثابت کرتے وقت اور لوگوں کو قائل کرتے وقت آپ خدا کو ثابت نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اپنے آپ کو اپنی عقل کو اپنی دانش کو ثابت کر رہے ہوتے ہیں۔

آپ خدا کو اجاگر نہیں کر رہے ہوتے آپ لوگوں کو معقول کر رہے ہوتے ہیں۔

آپ یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ دیکھو اس کو کہتے ہیں دانشمندی اور منطق آویزی۔

انا کی سب سے پسندیدہ خوراک Intellect ہے۔ Ego ذہن پر بڑا پھلتا پھولتا ہے۔ جب آپ ثبوت مہیا کر رہے ہوتے ہیں یا دلائل کاٹ رہے ہوتے ہیں۔

اس وقت خدا کا وجود یا خدا کا ماڈل سامنے نہیں ہوتا۔ صرف آپ ہی ہوتے ہیں۔ آپ ہی مرکز بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ سب توجہ آپ کی ذات پر ہی مرکوز ہوتی ہے۔

آپ محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ آپ بتا سکتے ہیں آپ بیان کر سکتے ہیں۔ آپ ثبوت دے سکتے ہیں۔ دلیل دے سکتے ہیں۔ مثال بیان کر سکتے ہیں۔

اس وقت خدا کا سارا دارومدار بھی آپ پر ہی ہوتا ہے۔

آپ چاہیں تو اُس کو ثابت کر دیں نہ چاہیں تو اُس کا بطلان کر دیں۔ اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔

اس کائنات میں Intellect کے سامنے ہر شے کی حیثیت ثانوی ہے۔ نمرون Intellect ہی ہے۔

ایمان کہتا ہے کہ دانش اور برہان کی حیثیت بعد کی ہے۔ "ہونے" کا وجود افضل ہے۔ ساری چیزیں ہونے سے تعلق رکھتی ہیں۔ Being اوّل ہے اور دانش ثانوی ہے۔ دانش اس کا ایک جزو ہے۔

لیکن Intellect ایک آمر ہے۔ ایک ڈکٹیٹر ہے جبکہ ایمان جمہور پسند ہے۔ ایمان آپ کے سارے وجود کو سارے "ہونے" کو معنی عطا کرتا ہے۔ expression عطا کرتا ہے جبکہ دانش جو محض ایک جزو ہے اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو افضل اور اعلیٰ اور supreme سمجھتی ہے۔

آج صبح بھی نماز کا وقت ایسے ہی گزر گیا اور یہ کوئی نئی بات نہیں، میرے ساتھ اکثر ایسے ہوتا ہے۔ دیر سے آنکھ کھلتی ہے اور میں ایسے ہی لیٹا رہتا ہوں۔

میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر کل کا اخبار اٹھا لیا۔ حق جلالی، اف توبہ میرا وجود خوف سے کانپنے لگا: دو بیٹوں نے زمین کے کاغذات پر زبردستی انگوٹھے لگوا لیے۔ پھر باپ کو قتل کر کے اس کی لاش جوہڑ میں پھینک دی۔

مفرور قاتلوں نے اسی گھرانے کے دو اور افراد قتل کر دیے۔

شہر میں ڈاکے، قتل اور چوریاں..... اغوا برائے تاوان کے لیے تین سالہ بچہ اٹھا لیا جو گھر والوں کی یاد میں روتا روتا فوت ہو گیا..... تیس گاڑیاں چوری ہو کر سرحد پار پہنچ گئیں۔

میرے ذہن پر تشویش کے کالے سیاہ بادل چھا گئے اور میرا ہر شے پر سے اعتماد اٹھ گیا۔ میں نے سوچا۔

کار کو چور سوچ لگوالوں گا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے پیچھے لوہے کے جنگلے بنواؤں گا۔ گیٹ پر گارڈ رکھوں گا۔

یہ زمانہ اب رہنے کے قابل نہیں رہا۔ خودکشی حرام ہے لیکن ایسے وقت جائز ہونی چاہیے۔ وہ لوگ کس قدر خوش نصیب ہیں جو اس زمانے میں فوت ہو چکے ہیں۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے پیٹ پر دھم سے ایک گولہ گرا اور اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میری ہی بلی کمبر فرش سے کود کر میرے پیٹ پر آ گری تھی اور اب وہاں سے چل کر میرے سینے پر...... چھینک ماری کہ کب تک لیٹے رہو گے، میرے دودھ کا وقت ہو گیا ہے اور تم کو کچھ فکر نہیں...... میرے سینے پر بیٹھ کر خرخر کرنے لگی۔ پھر آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلی گئی۔ میں دیر تک اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا رہا......

اسی طرح لیٹے لیٹے مجھ خیال آیا کہ اگر میں کمبر (بلی) کی طرح ساری فکریں چھوڑ کر اپنے اللہ کی یاد میں کھو جاؤں تو کیا مجھے وہ سب کچھ نہیں ملے گا جو اس بلی کو ملتا ہے...... خوراک، رہائش، توجہ، محبت، Care

اگر میرے جیسا ست کم ہمت اپنی بلی پر اس قدر توجہ دیتا ہے تو کیا میرا خدا میرے لیے سب کچھ نہیں کرے گا۔

اس خیال سے سرشار میں نے باورچی خانے میں آ کر اس کے لیے دودھ نکالا اور وہ رکابی میں اسے لپڑنے لگی۔

جب میرے دل میں یہ کوئی خوف پیدا ہوتا ہے تو میں اس کو کاغذ پر لکھ لیتا ہوں...... کئی مرتبہ پڑھتا ہوں۔

اگر آپ انسانوں کو پرکھنے کے فن سے آشنا ہونا چاہتے ہیں اور ان کی نفسیات سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو میری تائی کے فارمولے پر عمل کریں۔

بڑے سالوں کی بات ہے وہ میرے پاس آیا، کہنے لگا دعا کریں مجھے کام مل جائے۔ میں نے کہا، تم یقین سے کہتے ہو کہ تمہیں کام کی تلاش ہے؟

کہنے لگا، حد کرتے ہو۔ میں پچھلے دو سال سے بیکار ہوں، اگر مجھے کام کی تلاش نہ ہو گی تو اور کس کو ہو گی؟

میں نے کہا، اچھا اگر تمہیں کام مل جائے اور اس کا معاوضہ نہ ملے...... پھر؟

وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا تو میں نے کہا، اگر تمہیں کام مل جائے اور کام کرنے کی تنخواہ نہ ملے...... پھر؟

گھبرا کر کہنے لگا، مجھے ایسا کام نہیں چاہیے جیسا کہ تم کہہ رہے ہو۔ مجھے نوکری والا کام چاہیے۔ ایسا کام جس کے دام ملیں۔

میں نے کہا، اچھا اگر تم کو تنخواہ ملتی رہے اور کام نہ کرنا پڑے...... پھر؟ ایسا سودا اچھا نہیں رہے گا؟

کہنے لگا، سبحان اللہ، ایسا ہو جائے تو پھر اور کیا چاہیے۔

میں نے کہا، تو پھر تم کو کام کی تلاش نہیں، تنخواہ کی اور معاوضے کی تلاش ہے......

چلو یہی سمجھ لو۔

میں نے کہا، پھر تنخواہ کا ٹنٹا بھی کیوں۔ کہیں سے چھپر پھاڑ کے نہ مل جائے۔ کوئی ورثہ، کوئی ترکہ، کوئی انعامی بانڈ، کوئی لاٹری۔

کہنے لگا، یہ بھی ٹھیک ہے بلکہ بہت ہی ٹھیک ہے۔

اسی طرح ہم خدا کے ساتھ کرتے ہیں۔ بظاہر عبادت لیکن بباطن کسی اور شے کی طلبگاری ہوتی ہے۔

میں اپنی ساری مشکلات خدا کے پاس لے جاؤں اور چکر کاٹنا چھوڑ دوں۔ میری ماں کے پاس گاؤں سے ایک

بوڑھی عورت اماں سوندھاں آیا کرتی تھی، اس کے پاس کئی پوٹلیاں ہوتی تھیں اور وہ ساری کھول کھول کر میری ماں کے سامنے رکھتی جاتی تھی۔ اماں ان میں سے کچھ لیتی نہیں تھی، جاتے ہوئے اسے کچھ رقم دے دیتی تھی...... شاید میں اس طرح اپنے دکھ اس کے پاس لے جاؤں لیکن میں اپنی پوٹلیاں لے کر جاؤں، آرام سے بیٹھوں۔ سائیکل پر جاتے جاتے یا موٹر سائیکل چلاتے ہوئے شکوہ شکایت نہ کروں۔

بابا جی اصل میں خدا ہے کیا؟

خدا نہ جانا جاتا ہے نہ جانا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں تمہارا ہر خیال حقیقت کے خلاف ہے۔

تو پھر آپ ہر وقت خدا کی باتیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟

پرندہ ہر وقت گاتا کیوں رہتا ہے؟ پرندہ اس لیے نہیں گاتا کہ اس کے پاس کوئی اعلان ہوتا ہے، کوئی خبر ہوتی ہے۔ کوئی دوپہر کا ضمیمہ ہوتا ہے۔ وہ اس لیے گاتا ہے کہ اس کے پاس ایک گیت ہوتا ہے۔

کوئی ایسا فارمولا بتایئے جس سے خدا کی محبت پیدا ہو۔

اپنے ہاتھ آپس میں رگڑو۔ شاباش، دونوں ہتھیلیاں...... کیا کوئی گرمی پیدا ہوئی۔

جی بہت (گالوں کو لگاتی ہے)

بس اسی طرح رگڑتے رگڑتے گرمی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کام میں لگنا ضروری ہے، پوچھتے رہنا نہیں۔

جو نہ دیکھا جا سکے نہ سمجھا جا سکے نہ تصور میں لایا جا سکے۔ اس کو ماننے والے صاحب ایمان لوگ سمجھ بھی جاتے ہیں۔ تصور میں بھی لے آتے ہیں اور دیکھ بھی لیتے ہیں۔ صحیح اور سچی زندگی خدا پر ایمان رکھنے سے حاصل ہوتی ہے اور خدا پر ایمان رکھنا اسی کو جاننا اور اس کی جے جے کار کرنا ہے۔

روح تو ایک سوکھی پیاسی اسفنج کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ خدا کا تعلق ہی اس کو سرشار اور شرابور کرتا ہے ورنہ یہ سوکھی پیاسی ہی ختم ہو جاتی ہے۔

اگر تم نیکی، پاکیزگی اور تقویٰ کے بغیر خدا کا نام لیتے ہو تو پھر خدا ایک نام ہی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس ارضی دنیا کی ساری طاقتیں اور ساری خدائیاں نہ صرف خدا سے دور ہیں بلکہ خدا کے خلاف ہیں۔

انسان مخلوق ہے۔ ایسی مخلوق جو تخلیق کو Form کرتا ہے اور Transform کرتا رہتا ہے۔ خود کچھ
سکتا لیکن وہ...... اور اس جیسے دوسرے سارے انسان انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اپنے آپ کو خالق اکبر کے حضو
ضرور پیش کر سکتے ہیں اور اس سے طلب کر سکتے ہیں کہ اے خدا ہمارے Image کی حفاظت فرما۔ اس کی تکمیل فرما
کو perfect کر دے۔

باقر شاہ کمبل پوش سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک کفر و اسلام میں کوئی فرق ہے؟ جواب دیا، کچھ بھی نہیں۔ دو
شانیں سرکاری ہیں، اندھیرے میں اجالے کا سا حال ہے۔ پوچھا تم کس طریقے پر ہو؟
بولا "کسی پر بھی نہیں۔ سردی میں دھوپ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گرمی میں چھاؤں، دن کو اجالا اچھا لگتا ہے، را
کو روشنی۔

پھر باقر شاہ نے ہم سے پوچھا تم کس طریقے پر ہو؟
میں نے کہا، صاف ظاہر ہے کہ ہم لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ میں شریک ہیں لیکن باطن کا حال معلوم نہیں کہ کو
ہیں اور کیا ہیں۔ کوئی کہتا ہے باطن کے اندر خدا ہے۔ کوئی کہتا ہے ایک نفس اور ایک شیطان بھی اس میں گھسا ہوا ہے۔ اب
وہی جانے، اگر اس میں خدا ہے تو ان سب کا گزارا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خدا کے ساتھ رہیں۔ ہاں بطور خدمت گارو
کے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک وقت میں انسان خدا سے ناآشنا ہوتا ہے، پھر کسی لمحے پوری آشنائی حاصل کر سکتا ہے۔ اک کے ساتھ اک
مک ہو جاتا ہے۔ کبھی تو اس کا علم ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص پوری سرخوشی میں ہوتا ہے تو وہ اس کو چیزوں
سے، دولت سے، جائیداد سے، ترقی سے منسوب کرتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ
ملول اور رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ چیزیں اور ترقیاں اور دولت اور ہونا انسان کو خوش نہیں رکھتا (جب وہ سوتا ہے تو
یہ ساری چیزیں اس کے تصرف میں نہیں ہوتیں)
جس طرح باپ بچے کو ہوا میں اچھالتا ہے اور پھر پکڑ لیتا ہے، پھر اچھالتا ہے اور پھر پکڑتا ہے۔ ہوا میں بچہ ڈرتا
ہے، سہمتا ہے اور بازو میں واپس آنے پر یقین و آسائش سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہی حال خدا سے آشنائی کا اور ناآشنائی کا
ہے۔ بازوؤں میں آنے کا اور بازوؤں سے نکل جانے کا ہے۔
میں اس کورم میں بھی ایسے ہی پاتا تھا۔ خالی کے اندر سامع ناآشنا ہوتا ہے اور سامع پر آشنائی کے اندر داخل ہو
جاتا ہے۔ یہ خالی اور سامع، آشنائی اور ناآشنائی کبھی ہونا اور کبھی نہ ہونا ویسا ہی خطرناک کھیل ہے۔ جیسا سرکس کا کرتب باز
سب سے اونچی پینگ پر ہلارے لے لے کر کیا کرتا ہے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔
بڑی موسیقی وہ ہے جو موسیقار کی روح سے ہم آہنگ کر دے۔ اس کی آواز، اس کی لے یا اس کے ظن سے نہیں

اندر جو گزر رہی ہے اس سے آگاہ کر دے...... دیکھئے ناچ، اودھم، بھنگڑا تو کسی بھی بیٹ پر ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے
حیران ہو کر سوچتے ضرور ہیں کہ نصرت فتح علی کی موسیقی پر میں کچھ آشنا سا ہو جاتا ہوں۔ کس سے؟ کون سے؟ وہ
جو موسیقی سے اگلے پالے پر بیٹھا ہوتا ہے۔

ایک سیکنڈ کے لیے خدا کو پا جانا بڑے سے بڑے گناہ کو دھو دیتا ہے۔ بڑی سے بڑی بیماری کو دور کر دیتا ہے۔
مصیبتیں کاٹ دیتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ خدا کو پانے کا لمحہ ہو۔ خدا کے بارے میں باتیں کرنے کا یا اس کے وجود کو
نے کا یہ وعظ کرنے کا موقع نہ ہو...... کیا مچھلی کوشش کر کے یا در تلاش کر کے اور تحقیق کر کے پانی کو کھوجتی ہے۔ کیا
غوطہ مار کر ہواؤں کو تلاش کرتا ہے۔ نہیں! مچھلی تو ہوتی ہی پانی میں ہے۔ عقاب اڑتا ہی ہوا میں ہے۔ کیا ہم مطالعہ
خدا کو تلاش کرتے ہیں...... بالکل نہیں۔ ہم تو ہوتے ہی خدا میں ہیں۔ کیا اس کا فضل ہم دعا کر کے حاصل کرتے
تو ہمیں ایسے ہی ملا ہوتا ہے مفا مفت۔

ہر چیز کا اصل اور ہر شے کا جوہر دراصل غیر مرئی ہوتا ہے۔ نہ نظر میں آنے والا ہوتا ہے۔ یہ دنیا جو نظر آتی ہے اور
یہ کسی موجود چیز سے وجود میں نہیں آتی ہے بلکہ غیر مرئی سے، نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب زمین میں ایک دانہ
تا ہے تو ایک Life force اس پر کام کرتی ہے اور قوت حیات ہمیشہ غیر مرئی ہوتی ہے اور یہی نظر نہ آنے والی لائف
بیج پر اپنا عمل کرتی ہے اور اس زمین پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور پودا نمودار ہوتا ہے۔ پتے، شگوفے، پھول اور پھل سامنے
تے ہیں۔ کوئی اس کو قدرت کہتا ہے، کوئی نیچر، کوئی قوت حیات لیکن اصل میں یہ خدا ہے۔ یہ طاقت، یہ قانون یہ اصول
ہے۔

انسان کے اندر خدا کی محبت، خدا ہی ہوتی ہے۔

ایک نقطہ اٹھا لو تو سطر (لائن) ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کو ختم کر دو تو سارے جاندار ختم ہو جاتے ہیں لیکن یہ
نہیں ہو سکتا کہ جاندار ختم کر لو تو......

یہ کبھی خیال نہ کرنا کہ تمہاری اپنی دانش آگے بڑھ کر خدا کا احاطہ کر لے گی اور اس کی ذات متعین کر جائے گی۔
نہیں ہے...... بلکہ جب خدا تم کو ربانی خصائص سے بہرہ ور کرے گا تو کسی بیرونی روشنی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بیرونی
قدرتی روشنی کو یکسر ختم ہونا پڑے گا تا کہ خدا کا اپنا نور تمام و کامل نور تمہارے اندر منور ہو سکے۔

اس دنیا میں کہیں بھی خدا نہیں مل سکتا۔ وہ اپنے وجود اور اپنے تصور سے ماورا ہے۔ اس کی حقیقت زمان اور مکان میں نہیں۔ اس کے وجود کی نمائش نہیں کی جا سکتی۔ دکھایا، بتایا نہیں جا سکتا۔ اس کی حقیقت، اگر کوئی ہے تو وہ اس دنیا کی حقیقتوں سے مختلف ہے۔ کوئی بھی سائنس اب تک کی یا اس کے بعد آنے والی خدا کو سوچ نہیں سکتی۔ اس کو خیال میں نہیں لا سکتی۔ کوئی Cognitive ذات بحث کا نہ تو احاطہ کر سکتی ہے، نہ اس کو بیان کر سکتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ علم کے اندر کوئی خدا نہیں ہے کہ علم اس کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا۔

میں تم کو بڑی اہم، بڑی ضروری اور بے حد خفیہ بات بتانا چاہ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے، تم مصروف ہو۔ اپنی زندگی بنا رہے ہو۔ اپنا مستقبل سنوار رہے ہو۔ اپنی خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے ہو۔ اپنی ذات کو جاننے کی کوشش میں مصروف ہو۔

لیکن میں ایک بہت ہی اہم بات کرنی چاہ رہا ہوں۔ یہ بات اہم نہ ہوتی تو میں تم کو زحمت ہی نہ دیتا۔ تم سے بات ہی نہ کرتا۔ بہت ممکن ہے کہ تم یہ بات خود بھی جانتے ہو۔ پہلے بھی سن رکھی ہو لیکن اب بھول گئے ہو۔ وقت گزر گیا ہے اور تم نے اسے فراموش کر دیا ہے یا تم نے اس کے بارے میں سوچا بھی ہو، پھر یہ خیال آیا ہو کہ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ تو بہت ہی عجیب سی بات ہے...... انہونی...... جگوں وکھری۔

میں تم کو یہ بتانے آیا ہوں کہ جب تک تم اللہ سے نہیں پوچھو گے، بالکل سیدھے۔ بلاواسطہ طور پر اس وقت تک تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور وہ تم سے کیا چاہتا ہے۔ جب ایک دفعہ اس کو سوال ڈال کر بیٹھ گئے تو پھر دل کے اندر جھانک کر ان ارتعاشوں کو دیکھو جو سوال کا جواب لاتے ہیں...... لیکن اس عرصے میں اگر کوئی جواب موصول نہ ہو اور تمہارے سوال کا جواب خاموشی ہو تو پھر خوش ہو جاؤ کہ یہی جواب ہے اور اسی جواب کے لیے تمہیں سرگرم عمل رکھا گیا ہے۔

تم یہ کس طرح سے کہہ سکتے ہو کہ فلاں گھٹیا ہے اور فلاں بڑھیا۔ اس کا درجہ بلند ہے اور اس کا کمتر۔ یہ بات انسان کے طے کرنے کی نہیں ہے...... اگلے زمانے میں کوئی بادشاہ تھا، جس کے دربار میں اس کے موسیقاروں کا طائفہ اپنے سازوں کی ہم آہنگی کا کمال دکھاتا تھا۔ اسی بادشاہ کے پاس ایک بلبل بھی تھی جو سازوں کی آہنگ ختم ہونے کے درمیان اپنی سریلی آواز سے بادشاہ کا دل لبھاتی تھی۔ بادشاہ کو اس بلبل کی قدرتی، خداداد اور معصوم آواز ہنرمند، ودوان اور مشاق موسیقاروں کے کمال فن سے ہمیشہ اچھی لگتی تھی۔

اس بادشاہوں کے بادشاہ اور شہنشاہوں کے شہنشاہ کے حضور میں فرشتوں کے ان گنت گروہ ہر وقت اس کی صفت وثناء میں مصروف رہتے ہیں لیکن وہ شہنشاہ ان بے سُرے، بے وقعت اور بے حقیقت فانی انسانوں کی حمد سننے کا زیادہ خواہشمند ہے۔ چنانچہ ہم کو اپنی کم کوشی، کم آہنگی اور کم وقتی کا گلہ نہیں کرنا بلکہ اس کے حضور میں اس کی حمد وثناء کرتے ہی جانا ہے۔ اپنی قدرتی اور فطری آواز میں اور اس ادائی پر مسرور رہنا ہے۔

خدا سے ایسی محبت ہونی چاہیے جیسے بہن اور بھائی کی محبت ہوتی ہے یا ماں اور بچے کی محبت ہوتی ہے۔ ایسی محبت نہیں ہونی چاہیے جو عاشق و معشوق اور میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اپنی محبت کا اظہار برملا کر سکتے ہیں۔ جلوت میں خلوت میں، گھر میں، سرِ راہ، محفل میں، تنہائی میں لیکن دوسری قسم کے محبت کرنے والے صرف خلوت میں اور تنہائی میں اپنی محبت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

ہمیں ان لوگوں کی پیروی نہیں کرنی جو کہتے ہیں کہ ہم خدا سے اپنی محبت کا اظہار صرف مسجد میں یا مراقبے میں یا درگاہ میں یا گنبد کے اندر کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو اپنی محبت کا اظہار ہر جگہ کرنا ہے اور ہر مقام پر کرنا ہے۔ ہر شخص سے کرنا ہے اور ہر موسم میں کرنا ہے۔ اس میں چھپنا چھپانا نہیں۔

ان کے لیے جگہ صاف ستھری بنا کر رکھنی چاہیے۔

(1) اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہیں۔ یہاں آپ اس کے کام آئیں، اگلے جہان میں وہ آپ کے کام آئے گا۔

(2) اپنے کردہ گناہوں پر تاسف کا اظہار کرتے رہیں۔ ماضی میں کیے ہوئے گناہوں کو یاد کریں اور ان کو یاد دلا کر خاموشی کے ساتھ ان کی معافی مانگتے رہیں۔ (ایسے ہی لوگوں میں اعلان نہ کرتے پھریں کہ میں بڑا گنہگار ہوں) مسلسل مانگنے سے اور توبہ کرنے سے آپ کے ماضی کی گندی سلیٹ صاف ہوتی رہے گی۔ آئندہ کوئی گناہ نہ کریں۔ ہو جائے تو جلدی سے پھر معافی مانگ لیں اور توبہ کے لیے رکوع میں چلے جائیں۔

(3) جن لوگوں کے ساتھ زیادتی کی ہے، ان سے معافی مانگیں۔ خط لکھ کر یا ٹیلی فون پر ان سے معافی مانگنے کے بجائے گاڑی یا جہاز پر سوار ہو کر ان کے پاس جائیں اور بالمشافہ معافی مانگیں۔

(4) پرسکون اور مطمئن رہیں۔ کالے نہ پڑیں۔ کسی کو یا اپنے آپ کو فوراً جج کرنے نہ بیٹھ جائیں۔ خدا کے اپنے منصوبے اور اپنے پلین ہوتے ہیں۔ وہ علیم مطلق ہے، وہ ہر بات کو بہتر سمجھتا ہے۔ سیدھی راہ پر رہیں، چاہے مسافت نہ بھی طے ہو۔ جب اگلے جہان میں آپ کی آنکھ کھلے گی، وہی سیدھی راہ خدا کی قربت کا مقام ہوگی۔

یہ خدا کا خوف ہے جو نیکی اور حق کی تعلیم دیتا ہے۔ جو شخص خدا سے خوف کھاتا ہے، وہی مذہبی آدمی ہے اور وہی نیک انسان ہے۔

محبت کا اور خوف کا ایک ساتھ رہنا ناممکن بات ہے۔ خوف کس طرح سے حقیقی محبت پیدا کر سکتا ہے۔ ناممکن! نیکی اور پاکیزگی خوف کی فضا میں نہیں پل سکتیں۔ روحانیت اور محبت زبردستی ٹھونسے نہیں جا سکتے۔ ان کو تو روشن کر کے لاگو کیا جا سکتا ہے۔ روحانیت اور محبت کے پھول بے خوفی کی زمین میں اگائے جا سکتے ہیں۔ خدا کا تصور بے خوفی ہی میں پیدا ہو سکتا ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ بے خوفی ہی احدیت ہے۔

خواب موت ہے اور حقیقت زندگی۔ خواب نیند ہے اور حقیقت بیداری۔ جاگو اور اپنے آپ کو پہچانو۔

جہاں کوئی تحقیق نہیں اور کوئی مناظرہ نہیں، جہاں کوئی مختلف نظریات اور زاویے نہیں جہاں الفاظ نہیں صرف
ہے، مکمل خلا۔ وہیں سے ایک انسان دین میں داخل ہوسکتا ہے۔

زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب آپ اپنا سارا دماغ، ساری طاقت، ساری ترکیبیں اور ساری
صلاحیتیں صرف کر چکے ہوتے ہیں اور پانسہ پھینک چکتے ہیں۔ اس وقت سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور آپ کچھ نہیں
کر سکتے۔

یہ درست ہے کہ ہر شے مظہر خدا ہے مگر یہ صحیح نہیں کہ ہر ایک شے خدا ہے۔ ہر چیز خدا کی قدرت کی جلوہ گاہ ہے
مگر ہر چیز خدا نہیں ہے۔ وہ ذات قدیر و خبیر دنیا کی تمام اشیاء میں اپنا کام کرتی ہے مگر خود ان سب سے جدا اور بالا ہے۔

فہم انسانی حقائق الٰہی کے ادراک سے کماحقہ قاصر ہے اور ذکی سے ذکی انسان اور رسا سے رسا دماغ بھی آخر
کار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہم نے جیسا تجھے جاننا چاہیے تھا نہیں جانا۔ ہم صفات باری تعالیٰ میں سے صرف ان
معدودے چند صفتوں کو جان سکتے ہیں جن کا اثر ہم پر اور ہماری دنیا پر پڑتا ہے۔ اس کی ذات کی بابت تو ہم کبھی بھی کچھ نہیں
جان سکتے۔ وہ پاک ہے اور اس کی شان جو کچھ لوگ کہتے ہیں، اس سے بہت ارفع ہے۔

جب ساری ہدایات اور ساری عبادات ناکام ہو جاتی ہیں تو اس وقت گہرے غار کے اوپر اندھیرے کے
لامتناہی سمندر میں انسان کے لیے اصل ہدایت ابھرتی ہے۔ یہ انسان کی خالق اکبر اور خداوند کریم و عظیم کی طرف
رہنمائی کرتی ہے۔ اس ہستی کی طرف رہنمائی جس کو ہم جانتے نہیں، پہچانتے نہیں ہیں اور نہ ہی اس کو آنک سکتے
ہیں۔

یقیناً انسان کو اللہ پر ایمان رکھنا چاہیے۔ اس ایمان سے اس کے بہت سے مشکل مسائل کا حل خود بخود نکل آتا
ہے اور وہ قوی تر ہو جاتا ہے لیکن انسان کو اللہ پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ انسان پر بھی یقین رکھنا چاہیے۔ اپنے آپ پر
بھی ایمان رکھنا چاہیے کیونکہ اگر ہم انسان پر ایمان نہیں رکھیں گے تو خدا پر بھی ہمارا ایمان مضبوط نہیں ہوگا کہ انسان خدا کی
بہترین تخلیق ہے۔ انسان کی کمزوریاں اور مجبوریاں بہت ہیں۔ اسی طرح اس کی برتریاں اور اعلیٰ ترینیاں بھی سب سے
زیادہ ہیں۔ کیا اس نے ایٹم پھاڑ کر نہیں دکھا دیا۔ اگر وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو جہالت، تعصب اور پیکار کا قلع قمع کیوں نہیں
کر سکتا۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے انسان نے انسان پر پورا بھروسہ کر لیا اور اس نے کہنا شروع کر دیا۔ ''انسان عظیم ہے

'' یہ کہہ کر اس نے خدا پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی عقل، فہم اور انسانیت کے زور پر ایک نیا ایمان وضع کیا جو
ن کی ذات سے وابستہ تھا لیکن یہ ایمان بہت کمزور بودا ثابت ہوا۔ اس سے سارے سوالوں کے جواب نکالے نہ جا
اس سے انسان کا ایمان اپنی ذات پر متزلزل ہوگیا۔ اب اس کے پاس اس ایمان کی دولت ہی نہ رہی۔ نہ خدا پر نہ
ے آپ پر بلکہ کسی بھی چیز پر اس کا ایمان نہ رہا۔ اب وہ واپس خدا کی طرف آنے لگا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اب وہ انسان
ا ایقان چھوڑ دے گا۔

انسان پر شدت سے اثر انداز ہونے والی چیزیں تین ہیں۔ (1) وراثت (2) ماحول اور (3) تحت الشعور لیکن کیا
تین چیزیں اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کیا یہی اندرونی اور بیرونی طاقتیں ہیں جن پر اس کا کوئی زور نہیں چلتا۔ انسان کو
تحفے عطا کیے گئے ہیں جو اور کسی کو نہیں ملے۔ (1) شعور (2) تخلیق اور (3) ضمیر۔

جیسا کہ ہم خدا کے سامنے ہوتے ہوئے شیخی میں آ کر انسان عظیم ہے خدایا کہہ کر اور انسان کو بہت ہی بڑھا
کر پیش کرتے ہیں، اسی طرح ہم خدا کی صفت و ثناء کرتے ہوئے انسان کو ایک بہت ہی کمزور ماٹھی مخلوق کہنا شروع کر
تے ہیں۔

اگر دنیا کے سارے لٹریچر کا ملا کر مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ موضوع جس پر سب سے زیادہ کام ہوا ہے، خدا
ہے۔ انسان خدا پر اس قدر گہرا ایمان کیوں رکھتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ خدا کے دائرے سے اور اس کے بارے میں سوچنے
سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اگر خدا انسان کے ذہن کی پیداوار ہے تو پھر انسان اس سے اس قدر وابستہ کیوں ہے؟ چھوڑ دے،
ختم کر دے، ذہن سے کوئی اور پیداوار نکال لے۔ ہر صاحب دل صاحب نظر اور صاحب فکر نے خدا کے ہونے کے اور
انسان کے سوچنے کے کئی وجوہ بیان کیے ہیں لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جہاں انسان کا خدا پر ایمان ہے، اسی طرح خدا کا
بھی انسان پر ایقان ہے۔ فرماتا ہے کہ میرے بندوں پر ابلیس کا اغوا ممکن نہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خدا کا اپنے بندوں
کے ساتھ اس طرح سے وابستہ ہونا انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کا ذکر کرتا رہے۔ مثبت یا منفی لیکن ذکر ضرور کرتا رہے۔

دا اور دعا

دیکھو دعا کے قبول ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ جو کچھ مانگا وہ عین اسی طرح مل جائے۔ دوسری
صورت یہ ہے کہ کوئی بلا یا کوئی مصیبت آنے والی تھی، وہ ٹل گئی اور تیسری صورت یہ کہ مانگی جانے والی شے کا ذخیرہ جمع
کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ جس طرح بچوں کے لیے انعامی بانڈ یا ڈیفنس سرٹیفکیٹ لے کر رکھ دیتے ہیں کہ جب بڑے ہوں
گے تو ان کے کام آئیں گے۔ خدا تعالیٰ بھی اسی طرح کرتے ہیں کہ سوالی کے لیے اچھی نعمت آخرت کے لیے محفوظ کر کے
رکھ دیتے ہیں۔

دیکھو بیٹا! آپ اس پاک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو حزن و ملال کو نہیں جانتا۔ جو خوفزدہ نہیں ہوتا۔ جو صرف اپنے اعزاز میں بجتی ہوئی تالی کی آواز سے ہی زندہ نہیں۔ جو آج کی تعریف اور آج کی ثنا خوانی کے عوض آنے والی کل کا سودا نہیں کرتے۔

خدا کے بارے میں جاننا خدا کو جاننا نہیں ہے۔
لفظ "خدا" خدا نہیں ہے۔

خدا کے موجود ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ اس ثبوت کو الفاظ میں کس طرح سے ڈھالا جا سکتا ہے۔ خدا کے معاملے میں ثبوت کی زبان بہت ہی کمزور ذریعہ ہے۔ خیالات، مکالمات، توجیہات اور ثبوت خدا تک پہنچتے ہوئے شرماتے ہیں، گھبراتے ہیں، بھسم ہو جاتے ہیں۔ خیال میں اور دلیل میں انا ہی انا ہوتی ہے، خدا نہیں ہوتا اور خدا صرف اس جگہ ہوتا ہے جہاں انا نہیں ہوتی۔ پھر انا کے معیار سے خدا کو کس طرح سے جانچا جا سکتا ہے...... خدا پر بحث صرف ان حلقوں میں ہوتی ہے جہاں آنکھیں نہ ہوں، جہاں دل نہ ہوں۔ دل کے مشاہدات نہ ہوں۔ یہاں ایک بات لطف سے خالی نہیں کہ خدا پر بحث چاہے خدا کے خلاف ہو چاہے اس کے حق میں ہو، ایک ہی چیز ہے۔ یہ ایک ہی سکے کے دو پہلو میں۔ خدا کو ماننے والے اس کے حق میں گفتگو ہی نہیں کرتے۔ اس کو مانتے چلے جاتے ہیں...... یاد رہے کہ جو کچھ موجود ہے وہ لامعلوم ہے اور تم جاہل ہو۔ روشنی لامعلوم ہے لیکن اندھا پن معلوم ہے، خدا لامعلوم ہے لیکن جہالت ذاتی معلوم ہے۔

مذہب ذات کے اندھے پن کو دور کرتا ہے۔

قدرت کے اور فطرت کے خلاف جانے کی کوشش نہ کرو۔ قدرت کے ساتھ مقابلہ بازی کرنا سب سے بڑی حماقت ہے۔ اسی قدرت کے اندر تو خدا ہے بلکہ بزرگان دین تو قدرت کاملہ سے خدا ہی مراد لیتے ہیں۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی کمزوری اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ قدرت کے ساتھ جھگڑا شروع کر دیتا ہے اور نیچر کے خلاف نبرد آزما ہو جاتا ہے۔

انسان کہ مخلوق ہے اور جو تخلیق کو form بناتا اور transform کرتا رہتا ہے، خود کچھ نہیں بنا سکتا لیکن وہ خود اور اس جیسے دوسرے سارے انسان انفرادی طور پر یا مشترکہ طور پر اپنے آپ کو خالق اکبر کی حضوری میں ضرور پیش کر سکتے ہیں اور وہ اس سے درخواست کر سکتے ہیں اور اس سے مانگ سکتے ہیں کہ ہمارے Image کی حفاظت فرما اور اس کی تکمیل فرما اور اس کو perfect کردے۔

اے مولا نا میری رفتار میں تیزی ذرا کم کر دے۔ مجھے عجلت سے نجات دے۔ میں زندگی کے راستوں پر بہت

ہی تیزی سے دوڑ رہا ہوں اور میرے قریب سے گزرنے والا میرا کوئی بھائی، کوئی انگ ساک مجھے نظر ہی نہیں آتا۔ میں زندگی میں روز بروز بہت سی اچھی چیزوں کو مس کر رہا ہوں۔ مجھے اس خیر و برکت کا علم ہی نہیں ہوتا جو میری طرف تیری جانب سے آ رہی ہوتی ہے۔ میں زندگی میں بہت تیز بھاگ رہا ہوں۔ بہت عجلت میں جا رہا ہوں۔ مجھے آہستہ کر دے، مجھے پرسکون کر دے۔ میں آرام کے ساتھ ان چیزوں کا نظارہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے راستوں میں اترتی ہیں اور میرے اردگرد جلوہ نما ہیں۔ مجھے کم کر دے اور اپنے آپ کو میرے لیے زیادہ کر دے۔ (میں تیرے کرم کا نظارہ تو کر سکوں)

یہ کبھی نہ سمجھنا کہ آپ کی اپنی دانش اتنی بڑھ کر ایسے لپک سکے گی کہ وہ خدا کو جان لے یا پہچان لے۔ ایسا نہیں ہو سکے گا لیکن جب تم کو خدا خود اپنی ملکوتی (Heavenly) روشنی عطا کرے گا تو پھر کسی قدرتی روشنی کی ضرورت نہیں رہے گی اور سب کچھ روشن ہوتا جائے گا۔ یہ قدرتی روشنی اور قدرتی چمک خدا کے سامنے بالکل بجھ جانی چاہیے تاکہ خدا اپنی تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہو سکے۔

مفت امفت

زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے۔ تم اس کے حقدار نہیں تھے لیکن تم کو یہ مل گیا۔ زندگی تمہاری وراثت نہیں تھی اور تمہیں دے دی گئی۔ بالکل مفت امفت۔ تم نے اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کی، کوئی محنت نہیں کی۔ بس یہ تم کو ایویں ای مل گئی۔ کوشش جتنی بھی ہے، اس کا تعلق سراسر انا کے ساتھ ہے۔ کوشش ہمیشہ دکھ اور الم کو جنم دیتی ہے۔ ہر کوشش تمہارے خلاف ہوتی ہے۔ ہر کوشش تم کو مار مار کر ادھ موا کر دیتی ہے۔ تم سے خودکشی کروا رہی ہوتی ہے اور خود مزے لے رہی ہوتی ہے۔

اگر اتنی بڑی زندگی تم کو بغیر مانگے مل گئی، بغیر کسی حق کے بنا کسی دعویٰ کے مل گئی تو پھر خوشیاں بھی مل سکتی ہیں۔ آنند بھی مل سکتا ہے، ذات بھی مل سکتی ہے۔

زر

ہماری زندگی مسلسل عذاب میں گزر رہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہمارے پاس دولت کم ہے، ہمیں روپے پیسے کی زیادہ ضرورت ہے اور اس دور میں دولت سب سے اہم شے ہے! لیکن یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں ہماری زندگی اس لیے اجیرن ہو گئی ہے کہ Money کچھ اتنی اہم نہیں ہے۔ اگر زر اس قدر اہم ہوتا جس قدر کہ ہم سمجھے بیٹھے ہیں تو ہماری زندگی کا ہر پہلو اور ہر زاویہ اس کے قبضے میں ہوتا مگر یوں نہیں ہے۔ طلوع سحر، پروا کی ہوا، چاندنی رات، کوشش بغیر نیند، ڈنھل پر جھومتا ٹنڈا، اون کے گولے سے کھیلتا بلونگڑا، آپ کی نواسی، بہو کی مسکراہٹ، پوتے کی گالوں پر لگی چھچھی، ایک بے ساختہ شعر، نصرت فتح علی کی خان...... یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جن کے ساتھ زر کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ان جیسی لاکھوں ہی چیزیں ایسی ہیں جو مفت امفت ملتی ہیں اور لاکھوں کروڑوں خرچ کر کے بھی حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

ذکر اذکار

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تم کو سوائے اللہ کے ذکر کے اطمینان قلب نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک خدا کا ذکر نہیں کرو گے (جلی یا خفی) اس وقت تک اطمینان قلب کی دولت نصیب نہیں ہوگی۔

لوگ کہتے ہیں اور عام کہتے ہیں کہ خالی ذکر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے کیونکہ عمل کے بغیر کوئی راست قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ان کا خیال ہے کہ محض ہوحق سے کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک ہی بات کو بار بار دہرانے سے آپ کے مقصد کا حصول نہیں ہوتا۔

بزرگان دین کہتے ہیں کہ اگر املی کا نام لینے سے منہ میں پانی آ جاتا ہے تو خدا کا نام لینے سے وجود پر کوئی اثر بھی مرتب نہیں ہوگا۔

ایک نامی گرامی بادشاہ کی چہیتی بیٹی بیمار پڑی۔ اس عہد کے بڑے اطباء سے اور صادق حکیموں سے اس کا علاج کروایا لیکن مرض بگڑتا گیا۔ آخر میں وہاں کے سیانے کو بلا کر مریضہ کو دکھایا گیا۔ اس نے مریضہ کے سرہانے بیٹھ کر اللہ کا ورد شروع کر دیا۔

طبیب اور حکیم اس کے اس فعل کو دیکھ کر ہنسے اور کہا کہ محض الفاظ جسم پر کس طرح سے اثر انداز ہوں گے! تعجب!!

اس صوفی نے چلا کر کہا "خاموش! تم سب لوگ گدھے ہو اور احمقوں کی سی بات کرتے ہوئے۔ اس کا علاج ذکر ہی سے ہوگا۔"

اپنے لیے گدھے اور احمق کے الفاظ سن کر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ان کے جسموں کے اندر خون کا فشار بڑھ گیا اور انہوں نے صوفی کے خلاف مکے تان لیے۔ صوفی نے کہا "اگر گدھے کے لفظ نے تم کو چراغ پا کر دیا ہے اور تم سب کا بلڈ پریشر ایک دم ہائی ہو گیا ہے اور تم نے میرے خلاف مکے تان لیے ہیں اور تم ایک عمل میں داخل ہو گئے تو ذکر اللہ اس بیمار بچی کے وجود پر کوئی اثر نہیں کرے گا۔"

ان سب حکیموں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا۔

اگر عام زندگی میں دیکھا جائے اور دینوی سطح پر اس حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو یقین کی طرف قدم بڑھے گا۔

مذہب

محبت اور عدل

محبت سے غمی اور اداسی ضرور پیدا ہوگی۔ وہ محبت ہی نہیں جو اداس نہ کرے۔

اگر چاہتے ہو کہ محبت ابدی ہو جائے اور پائیدار ہو جائے تو چھچھڑی محبت ایسا نہیں کر سکے گی۔ اس کو طاقت عطا کرنے کے لیے اس میں عبادت کو شامل کرنا پڑے گا۔

عبادت کے بغیر محبت اداس رہتی ہے اور محبت ہی عبادت کا رُخ بتاتی ہے۔

محبت ایک ہونے کی آرزو کرتی ہے۔ اس کی طرف بڑھتی ہے۔ من تو شدم تو من شدی کا رنگ اپناتی ہے لیکن یہ اک مک ہونے کا وعدہ نہیں کرتی۔ اس آرزو کو مکمل کر کے نہیں دے سکتی' خواہش پوری نہیں کرتی اور یہی اداسی کا سبب بن جاتا ہے۔

چندھیانے والی روشنی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ زیادہ شیرینی کڑوی ہو جاتی ہے۔

محبت دل پکڑ لیتی ہے اداس کر دیتی ہے۔

جنسی محبت میں بھی اک مک ہونے کی خواہش ہوتی ہے اور یہ محبت انسان کو دو میں بانٹ دیتی ہے sex کا لفظ sexus لاطینی سے نکلا ہے جس کے معنی تقسیم کے ہیں۔ جنسی زندگی بسر کرنے والے بڑے دُکھی ہوتے ہیں۔ ہر حسین تازہ بدن سے مقصود نظر۔

محبت تم کو وقتی تسکین اور وقتی خوشی دے سکتی ہے لیکن دائمی سکون نہیں دے سکتی۔

محبت تنہائی عطا کرتی ہے۔ چاندنی رات میں محبوبہ اور محبوب بیٹھے ہیں دونوں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں اور الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں کوئی پل نہیں۔ ہر ایک دوسرے کو اپنی تنہائی کا احساس دلا رہا ہے۔

محبت ایک بڑا سبق ہے۔ ایک دائمی سبق کہ انسان اکیلا ہی آتا ہے اکیلا ہی رہتا ہے اور اکیلا ہی جاتا ہے۔ اس تنہائی کو نشے سے دُور نہیں کیا جا سکتا۔ نہ درختوں پودوں کے نشے سے نہ فیکٹری میں بننے والے نشے سے نہ جسم کے اندر پیدا ہونے والے نشے سے۔

اس تنہائی کو چیر کر اندر اُترنا ہے۔ اس میں گہرے اُتر جانا ہے۔ تہہ تک پہنچ جانا ہے اور پھر اچانک تم پر یہ کھلنا ہے کہ

یہ تنہائی' تنہائی نہیں ہے یہ تو خدا کی موجودگی کا اظہار ہے۔ تم تنہا ہو چکے ہو اور اس لیے تنہائی میں اتر گئے ہو کہ خدا بھی تنہا ہے۔

کرک گارڈ کہتا ہے کہ زندگی ہمیشہ پیچھے کی سمجھ میں آتی ہے لیکن اسے بسر آگے کو کرنا پڑتا ہے۔

مذہب

مذہب ایک ایسی چیز کا جلوہ (vision) ہے جو دور (beyond) اور پیچھے اور حاضر اشیاء کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی پکی اور سچی حقیقت ہوتا ہے جو اپنا آپ منوانے کے لیے قطار میں منتظر کھڑا ہوتا ہے۔ مذہب ایک Remote possibility ہے لیکن اس کے باوصف سامنے کی حقیقتوں میں سے ایک بھرپور حقیقت ہے۔ مذہب ہر گزرنے والی شے کو معنی عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی apprehensive سے آنکھ بچا جاتا ہے۔ ایک ایسی شے جس کا حصول آخری کمال ہے لیکن کسی طرح سے بھی ہاتھ نہیں آتا۔ جو آخری آدرش ہے لیکن جس کی quest نا امیدی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ابھی ہم نے دنیا کو اسلام پیش کرنا شروع نہیں کیا۔ صرف شریعت کو متعارف کرایا ہے اور اسی کو پیش کیا ہے اور کسی حد تک زیادہ ہی پیش کر دیا ہے حالانکہ ہم کو اسلام کی زندگی پیش کرنی چاہیے تھی۔ ایسی زندگی جو اسلام کی روح سے بھرپور ہو۔ میرا مطلب ہے اپنی زندگی اس طرح سے پیش کرنی چاہیے تھی جسے غیر دیکھ کر آسانی سے سمجھ لیتے کہ پیغمبر خدا نے جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا وہ حق تھا اور وہی اسلام تھا۔

اسلام کے تعارف میں شریعت کی وجہ سے کافی تاخیر ہو گئی۔ شریعت چونکہ اماموں کی توضیح تھی اس لیے وہ دین کو لے کر آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر شریعت نے ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھ کر اسلام کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج اسلام کا نقشہ اور بھی بدتر ہوتا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ذرا اس انسان پر اور انسانیت پر نظر ڈالو ہر جگہ تاریخی جہالت قتل و غارتگری اور جرائم ہی نظر آئیں گے تو میں سوچتا ہوں کہ ابھی انسان کی تاریخ چار ہزار سال ہی تو پرانی ہے اسے تھوڑا سا وقت اور دو یہ بہت اعلیٰ درجے کی مخلوق ثابت ہوگا۔ ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا، وہ ذات جسم سے ماورا ہے اس کی تجسیم نہیں کی جا سکتی۔ وہ کسی صورت میں کسی مورتی میں کسی صنم میں نہیں ڈھالی جا سکتی۔ اس کو بت نہ بناؤ، پتھر کی شکل نہ دو، بت پرستی نہ کرو۔ آپ نے بجا ارشاد فرمایا لیکن مسلمانوں نے کیا کیا۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم کو بت شکنی کا حکم ملا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بتوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سمجھے کہ چونکہ ہم کو بتوں سے دور رہنے کا اور بت پرستی نہ کرنے کا حکم ملا ہے، اس لیے بتوں کا قلع قمع کرنا چاہیے۔ حضورؐ نے

بتوں سے، شے سے، اجسام سے دوری کا حکم دیا تھا اور مسلمان، یہ راز نہ سمجھ سکے اور انہوں نے بت شکنی کو اپنا شعار بنا لیا۔ کچھ لوگوں نے بتوں کو اور پتھر کو اپنا خدا بنا لیا اور ان کی پوجا شروع کر دی۔ کچھ نے ان کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا۔ دونوں ہی پتھر سے وابستہ ہو گئے۔ دونوں ہی اپنے اپنے انداز میں پتھر سے واصل ہو گئے۔ دونوں یہی سمجھنے لگے کہ اس زندگی میں پتھر ہی اہم ہے۔ دونوں پتھر کے گرویدہ ہو گئے۔ ایک پتھر سے رشتہ جوڑ کر ایک پتھر توڑ کر...... سنو! سنو!! چیز، شے، موضوع، منظر کو بھول جاؤ، صرف اپنے ساتھ رہو، کوئی شے، کوئی چیز نہ بناؤ۔ کچھ بھی ساخت نہ کرو، بنانے والا موجود ہے، وہ بنا رہا ہے۔ تم اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکو گے۔ اس کو Improve نہیں کر سکو گے اور کچھ نہ کرو، بس اپنی ذات کے اندر اتر جاؤ۔ اس کو دیکھو، اس کو سمجھو اور اس کا قرب حاصل کرو۔

فرمایا کہ شبیہ تیار نہ کرنا۔ صنم نہ بنانا۔ بت نہ بنانا کیونکہ اس کا بت بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ شکل و صورت سے مبرا ہے۔ اس لیے اس کا بت نہ بنانا، نہ ہی اس کی پوجا کرنا...... ہم نے یہ سمجھ لیا کہ بتوں کو توڑنا اور بت خانوں کو تباہ کرنا ہماری ڈیوٹی ہے۔ چونکہ وہ شکل و صورت سے مبرا ہے۔ اس لیے جہاں بھی اس کی شکل و صورت بنائی گئی ہے۔ اس کو ڈھا دینا چاہیے، تباہ کر دینا چاہیے...... ذرا ان کی عقل ملاحظہ فرمائیں، فرمایا یہ تھا کہ ظاہر پرستی نہ کرنا، ظاہر کو نہ اپنانا، اپنے اندر اترنا، اپنے وجود کی تلاوت کرنا لیکن ہم نے بتوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ کچھ لوگ پتھر کو پوجتے ہیں، کچھ پتھر کو توڑتے ہیں۔ دونوں ہی پتھر سے وابستہ ہیں، دونوں ہی پتھر کے گرویدہ ہیں۔ دونوں ہی اس سے بندھے ہیں۔
سور کھانے کی مناہی ہے، ہم نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ دلدل میں سے نکلا تھا، سونٹے ڈانگیں مار مار کر مار دیا۔

اگر آدمی کو موت نہ آتی، اگر وہ ہمیشہ زندہ رہتا یعنی اس دنیا میں موت نہ ہوتی تو پھر شاید مذہب کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا۔

میری کچھ بہت ساری مشکلات تھیں اور ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ جس طرح اپنی مشکلات کو دور کرنے کے لیے ہر کوئی متعلقہ علاج گاہ سے رجوع کرتا ہے۔ میں نے بھی صحافت سے عدالت سے علم سے رجوع کیا لیکن مجھے کوئی تشفی آمیز جواب یا خاطر خواہ علاج میسر نہ آ سکا۔
پھر میں ڈیرے پر چلا آیا۔
یہاں میں ایک ''ان ڈور'' مریض کے طور پر داخل کر لیا گیا اور میرے ٹیسٹ ہونے لگے۔
میں تھا تو ایک بہت ہی معمولی سا انسان اور عام سا بندہ لیکن میرے اندر ڈھیر ساری پیچیدگیاں تھیں۔ مثلاً
میں نیکی سے محبت کرتا تھا لیکن میرا عمل بدی پر مشتمل تھا۔
میں زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن موت کی وادی کی طرف روانہ تھا۔

جب تک میں نابالغ تھا اور بے شعور تھا، میں نشوونما پا رہا تھا لیکن جونہی میں بالغ ہوا اور شعور کی منزل کو پہنچا میری نشوونما رک گئی۔

میں چیزوں کو چیزوں کی خاطر کرنا چاہتا تھا لیکن میں چیزوں کو اپنا آپ فروخت کرنے کے لیے سب کچھ کر رہا تھا۔

میں علم کو علم کے طور پر حاصل کرنے کا متمنی تھا لیکن میں علم کو دولت کمانے کے لیے حاصل کر رہا تھا۔

میں اچھا ہونا چاہتا تھا لیکن میں اچھا بن کر دکھا رہا تھا۔

میں زندگی کے راستے پر بڑی ہوش مندی کے ساتھ چل رہا تھا لیکن ہر بار راستے سے باہر نکل جاتا تھا۔

میں جیسا تھا اس سے لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا، جیسا ہونا چاہیے تھا، اس کے لیے کلپ رہا تھا۔

میرے اندر بڑا تضاد تھا اور اس تضاد نے سارے وجود میں تیزابیت پیدا کر رکھی تھی۔ خوف اس بات کا تھا کہ دنیا نے میرے بارے میں جو توقعات قائم کر رکھی ہیں، میں اس ڈنڈے تک پہنچ بھی سکتا ہوں کہ نہیں۔

بانسی سیڑھی ہر وقت کانپتی رہتی تھی۔ خوف بڑھتا رہتا تھا۔

مجھے یوں لگتا تھا کہ میں کسی بڑے کام کے لیے، کسی اعلیٰ مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔ اس لیے یہ چھوٹے چھوٹے کام، یہ روزمرہ کی ذمہ داریاں، یہ دنیاوی تقاضے بڑے ہیٹی والے کام ہیں۔

مجھے مرنے سے پہلے ایک بلند مقام ضرور حاصل کرنا ہے کیونکہ......

میں، میں ہوں۔

میں اپنے دن کو اور اپنے وقت کو حصول کے فیتے سے ناپتا تھا۔

اگر تو کچھ حاصل ہو گیا پھر تو ٹھیک ہے ورنہ دیہاڑی ماری گئی!

میں زندگی بھر ایک سکرپٹ رائٹر سے آگے نہ بڑھ سکا۔

آج کی ٹاک لکھ دی۔ آج کا ایڈیٹوریل مکمل کر لیا۔ آج کا کالم تحریر کر لیا۔ آج کا روزنامچہ رقم ہو گیا......

شاباش! زندہ باد! سبحان اللہ! لیکن میرے اندر ایک عجیب سی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔

میں حال کی ہر گھڑی سے اور موجود کے ہر لمحے کے خاتمے پر اور بہتر اور زیادہ ہونا چاہتا ہوں اور پھیلنا چاہتا ہوں اور پھولنا چاہتا ہوں۔

میرے اندر کی خواہش کہتی ہے کچھ اور کرو، کچھ اور سیکھو، کچھ اور کہو، ایک اور بھاشن دو، ایک اور حکایت بیان کرو، ایک اور کہانی کہو!

میری یہ خواہش میرے فن سے بھی بڑی ہے۔

میرے وجود سے بھی قوی ہے۔

میرے مذہب سے بھی وزنی ہے۔

حتیٰ کہ میری طاقت، میری راحت، میری خوشیوں سے بھی بڑی ہے۔

میں ایک تھیوری قائم کر کے فوت ہونا چاہتا ہوں کہ: لاشعور، لاشعور کیوں ہے؟

میں یہ تحقیق کرنا چاہتا ہوں کہ مسعود سعد سلمان کا ہندوی دیوان کہاں ہے؟

کیا یہ میرے اندر کی خواہش ہے یا میں اس خواہش کے اظہار سے توجہ کا طالب ہو رہا ہوں؟

میں ہر کام اعلیٰ معیار کا کرنا چاہتا ہوں۔

ایسا معیار جہاں کوئی دوسرا نہ پہنچ سکے۔ اس کام کو دہرا نہ سکے۔

ایسا کام جس پر کوئی انگلی نہ رکھ سکے۔ جس میں کوئی خامی نہ ہو۔

میں اپنی ہر غلطی سے ڈرتا ہوں اور ہر غلطی نکالنے والے کا دشمن ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے کام میں کوئی غلطی ہے تو وہ اختیاری ہے۔

وہ میرے کام کا تسلسل ہے۔ میرے تسلسل کا ریڑھ ہے۔

لیکن جب مجھے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ آ جاتا ہے اور

زندگی پر حاوی ہو جاتا ہوں تو زندگی اپنا رخ تبدیل کر لیتی ہے۔

وہ کامران کی بارہ دری کے پاس بہنا شروع کر دیتی ہے۔

اور میں بڈھے دریا پر بیٹھا رہ جاتا ہوں۔

میری اصل مشکل یہ ہے کہ میں زندگی کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا تت نکالنے کی کوشش میں مصروف ہوں میں زندگی بسر کرنے کا طریقہ نہیں جانتا۔

(میں سیدھے سبھاؤ زندگی بسر کرنے کے بجائے اس کا تت نکالنے میں مصروف ہوں۔)

میں کسی بھی اس چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جو مجھے نظر نہ آئے، میرے حواس میں نہ اترے، میرے لیے راحت ترقی کا ایک بہت بڑا "لیور" ہے۔ میں گفتگو کو زندگی کی اساس گردانتا ہوں۔

لیکن فصاحت کبھی تو مترنم ہوتی ہے۔ کبھی طاقتور، کبھی ولولہ انگیز لیکن افسوس فصاحت ہمیشہ ہی ایک Over statement ہوتی ہے۔ ہمیشہ ہی ایک Projection ہوتی ہے۔

بے ایمان لوگ الفاظ پر ایمان رکھتے ہیں، اپنی ترقی کے لیے الفاظ کو سہارا بناتے ہیں۔

وہ حقیقت کا ساتھ نہیں دیتے۔ حقیقت کو اپنی ٹیک نہیں بناتے۔ حقیقت کے قریب نہیں جاتے۔

معروضی سوچ بالکل جھوٹ ہے، میں اس کے خلاف ہو گیا ہوں۔

لیکن اب جب مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میں کسی دوسرے سے لائق نہیں ہوں تو کیا یہ جانکاری مجھے دانشمند بنا سکتی ہے؟ لائق بنا سکتی ہے؟

جو چیزیں میرے مالی حالات کے دائرے سے باہر کی ہیں، وہ باہر ہی رہتی ہیں۔ جب میں اور امیر ہو جاتا

ہوں۔ میرے مالی حالات مزید بہتر ہو جاتے ہیں تو پھر کچھ نئی چیزیں اس دائرے سے باہر آ موجود ہوتی ہیں۔ ان کی موجودگی بدستور رہتی ہے۔ میرا خلا آمدنی بڑھ جانے کے باوصف ویسا ہی رہتا ہے۔ آمدنی میں اضافہ ہاتھ میں نہ آنے والی کچھ اور اشیاء تخلیق کر دیتا ہے۔

فرمایا: خوشی اور شادمانی، مسرت اور فراوانی موجودہ صورتحال کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ حال سے لطف اندوز ہونے کی کیفیت ہے، اس کا مستقبل سے کوئی تعلق نہیں۔ مستقبل خوشی عطا کرنے سے قاصر ہے۔ مستقبل ایک معذور سہارا ہے۔ اس پر ٹیک نہیں لگائی جا سکتی۔ خوشی اور شادمانی کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ اپنے مستقبل کو Consult کر کے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کس قدر خوش ہوں، کس قدر مطمئن ہوں۔

میں کندھے پر ڈانگ رکھ کر حقیقتوں سے لڑتا رہتا ہوں۔ مجھے حقیقتوں کے ساتھ Deal کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔

میرے اندر کا غنڈہ لوگوں سے اصول کے نام پر جگا ٹیکس وصول کرتا ہے۔ وہ بار بار ایک ہی فقرہ دہراتا ہے کہ ''میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔'' میرے اندر کے غنڈے کے پاس اپنے ہر عمل کے لیے ایک منطق ہوتی ہے، ایک وجہ ہوتی ہے...... لیکن یہ وجہ ہر مرتبہ Idealistic ہوتی ہے۔

میرے وجود کا ایک بڑا حصہ نسوانی انگ کا ہے۔ وہ ہمیشہ ''یہ حق ہے'' کے پردے کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور مجھے سکون سا ہو جاتا ہے کہ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ پھر میں یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ ''نقصان پہنچانا'' میری خواہش ہے، میری آرزو ہے۔ میرا اشعار بن چکا ہے۔

جب میں ٹی ہاؤس جاتا ہوں تو گھر سے چلتے وقت بچھو کا روپ اختیار کر کے نکلتا ہوں۔ میرے اندر ضرر رسانی کا مادہ بے ضرری کے ارادے سے پہلے پیدا ہو جاتا ہے۔

جب کبھی بانو بیمار پڑتی ہے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ اس کی بیماری سے میرا بڑا حرج ہوتا ہے۔ وقت ضائع ہوتا ہے۔ گھر کی نگہداشت میں رخنے پڑ جاتے ہیں۔ طے شدہ پروگرام تاخیر کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پھر اس کی بیماری کی وجہ سے اس کے اندر خصوصی توجہ کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ طلب کچھ دیر ہنگامی رہنے کے بعد مستقل بھی ہو سکتی ہے۔ میں نظم و ضبط کا بندہ ہوں، بیماری استراحت کو ناپسند کرتا ہوں۔ میرا جسم، میرا وجود اور میرے جذبات مجھ کو ودیعت ہوتے ہیں۔

میں اپنے جذبات کے سلسلے میں نہ تو خوفزدہ ہوں، نہ Insecure ہوں اور نہ ہی ان کے خلاف انتقامی کارروائی کرنا چاہتا ہوں۔

جس طرح مجھے میری آنکھوں کی ساخت، بالوں کا رنگ اور پاؤں کا سائز ودیعت ہوا ہے، اسی طرح سے جذبات ملے ہیں۔

میں اپنے جذبات کا ذمہ دار نہیں (ان کے فعل کا البتہ ہو سکتا ہوں)

میں اپنے جذبات کی ساخت اقلیدس کے قاعدے اور ارسطو کے فلسفے کے مطابق نہیں کر سکتا۔ پھر مجھ سے کہا

جاتا ہے کہ اپنے جذبات کی وجہ سے اپنے آپ پر نفرین نہ کر، وہ یہ قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

کیا میں اپنے قابل نفرین جذبات کی بھی سرزنش نہ کروں؟

مجھ سے کہا جاتا ہے، ایسی باتوں پر پریشان نہیں ہوا کرتے لیکن میں پریشان ہوتا ہوں۔

کہتے ہیں انسان اپنے افعال کا ذمہ دار نہیں لیکن میں تو ہوں...... میں جو کچھ کرتا ہوں، اس لیے کرتا ہوں کہ میں وہ کرنا چاہتا ہوں۔

بے غرض و غایت اور بے لوث کا تصور محال ہے۔ شاید ہم سب وہی کچھ کرتے ہیں جس کی ہم کو خواہش ہوتی ہے یا ہمارے وجود کے کسی حصے کو خواہش ہوتی ہے۔

سخاوت اور Generosity بھی ایک طرح کی خود غرضی ہے، ایک طرح کا لالچ ہے۔ خود غرضی نہ تو Inherently اچھی ہے نہ بری۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ ہم کس طرح کے خود غرض ہیں...... اچھے یا برے...... یہ خود غرضی ہمیں صحت مند بنا دیتی ہے یا ہمیں مجروح کر رہی ہے۔

یوں تو کئی طرح کا جھوٹ میرے اندر سمایا ہوا ہے لیکن ایک جھوٹ گفتگو کے دوران ''پھک'' کر کے میرے منہ سے نکل جاتا ہے۔ میں حیران رہ جاتا ہوں۔

کبھی کبھی میں اس جھوٹ کو اس نشست کے اندر ہی صحیح کرنا چاہتا ہوں لیکن جب میں اسے صحیح کرتا ہوں تو سننے والے سمجھ جاتے ہیں، تاڑ جاتے ہیں۔

کچھ جھوٹ میں اپنے ان افعال کے بارے میں بولتا ہوں جن کے متعلق مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں انہیں Cover کر لوں گا۔

ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے میں ان کے بارے میں داستانی ہیولا بُن لیتا ہوں۔ اگر تو وہ ہیولا کامیاب رہتا ہے پھر مجھے تسلی سی ہو جاتی ہے کہ یہ جھوٹ نہیں تھا۔ اگر کامیاب نہیں رہتا اور مجھے سچ بولنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے تو پھر میں سچ بول لیتا ہوں لیکن اگر میں سچ نہیں بولتا تو پھر مجھے اپنی دروغ گوئی بھی بری نہیں لگتی۔ کام ٹھیک ٹھاک چل جاتا ہے۔

مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ مجھ سے کیسے افعال سرزد ہوتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی زبان سے، اپنے عمل سے کیا کرتا ہوں۔ مجھے تو اپنے خیالات، احساسات اور جذبات دبا کے رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے انگوٹھے تلے رکھا ہوا ہے۔

دراصل میں اندر سے باہر کی طرف منہ کر کے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ باہر سے اندر کی طرف نہیں۔ کچھ کرنے کی خواہش کرنا، کسی شے کی تمنا کرنا، ایک خواہش ہے، یہ ایک فقرہ نہیں ہے۔ جب میں ''تہیہ'' کر لیتا ہوں کہ مجھے یہ کرنا ہے تو میں اپنی خواہش کو فقرے میں ترجمہ کرتا ہوں۔ پھر میں اس فقرے کی پیروی کرتا ہوں۔

میں اپنی خواہش کو اپنے وجود سے نکال کر ذہن کے طاقچے میں رکھ لیتا ہوں۔ پھر میں سوچتا ہوں، مجھے کیا کرنا ہے...... مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس چاہیے کے ساتھ اور بہت سے ''چاہیے'' چمٹ جاتے ہیں۔ جیسے زمین پر گرے ہوئے

شہتوت کے ساتھ بے شمار چیونٹیاں چمٹ جاتی ہیں۔

اس وقت مجھ پر کیا کیفیت گزرتی ہے، اس کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔ میں ڈکشنری دیکھتا ہوں۔ لغات میں ڈھونڈتا ہوں مگر مجھے کوئی صحیح لفظ نہیں ملتا جو میری کیفیات کی ترجمانی کر سکے۔

اس وقت مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا کہ میں کیا کروں؟ لیکن جب مجھے پیاس لگتی ہے تو مجھے کبھی یہ پوچھنا نہیں پڑتا کہ میں کیا کروں۔ کبھی سوچنا نہیں پڑتا۔ غور کرنا نہیں پڑتا۔ نہ ہی میں ڈکشنری میں پیاس کے معنی تلاش کرتا ہوں۔ میں آرام سے اٹھتا ہوں، سلیپر پہن کر باورچی خانے میں جاتا ہوں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لیتا ہوں۔

اگر میرے اندر افسانہ لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے یا کچھ بھی لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور یہ خواہش تحریر میں نہیں ڈھلتی تو یہ خواہش جھوٹی ہوتی ہے، مصنوعی ہوتی ہے، جعلی ہوتی ہے۔ میں کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتا (آپ نے فرمایا تاں جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو، وہ ماضی جھوٹا ہے)۔

کہا جاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں تنہا آتا ہے اور تنہا ہی جاتا ہے۔ کتنی بھی مجلسی زندگی گزار لے، اصل میں وہ تنہا ہی ہوتا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنہائی کے لمحات ہی حق اور سچ ہوتے ہیں۔ انسان اس وقت اصل (Real) ہوتا ہے، جب وہ اکیلا ہو۔ لفظ اللہ بھی میری سمجھ اس وقت آنے لگتا ہے جب میں تنہا ہوں۔ کافی ہاؤس کی بحث میں اس لفظ کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ مذہب ذہین لوگوں کی زندگی کا مضمون نہیں ہے کیونکہ میں صرف اس وقت باور (Believe) کرتا ہوں جب میں مکالمے سے باہر ہوتا ہوں۔ تنہائی میرے حساب سے ایک غلط لفظ ہے (ایک اسم بے مسمیٰ ہے) میرے لیے تو تنہائی اجتماع کے مترادف ہے۔ میں تنہائی کا ترجمہ ''مجتمع'' کرتا ہوں۔ اس وقت میں اور قدرت ایک ہوتے ہیں۔ میں اور Being ایک ہوتے ہیں۔ میں تو تنہائی کا مطلب جوڑ میلے (؟) سے لیتا ہوں۔ جیسے میرے بکھرے ہوئے جوڑ پھر سے جوڑ دیئے گئے ہوں۔ میرے بند پھر سے مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ مجھے جوڑ جاڑ کر ایسے بٹھا دیا گیا ہو کہ مجھے چھوٹی چیزیں واقعی چھوٹی نظر آئیں اور بڑی چیزیں بڑی!

یہ جتنے بھی پاکیزہ فراڈ ہیں، متبرک دھوکے بازیاں ہیں۔ یہ مذہب کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان فراڈوں نے مذہب کا سہارا پکڑ کر اپنی دکانداری چلائی ہے۔ اگر مذہب نہ ہوتا تو اس قسم کی مقدس دھوکے بازیاں نہ ہوتیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں مذہب مولویوں کی اختراع ہے لیکن جب میں یہ سنتا ہوں تو کہتا ہوں کہ پھر مولویوں کو مولوی کس چیز نے بنایا ہے؟

لوگوں کے دلوں میں پہلے مذہب کا تصور موجود ہوگا تو مولوی آگے بڑھے۔ انہوں نے اس تصور سے فائدہ اٹھا کر اس کی تشریح کی اور اسے جملہ حقوق بحق مولوی بنایا۔

پہلے پہلے جب انسان نے قدرت کے مظاہر کو اور ان کی طاقت وریوں کو دیکھا تو حیران ہوا اور ڈرا اور قدرت کے مظاہر کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ (ہواؤں، بجلیوں، طوفانوں کو بھانپ کر وقت مقررہ سے پہلے ہی رسومات وغیرہ شروع کر دی۔ اصل میں ان مظاہر سے اس کی روشناس بچگانہ سائنس کو تسلیم کرنے کی ابتداء تھی۔ پھر آہستہ آہستہ انسان اس خوف کے معنی تلاش کرتا کرتا طاقت ور قسم کی توضیح میں داخل ہو گیا۔)

مذہب کو علم کی ایک قسم قرار دینا بھی ایک غلطی ہے۔ ایسے ہی جیسے مذہب کو ایک سیاسی ادارہ یا سیاسی رویہ کہہ کر پکارا جائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایمان کے ساتھ علم ضرور وابستہ ہوتا ہے لیکن اس علم کی وضع قطع مختلف ہوتی ہے اور وہ مذہب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

چلیے مان لیں کہ مذہب کی ابتداء خوف سے ہوئی۔ جب ایک لنڈا بچہ بے یار و مددگار انسان ویران زمین پر یکہ و تنہا ڈال دیا گیا اور قدرت کے مظاہر نے اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ڈرانا شروع کر دیا۔ اس ڈر نے مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ لوگ دیوتاؤں کے غضب کے آگے گڑگڑانے لگے۔ بہت حد تک یہ فلسفہ اور سوچ ٹھیک نظر آتی ہے لیکن خوف مذہبی یا دینی چیز نہیں ہے۔ خوف تو پلاتا ہے، تڑپاتا ہے۔ سکتے میں ڈال دیتا ہے۔ مفلوج کر کے بٹھا دیتا ہے۔ خوف جب سکتے اور بے جانی کے ساتھ امیدیں اور انشاء اللہ میں ڈھلتا ہے تو پھر مذہب کی صورت اختیار کرتا ہے یعنی جب تک خوف مخالف جذبے، امید اور یقین کے ساتھ نہیں ہوتا اس وقت تک وہ مذہب کا روپ نہیں بنتا۔

خوف انسان میں اسی وقت مذہب کا رخ پیدا کرتا ہے جب انسان امید سے بھر جائے اور دعا میں اور حمد میں اتر جائے۔ (جب خوف انسان کے دل میں امید پیدا کر دے اور اس امید کے ساتھ دعا (Prayer) کا آغاز ہو جائے تو مذہب جنم لیتا ہے۔ خالی خوف سے مذہب نہیں بنتا!

کچھ لوگ مذہب کے بارے میں گفتگو کرنا ہی پسند نہیں کرتے کہ یہ ماضی کی بات ہے اور قصہ پارینہ ہے۔ وہ اس لیے گفتگو نہیں کرتے کہ یہ تو ایک ذاتی معاملہ ہے اور ذاتی معاملے پر کیا بات کرنی۔ ایسے لوگ آزاد لوگ ہوتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مذہب صدیوں سے انسپریشن کی پھلواڑی کے طور پر کام دیتا رہا ہے۔ آرٹ کے لیے، ادب کے لیے، موسیقی کے لیے اور لوگ دیوانگی کی حد تک مذہب سے وابستہ رہے ہیں۔ اب بھی مذہب فرد اور معاشرے کی زندگی میں ایک مضبوط بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔

ایک نسل پہلے کی بات ہے پڑھے لکھوں کی دنیا میں مذہب کی چھٹی ہو گئی تھی۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی، اس وقت مذہب تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن مذہب پھر لوٹ چکا ہے اور واپس گھروں میں آ رہا ہے۔ یورپ کے نان فکشن ادب میں اب زیادہ کتابیں مذہب پر ہیں۔ اب مشہور فلمسٹار اور کھلاڑی سٹیج ایکٹر مذہب کی طرف لوٹ رہے ہیں اور دنیا میں مذہب پر فلمیں بن رہی ہیں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت زمانے کی بڑی بھوک روٹی کی بھوک نہیں ہے بلکہ خدا کے کلام کو جاننے اور وحی کو سمجھنے کی بھوک ہے۔ ہماری نسل کو اس روحانی بھوک کو دور کرنے کے لیے مذہب کے پرانے اور سائنسی دور سے پہلے کے فارمولوں کو اپنانا ہے۔ اب ترقی اور پراگریس کے نام پر نئے معنی کو تلاش کرنا ہوگا اور روحانی پیاس دور کرنے کے لیے دور

جدید کے تقاضوں کو سمجھنا ہوگا۔ ہمیں مذہبی زبان اور مذہبی لہجے کو ایک نیا روپ دینا ہوگا۔ ایسا روپ جو سائنس اور دریافت کی روشنی میں مذہبی زبان کو نیا لہجہ سکھا سکے۔

مذہب اس وقت بنتا ہے جب باہر کا expression اندر کے تاثرات سے قوی تر ہو جائے اور زیادہ اہم ہو جائے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ مذہب اور جذبات انسانی جلد سے گہرے اترنے چاہئیں۔ جوں جوں یہ گہرے ہوں گے مذہبی جذبات زیادہ میٹھے ہوں گے۔

مذہب کیا ہے؟ مشکل سوال ہے۔ اگر لغت میں اس کی تعریف دیکھیں تو تسلی نہیں ہوتی۔ عالموں کی کتابوں سے معنی ڈھونڈیں تب تشفی نہیں ہوتی۔ الہامی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انصاف پسندی اور شفقت اور کریمی اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا نام مذہب ہے یا پھر یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری، جھکنے والوں کے ساتھ جھکنا اور اپنے آپ کا پتہ نہ چلنے دینے کا نام مذہب ہے۔ یہاں Ritual کا کوئی مذکور نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مذہب ایک پختہ اور کہنہ مذہب دکھی لوگوں کو سکھی کرنے ہی کا نام نہیں بلکہ عیش پسند لوگوں کو دکھی کرنے کا بھی نام ہے۔ ایک پختہ کار مذہب کا ماننے والا شخص آزادی پر بھی ایمان رکھتا تھا اور اس کے ساتھ بھوک، ناداری، جہالت، بیزاری اور جنگ کا قلع قمع کرنے کی بابت بھی سوچتا تھا۔ اس کا test یہ بنتا ہے کہ وہ ان ساری چیزوں کا ناس مارنے میں کس حد تک عملی اقدام کرتا ہے۔

پختہ مذہب عزم و یقین کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہ بزدلی اور میانہ روی سے ہاتھ نہیں آتا۔ پختہ مذہب زمانے کا مقابلہ کرنے کے لیے نومولود بچے کی طرح سر کے بل پیدا ہوتا ہے اور عزم و یقین کی مٹھی بھینچ کر اپنے عہد کا اعلان کرتا ہے۔

مذہب کے لیے سب سے بڑا اندیشہ موقع پرستی کا اندیشہ ہے۔ میرا مطلب ہے جب مذہب کو کامیابی، خوشی اور آنند اور معاشرتی قبولیت کے لیے اپنا لیا جاتا ہے۔ جب مذہب کو اس لیے اختیار کیا جائے کہ اس سے کامیابی، ترقی، برتری اور شہرت حاصل کی جا سکتی ہے۔ جب آدمی یہ سوچنے لگے کہ مذہبی وضع اختیار کرنے سے گاہک پر، ملازم پر، آقا پر اور مالک پر اچھا اثر پڑے گا۔

یہ ایسے ہی ایک برائی ہے جیسے Honesty is the best policy ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ honesty اگر بری Policy بھی ہو پھر بھی Honesty کو اختیار کیے رکھنا چاہیے۔ مذہب سے چاہے فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے، اس کو اختیار کیے رکھنا بہت ضروری ہے۔

اصل میں مذہب نفع بخش، سلامت روی، خوش افزائی اور عطا کردگی سے بڑھ کر چیز ہے۔ یہ کائنات پر اس کے مظاہر پر، اللہ کی نشانیوں پر، دوسرے انسانوں پر اور اپنے آپ پر توجہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ زندگی کے مجموعی view پر زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ موقع تاڑ بن کر اور فائدہ اٹھاؤ بن کر مذہب کو اختیار کرنا ایسے ہی ہے جیسے صابن، ٹوتھ پیسٹ، شیمپو اور ذہنی بسکٹ کے اشتہاروں کے مطابق اپنی زندگی کا رخ متعین کرنا اور ان کے مطابق اپنے آپ کو سنوارنا۔

وہ مذہب جو عقل اور دانش کے test پر پورا نہیں اترتا وہ جذباتیت، رسم پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اصل مذہب

پورے کا پورا گہرا اور پاتال میں ہوتا ہے اور ہر حال میں پختہ ہوتا ہے۔ مضبوط ہوتا ہے اور قابل اعتماد ہوتا ہے۔ اس نے حقیقتوں کا سامنا کیا ہوتا ہے اور ہر چیلنج پر پورا اترتا ہے۔ اس نے نفسیات، معاشیات، سیاسیات، ارضیات، حیاتیات اور طبعیات کو اپنے وسیع دامن میں جگہ دی ہوتی ہے اور وہ اس کے شامیانے تلے مذہب سے وابستہ پرورش پا رہے ہوتے ہیں۔

ہم مذہب کو ایک cult کے طور پر اختیار نہیں کر سکتے بلکہ اس کے بنیادی اصولوں اور تقاضوں کو پھر سے سوچ کر ان پر حکم لگا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کیا ہے؟ کون ہے؟ اور اس ساری سکیم میں کیوں ہے۔ پھر...... ہم کس قدر آزاد ہیں، کیا خدا ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے!! کیا موت خاتمہ ہے اور اس کے بعد زندگی کا کوئی نشان نہیں...... ان سوالوں کا جواب نکالنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ایک کوشش کر کے اس کی طرف رجوع ضرور کیا جا سکتا ہے اور اس رجوع سے ہمارے اندر کی استقامت میں اضافہ ممکن ہے۔

اس کائنات کی لامتناہی بڑائی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اس کے سامنے منحنی ہو گیا اور ہار مان گیا۔ ایک ماہر افلاک نے اپنی دوربین میں سے دیکھتے ہوئے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے چپڑاسی سے کہا، اف خدایا، توبہ میری۔ جب میں اجرام فلکی کا معائنہ کرتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ ان کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہے؟

چپڑاسی نے کہا، سر! جس دوربین سے آپ یہ اجرام فلکی دیکھ رہے ہیں، یہ حضرت انسان کی ایجاد ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان کے مقابلے میں دوسرے جانوروں کے پاس بھی دماغ ہے، وہ بھی اس سے کام لیتے ہیں لیکن اگر سیمنٹ اور سریا دنیا کے کسی بھی جانور کو دے دیا جائے، وہ اس کو لے کر نہ تو دریائے راوی پر پل تعمیر کر سکے گا، نہ اس سے سکائی سکریپر بنا سکے گا۔ کوئی جانور کتنا بھی زور لگا لے، اس سے نہ تو مسجد قرطبہ جیسی نظم لکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی چغتائی جیسی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔

آدمی کے بدن میں اتنا لوہا موجود ہوتا ہے کہ اس سے چار انچ لمبی کیل بن سکتی ہے۔ اتنا کاربن ہوتا ہے کہ اس سے بارہ درجن سرمئی پنسلیں بن سکتی ہیں۔ اتنا پانی ہوتا ہے کہ اس سے پانچ سیر کا گڑوا بھر سکتا ہے یعنی آدمی کاربن، آکسیجن، ہائیڈروجن اور نیوٹروجن کا مجموعہ ہوتا ہے اور ان کا تناسب طے ہوتا ہے لیکن جناب پھر دیکھ لیجیے کہ یہ چھٹانکی بھر لوہے اور بارہ پنسلوں والے کاربن کا کمال کہ پانچوں براعظموں پر جمبو جیٹ چلاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ سمندروں کے اندر سرنگوں میں سے گزر رہا ہے۔ یہی آدمی دوسرے کی آنکھوں کا ٹشو لے کر ایک اندھے کی آنکھ میں لگاتا ہے اور دیکھنے لگ جاتا ہے۔

مذہب کی بھی اپنی ہی ایک زبان ہوتی ہے جو صدیوں کے ریاض، تجربے، عمل اور سوچ کے بعد پیدا ہو جاتی ہے اور خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ کھیلوں کی یا نیوی کی یا ڈاکٹری کی تلمیحات کی طرح۔ اس کے علاوہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو صرف جاننے والوں کو اور سالکوں کو معلوم ہوتی ہیں۔ مذہبی اور روحانی اصطلاحات اس لیے بھی اچھی طرح سے گرفت میں نہیں آتیں کہ وہ Concepts سے تعلق رکھتی ہیں چیزوں سے نہیں۔ بہت زیادہ استعمال ہونے والی اصطلاحات بھی فہم کے اندر نہیں اترتیں۔ مثلاً دو نہایت ہی عام استعمال میں آنے والی اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں

ہیں۔ خدا اور روح مگر دونوں ہی بعید از قیاس رہتی ہیں۔ حالانکہ ہم قدم قدم پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

اصل میں شفقت، محبت، ترحم اور مہربانی کے جذبے کو بھی سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے بلکہ بہت ہی سوچ کر دارو کرنا چاہیے۔ اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک اپاہج لڑکی کو آپ تحفے تحائف، توجہ دیتے رہیں اور وہ اس کو محبت سمجھنے لگے اور جب آپ جانے لگیں تو وہ آپ کی جدائی برداشت نہ کر کے خودکشی کر کے مرجائے۔ اس جذبے کو ہمیشہ عقل اور فراست کی کسوٹی پر پرکھ کر استعمال میں لانا چاہیے۔ اس طرح کی ایک اور مصیبت وہ "محبت" کا جذبہ ہے جو والدین بچوں کی اندھی محبت میں ان کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ چور ڈاکو بنا دیتے ہیں اور ان کا برا انجام ہوتا ہے۔ مذہبی احساسات میں بھی ایسے ہی جو جذبی تاثرات دیکھنے میں ملتے ہیں۔ ایک جذبہ انسان کو اوج ثریا پر لے جاتا ہے اور وہی اگر تفکر اور تدبر کے ساتھ دیکھا پرکھا نہ جائے تو انسان کو نفرت، کڑواہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خون خرابہ ہونے لگتا ہے۔ مذہبی جنگیں ہونے لگتی ہیں۔ حالانکہ مذہب کا جنگ سے کوئی رشتہ ہے ہی نہیں۔ ہم اپنی زندگیوں سے محبت اور ترحم کو نکال نہیں سکتے کہ ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور نہ ہی مذہب کو نکال سکتے ہیں، اس سے غلط کام اور غلط مطلب لیا جا سکتا ہے۔

مذہب اور پھر مذہب!

باوجود اس کے کرم نے مذہب کو بڑی شدت کے ساتھ رد کرنا شروع کر دیا ہے اور اس میں مسلسل کیڑے نکالنے کی ذمہ داری اپنائی ہے لیکن صابن کی دھون کے ساتھ بچہ بھی چلمچی سے باہر نہیں پھینک دینا چاہیے...... اگر ہم مذہب کی ضعیف الاعتقادی اور تنگ نظری اور بے منطقیت پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں مذہب کی خوبیوں کو بھی تو اجاگر کرنا چاہیے۔ (خاص طور پر اسلام کے مذہب کو) اس کے اندر بے پناہ خوبصورتیاں اور نزاکتیں جمع ہیں اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔

نام کا مسلمان

یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا عام استعمال ہوتا ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام عمل کا نام ہے۔ قرآن عمل کی کتاب ہے، اس پر جزدان چڑھا کر اوپر رکھنے کا حکم نہیں۔ جو شخص احکام شریعت پر عمل نہیں کرتا، وہ سچا مسلمان نہیں، وہ نام کا مسلمان ہے۔

اب نام کا مسلمان ایک بھاری تعداد میں موجود ہے اور وہ عملی مسلمان نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنا مذہبی تشخص چھوڑنے کو تیار نہیں۔

وہ رشوت لیتا ہے، سود کھاتا ہے، دوغلی زندگی بسر کرتا ہے لیکن مسلمان کہلاتا ہے اور مسلمان کہلانا چاہتا اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔

بے شک وہ ایسا مسلمان ہے جنہیں دیکھ کے شرمائیں ہنود لیکن ہم اس کو ہندو نہیں کہہ سکتے۔ نہ ہی اسے چھوڑ سکتے ہیں۔

یہ کون لوگ ہیں جو نام کے مسلمان کو پسند نہیں کرتے۔ یہ غور طلب لوگ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مسلمان کو اچھائیوں سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں۔ عمل سے وابستہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کو بہتر انسان دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ پہلے انسان دیکھنا چاہتے ہیں پھر مسلمان۔ ان کا خیال ہے کہ اچھا انسان بن کر ہی اچھا مسلمان بن سکتا ہے بلکہ اصل مسلمان وہ ہے جو اچھا انسان ہے...... لیکن نام کا مسلمان کہتا ہے کہ میں اچھا مسلمان تو نہیں ہوں لیکن میں مسلمان ہوں اور مسلمان کہلوانا پسند کرتا ہوں، صرف انسان نہیں۔

یہ توجہ طلب لوگ جو مسلمانوں میں عمل دیکھنے کے خواہش مند ہیں اور جو صرف باعمل مسلمان کو مسلمان گردانتے ہیں، وہ لوگ شرع اور شریعت کے پابند لوگوں کو بھی اچھا مسلمان نہیں سمجھتے اور ان کو بنیاد پرست، تنگ نظر، متعصب اور کوتاہ بیں مسلمان کہتے ہیں۔

کس قسم کے عمل کو عمل سمجھتے ہیں اور کس قسم کے عمل کو مسلمانوں میں رواں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ سیکولر عمل کو بہتر عمل سمجھتے ہیں اور اکثر باہر سے اس کی مثال دیتے ہیں اور غیر مسلموں کے حسن سلوک اور حسن عمل کو عمل سمجھتے ہیں۔ مثلاً۔

(1) لوگوں سے خوش اخلاق اور خوش بیانی سے پیش آنا۔

(2) برداشت اور رواداری کا مظاہرہ کرنا۔

(3) جھگڑے سے ہر حالت میں گریز کرنا۔

(4) جہاد اور جسمانی خواہش کو کنٹرول میں رکھنا۔

(5) وسعت مال کے حصول کے ذرائع اختیار کر کے اپنی اور قوم کے لوگوں کی مالی حالت بہتر بنانا۔

(6) یورپ کے انداز زیست اختیار کر کے وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام میں تبدیلی لانا۔

(7) دنیا کو زیادہ مضبوطی سے اختیار کرنا۔

لیکن ہمیں سوچنا پڑے گا کہ کیا ہم نام کے مسلمانوں کو اسی طرح سرزنش کرتے رہیں اور ان کو گھٹیا اور کمتر درجے کے مسلمان سمجھتے رہیں۔

لیکن...... بوسنیا کے اور چیچنیا کے نام کے مسلمان کہتے ہیں کہ ہم اعلیٰ درجے کے عملی مسلمان تو نہیں ہیں اور نہ ہی ان صفات اسلامی کے حامل ہیں جن کی آپ ہم سے توقع رکھتے ہیں لیکن ہم مسلمان ہیں اور پورے مسلمان ہیں اور امہ کے اندر اسی طرح سے شریک رہنا چاہتے ہیں جس طرح سے دوسرے مسلمان شریک ہیں۔

فلاں صاحب نے کہا شراب بھی پیتا ہوں اور شام کو رنڈی کا مجرا بھی دیکھتا ہوں اور یہ شعار ہرگز اسلامی نہیں ہے۔ گناہ کا مرتکب ہوں لیکن جنت تو دو ہاتھ دور ہے۔ دو ہاتھ ماریں گے، جنت لے لیں گے۔

ڈیرہ دار طوائفیں جو برکھا برسا کر محفل سے نکل گئیں۔ میں اس گروہ کو بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا جو ڈیرے پر آ کر اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔ وہ غور طلب گروہ جو مسلمانوں سے اچھے، پاکیزہ، شرعی اور دینی عمل کا خواہاں تھا، وہ عام

طور پر سیاستدانوں، بیوروکریٹس، فوجیوں، پروفیسروں اور صحافیوں وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ بڑے دکھ کے ساتھ مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے تھے اور مسلمانوں کے باعمل ہونے کی آرزو میں گھلتے تھے مگر وہ بھی میری آپ کی طرح کے عام مسلمان ہی ہوتے تھے۔ اچھے اچھے، پڑھے لکھے، عمدہ عہدوں پر فائز، اونچے مالی طبقے سے وابستہ لیکن نام کے مسلمان۔

بڑے تعجب کی بات ہے اور مل بیٹھ کر سوچنے کا مقام ہے کہ سارا مغرب اعلیٰ درجے کے اچھے، باعمل، پڑھے لکھے مسلمانوں کے ساتھ تو گھل مل کر رہنے کا خواہشمند ہے لیکن وہ نام کے مسلمانوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان کے دفعیہ کے پروگرام بناتا رہتا ہے۔ یہ نام کے مسلمان کون ہیں؟

سارے مذاہب کے بنیادی فلسفے کیوں بدل گئے؟

سارے مذاہب نیکی، بھلائی، شرافت انسان دوستی کی تعلیم دیتے ہیں لیکن ہم جب ان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان مذاہب کے ماننے والے نیکی، بھلائی، شرافت اور انسان دوستی کا دامن چھوڑ کر قتل و غارت گری اور ایک دوسرے کی تباہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ ایسا کیوں ہے؟

(1) شاید ان مذاہب کی تفاصیل اور جزئیات بیان کرتے وقت لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

(2) حضورﷺ کو رحمت العالمین کا رتبہ ملا ہے اور اوپر سے ملا ہے۔ ان کو دوسرے مذاہب کے لوگ اس خطاب کے مطابق نہیں سمجھتے۔ تفسیر کرنے والوں نے کچھ اور طرف کو ہینڈل موڑ دیا۔

(3) لوگ مذاہب کی بنیادی تعلیمات جاننے کے باوصف ان کے خلاف ہو گئے۔ اچھائیوں کو برائیاں اور خوبیوں کو خرابیاں سمجھنے لگے۔ سائنس کی اختراعات نے بھی کافی نقصان پہنچائے لیکن لوگ ان کے خلاف نہیں ہوئے۔

Evil مذہب

بدی کا بھی اپنا ایک مقام ہے اور اونچا مقام ہے۔ اس دنیا میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے لیے حسد، رقابت، مقابلہ، انتقام، قتل، جنس اور ظلم کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ سب نہیں ہوں گے تو دنیا ترقی نہیں کرے گی۔ ان چیزوں کے ہونے سے دنیا بہت ترقی کرتی ہے۔ گو انسان نیچے کو جاتا ہے۔ اسفل السافلین کہلاتا ہے۔ اخلاقی اقدار پر پورا نہیں اترتا لیکن اس کی دنیا مندرجہ بالا Evil کے سہارے ہی اوپر کی منزلیں طے کرتی ہے۔

اگر Evil ایسی ہی اہم شے ہے تو پھر اس کا آسمانی صحیفوں میں گزر بسر اس قدر ذلت سے کیوں ہوتا...... پہلے تو اقدار کے بارے میں طے کریں۔

What religion is not

اگر ہم مذہب کے بارے میں یہ سمجھنے لگیں کہ یہ کچھ کرنے کی یا کر کے دکھانے کی چیز ہے تو پھر ہم پہلے ہی قدم پر

دلدل میں اور کھوبے میں پھنستے نظر آتے ہیں کیونکہ زندگی میں کوئی عمل یا Activity ایسی نہیں ہے جسے خصوصی طور پر مذہبی عمل کہا جا سکے۔

مذہب اصل میں کیا ہے اور اس کی غایت کیا ہے، اسے ڈھونڈنے کے لیے ہمیں دوسری طرف سے چکر کاٹ کر آنا ہوگا کہ مذہب کیا نہیں ہے!

پہلے تو آپ یہ جان لیجیے اور مان لیجیے کہ مذہب کوئی فکر یا کوئی سوچ یا کوئی جانکاری نہیں ہے یعنی یہ نہ تو خیال کے زمرے میں آتا ہے اور نہ عمل کے دائرہ کار میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ سائنس بھی نہیں ہے۔ تاریخ بھی نہیں، داستان رزم بھی نہیں، نہ یہ فلسفہ ہے۔ حتیٰ کہ یہ دینیات بھی نہیں۔ میں مذہب کے نقطہ نظر سے تمام رازہائے سربستہ کا علم رکھ سکتا ہوں لیکن پھر بھی کچھ نہیں ہوں۔

اب یہ بھی مان لیجیے کہ مذہب کوئی اخلاقیات بھی نہیں۔ کردار بھی نہیں اور prudence تو خیر بالکل ہی نہیں۔ شاید اس کے قریب ترین اگر کوئی شے آ سکتی ہے تو وہ اخلاقیات ہی ہے کیونکہ اس کے بغیر مذہب کا تصور ذرا مشکل سی بات ہے لیکن اگر دیندار لوگوں سے پوچھیے تو وہ بھی کہیں گے کہ مذہب اخلاقیات سے ذرا آگے کی چیز ہے، یہ اس پر بڑھاوے کا نام ہے۔

پھر مذہب جذباتیت بھی نہیں۔ جذبات کا اگر مظاہرہ دیکھنا ہو تو وہ آپ کو فنون لطیفہ میں بدرجہ اتم ملے گا اور مذہب سے بڑھ کر ملے گا۔ کوئی مذہبی آدمی یہ بھی ماننے کو تیار نہیں ہوگا کہ اس کا مذہب فنون لطیفہ کا ایک مظہر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آرٹ بھی اخلاقیات کی طرح مذہب کے قریب تر کی چیز ہے لیکن اکثر اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مذہب اور آرٹ بالکل متضاد جہتیں بن کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔

اصل میں انسان پورے کا پورا انسان جانتا بھی ہے' سوال بھی کرتا ہے اور محسوس بھی کرتا ہے اور وہ یہ تینوں چیزیں (ایک ساتھ) کرتا ہے۔ ہم ہمیشہ اس کو کسی ایک شے میں کھبا ہوا دیکھتے ہیں جس سے وہ حال کی گھڑی میں برسرپیکار ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا اس پر دوسری چیزیں بھی وارد ہو رہی ہوتی ہیں خواہ دھیمے انداز میں ہی کیوں نہ ہوں۔ دھیمے اور واضح اور مبین اور دھندلے ارادوں اور پیش قدمیوں کی بات کرتے ہوئے ہم شعور اور لاشعور کے دائروں میں اتر جاتے ہیں۔

تو کیا مذہب پراچین زمانوں اور لاشعور کی گہرائیوں سے بوکے نکالنے اور پانی بھرنے کا نام ہے۔ ایسی کئی تصویریاں بڑی بنا سجا کے پیش کی جاتی ہیں اور ان پر بڑی واہ واہ ہوتی ہے لیکن ان کو precise بنانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

مثلاً فرائڈ مذہب کو ایک دھوکا اور Fraud کہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ژونگ اسے زندگی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ حسن کا اور معانی کا منبع خیال کرتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ژونگ بھی اسے ایک دھوکا ہی خیال کرتا لیکن دور سے ایک حقیقی دھوکا بھی سمجھتا ہے۔

کچھ بھی سہی، مذہب کو قدیم اور پراچین کے ساتھ ملحق کرنا زیادتی ہے۔ قدیم اور پراچین تو اوہام اور ترقی یافتہ

مذہب کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

اور ایک اور بات جو مذہب نہیں ہے، وہ روحانیت mysticism ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روحانیت میں مذہب کا عمل ہی جاری ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہب روحانیت نہیں! عام اصطلاح میں روحانیت مذہب کے ایک خصوصی شعور کا نام ہے جس سے کچھ گنے چنے لوگ ہی واقف ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو برگزیدہ ہوتے ہیں اور جو اس کے لیے مخلص ہوتے ہیں لیکن وہ بھی مذہب سے بہت دور ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں بہت اعلیٰ درجے کے مذہبی لوگ گزرے ہیں جو روحانی بزرگ نہیں تھے لیکن بہت ارفع درجے کے مذہبی لوگ تھے۔

یہ بات خواہ سو فیصدی درست ہو کہ ہر مذہب میں روحانیت کا ایک رخ موجود ہوتا ہے بلکہ روحانیت ہی مذہب کی نقیب ہوتی ہے۔ اس پر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہیں!

اجتہاد......

ایک عام خیال کے مطابق اسلام کو اور اسلامی ریاست کو اجتہاد کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اسلام میں اجتہاد کا رستہ کھل جائے تو پھر یہ مذہب ایک حرکی قوت بن کر دوسرے سارے معاشروں سے آگے نکل کر ان کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

(1) اگر اسلام میں فوٹو کھنچوانے کی پابندی ختم ہو جائے اور مفتی فضل الرحمٰن، شاہ احمد نورانی، مولانا سمیع الحق، مولانا......... اپنی تصویر اتارنے کی اور ٹیلی ویژن پر آنے کی اجازت دے دیں تو امہ فوری ترقی کر سکتی۔

(2) اگر عورتوں کو سینہ یا کندھے ڈھانپے بغیر یا حجاب لیے بغیر بازاروں، منڈیوں، پلازوں وغیرہ میں خریداری کی عام اجازت ہو جائے اور وہ آزادی کے ساتھ خرید و فروخت کر سکیں تو......

(3) اگر خواتین کو موٹر، گاڑی، ہوائی جہاز، سکوٹر وغیرہ سرِ عام چلانے کی اجازت ہو جائے

(4) اگر مولوی لوگوں کو ٹیلی فون، کار، لاؤڈ سپیکر کے استعمال کی اجازت دے دیں اور اس کے ساتھ ساتھ سائنس کے دوسرے آلات، جراحی کے انسٹرومنٹس، ولایتی ادویات اور انجکشن وغیرہ کی اجازت دے دیں اور ان چیزوں کے استعمال میں اجتہاد سے کام لیں تو......

(5) اگر کبھی خوش قسمتی سے کسی اسلامی ملک کی سربراہ عورت بن سکے یا اسلام میں اجتہاد کر کے اس کی اجازت ہو جائے تو اس ملک کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی ریاستیں بھی دنیا میں بلند مقام پر پہنچ جائیں جہاں ابھی تک کوئی خاتون سربراہ مملکت نہیں بن سکی۔

(6) اگر امام کعبہ دوسرے ملکوں سے آئی ہوئی خواتین کے ساتھ فوٹو اتروا سکیں یا دوسرے ممالک جا کر وہاں کی سربرآوردہ مسلم خواتین کے ساتھ فوٹو اتروانے پر کوئی اعتراض نہ کریں تو......

(7) اگر اسلامی ممالک اپنے بینکوں کو سود لینے اور سود دینے کی اجازت دے دیں تو......

(8) اگر اسلامی ممالک صرف دینی پرچوں اور مذہبی اخباروں کے علاوہ دوسرے عام اخبار چھپنے کی بھی اجازت

دے دیں اور ہر طرح کے آزادی اظہار عطا کرنے سے پابندی اٹھالیں تو......

(9) اگر اسلامی ممالک اور ان کے کٹر رجعت مولوی اپنی قدامت پسندی ترک کر کے اسلامی ملکوں میں ریڈیو، ٹی وی، ویڈیو شاپ اور ویڈیو گیمز کی اجازت دے دیں تو......

(10) اگر مولوی حضرات سائنسی ایجادات کو اپنی ذات کے لیے استعمال کرنے میں بھی اجتہاد کا سہارا لیں اور ہوائی جہاز اور بحری جہاز سے حج پر جانے میں پابندی عائد نہ کریں تو......

(11) اگر اسلامی ممالک میں قرعہ اندازی، لاٹری، انعامی سکیموں اور پرچی کھینچنے والے جوئے کی اجازت ہو جائے اور اس میں اجتہاد سے کام لے لیا جائے تو اسلام بڑی سرعت سے ترقی کر سکتا ہے۔

(12) اگر اسلامی ممالک میں پورے کے پورے ولایتی قوانین عائد کر دیے جائیں اور عدالتوں سے اسلامی قوانین کو نکال دیا جائے تو اسلامی ممالک عدل، انصاف اور جرم و سزا کے معاملے میں ولایتی ملکوں جیسے قابل تقلید معاشرے پیدا کر سکتے ہیں۔

(13) اگر مسلم ممالک کے مولوی اپنے دینی اداروں میں ولایت کے علوم کی تعلیم دینا بھی شروع کر دیں تو مولوی کی نظر میں وسعت پیدا ہو جائے اور وہ واقعات علم کو عالمی تناظر میں دیکھنے کی عادی ہو جائیں۔ ان میں ویسی ہی وسعت نظر اور وسعت قلب پیدا ہو جائے جیسی مغرب کے لوگوں میں ہے۔

(14) اگر تھوڑا سا اجتہاد کر کے ولایتی لباس اختیار کرنے کی اجازت مل جائے تو پھر ترقی خود چل کر اسلامی ممالک کے دروازوں پر پہنچ جائے۔

(15) اگر اسلامی ملکوں میں طب کے پیشے اور قدیم طریق علاج کے بجائے ولایتی قسم کے علاج معالجے کا سلسلہ شروع کر لیا جائے اور لوگوں کو ڈاکٹروں اور سرجنوں کے حوالے کر کے انسانوں کا علاج معالجہ شروع کیا جائے تو اسلامی ممالک سے ہر قسم کی بیماری کا خاتمہ ہو جائے اور لوگ صحت حاصل کر کے لمبی عمر پا سکیں لیکن ولایتی دواؤں پر پابندی ہونے کی وجہ سے اور مولوی کے ضدی رویے کی بنا پر سارے اسلامی ممالک بیماریوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔

(16) اگر اسلامی ممالک میں تنگ نظر لوگوں کے پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دے کر یہاں علم کی دولت عام کی جا سکے اور سکولوں، کالجوں، مدرسوں کی تعمیر سے پابندی اٹھائی جا سکے تو امہ بہت جلد ترقی کر سکتی ہے۔

(17) تعلیم کے سلسلے میں اگر عورتوں کی تعلیم پر عائد پابندیاں اٹھالی جائیں اور لڑکیوں کو بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے کی اجازت مل جائے تو اسلامی ممالک دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر سکتے ہیں۔

(18) اگر اسلامی ممالک میں مولوی اور ملا کی پروا کیے بغیر عورتوں کو بازاروں اور منڈیوں میں دکانداروں اور آڑھتیوں کے طور پر آنے کی اجازت ہو جائے اور خواتین امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں اور صنعت و تجارت کے میدان میں گھر چھوڑ کر بازار میں آ جائیں تو ملکی معیشت میں ناقابل یقین اضافہ ہو جائے۔

(19) اگر سائنس کی تعلیم میں رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں اور مسلمان ممالک کے نوجوانوں کو بھی ڈاکٹر، انجینئر،

کمپیوٹر پروگرامر، سائنس دان، ہواباز Pilot بننے کی اجازت مل جائے تو اسلامی ممالک دنیا کے دوسرے ملکوں کو بہت پیچھے چھوڑ جائیں۔

(20) دنیا کے تیزی سے بدلتے تقاضوں کے پیش نظر اگر مولویوں کے درس نظامی میں دورجدید کے علوم کے تعارفی اسباق شامل کر دیئے جائیں اور مولویوں کو بنیادی سائنس کے اصولوں سے آگاہ کر دیا جائے تو وہ بہتر مولوی بن کر احسن طریق پر اپنے معاشرے کی خدمت کر سکیں۔ عین اسی طرح اگر ایم بی بی ایس کے کورس میں ٹیڈی بکری پالنے کے طریق اور چونسہ آم کی پیوندکاری کے اسلوب کے تعارفی اسباق بھی شامل کر دیئے جائیں تو ڈاکٹر لوگ احسن طریق پر اپنے معاشرے کی خدمت کر سکیں۔ ایسے ہی اگر ایل ایل بی کے کورس میں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کے طریق اور تیل صاف کرنے کے ابتدائی فارمولے شامل نصاب کر دیئے جائیں تو وکیل حضرات احسن طریق پر اپنے معاشرے کی خدمت کر سکیں۔

(21) اگر تنگ نظر مولوی اور بدشکل مصلح اجتہاد سے کام لے کر اپنے اپنے ملک کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو ریڈیو، ٹی وی اور فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دیں تو کثیر زرمبادلہ خرچ کر کے غیر ملکی فنکاروں کو مسلم ملکوں میں بلانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اپنے ہی ملک کے لڑکے، لڑکیاں، مرد، عورتیں مقامی فنکاروں کے طور پر بہتر فن کا مظاہرہ بھی کر سکیں اور اپنے کلچر کی ترجمانی بھی کر سکیں۔

(22) اگر اسلامی ملکوں کے سربراہ تصویر کشی کو حرام نہ سمجھیں اور اجتہاد کر کے اپنی تصویریں، ٹکٹ سکوں اور کرنسی نوٹوں پر شائع کروا سکیں ان کا شمار آپ سے آپ ترقی یافتہ حکمرانوں اور سیاستدانوں میں ہونے لگ جائے۔

(23) اگر تنگ نظر مولوی اور بدہیئت مصلح اجتہاد کے ذریعے مسلمان ممالک میں بھی بیاہ شادی کی غیر اسلامی رسموں کے ادا کرنے کی اجازت دے دیں اور دوسرے آزاد معاشروں کی طرح مسلمان معاشروں کو بھی دل پشوری کرنے کی چھٹی دے دیں تو مسلمانوں سے ساری ذہنی اور نفسیاتی بیماریاں خودبخود دور ہو جائیں۔

(24) اگر اسلامی ممالک میں چیمبر آف کامرس کھولنے کی اجازت ہو جائے تو سارے اسلامی ملک فروغ تجارت میں دوسرے ملکوں کے شانہ بشانہ آ کھڑے ہوں۔

(25) اگر علمائے کرام پارلیمانی نظام جمہوریت کو اجتہاد کے ذریعے دین کا درجہ دے کر سارے عالم اسلام پر لاگو کر دیں (یا کروا دیں) تو دنیائے اسلام میں ایک خوش آئند انقلاب آ جائے اور چودہ سو سال سے ترقی کے بند راستے خودبخود کھل جائیں۔

(26) اگر ملا لوگ مسلم امہ کو آخرت، جزا و سزا، ایمان و ایقان، اللہ کی رحمت پر بھروسہ، قسمت اور تقدیر پرستی جیسی چیزوں میں ملوث کر کے ان کو راہب اور گوشہ نشین بنانے پر مجبور نہ کریں اور انہیں دنیا کمانے اور دنیا کے اندر جدوجہد کر کے زندہ رہنے کا درس دیں اور انہیں کوٹھڑیوں، حجروں اور ڈیروں سے نکال کر باہر لائیں تو اسلامی ممالک عمل کی گرمی سے بھڑ بھڑا جائیں اور مسلم ممالک اپنی کھوئی ہوئی میراث پھر سے حاصل کر لیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا لاہور میں مال روڈ، میکلوڈ روڈ، برانڈرتھ روڈ، شاہ عالمی، اکبری منڈی اور شاہ عالم مارکیٹ [کرا]چی کی بندر روڈ، جوڑیا بازار، نیپئر روڈ، بولٹن مارکیٹ، پورٹ ٹرسٹ ان دو شہروں کے راہبوں، گوشہ نشینوں، بے عملوں اور [تارک] الدنیا لوگوں کی وجہ سے ہر وقت سنسان اور بے آباد رہتی ہیں۔ لوگ دنیا کمانے سے کتراتے ہیں اور ہر وقت عاقبت [سنوارنے] کے لیے بے عملی کے حجروں میں بند رہتے ہیں۔ اس لیے پاکستان کے سارے شہر سنسان اور ویران رہتے ہیں۔

[اسرا]رِ توحید

توحید کے چار مراتب ہیں۔ ایک منفرد، دوسرا مغز کا مغز، تیسرا چھلکا اور چوتھا چھلکے کے اوپر کا چھلکا...... توحید کو ایک [اخرو]ٹ سمجھ لو جس پر دو چھلکے ہوتے ہیں اور اندر ایک مغز اور مغز میں تیل۔ پس توحید کا اول مرتبہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے کہے لا [الہ الا] اللہ مگر دل اس سے غافل ہو یا منکر۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس کلمے کے معنی کو دل سے سچ جانتا ہوں جیسے عام مسلمان اس کی [تصد]یق کرتے ہیں۔ مرتبہ سوم یہ ہے کہ نور حق سے مشاہدہ ہو کہ یہ معنی کھل جائیں (یہ مقام مقربین کا ہے) مقربین کون ہوتے [ہیں]؟ وہ جو اشیاء کو تو کثیر جانیں کہ دنیا ان سے بھری ہوئی ہے لیکن اس ساری کثرت کو اللہ کی طرف سے سمجھیں اور چوتھا مرتبہ یہ [ہ]ے کہ دنیا کی کل اشیاء اور سب موجودات سے نظریں اٹھا کر ذات واحد اور یکتا کے اور کسی کو نہ دیکھے۔

[م]سلمانوں میں اتفاق کیسے ہو؟

اتفاق ہوتا ہے دوسروں کو آرام و سکون پہنچانے سے۔ اگر مسلمان اس کا خیال رکھیں کہ دوسرں کو نفع پہنچانا ہے [تو س]ب متفق ہو جائیں گے۔

اسلام کا ایک حسن یہ ہے کہ اس کو اپنی اشاعت کے لیے نہ زر کی ضرورت ہے نہ زور کی۔

[پ]ردہ اور پابندی

ناپسندیدہ لباس وہ ہے جو اپنی ذات میں عزت اور گھمنڈ پیدا کرنے کے لیے پہنا جائے۔

[ا]سلام کا علم

میں صوفی ازم کے بورڈ سے ٹیک آف نہ کر سکا کیونکہ نہ میں بابا تھا، نہ ہی سائنس دان۔ میں تسلیم و رضا کی رسی [تھ]امنا جانتا ہی نہ تھا۔ پھر پاکستان میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ گھر گھر...... گلی گلی...... امید کی نئی کرن پھوٹی......

اسلام کا علم مجھے اپنے بڑوں سے ملا ہے اور یہ اتنا مختصر ہے کہ بڑی آسانی کے ساتھ چند جملوں میں ادا ہو جاتا ہے اور احکام کی صورت میں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ میں اسلام سے صرف اسی حد تک متعارف ہوں اور دعا کرتا رہتا ہوں کہ جتنی بات کی مجھے آگہی عطا کر دی گئی ہے، اس کے مطابق رہنے کی توفیق عطا ہوتی رہے۔

مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام کا مطلب سلامتی ہے۔ جو شخص اسلام قبول کر لیتا ہے، وہ سلامتی میں داخل ہو جاتا ہے اور جو شخص سلامتی میں داخل ہو جاتا ہے، وہ سلامتی ہی عطا کرتا ہے۔ اس کے مخالف عمل نہیں کرتا۔ جس طرح ایک معطر آدمی اپنے گرد و پیش کو عطر بیز کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان اپنے گرد و پیش کو خیر اور سلامتی سے لبریز کر دیتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے مجھ سے اپنے ماحول کو اور اپنے گرد و پیش کو سلامتی اور خیر عطا نہیں ہو رہی تو مجھے رک کر سوچنا پڑے گا کہ میں اسلام کے اندر ٹھیک سے داخل بھی ہوں یا نہیں......

میرے مسلمان ہونے کا ٹیسٹ اور میرے اسلام کی کسوٹی میرا گردش و پیش، میرے اردگرد کے لوگ اور میرا معاشرہ ہے جس کے اندر میں موجود ہوں۔ اگر میرے اردگرد کے لوگ سلامتی سے ہمکنار ہیں اور شر اور فساد سے محفوظ ہیں۔ خیر کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آسانی سے اور آزادی سے سانس لے رہے ہیں۔ ہر طرح سے سوکھے ہیں تو میں اسلام کے اندر ہوں اور اس خوشبودار ردا میں لپٹا ہوا ہوں جو اردگرد کی کثافت کو دور کر رہی ہے۔

اس بات کا جائزہ لینے اور اپنے گرد و پیش کے حوالے سے خود کو سمجھنے کے لیے مجھے علم کی ضرورت ہے اور یہ علم اس تعلیم سے ملتا ہے جو مجھے آج تک مل چکی ہے اور جو اب مجھے دی جا رہی ہے۔ میری آموزش یا میری استعداد علمی الفاظ کی اور بیان کی محتاج ہے۔ یہ میں تحریر سے بھی حاصل کرتا ہوں اور تقریر سے بھی۔ الفاظ مجھے شناخت دیتے ہیں، علم سے شناسائی عطا کرتے ہیں اور میرے معلوم میں اضافہ کرتے ہیں۔ میری معلومات بڑھاتے ہیں۔ معلوم اور معلومات میرے ذہن اور میری یادداشت کو معمور کرتے ہیں۔ میرے حافظ کے اندر کیٹلاگنگ کرتے ہیں۔ میری یاد بود کی فہرستیں مرتب کرتے ہیں......لیکن اس گہرے، پائیدار اور حافظے کو معمور کرنے کا عمل میری روح یا میرے وجود یا میری کارکردگی پر اثر ضرور ہوتا ہے لیکن زندگی میں میری پیش قدمیوں پر کوئی دیرپا اثر نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ میری دگرسازی نہیں کرتا۔ میں اپنے حافظے میں مجتمع الفاظ یا واقعات کے زور پر یا دوسری کتابوں کی مدد سے ایک اور کتاب تو مرتب کر سکتا ہوں لیکن وہ کتاب میرا حال نہیں ہوگی۔ میں نے اسے اپنی ذات کی لیبارٹری میں ذاتی تجربات سے گزر کر نہیں لکھا ہوگا۔ اس لیے اس کتاب سے علم نافع میں اضافہ نہیں ہوگا اور اس سے میرے گرد و پیش کو خیر نہیں پڑے گی۔ صرف کتب خانے میں اور لائبریری میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہو جائے۔ میرے لیے ایک بار پھر مشکل پیدا ہوگئی۔

فرمانے والے فرماتے ہیں کہ ہر صحیح علم اور نافع علم کو طالب علم کی ذات میں اتارنے اور اس علم کو متعلم کی روزمرہ عملی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے ایک باعمل استاد، ایک صاحب حال معلم اور ایک کرنی والے گرو کی ضرورت ہوتی ہے جس کی غیر موجودگی میں کتاب، سے الفاظ سے یا بیان سے حاصل کیا ہوا علم زندگی پر وارد کیا جا سکے۔ آپ تیراکی کے فن پر ساڑھے چار سو صفحے کی کتاب دس مرتبہ پڑھ کر اسے اچھی طرح سے حفظ کر لیں لیکن جب آپ پانی میں اتریں گے تو تیر نہیں سکیں گے۔ اس کے برعکس جب ایک ماہر تیراک آپ کا راہبر بن کر آپ کا ہاتھ پکڑ کر پانی میں اتارے گا تو پہلے ہی سبق میں پانی آپ کا وزن سہارنے لگے گا۔

آپ نے اکثر صاحب حال کی ٹرم سنی ہوگی لیکن مصروفیات کی وجہ سے اس پر کبھی غور نہیں کیا ہوگا۔ دراصل یہ

دانشمندانوں کی ٹرم ہے جن کا علم لہریں اور موجیں بن بن کر ان کے وجود سے گزرتا رہتا ہے اور جو اپنے علم کے ساتھ یکجان ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ ان کو لفظوں، حرفوں اور ہندسوں کی شکل میں ملتا ہے، وہ اسے اپنے وجود کی لیبارٹری میں اتار کر اپنا حال بنا لیتے ہیں۔ جس دھن کے ہوتے ہیں، اسی میں بہے جاتے ہیں۔ تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔ بس لیبارٹری کا آستانہ ہوتا ہے اور ان کی ہمہ وقت حاضری ہوتی ہے۔ اس حاضری سے اور اس محویت سے اور اس اختیار و قبولیت سے بڑے بند دروازے کھلتے ہیں اور اوپر سے بڑے بڑے خزانے ملتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ہمارے یہاں سائنس کی تدریس اسی وجہ سے انحطاط کا شکار ہے کہ یہاں سائنس کے صاحب حال لوگ نہیں ہیں، صرف استاد ہیں اور سائنس کے مدرس لفظوں اور کتابوں اور ہندسوں کو نئے کاغذوں پر منتقل کر کے سائنس کے نوٹس تو تیار کر سکتے ہیں لیکن کوئی دریافت یا اختراع نہیں کر سکتے۔

یہ لمبی اور بظاہر بے تعلق بات میں نے اس وجہ سے کی ہے کہ ہماری تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ اعلان ہمیں تعلیم اور تدریس کو ایک نئے زاویئے سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور اس لمحے سے خائف ہے کہ ہم پہلے سے موجود بہت سی تعلیمی رپورٹوں میں سے اٹھا کر کونسی صدر مملکت کے حوالے کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے سے ہماری تعلیم میں اسلامی شعار پیدا ہو جائے گا۔

اب سوچنا یہ ہے کہ نصاب میں تبدیلی کر دینے سے یا موجودہ نصاب میں مناسب کتر بیونت سے استادوں اور ان کے شاگردوں میں کس حد تک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ کیا محض الفاظ اور بیان اور چھاپے اور تقریر کے زور پر روح کو زندہ اور قلب کو منقلب کیا جا سکتا ہے۔ کیا موجودہ نظام الاوقات میں نیکی، اچھائی، راستی کے لیکچرر کا ایک خصوصی پیڑن دے کر مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں؟......میرا مطلب ہے کیا کسی طالب علم کو ''گریز اناٹومی'' منہ زبانی یاد کرا کے یا سنا کے ایک اچھا ڈاکٹر بنایا جا سکتا ہے؟ یا اس کو تھیٹر لے جا کر ایک ماہر سرجن کی حضوری میں دے کر سرجری کا فیض عطا کیا جا سکتا ہے کہ دیکھے اور سیکھے۔ پیروی کرے اور گن پائے!

پھر ہم کو یہ بھی سوچنا ہے کہ طالب علم کو علم محصور سکھانا ہے یا علوم وسعت پذیر سے روشناس کرانا ہے۔ اسلام تو نوع انسانی کو غلامی سے چھڑانے والا اور آزادی کی نعمت عطا کرنے والا دین ہے۔ وہ کوئی شے پوشیدہ نہیں رکھتا حتیٰ کہ خرابی اور برائی اور بے حیائی کو بھی اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ واضح کر کے بتاتا ہے کہ اس میں خرابی ہے، ویل ہے، ہلاکت ہے۔ اس کو اچھی طرح سے دیکھ لو، پہچان لو اور سمجھ لو۔ اس کی طرف رخ نہ کرنا ورنہ معدوم ہو جاؤ گے...... پھر اسلامی تعلیم، تنگ نظری، بند نظری، تعصب، طنز، طعن اور تشنیع کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اسلامی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کہیں بے دلیل ہو کر ہم کسی کو کافر، ملحد، زندیق، رجعت پسند، فنیٹک، ترمیم پسند یا فنڈامنٹلسٹ بھی نہیں کہہ سکتے۔ گالی دینے، بدزبانی کرنے اور نام دھرنے کی اسلام میں بڑی تنبیہ ہے۔

پھر ہم کو یہ بھی واضح کرنا پڑے گا کہ اسلامی تعلیم اور دوسری تعلیم میں کیا فرق ہے۔ لوگ بیچارے پریشان ہوں گے کہ یہ کیا نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا۔ کہیں گے تعلیم تو تعلیم ہی ہوتی ہے، جغرافیہ نہ اسلامی ہوتا ہے نہ غیر اسلامی۔ انجینئرنگ نہ اسلامی ہوتی ہے نہ ملحدانہ۔ تھرموڈائنیمکس نہ اسلامی ہے نہ مجوسی، کمپیوٹر نہ اسلامی ہے نہ کافر...... لے دے کے علم الاخلاق کی

تعلیم رہ جاتی ہے۔ سو وہ بڑے شوق سے آپ اسلامی ٹرمینالوجی میں ڈھال لیں۔

پھر جائز طور پر یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ آپ باہر سے آنے والی تعلیم کے ان تھیلوں کا کیا توڑ کریں گے جو ہر صبح آٹھ بجے والی ڈاک سے آ جاتی ہے اور رات کو ٹی وی پر گھر گھر بکھر جاتی ہے۔ اس میں حق اور باطل کی نشاندہی کرنے والے کونسے شہرہ آفاق ذہن آپ کے پاس موجود ہیں جو صحیح انتقاد کی صلاحیت رکھتے ہیں اور منطقی اور عملی طور پر غیر اسلامی تعلیم کا بطلان کر سکتے ہیں۔

اور پھر اگر آپ اس بات کا تہیہ کر ہی لیں گے کہ ایک سرکاری حکم نامہ کے ذریعے تمام درسگاہوں اور دانش گاہوں کو اسلامی رنگ میں رنگنے پر مجبور کر دیں گے تو ان شرارتی یا سادہ لوح گروہوں کا کیا سدباب کریں گے جو سیاہ رنگ کے موٹے مارکر خرید کر ہر کتاب میں ہیگل، نیٹشے، فرائیڈ اور مارکس کے نام پر پھرنے لگیں گے اور اناٹومی کی تصویریں بلیڈ سے کاٹ کر ہر آتے جاتے کو یہ بتانے لگیں گے کہ بھئی کیا کریں، اسلامی سرکار کا یہی حکم ہے۔ ان میں گو مفسدوں کی تعداد زیادہ ہو گی لیکن کچھ معصوم لوگ بھی اس عمل میں شامل ہو جائیں گے اور آخر میں یہ کہ اپنی درسگاہوں میں ہم وہ استاد کہاں سے فراہم کریں گے جو اخلاقیات کا درس دیتے وقت صرف اپنی شخصیت کے سحر اور اپنے اخلاق و عمل کی تاثیر سے اسلامی تعلیم کو اپنے طالب علموں کی روح میں اتار دیں گے۔

لیکن ان ساری باتوں سے میرا مقصد خدانخواستہ آپ کو بددل کرنا یا مایوس کرنا نہیں ہے۔ میں نے تو ان چند مشکلات کا ذکر کیا ہے جو ابھی ہمارے قومی، اخلاقی اور قومی شعور کے بڑے گیٹ کو بند کیے کھڑی ہیں۔ اس کے آگے ابھی چھوٹے چھوٹے اور بھی کئی ابواب ہیں جن کو اور بھی بھاری پتھروں نے بند کر رکھا ہے...... لیکن جہاں ارادہ نیک ہو اور نیت صاف ہو، وہاں بڑی سے بڑی مشکل بھی خود ہی راستہ دے دیتی ہے اور کوئی بھی ناکہ بند نہیں رہتا۔

لازم ہے کہ ہر حکومت، سیاست، دھونس دھاندلی، خوف، شماتت اور تحسین و تمجید سے بے نیاز ہو کر ایسا قدم اٹھائے اور پہلی مرتبہ ذہنوں کے ساتھ ساتھ روح و قلب کی آبیاری کا سامان بہم بھی کرے۔ اب زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے اور چھریوں اور کلہاڑیوں سے آنے والے انقلاب زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے۔ اصل انقلاب تعقل، تدبر اور تفکر سے آتے ہیں اور میرا ایمان ہے کہ تعقل اور تفکر کا ہیڈ کوارٹر قلب ہے، ذہن نہیں۔

وقتی کامیابی سے خوش نہ ہوں

روح کے ایک نئے تصور اور اس کی نئی تخلیق کے بغیر اور ایک نئے روحانی رویئے کے بغیر ہم صدیوں تک ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے اور کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اگر کچھ تعمیر ہی کرنا ہے تو پھر ایسی تعمیر کا ڈول کیوں نہ ڈالا جائے جو رہنے والی ہو، جو سالم ہو، مضبوط ہو۔

اپنی بنیادیں مضبوط اٹھائیں اور پھر جتنی چاہیں اس پر منزلیں تعمیر کرتے جائیں۔ دنیا میں کوئی سوسائٹی، کوئی ادارہ، کوئی تہذیب روحانی قدروں کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ روحانی قدروں سے آپ اخلاقی قدریں مراد لے سکتے ہیں۔

وقتی کامیابی سے خوش نہ ہو جایا کریں۔ میں زور دے کر یہ بات پھر کہوں گا کہ وقتی کامیابی سے خوش نہ ہو جانا کیونکہ جتنی کمزور بنیادوں پر جتنی اونچی اور بوجھل عمارت آپ بنائیں گے، اسی قدر تیزی سے اور خوفناک انداز سے وہ گر کر تباہ ہو گی۔

زندگی ہمیشہ اندر سے باہر کی طرف بڑھنی چاہیے۔ باہر سے اندر کی طرف نہیں۔ انسان اپنے ماحول کو زیادہ متاثر کرتا ہے، ماحول اس قدر نہیں۔ جس قدر ایک انسان اپنے ساتھیوں، ہم وطنوں اور پڑوسیوں سے محبت کرے گا، اسی قدر ان کے سیاسی اور معاشی ادارے انسانوں کے ساتھ یگانگت کریں گے اور اپنے جذبات کا اظہار کریں گے۔ اسی طریق پر باہر کی دنیا اندر کی دنیا سے امتزاج رکھے گی۔

دیکھو اس وقت سیاست جس محنت اور کوشش سے انسان کو انسان سے جدا کر رہی ہے۔ جماعت کو جماعت سے الگ کر کے ایک دوسرے کا دشمن بنا رہی ہے۔ اسی قدر روحانیت کا احساس انسان کو انسان کے قریب لاتا ہے۔ اگر ہم اپنی روحانی زندگی، روحانی رویئے اور روحانی خزانے پر اتنا ہی وقت اتنی توجہ اور اتنا سرمایہ لگائیں جتنا ہم سیاست پر لگاتے ہیں تو ہماری ساری مشکلات گھل کر بلکہ پگھل کر موم ہو جائیں۔ یہ اتنی بڑی، پہاڑ جتنی حقیقت ہے جس سے ہم سارے منہ موڑ کر بیٹھے ہیں اور اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

جب تک کسی مملکت کو خیر سگالی، دانشمندی، روحانی دلیری اور انصاف کے ساتھ نہیں چلایا جائے گا، یہ کسی صورت میں چل ہی نہیں سکے گی۔ اس میں کاغذوں اور رجسٹریوں اور فرمانوں کے مٹھے تو ہوں گے جنہیں قانون اور ضابطے کا نام دیا جاتا ہے لیکن صحیح حکومت نہیں ہو گی۔

لوگ عام طور پر بڑے سادہ لوح ہوتے ہیں۔ میں جو کہ سیاست کو بری طرح سے رگیدتا ہوں، اس کو ذلیل و خوار کرتا ہوں، نام دھرتا ہوں۔ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ بدبخت ہماری ایک چوری بھی ہے، آخر حکمرانی کا کوئی تو طریقہ ہو گا ہی۔ کسی نہ کسی کو تو ہم پر حکمران ہونا پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی اصول تو وضع کرنا ہی پڑے گا۔

مذہب وجود کی اخلاقی ضرورت

میں ایک مذہبی آدمی ہوں۔ وہ اس لیے کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ مذہب میرے وجود کی ایک اخلاقی ضرورت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو ورثے میں ملنے والی شے ہے۔ آموزش ہے، مزاج کی بات ہے۔ میں نے خود کئی مرتبہ آپ کو یہ سب کچھ کہہ کر تسلی دی ہے لیکن اس سے معاملہ سلجھا نہیں بلکہ اور الجھ گیا ہے۔ یہ مسئلے کا حل نہیں بنتا!

انسانیت بھی کوئی مجھ سے کم مذہبی نہیں ہے۔ جب میں ارد گرد دیکھتا ہوں تو کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ مذہب ساری تبدیلیاں برداشت کرتا رہا ہے۔ ہر قسم کے انقلابات سے گزرتا رہا ہے۔ کلچر کی ساری کروٹوں سے زندہ سلامت نکل گیا ہے۔ مذہب پر بڑے بڑے وار ہوئے، بڑے کلہاڑے چلے۔ کئی مرتبہ یہ درخت کٹا لیکن ہر مرتبہ اس کی شاخیں اور پتے اور کونپلیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ نکلیں۔ یہ درخت سوکھا تو اس کی نشوونما کی کیا وجوہات ہیں۔ یہ اس قدر تسلسل کے

ساتھ کیوں چلا جا رہا ہے۔

بزرگ کہتے ہیں کہ مذہب انسان کو خدا سے جوڑتا ہے۔ اس وجہ سے یہ قائم و دائم ہے کہ خدا کی ذات بھی حی و قیوم ہے اور پھر مذہب کوئی اندر کی چیز نہیں بالکل داخلی شے نہیں، تمام تر روحانی نہیں۔ یہ باہر کی شے بھی ہے، معروضی بھی ہے، اپنے رسوم و رواج اور اپنے بیرونی مظاہر بھی رکھتا ہے۔

مذہب بڑی کامیابی کے ساتھ لوگوں پر حکمرانی بھی کرتا ہے۔ اس لیے ابتدا میں اسے حکومتی انداز میں بھی استعمال کیا گیا۔ اس سے حکومتوں کے کام بھی لیے گئے بلکہ کچھ تو کہتے ہیں کہ اسے ایجاد ہی اس غرض سے کیا گیا۔ مذہب کو سیاست نے خوب خوب استعمال کیا۔ تمام سیاستوں میں پاکیزہ فراڈ کی نشاندہی ملتی ہے۔ لوگوں نے اسے دھوکے بازی کا ذریعہ بھی بنایا۔

لیکن اس سے کیا ثابت ہوا؟ کیا نتیجہ نکلا؟

عورت اور اسلام

صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے بڑے بڑے مرد، بادشاہ، سیاستدان، تاجر، عالم، فلسفی، بوڑھے، نوجوان بھاگتے ہیں اور اس عورت کی نقل میں بھاگتے ہیں جو پانی کی تلاش میں بھاگی تھی۔ ابد تک کے لیے رسم قائم کر دی گئی ہے۔ مرد منہ اٹھا کر خانہ کعبہ کی طرف دیکھتے ہیں اور بھاگتے ہیں۔ عورتیں چپ چاپ چلتی ہیں۔ انہیں بھاگنے کا حکم نہیں ہے۔ بی بی ہاجرہ کا مرتبہ بلند کرنے اور ان کے حوالے سے ساری عورتوں کا درجہ بلند کرنے کے لیے یہ رسم قائم کر دی گئی ہے۔

کاہلی

ایک شخص کے خط کے جواب میں تہجد کے وقت میری آنکھ تو کھل جاتی ہے لیکن کاہلی کی وجہ سے اٹھ نہیں سکتا، البتہ اذکار و اشغال جو آپ نے بتائے ہیں، ان کو بلا ناغہ کرتا ہوں۔ ان صاحب کو جواب میں لکھا کہ دفع کاہلی کے لیے تو حبس دم کریں اور اثر ذکر کے لیے کثرت ذکر جہر ضرب کے ساتھ کریں۔

جمہوریت اور منصور حلاج

اس نے کہا جمہوریت میں لوگ کچھ نہیں کہتے، معاف کر دیتے ہیں۔ پرانا زمانہ اچھا تھا لوگ پھانسی دے دیتے تھے۔ میرا بھی دل یہی چاہتا ہے لیکن مجھے معلوم ہے اس دور میں جمہوریت ہے، دین نہیں، سختی نہیں۔ منصور کا قصہ سنو۔

سیدھا راستہ

دکھا ہم کو سیدھا راستہ، راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے اپنا کرم کیا نہ ان لوگوں کا......

صراط مستقیم کے لوگ سیدھی راہ پر چلتے ہوئے۔ کاش میں ان کے نقوش پا پر چل سکتا۔ حضرت بلالؓ چلے جا رہے [ہیں۔ میری] آرزو ہے، میں ان کا غلام ہوتا۔ ان کا بکس اور ٹوکری اور جوتے میرے ہاتھ میں ہوتے اور میں اس راہ پر چلتا جس پر وہ چلے جا رہے ہیں۔ میں ان کے گھر کا مالی ہوتا۔ اندر سے مجھے حکم ملتا اور میں سودا سلف وغیرہ خرید کر لایا کرتا۔ [...] آتا، جھڑکیاں کھاتا، چاہے ان کے دوسرے رشتہ دار مجھ پر سختی کرتے لیکن مجھے اس تعلق سے خوشی ہوتی کہ میں ان کا [غلا]م ہوتا۔ وہ حضورؐ سے مل کر آتے، میں ان کو دیکھ لیا کرتا۔ اتنی ہی میری حیثیت ہوتی۔

[علا]قے کا بوجھ

مسلمان نہ مانے اس کے وجود اور اس کی سائیکی پر اس کے دین اور اس کے علاقے کا بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ اسی [لی]ے وہ گناہ کرنے کے لیے اور بدمعاشی اختیار کرنے کے لیے باہر کا رخ کرتا ہے اور باہر جا کر خوب کھل کھیلتا ہے۔ اپنے [ملک] میں نہیں کھیل سکتا۔ اس لیے نہیں کہ وہاں قانون اور رائے عامہ کا شکنجہ سخت ہوتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ جس طرح کوئی [...]یں، معبد میں، کلب میں عبادت کدے میں جا کر کھل نہیں کھیل سکتا۔ اسی طرح مسلمان کے لیے اپنے گھر میں کھل کھیلنا [بہ]ت ہی مشکل ہے۔ جس طرح کلب میں، ساحل سمندر پر، ہوٹل کے اکیلے کمرے میں بس ایک ہی خیال آتا ہے اسی طرح [...] اسلامی ملکوں اور ریاستوں میں بس ایک ہی خیال ذہن میں گھومتا ہے اور ایک ہی عمل رونما ہوتا ہے۔ عشئیں۔

[مذ]ہب اور سائنس

سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے بجائے اصل میں ایک دوسرے کا ضمیمہ اور متمتہ ہیں۔ [ایک] دوسرے کے بغیر خام ہے اور دوسرا پہلے کے بغیر نا تمام ہے۔ مذہب اس وقت تک درست نہیں جب تک علم اس کی [تائی]د کرے۔ علم اس وقت تک صحیح نہیں جب تک مذہب اس کی تصدیق نہ کرے۔ سائنس ذات باری کی نسبت اس [...]ے کا بطلان ضرور کرے گی کیونکہ سائنس کا کام یہ ہے کہ وہ تمام واقعات عالم پر غور کر کے اس کے اسباب ظاہری کے [...]ے ان کو مرتب کرے۔ ان کی جماعت بندی کرے اور یہ دکھائے کہ کوئی واقعہ بے قاعدہ اور بے اصول نہیں ہے بلکہ [...] کام کسی نہ کسی قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ بظاہر سائنس کی ترقی ظہور قدرت خداوندی کے منافی نظر آتی [ہے مگر خدا کو] ماننے والوں کے عقیدے کے مطابق وہی ترقی مظہر شان کبریائی بن جاتی ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ فضائے محیط میں [ستا]رے اس طرح گردش کرتے ہیں۔ سائنس کہتی ہے سطح زمین پر مختلف قسم کے نباتات اور حیوانات یوں پیدا ہو گئے۔ [مذہ]ب کہتا ہے بے شک درست ہے، خدا نے ان کو اسی طرح پیدا کیا ہے۔

[ر]ہبانیت فی الاسلام

اگلے زمانے میں سادھو اور صوفی لوگ گیان دھیان کے لیے مخلوق سے بیگانہ ہو کر غاروں اور گھپاؤں میں جا

بیٹھتے تھے اور تارک الدنیا ہو جاتے تھے۔ اب سائنس نے آج کے تارک الدنیا کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔
اس وقت ایجادات اور آسائشات کی وجہ سے ساری خدائی ہی تارک الدنیا ہو گئی ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں، سیکرٹریوں،
محافظوں اور دربانوں میں گھرے دفتروں میں، اپنے اپنے ٹیلی ویژنوں کے سامنے ہم مجموعی طور پر تارک الدنیا ہو گئے
ہیں۔ یہ سائنس کے کمالات میں سے سب سے بڑا کمال ہے۔

موتو قبل انتموتو

جب بھی تم پر کوئی موڈ طاری ہو، غم کا موڈ، غصے کا موڈ، نفرت کا، شہوت کا، خوشی کا، جولانی کا حتیٰ کہ نماز میں بھی کوئی موڈ طاری ہو تو ہمیشہ یاد رکھ کر یہ بھی گزر جائے گا۔ اپنے آپ کو سمجھا لو کہ یہ بھی گزر جائے گا۔ بس اس کو ایک عادت بنا لو کہ یہ بھی جائے گا اور یہ بھی گزر جائے گا...... حقیقت یہ ہے کہ موڈ گزر جاتا ہے، چلا جاتا ہے اور تم صاف ستھرے رہ جاتے ہو، دھوئے دھائے۔ آہستہ آہستہ تم میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے آپ کو موڈ سے دور کر لو۔ پھر تم میں اور موڈ میں فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے، دوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر تم ایک تماشا بن جاتے ہو اور موڈ کو ایک شاہد کے طور پر ایک گواہ، ایک بھی گواہ کے طور پر دیکھنے لگ جاتے ہو۔

پھر تم پر خاموشی اترتی ہے۔ وہ خاموشی نہیں جو تم زبردستی اپنے آپ طاری کرتے ہو یا زور لگا کر چپ اختیار کرتے ہو۔ یہ خاموشی اور طرح کی ہوتی ہے جو غیر معلوم سے آتی ہے۔ کسی نامعلوم مقام سے، عرش سے عرش عظیم سے، ایک تحفہ بن کر۔

ایک بات یاد رکھو کہ جس قدر فاصلہ ہو گا اسی قدر آسانی ہو گی۔ اسی قدر آگاہی ہو گی۔ تم بحال ہوتے جاؤ گے، فرار پکڑتے جاؤ گے۔ مہاتما بدھ بنتے جاؤ گے، بڑ کے نیچے بیٹھا ہوا بدھا۔

لیکن یہ گیان موت سے پہلے حاصل نہیں ہو گا۔ جب تک اپنے آپ کو مار نہیں لو گے، مرنے سے پہلے مار نہیں لو گے، یہ کیفیت نہ مل سکے گی۔ پرانے کو مارنا پڑے گا اور نئے کو جنم دینا ہو گا۔ اپنے پرانے فلسفے، پرانے اعتقاد، پرانے وجود، پرانے ایغو، پرانی انا سب کو ختم کرنا پڑے گا۔ چتا میں ڈال کر سواہ کرنا پڑے گا...... اسی لیے بڑے بڑے آستانوں اور درگاہوں پر "مچ" لگا ہوتا ہے۔ آگ سلگ رہی ہوتی ہے۔ ایک چھوٹی سی چتا ہر وقت بھڑکتی رہتی ہے تاکہ آنے والا اس میں اپنے پرانے اعتقاد پرانا یقین پرانا وجود، پرانی شہرت پرانا نام پھینک کر بھسم کر ڈالے اور پھر اسی ققنس سے ایک نیا جنم لے۔ ایک نیا تنفس پیدا کرے۔

یہ نیا جنم لینے والا وجود ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ آنے کو تیار ہوتا ہے۔ تڑپ رہا ہوتا ہے۔ کلپ رہا ہوتا ہے لیکن پرانے وجود میں اس کے آنے کی کوئی جگہ ہی نہیں ہوتی۔ سارا ٹھوسم ٹھوس بھرا ہوتا ہے۔ مہمان تو دروازے پر ہوتا ہے لیکن میزبان سب کچھ بند کر کے اور کنڈیاں چٹخنیاں چڑھا کر اندر بیٹھ رہتا ہے۔

اپنے آپ کو کشادہ کرو، اپنے آپ میں جگہ پیدا کرو، دروازے کھول دو، پھاٹک وا کر دو۔ زنجیریں توڑ دو اور اگر

سب کچھ نہ ہو سکے تو اس گھر کو آگ لگا کر بھسم کر دو اور آنے والے کے لیے کھلا اور صاف قطعہ زمین پیدا کر لو تاکہ وہ وہاں ٹھہر سکے۔ رہ سکے، خیمہ لگا سکے۔

آدم اور حوا

جان من! میرے پیارے آدم اس وقت کیا ہو گا جب سورج ماند پڑ جائے گا اور اس کی روشنی ختم ہو جائے گی!
میں نے دیکھا ہے یہ کبھی کبھی بالکل مدھم ہو کر پیلا پڑ جاتا ہے۔ اللہ ہم اس وقت کیا کریں گے!
اگر یہ اپنی روزمرہ خدمت سرانجام نہ دے سکا، نہ اس نے روشنی دی نہ گرمی عطا کی، اس وقت کیا ہو گا۔
دیکھ لینا ایک دن اس نے تھک کر رہ جانا ہے اور ہمارے سامنے بجھ جانا ہے۔
ہائے جان! اس وقت کا اندازہ کرو جب سورج فوت ہو گیا اور ہم زندہ رہ گئے۔
اور یہ ننھے ننھے بے نشان سے ٹمٹماتے ستارے اور پیلا پیلا چاند ان سے تو مرحوم سورج کی ذمہ داریاں نہیں نبھائی جا سکتی۔
انہوں نے تو اس کے ساتھ ہی ختم ہو جانا ہے، پھر ہم اندھی اندھیری راتوں میں کیسے زندہ رہیں گے، کیسے وقت گزاریں گے؟

حضرت آدم: بیوی جان! تم اس کے گرنے، مرنے، بجھنے کی فکر ہی نہ کرو۔ مجھ پر اعتماد کرو اور یقین رکھو کہ میں اس کی جگہ ایک اور چمکتا دمکتا دہکتا سورج لے آؤں گا۔

عقابوں کے پر ادھار مانگ کر ایک شعلہ جوالا کی طرح اونچے آسمانوں میں اڑان بھروں گا اور پرانے سورج کی جگہ ایک نیا سورج فٹ کر دوں گا۔ تم فکر ہی نہ کرو، گھبراؤ مت اور بالکل چنتا نہ کرو۔

اوپر ہی اوپر آسمانوں کی وسعتوں میں تیز تیز روشنی کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے ستارے بھی ٹانک دوں گا اور ان کی روشنی بھی بڑھا دوں گا۔

حوا: ہائے جان! تم کتنے پیارے کیسے ذہین اور کس قدر باہمت ہو، بہشت کی ہر شے سے اعلیٰ اور جنت کی ہر شے سے ارفع لیکن میں بھی کیسی بے وقوف ہوں اور کس چنتا میں گھری رہتی ہوں۔ بھلا وہ جس نے تم کو بنایا ہے اور سورج اور چاند نہیں بنا سکتا۔

وہ جس کی صبحوں پر اور شاموں پر حکمرانی ہے اور جو وقت پر اور سمے کا راجہ ہے، پرانے ستاروں کی جگہ نئے ستارے ایسے بکھیر دے گا جیسے میں یہ دانے بکھیر رہی ہوں۔

آدم: (قدرے غصے میں) نہیں نہیں۔ میں کہہ جو رہا ہوں کہ تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو، پھر خوامخواہ فضول باتیں کیوں کیے جا رہی ہوں۔

روحانیت

خودشفائی Self healing

خودشفائی کے کام کوکل پر نہ ٹالنا۔ یہ آج ہی شروع کرو۔ بھوکے ہوتے ہوتو کھانے کی میز پر لپکتے ہو۔ اب روحانی بھوک لگی ہے تو کچن میں چلو وہاں سب کچھ موجود ہے اور تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ اگر یہ خوف ہو کہ وہاں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا تو بھی وہاں پہنچو اور دیکھو۔ خوفزدہ ہی پہنچو۔ لرزاں اور ترساں ہی پہنچو۔ وہاں تم کو ایک نیا تجربہ ایک نیا احساس ہوگا اور یہ احساس ہی اس حقیقت کو صاد کرے گا کہ تمہارا وہاں انتظار تھا۔

اچھے دنوں کی امید

اچھے دن آئیں گے اور ضرور آئیں گے بشرطیکہ تم ان کے آنے کی امید چھوڑ دو۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہاری بے چینی اور خرماں نصیبی کی وجہ امید ہے۔ وہ تمہیں بار بار تڑپاتی ہے۔ بار بار رُلاتی ہے اور ہر وقت غم میں مبتلا رکھتی ہے۔

اصل میں امید تم میں دوئی (Self deception) کا خیال باطل پیدا کرتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ایک تو وجود ہے اور ایک کوئی اور دوسری چیز ہے جو اس وجود سے نکل کر اس سارے Self کو بچا لے گی۔ بس یہی ایک دھوکا ہے کیونکہ زندگی ایک سے بٹی ہوئی نہیں۔ مگر امید اس کو بٹی ہوئی بنا کر پیش کرتی ہے.....تم ایسے کرو کہ امید کا خیال چھوڑ دو۔ جلد ہی تم محسوس کرنے لگو گے کہ باہر سے کسی شے کے آ کر بچانے اور سہانا کرنے کی کوئی تک ہی نہیں۔ تمہارا اکیتائی کا شعور ہی تمہاری نجات ہے۔

جھگڑے کا حل

''ہر شام اور ہر رات کوئی نہ کوئی نیا جھگڑا آ موجود ہوتا ہے اور ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اس جھگڑے سے اور روز روز کے مسئلے سے کس طرح جان چھڑائی جائے؟''

''معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات کا کوئی حل ڈھونڈنے کے بجائے جھگڑے کا حل تلاش کر رہے ہیں۔ مسئلے کے باہر جھاڑ پونچھ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا گند تو اندر پڑا ہوا ہے۔ کچن کے فرش پر آپ کتنی ہی ٹاکی ماریں وہ نہیں سوکھے گا

سب سے پہلے آپ کو وہ ٹونٹی بند کرنا پڑے گی جو فرش پر پانی بہا رہی ہے۔ اسی طرح اپنے نت نئے جھگڑے کی ٹونٹی آپ خود ہیں۔''

''ایسی باتوں کو سمجھنے کے لیے کہاں سے روشنی حاصل کی جائے؟''

''یہ روشنی آپ کو بالکل سامنے ملے گی اور مفت ملے گی۔ اگر راستے میں یہ روشنی ماند پڑ جائے تو اپنا سفر ترک نہ کرنا اگلے موڑ پر یہی روشنی پھر شروع ہو جاتی ہے وہاں بڑا زبردست بلب لگا ہے۔''

لمس۔ یاد

پرانی یاد ذہن میں نہیں ہوتی' وجہ یاد یا وجود یادداشت میں ہوتی ہے۔ ژال کا کٹو لکھتا ہے میں ایک مرتبہ پھر اپنے پرانے گاؤں آیا جہاں میں سکول میں پڑھا کرتا تھا اور جدھر سے جاتے ہوئے ایک تنگ گلی میں پتھر کی کھردری دیوار کے ساتھ ہاتھ گھساتا ہوا اس گلی سے نکلا کرتا تھا۔

اب کی بار میں نے پچیس تیس سال بعد اس دیوار پر اسی طرح سے ہاتھ پھیرا تو مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا۔ واپس پلٹ کر میں نے کافی سارا جھک کر (جتنا میرا اس زمانے میں قد تھا) پھر اس دیوار پر ہاتھ پھیرا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جس طرح سوئی گراموفون ریکارڈ پر رگڑ کھاتے ہی گانا گانے لگتی ہے۔ مجھے پتھر کی دیوار سے اس زمانے کی بو باس آنے لگی۔ میری نیلی ٹوپی' کتابوں سے بھرا چمڑے کا جزدان کا کندھے پر بوجھ۔ میرے سارے دوستوں کے نام ایک ایک کر کے۔ سارے استادوں کے چہرے۔ میرے دادا کی گرجدار آواز۔ اس کی ڈاڑھی سے سگار کی خوشبو۔ میری بہن کے جوڑے سے مولسری کے پھولوں کی خوشبو میری ماں کے لباس سے لہسن پیاز اور باسی ڈبل روٹیوں کی خوشبو۔

کاکٹو کہتا ہے یہ یاد کہاں سے آئی۔ کیا میرے دماغ میں تھی۔ کیا اعصاب میں تھی۔ یادداشتوں کی تھیلی میں تھی؟ میں کہتا ہوں نہیں نہیں.....وہ اس دیوار کے اندر تھی۔

آپ نے کئی بار لوگوں کو بزرگوں کی قبروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ اس سے ہم پڑھے لکھے لوگوں کو بڑی چڑ ہوتی ہے۔ ہم اس بیہودہ حرکت پر نفرین بھی کرتے ہیں بہت سے لوگ اس کو شرک سمجھتے ہیں۔ کچھ قبر پرستی کے طعنے دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے سے ان کی خوشبو آتی تھی۔ وہ خالی خوشبو ہی نہیں ہوگی ان کی آواز اور ان کے لہجے کا زیرو بم بھی ہوگا۔

خواہشات کم ہوں تو انسان میں کشف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مادی دنیا سے بندھن انسان کو ظالم اور سخت گیر بنا دیتا ہے۔ عراق پر حملہ' فاک لینڈ پر تھیچر کا حملہ' افغانستان پر امریکہ کی میزائل باری' ان ممالک کی یادداشت کو کم کر دیتی ہے۔ خواہشات کچھ یاد کرنے نہیں دیتیں۔

میری پرانی کرسی' پچیس برس پرانی اب بھی میرے ساتھ ہے۔ اس پر میں نے کالج کے زمانے میں پڑھائی کی۔ نوکری کے زمانے میں نوٹس لکھے۔ اس پر بیٹھ کر گیارہ کتابیں تحریر کیں۔ اس کی گدی نو مرتبہ مرمت کی۔ چوبیس بیس

مرتبہ ٹھکوائیں۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ میں اس پر بیٹھتا ہوں۔ اس کے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتا ہوں تو میرے سامنے کئی راستے روشن ہوتے ہیں..... اس پر ہاتھ پھیرنا کوئی شرک نہیں۔ کوئی ضعیف الاعتقادی کا مظہر نہیں..... کوئی رچول نہیں۔ یہ تو تعلق کی بات ہے۔ جیسے ایک شہسوار اپنے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ ایک رائٹر اپنی کرسی کے بازوؤں کو سہلاتا ہے۔ ایک دعا مانگنے والا کسی مقدس اور متبرک شے کو چھوتا ہے۔

مجھے پتہ نہیں میں اسے کیوں ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہوں۔ کوئی ایسی رکھنے والی چیز بھی نہیں۔ دکھانے والی بھی نہیں۔ بتانے والی بھی نہیں لیکن یہ میرا ساتھ نہیں چھوڑتی میں تو اس کو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھے نہیں چھوڑتی۔

صبر و سکون

کسان ہل جوتتا ہے۔ کھاد ملاتا ہے مٹی نرم کرتا ہے بیج ڈالتا ہے پانی دیتا ہے اور پھر پودے کے انتظار میں کھڑا ہو جاتا ہے..... پھولوں کو پودوں سے زبردستی کھینچ کر نہیں نکالا جا سکتا۔ اس کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ خاموشی کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ..... اور محبت کے ساتھ!!

اللہ کی محبت کا بیج بھی ایسے ہی بویا جاتا ہے اور پھر اسی طرح روحانی مراد کا بھی انتظار کیا جاتا ہے۔ خاموشی سے محبت سے جرأت سے! جو کوئی بھی اس میں بے چینی کا اور بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے وہ مراد حاصل نہیں کرتا۔ بے صبری بار آوری کے لیے مناسب کھاد نہیں ہے۔

ابدی پھولوں کے حصول کے لیے ابدی انتظار کی ضرورت ہے اور جو ابدی انتظار کا تہیہ کر لیتا ہے اس کے لیے فٹ سے بھی دروازہ کھل جایا کرتا ہے۔ ہمارے اندر' اندر کی طاقت موجود ہے اور کافی مقدار میں موجود ہے لیکن ہم بے صبری کے ساتھ اس کو گنوا دیتے ہیں۔

گدلے جوہڑ کے اندر اپنے چھکڑوں کو تیزی سے ہانکتے ہوئے گزارنا اور بھی گدلاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ آرام سے چلو گے تو سب گار بیٹھ جائے گی..... ہم پر لازم ہے کہ ہم محض شاہد بنیں۔ دیکھنے والے بنیں۔ ذہن خود بخود پاکیزہ ہو جائے گا۔ ہمیں ذہن کو پاکیزہ بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ساری گڑبڑ اس ذہن کو پاکیزہ بنانے سے پیدا ہوتی ہے۔ آرام سے کنارے پر بیٹھ کر نظارہ کریں اور پھر دیکھیں کیا نظارا ابھرتا ہے۔

آزادی

انسان تو ایک جنگلی گھوڑا ہے۔ تند خو' تیز رفتار اور منزل مار۔ اس کو آزادی پسند ہے اور وہ سر اٹھا کر دونوں پاؤں اٹھا کر ہنہنا کر اپنی آزادی کا اعلان کرتا رہتا ہے آزادی سے محبت کرتا ہے۔

انسان بھی ایسا ہی ہے آزاد..... خود مختار

لیکن آدمی گرفتار بھی ہو جاتا ہے۔ پکڑا بھی جاتا ہے۔ محبت میں' سختی میں' کوڑے کے نیچے' تازیانے میں' بیٹھے

لفظوں سے۔

انسانی سپردگی کی متعدد وجوہات ہیں۔ خود سپردگی اپنی مرضی سے حوالگی۔ ظلم کے آگے سرنگونی۔

بچپن میں مذہب کے لیے سپردگی کا درس دیا جاتا ہے۔

اس پر درسگاہوں میں سختی سے عمل کرایا ہے..... ان درس گاہوں میں استاد ایک دیوتا کے رُوپ میں سپردگی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ استاد کا ادب کرایا جاتا ہے۔

والدین کا اندھا ادب۔

اتھارٹی کا حکم منوایا جاتا ہے۔

جمہوریت میں آمریت کا سارنگ روپ ہی ہوتا ہے۔ لوگ اپنے حقوق ووٹ کے ہاتھ گروی رکھ دیتے ہیں۔ آزادی تقریر سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ اپنی خوشیاں سیاسی لیڈروں کو عطا کرتے ہیں ان کے جلوسوں میں ناچتے ہیں ان کی گاڑیوں کے آگے بھنگڑا ڈالتے ہیں۔

جمہوریت نواز لیڈروں کے گھر اور آمروں کے گھر بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔

ان کا طرز تکلم ایک سا ہوتا ہے۔ ان کے غیر ملکی دورے' سربراہوں سے ملاقاتیں ایک سی ہوتی ہیں۔

ایک خاموش اعلان

زندگی کے ایک مقام پر پہنچ کر آپ کو عزیزوں' دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے ایک اعلان کرنا پڑتا ہے۔ ایک خاموش بیان دینا پڑتا ہے کہ جناب آیندہ سے میرے مزاج میں فوری اور اچانک تبدیلی سے آپ کو میرے بارے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا دُکھ اور ذرا سی تکلیف بھی ہوگی۔ میرے روّیے پر آپ ناخوش بھی ہوں گے۔ لیکن میں آپ کو ناخوش کرنا یا آپ کو hurt کرنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اب میں تھک گیا ہوں اور خود اذیتی اور self punishing سے نکل کر آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تو آپ میرے ساتھ چل سکتے ہیں اور اس تبدیلی پر برہم نہیں ہوتے تو بسم اللہ' مجھے بڑی خوشی ہوگی لیکن اگر یہ آپ کے لیے مشکل ہے تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں اکیلا اس سفر پر نکلوں..... زندگی کے روزمرہ معمولات میں تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن باطن کے سفر کے لیے میں نے ایک اور راستہ تلاش کر لیا ہے۔ مجھے پتہ نہیں یہ راستہ مجھے کہاں لے جائے گا لیکن اتنا پتہ ہے کہ یہی صحیح اور راست قدم ہے!

تشویش و اندیشے کا علاج

زندگی میں تشویش اور پریشانی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو اُس تقاضے کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیں جو دوسرا آپ سے رکھتا ہے۔ اس ''وجہ'' کی بنا پر بڑے دردناک قسم کا خود (self splitting) کا

عمل شروع ہوجاتا ہے۔

آپ کے وجود کا ایک حصہ تو لوگوں کی توقعات کے مطابق رہنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتا ہے اور دوسرا سکون اور آرام سے زندگی گزارنے کی خواہش میں ڈوبا رہتا ہے۔ دوسروں کی توقعات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کہیں ''وہ دوسرا'' ہم کو چھوڑ نہ دے۔ ہم سے منہ نہ موڑ لے۔ اس لیے ہم اُس کو خوش رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارا ساتھی رہے' دوست بنا رہے۔ جنسی مطابقت ختم نہ کردے' جنسی ساتھی نہ رہے۔

اس کا آسان علاج یہ ہے کہ ''اپنے بن کر اور اپنے ہو کر رہو''۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ لوگوں کی خواہش کے مطابق رہا جائے۔ غلامی سے نکل کر آزاد ہوجاؤ اپنی مرضی کرو جیسے پسند کرتے ہو ویسی زندگی بسر کرو۔ اپنے بن کر رہنے میں کوئی اندیشہ نہیں' کوئی تشویش نہیں وسواس نہیں' مزے ہی مزے ہیں۔ اس قدرتی حالت میں رہنے سے کوئی بھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

اندھیرے کا سفر: عجیب حقیقت

جو شخص اپنی مشکلوں اور الجھنوں کے ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں وہ اپنی ذات پر زیادہ توجہ دینے کے بجائے دوسروں کا زیادہ دھیان رکھتے ہیں۔ دوسروں کی بات زیادہ کرتے ہیں۔

خوشیوں کو کہاں تلاش کریں؟

اپنے کو حکم کرنے اور اپنی بات کرنے کا پختہ تہیہ کرلیں خوشیوں کی تلاش کا جنون ختم ہوجائے گا۔ خوشیاں قریب آجائیں گی۔ باطن کے سفر میں کئی بار یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں کدھر جارہا ہوں۔

''مبارک ہو' سلامتی ہو..... اس سفر پر جانے کے لیے یہ معلوم ہی نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کدھر جارہے ہیں۔ اگر آپ نئی نئی سینریوں اور نئے مناظروں کے بیان میں مشغول ہیں تو آپ کا سفر رُکا ہوا ہے..... ایک راز کی بات سن لیجئے آپ کے کام آئے گی: جتنی مسافت آپ اندھیرے میں طے کریں گے اسی تیزی کے ساتھ روشنی کی طرف بڑھیں گے۔

کیا تم آزاد ہونا چاہتے ہو' ہلکے پھلکے رہنا چاہتے ہو لیکن یہ کافی مشکل کام ہے۔ ہم کو ہماری پسند اور ناپسند نے یرغمال بنا رکھا ہے اور ہم مجبور ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہماری زندگیوں میں طعام' لباس' آرائش اور تفریح...... کے اندر چھوٹی چھوٹی ترجیحات نے ہم کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ جو شخص کھانے کے معاملے میں خصوصی ترجیحات کا حامل ہے' وہ دوسرے معاملات میں بھی خصوصیات کا اسیر ہوگا۔ وہ ایک مخصوص قسم کی موسیقی کو پسند کرسکتا ہوگا۔ وہ ایک مخصوص قسم کے آرٹ سے ہی لطف اندوز ہوسکتا ہوگا۔ جب اپنی مرضی اپنی پسند اپنی خواہش کی شے کا سامنا ہوگا یرغمالی خوش رہے گا ورنہ نوے فیصد دکھ میں اور تکلیف میں گزارے گا۔

جب چھوٹے چھوٹے معاملات میں ہمارا یہ حال ہے تو بڑے معاملات میں ہماری کیا حالت ہوتی ہوگی.....

لیکن اگر ہم چھوٹی چھوٹی خواہشات کی یرغمالی قید سے نکل جائیں تو پھر بڑے معاملات خود ہی طے ہوجائیں گے اور ہم ایک سکون اور آزاد زندگی بسر کرنے پر قانع ہوجائیں گے۔

''الاّ قلیلاً''

انسانی ذہن ایسے ان گنت سوال پوچھنے کی صلاحیت رکھتا ہے جن کے جواب نہ اس کو معلوم ہوتے ہیں نہ وہ ساری عمر ان کے جواب دے سکتا ہے۔ اس (ذہن) کی کچھ عجیب سی ساخت ہے اور جیسا کہ یہ ہے یہ ایسی چیزوں کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے جن کو ہم اپنی حیات کے تجربے سے حاصل نہیں کرسکتے۔ ہم خدا کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ہم روح کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ایک مربوط شے ہے یا بہت سی چیزوں سے مل کر بنتی ہے۔ اگر یہ بہت سی چیزوں سے مل کر بنتی ہے تو اس کی ہیئت ترکیبی کیا ہے؟ یا پھر سے جسم سے اور بدن سے الگ کوئی شے ہے! پھر ہم کائنات کے بارے میں سوال کرتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ دنیا کی ابتداء وقت کے اندر ہوئی تھی یا یہ ابدی شے ہے۔ ایسے بہت سے اور سوال اور بہت سے معلوماتی تقاضے اپنی جگہ دلچسپ بھی ہیں اور توجہ طلب بھی۔ ان کے بچار میں لطف بھی ہے لیکن ان کا کوئی جواب نہیں بن پڑتا..... کئی مرتبہ فلسفہ آگے بڑھ کر ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن (بقول کانٹ) جواب دیتے وقت بہت ہی کنفیوژ ہوجاتا ہے اور احمقانہ دلائل دینے لگتا ہے۔

ہمزاد

ہر شخص کے وجود میں اس کے وجود کی ایک نقل بھی ہوتی ہے جو جسمانی وجود کے مقابلے میں ہلکی' روحانی اور لطیف ہوتی ہے۔ اس کو دوسرا جسم یا ڈبل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کو ہمزاد کا نام بھی دیتے ہیں۔ یہ جسمانی وجود کے مقابلے میں زیادہ آزاد اور سریع الحرکت ہوتی ہے اور جہاں چاہے آسانی کے ساتھ جاسکتی ہے۔

دعویٰ ہے کہ ہمزاد جسم کے اندر سے نکل کر باہر چلا جاتا ہے اور اس کمرے میں اس گھر میں اور اس شہر میں اور بعض اوقات اس ملک سے باہر نکل کر گھوم پھر کر پھر واپس آجاتا ہے۔ جب تک ہمزاد باہر گھومتا ہے جسمانی وجود اپنی چارپائی پر یا اپنی کرسی پر یا اپنے آسن پر موجود رہتا ہے۔

ہمزاد ایک روپہلی دھاگے کے ساتھ جسمانی وجود سے بندھا رہتا ہے اور یہ دھاگا جتنا چاہے اس قدر طویل ہوتا جاتا ہے۔ یہ دھاگا یا ربن یا گوٹا ناف کے نیچے بندھا ہوتا ہے اور یہی اس کے جڑنے کا مقام ہے۔ یہ ہلکے طور پر منور بھی ہوتا ہے' کبھی اس کو روپہلی دھاگا کہتے ہیں۔ یہ ربن عام طور پر دو یا تین انچ چوڑا ہوتا ہے لیکن جوں جوں ہمزاد دُور ہوتا جاتا ہے' وہ باریک ہوجاتا ہے۔

ہمزاد خیال کی سی تیزی کے ساتھ جہاں چاہے پہنچ جاتا ہے۔ عام طور پر تیرتا ہوا پھرتا ہوا اُفقی انداز میں سفر کرتا ہے۔ اس ربن کے ٹوٹنے کا کبھی بھی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ صرف موت کے وقت ٹوٹتا ہے۔

یہ "ڈبل" جسمانی وجود کے اندر سے یوں نکلتا ہے جیسے کیلے کے چھلکے میں سے اس کی گلی نکلتی ہے یا دستانے میں سے ہاتھ نکلتا ہے۔ نکلنے سے پہلے جسم کے اندر ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ پھر سن سا ہو جاتا ہے۔ پھر ٹھنڈی ہوا کا احساس ہوتا ہے۔ پھر سرنگ کے اندر داخل ہونے کی feeling ہوتی ہے۔

جب ہمزاد نکل جاتا ہے تو جسمانی وجود پرسکون اور بے حس ہو جاتا ہے اور اس وقت تک اسی طرح سے رہتا ہے جب تک یہ لطیف وجود واپس آ کر جسمانی وجود میں داخل نہ ہو جائے۔

پتہ نہیں یہ کس میٹریل کا بنا ہے لیکن یہ ایک برقی وجود ہے کیونکہ جسم سے جدا ہوتے وقت بجلی کا ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے ہمزاد ٹیلیفون کی تاروں میں داخل ہو کر بھی سفر کرتے ہیں۔

ہمزاد کو رہنما بھی ملتے ہیں۔ ابتدا میں کسی رہنما کے ذریعے ہی ہمزاد جسمانی وجود سے نکلتا ہے آگے چل کر وہ اُسے گائیڈ بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی سفر کرتے ہیں۔ کچھ کا تو پتہ چل جاتا ہے کہ کون سی روحیں ہیں اور کچھ کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ہمزاد مسافر کے ساتھ یہ رہنما ہو..... اسی طرح کچھ "راہ روکئے" بھی ہوتے ہیں جو ہمزاد کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں اور اس کے سفر کو زمینی بنائے رکھنے تک محدود رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی ہمزاد اس وجہ سے بھی جسمانی وجود سے نکلتا ہے کہ زمین پر کسی کو اس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک عورت خودکشی کر رہی تھی۔ ہمزاد نے جا کر اس کو بچایا اور اس کو تسلی دی۔ بعد میں اتفاقاً وہ عورت عام زندگی میں سلیم سے ملی تو اُس نے اس کو پہچان لیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی "سلیم میرا مرشد ہے۔"

آسٹرل سفر عام طور پر نیند کے اندر ہوتا ہے لیکن کئی ایک خوشگوار موڈ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے یا لیٹے ہوئے اس ٹرانس (Trance) میں چلے جاتے ہیں اور سفر شروع کر دیتے ہیں..... اس سفر پر اچھی صحت والے بھی جاتے ہیں لیکن عام طور پر جذباتی طور پر گھبرائے ہوئے بیمار لوگ اور اچانک حادثے میں اترنے والے یہ سفر شروع کرتے ہیں۔

یہ سفر اپنی مرضی سے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی مشق بہت مشکل کام ہے۔ کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں (کبھی کبھی وہ اپنے دوستوں کے گھر جا کر ان کی گھنٹی بجاتے ہیں لیکن خود نظر نہیں آتے)۔

آسٹرل پروجیکشن کا سب سے اچھا ٹیسٹ یہ ہے کہ کمرے میں چھت کے پاس ایک پرچھتی پر کچھ ہندسے اور سوال لکھ کر ڈال دیے جاتے ہیں۔ آسٹرل مسافر انہیں بستر پر لیٹے لیٹے پڑھ کر بتا دیتا ہے۔

جب کسی کا آپریشن ہو رہا ہو تو یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپریشن کروانے والا چھت کے پاس ہو کر سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ اس کو وہ روپہلی تار بھی صاف نظر آتی ہے جو اس کے جسمانی وجود اور اس کے اپنے کوبی وجود کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔

جسم سے نکلتے وقت پہلے تو دھندی نظر آتی ہے پھر سب کچھ روشن براق ہو جاتا ہے۔ سلور ڈوری بھی روشن ہوتی ہے اور چمکتی ہے۔ ہمزاد اکثر ایسی آوازیں سنتے ہیں جیسے ریشم کا تھان پھاڑا جا رہا ہو۔

عام طور پر سر کی جانب سے یعنی گدی سے نکلتا ہے۔ کئی ایک کا ناف کے نیچے سے برآمد ہوتا ہے۔ چند گز لیٹے

لیٹے یعنی اُفقی طور پر سفر کرنے کے بعد سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور عمودی سفر اختیار کرتا ہے۔

سفر کے دوران ہمزاد کے حواس خمسہ عام زندگی سے بہتر اور تیز ہو جاتے ہیں۔ سردیوں میں برف باری کے دوران نکلا ہوا ہمزاد اگر سفر کرتا ہوا گرم علاقے میں پہنچ جائے تو اس کو گرمی کا پورا پورا احساس ہوتا اور وہ گرمی سے متعلق سارے پودے، درخت، پرندے، آبادی اور انسان دیکھتا ہے۔

ہمزاد اپنے انسانی وجود کو بہت آسانی سے دیکھ سکتا ہے بلکہ نکلنے کے بعد اُسے مڑ کر ضرور دیکھتا ہے۔

بہت حساس آدمی یا روحانی آدمی ہمزاد کو دیکھ بھی سکتے ہیں اور ان سے باتیں بھی کر لیتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ہمزاد ہیں۔

ہمزاد کو اپنا چہرہ آئینے میں نظر آ سکتا ہے۔ اس وجود کا وزن بھی ہوتا ہے اور یہ کشش ذہن کو بھی محسوس کرتا ہے۔

ایک آسٹرل لڑکا ایک شام گھومتا پھرتا اپنی محبوبہ کے گھر پہنچ گیا وہ سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ یہ بھی سیڑھیوں پر جا بیٹھا اور اس کی کمر میں بازو حمائل کر دیا۔ اگلے دن لڑکی نے یہی واقعہ لڑکے کو سنایا اور حیرانی ظاہر کی کہ ایسے کس طرح سے ہو سکتا ہے۔

ہمزاد چیزوں کو ہلا جلا نہیں سکتا (لیکن ایک آدھ کیس ایسا بھی ہے کہ چیزیں ہلائی گئیں)

ہمزاد سوچ بھی سکتا ہے اور دوسروں کی سوچ اس تک پہنچ بھی سکتی ہے۔ وہ آزاد ہوتا ہے اور آزادی کے فرارے لیتا ہے اس کی واپس اپنے جسم میں آنے کی کوئی زبردست خواہش نہیں رہتی لیکن اُس کو آنا ہی پڑتا ہے مجبوراً!

قدس سرہ

زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے۔ تم اس کے حقدار نہیں تھے نہ ہی یہ تمہارا حق تھا..... یہ تم کو دی گئی ہے تم نے اس کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ محنت نہیں کی۔ ہمت نہیں کی..... ایک مرتبہ جب تم پر یہ بات کھل گئی تو تم کو بڑی آسانیاں عطا ہو جائیں گی۔

اگر زندگی ایک تحفہ ہے تو پھر اس کے ساتھ جتنی بھی چیزیں ہیں سب کی سب تحفے ہیں..... خوشی، محبت، آنند، مراقبہ، جو کچھ بھی خوب اور خوبصورت ہے ایک تحفہ ہے..... ذات کی طرف سے ذات باری کی طرف سے!!

کوشش جتنی بھی ہے جہاں کہیں بھی ہے اس کا انا کے ساتھ تعلق ہے۔ کوشش ہمیشہ دُکھ کو اور الم کو جنم دیتی ہے۔

ہر کوشش تمہارے خلاف جاتی ہے۔

ہر کوشش نے تم کو مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔

تم سے خودکشی کروا دی ہے۔

خوش رہنے یا خوش ہونے یا خوشی پر کسی کا حق نہیں ہے..... تم خوش ہو سکتے ہو، خوش رہ سکتے ہو لیکن خوشی پر اپنا حق نہیں جتا سکتے..... امریکن دستور بھی کیا احمقانہ دستور ہے جس میں رقم ہے:

you have the basic fundamental right to preserve happiness.

اگر تم سمجھو گے کہ خوش رہنا اور خوشیوں کا حصول کرنا تمہارا حق ہے تو پھر تم خالی ہوتے جاؤ گے۔

اس دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں' جن کو تم کرنے کی کوشش کرو گے تو انہیں خود ہی ناکردہ کر بیٹھو گے۔ اگر ان کو نہیں کرو گے۔ اس کے لیے کوشش نہیں کرو گے تو کر لو گے۔ تمہاری کوشش ہی تم کو Reverse Effect کی طرف لے جائے گی..... مثلاً سونے کی کوشش کرو' زور لگاؤ' ساری توجہ سونے پر دو' نہیں سو سکو گے..... جب تم اس کی کوشش چھوڑ کر ڈھیلے پڑ جاؤ گے' فوراً سو جاؤ گے۔

حق منواتے رہو گے تو سطح پر رہو گے۔ اگر ذرا نیچے اُترو گے ڈھیلے چھوڑو گے تو حق غائب ہو جائے گا اور ڈھیلا چھوڑ دو گے تو انعام عطا ہونے لگے گا۔

بس یہ بنیادی بات یاد رکھنا کہ تم زندگی کے حق دار نہیں تھے اور تم کو زندگی مل گئی۔ بالکل حق کے بغیر۔ کسی رائٹ کے بغیر۔ تم زندہ ہو زندگی سے بھرپور ہو گئے ہو۔

اگر اتنی بڑی زندگی کسی حق کے بغیر مل گئی' کسی دعوے کے بغیر مل گئی تو پھر خوشیاں بھی مل سکتی ہیں۔

محبت بھی مل سکتی ہے۔

آنند بھی مل سکتا ہے۔

ذات بھی مل سکتی ہے۔

لیکن یہ ایک قانون کے تحت ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ کوشش نہ کرو..... خوشی پکڑی نہیں جا سکتی۔ خوشی کو بلایا جا سکتا۔ اس کو تشریف لانے کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔

زندگی دائروں میں گھومتی ہے۔ سیدھی لائن میں حرکت نہیں کرتی۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ سورج ایک اور بڑے سورج کے گرد گھومتا ہے۔ سارا نظام شمسی گھومتا ہے پوری گلیکسی گھوم رہی ہے۔ ساری کائنات گھوم رہی ہے۔ دائروں کے اندر گول گول موسم گردش کرتے ہیں۔ بچپن' جوانی' بڑھاپا گردش کرتے ہیں۔ ساری زندگی مدور ہے۔ یہ سیدھی نہیں ہوتی' تیر کی طرح نہیں ہے یہ زندگی ہے تیر تو انسان کی ایجاد ہے قدرت کی نہیں۔

تیر دو نقطوں کے درمیان سفر کرتا ہے اور نہایت کم فاصلے کا متلاشی ہے۔ تیر ہمیشہ تیزی میں ہوتا ہے۔ اس کو بڑی کاہلی پڑی ہوتی ہے۔ شتابی کا مارا ہوتا ہے۔ لیکن خدا کبھی بھی شتابی میں نہیں ہوتا۔ وہ بڑے صبر کے ساتھ ہر کام کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ آہلے گہلے انداز میں رہتا ہے۔ اس کو کوئی سفر درپیش نہیں کسی مہم کی تلاش میں نہیں۔ اس کو کہیں جانا نہیں اس لیے وہ ہمیشہ یہیں ہوتا ہے اور ہر وقت موجود ہوتا ہے۔

تیر کو ایک ہدف کی تلاش ہوتی ہے ایک نشانے کی تڑپ ہوتی ہے اس لیے وہ قیام نہیں کر سکتا۔ خدا پھول کی خوشبو کی طرح اردگرد موجود رہتا ہے۔ جیسے رات کی رانی رات بھر موجود رہتی ہے اُسے کہیں جانے یا بھاگنے کی تمنا نہیں ہوتی۔

خدا ایک بچہ بنانے میں پورے نو مہینے لگاتا ہے۔ اس کے یہاں efficiency ایکسپرٹوں کی ٹیم نہیں ہوتی۔ لاکھوں کروڑوں اربوں برسوں سے خداوند تعالیٰ بچہ بنانے کے لیے نو مہینے کی مدت ہی پسند فرماتا ہے۔ خدا نے اس ساری مدت میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اگر کی ہوتی تو اس نے ایسے کل پرزے ضرور وضع کیے ہوتے جن کی مدد سے ایک بچہ نو مہینے کے بجائے نو منٹ میں بن جایا کرتا۔ اس کے یہاں اسمبلی لائن لگی ہوتی اور ''ماس پروڈکشن'' کا سلسلہ جاری ہوتا۔

لیکن خدا کریم ہے رحیم ہے۔ مہربان ہے وہ ایک بچہ پیدا کرنے میں بڑی محبت' محنت اور توجہ سے کام لیتا ہے۔ ایک پرندہ ایک گھونگا اک تتلی پیدا کرنے پر توجہ دیتا ہے حتیٰ کہ گھاس کا ایک ڈنٹھل بنانے میں بھی توجہ اور محبت سے کام لیتا ہے۔

اگر تم خدا کے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اس کے حکم کے اندر جینا چاہتے ہو تو تیزی' شتابی اور تیز رفتاری کو اپنی زندگی سے نکال دو ورنہ تم خدا کو Surpass کر جاؤ گے۔ وہ تو یہیں کہیں ہوگا اور تم وہاں کہیں نکل جاؤ گے۔

لیکن تم بھی کیا کرو تمہاری تربیت ہی اس طرح سے ہوئی ہے کہ جلد از جلد کام کس طرح سے نبٹایا جائے۔ تیزی کے ساتھ کس طرح سے کام کیے جائیں۔ تیز رفتاری کیسے اختیار کی جائے۔

کچھ لوگ خوشی کی تلاش میں رہتے ہیں اور سکون اور آنند کو ڈھونڈتے رہتے ہیں لیکن ان کو یہ نعمت ساری عمر نہیں ملتی۔ ایک ایسے ہی شخص نے ایک روز اچانک خوشیوں کو پالیا اور وہ آنند کے راستے پر نکل گیا۔ ہم نے اُس سے اس کا راز پوچھا تو وہ کہنے لگا میں نے ساٹھ برس تک خوشیوں کی تلاش کی اور ساری عمر ان کی کھوج میں لگا دی۔ لیکن کل رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں خوشی کی تلاش نہیں کروں گا نہ ہی اس کی آرزو کروں گا۔ بس زندہ رہوں گا اور زندگی کے ساتھ وابستگی اختیار کروں گا جیسے جھومتے ہوئے نرسل پر ٹڈا ہوتا ہے کہ جدھر جدھر نرسل جھومتا ہے ٹڈا بھی ادھر ادھر گھومتا ہے۔ اب میں خوشی کے لیے پریشان نہیں ہوں۔ اب میں صرف زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس وقت سے خوش ہوں۔

جب آپ خوشی کی تلاش چھوڑ دیتے ہیں یا خوشی کا حصول ترک کر دیتے ہیں اسی لمحے آپ خوش ہو جاتے ہیں۔ جب آپ سکون حاصل کرنا بھول جاتے ہیں اُسی وقت آپ پرسکون ہو جاتے ہیں..... بات یہ ہے کہ خوشی اور سکون آپ کے پاس پاس تھے۔ بالکل قریب۔ آپ کے اردگرد لیکن آپ اپنے زورِ عمل میں بہت دُور نکل گئے۔ بہت تیزی کے ساتھ بہت دُور!!

جب تم کسی تحقیق یا تلاش میں ہوتے ہو اس وقت تم بند ہوتے ہو۔ بالکل بند۔ تلاش اور دریافت کا الجھاؤ تم کو مقید کر دیتا ہے۔ تم پر اپنے تسمے کس دیتا ہے۔ جب تم میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہوتی ہے یا کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو تم ریشم کے کیڑے کی طرح اس خواہش کے تاروں میں لپٹ جاتے ہو۔ بندھ جاتے ہو اور اس مضبوطی سے بندھ جاتے ہو کہ خوشی کی کوئی کرن اس کویے کو چیر کر اندر داخل نہیں ہو سکتی۔

خوشی پکڑنے سے نہیں آتی۔ جال پھینک کر۔ کانٹا لگا کر۔ پھندا لگا کر پکڑی نہیں جاتی۔ یہ تو بس جوں جوں انسان ڈھیلا ہوتا جاتا ہے آتی جاتی ہے اور اندر بسیرا کرتی جاتی ہے..... خوشی ایسے ہی آتی ہے جیسے نیند آتی ہے۔

سکون بھی ایسے ہی آتا ہے جس طرح آنکھوں میں نیند اترتی ہے۔ خوشی کے لیے اور سکون کے لیے کچھ کرنا نہیں ہوتا۔ تم نے تو خوشی اور سکون حاصل کرنے کے لیے عمل کر کر کے خود کو چبا کر لیا۔ تم نے تو اتنی کوشش کر لی کہ ناخوش اور بے

سکون ہو گئے۔

اگر ناخوش رہنا ہے تو خوب عمل کرو۔ دبا کے کرو اور کرتے رہو۔ اگر خوش رہنا ہے تو چیزوں کو اور وقت کو گزرنے دو۔

''جانے دو'' زندگی کا راز ہے۔

''جانے دو'' قریب کا راز ہے۔

''جانے دو'' سب سے بڑا راز ہے۔

لیکن تم تو جانے دیتے ہی نہیں تم اتنے مصروف اس قدر الجھے ہوئے اور ایسے غرق رہتے ہو کہ خوشی کی کوئی کرن تمہارے اندر داخل ہی نہیں ہو سکتی۔ ایسے کارندے بن کر کام میں لگے رہتے ہو کہ خوشی کا جھونکا تمہارے وجود کے اندر اترتا ہی نہیں۔ تمہارا کیا بنے گا بھائی۔

دنیا میں ہزاروں لاکھوں انسان اپنے منتہائے مقصود کو پہنچ جاتے ہیں۔

وہ کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ناخوش اور غمگین بھی ہو جاتے ہیں۔

وہ امیر ہونا چاہتے تھے..... امیر ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ناخوش اور غمگین بھی۔

جتنے جتنے آپ امیر ہوتے جائیں گے اسی قدر ناخوش ہوتے جائیں گے۔

عجیب بات ہے کہ امیر بن جانے اور امارت حاصل کر چکنے کے بعد امید ختم ہو جاتی ہے..... توقع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

انہوں نے سوچا تھا کہ امیر ہو جائیں گے تو سارے دُکھ دُور ہو جائیں گے اور خوشیاں صحن خانہ میں اُتر آئیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا..... وہ امید جو باندھی تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ خوش ہونا چاہتے تھے اس کا دُور دُور تک کوئی نشان نہ ملا ناامید ہو گئے۔

غریب آدمی ہر وقت پرامید ہوتا ہے۔

امیر آدمی امید سے بہت دُور ہوتا ہے..... سخت ناامید

اگر کوئی امیر آدمی ناامیدی کا شکار نہیں ہے تو سمجھ لو

وہ ابھی تک ٹھیک سے امیر نہیں ہوا..... کیونکہ

ناامیدی امارت کی نشانی ہے..... اصل امارت ناامیدی کے سہل سے وابستہ ہے۔

جو معاشرہ امیر ہو جاتا ہے وہ ناامیدی کے سمندر میں غرق ہونے لگتا ہے۔

ناامیدی..... خوف..... اندیشے..... نہ ہو سکنے کا ملال۔

خوشی پر تمہارا کوئی حق نہیں بنتا۔ خوشی تمہاری ملکیت نہیں۔ تم اس کو پکڑ نہیں سکتے۔ گھیر نہیں سکتے۔

خوشی کو تو تم بہلا پھسلا کر بلا سکتے ہو۔

خوشی تو شرمیلی اور نوخیز عورت کی طرح ہوتی ہے۔ ایک لجونتی کی طرح!

تم کو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے Court کرنا پڑے گا۔

اسے یقین دلانا پڑے گا۔ آہستہ آہستہ منانا پڑے گا۔

پھر یہ گھونگٹ اٹھائے گی۔ پھر تم سے بات کرے گی۔

تم جاتے ہی کسی عورت سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اٹھو اور میرے ساتھ بستر میں چلو۔

یہ تو بہت ہی واضح بہت ہی شرمناک۔ بڑی ہی فحش اور بے عزت کرنے والی بات ہے۔ اس کے لیے تو صبر کی ضرورت ہے۔

عورت سے بات کرنے کے لیے تو شاعری چاہئے لطف چاہئے۔

تمہارے ذہن میں دُور دُور تک وشے کا اور وشے بھوگ کا خیال تک نہیں چاہئے۔

تب جا کر یہ کبوتری تمہارے من کی چھتری پر اترے گی۔

پھر یہ تمہارے سامنے اپنے پَر کھول کر لیٹے گی۔

اپنا سب کچھ ظاہر کرے گی۔

زندگی کو بھی اپنے آپ پر سے گزرنے دو۔

اس کو زور زبردستی سے نہ پکڑو۔

عمل سے اور کرنے سے سب معمولی چیزیں اور بے مصرف تمہاری برات ہوں گی۔

نہ کرنے سے اور منتظر رہنے سے۔ سب خوبصورت' سب مقدس۔ سب آسمانی نعمتیں تمہارا حصہ ہوں گی تمہارے وجود کا حصہ ہوں گی۔

''ماں کی گود''

نامعلوم سکھایا نہیں جا سکتا نامعلوم سیکھا جا سکتا ہے..... بلکہ سیکھا بھی کہاں' کیونکہ جب تم اسے سیکھتے ہو پھر بھی یہ نامعلوم ہی رہتا ہے..... یہی اس کا سب سے بڑا حسن ہے یہی اس کی خوبی ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا۔

خدا کبھی بھی علم نہیں بن سکتا..... جتنا اس کو جاننے کی کوشش کرو گے اسی قدر وہ پراسرار ہوتا جائے گا..... اور جب تم اپنے مرکز میں اُتر کر اُسے پا لو گے تو پھر تم نہیں رہو گے وہ ہی وہ رہ جائے گا۔ علم پھر بھی حاصل نہ ہو سکے گا کیونکہ علم تو جاننے والے کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ جب Knower ہی نہ رہا تو پھر علم کدھر رہا۔ لیکن کمال ہے اور بڑی حیرت کی بات ہے کہ

ایک بڑے ہی تضاد کے انداز میں راز تم پر وا کر دیا جاتا ہے۔ پراسراریت کھول دی جاتی ہے۔ تم اسے جان

جاتے ہو پہچان جاتے ہو کیونکہ تم خود mystery بنے ہوئے ہوتے ہو۔

اگر تم خدا کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہو تو میرے پاس فضول آئے ہو۔ میرے پاس ایسا کوئی علم نہیں۔

لیکن اگر تم خدا کو جاننا چاہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر مناسب ہے۔ لیکن اس کے لیے مرنا اولین شرط ہے۔ مرنا اور جان دینا اس سے کم اور کوئی قیمت ہی نہیں۔

اس سے بڑا خطرہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔ خدا کو جاننا بڑے خطرے کا کام ہے۔

جب تک تم اپنا آپ گنواؤ گے نہیں تم کچھ بھی نہ پا سکو گے۔

اگر یہاں تم کچھ پانے کے لیے کچھ حاصل کرنے کے لیے آئے تو پھر ابھی سے لوٹ جاؤ کیونکہ یہاں پانے والی کوئی شے نہیں ہے۔

البتہ گنوانے کے بڑے مواقع موجود ہیں۔

اگر تم گنوانا نہیں چاہتے یا گنوانا نہیں جانتے تو پھر تم کو گرو سے کچھ بھی نہیں مل سکے گا۔

وہ تم کو بڑی آہستگی سے پرے دھکیل دے گا۔

ایسی آہستگی سے کہ تم کو یوں لگے گا جیسے تم نے اُس کو دھکیل دیا ہو اور خود اس سے علیحدہ ہو گئے ہو۔

اور تم نے خود اس میں ایسی چیزیں دیکھ لی ہیں جن کی وجہ سے علیحدہ ہو جانا ہی مناسب تھا..... دراصل گرو نے بڑی چالاکی سے خود ہی یہ بات تمہارے دھیان میں ڈال دی ہوتی ہے۔

یقین ایک مشکل سودا ہے۔

یقین کر لینے والے بڑے سورما لوگ ہوتے ہیں۔

یقین تو بس ایک چھلانگ کا نام ہے۔ اندھیرے میں چھلانگ۔ اندھی چھلانگ۔

جس نے سوچ کر اور آغاز و انجام دیکھ کر زقند بھری اس نے کوئی حرکت ہی نہیں کی۔ گرو کے ساتھ یک قلبی اور یک جانی اعتبار اور یقین کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔

یہ ایسا تعلق ہے جو محبت سے بھی قیمتی ہے۔

لیکن اس محبت کے لیے اندھا ہونا شرط ہے۔

کیونکہ جب ادھر کی آنکھیں بند ہوں گی تبھی دوسری آنکھیں کھلیں گی۔

لیکن دوسری آنکھیں خرد سے اور عمل سے اور فیصلے سے نہیں کھل سکتیں۔

دوسری بات یہ یاد رکھو کہ جب تم کچھ دریافت کر رہے ہو کچھ معلوم کرنا چاہ رہے ہو تو ضروری نہیں کہ تم کو مطلوبہ علم یا مطلوبہ شے مل بھی جائے۔

کئی بڑے بڑے گیانی اور ودوانی بڑے بڑے سوال کرتے ہیں ساری عمر پوچھتے ہی رہتے ہیں لیکن ان کو کچھ بھی نہیں ملتا۔

وہ بس سوال کرنا اور حیرت میں رہنا اور معلوم کرنا ہی جانتے ہیں۔ خطرے میں اترنا نہیں جانتے۔

اور خطرے میں اترے بغیر' صرف معلوم ہی کرتے رہنا اور سوال ہی پوچھتے جانا۔ آپ کو سچ تک نہیں لے جا سکتا۔

مرشد آپ کو آپ کے سوال پوچھنے اور اپنے علم میں اضافہ کرنے کی وجہ سے قبول نہیں کرتا۔ نہ ہی وہ..... آپ کا تجسس دُور کرنے کے لیے آپ کو پکڑتا ہے۔

وہ تو بس آپ کو آپ کی تیاری اور آپ کی رضامندی اور آپ کی پختہ خواہش کی وجہ سے قبول کرتا ہے۔

یاد رکھنا! بڑے دھیان کی بات ہے اس پر عمل کرنا۔ جب بھی کبھی زندگی میں کسی گرو کے قریب ہونا۔

اس کے بیان کے الفاظ نہ سننا..... بلکہ اُس کو سننا۔

اس کے وجود کو..... اس کے وجود کے ترنم کو۔ اس کی ذات کی مدھم لے کو پکڑنے کی کوشش کرنا۔

یہ مت سننا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے اُس کے الفاظ کیا ہیں۔

گرو کیا ہے؟ خود اُس کے لفظ بھی یہ نہیں بتا سکتے۔

خاموشی بھی اس کی وضاحت نہیں کر سکتی..... کیونکہ

خاموشی بھی تو زندگی کا ایک حصہ ہے۔ پوری زندگی نہیں۔

لفظوں میں تو کچھ بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔

خاموشی میں البتہ کچھ حصہ اجاگر ہو سکتا ہے۔

گرو کو کرتے دیکھو باتیں کرتے دیکھو بیٹھتے چلتے دیکھو پانی پیتے پانی انڈیلتے پانی گراتے منہ دھوتے چوگا ڈالتے آسمان کو دیکھتے دیکھو.....

گرو کے لیے داس بلکہ داسی بن جاؤ۔

چیلا بننے کے لیے مرید ہونے کے لیے نسوانی صفات پیدا کرنا ضروری ہے۔

عورت وصول کرتی ہے جمع کرتی ہے محفوظ کرتی ہے۔

گرو کو اختیار کرنے کے لیے..... گرو کو کھا جاؤ۔ چبا جاؤ۔ اسے اپنے اندر اتار کر ہضم کر لو۔

خیال اور انجانے واقعات

ہر واقعہ اور ہر لمحہ انسان کی روح کے اندر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ جس طرح ہوائیں سوکھے بیجوں کو اڑا کر ہزار ہا میل کی دوری تک لے جاتی ہیں اور ان کو ایسی زمین کے حوالے کر دیتی ہیں جہاں وہ نشوونما پا کر تناور درخت بن جائیں۔ اسی طرح دور دور کے خیال اور انجانے واقعات انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان خیالات کو اور اس

قدر دور سے آنے والے روحانی (Waves) کو اپنا لیتے ہیں اور بہت سے ان کو بیکار کی شے سمجھ کر اپنا آپ بند کر لیتے ہیں۔ جس طرح سے پتھریلے، کنکریلے اور کلر شور زدہ Soil بیجوں کو اپنے اندر اترنے نہیں دیتے۔

روحانی بیج صرف ان وجود میں نشو و نما حاصل کر سکتے ہیں جو وجود آزاد ہوں اور مریت کے حصار میں داخل ہو چکے ہوں۔ آزادی اور خود مختاری کے بغیر ان بیجوں کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص جو اپنی خواہشات اور اپنے تلذذ ذات کا اسیر ہے، ایک آزاد شخص نہیں ہے۔ جو آرزوؤں اور تمناؤں اور لذتوں اور راحتوں کے کشکول اٹھائے پھرتا ہے وہ بھکاری ہے، بادشاہ نہیں ہے۔ آزاد نہیں قیدی ہے اور قیدی کے وجود کے لیے جب بھی تیار ہوتا ہے، قیدی کا لباس ہی ہوتا ہے۔ شاہی خلعت نہیں اور محکوم اور مجبور آدمی ارفع لذت (Higher Pleasure) کے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

خداوند قدوس اپنے حیی و قیوم ہونے کی رمق ایک قیدی کے اندر نہیں اتارتا۔ قیدی اور محکوم کو چونکہ آزاد ہونے کی طلب نہیں ہوتی، اس لیے وہ ایسی رمق کو پسند بھی نہیں کرتا...... میں نے اپنی زندگی کو اسیری کا عادی بنا لیا ہے اور میں نے اشیاء سے محبت کا دم بھرنے کے اصل (حقی) محبت اور اس کے منبع سے کنارہ کشی کر لی ہے۔

اگر میں نے خدا کے فضل اور اس کے کرم کے بیجوں اور دابوں کو قبول کیا ہوتا تو اس وقت تک میرے وجود کے اندر ایک گلستان کی سی کیفیت ہوتی۔ میں ہر وقت ہر لمحہ ہر گھڑی بلکہ ہر سانس کے ساتھ اس پورٹیبل (Portable) گلستان کے اندر گزرتا لیکن میں نے خدا کی طرف رخ ہی نہیں کیا۔ اس کی عنایات قبول ہی نہیں کیں۔

اللہ کے فضل کی صورت بھی عجیب ہے۔ وہ مجھے سخت گرمی میں بھگا کر، ہنکا کر اور پسینہ پسینہ کر کے اپنا کرم کرتا ہے۔ سخت سردی میں منجمد کر کے مجھ پر فضل کرتا ہے۔ مجھے کھانے کو دے کر بھی مہربانی کرتا ہے، بھوکا رکھ کر بھی عنایات کرتا ہے۔ بیماری میں مجھے نحیف و نزار بھی کرتا ہے اور بے زری میں مجھے پریشان بھی رکھتا ہے لیکن ان ساری چیزوں کو اپنا کر میں مسکرا کر اپنا چہرہ اوپر اٹھاتا ہوں تو وہ میری شہ رگ کے پاس اسی سانس کا ایک حصہ ہوتا ہے جو میں روشنی حاصل کرنے کے لیے اندر کھینچتا ہوں اور جو میں زندگی حاصل کرنے کے لیے باہر نکالتا ہوں۔ اس نے میرے سر پر ٹھنڈی دھریکوں کا سایہ کر رکھا ہے۔ میری زندگی گھرے چھتنارے تلے گزر رہی ہے۔ اس نے کسی شخص کو دھریکوں کو پانی دینے پر مامور کر رکھا ہے۔

رومانیت

بس تو پھر وہی بنیادی سوال رہ جاتا ہے کہ محبت کہاں سے آتی ہے؟ اس کا منبع کیا ہے؟ یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ارتقاء کی اتنی بڑی طاقت کہاں سے در آتی ہے؟ اس کا Origin کیا ہے۔ اس طرح grace کہاں سے آ جاتی ہے۔ محبت تو پھر بھی ایک شعوری چیز ہے لیکن grace نہیں ہے۔ یہ جو شعور سے باہر کی شے ہے جو انسان میں روحانی گروتھ کی ذمہ دار ہے، یہ کدھر سے آتی ہے۔

گلاب گلاب گلاب

ایک روحانی آدمی ہمیشہ غلط سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس کے بارے میں غلط فہمی نہ ہو تو وہ روحانی آدمی نہیں ہوتا۔ انسانیت کا رویہ زندگی کے بارے میں بالکل روحانی ہے۔ اس لیے ایک روحانی آدمی ہمیشہ ایک اجنبی انسان ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں دنیا کے لوگ جو کچھ بھی کہیں وہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ دنیا والے اس کی تعریف بھی کریں تو وہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کوئی اعلان محض اس وقت سچ ہوتا ہے جب اعلان کرنے والا خود روحانی ہو۔

جب تک آپ سچے نہیں ہیں، آپ جو بھی کہیں گے، وہ جھوٹ ہوگا۔ خواہ بظاہر وہ سچ نظر آئے۔ خواہ آپ دو اور دو چار کہیں لیکن اگر آپ جھوٹے ہیں تو وہ چار جھوٹ ہوگا۔ ایک روحانی آدمی اتنا بڑا فنومنا ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے کوئی زبان ہی نہیں ہوتی۔ اگر تم کہو کہ وہ اچھا آدمی ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے کیونکہ وہ برا بھی ہوتا ہے۔ اصل میں ایک روحانی آدمی خدائی صفات سے متصف ہوتا ہے۔ جس طرح خدا رحیم و کریم اور بیک وقت قہار و جبار ہے اسی طرح روحانی آدمی بیک وقت اچھا اور برا ہے۔ وہ سردی گرمی، دھوپ اور چھاؤں، خزاں اور بہار ہے اور بیک وقت ہے۔ اس لیے اس کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔

اصل میں روحانیت ایک انقلاب ہے، سکون نہیں ہے۔ روحانیت عقل و دانش اور بینش کا نام نہیں ہے، یہ مکمل تبدیلی کا نام ہے۔

خدا کے بارے میں جاننا خدا کو جاننا نہیں ہے۔

لفظ خدا، خدا نہیں ہے۔

روحانیت ایک ذاتی کھوج کا عمل ہے، یہ سوسائٹی کے چلن کا نام نہیں ہے۔

اسی طرح زبان کا مسئلہ ہے۔ زبان آپ کو انسان اور انسانی سوسائٹی کا ایک جزو بناتی ہے لیکن جب آپ زبان سے عاری ہو جاتے ہیں تو آپ سوسائٹی سے اور تمدن سے اور گروہ کے انداز زیست سے باہر نکل جاتے ہیں۔ آپ درختوں، دریاؤں، کہساروں کا ایک حصہ بن جاتے ہیں..... قرآن عربی زبان کا نام نہیں ہے۔ قرآن دل کا اور اندر کا کلام ہے۔ عربی زبان کا حصہ نہیں ہے۔ یہ سکوت کا اور خاموشی کا ترجمان ہے۔ قرآن حق ہے اور اس کا حقیقت سے تعلق ہے، زبان سے نہیں، لفظ سے نہیں۔

روحانیت احساس کا ایک سمندر ہے۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس میں تم ڈوب جاتے ہو لیکن ہستی اور زیست موجود رہتی ہے۔ یہ موت ہے اور ساتھ ہی رستاخیز ہے۔ جیسے تم تھے وہ تو مر گئے اور ایک نئے ہو کر جنمائے گئے۔

روحانیت اندر کی تبدیلی، اندر کی کایا کلپ کا نام ہے۔ روحانیت نہ تو مسجد ہے نہ مندر۔ نہ ہی تزئین و آرائش ہے، نہ ہی گنبد اور معبد ہے...... اندر اترتے جاؤ اور اندر اترتے جاؤ اور جوں جوں گہرے ہو جاؤ گے، دیکھو گے کہ وہاں اتنا براجمان ہے۔ پہلے سے موجود ہے۔ پھاٹک لگا کر کھڑی ہے۔ اس پھاٹک سے کسی طرح سے گزر جاؤ، تم روحانیت میں

داخل ہو گئے۔ اس دنیا میں اگر کوئی شے دھارمک نہیں ہے تو وہ انا ہے اور انا کبھی بھی روحانی نہیں ہو سکتی۔ فرقے اور مذہب اس کو مار نہیں سکتے، وہ تو الٹا اس کو اور تقویت دیتے ہیں۔

اصل اور صحیح عبادت خاموشی کا نام ہے۔ سکوت کا نام ہے اور خاموشی نہ تو مسلمان ہوتی ہے، نہ یہودی، نہ عیسائی۔ خاموشی دھرم ہوتی ہے، خاموشی میں فرقے مرجاتے ہیں، مذہب ختم ہو جاتے ہیں۔ سوسائٹی لایعنی ہو جاتی ہے۔ تہذیب اور تمدن برباد ہو جاتے ہیں...... اور تو اور خاموشی میں تم آپ ختم ہو جاتے ہو، معدوم ہو جاتے ہو۔ صرف خاموشی رہ جاتی ہے اور تم ختم ہو جاتے ہو۔

دین شاعری ہے منطق نہیں، فلسفہ نہیں۔ یہ آرٹ ہے اور آرٹ مباحثہ نہیں ہوتا۔ آرٹ کے پاس کوئی دلائل نہیں ہوتے۔ اس کو دلائل کی ضرورت بھی، آرٹ دلیل کے بغیر ہی آپ کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ یہ بہت طاقتور چیز ہے۔ کمزور چیزوں کو دلیل کا سہارا درکار ہوتا ہے۔ طاقتور چیزوں کو نہیں۔ سورج کو اپنے طلوع کے لیے کوئی دلیل نہیں دینی پڑتی۔ کوئی مباحثہ نہیں کرنا پڑتا۔ اگر دلیل کے ذریعے تم مان بھی لو تو بھی تم روحانی نہیں ہو سکتے۔ روحانیت تو محبت کی طرح ہے۔ تم اس میں گرفتار ہو سکتے ہو، گرفتار ہو جاتے ہو، اس کو ثابت نہیں کر سکتے۔

استاد کے پاس شاگرد ہوتے ہیں۔ استاد کے پاس چیلے نہیں ہوتے۔ استاد سکھاتا ہے، پڑھاتا ہے، بتاتا ہے۔ اس کے پاس سکھانے کو کچھ ہوتا ہے مگر مرشد کے پاس سکھانے والی کوئی چیز نہیں ہوتی کیونکہ روحانیت سکھائی نہیں جا سکتی۔

لاؤتزے کہتا ہے، حق سکھایا نہیں جا سکتا۔ حق بولا بھی نہیں جا سکتا اور جو کچھ بولا جاتا ہے، وہ سچ نہیں ہوتا۔ بولی جانے والی چیز سچ کی بابت ہو سکتی ہے، سچ نہیں ہوتی۔ طالب علم بھی زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ کسی گرو کے پاس آتا ہے تو وہ خدا کو جاننا چاہتا ہے، اسے پانا نہیں چاہتا۔ اس کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے حاصل کرنے کا خواہشمند نہیں ہے۔

ایک طالب علم باطن کا سفر اختیار کرنا نہیں چاہتا، علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ موچی بننا نہیں چاہتا، کفش سازی کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

طالب علم آگہی کا خواہش مند نہیں ہوتا، علم کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس لیے طالب علم ہمیشہ استادوں کے گرد جمع ہوتے اور چیلے گروؤں کے گرد۔ چیلا پوچھتا ہے، میں ہستی کیسے بن سکتا ہوں، وجود کس طرح بن سکتا ہوں۔ جوہر میں کس طرح اتر سکتا ہوں۔ طالب علم پوچھتا ہے، میں علم کس طرح اکٹھا کر سکتا ہوں، آج تک دنیا میں کوئی شاگرد چیلا نہیں بن سکا جب تک اس نے طلب علم کی ہوس کو گرا نہیں دیا۔

پیر اور مرشد جنس بازار نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس کے اشتہار چھپ سکتے ہیں۔ نہ وہ درسی گرائمر کے نوٹس شائع کر سکتا ہے۔ وہ تو بس ہوتا ہے۔ اس کا وجود اور اس کا جوہر ہی ایک ناقابل یقین چیز ہوتا ہے۔ مرشد ایک عجیب و غریب مخلوق ہوتا ہے۔ ایسی مخلوق جس کے اندر تضادات ایک دوسرے کے ساتھ کمریں جوڑ کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ دوریاں جمع ہوتی ہیں اور وہ ان کے راز سے واقف ہوتا ہے۔

روحانی آدمی کسی عقل کے دائرے میں نہیں آتے۔ وہ صرف دل کے اندر جگہ پا سکتے ہیں۔ کسی انجمن یا مجلس کا حصہ نہیں بن سکتے۔ چونکہ انجمنوں اور مجلسوں کا دل نہیں ہوتا۔ اس لیے گرو وہاں رہ نہیں سکتا۔

میری انگلی کی طوالت دیکھو۔ میں اس سے چاند کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ چاند دور ہے، عجیب ہے لیکن چاند میری انگلی نہیں ہے۔ چاند نامعلوم ہے، انگلی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ یہ معلوم ہے۔ الفاظ بھی انگلی کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ نامعلوم کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں، خود نامعلوم نہیں ہوتے۔ خود سر نہیں ہوتے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جب تک بات سمجھ نہ لیں، اس وقت تک اس پر اعتبار نہیں کرتے۔ انہیں یقین ہی نہیں آتا کہ اس کائنات میں کوئی ایسی چیز بھی ہو سکتی ہے جسے سمجھا نہ جا سکے۔ اب یہ ان کے ایگو کا کمال ہے۔ ان کی انا کا اعجاز ہے کہ ایسا سمجھتے ہیں...... اصل میں یہ سب انا کے کھیل ہیں۔ ایک انا کہتی ہے کہ میں اس قدر ذہین اور صاحب فراست ہوں کہ سب کچھ جان سکتا ہوں اور اگر میں نہیں جانتا یا نہیں سمجھتا ہوں، وہ شے محض واہمہ ہے۔ دوسری ایگو کہتی ہے کہ جب میں ہی نہیں سمجھتا تو پھر اس شے کا وجود کس طرح ممکن ہے۔

لیکن جانکاری کے لیے اس شے سے تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ سیدھے اس سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔ وہ خود بولے گی، خود بتائے گی کہ میں ہوں کہ نہیں لیکن اس کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تقریروں کی، مکالموں کی، سیمیناروں کا تکلف نہیں ہوگا۔ اس کے لیے خاموشی اختیار کرنا ہوگی، مراقبے میں اترنا ہوگا۔ اس چیز کے قریب جانا ہوگا، اس سے تعلق پیدا کرنا ہوگا۔ اگر کوئی چیز آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو اس کے ساتھ جھگڑا نہ کریں۔ اس سے الجھیں نہیں۔ آپ اس کائنات میں عقل کل نہیں ہیں۔

زندگی کا راز نہ کسی سے ڈھونڈا جا سکا نہ کسی کو معلوم ہوا۔ نہ یہ حل ہو سکتی ہے، نہ ہی اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ گزاری جا سکتی ہے اور پھر زندگی کوئی مسئلہ تو نہیں ہے کہ سلیٹ پنسل لے کر اس کا حل ڈھونڈنے لگ جائیں، زندگی تو زندگی ہے یہ بسر کی جاتی ہے۔

جانکاری کا آخری لمحہ جہالت کا لمبا وقفہ ہوتا ہے۔ جہل کی کالی رات اور پھر اس کالی رات سے صبح نمودار ہوتی ہے۔ اس سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے اور یہ کرن علم ہوتا ہے اصل علم۔ علم حضوری دانست، اس علم کو بدھا ''سمبودھی'' کے نام سے پکارتا ہے۔ پاتانجلی اس کو سمادھی کا نام دیتا ہے۔

میں تم کو ایک پھول دکھاتا ہوں، ایسا پھول جو تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم پوچھتے ہو، اس کا نام کیا ہے؟ لیکن تم اس کا نام جاننے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہو، پھول دیکھو میں نے تمہیں پھول دکھایا ہے۔ اس کا نام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ الف بے جیم دال...... کوئی نام...... لیکن تم مصر ہو اور بار بار پوچھتے ہو۔ فرض کرو میں کہتا ہوں اس کا نام الف ہے۔ پھر تم خوش ہو جاتے ہو کہ مجھے معلوم ہو گیا۔ تم پھول پر الف کا لیبل لگا لیتے ہو۔ پھر اپنے بچے کو بتاتے ہو کہ دیکھو بیٹا اس پھول کا نام الف ہے۔ دوستوں کو بتاتے ہو، عزیزوں کو بتاتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ تم نے پھول کو جان لیا لیکن میرے بھائی تم نے پھول کو کہاں جانا، تم نے تو لیبل کو جانا ہے۔ الف کو جانا ہے، نام کو جانا ہے...... لیکن نام سب کچھ نہیں بتاتے بلکہ کچھ بھی

نہیں بتاتے۔ نام اور لیبل جاننے والا شے کی ماہیت سے محروم رہ جاتا ہے، شے کو نہیں جان سکتا۔ لیبل نوازی بڑی خطرناک چیز ہے۔ یہ اچھا ہے، یہ برا ہے۔ یہ مرد خوبصورت ہے، یہ اس کی بیوی ہے۔ بیوی بدصورت ہے لیکن ٹھہرو، لیبل لگانے سے پہلے رکو۔ آخر اتنی جلدی بھی کیوں! کیا تم نے اچھوں کو برا اور بروں کو اچھا ہوتے نہیں دیکھا۔ بدصورتوں کو حسین اور حسینوں کو بدصورت نہیں دیکھا۔ پھر ٹھہرو اور لیبل نہ چپکاؤ۔ تشکیک زندہ ہے اور تحقیق مردہ ہے۔

اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عمل راستہ مانگتا ہے۔ منزل کی نشاندہی چاہتا ہے اور اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

مذہب تحیر ہے، معصومیت ہے، علم نہیں ہے۔ امّی پیغمبروں نے اپنی معصومیت کے ذریعے لوگوں کی زندگیاں بدل دیں۔ معاشروں کی کایا کلپ کر دی...... مکالمات اور مباحث سے جہالت کبھی بھی دور نہیں ہوتی، چھپ ضرور جاتی ہے۔ پہیہ گھوم رہا ہے اور جس پر گھوم رہا ہے، وہ دُھرا ساکن ہے۔ صامت ہے، پرسکون ہے اور جگہ پر Fix ہے۔

وجد

وجد میں یا Trance میں کونسی چیز ہوتی ہے جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ وجد میں کیا ملتا ہے...... کچھ بھی نہیں! اس وقت تک وجد ممکن ہی نہیں جب تک کوئی شے جاننے کی رہ گئی ہو۔ وجد تو موجود Existance کے ساتھ یک جان ہونے، اکمک ہونے کی ایک صورت ہے۔ اس وقت حق حقیقت اور حقیقت کو پانے والے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔

بھاگو نہیں

دنیا کے اندر رہنا اور دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھنا ہی ترک ہے۔ یہی سنیاس ہے۔ وہ تین بندروں والے مجسمے دیکھے ہیں۔ ایک نے آنکھیں بند کر رکھی ہے کہ کوئی برائی نہ دیکھے۔ ایک نے کان بند کر کے رکھے ہیں کہ کوئی برائی نہ سنے۔ ایک نے منہ بند کر رکھا ہے کہ کوئی بری بات منہ سے نہ نکلنے پائے...... بندروں تک تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن انسانوں کے لیے موزوں نہیں۔ آزادی پانے کے لیے دنیا سے کنارہ کشی کرنا کوئی آزادی نہیں، کوئی کمال نہیں۔ یہ تو بلکہ ایک بندھن ہے جس کا احساس نہیں ہو پاتا۔ دنیا سے بھاگو نہیں لیکن اپنے وجود کا احساس رکھو۔ اپنے من کو جانو، بھاگنے میں خطرہ ہے، جاننے میں عافیت بھی ہے اور آزادی بھی۔ جو بے خوفی جانکاری سے حاصل ہوتی ہے، وہی ہم کو آزادی عطا کرتی ہے۔

واردات قلبی

ذہانت سوچ سکتی ہے لیکن واردات میں سے نہیں گزر سکتی۔ تجربہ اور واردات ہمیشہ دل پر گزرتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ میں سے سب سے رئیس عضو پر۔ ذہانت واردات کے بغیر موت جیسی ہے بلکہ سچ پوچھو تو موت ہی ہے۔ مردہ

اور خوابیدہ الفاظ ذہن کے اندر گرتے پھرتے اور گونجتے ہیں۔ وہ ہم کو آزاد نہیں کر سکتے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہی ہماری زنجیریں اور ہتھکڑیاں ہیں۔ واردات قلبی ہی آزادی ہیں اور وہی ہم کو آزادی عطا کر سکتی ہیں۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ حق اور سچ کی تلاش میں مت نکلو بلکہ حق کی واردات کو تلاش کرو اور سچ کا تجربہ ڈھونڈو۔ زندگی کو کھوجو اور حق کے اندر گہرے اترو۔ یاد رکھو کہ جو لوگ سچ کے اندر ڈوب جاتے ہیں اور انہیں اس ڈوبنے کا شعور ہوتا ہے، وہی لوگ "نا سچ" کی پھانسی سے آزاد ہوتے ہیں۔ آزاد ہونا ہے تو ذہن کے بجائے دل کا سہارا پکڑو۔ یہی وہ ایک سہارا ہے جو آزادی کے رستوں پر لے جانے والا اور خوشیوں کے پھریرے اڑانے والا ہے۔

موتو قبل انتمتو

جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے، اس کو ایک کسوٹی پر گھس کر ضرور دیکھا کرو۔ ایک پرکھ ضرور قائم رکھو کہ یہ سب کچھ اور آئندہ کے حصول کا سب کچھ کیا موت ان کو آپ سے جدا نہیں کر دے گی۔ یہ دولت، یہ جائیداد، یہ بینک بیلنس جواب آپ کی ملکیت ہیں، کیا ذرا سی موت ان کے درمیان حائل ہونے سے یہ ساری چیزیں آپ سے جدا نہیں ہو جائیں گی۔ یہ عزت، یہ شہرت، یہ ناموری، یہ سیاسی اقتدار، یہ طاقت...... یہ ساری چیزیں ایک موت کی ہلکی سی آمد سے آپ سے الگ نہیں ہو جائیں گی...... اسی لیے صوفی کہا کرتے ہیں کہ ان ساری چیزوں کے سامنے پہلے ہی مر جاؤ۔ خود موت کو اختیار کر لو۔ یہ سب چلی جانے والی چیزیں ہیں اور پیشتر اس کے کہ یہ آپ سے بے وفائی کریں، آپ خود ان سے منہ موڑ کر ان کو ٹھونٹھ دکھا دو اور اس چیز کو اختیار کر لو جو لافانی ہے جو امر ہے، جو سادھی ہے۔

روحانی سورما

روحانی سورما کے پاس ایک قرول ہوتی ہے۔ ایک خنجر، ایک پیش قبض، ایک جدھر، وہ اس کے فن سے بھی واقف ہوتا ہے اور کم سے کم مدت میں قرولی نکال کر حملہ آور شے پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔

آب حیات

اللہ فرماتا ہے کہ میں نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے کچھ تو پیٹ کے بل رینگتے ہیں، کچھ دو پاؤں پر چلتے ہیں اور کچھ چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ پانی وہ بنیادی ماحول اور بنیادی سہارا ہے جس سے ہم زندگی کی ابتداء میں متعارف ہوتے ہیں۔ پانی پاکیزگی ہے، پانی نرم احساس ہے۔ جذبہ ہے، سر ہے ایک بھید ہے۔ بہت سے لوگ پانی کے قریب رہنا پسند کرتے ہیں، کسی ندی کنارے، دریا کنارے، سمندر کے قریب، پہاڑی نالوں کے درمیان۔ کہتے ہیں پانی ایک روح ہوتی ہے جو صاحب نظر لوگ آبشاروں میں جھرنوں میں، سمندر کی بپھرتی ہوئی لہروں میں دیکھ لیتے ہیں۔ ان کے متعلق بڑی کہانیاں مشہور ہیں۔ ان سے ملنا آسان نہیں لیکن اگر دل میں شک نہ ہو اور انسان بے اعتباری نہ کرتا ہو تو پھر ان سے

ملاقات ضرور ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے تخیل کی بلکہ وسیع تخیل کی ضرورت ہے۔

روح اور بدن

میں سمجھتا ہوں کہ روح کا اور بدن کا کوئی میل نہیں لیکن ان کا ساتھ ازل سے چلا آ رہا ہے اور ابد تک اسی طرح سے چلتا چلا جائے گا۔

جو بات روح کو پسند ہے، وہ بدن کو پسند نہیں۔ روح کو ریاضت پسند ہے۔ قناعت پسند ہے۔ شفقت اور شرافت پسند ہے۔

لیکن بدن کو راگ رنگ، دھینگا مشتی، قتل غارت گری، زنا اور ریپ، چوری یاریاکاری پسند ہے۔

ان دونوں کو جوڑ کے رکھا ہے اور ان کو اسی طرح سے چلنا پڑتا ہے لیکن اک دوسرے سے کھنچ کے رہتے ہیں جیسے بھینس کے ساتھ گھوڑے کو "نرڑ" دیا جائے۔ وہ دونوں ایک ساتھ رہیں اور ایک ساتھ زندگی بسر کریں۔

لیکن روح اس وقت تک جسم سے پسند کا رابطہ نہیں کرتی جب تک جسم حسین نہ ہو، خوبصورت نہ ہو، صاف نہ ہو، بے داغ نہ ہو۔

جب آدمی مرتا ہے، بے جان ہوتا ہے۔ بے شکل اور بے رخ اور بد ہیئت ہو جاتا ہے۔ پھر اگر ناگہانی طور پر جب اچانک قتل ہوتا ہے، گولیوں کی باڑھ لگتی ہے تو روح اس کی بد ہیئتی کو دیکھ کر اور اس کی بدصورتی اور بدشکلی سے نفور کرکے اس سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔

جسم کو مجروح ہونا چاہیے، کٹنا پھٹنا تباہ و برباد ہونا چاہیے۔ یہ بدن کا نقصان ہے لیکن ایسے نقصان پر روح کو تو اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اس کا ساتھ دینا چاہیے لیکن ایسے نہیں ہوتا، بدن تو بعد میں مرتا ہے (کئی اعضائے بدن دیر تک زندہ رہتے ہیں) روح پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

یہ تو ہوئی موت کی بات۔ اب اگر بدن کسی اور خطا کسی اور کمی یا کسی اور لغزش کی وجہ سے گندا ہو جائے تب بھی روح اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس سے پرے پرے رہنا شروع کر دیتی ہے۔ جسمانی طور پر بدن بھلے درست ہو لیکن اگر اخلاقی طور پر اور معاشرتی طور پر طے شدہ قدروں سے نکل گیا، پھر روح نے اس کے ساتھ نہیں دیا۔ اس سے کنارہ کش ہو کر رہی۔

اسی لیے بزرگانِ دین کہتے ہیں بدن کو راستی پر لے آؤ۔ روح قریب آ جائے گی اور دوستی کا دم بھرنے لگے۔ اس کی دوستی کے سہارے اور اسی کی چاند گاڑی پکڑ کر آپ اونچی دنیاؤں کی سیر کرنے لگیں گے۔

ہر صورت کی کنہ غیر مرئی ہے۔ یہ دنیا جو ظاہر ہے، کسی ظاہر سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ ایک غیر مرئی طاقت سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ جب ایک بیج زمین میں بویا جاتا ہے تو اس پر زندگی کی نمو کی اثر پذیر ہوتی ہے اور وہ قوت نمو نظر نہیں آتی۔ وہ غیر مرئی ہوتی ہے اور وہ نہ نظر آنے والی قوت اس بیج پر زمین کی تاریکی میں اس طرح سے اثر انداز ہوتی ہے

کہ اس بیج سے کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ پودا بنتا ہے۔ برگ و بار لاتا ہے اور پھولوں سے لد جاتا ہے۔ یہ پھول، یہ پتے، یہ غنچے، یہ پھل جو نظر آتے ہیں، ایک نہ نظر میں آنے والی قوت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ زراعت میں اسے قدرت کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن نام سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل میں یہ خدا ہی کا کرشمہ ہوتا ہے اور اسی کی کرتو یہ ہوتی ہے۔ وہی خدا جو نظر نہیں آتا۔ جو ازل سے ابد تک ہے۔ جو ہے...... ہے اور ہوتا ہی رہے گا

بس یہی قدرت، یہی کرشمہ، یہی قانون آپ کے اندر بھی کام کر رہا ہے۔ اس کو آپ کی بزنس میں، آپ کے گھر میں، آپ کی زندگی میں، آپ کی اقتصادیات پر اپلائی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ باہر کے سارے مظاہر اندر کے اسی قانون کے تابع ہوتے ہیں۔ اسی کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ جو کچھ آپ کے تجربے اور آپ کی کردنی سے گزرتا ہے، اسی قانون کی کشش کے تحت گزرتا ہے۔

سارا جھگڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے اور اس دنیا میں سارے فساد کی جڑ اسی مقام پر گڑی ہے جب ہم کسی شے کو کسی شخص سے طلب کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اور عین اس وقت ہر شخص ہراساں اور پریشان پھر رہا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا اس سے اس کی چیز لے لے گا۔ انسان کو اس دنیا میں بس ایک خوف ہوتا ہے کہ لوگ مجھ سے زیادہ لے لیں گے اور مجھے اس زندگی میں کم سے کم مل سکے گا......

روحانی زندگی میں اور باطن کے سفر میں خود غرضی کا کوئی مقام نہیں۔ خدا کا قانون انصاف کا قانون ہے اور یہ خود غرضی کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کوئی کام نہ کریں۔ محنت سے اور مشقت سے کام نہ لیں بلکہ اس کے برعکس ہم کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ محنت اور توجہ سے کام کرنا چاہیے کیونکہ ہماری جھولی میں زیادہ کام پڑنے والا ہے لیکن یاد رہے کہ اس کام میں جد و جہد کامیابی کا عکس نہیں ہوگا۔ یہ کوشش اور مشقت اور کشش کا درس نہیں ہوگا کہ اس میں خیالات کو گھیرنے کے پھندے ہوں۔ ساتھی ساتھ ملانے کے ہتھکنڈے ہوں یا شہرت، عزت، دولت، مقبولیت حاصل کرنے کے۔

موتو قبل انتموتو

حضرت عیسیٰ زندہ اٹھا لیے گئے۔ وہ وہاں نہیں تھے، اس قبر میں یا اس مرقد میں جس میں لوگ ان کو سمجھتے تھے کہ ہیں...... اصل میں ہم بھی اس وقت اپنے بدن میں موجود نہیں رہتے جب ہم ایک حقیقت کو یا ایک ٹروتھ کو جان جاتے ہیں۔ جب ہم پر سچائی وارد ہو جاتی ہے تو ہم بدن سے اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ ایک غلطی سے برآمد ہو جاتے ہیں۔ ایک مایا سے نکل آتے ہیں۔ اس وقت ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ وجود، یہ بدن ہمارے شعور کا ایک حصہ ہے اور یہی وہ شعور ہے جو ہمیں ہمارے بدن پر دسترس عطا کرتا ہے۔

جنگل سے سائبرین ٹائیگر جو بہت ہی خونخوار تھے، پکڑ کر لے جا رہے تھے اور ان کا پکڑنا ناممکن تھا۔ ڈاکٹر نے بے ہوش کرنے والی سرنج بندوق میں بھر کر ان کی ران میں ماری۔ تھوڑی دیر بعد خوفناک اور خونخوار ٹائیگر بے ہوش کر زمین

پر لیٹ گئے۔ نوکر لوگ ان کو پرانے تختوں پر ڈال کر اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ ڈاکٹر نے ان کے منہ کھول کر دانتوں کا معائنہ کیا۔ ان کے گلوں پر تھپڑ مارے۔ ان کے پپوٹے کھول کر دیکھے۔ ان کی آنکھوں میں دوائی ڈالی۔ وہ جسم ہی جسم تھے اوران کا شعور ختم ہو چکا تھا۔

جب ایک شخص برائی اور Evil کی وجہ جان جاتا ہے اوراس کی بدذاتی سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسان زندگی میں بار بار کیوں رونما ہوتی ہے تو پھر وہ روزمرہ زندگی کی مشکلوں اور مصیبتوں کو سمجھنے لگ جاتا ہے اوران کا مقابلہ کرنے میں آسانی محسوس کرتا ہے۔ پھر اس کی زندگی میں آزادی، خوشی، مسرت، ہم آہنگی اور سکون پیدا ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ اپنے گھر والوں، محلے والوں، اپنے شہر، اپنے ملک اور ساری دنیا کے لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے اوران کی دستگیری کرنے کے لیے بڑے بھرپور انداز میں تیار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ ہے یا خدا اس کے ساتھ ساتھ ہے اور ہم دونوں کو دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔ خدا سچ مچ اسی کی شہ رگ کے پاس تخت نشین ہو جاتا ہے۔

زندگی بسر کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی اصول، قانون اور ضابطے کے تحت بسر کی جائے اور دوسرے یہ کہ زندگی فضل اور کرم کے سہارے گزاری جائے۔ جو زندگی مادی، انسانی اور کوششی سہاروں کے بل بوتے پر گزاری جاتی ہے وہ مشکل، تکلیف دہ اور پرمشقت ہوتی ہے اوراس میں ایک طرح کی ناگواری کا بڑے تسلسل کے ساتھ چلن ہوتا ہے۔ ایسی زندگی تلوار کے بل بوتے پر اور تلوار کی دھار پر گزاری جاتی ہے۔ جنگ والی تلوار نہیں بلکہ روزمرہ کے واقعات اور حالات کی تلوار، مقابلے کی تلوار، کمپی ٹیشن کی تلوار، رتبہ حاصل کرنے کی تلوار اور آخر میں اس کا انجام ایک ہی ہوتا ہے کہ تلوار کے ساتھ زندگی بسر کرنے والا بالآخر تلوار ہی سے مارا جاتا ہے۔

لیکن کیا grace کے ساتھ زندگی گزاری جا سکتی ہے؟ خاص طور پر اس دور میں جس میں ہر شے اور ہر کام مقابلے کے ساتھ بندھا ہے اوراسی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ مشکل کام ہے! لیکن غور سے دیکھیں اور تاریخ کا مطالعہ کریں تو بے شمار اہل اللہ جن سے ماضی بھرا پڑا ہے اور بہت سے جو اس عہد میں ابھی گزرے ہیں اور جو ہمارے اردگرد میں کہیں اب بھی موجود ہیں، یہ ہم جیسے ہی لوگ تھے اور ہماری طرح پریشان رہا کرتے تھے لیکن پھر ان پر اچانک اللہ کا فضل ہوا۔ ان کو روشنی ملی یا ذات حق کا بلاواسطہ مشاہدہ ہوا۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، نبی کریمؐ، مہاتما بدھ، ان شخصیتوں سے کروڑوں، اربوں انسانوں کو روشنی ملی اور زندگی میں آسانیاں نصیب ہوئیں۔ دو نسلوں تک ان مقلدوں نے روشنی عطا کرنے والوں کے انعامات سے خوب خوب فائدے اٹھائے لیکن وہ اس شعور کے اندر زندہ نہ رہ سکے جو ان کے گوروں کا اعجاز تھا۔ جلد وہ زمانے کے الٹ پھیر میں پھر شامل ہو گئے اور پھر سے مادی زندگی میں الجھ گئے۔

ذہن انسانی آلکس اور سستی کا مارا ہوا ہے۔ یہ اپنے آپ کو ڈسپلن کرنا پسند نہیں کرتا۔ چالو روش میں بہنے پر خوش رہتا ہے۔ اسی لیے دیکھا ہوگا کہ ایک افسر ہوتا ہے اور ہزاروں کلرک ہوتے ہیں۔ ایک انجینئر ہوتا ہے، ہزاروں مستری ہوتے ہیں۔ ایک آرکیٹیکٹ ہوتا ہے کروڑوں مزدور ہوتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو سنوارنا نہیں چاہتا۔ محنت سے گھبراتا ہے۔ اس لیے Cliche میں زندگی بسر کرنا پسند کرتا ہے۔ اصول پرستی اور اصول پسندی سے گھبراتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ باطن کے سفر کے لیے کوئی طے شدہ شیڈول نہیں ہے۔ ایک آدمی ایک قدم آگے جاتا ہے، تین قدم واپس آ جاتا ہے۔ ایک سیدھا منزل تک پہنچ جاتا ہے اور پھر فسق و فجور میں داخل ہو جاتا ہے۔ زور لگائے تو نکل بھی جاتا ہے، کوشش نہ کرے تو پھنسا ہی رہ جاتا ہے۔

باطن کے سفر کے لیے کوئی خوش نصیب بہت بڑے صوفیا کے فرمودات کو جان کر اور سمجھ کر اوران کی پیچیدگیوں سے متعارف ہو کر اپنا کامیاب سفر شروع کر سکتا ہے۔

مذہب کی چھوٹی چھوٹی شرائط اور بنیادی ارکان اختیار کر کے چل سکتا ہے حتیٰ کہ مانع چیزوں کو اختیار کر کے بھنگ پی کے، مجر اسن کے بھی اس سفر پر روانہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی لیبل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک طلب کی مضبوطی ہوتی ہے کہ خدا کو پانا ہے اوراس کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ بڑی بڑی ٹکریں مار کر اور اندھی گلیوں میں ہڈ گوڈے تڑوا کر بالآخر متلاشی اپنی منزل پر ضرور پہنچ جاتا ہے۔

خدا کے بارے میں باتیں کرنا، ڈائیلاگ کرنا اوراس پر غور کرنا بالکل ممکن ہے اور بہت حد تک آسان بھی ہے لیکن یہ ساری گفتگو اور مکالمے اور بڑے بڑے Symposium خدا کو ہمارے تجربے میں نہیں اتار سکتے۔ یہ اس کا دیباچہ تو ہو سکتے ہیں لیکن اس سے واپرتا کی کتاب مرتب نہیں ہوتی۔

خدا کی عبادت، خدا کے بارے میں سوچ اور خدا کے بارے میں مجلس آرائی ہم کو خدا تک نہیں پہنچاتی۔ خدا تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے خاموشی۔ دھیان، مراقبہ۔ یہ وقفہ ایک منٹ کے ہزارویں حصے پر بھی محیط ہو سکتا ہے، ایک پلک جھپکنے پر بھی۔ اس کے لیے کوئی لمبی سدھیاں کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جونہی ذہن پرسکون ہوا خدا کا گیان مل گیا۔ اس میں روحانی لٹریچر پڑھنے سے، ڈیروں پر جانے سے، مرشدوں سے ملاقات کرنے سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

جب تک خدا ایک سوچنے کی اور غور کرنے کی چیز رہے گی، اس کا درجہ نیاگرا فالز، تاج محل، کوانٹم تھیوری اور ساختیات جیسا رہے گا۔ ان سب موضوعات پر ہم گھنٹوں، دنوں بلکہ سالہا سال تک باتیں کر سکتے ہیں اور کرتے چلے جاتے ہیں۔

اسی طرح خدا کے ساتھ ہے۔ جب تک ہم اس کی بابت باتیں کرتے ہیں، اس کے متعلق پڑھتے ہیں، مطالعہ کرتے ہیں، بڑا مزا آتا ہے اور بڑا سرور ملتا ہے لیکن خدا اس سرور سے لاکھوں میل دور ہوتا ہے۔ یہ ایک خیال اور ایک تصور ہی رہتا ہے۔ اصل سے ملاقات نہیں ہوتی۔ ایک تصویری نظر آتا ہے۔ خوبصورت، رنگدار تصویر۔

لیکن جب ہم خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہمارا دل ترشنا سے بھر جاتا ہے۔ پھر اس کے فضل کے برسنے کا موقع ہوتا ہے۔ پھر وجود کے آسمان پر اس کے بادل آتے ہیں اور عطا کی بارش ہوتی ہے۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ اصول اور ضابطے سے بڑھ کر اس کے فضل کا کمال ہے۔

ایسی کیفیات کہ جب ٹانکا لگ جائے تو وہ دن میں بار بار آتی ہیں۔ درجن بھر سے زیادہ مرتبہ۔ وجہ یہ کہ اندرونی سکون کو بار بار چارج کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ خدا کے فضل کا سوتا ہمارے اندر اترتا ہے اور

ہمارے اندر سے ہو کر باہر جاتا رہتا ہے تاکہ دوسروں کو بھی سیراب کرے۔ بغیر کسی کوشش کے، جدوجہد کے، بغیر کسی Effort کے۔

یہ کبھی نہیں سوچنا چاہیے کہ خدا ہمارے لیے ایک اعلیٰ درجے کا گھر بنا دے گا۔ ایک بارہ کنال کی کوٹھی سجا دے گا تاکہ ہم سکون کے ساتھ اور مزے کے ساتھ اس میں رہیں اور موجیں کریں۔ ایسا نہیں سوچنا چاہیے اور نہ ہی یہ مانگنا چاہیے۔ ہمیں بارہ کنال کی کوٹھی کے بجائے خدا کے اندر رہنا چاہیے۔ کوٹھی نہیں مانگنی چاہیے، خدا مانگنا چاہیے اور جس نے خدا مانگ لیا، پھر وہ سب کوٹھیوں والوں سے افضل ہو گیا۔

اگر ہمارا ٹھکانہ خدا کے علاوہ کہیں اور ہو گا تو پھر خطرہ ہر وقت موجود رہے گا۔ چور، ڈاکو کا خطرہ۔ آگ کا خطرہ، سیلاب کا خطرہ، زلزلے کا خطرہ لیکن جب ہم نے خدا کو اپنا بنا لیا، سب کچھ بنا لیا پھر کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔

اصل میں خدا آپ کو صحت نہیں دے سکتا، دولت نہیں دے سکتا، عقل و دانش عطا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خود ہی صحت، خود ہی دولت، خود ہی دانش اور خود ہی بے فکری اور خود ہی اطمینان ہے!

فوراً معاف کر دیں

جو باتیں سمجھ آ گئی ہیں، ان پر عمل کرنا شروع کر دیں۔

جس شخص نے آپ کا کوئی قصور کیا ہو، اس کو فوراً معاف کر کے آزاد کر دیں۔ جب تک آپ اسے معاف نہیں کریں گے، وہ قصور میں جکڑا رہے گا اور آزادی سے دور رہے گا۔ یاد رکھیے جکڑے ہوئے شخص پر شیطان فوراً حملہ کرتا ہے۔

شٹل میں چاند کی طرف جانے والا جب Base کی ہدایات پر عمل کرے گا تو وہ اوپر ہی اوپر چلتا جائے گا۔ ہدایات پر عمل کرنے والا اور ماننے والا چاند تو کیا گردوں سے بھی آگے نکل کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔

اس بات کی فکر نہ کرنا کہ گیان دھیان کی بہت سی باتیں تم کو سمجھ نہیں آتیں، اس بات کی فکر ضرور کرنا کہ جو باتیں سمجھ آ گئی ہیں، ان پر عمل نہیں ہوتا۔

زندگی کے فیصلے کرنے کے لیے دماغ سے ضرور کام لیں جو خدا نے آپ کو دیا ہے۔ اسی طرح دل کے فیصلوں پر بھی عمل کریں، وہ بھی آپ کو خدا نے ہی دیا ہے۔

جہاد اشاعت اسلام کے لیے نہیں، حکومت اسلام قائم رکھنے کے لیے دیا ہے۔

معرفت کے معنی ہیں کہ دنیا کی قدر دل کے اندر نہ ہو، اس سے دل کو خالی رکھے اور بے ضرورت سامان جمع نہ کرے۔ اگر ساری زمین گناہوں سے بھر جائے تو توبہ سب کو مٹا دیتی ہے۔ ڈائنامائٹ ذرا سی ہوتی ہے لیکن بڑے پہاڑوں کو پھاڑ دیتی ہے۔

اگر سکون قلب کی طلب ہے تو ہر وقت اس کی فکر میں رہنا خود جمعیت کے منافی ہے۔ جمعیت جبھی ممکن ہے کہ

تب اس کی تحصیل کے خیال سے خالی ہو۔

دن اور رات

رات کا پہلا پہر چوروں اور زانیوں کے لیے مختص ہوتا ہے۔ کلبوں کے لیے اور جوئے خانوں کے لیے لیکن آخری پہر خدائی ہوتا ہے۔ اس میں ایسی حرکات نہیں ہو پاتیں۔ یہ پہر بڑا برکت والا ہوتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ اس وقت انسانی کروموسوم الگ الگ ہوتے ہیں۔ ایکس الگ اور وائی الگ۔ اسی وقت صحت مند بکٹیریا جنم لیتا ہے۔ وہی کے بکٹیریا دہی جماتے ہیں۔ زخموں میں مندمل ہونے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

نیکی اور ذات

یہ مشکل ہے کہ انسان پہلے نیک بنے، اچھا بنے، صالح بنے، پھر ذات کی تلاش کرے اور اس سے ہم آہنگ ہو۔ اس کے معنی پائے۔ ذات کے قریب ہونے سے نیکی، فلاح اور اصلاح حاصل ہوتی ہے۔ نیک ہونے سے ذات کا قرب حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے شرعی لوگ اچھا، نیک اور صالح ہونے کے باوجود ذات کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ جنت کی بھرتی ہوتے ہیں، انسان نہیں ہو پاتے۔

روحانیت

روحانیت ایک ذاتی کھوج کا عمل ہے۔ یہ سوسائٹی کے چلن کا نام نہیں ہے۔ روحانیت احساس کا ایک سمندر ہے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس میں تم ڈوب جاتے ہو لیکن ہستی اور زیست موجود رہتی ہے۔ یہ موت ہے اور ساتھ ہی رستاخیز بھی ہے۔ جیسے تم تھے وہ تو فوت ہو گئے اور ایک نئے تم نے جنم لیا۔

بڑائی اور برتری کی اپنی اپنی قسمیں ہیں۔ جب ہم بڑائی کی سوچتے ہیں تو کچھ حاصل کرنے کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ جب انبیاء بڑائی کی سوچتے ہیں تو کچھ عطا کرنے کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ جب میں بڑائی کے حصول کی کوشش کرتا ہوں تو نوکر چاکر، خدام ادب اور مال و دولت اور محل ماڑی کو حاصل کرنے کی طرف لپکتا ہوں۔ لیکن جب نبی بڑے ہونے کا اظہار کرتے ہیں تو فرماتے ہیں پیاری بیٹی تو نے نوکر چاکر غلام اور لونڈی لے کر کیا کرنا ہے۔ میں تمہیں ایک ایسا وظیفہ نہ بتا دوں جو تمہیں ہر مشکل پر آسانیاں عطا کرتا رہے!

گوئٹے نے کہا انسان کی روح بھی سورج کی طرح ہے۔ لگتا ہے کہ غروب ہو گیا لیکن غروب ہوتا نہیں۔

جب انسان روحانی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو میرے مشاہدے کے مطابق اُسے ایک عجیب واردات کا سامنا ہوتا ہے..... سفلی دنیا میں باطن کا سفر طے کرتے ہوئے جب انسان روحانی سربلندیوں کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے بدنی افعال میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں۔ اس کا جسم اور اس کی کارکردگی disturb ہو جاتی ہے اور اُسے بہت سی adjustments کرنی پڑتی ہیں۔ میں نے بہت سے سالکوں کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کے حال کا مطالعہ کیا ہے۔ جن مرد اور عورتوں کو نئے روحانی تجربے کا شدید جھٹکا لگتا ہے تو ان میں Clairvoyance کے واقعات ان کی عقل اور ان کے شعور پر شدت سے وارداتیں کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اچانک آتے ہیں اس لیے اپنے ساتھ ناخوشگوار پیغام بھی لاتے ہیں (پھول کھلتے ہیں بھونڈی تصویریں نظر آتی ہیں مقدس مقامات آشکار ہوتے ہیں۔ جنسی گیت گائے جاتے ہیں)

طاقتور جبلتیں اپنی عادت کے اعتبار سے اس اچانک اٹھ جانے والے ڈھکنے پر پورا زور ڈال کر اسے بند کرتی ہیں اور اندر کی روشنائیاں جو باطن کے سفر کا نتیجہ ہوتی ہیں' بند ڈھکنے کے اندر بھی چراغاں کرتی جاتی ہیں۔ اس سے ایک نہایت کریہہ اور مشکوک قسم کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ اس قسم کے روحانی لوگوں پر اور ان کے کرتوتوں پر طرح طرح کی تنقید کرتے ہیں اور ان کا دل کھول کر ٹھٹھا اُڑاتے ہیں..... لیکن اس قسم کی شک انگیز اور کریہہ صورتحال سے حوصلے صبر اور استقامت کے ساتھ عہدہ برا ہوا جا سکتا ہے۔ مرشد ایسے ہی مشکل مقامات کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اس افتاد کا بھیدی ہونے کے باعث سب سے زیادہ مدد کر سکتا ہے۔

خدا روح ہے۔ اس نے اپنی روح ہم میں پھونکی ہے۔ ہم کو اس روح کے راستے ہی تلاش کر سکتے اور اسی راہ چل کر اس سے مل سکتے ہیں۔ انسان خدا کو جسمانی اور ذہنی اور عقلی بنیاد پر تلاش نہیں کر سکتا۔

خدا میں اب رہا جا سکتا ہے، مستقبل میں نہیں۔

ایک عجیب بات ہے کہ مادی شعور رکھنے والا اور مادی ذہن رکھنے والا کبھی بھی خدا کی چیزوں سے محبت نہیں کرتا۔ خدا کی چیزیں اور خدا کی باتیں مادی ذہن کے لیے احمقانہ سی چیزیں ہیں، بیکار چیزیں ہیں۔ اس کو خدا کی چیزیں اپیل نہیں کرتیں۔ ایسا شخص اگر نماز پڑھتا ہے یا جمعہ کے خطبے میں بھی جاتا ہے، دوسری مذہبی رسومات ادا کرتا ہے۔ پھر بھی یہ ساری باتیں اس کے اندر روحانی شعور پیدا ہونے کی ترجمانی نہیں کرتیں۔

روحانی شعور موسیقی کے ذوق کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ پہلے اس کے لیے خواہش ہو، طلب ہو۔ اس کے بعد صبر اور آرام سے بیٹھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اس کے بعد راگ کے بول سنے جائیں اور پھر خود کو مزید برداشت سے آشنا کرنے کے لیے دلچسپ کے ساتھ رشتہ استوار کیا جائے۔

روحانی شعور زندگی ہے اور مادی شعور موت

ایک ذاتی تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر انسان سچا ہو اور ایماندار ہو اور خدا کے ساتھ واصل ہونے کا آرزومند ہو تو وہ دست بستہ یہ عرض کر سکتا ہے کہ یا اللہ میں نے قرآن پڑھا ہے اور میں اس کو باقاعدگی سے اپنے مطا

میں رکھتا ہوں لیکن یہ قرآن خوانی جو مجھے بہت عزیز ہے، میرا تجربہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ فرمایا گیا ہے۔ میرے تجربے سے نہیں گزرتا۔ میں یہ سب کچھ جانتا نہیں ہوں (مانتا ضرور ہوں) کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے اس تجربے سے اور اس مشاہدے سے گزار دیں اور "حصول" کے لیے اور وصول کے لیے میری منزل آسان فرما دیں۔

آپ یقین کریں کہ ایسا کرنے سے اور ایسی مخلصانہ دعا کرنے سے اتنا کچھ مل جاتا ہے کہ آپ اس پر حیران رہ جاتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ آپ کا انعام خدا کی طرف سے ملنا چاہیے، انسان کی طرف سے نہیں۔

اب تک تو یہ حقیقت آپ پر کھل چکی ہوگی کہ اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن صرف اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں جو ہو چکا ہے اور جو ماضی میں گزر چکا ہے۔ پولیس نے جو چھاپہ مارا تھا، گجرات میں جو قتل ہوا تھا، بش نے جو فوج اتاری تھی، بوسنیا میں جو گزری تھی، صومالیہ میں جو امریکی مارا گیا تھا، منڈی کا بھاؤ جو گرا تھا، حصص کی قیمت جو چڑھی تھی..... ان سب کا تعلق ماضی سے ہے۔

میڈیا کے پاس اب تک وہ راز نہیں آیا کہ وہ پوشیدہ خبر دے سکے۔ اس واقعے پر حاوی ہو سکے جو ان پوشیدہ قوتوں کی وجہ سے رونما ہونے والا ہے جس کو "خبر" کا نام دیا جائے گا۔ اس وقت جو کچھ اخبار میں چھپتا ہے اور جو کچھ ریڈیو پر سنا جاتا ہے، وہ ہو چکنے والے واقعے کی بازگشت ہوتی ہے۔ ان غیر مرئی قوتوں کے واقعات پیدا کرنے کی تفصیل ہوتی ہے جو خبر بنا کر آپ کو پیش کر دی جاتی ہے۔ میڈیا ان غیر مرئی قوتوں سے اور ان پوشیدہ طاقتوں سے واقف نہیں ہے۔

میرے حساب سے اور میرے اندازے کے مطابق ان سری طاقتوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دنیا میں امن کو بحال کر دیا جائے۔ اس متفق علیہ فیصلے پر دستخط بھی ہو چکے ہیں لیکن کسی انٹرنیشنل ایجنسی یا دنیا کے سب سے بڑے سی این این نے اس کی رپورٹ ابھی تک نہیں کی۔

غیر مرئی قوتوں کا یہ فیصلہ ان دھیمے دھیمے آثار سے واضح ہونے لگا ہے کہ انسان پھر روحانیت کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اکا دکا..... تنہا تنہا بہت ہی کم، بالکل موہوم گنتی کے اندر! لیکن میڈیا اس کی خبر دینے سے قاصر ہے۔ میڈیا ہرگز ایک حساس ذریعہ نہیں ہے۔ اس کی حیثیت تو لکھا تھانے سے زیادہ نہیں۔ وقوعہ ہو جائے گا تو پرچہ کٹے گا، پرچہ چھپے گا ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔

میں تھرڈ ورلڈ کی بابت تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ ترقی یافتہ دنیا کی بابت یقین سے عرض کر سکتا ہوں کہ دنیائے سائنس دنیائے فلسفہ حتیٰ کہ دنیائے ادب اکیسویں صدی میں روحانیت کی تلاش میں داخل ہو رہی ہے۔

میرے خیال میں روحانیت کے بارے میں ایک گہری، مدلل اور تحقیقی گفتگو بھی بڑی توجہ طلب ہو سکتی ہے اور ہم اس سے بہت سی نئی باتیں اور نئی حقیقتیں دریافت کر سکتے ہیں لیکن ایسا ابھی تک ہوا نہیں۔ میرا مطلب ہے بھرپور انداز میں ایسے نہیں ہوا۔ اکا دکا مجلسیں اور بین الاقوامی سیمینار ضرور ہوئے ہیں لیکن اس کو وسیع و عریض پھیلی ہوئی گفتگو پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

جس طرح سائنس دان دنیا بھر میں اپنی سوچ پھیلاتے رہتے ہیں اور دنیا بھر کے لوگوں کو، سائنس دانوں سے اور ناسائنس دانوں سے مکالمہ کرتے رہتے ہیں ایسے ہی ایک ناختم ہونے والا ڈائیلاگ روحانیت کے بارے میں بھی ہوتے رہنا چاہیے۔ روحانیت کے ضمن میں ایک عالمی سیمینار اس اکیلے چنے کی حیثیت رکھے گا جو اپنی تمام تر کوشش کے باوجود بھاڑ نہیں پھوڑ سکے گا۔

محبت کے بارے میں اب یہ واضح حقیقت عیاں ہو چکی ہے کہ جتنی محبت آپ عطا کریں گے، اسی قدر اس کا خزانہ بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ روحانیت کے بارے میں جس قدر لمبا ڈائیلاگ کیا جائے گا، اس کی جھیل کناروں تک بھرتی جائے گی۔ آپ اپنے دوستوں، اپنے ساتھیوں، اپنے گھر والوں سے روحانیت کے بارے میں جتنے بھی سوال کریں گے، اسی قدر آپ کی معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اسی طرح جیسے سائنس دان اپنے اپنے ملکوں میں بیٹھے دنیا بھر کے دوسرے سائنس دانوں سے اپنی معلومات کا اشتراک کرتے ہیں اور اس سے ٹیکنالوجی کے علم کے وسعت عطا ہوتی ہے، اسی طرح روحانیت کی سائنس کے اشتراک سے اس علم میں بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔

دنیا بھر کی ''پاگلانہ کوششیں'' اور ''دیوانے طرارے'' آخر کو موت کے اندر جا کر مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ موت کیا ہے؟ موت اس بات کا اعلان ہے کہ بس۔ اس سیڑھی پر آگے کوئی ڈنڈا نہیں۔ موت زندگی کی بھاگا دوڑی اور رش تک خاتمے کا نام ہے۔ یہ مستقبل کو ختم کرنے والی مہربانی ہے یعنی یہ مزید امکانات کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کا نام ہے...... تیز طرار، مشتعل اور مستعد ذہین انسان کو بڑی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ جیسے راکٹ چلتا ہے۔ کچھ ایسی ہی تیزی انسان میں آ جاتی ہے۔ پھر موت اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے اور اس تیز طرار، مستعد اور تیز رفتار کو شانت کر دیتی ہے۔

یہ تیزی یہ طراری چاہے دولت کے لیے ہو، چاہے مذہب کے لیے چاہے عیش وعشرت کے لیے چاہے تیاگ اور دنیا چھوڑنے کے لیے۔ اصل میں ایک جیسی تیزی ہے...... پھر یہ بھی یاد رکھو کہ جہاں تیزی ہے، تاولا پن ہے، وہاں خواب ہے۔ خوابوں کے پیچھے ہمیشہ بھاگا جاتا ہے لیکن جہاں پر کوئی تیزی نہیں، کوئی تاولا پن نہیں، وہاں حقیقت ہے، وہاں سچ ہے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ وہیں زندگی ہے، ایسی زندگی جس کو موت نہیں۔

ایک بات رکھیے کہ اس کو اچھی طرح سے پلے سے باندھ لیجیے کہ روحانیت کا اور سچ کا جواب کبھی بھی باہر سے نہیں ملتا۔ علم باہر کی چیز ہے ہی نہیں اور نہ ہی یہ انفرمیشن ہے۔ یہ آپ پر لادا نہیں جا سکتا۔ علم کو ہمیشہ اندر سے نکالنا پڑتا ہے۔ جس طرح ڈول ہمیشہ کنویں کے اندر ڈال کر پانی نکالنا پڑتا ہے لیکن اس میں بھی ایک شرط ہے کہ اندر جانے والا ڈول خالی ہو۔ اگر وہ بھرا ہوا ہوگا تو اس کے اندر پانی نہیں آ سکے گا۔

خدا کا مطلب ہے کہ جو موجود ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ موجود کے اندر ہے بلکہ موجود اس کے اندر ہے، اس کی وجہ سے ہے۔ میں بھی اسی کے اندر ہوں، اس لیے میں اس کو نہ تو تلاش کر سکتا ہوں اور نہ ہی پکڑ سکتا ہوں۔ ہاں البتہ اس کے اندر گم ہوا جا سکتا ہے اور اس کے اندر گم ہونا اس کو پانا ہے۔

روحانیت کی دنیا میں ہر شخص کو اپنے سر پر سے ادھار لیے ہوئے علم کا گٹھا اتارنا پڑتا ہے اور ہولے ہو کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔

پاکیزگی اور روحانیت کا مطلب ہے اپنے آپ ہونا، اپنے آپ میں ہونا۔ عام طور پر انسان اپنے آپ سے باہر ہوتا ہے۔ ہمیشہ غیر ہوتا ہے۔ کبھی بھی آپ نہیں ہوتا۔ وہ ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، مگر اپنے ساتھ نہیں ہوتا۔

دیکھیے، میں ایک غلام ہوں۔ باہر سے جو کچھ بھی آتا ہے۔ میں اس سے برانگیختہ ہو جاتا ہوں۔ باہر سے آنے والی ہر شے میرے اندر کو تبدیل کر دیتی ہے اور مجھے تلاش کرتی ہے۔ اس لحاظ سے میں خود مختار نہیں ہوں، مجبور ہوں۔ اگر باہر کی چیزیں مجھ پر اثر انداز نہ ہوں۔ میں ویسے ہی رہوں جیسا کہ میں ہوں تو پھر سمجھ لیجیے کہ مجھ پر علم کے اور آزادی کے دروازے کھلنے لگے ہیں۔ اصل میں خلا کے حصول سے آزادی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہمیں خلا کا Void کا مشاہدہ بھی کرنا چاہیے اور مطالعہ بھی۔ اگر اندر خلا پیدا کر لیا ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ باہر آسان ہو گیا، سادہ ہو گیا، اصل میں تہی شدگی اور بالقصدی ہی سنت ہونے کی نشانی ہے۔

کوشش، بے چینی اور بے اطمینانی کا گھر ہے۔ کوشش کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی شے کی خواہش کی جا رہی ہے۔ کسی ایسی چیز کی طلب جو موجود نہیں ہے، جو حاضر نہیں ہے۔ اس صورتحال سے پیدا ہوتا ہے اور یاد رکھیے، ہمیشہ تناؤ ہی سے تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ بے چینی سے سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی بے چینی اپنے آپ کو سکون میں تبدیل کر سکتی ہے۔ کچھ نہ کرو، اپنے آپ پر زور نہ دو۔ ہر قسم کی کوشش ترک کر دو لیکن نگہ ہشیار رکھو۔ اچھی طرح سے واچ کرو۔ آہستہ آہستہ ایک نیا شعور بیدار ہونے لگے گا اور ایسے میں جو شعور پیدا ہوگا، وہ ہی اصل حقیقت سے روشناس کرائے گا...... اس دنیا میں جو کچھ بھی حاصل کیا جاتا ہے، کوشش اور جدوجہد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ کوشش ایک ذریعہ ہے اور انا اس کا مرکز ہے۔ ہر کوشش انا کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی جاتی ہے۔ حصول اور یافت سے جو خوشی ملتی ہے، وہ انا کو مضبوط کرنے سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ انا کبھی بھرتی نہیں ہے۔ اس کا بھانڈا ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ اس لیے خوشی ہمیشہ دیکھی جا سکتی ہے، حاصل نہیں ہوتی......

قلب کا تعلق نہ دوستوں سے رکھے نہ دشمنوں سے مگر حقوق سب کے ادا کرے۔

اور بہت دور لوگ بیٹھے ہیں اور بیلوں کی جوڑیاں کھڑی ہیں، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرا منتہائے مقصود لذت عیش، انبساط اور حصول زر ہی نہیں ہونا چاہیے زندگی اور صحت ہی نہیں

ہونا چاہیے۔ آرام اور سکون ہی نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اشیاء کی طلب بھی اتنی شدید نہیں ہونی چاہیے۔ خاص طور پر نیکی اور دانش جیسی اشیاء کی بھی طلب نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے ایسا استغراق بھی نہیں ہونا چاہیے جو ہماری مفلسی اور موت میں گھر ا ہوا ہو۔ مجھے تو اس شعور کی ضرورت ہے کہ جو شے مجھے ملے میرے راستے میں آئے، مجھے اتنی سمجھ ہو کہ یہ میرے خدا کی عطا کردہ ہے، اس کا تحفہ ہے۔ اس کا عطیہ ہے۔ اس طرح میں اس کی عطا کو اور کریمی کو بخشش سمجھ سکوں گا اور اپنے آپ کو ایک حقیر تحفے کے طور پر پیش کر سکوں گا۔

روحانی سفر میں اور باطن کی مسافرت میں اول اول بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے، سمجھنا پڑتا ہے۔ کچھ ترکیبیں اور عمل بھی جاننے پڑتے ہیں۔

انسان تحت القدرت ہے، مستقل نہیں ہے (یعنی خدا تعالیٰ کی قدرت کے ماتحت ہے، خود مستقبل نہیں کہ جو چاہے ہو، جو چاہے نہ ہو) انسان کی ایک مستقل تجویز بھی ضرور ہوتی ہے جسے اس کا ذہن اختراع کر لیتا ہے مگر دیکھا گیا ہے کہ ہر امر اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا۔

سر! آپ یہ بتائیں کہ سود کیوں حرام ہے؟

بس یہ حکم ہے اور حکم کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

لیکن ہم تو کسی بات کی دلیل مانے بغیر اس کی لاجک سمجھے بغیر اسے تسلیم نہیں کریں گے۔

فرمایا: اگر کسی مکان میں علوم جدید کے ماہر اور بڑے بڑے دانشور بیٹھے ہوں اور اونچی اونچی باتیں کر رہے ہیں اور ایک انجینئر بھاگے بھاگے آئیں اور کہیں فوراً اٹھو بھاگو بھاگو، یہ مکان گرنے والا ہے تو سب اٹھ کر بھاگ جائیں گے اور ایک شخص بھی دلیل یا Reason نہیں مانگے گا۔ اگر ڈاکٹر کوئی دوا تجویز کر دے، بلا حیل وحجت استعمال کرنا شروع کر دیں گے کہ یہ اس علم کا ماہر ہے لیکن دین کے عالموں کی بات ماننے میں سو سو طرح کے اعتراض کرتے ہیں، تحقیقیں نکالتے ہیں۔

شاہدہ: مولویوں کی بات کیسے مان لیں سر، ان میں تو آپس کا اختلاف ہی ختم نہیں ہوتا۔ اب کس کی مانیں، کس کی نہ مانیں۔

ارشاد: اختلاف کہاں نہیں ہے اور کس میں نہیں ہے۔ وکیل حضرات ایک ہی واقعہ میں ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں اور خوب خوب جھگڑا کرتے ہیں بلکہ ان کے جھگڑا کرنے کو اور اختلاف کرنے کو باقاعدہ کٹہرے بنا دیے جاتے ہیں۔ جھگڑا کرنے کے لیے سپیشل قسم کا فرنیچر لگا دیا جاتا ہے کچہریوں میں۔ پھر ڈاکٹروں میں اختلاف ہوتا ہے مگر وہاں کوئی نہیں کہتا کہ ان میں تو اختلاف ہے، ہم کس کا علاج کریں، کس کا نہ کریں۔

جمیل: یہ تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہ تھا سر۔

شاہدہ: لیکن اس کی وجہ کیا ہے سر؟

ارشاد: وجہ اس کی یہ ہے کہ جو بات کسی کو کرنی ہوتی ہے اور اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے، اس میں خلاف، ناخلاف کی پروا نہیں کی جاتی۔ دین کی چونکہ پروا نہیں اور اس کی قدر نہیں۔ اس لیے حیلے بہانے تلاش کیے جاتے ہیں۔

کلثوم: شاید اس کی وجہ یہ ہو سر کہ جان زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

ارشاد: شاباش۔ کلثوم تو سوچنے والی لڑکی ہے بھئی۔ بات یہ ہے کہ جان جیسی عزیز ہے، اگر ایمان بھی ایسا ہی عزیز ہو تو علاج کی فکر کی جائے اور اس میں کسی قسم کی بہانے بازی نہ ہو۔

اگر آپ اندر سے نیک اور پاک صاف ہیں تو آپ کے سامنے ساری چیزیں شیشے کی طرح واضح اور شفاف ہوں گی۔ کسی مسئلے کے سمجھنے میں دقت نہیں آئے گی۔ تم ان سب کو بڑی وضاحت کے ساتھ جان جاؤ گے اور تم ان سب کو سمجھ لو گے۔ ایک پاک صاف دل اندر کی طرف دیکھتا ہے اور بڑی گہرائی کے ساتھ دیکھتا ہے۔

خوشی کی تلاش، خوشی کے معنی۔ اگر آپ کو ایسی خوشی عطا کر دی جائے۔ (کمفرٹ اور خوشی) جتنی خوشی دوسروں کے ساتھ شیئر کرو گے تم کو اس سے زیادہ ملتی جائے گی (مائع اپنے سطح ہموار رکھتے ہیں۔

ہر تخلیق اپنے نیچرل ہونے کی دوبارہ آرزو کرتی ہے یعنی وہ اپنے تخلیق ہونے سے پہلے کے زمانے کی آرزو کرتی ہے۔ Elements عناصر عدم سے تخلیق ہوئے اور لوٹ کر عدم میں ہی چلے جاتے ہیں۔

تکلیف اور تعب کا کچھ مقصد ہے۔ آفاقی مقصد!

تکلیف اور حزن کے بغیر روح کا بدن سے برآمد ہونا ناممکن ہے۔ جب روح کو بدن سے الگ کیا جائے گا تکلیف ہوگی، ساری پیدائش تکلیف دہ عمل سے گزرتی ہے۔

ذہن انسانی اپنے جمود کی وجہ سے اور اپنی آلکسی کی بدولت سوچنے سے نفور کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہی نہیں رہتی کہ سوچے یا غور کرے۔ یہ اپنے آپ کو منظم کرنے کا بھی خواہشمند نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی اس کی تنظیم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں بہت تھوڑی تعداد میں نصرم اور ناظم ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں کلرک اور منشی ہیں۔ ہزاروں ڈاکٹروں کے درمیان ایک صادق ڈاکٹر اور سینکڑوں وکیلوں اور سیاستدانوں کے درمیان ایک صاحب نظر مفکر ہوتا ہے۔ اصل میں ہیومن مائنڈ کسی بھی صورت میں ڈسپلن ہونا نہیں چاہتا۔ بس ایسے ہی آوارہ گردی کرتے رہنے کو

اور بے راہ روی کو پسند کرتا ہے۔

کم ہمتی، کم صحتی اور کم دولتی ہماری راہ کے بڑے پتھر ہیں۔ ہم آگے بڑھتے ہیں اور پھر پیچھے لڑھک جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایک عجیب شاخسانہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی بھی عجیب ہے۔ اس میں کبھی کبھی کم ہمتی اور ناسازی صحت اور بیماری ہماری راہ کے پتھر نہیں ہوتے بلکہ کبھی کبھی اچھی صحت، اعلیٰ ماحول اور دولت مندی ہماری روحانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی مشکل بن جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اچھی صحت اور دولت کی فراوانی اور دور تک پھیلی آسائش خدا کے بغیر بڑی اچھی زندگی گزارنے لگتی ہے اور یہ زندگی بڑی خوبی کے ساتھ گزرتی جاتی ہے تا آنکہ اس میں کوئی عجیب سا موڑ نہیں آ جاتا۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ باطن کے راستے کے لیے انسان کونسا راستہ چنے۔ بہت اعلیٰ درجے کا فلسفیانہ تعلیم والا راستہ بھی چنا جاسکتا ہے اور سیدھا سادا ایک پریمی قسم کا راستہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

خدا کے بارے میں باتیں بھی ہوسکتی ہیں اور خدا کے بارے میں غور بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے خدا ہمارے مشاہدے میں نہیں آتا۔

علمی پلندے ہوں۔ جو کچھ ہمارے لیے ہوگا روحانیت کے تختے پر آرام دہ صورت میں ہوگا اور اس آرام کی حالت میں ملے گا۔ وہ کچھ ایسا ہوگا کہ ہم کو تجربات کے نئے راستوں سے گزارے گا اور وہ کچھ یوں زندہ بھی ہوگا، مستعد بھی اور چوکس ہو کر بھی ہمارے تجربے اور مشاہدے سے گزرتا جائے گا۔ آرام کرو، قناعت کرو۔ Relax کرو اور پھر دیکھو کہ یہ وہی غیر مرئی ہے جو مختلف مظاہر میں جلوہ گر ہو رہا ہے، نظر آنے لگا ہے۔

جب زندگی کی اعلیٰ اور عمدہ چیزوں کے لیے ذہنی اور جسمانی کوشش ترک کر دی جاتی ہے تو تمام اچھی اچھی اور مرغوب اشیا قدرتی طور پر اپنی اپنی آغوش کھول کر آپ کے وجود سے لپٹنا شروع کر دیتی ہے۔

ایک بات یاد رکھنا کہ مسئلہ سے مسئلہ کا علاج نہیں کیا جاسکتا یا ہونے سے یا حصول سے نہ ہونے کی کاٹ نہیں کی جاسکتی۔ صحت کی زد آگے بڑھا کر بیماری کی کاٹ نہیں کی جاسکتی۔ دولت سے یا روپے سے بہتات حاصل نہیں ہوسکتی۔ دوستوں سے یا شادی سے رفاقت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ اللہ کے فضل سے اور اللہ کے خیال سے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ انسان بیچارہ منفی کے اوپر مثبت کا پلستر لگا کر اور اپنے موکھے بند کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور وہ بند نہیں ہوتے۔ یہ ظاہر کے انعام اور ظاہر کی چیزیں پھل پھول اور غنچے شگوفے ہیں جو غیر مرئی قوت نمو سے وجود میں آتے ہیں۔ جب تک اس وقت کی طرف توجہ نہیں ہوگی، زبردستی کے پھل پھول غنچے، شگوفے کاغذ کے پھولوں کی طرح ہوں گے۔

زندگی کی طرف آپ دو طرح سے پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ ایک تو آپ اصول کے اندر اور قانون کے اندر رہ کر اور دوسرے فضل کے اندر grace کا سہارا پکڑ کر۔

مادی زندگی کے زور پر زندگی گزارنے میں بڑا زور لگتا ہے اور بسا اوقات زندگی ناخوشگواری کے ساتھ گزرتی

ہے۔ مشکلات میں گزرتی ہے۔ ایسی زندگی تلوار چلاتے گزرتی ہے۔ مقابلے کی تلوار، کمپی ٹیشن کی تلوار، چالاکی اور ہوشیاری کی تلوار۔ مقام اور منصب تلاش کرنے کی تلوار اور تقدیر کے قاضی کا یہ طے شدہ فیصلہ ہے کہ جو تلوار کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، وہ تلوار ہی سے قتل ہو جاتا ہے اور یہی اس کے خاتمے کا ذریعہ بنتا ہے۔

1۔ اللہ کی عطا ہر حال میں اور ہر صورت میں علم اور حکمت سے ہوتی ہے۔ تنگ وہ کرتا ہے جو خود تنگ ہو۔ جس کی ذات میں یہ حقیقت رچ بس جائے کہ اللہ تعالیٰ احتیاج سے پاک ہے اور اس کی ہر بات میں علم و حکمت ہے، اس کا مخلوق سے جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔

2۔ ایک ہی معیار اخلاق سامنے ہو تو یکسوئی کی نعمت عطا ہوتی ہے۔ (ہر ایک جگہ سے اخلاق کے نمونے اکٹھے کرتے پھرنا اور پھر ان کی ترتیب و تدوین میں لگے رہنے سے بے چینی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔)

3۔ مخلصین کا ساتھ وہی رکھ سکتا ہے جس کی اپنی کوئی مرضی نہ ہو۔ مخلصین وہ ہوتے ہیں جن پر شیطان کا اغوا ممکن نہیں یعنی جن کو شیطان بہکا نہیں سکتا۔ ان کا کوئی کام اپنی خواہش سے نہیں ہوتا جو بھی کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگوں کی تعریف یا ان کی تنقید کی مخلصین کو پروا نہیں ہوتی۔

4۔ جب خیر پر خرچ نہ کیا جائے گا تو غیر پر ضرور ہوگا اور اس کا حاصل ہلاکت ہوگا۔ خیر پر خرچ کرنے کی پہچان یہ ہے کہ اس راہ میں خرچ کر کے نفس کو خوشی نہ ہو۔ خرچ کرتے وقت صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی مطلوب ہو۔

5۔ امتیازات تلاش کرتے رہنا جماعت کے ساتھ رہنے میں اور جماعت کو ساتھ رکھنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس سے جماعت کا رخ پیدا نہیں ہوتا۔

امتیازات یہ ہیں کہ ہر وقت کوالی فیکیشن اور حسب نسب اور اپنی خوبیاں واضح طور پر یا مبہم طریق سے اجاگر کرتے رہنا۔ جب یہ عمل ہوگا تو جماعت کے لوگ خوفزدہ ہو کر دور ہوتے جائیں گے۔ اگر کوئی اور شخص امتیاز عطا کرے تو اسے بسم اللہ کر کے قبول کر لینا چاہیے۔ حضور نبی کریمؐ کسی کو امتیاز عطا فرماتے تھے تو وہ شخص باعزت ہو جاتا تھا جو شخص ہر وقت اپنے لیے امتیاز تلاش کرتا رہے، اس سے ملنے والا اپنے آپ کو بے عزت محسوس کرتا ہے۔

6۔ جسے معاف کیا جائے اسے آسانی عطا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔

7۔ جو صرف عطا سے چمٹ جائے اور معطی کی معیت کو چھوڑ دے، فنا اس کا احاطہ کر لیتی ہے۔

معلوم ہوگا کہ اس کرۂ ارض پر جتنے بھی عمل ہوتے ہیں، وہ سب ذکر کے اور اظہار کے اور گفتار کے مرہون منت ہیں۔

1۔ اخباروں میں جتنے بھی خطوط ایڈیٹر کے نام شائع ہوتے ہیں، وہ سب گفتگو پر، اظہار پر، الفاظ پر اور بیان پر

منی ہوتے ہیں۔ گویا ان میں ذکر کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

2۔ دیواروں پر پوسٹر، سڑک کنارے ہورڈنگ، اخباروں کے کالم، لیڈروں کے بیان، مقرروں کی تقریریں، مولویوں کے وعظ وغیرہ یہ سب الفاظ ہی ہوتے ہیں اور ذکر اذکار کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ عمل ان کے مقابلے میں معمولی اور بے معنی ہوتا ہے کہ وہ گفتار کے منبع سے صورت پذیر ہوتا ہے۔

3۔ احتجاج الفاظ کے فریم ورک میں مقید ہوتا ہے۔

4۔ نعرے مارتے انقلابی الفاظ کے نعرے مارتے ہیں اور لفظوں میں اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔

5۔ خاموش walk کرنے والے اپنے احتجاجی بورڈ اٹھا کر ذکر کرتے چلتے ہیں۔

6۔ جو لوگ دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں، وہ بھی ذکر کرتے ہیں لیکن ان کا ذکر، ذکر خفی ہوتا ہے۔

7۔ مرن برت والوں کے پیچھے بھی ایک ذکر ہوتا ہے اور وہ ذکر خفی انتہی ہوتا ہے۔

8۔ اصل میں دیکھا جائے تو ذکر ہی عمل ہے اور ذکر ہی ارتکاب عمل ہے۔ جو عمل ذکر کے بغیر ہو اور جس کے پیچھے اس کا اقرار اعلان نہ ہو، وہ عمل بے معنی، رائیگاں اور بدنیتی پر منی ہوتا ہے۔

9۔ گفتار کی بڑی اہمیت ہے بلکہ گفتار ہی اہم ہے۔ الفاظ کے اندر ہی خیر اور شر کی قوتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ الفاظ کو آپ جہاں بخش، لائف سیونگ گولیوں کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور الفاظ ہی کو آپ کلاشنکوف کی گولیوں کے طور پر استعمال میں لا سکتے ہیں۔ گفتار میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور گفتار کا Volume ذکر سے سیٹ کیا جاتا ہے۔

گونگے کا عمل کتنا بھی ارفع کیوں نہ ہو، اس کے پیچھے چونکہ کسی دستور کا اعلان نہیں ہوتا، اس لیے وہ عمل محل نظر ہو جاتا ہے۔

ہر عمل بھی عمل نہیں ہوتا...... ہم اکثر "رولنے" کو ہی عمل سمجھ لیتے ہیں۔

لیکن جہاں مولا نہیں، وہاں رولا ہے۔ رولا عمل نہیں، رولا ذکر نہیں، رولا ورد نہیں، رولا بس رولا ہی ہے۔ منڈی میں رولا ہے، بازار میں رولا ہے، مجمع میں رولا ہے۔ سٹاک مارکیٹ میں رولا ہے، بی بی سی میں رولا ہے، ورلڈ فورم میں رولا ہے، ٹاک شو میں رولا ہے...... اور جہاں مولا نہیں وہاں رولا نہیں۔ بس رولا ہی رولا ہے۔

اس لیے بزرگان دین ذکر کی تلقین کرتے ہیں تاکہ انسان رولے سے ٹوٹ کر مولا سے لگ جائے۔

انسان اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتا ہے لیکن مجبور ہے۔ معجزات کی دنیا میں سائنس کا آدمی رہنے پر مجبور ہے۔ اس کو یقین آ ہی نہیں سکتا۔ (1) وہ کہتا ہے ایسے تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ انسان کے ذہن کی پیداوار ہے اور اس کے متخیلہ کا ایک حصہ ہے۔ (2) دوسرے کچھ واقعہ گزرا اور دیکھنے والا چونکہ ناقص تھا۔ تربیت یافتہ نہیں تھا، اس لیے معجزہ نہیں سمجھا کیونکہ اس کے پاس وافر علم نہیں تھا۔ (3) لوگوں کے درمیان بات چلتی چلتی اور وقت گزرنے پر شکلیں بدلتی بدلتی حقیقت سے معجزے کا

روپ دھار گئی۔

موسیٰ ایک ماہر جغرافیہ دان تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ جوار بھاٹا کے دوران سمندر کا پانی کب بالکل نیچے ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو آسانی سے لے کر نکل گئے اور فرعون جغرافیہ نہ جاننے کی وجہ سے ڈوب گیا۔

یہ سچ نہیں ہے کہ مولوی نے ڈرا ڈرا کر لوگوں کو خوفزدہ کر کے گناہ کی طرف دھکیل دیا اور ان کے اندر جرم کا اور قصور کا تصور پیدا کر دیا اور اس تصور سے خود فائدہ اٹھایا کہ ان کا لیڈر بن کر بیٹھ گیا۔ یہ بات نہیں، گناہ کا تصور انسان کے اندر reflexine کی صورت میں ہے۔ انسان کے اندرونی توازن میں جب بے وزنی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب اس کے اندر عزت نفس کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ خدا سے بیگانگی پیدا ہوتی ہے، علیحدگی پیدا ہوتی ہے تو وہ گناہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مولوی کے خوف دلائے بغیر اس کے جھڑکے سے بغیر...... یہ (گناہ) انسانی ضمیر کے تانے بانے اور اسی کے تار و پود کا ایک حصہ ہے۔ گناہ مذہب نے ایجاد نہیں کیا۔ یہ اس نے دریافت کیا ہے اور اس کے اثرات کا انسان کے وجود پر جس جس طرح کا بوجھ پڑتا ہے۔ اس کا مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جس کے خلاف گناہ کیا ہے۔ اس کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ (اس کا علاج عیسائی دنیا نے اعتراف میں ڈھونڈا ہے۔

ہر چیز ایک سی ہے اور ہر چیز مختلف ہے۔ تمام انسانوں میں انسانیت کا جزو Common ہے، پھر بھی ہر شخص مختلف ہے۔ اسی طرح تمام مذاہب ایک سے ہو کر بھی جدا جدا ہیں۔

ایٹم کے اس دور میں ہم انسان کے بارے میں بڑی وسعت نظری کے ساتھ سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا بھر میں انسانوں کے احساسات، جذبات، معاملات ایک جیسے ہیں اور ان کے مسائل، ان کے تقاضے، ان کے خوف اور ان کی خواہش بھی ایک طرح کی ہیں۔ ان سب کی امیدیں بھی ایک جیسی ہیں۔ سب کے سب انسان ہیں اور انسان کی وسیع برادری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن آپ سے کبھی بھی کسی انسان کا تعارف یہ کہہ کر نہیں کرایا جاتا کہ ان سے ملیے، یہ ایک انسان ہیں بلکہ انہیں مصری، یونانی، اطالوی، البانی، امریکی اور انگلستانی کہہ کر بتایا جاتا ہے۔

قوالی کے اندر کوئی ساز طبلے کی جگہ نہیں لے سکتا اور ہارمونیم گھڑے کا خلا پر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خنجری، ڈھولک اور کھڑتالیں اپنے اپنے مقام پر بجتی ہیں لیکن ساری کی ساری ایک ہی دھن بجا رہی ہوتی ہیں۔ ایک ہی لے جاری ہوتی ہے اور ایک ہی استاد کے آگے جھکی جا رہی ہوتی ہیں۔

یہ دنیا کیسے معرض وجود میں آئی کیونکر بنی۔ کس ترتیب سے اس پر ساری چیزیں آتی گئی اور بنتی گئیں۔ شاید پہلے دن اور رات بنے، ٹائم بنا، پھر آسمان، زمین اور سمندر، گھاس، سورج، چاند ستارے سمندروں کے اندر مچھلی، پھر دو ٹانگوں، چار ٹانگوں والے زمینی جانور اور ان کے ساتھ پیٹ کے بل رینگنے والے جانور اور آخر میں انسان۔

لیکن دنیا کے سارے جانداروں میں ساری مخلوق میں انسان ہی ایک ایسا جاندار کیوں ہے جو اپنے خون اور پسینے کی کمائی سے اور اپنی دن رات کی محنت سے ایک وقت کی روٹی کماتا ہے۔ دوسرے جانور ایسا نہیں کرتے، مزے سے کھاتے پیتے ہیں، چرتے چگتے ہیں، کوئی فکر نہیں، فاقہ نہیں، طعنہ نہیں، الہانا نہیں...... بزرگوں نے اس کے کئی جواب دیئے

لیکن کوئی دل کو نہیں لگتا، تسلی نہیں کرتا۔

سچ کے لیے اور حق کے لیے انسان کی تلاش جاری ہے۔ انسان زمانہ قدیم سے سوال پوچھتا آیا ہے اور اب تک پوچھ رہا ہے۔ ایک نسل کی سائنس دوسری آنے والی نسل کا توہم بن جاتی ہے۔ دوسری پود کے لیے ارتقا بن جاتی ہے۔ انسان کی یہ تلاش بڑی بوجھل، تکلیف دہ اور تھکانے والی بن جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بڑی پرشکوہ، شاندار Gloriousہفت خواں بھی ہوتی ہے۔

تصوف

فوری علاج

1- اندھا جذبہ کیا ہوتا ہے' تیز طرار غصے میں بھرا ہوا؟

اندھا جذبہ ایک ایسی حدت ہوتی ہے جس میں روشنی نہیں ہوتی۔ اس حدت سے فائدہ اٹھانے کے لیے عقل کی چھوٹی سی موم بتی جلا کر ضرور دیکھ لو۔

2- آپ نے کہا تھا کہ ہم مضطرب محسوسات کو غچہ بھی دے سکتے ہیں' یہ کیسے ممکن ہے؟

جو شے آپ کو خوفزدہ کر رہی ہے اگر آپ بہت دیر تک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہو جائیں تو تھوڑی دیر بعد وہ خود خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے گی۔

3- اپنے تصورات اور خیالات کی پڑتال کس طرح سے کر سکتے ہیں کہ وہ ٹھیک بھی ہیں یا نہیں؟

دیکھیں کہ کیا آپ کے خیالات نے اور آپ کے فلسفے نے آپ میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔ اگر نہیں کی تو اپنا فلسفہ تبدیل کر دیں۔

4- اصلی مضبوطی کس طرح سے حاصل ہوتی ہے اور کب حاصل ہوتی ہے؟

آپ اس وقت پورے طور پر مضبوط ہوتے ہیں جب آپ میں کوئی منفی تصور یا منفی جذبہ نہیں ہوتا۔

5- اپنے مسائل حل کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

سری فلسفے میں "خود صحت یابی" پر وقت کا تصرف نہیں ہوتا۔ صحت یابی فوری طور پر ہوتی ہے۔ جب بات سمجھ میں آ گئی اسی وقت صحت ہو گئی۔

بیش بہا نسخہ

خود بیداری اور خود نگہداری کے لیے آج آپ کو ایک لقمان حکیم جیسا نسخہ عطا کرتے ہیں۔ ذرا غور سے سننا اور پھر ضرور استعمال کرنا:

آج کے بعد سے لوگ آپ کے ساتھ جو بھی سلوک کریں یا آپ کے ساتھ جو بھی رویہ اختیار کریں یا آپ کے

بارے میں جو بھی کہیں ان کو ایسا کرنے دیں اور ان کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ ان کے رویے اور ان کی طبع میں نہ تو کوئی تبدیلی پیدا کریں اور نہ ہی کسی طرح سے ان پر اثر انداز ہوں..... نہ ہی ان کے کہنے اور کرنے پر ناخوشی کا اظہار کریں نہ ہی نفرین کریں اور نہ ہی اس کا تذکرہ اوروں سے کریں اس موضوع پر زبان ہی نہ کھولیں۔

اب یہ سب کیا ہے اور ایسا کیوں کیا جائے؟ آزادی کے لیے شخصی آزادی کے لیے اور ذاتی خوشی کے لیے..... یہ ان کے عمل نہیں ہیں جو ہم کو مضطرب کرتے ہیں اور ہمیں وسوسوں میں گھیرتے ہیں بلکہ یہ ہماری اپنی غیر محفوظیت کا خوف ہوتا ہے۔ Insecurity کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس بات کی طلب ہوتی ہے کہ وہ لوگ ہم کو حفاظت میں رکھیں اور سکون میں رکھیں اور جو کام ہم کر رہے ہیں اُسے آرام سے کرنے دیں۔

تو جناب! ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ فرد خود میں تبدیلی پیدا کرے نہ کہ اپنے عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں میں تبدیلیاں پیدا کرتا پھرے اور ان کے دروازوں پر جا کر دھکے مارتا پھرے۔

جب تم لوگوں کو اپنی من مانی کرنے دو (اور ایسا وہ ہر حال میں کریں گے) اور ان کی راہ کی رکاوٹ نہ بنو تو تمہارے اندر ایک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوگی۔ آپ پہلی مرتبہ دیکھیں گے کہ ان کے رویے پر آپ کا افسوس یا ان کے رویے پر آپ کی سرزنش ہی آپ کی بے چینی اور تردد کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ان کو آپ کی بے چینی یا تردد سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ اس کی بنیاد نہیں ہیں۔

اس عمل کو بزرگان دین تلاوت وجود کے نام سے پکارتے ہیں اور اس کو وہ ارفع خود شناسی اور خود عملی کا نام دیتے ہیں۔

تلاوت وجود

''پچھلے دنوں تم نے کیا پڑھا؟''

''ایک دینی کتاب۔''

''اور تم نے بھی؟''

''ایک فلسفے کی کتاب۔''

''اور تم نے کیا پڑھا؟''

''میں نے اپنے آپ کو پڑھا۔ اپنے وجود کی تلاوت کی۔''

''شاباش! تم نے منزل کی طرف جانے کے لیے سیدھا قدم اٹھایا۔ اب اس تلاوت وجود کا سلسلہ ختم نہ کرنا۔''

گھونسے

''اس دنیا میں سارے گھونسے مجھی کو کیوں لگتے ہیں؟''

اس لیے کہ آپ گھونسوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہم کو وہی کچھ نصیب ہوتا ہے جس دنیا میں ہم آباد

ہیں۔ بزرگان دین کہتے ہیں کہ جب تک آپ ذہنی نقل مکانی نہیں کریں گے یہ گھونسے آپ کو اسی طرح لگتے رہیں گے۔

آپ کے اندر ایک کشش ہے اور وہ ایسی چیزوں کو آپ کی طرف کھینچتی ہے جس کی اس کو چاہت ہوتی ہے۔ مثل مثل کو کھینچتی ہے..... یہ قدرت کا ایک اصول ہے۔ شیر شیروں کے ساتھ مل کر رہنا پسند کرتے ہیں اور گیدڑ گیدڑوں کے ساتھ۔ اگر آپ اپنے آپ کو تبدیل کر لیں گے تو آپ کی کشش دوسری قسم کی مطلوبات کو کھینچنے لگے گی اور تبدیلی کے لیے وہی اصول ہے جس کا بار بار ذکر ہوا ہے کہ اس نیچر کو ڈھونڈو جو تمہاری اصل نیچر ہے۔ وہ نہیں جس کا آپ نے لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

بدقسمتی کا خاتمہ

بہت سے لوگ ہر وقت مصیبت میں گھرے رہتے ہیں خاص طور پر لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات بری طرح سے پھنس جاتے ہیں۔ ہم کو کیا معائنہ کرنا چاہیے۔

آپ دیکھیں گے کہ آپ کے بہت سے مسائل غلط قسم کے لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کی وجہ سے ہیں۔ پھر آپ کو ایک اور تکلیف دہ حقیقت کا سامنا بھی کرنا ہوگا کہ آپ کے اندر کچھ غلط قسم کی چیز ہے جو غلط قسم کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اب یہ وہ سخت مقام ہے جہاں آپ کو ایمانداری کے ساتھ نشتر زنی کرنی ہے اور اپنی ذات کی رو رعایت رکھے بغیر معاملے کی تحقیق کرنی ہے۔

جس بدقسمتی کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے پھر وہ بدقسمتی نہیں رہتی۔ وہ اپنا آپ دوہراتی نہیں۔ جب مسئلہ اچھی طرح سے سمجھ میں آ جاتا ہے تو اس کا موشن ٹوٹ جاتا ہے حرکت بند ہو جاتی ہے اور جب حرکت بند ہو جائے تو مسئلہ Stop ہو جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ روحانی راستے کی سب سے بڑی منزل یہی ہے کہ اپنے آپ کو خود آزاری سے بچایا جائے۔ جب یہ راز معلوم ہو جاتا ہے اور اس پر عمل شروع ہو جاتا ہے تو آدمی بہت ہی افسوس کرتا ہے کہ کاش! یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی اور جو نقصان ماضی میں اٹھائے تھے وہ نہ اٹھانا پڑتے۔

ناعمل

عام طور پر ایک شخص کے پاس اپنے عمل کی ایک لمبی فہرست ہوتی ہے۔ وہ بہت کچھ کرنے اور کر گزرنے کا خواہشمند ہوتا ہے لیکن اس ظالم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کچھ نہ کرنا بھی عمل ہی کی ایک صورت ہے..... سری رمز کے طور پر کچھ نہ کرنا بھی سب سے بڑا تخلیقی عمل ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا کہ جو شخص زور لگائے اور ڈھوس مارے بغیر اپنے دن میں داخل ہوتا ہے وہ کس خوش اسلوبی سے سارے کام سرانجام دیتا ہے۔ زور لگانے اور زور آزمائی کرنے سے بڑی اڑچنیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر کام میں بڑی طاقت صرف ہوتی ہے..... ہم کو اس شعور اور ہوشمندی کی ضرورت ہے کہ جانیں کہ ہم جو کام زور لگا کر کرتے ہیں

وہ ہمارے لیے ایک اور زنجیر بن جاتا ہے۔
ناعمل میں داخل ہو کر کام کرو۔

قانونِ قدرت: مکافات

سری رمز کے ایک اصول پر نگاہ ڈال کر دیکھیے کہ جو کچھ تم کسی اور کے لیے چاہتے ہو وہی تم اپنے لیے چاہتے ہو۔ یہ اصول ہر شخص پر ہر وقت اور ہر مقام پر لاگو ہے اور کوئی اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔

فرض کیجئے راشدہ کو روحی سے کوئی تکلیف پہنچی اور اس کا دل دکھ سے بھر گیا تو اس نے روحی سے بدلہ لینے کے لیے اُسے بددعائیں دیں اور اس کا برا چاہا تاکہ اس کے ذہن کو کچھ تو سکون پہنچے۔ اب جب راشدہ نے روحی کا برا چاہا اور اس کو بددعائیں دیں تو پتہ چلا کہ راشدہ بددعا کے اور برائی کے سٹور ہاؤس میں رہائش پذیر ہے' جہاں سے اس کو بددعا کی کھلی سپلائی مل رہی ہے اور مفت مل رہی ہے۔ اب جب بھی راشدہ بددعا کے پیکٹ تیار کرتی ہے تو اس کے گھر میں بھی ایک فیکٹری کھل جاتی ہے جہاں سپلائی کے لیے مال تیار ہو رہا ہے۔ اب راشدہ اپنی ہی خواہش ہے اور اپنی ہی سزا ہے۔

اس سزا سے نکلنے کے لیے سری قانون کو اچھی طرح سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

مراقبہ

معمولی سوچ معاملات کا حل تلاش نہیں کر سکتی بلکہ معمولی سوچ ہی معاملات اور پیچیدگیاں پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ ایک کبوتر باز کبھی بھی کسی بلی کو اپنے کبوتروں کی حفاظت پر مامور نہیں کرتا۔

ہر شخص میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ معمولی سوچ سے کنارہ کر کے گہری سوچ کو اپنائے اور اس میں مہارت حاصل کرے۔

اس کو اس طرح سے شروع کیا جا سکتا ہے کہ آپ خاموشی سے اپنے کمرے کے ایک گوشے میں اپنے ساتھ بیٹھیں۔ اپنے ذہن کے ساتھ کوئی ورزش نہ کریں۔ صرف اس کا مشاہدہ کریں کہ یہ کدھر کدھر جاتا ہے اور کیا کیا کرتا ہے۔ اپنے خیالات کو ابھرتے اور پھر ناپید ہوتے دیکھیں اور دیکھتے جائیں۔ اوّل اوّل یہ مشکل بھی ہوگا اور عجیب بھی لگے گا۔ لیکن اپنی کوشش ترک نہ کریں۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ آپ اپنے خیال کی پہلی رو کو پکڑ لیں گے۔ یہ معمولی رو نہیں ہوتی۔ یہ پرسکون ذہن ہوتا ہے جو آپ کے سارے الجھاؤ کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بصیرت کے اصول

دیکھیں کہ ناامیدی اور محروم سازی آپ کو آزادی اور فارغ البالی کی طرف لے جانے کی طاقت رکھتی ہے' مایوسی کی طرف نہیں۔

دیکھیں کہ آپ بے معنی خدشات اور بے بنیاد مفروضوں کے بجائے طاقتور حقائق سے روشناس ہو سکتے ہیں۔
دیکھیں کہ کسی دوسرے آدمی کے لیے باملاحظہ اور Considerate ہونے کے لیے آپ اس کے معاملات میں دخل تو نہیں دے رہے۔
دیکھیں کہ آپ احمق اور غرض مند لوگوں کی خوشامد اور مدح سرائی سے متاثر تو نہیں ہو رہے۔
دیکھیں کہ ایک مختلف قسم کا انسان ہی دوسرے مختلف قسم کے لوگوں کو جان اور پہچان سکتا ہے۔
دیکھیں کہ دوسرے لوگوں نے اپنے آپ پر جو خول چڑھا رکھے ہیں کیا آپ ان کے اندر کے انسان کو پہچان رہے ہیں۔
دیکھیں کہ آپ نے یہ فن سیکھ لیا ہے کہ اپنے آپ کے ساتھ کس طرح سے خوش ہو کر رہا جاتا ہے۔

ہم کو القاء کس طرح سے حاصل ہو سکتا ہے؟
جب آپ کی ظاہرا صورت اور اصل صورت میں مطابقت پیدا ہو جائے یعنی جیسے اندر ہیں ویسے ہی باہر ہو جائیں۔

مضامین

جب ہماری زندگی "بے حقیقی" کی خوراک پر پرورش پائے گی تو ہمیشہ بھوکی رہے گی اور بالآخر اس گرسنگی کے ہاتھوں موت کی آغوش میں چلی جائے گی۔
وہ موت جس کی راہ سے ہم زندگی میں داخل ہوتے ہیں کوئی حقیقت سے فرار نہیں۔ کوئی فرار کی راہ نہیں بلکہ ٹوٹل حقیقت کی طرف ایک واضح "کومٹ منٹ" ہے۔ اس کی ابتدا۔
جب ہم زندگی کی (مادی) اشیاء کو اصل سمجھ کر انہیں اپنانے میں تگ و دو کرتے ہیں اور ان کے عشق میں مرتے ہیں تو ہم کو گہرے مطالعے کے بعد اور معروضی مشاہدے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ اشیاء تو بے معنی لایعنی اور بے حقیقت ہیں۔ ان میں متغرق ہونا نہ صرف صحت روحانی کے لیے مضر ہے بلکہ صحت جسمانی کے لیے بھی بے حد غیر مفید ہے..... لیکن ان کو بے معنی اور بے حقیقت سمجھنے کے لیے ان اشیاء کو ذرا دور رکھ کر اور خود پرے کھڑے ہو کر ان کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے اور یہ دور رکھنا اور پرے ہو کر مشاہدہ کرنا اس بات کا متقاضی ہے کہ ان اشیاء کو اپنی زندگی سے نکال کر دیکھا جائے۔ اگر مستقلاً نہیں تو تھوڑے وقت کے لیے' عارضی طور پر' چند ایام کے لیے محض مطالعے اور مشاہدے کی خاطر' صرف پڑتال کے لیے۔
ریگستانی درویش بتاتے ہیں کہ اللہ کریم نے اپنی مہربانی سے ویرانے کو اس لیے تخلیق کیا کہ یہ ویرانہ خدا کے نزدیک محترم ہے کہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اس کی کوئی اہمیت نہیں (زرخیز اور سرسبز زمین کے مقابلے میں جس کے لیے جنگیں اور خونریزیاں ہوتی ہیں' جن کو سونے کی چڑیا کہا جاتا ہے) خرابے اور ویران زمین انسان کے لیے تاراج نہیں

کرتا کہ ان کی قیمت ہی نہیں ہوتی۔ ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ان سے کچھ لیا نہیں جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بندے ایسے ویرانوں اور ریگستانوں میں بلامقصد رہتے ہیں اور بلاارادہ گھومتے ہیں اور خدا ان کا خاص خیال کرتا ہے اور ان پر خصوصی نظر رکھتا ہے۔ یہ لوگ اگر چاہیں تو بڑی آسانی کے ساتھ آبادیوں کا رُخ کر سکتے ہیں اور سیدھے سجاؤ شہروں میں جا داخل ہو سکتے ہیں۔ لیکن اللہ نہیں چاہتا کہ وہ ایسا کریں۔ نہ ہی وہ اپنے اللہ کو چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی معیت میں جو وقت گزارا ہوتا ہے وہ انسانی زندگی کے نایاب لمحے ہوتے ہیں اور انسان انہیں کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتا۔

ریگستان صرف "اپنا آپ ہونے کے لیے" اور خود اپنی ذات کے لیے بنائے گئے۔ ان کو انسان اپنے مصرف میں لانے کے لیے تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح پہاڑ اور اسی طرح سمندر! تو ریگستان اور صحرا ان لوگوں کے لیے ایک ایسی منطقی آماجگاہ ہے جو صرف اپنا آپ ہونے کے اور کچھ نہیں ہونا چاہتے کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ یعنی وہ ایک ایسی مخلوق بن کر رہنا چاہتے ہیں جو خالصتاً اللہ پر دارومدار رکھتی ہو اور اسی کے فضل کے سہارے زندہ ہو اپنی کارکردگی محنت اور جدوجہد کی وجہ سے نہیں۔

یہ جو صحرا ہے ناں۔ یہ جو ریگستان ہوتا ہے یہ دیوانوں کا ملک ہوتا ہے۔ پھر اس میں شیطان بھی رہتا ہے اس کو اسے بھی یہ جگہ پسند ہے۔

پیاس انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ ابلیس بھی دیوانہ ہے۔ چھو کر دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اس کو بھی اپنے کھوئے وقار کو واپس پانے کی تر شنا ہے پیاس ہے..... تو بندۂ صحرائی کو اس بات کا اچھی طرح سے خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی پیاس بڑھ کر اس کو دیوانہ نہ بنا دے اور وہ ابلیس کے ہتھے چڑھ کر اس کا بندہ نہ بن جائے۔

مراقبہ

مراقبے کے لیے دو وقت مناسب ہیں، صبح کا اور شام کا۔ صبح فجر کے بعد اور شام مغرب کے بعد۔

ایک ایسا گوشہ تلاش کریں جہاں تنہائی ہو اور سکون ہو اور آسائش ہو۔

زمین پر بیٹھیں یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھیں یعنی چوکڑی مار کر بیٹھیں۔ یہ مشکل ہو تو پھر آپ کرسی پر بھی بیٹھ سکتے ہیں لیکن اس میں پاؤں ننگے ہوں اور دونوں پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہوں یعنی زمین کے ساتھ اٹھ ہو کر بیٹھیں۔

آنکھیں بند کر لیں، چہرہ اوپر ٹھوڑی اٹھی ہوئی۔

کمر بالکل سیدھی۔ کمر میں کوئی جھکاؤ نہ ہو، کوئی کبڑا پن نہ ہو، بالکل سیدھے ہو کر بیٹھیں۔

اب بڑی تسلی بڑے سکون اور بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی توجہ اپنے سانس پر لگائیں اور دیکھیں کہ سانس آرہا ہے۔ سانس جارہا ہے۔ Inhale بھی ہے اور Exhale بھی ہے۔

اب ساری توجہ سانس کی آمد و رفت پر مرکوز کر دیں کہ یہ آیا یہ گیا، یہ آیا یہ گیا۔

ایک دو مرتبہ تو آپ اس پر دھیان کر لیں گے۔ اس کے بعد خیال آپ کو بھگا کر کہیں کا کہیں لے جائے گا۔ عجیب و غریب باتیں یاد آنے لگیں گی۔ اب خیال کی مہار موڑیں اور اسے واپس سانس پر لے آئیں۔ بڑی مشکل سے واپس آئے گا۔ ذرا سی دیر کو آپ کے سانس دیکھے گا، پھر بھاگ جائے گا۔ بھاگتا ہے تو بھاگ جائے۔ اس کو کوئی سزا نہ دیں، سختی نہ کریں، پھر آہستگی کے ساتھ واپس لے آئیں اور کوشش کر کے زیادہ دیر تک اسے ساتھ رکھیں۔

مراقبے کے لیے امن اور سکون ضروری ہے

سکون کیا ہے، مقابلے کا رخ چھوڑ دینا، خم ٹھونک کر کھڑے رہنے کو ترک کر دینا۔ اگر آپ کو امن اور سکون کی ضرورت ہے تو لڑائی بند کر دیں۔ سکون چاہتے ہیں تو اپنے خیال کے ساتھ جنگ بند کر دیں۔ خیال تو آپ کو اکساتے رہیں گے۔ آپ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا شیریں بند کر دیں۔

اگر آپ اپنے جذبات میں سکون چاہتے ہیں اور اس کو ٹھنڈا کر کے رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو بند کر دیں، محسوسات کے حوالے کر دیں۔ احساسات جذبے کو محسوس کریں گے اور آپ کو اطلاع دیں گے۔ اس سے اطلاع حاصل کریں۔ تند تیز ہوا کا جذبہ احساس کی ڈالیاں ہلائے گا۔ ان ڈالیوں کو ہلتا دیکھیں اور دیکھتے جائیں اور پتہ کرتے جائیں کہ ڈالیں کدھر کدھر کو جھوم رہی ہیں۔

اگر جسمانی سکون کی ضرورت ہے تو زندگی کی دوڑ دھوپ روک لیں۔ اپنے جسم کو تھکن منزل سے آگے نہ لے جائیں۔ جسم کو آرام دیں، جسم کو ورزش کے ساتھ خوش حال کریں۔

اگر لوگوں کے ساتھ امن و سکون کی آرزو ہے تو لڑائی بند کر دیں۔ اپنے راستے پر چلتے جائیں، اپنے کام کرتے جائیں۔ اگر کوئی آپ کے ساتھ چلتا ہے ٹھیک ہے۔ اگر کوئی نہیں جانا چاہتا سبحان اللہ آپ خود ہی اکیلے چلتے جائیں۔ گانا نہیں آتا پھر بھی گنگنائیں۔ درود شریف آتا ہو تو وہ روح میں اتارتے جائیں۔ اپنی پورٹیبل جنت اپنے ساتھ رکھیں جس طرح لڑکیاں اپنا وینٹی بکس ساتھ رکھتی ہیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنی جنت ہر وقت ہینڈ بیگ، بریف کیس کی طرح ساتھ رکھیں۔ جنت بڑی ہو اور بھاری ہو تو کندھے پر لٹکا لیں۔

غصہ آ جائے تو جیسا فرمایا گیا ہے، بیٹھ جائیں اور زیادہ آ جائے تو لیٹ جائیں۔ اپنے امن کی پڑیا ساتھ رکھیں۔ میں نے بڑے بزرگوں کو دیکھا ہے، مشکل وقت میں پانی منہ میں رکھ لیتے ہیں۔ میرے بابا کو پان کھانے کے عادی نہیں تھے لیکن ڈیرے پر ایک بڑا سا پاندان موجود رہتا تھا۔ ایک بڑا سا پان منہ میں رکھ کر ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے تھے اور مسکرانے لگتے تھے۔

ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں

فتویٰ دینا اور فیصلہ کرنا اور حتمی رائے دینا اس لیے ناممکن ہے کہ یہ کائنات ایک دوسرے واقعات اور معاملات

سے اس طرح سے بندھی ہوئی ہے کہ اس وقت تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا جب تک آپ کو ساری صورتحال اور پورے کا پورا کل کا علم نہ ہو۔

فتویٰ دینا یا فیصلہ دینا اس لیے بھی مضر ہے کہ آپ نے کوئی فیصلہ دیا، آپ سکڑ گئے، اندر بھی اور باہر بھی۔ آپ رک گئے، سٹاپ ہو گئے۔ آپ نے کہہ دیا کہ بس یہ آخری اور حتمی بات ہے، اس سے آگے کچھ نہیں۔

تصوف

''من چلے کا سودا'' ایک گیت

تم اپنی مسجد کو جاؤ
اور میں اپنی مسجد جاتا ہوں
پر ساتھ چلیں گے ہم دونوں
مغرب کا وقت ہے
اور ٹائم کم رہ گیا ہے
ہماری مسجدیں ہمارے باپ دادا نے بنائی تھیں اور ساتھ ساتھ بنائی تھیں
تم اپنی مسجد کو جاؤ
اور میں اپنی مسجد کو جاؤں گا
لیکن ہم ساتھ ساتھ جائیں گے، اکٹھے جائیں گے
ہم دونوں کا ایک خدا ہے
ایک رسول ہے، ایک قرآن ہے
اس لیے ہم اکٹھے چلیں گے
ساتھ ساتھ چلیں گے
درود تلبیہ پڑھتے چلیں گے
تمہاری مسجد کا موذن بڑا سریلا ہے
مجھے اپنے گھر بھی اس کی آواز سنائی دیتی ہے
لیکن ہمارے موذن کی اذان بھی دور دور تک پہنچتی ہے
اور جب یہ دونوں اذانیں مل جاتی ہیں تو
سارا شہر ایک میٹھی گونج میں ڈوب جاتا ہے
اس وقت یہی گونج اُبھر رہی ہے

آؤ اپنی اپنی مسجد کو چلیں
جو ہمارے باپ دادا نے بنائی ہیں
لیکن ہم ساتھ ساتھ چلیں گے اور اکٹھے ہی جائیں گے
چلو جلدی کرو، جوتا پہنو، چھڑی تھامو
اذان ہو رہی ہے
ہم دونوں اپنی اپنی مسجد کو ساتھ ساتھ جائیں گے
اور اس خدائے واحد کو سجدہ کریں گے
جو میری مسجد کا خدا ہے
جو تری مسجد کا خدا ہے
جو ہم دونوں کا رب ہے
رب السموات والارض
چلو چلو جلدی کرو
نماز کا وقت ہو گیا ہے
تم اپنی مسجد کو جاؤ
میں اپنی مسجد کو جاؤں گا
لیکن ہم ساتھ ساتھ جائیں گے
اور ساتھ ساتھ آئیں گے
کہ ہمارا راستہ ایک ہے
طریق ایک ہے، سبیل ایک ہے

Cleaning House

ہم اپنے گھروں کی صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کھڑے ہو کر صفائی کراتے ہیں۔ کونے کھدرے کرید کرید کر صاف کرواتے ہیں۔ الماریاں، ڈبے، دراز، میزیں، سب کو جھاڑا تھرکایا جاتا ہے۔

عین اسی طرح ہم کو اپنے وجود کی صفائی بھی کرنی چاہیے۔ اس کو کسی دوسرے سے صاف نہیں کرایا جا سکتا۔ اسے خود ہی جھاڑ دے کر صاف کیا جاتا ہے۔ اندر کئی ڈبے ایسے ہیں جو ہم نے کبھی کھولے ہی نہیں۔ کچھ گمان ہیں جن کو ویسے کا ویسا بند کر رکھا ہے۔ ان بند ڈبوں اور گمانوں اور بدگمانیوں کے اندر عجب طرح کی بدبو پیدا ہو گئی ہے۔ پھر کچھ بولے ہوئے جھوٹوں کے خالی لفافے اور شیشیاں ہیں۔ ان سے عجیب طرح کی ہمک آ رہی ہے۔ سینے کے بڑے صندوق میں کچھ نفرتیں

ہیں جن میں اب پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہوگیا ہے۔ان کا صفایا کرنا یوں مشکل ہے کہ ان میں ٹڈیاں، جھینگر اور پسو پیدا ہوگئے ہیں۔ اگر یہاں آپ دوائی پمپ کریں گے تو وہ شخصیتیں بھی کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ مرجائیں گی جن کو آپ نے نفرت کے لیے پالا ہوا ہے۔اس لیے بڑا صندوق اوندھا مار کر اسے زور زور سے تھپتھپانا پڑے گا اور حشرات کو اندر سے بھگانا پڑے گا۔ پھر اپنی یادوں کی تہیں لگا کر اندر کپڑا پھیر کر صفائی کرنی پڑے گی۔ چاہے کدورتیں ہوں، چاہے نفرتیں ہوں۔ اگر اندر کی صفائی ہوتی رہے تو سانس سے بدبو کے بھبکے ختم ہو جائیں گے۔ یہ جو دنیا میں اتنے ماؤتھ واشز اور بریتھ فریشنرز بن رہے ہیں، ان کی ضرورت نہ رہے۔ اگر اپنے وجود کی صفائی ہوتی رہے تو پھر ان سینوں کی، کلونوں کی، خوشبوؤں کی اور عطروں کی بالکل ضرورت نہ رہے۔

سب سے زیادہ بدبو دل کے اردگرد کے درازوں میں ہوتی ہے۔ان درازوں میں ہم اپنے عقیدے کے پھول اور گلدستے سجاتے ہیں اور ان کو بند کر کے رکھتے ہیں لیکن یہ سوکھنے، سڑنے اور گلنے والے گلدستے ایسی خوفناک بو دیتے ہیں کہ اگر ان کو نکال کر انہیں صاف کر کے، دھو کے نہ رکھا جائے تو اسی بدبو کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔

عقیدے کے پھول اور گلدستے ماننے کی شبنم سے تر و تازہ رہتے ہیں اور کرنے کی ہوا سے نشوونما پاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ بہت جلد گل سڑ کر سارے وجود کو بدبودار بنا دیتے ہیں۔

عقیدے کی امثال:

سب مسلمان بھائی ہیں۔

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اپنا عہد پورا کرو قیامت کے دن اس کی بابت پوچھا۔

جو بات کہو وہ پوری کرو۔

بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

لوگوں سے اچھی بات کرو۔

لوگوں کو معاف کرو اور درگزر کرو۔

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو۔

ریاضی

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ہماری باتوں اور ہمارے نظریات کو سمجھنے کے لیے اور ان انکشافات تک گہرے اترنے کے لیے ریاضی کے علم کا جاننا بہت ضروری ہے کیونکہ ریاضی کے ایک عملی مشاہدے کے بغیر طبیعات کی مبادیات کو سمجھنا ناممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بالکل ٹھیک ہے اور اس وقت ہم جس کلچر میں زندگی گزار رہے ہیں اس میں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ ہماری ٹیکنالوجی، تہذیب کا سارا دارومدار ریاضی کے اصولوں پر

بندھا ہے لیکن! (اور اس ''لیکن'' پر آپ کو آرام سے علیحدگی میں غور کرنا ہوگا) جب ہم سے صوفی، سالک، جوگی بڑی عاجزی سے یہ کہتے ہیں کہ باطن کے سفر اور اس سفر کی فزکس کو جاننے کے لیے بھی اللہ کا ذکر کثرت سے کرنا پڑے گا اور صبح و شام اس کی تسبیح کے ریاضیاتی فارمولوں سے گزرنا پڑے گا تو بڑے بڑے سمجھدار اور منصف مزاج لوگ بھی رک سے جاتے ہیں۔

تصوف

تصوف کی تعلیم اس شخص کو آہستہ روی پر مائل کر کے اُسے مواقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کا جائزہ لے اور اپنے آپ کو سمجھے اور جس چالاکی نے اُس پر قبضہ جما رکھا ہے اُس سے باہر نکل آئے۔ یہ باہر نکلنا ہی اس کو اپنے آپ سے بچا سکتا ہے ورنہ یہ اپنا آپ اُسے بھون کے رکھ دے گا۔

تصوف کے بارے میں لوگ اکثر دریافت کرتے ہیں۔ ورد وظیفے اور مراقبے کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں لیکن معلومات کا حصول اصل نہیں ہے۔ جب خواہش گہری ہوگی اور وابستگی پنجہ گاڑ چکی ہوگی پھر کچھ کام کے آثار پیدا ہوں گے۔

ٹینس کے کھلاڑی کو کبھی دیکھا ہے۔ان کو کھیلتے ہوئے' کھاتے ہوئے' بولتے ہوئے' ہنستے ہوئے بیان دیتے ہوئے وہ ہر رنگ میں ٹینس کھاتے ہیں' ٹینس بولتے ہیں' ٹینس ہنستے ہیں اور ٹینس اوڑھتے ہیں۔ان کے گھر کے لوگ ان کے بارے میں کبھی پریشان نہیں ہوتے کہ اس وقت وہ کہاں ہوں گے۔وہ ہر وقت کورٹ کے اندر باہر اردگرد ہی ہوتے ہیں اور آپ ان سے کبھی بھی مل سکتے ہیں۔ یہ اُسی کھیل کی قیمت ہے جو وہ ادا کرتے ہیں اور زندگی بھر کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال تصوف میں مراقبے کا ہے اور باطن کے سارے سفر کا ہے۔

کالج کے زمانے میں سینما کی کھڑکی کے سامنے قطار میں کھڑے ہو کر جب ہم تین چار دوست ٹکٹ خریدنے جاتے تھے تو اکثر ہم میں سے کسی نہ کسی کے بوٹ کے تسمے اچانک ڈھیلے ہو جاتے تھے اور وہ قطار سے نکل کر ایک طرف ہو کر تسمے باندھنے لگ جاتا تھا۔ دوسرے دوست اس کا ٹکٹ بھی خرید لیتے تھے اور یہ جتاتے نہیں تھے کہ تم کنجوس ہو' بے زر ہو' یا غریب گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ بس ایسے ہی عزت رہ جاتی تھی یا رکھ لی جاتی تھی۔

اسی طرح جب کوئی شخص اچانک غصے میں آ جائے تو آپ کو یہی سوچنا چاہیے کہ اس شخص کے تسمے اچانک کھل گئے ہیں اور اس کے اندر اُس کے کھیسے میں جیب میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے کہ وہ جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا ہے اور اس کی ساری توجہ اپنے آپ پر مرکوز ہوگئی ہے۔

محبت میں تونگری حاصل کرنے کے لیے اور انکساری کے ملک التجار بننے کے لیے آپ کو دوسروں کے ساتھ

برداشت کے ساتھ رہنا چاہئے۔

اگر ننانوے آدمی آپ کی تعریف میں اور محبت میں مبتلا ہیں تو یہ مت سمجھنا کہ سوواں آدمی بھی آپ کا ویسا ہی مداح ہے۔

اپنی ذرا سی تعریف سن کر دوستوں کو فون کرنا نہ شروع کر دیا کریں۔ لائنیں بہت ہی مصروف ہوتی ہیں کیونکہ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے یہی کہہ رہے ہوتے ہیں کہ مجھے بہت ہی پسند کیا جا رہا ہے۔

میری تائی کہا کرتی تھی کہ تم لوگوں کے منہ بند نہیں کر سکتے وہ جو چاہیں گے کہیں گے۔ پھر لوگوں کے ذہنوں پر کسی کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ صرف اپنے ذہن پر ہوتا ہے اور بیوقوف لوگ اپنے ذہن پر کنٹرول کرنے کے بجائے لوگوں کے ذہن پر طاقت آزمائی شروع کر دیتے ہیں۔
جب آپ کو یہ بات سمجھ آ گئی تو پھر آپ کو لوگوں کی تنقید اور تبصرہ کبھی بھی تکلیف نہیں دے گا۔

توجہ کا اثر اس پر ہوتا ہے جو اپنے آپ کو محتاج اثر سمجھتا ہے اور اپنے کسی کمال کا دعویدار نہ ہو۔ اسی لیے عوام پر توجہ کا اثر ہوتا ہے خواص پر نہیں۔ خواص تو خود اس بات کے دعویدار ہیں کہ دوسرے ان کے محتاج ہیں' پھر ان پر کس طرح سے اثر ہو سکتا ہے۔

تصوف کبھی بھی ہستی اور زندگی اور زیست کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ خود ہستی ہوتا ہے، خود زیست ہوتا ہے۔ یہ نہ تو علم ہے نہ ہی عمل ہے۔ یہ تو بس ہستی ہی ہستی ہے، زیست ہی زیست ہے۔ صوفی لوگ بھاشن نہیں دیتے، یہ بس گاتے ہیں، لہراتے ہیں، جھومر ڈالتے ہیں، زندگی بھاشن نہیں، زندگی لہر ہے، موج ہے، دھارا ہے۔

صوفی کہتے ہیں منہ بند کر کے رکھو، صرف باہر کا منہ ہی نہیں بلکہ اندر کا منہ بھی بند کر کے رکھو۔ پھر تم کو ملے گا اور بہت کچھ ملے گا۔ جب تم مانگتے نہیں ہو تو تم کو ملتا ہے۔ جب مانگتے ہو تو نہیں ملتا۔ بظاہر یہ ایک تضاد نظر آتا ہے لیکن زندگی کی حقیقت یہی ہے۔

باطن کے سفر کا صرف ایک راستہ ہے جو گرو کے بغیر بھی طے کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے عاجزی اور انکساری کا رویہ' عجز کا وجود اور عجز کی روح اور عجز کا ہیولا۔ اس طرح کہ تم درختوں سے چشموں سے پہاڑوں سے گھاس سے پتھروں سے گیان حاصل کر سکتے ہو۔ بادلوں سے، ہواؤں سے درس لے سکتے ہو۔ اگر آپ عاجز ہیں اور انکساری کے اندر رہتے ہیں تو

ساری دنیا آپ کو سبق دے سکتی ہے۔ ساری کائنات آپ کو رموز سے آشنا کر سکتی ہے۔

تصوف اور صوفی ازم علم کا یا آموزش کوئی سسٹم نہیں ہے۔ اس کے پاس کوئی کتابی نصاب نہیں ہے، تصوف پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس کا کوئی کورس نہیں، کورس کے نوٹس نہیں۔ اس میں استاد بھی آپ کی مدد نہیں کر سکتے کیونکہ استاد تو ہمیشہ بیان کرتے ہیں۔ وضاحت کرتے ہیں لیکن وضاحت کبھی بھی تجربہ نہیں بن سکتی۔ درزیدگی نہیں بن سکتی۔ واپرتا نہیں ہو سکتی۔ وضاحت اور علم اور بیان چونکہ تجربہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے تجربے کا بدل بن جاتا ہے اور لوگ بدل کو ہی تجربہ اور مشاہدہ اور واپرتا سمجھ کر اس میں ڈوب جاتے ہیں۔
جو لوگ جانتے نہیں ہیں وہ بہت لمبی گفتگو کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے تقابل کی کوئی چیز نہیں ہوتی جس سے موازنہ کر کے اپنی گفتگو روک سکیں۔ ان کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہوتا...... چونکہ ہم کسی کے بارے میں جبھی جان سکتے ہیں جب وہ بولے، کوئی بات کرے۔ اس لیے ہر شخص کو سوسائٹی کے اندر داخل ہونے کے لیے بولنا پڑتا ہے۔ گفتگو اس کا گیٹ پاس ہے۔ گفتگو سوسائٹی کی جان ہے۔ اس کو ہر شخص حیران کرتی رہتی ہے، متوجہ کرتی رہتی ہے۔ وہ سارا وقت تحیر میں گزارتا ہے اور دین سے شرابور ذہن کی بھی یہی شناخت ہے۔ ہر وقت تحیر میں رہنا، ہر لحظہ حیرت میں رہنا، ہر لحظہ حیرانی کے ساتھ بسر کرنا، آپ کو معصوم بناتا ہے۔ صوفی بناتا ہے، سائنس دان بناتا ہے۔

تصوف کبھی بھی ہستی اور زندگی اور زیست کے بارے میں نہیں سوچتا۔ وہ خود ہستی ہوتا ہے۔ خود زیست ہوتا ہے۔ یہ نہ تو علم ہے، نہ ہی عمل ہے۔ یہ تو بس ہستی ہی ہستی ہے، زیست ہی زیست ہے...... صوفی لوگ بھاشن نہیں دیتے، یہ بس گاتے ہیں، لہراتے ہیں، جھومر ڈالتے ہیں، زندگی بھاشن نہیں، زندگی لہر ہے، موج ہے، دھارا ہے۔

صوفی کہتے ہیں منہ بند کر کے رکھو، صرف باہر کا منہ ہی نہیں بلکہ اندر کا منہ بھی بند کر کے رکھو، پھر تم کو ملے گا اور بہت کچھ ملے گا۔ جب تم مانگتے نہیں ہو تو تم کو ملتا ہے۔ جب مانگتے ہو تو نہیں ملتا۔ بظاہر یہ ایک تضاد نظر آتا ہے لیکن زندگی کی حقیقت یہی ہے۔

تصوف کو آج کل ایک تحقیر آمیز شے سمجھا جاتا ہے لیکن تصوف کا مطلب اندھیری گپھا، دھوپ سامگری، اگر بجور اور گلاب پاشی سے نہیں، نہ ہی اس کا تعلق حاضرات سے ہے اور مجلس موکلات سے ہے۔ تصوف اور Occultism کے درمیان شدید فرق ہے۔
تصوف کی بنیادی تعلیم صرف اتنی ہے کہ حقیقت ایک ہے! اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اختیار کیے جاتے ہیں اور اس سچائی کا بلاواسطہ تجربہ حاصل کرنے کے لیے ذرائع ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ جو حقیقت ہے اور ایک ہے

اس ''ایک'' کو کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ God، خدا، کائنات اور ذہن یا خلا، یا پھر absolute۔

ہماری سائنس کے پیچ در پیچ راستوں اور طول و طویل غلام گردشوں اور نیم روشن بھول بھلیوں کا کوئی بھی دروازہ اس absolute پر نہیں کھلتا لیکن اگر کوئی ان پر پیچ راستوں اور غلام گردشوں اور بھول بھلیوں سے واقف ہے تو وہ چھلانگ مار کر باہر آسکتا ہے اور کود کر ان بھول بھلیوں سے برآمد ہو سکتا ہے اور اس absolute کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

اصل خیر یہ نہیں بیٹا کہ کسی بھوکے کو دیکھ کر ایک روپے سے اس کی مدد کر دی بلکہ اصل خیر بھوکے کو اس وقت روپیہ دینا ہے جب تم کو بھی ویسی ہی بھوک لگی ہو اور تم کو بھی اس روپے کی ویسی ہی ضرورت ہو جیسی اس کو ہے۔

اچھا اور خیر ان فعلوں کے تابع نہیں ہے جو ہم کرتے ہیں بلکہ اس کا تعلق اندر سے ہے کہ ہم ہیں کیسے؟

ایک اور قابل غور بات جو میرے مشاہدے میں آئی ہے، وہ یہ ہے کہ سالک جب اونچے مقام پر پہنچ کر باطن کے سفر میں بہت آگے نکل جاتا ہے تو اس پر الہامی کیفیت کی عبارت کا درود ہونے لگتا ہے۔ اس پر بنے بنائے فقرے اور راز اترنے لگتے ہیں اور اس کا بیان چار دانگ عالم میں مشہور ہو جاتا ہے۔ یہ بڑا مشکل مقام ہوتا ہے۔ بھگون رجنیش اور واصف صاحب کی مثالیں عین میرے سامنے کی ہیں۔ یہ لوگ ہر وقت لوگوں کی محفلیں سجا کے رکھتے ہیں اور ان کو اپنے روحانی اکھان عطا کرتے رہتے ہیں لیکن باباجی نے ایک عجیب چالاکی اختیار کر رکھی تھی۔ اکھان بیان کر جاتے تھے اور اپنے گرد مجمع نہیں لگاتے تھے۔ لوگ آتے تھے تو ان کو ڈاکٹر صاحب یا سیکرٹری صاحب کے حوالے کر کے خود چنے کی دال پکانے، چمچہ پھیرنے چلے جاتے تھے۔

اس سلسلے میں بزرگوں کے بڑے قول ہیں۔

حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازنی قشیری فرماتے ہیں کہ صوفی کی مثال برسام کی بیماری کی سی ہے کہ اس کے شروع میں ہذیان ہوتا ہے اور آخر میں سکوت! پس جب متمکن ہو جائے تو گونگا ہو جاتا ہے۔ پس صفوت کی دو تعریفیں ہیں۔ ایک وجد اور دوسرا نمود۔ نمود تو مبتدیوں کے واسطے ہے اور وجد منتہیوں کے واسطے اور وجد کی حالت میں وجد کا بیان مشکل ہوتا ہے۔ جب تک طالب علو ہمت میں ناطق ہے، نطق اہل ہمت کے لیے بکواس ہے۔ جب پہنچے پہنچ گئے، پھر بولنا کیسا! فرمایا جب موسیٰ علیہ السلام مبتدی تھے اور آپ کی تمام ہمت رویت تھی۔ اپنے ارادہ کو یوں بیان فرمایا، اے میرے پروردگار مجھے اپنا آپ دکھا۔ میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں تو یہ بیان موسیٰ علیہ السلام کا مقصود نہ پانے کی وجہ سے ہذیان تھا۔ رسول خدا منتہی تھے اور صاحب حوصلہ تھے۔ جب آپ کی شخصیت ہمت کے مقام پر پہنچی اور ہمت فنا ہوئی تو فرمایا...... بار خدایا میں تیری ثناء کا احاطہ نہیں کر سکتا اور یہ درجہ اور مقام عالی ہے۔

مخلوق خدا سے دور رہنا رہبانیت ہے۔ مخلوق کے اندر اللہ کے لیے رہا یہ پاکی ہے اور دین ہے۔

(1) تاجر، کارخانہ دار، بزنس مین جو مخلوق اللہ سے متعارف نہیں ہیں بلکہ اپنے کام سے متعارف ہیں اور اس کے سوا اور کسی کو نہیں جانتے، وہ سب راہب لوگ ہیں۔

(2) زمیندار، جاگیردار، وڈیرے، یہ سب راہب ہیں۔

(3) حکومت کے کارندے۔

(4) اہل علم۔

تصورِ شیخ' یا مرشد' گرو

مقررین

ایک صوفی تھکا ہارا جنگل میں جا رہا تھا اور چلتے چلتے وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں جنگل کے جانوروں کا اکٹھ تھا اور محفل مباحثہ گرم تھی۔ اس صوفی کو چونکہ جانوروں کی بولیوں کا علم تھا اس لیے وہ رُک کر سننے لگا۔ مباحثے کی صدارت ایک بوڑھے شیر کے سپرد تھی۔

سب سے پہلے لومڑی سٹیج پر آئی اور اس نے کہا "برادرانِ دشت سنئے اور یاد رکھئے کہ چاند سورج سے بڑا ہے اور اس سے زیادہ روشن ہے۔"

ہاتھی نے اپنی باری پر کہا "گرمیاں سردیوں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈی ہوتی ہیں۔"

جب باگھ سٹیج پر آیا تو سارے جانور اس کی خوبصورتی سے مسحور ہو گئے۔ اُس نے اپنے پیلے بدن پر سیاہ دھاریوں کو لہرا کر کہا "سنو بھائیو! دریا ہمیشہ نیچے سے اوپر کو چڑھتے ہیں۔"

صوفی نے شیر ببر سے کہا صاحب صدر! یہ سب غضب کے مقرر ہیں اور ان کی وضاحت نے اس محفل کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ سارے مقررین نے سارے ہی بیان غلط دیئے ہیں اور ہر بات الٹ کہی ہے۔ سامعین کو یا تو پتہ نہیں یا انہوں نے توجہ نہیں دی یا پھر وہ لاتعلقی سے سنتے رہے ہیں۔ ایسی احمقانہ اور غلط باتیں کرنے کی کس نے اجازت دی۔

شیر نے کہا "صوفی صاحب! یہ واقعی ایک عیب دار بات ہے اور شرمناک بات ہے لیکن ہمارے سامعین entertainment مانگتے ہیں enlightenment نہیں۔ پتہ نہیں ہم کو یہ عادت کیسے پڑی لیکن صوفی صاحب پڑ گئی ہے۔"

بابا صاحبا

مرشد کیا ہے؟ مرشد کیا کرتا ہے؟ کچھ بھی نہیں کرتا۔ کوئی کمال نہیں دکھاتا۔ وہ آپ کے اندر پیاس پیدا کرتا ہے۔ پیاس بڑھاتا ہے تاکہ آپ کل کے پانی کی طرف بڑھ سکیں۔ آپ اپنے آپ کو پہچان سکیں اور دوئی کا کنارا چھوڑ کر وحدت کے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی پیاس بجھا سکیں۔ یہ چھلانگ صرف اس وقت لگائی جا سکتی ہے جب آپ کے اندر

زف کے مقابلے میں پیاس زیادہ ہو اور پیاس نے آپ کو تڑپا کے رکھ دیا ہو۔

عبدیت

عبدیت کا کام چپراسی گیری کا سا ہے۔ جس طرح ولایتی قوموں کے چپراسیوں کی وردیاں اچھی بصورت اعلیٰ کپڑے کی ہوتی ہیں اور ان کے سینوں پر گلیکو' کوڈک' فائنرز وغیرہ کاڑھا ہوا ہوتا ہے اور وہ فخر سے ھوما کرتے ہیں کہ دیکھو کسی دیسی فرم کے ملازم نہیں ہیں اسی طرح سے اللہ کی نوکری والے گھوما کرتے ہیں۔ ماسعی بھی اسی کا نام ہے کہ اس کی نوکری میں اور اس کی اردلی میں گھومتے رہو بھاگتے رہو۔ دنیاداری کے موں کے لیے الاّ ماسعی نہیں ہے۔

وضاحت چپراسی۔ اردلی۔ بیٹ مین کی کی جائے کہ وہ کس طرح فخریہ صاحب کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔

اصول مسرت ایک سیدھا سا اصول ہے۔ جتنی خوشی تم دوسروں کے ساتھ Share کرو گے اُس سے زیادہ تم کو مل جائے گی۔ اس کا ایک یہ مطلب بھی ہے کہ جتنے تم خوش ہو گے اسی قدر دانشمند ہو گے اور پھر خوشی اتنی بڑی خوبی ہے جتنی بڑی ناخوشی "بدخوبی" ہے..... جب تم خوش ہوتے ہو تو قدرت کی چیزیں فطرت کے نظارے زیادہ روشن زیادہ حسین اور زیادہ واضح ہو کر نظر آتے ہیں۔ پھولوں کی خوشبوؤں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جھرنے زیادہ موسیقی بکھیرنے لگتے ہیں۔ خوراک کا مزا بہتر ہو جاتا ہے۔ دوست کا ہاتھ اور اس کی گرفت مضبوط نظر آنے لگتی ہے۔ تمہاری اپنی آواز زیادہ خوبصورت ہو جاتی ہے۔

اس کے مقابلے میں جب آپ ناخوش ہوتے ہیں' ناراض اور ناساز ہوتے ہیں تو ہر شے دھندلی ہو جاتی ہے۔ نہ باہر کا حسن نظر آتا ہے نہ اندر کا۔ آوازیں مدھم پڑ جاتی ہیں خوشبوئیں ماند ہو جاتی ہیں۔ بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ لس ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا اور کا اور ہو جاتا ہے۔ تم کو پتہ نہیں چلتا کہ خوف اور اکلاپا آپ کی ذات کے Blind Spots کے اندر آپ کی روح کو کیسے پژمردہ کر دیتے ہیں اور اس کی بصیرت پر موتیا اُتر آتا ہے۔

The happy day make us wise.

گرو

گرو سدھی موت ہوتا ہے۔ جو کوئی بھی مرشد کی طرف جا رہا ہے۔ اپنی موت کی طرف جا رہا ہے۔ ایسی گہری گھناؤنی اور بھسم کر دینے والی موت کو اس کے بعد کچھ بچتا ہی نہیں۔ دوسری موت میں جسم مر جاتا ہے۔ شریر فنا ہو جاتا ہے لیکن شعور رہتا ہے اور آگے جاتا ہے لیکن گرو کی موت سب کچھ لے ڈوبتی ہے۔ اس میں شعور بھی باقی نہیں رہتا' سب کچھ فنا ہو جاتا ہے' بس لافانی عنصر باقی رہ جاتا ہے۔

ہر مرید کے لیے ڈیرے پر جانا موت سے کم نہیں۔ مرشد تمہاری انا کو مار دے گا، بھسم کر دے گا۔ تم اس کو بچانے کی کوشش کرو گے۔ اس کو چوگا دے کر، بادام چھوہارے کھلا کر موٹا کرو گے، مقابلے میں لاؤ گے۔ وہ اسے مارے گا، ختم کر دے گا۔ ڈیرے پر جانے والا ہر شخص اپنی کمزور، پامال اور زخم خوردہ انا کو صحت دلوانے کے لیے آتا ہے۔ اپنی زخمی فاختہ کو ہلدی چونے لگوانے کے لیے پیر کے گھر آتا ہے اور سب طرف سے تو اس کی انا مجروح ہوگی، پامال ہوگئی۔ اب شاید تصوف میں اور بھگتی میں اور سلوک میں ہی ابھر آئے۔ شاید اسی طرح سے لوگ اسے جاننے لگیں، اس کی کلا جگ جائے۔

لیکن مرشد لمبا جال پھینک کر تم کو اس لیے نہیں پکڑتا، وہ تمہیں اپنے قریب لاتا ہے اور پھر ڈھیل دیتا ہے۔ پھر قریب لاتا ہے اور مزید قریب لاتا ہے۔ اتنا قریب کہ وہ سیوا جی کی طرح تمہارے پہلو میں پنجہ گڑھ کر تم کو افضل خان کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے اور اس بری طرح سے ختم کرتا ہے کہ تمہاری خودی اور تمہاری انا کا بیج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جلا کر خاکستر بنا دیتا ہے۔ پھر اس سے کوئی نہال امید برآمد ہونے کی توقع نہیں رہتی۔

بابا جی نور والے

لاکھوں انسانوں میں کوئی ایک صاحب نظر بنتا ہے اور ہزاروں صاحبان نظر میں سے ایک گرو تیار ہوتا ہے۔ صاحب نظر بننے کے لیے تم کو اپنے لیے اپنے آپ پر کام کرنا پڑے گا لیکن گرو بننے کے لیے تم دوسروں کے راستے کی رکاوٹیں دور کرنی ہوں گی...... اسی لیے جب گرو تمہارے راستے کی اڑچنیں دور کرنی چاہتا ہے تو تم بہت سی مشکلیں اور اڑچنیں خود اپنی راہ میں اور اکٹھی کر لیتے ہو۔

تھوڑی سی مشق کر کے تم چیزوں کی نوعیت کے بارے میں باتیں کر سکتے ہو۔ لوگوں کو قائل کر سکتے ہو۔ انہیں معقول کر سکتے ہو۔ تم ان کو خاموش کر سکتے ہو۔ انا کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہن میں رہتے ہیں، وہ اپنے خرد کے اندر گرفتار ہوتے ہیں۔ ایک گرو بڑا سمجھدار، سیانا، عقلمند اور دانشمند بابا ہوتا ہے لیکن وہ دانش کے ساتھ تم کو قائل نہیں کرتا کیونکہ دانش تمہیں آگے نہیں لے جا سکتی بلکہ کہیں بھی نہیں جا سکتی۔

مرشد اور پیر بڑی بڑی تحریکیں نہیں چلا سکتے۔ جماعتیں لے کر نہیں چل سکتے۔ وہ تو جب مشہور ہوتے ہیں اور لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگتے ہیں تو وہ چلے جاتے ہیں۔

کسی گرو کا قائل ہونا یا اس کا گرویدہ ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ انا کی اور خودی کی موت ہے۔

صوفی لوگ تدریس پر اور تعلیم پر ایمان نہیں رکھتے۔ گرو لوگ تعلیم نہیں دیا کرتے۔ کیا نہیں کرتے۔ ان کا سارا وجود ہی تعلیم ہوتا ہے۔ وہ کھڑکیاں سی کھول دیتے ہیں۔ دریچے سے بن کر بیٹھ جاتے ہیں جیسے کوئی تجریدی تصویر ہو۔

ایک معلم مردہ شے سے وہ مردہ علم عطا کرتا ہے، استاد کی ساری توجہ تدریس پر ہوتی ہے، طالب علم پر نہیں۔ اس کے لیے تعلیم اور تعلم اہم ہوتے ہیں...... لیکن ایک گرو کے لیے ایک مرشد کے لیے تدریس ایک کھلونے

سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ علم اگر نافع ہے تو درست ہے۔ اگر نافع نہیں تو غلط ہے۔ نقصان دہ ہے، خطرناک ہے۔

مرشد کے لیے انسان اہم ترین چیز ہے۔ ایک فرد، ایک بندہ، ایک آدمی...... ہجوم یا گروہ یا خلقت اہم نہیں۔ انسانیت اہم نہیں۔ بس تم اہم ہو۔ اپنی تمام تر شخصیت اور فردیت کے اندر لپٹے ہوئے، مرشد جو کچھ بھی کہتا ہے، ایک مرید کے لیے ہوتا ہے۔ ایک شخص کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا فرمان ایک چٹھی کی طرح ہوتا ہے۔ ذاتی چٹھی کی طرح۔ پرائیویٹ لیٹر کی طرح...... اس خط کو اس چٹھی کو عمومی رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ یہ سب کو پڑھائی نہیں جا سکتی۔ (فرد اہم ہے۔ اگر مسئلہ نہ ہوتا، اس کی والدہ کا اسقاط ہو گیا ہوتا)

ایک استاد ایک دانشور ایک مولوی آپ کو خدا کے بارے میں، مذہب کے بارے میں، حق اور سچ کے بارے میں طول و طویل باتیں سنا سکتا ہے۔ بڑے نکتے سمجھا سکتا ہے مگر ایک گرو ایسا نہیں کرتا۔ وہ اپنا آپ کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیتا ہے اور تم اس کے اندر سے حق کا اور سچ کا تحفہ اٹھا لیتے ہو۔

ایک گرو کو سمجھنے کے لیے تمہیں اسی کے قریب آنا پڑے گا، بہت زیادہ قریب، بے حد قریب۔ اس کے چرنوں کے اندر لیکن ایک استاد سے آپ جتنی دور رہنا چاہیں رہ سکتے ہیں۔ کوئی مشکل نہیں پڑتی، کوئی مسئلہ نہیں بنتا۔ اس میں قربت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آمنے سامنے کی احتیاج نہیں ہوتی۔ استاد کے ساتھ آپ عمر بھر مرتکب نہیں ہوتے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ایک ارتکاب ایک کومٹمنٹ بس آخری کنارہ ہے۔ اس سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ واپس ہو بھی کیسے سکتے ہو۔ ایک چالاک اور عیار ذہین دور دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی شمولیت اختیار نہیں کرتا۔ مبصر کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اوپن یونیورسٹیاں بننے لگی ہیں اور خط و کتابت کے ذریعے علم عطا کرنے کے بہت سے ادارے قائم ہو گئے ہیں۔

صوفی دل کا اور قلب کا بندہ ہوتا ہے۔ محبت کا بندہ ہوتا ہے۔ اس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ کائنات کہاں سے آئی ہے۔ اس کی ابتداء کیسے ہوئی۔ اس کو بنانے والا کون ہے۔ اس کا انجام اور اختتام کیا ہوگا...... صوفی کو سوال کرنے نہیں آتے۔ وہ سوال پوچھتا بھی نہیں۔ وہ تو بس زندہ رہنے اور زندگی بسر کرنے کے لیے آتا ہے...... جو احمق لوگ ہوتے ہیں، وہ سوال پوچھا کرتے ہیں۔ بحث کرتے ہیں۔ مکالمے کرتے ہیں۔ صوفی تو بس زندہ رہنا شروع کر دیتا ہے......

صوفی ازم کو مذہبی لوگ تباہ کر دیتے ہیں۔ نام نہاد مذہبی لوگ۔ حلاج کہتا ہے انا الحق۔ میں خدا ہوں...... تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف وہی خدا ہے۔ اس کا کہنا ہے یہ شجر بھی خدا ہے، یہ پہاڑ۔

س: سر کیا دعا خواہش نہیں؟

ج: ہے تو سہی لیکن اس کی Definition ذرا مختلف ہے کہ دعا ایک ایسی خواہش ہے جس کا رخ ہمیشہ آسمان کی طرف ہوتا ہے۔

دعا کرو تو ایسے گڑگڑا کر پکار کر کرو کہ سارا دارومدار اور انحصار خدا پر ہی نظر آئے اور کام کرو تو اس طرح کہ ہر شے

کا انحصار تمہی پر ہو۔

س: کیا دعائیں سنی بھی جاتی ہیں؟

ج: اس کا دار و مدار تمہارے ایمان پر ہے۔ جن دعاؤں کو کمزور ایمان کے ساتھ کیا جائے گا، وہ منمنی سی ہو کر ادھر ہی رہ جاتی ہیں جیسے بھٹکی ہوئی آتشبازی چلتی ہے اور جو دعائیں یقین، محکم اور ایمان مکمل کے ساتھ کی جاتی ہیں، وہ سیدھی ساتویں آسمان تک پہنچ کر اپنے ہدف سے جا ٹکراتی ہیں۔

حضور پیر ملتا کیسے ہے؟

اوئے بابا لوکا! اگر قسمت میں ہے تو پیر خود گھر آ جاتا ہے، کہیں جانا نہیں پڑتا۔ فرمایا، فرمانے والوں نے کہ ایک مردِ خدا کا آخری وقت قریب آیا تو کسی بستی میں آئے اور دیکھا کہ ایک لڑکا موجود ہے۔ تانی کی پان کر رہا ہے۔ فقیر نے اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی اور کہا، مجھ کو سرکار نے طلب فرمایا ہے تو میرا کفن دفن کر دینا۔ اتنا کہہ کر چادر تان کر لیٹ گئے اور رخصت ہوئے۔ ان کے کفن دفن کے بعد وہ لڑکا سب سے الگ تھلگ قطع تعلق کر کے بیٹھ رہا۔ اس کے وارث رونے پیٹنے لگے۔ اس نے کہا، سنو میرے بڑے بزرگو! نہ میں کہیں گیا، نہ کسی سے کچھ طلب کیا، نہ میں اس کوچہ باطن سے واقف تھا۔ خدا نے گھر بیٹھے اپنی نعمت عطا فرمائی۔ اب میں تمہارے کام کا نہیں رہا۔ نہ تم میرے مطلب کے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو...... خدا حافظ۔

اچھا حضور اگر فقیری ایسی آسان ہے تو پھر مشقت و مجاہدہ کیوں کرواتے ہیں۔ اتنی محنت سے خاک میں کیوں رولتے ہیں۔ مانجھتے کیوں ہیں۔

بابا لوکا۔ ایک شخص کے پاس تیل کے دو پیپے تھے۔

بابا لوکا! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں عرض کیا کہ تیری بارگاہ میں میرا کون سا فعل پسند ہے تاکہ میں اسے زیادہ کروں اور بار بار کروں۔ حکم ہوا کہ یہ فعل ہم کو پسند آیا ہے کہ زمانہ طفلی میں جب تمہاری ماں تم کو مارا کرتی تھی تو تم مار کھا کر بھی اسی کی طرف دوڑتے تھے اور اسی کی جھولی میں گھستے تھے۔ پس طالب خدا کو بھی یہی لازم ہے کہ گو کیسی بھی سختی ہو، کیسی بھی ذلت و خواری پیش آئے۔ ہر حال میں خدا کی طرف متوجہ رہے اور اس کے فضل کا طلبگار رہے۔

نہ کوئی ساجد نہ مسجود، نہ عابد نہ معبود، نہ آدم نہ ابلیس۔ صرف ایک ذات قدیم صفات رنگا رنگ میں جلوہ گر ہے۔ نہ اس کی ابتداء نہ انتہا۔ نہ اس کو کسی نے دیکھا نہ سمجھا۔ نہ فہم و قیاس میں آئے۔ نہ وہم و گمان میں سمائے۔ جیسا تھا ویسا ہی ہے اور جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ نہ گھٹے نہ بڑھے، نہ اترے نہ چڑھے۔ وہ ایک ہے لیکن ایک بھی نہیں کیونکہ اس کو موجودات سے الگ سمجھنا نادانی اور حد رکھتا ہے...... دنیا میں طرح طرح کے کاروبار اور رنگا رنگ اشغال موجود ہیں۔ ایسے ہی خدا جوئی اور خدا شناسی بھی ایک دھندا ہے جس کا کوئی سر پیر نہیں۔

جب شاہ منصور کو سولی پر کھینچ دیا۔ جسم کو جلا دیا۔ خاکستر کو دریا (دجلہ) میں بہا دیا تو دریا جوش میں آ گیا۔ لوگوں نے

[...]کو خبر دی۔ امام صاحب دجلہ کے کنارے آئے اور کہا، منصور ہماری بات غور سے سن۔ ہم جانتے ہیں کہ تو طریقت میں سچا [...]ن ہمارا قلم بھی اگر خلاف شرع چلا ہو تو شہر غارت کر ورنہ تجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ اسی وقت دریا کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔

سن بابا لوکا۔ فقیری ایک بات ہے کان میں کہنے کی۔ یا تو انسان ادھر تھا یا پھر ادھر ہو گیا۔ گویا کسی نے آگ میں [...] مار دی۔ نہ اس کے لیے وقت و زمانہ درکار ہے نہ عبادت و تسبیح نہ ورد و وظیفہ۔

اوئے بابا لوکا! فقیری کی نشان خاک ہونا ہے، راکھ ہونا ہے۔ جس طرح راکھ خوشبو اور بدبو دونوں کو ڈھانپ [...]ہے۔ اسی طرح فقیر بھی لوگوں کے عیب، ثواب اور نیک و بد پر نظر نہیں کرتا۔

بابا لوکا! طالب کو طلب کی راہ میں دوسری سب کیفیتیں گرد ہیں۔ ان کی کچھ حقیقت نہیں۔ اگر طالب کو کچھ [...]ل نہ ہوا اور اس راہ میں کھپت رہا ہو تو یہ ہزار مراد سے بہتر ہے کیونکہ راہ فنا میں حاصل اور حصول کیا بابو لوکا! جو قدم اس [...]ر پہ اٹھا وہی نقد وقت ہے۔

او بھائی بابو لوکا! منشا سرکاری یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہ دیکھے جیسے آنکھ سارے جہان کو دیکھتی ہے مگر اپنے [آ]پ کو نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح ناک ہر شے کی خوشبو اور بدبو سونگھتی ہے سوائے اپنے پیٹ کی بدبو کے ...... ہاں اگر فضل خدا [...]ل حال ہوا اور کوئی مرد خدا اپنے وجود کی سیر کرا دے تو سبحان اللہ...... نور اللہ۔

سن بابا لوکا! جب تک کوئلہ دہک نہیں جاتا، چٹختا ہی رہتا ہے اور دھواں دیئے جاتا ہے مگر جب آگ اس کے اندر [...]لی سرایت کر جاتی ہے اور وہ آگ بن کر دہکنے لگتا ہے تو پھر نہ دھواں دیتا ہے نہ آواز۔ اسی واسطے فرماتے ہیں کہ ابتداء [...]لی وجد کرنا نیک ہے۔ درمیان میں خوشی اور سرور لیکن آخر میں برا ہے۔ اس میں دہکنا ہی اچھا۔

عدم ہے یا کوئی کوئے صنم ہے
چلی جاتی ہے واں خلقت خدا کی

دیکھ بابا لوکا! نئی بچھرا پلٹن تیار ہو رہی ہے۔ پرانی سرکاری فوج کو پتہ بھی نہیں کہ ایک دن یہی پلٹن چٹکی بجاتے [...]ن کی جگہ چھین لے گی۔ بڈھوں کی جگہ جوان وارث بنتے ہیں۔ جوانوں کی جگہ بچوں کی بھرتی جاری ہے۔ ایک مرتا ہے [...]را اس کے منصب پر قائم ہوتا ہے۔ اگر آدمی غور کرے تو یہ نئی پود عبرت کے لیے کافی ہے۔

سن بابا لوکا! شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی" بڑے مالدار تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے خیموں کے کیلے بھی سونے کے تھے۔ آپ کے ایک دوست نے پوچھا حضور آپ تو درویش ہیں، پھر یہ سونے کے کیلے زمین میں گاڑ کر رکھے کیوں باندھتے ہیں؟ فرمایا الحمدللہ، یہ سونے کے کیلے مٹی میں ٹھونکے ہوئے ہیں دل میں نہیں۔ در گل است نہ بہ دل۔

لیکن آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند حضرت مخدوم صدر الدین نے سارا مال و دولت راہ خدا میں دے کر ختم کر دیا۔ جب کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے والد تو صاحب مال تھے، آپ نے یہ کیا کیا۔ آپ نے فرمایا، میرے والد سانپ کا منتر جانتے تھے، میں نہیں جانتا۔

ارشاد= کئی مرتبہ زندگی میں اور زندگی سے زیادہ ایمان کے اندر تضاد نظر آتا ہے...... یاد رکھو ایمان ہے،

سائنس نہیں ہے۔ ایمان ایک موسم میں آگے بڑھتا ہے، دوسرے میں پورے کا پورا پیچھے چلا جاتا ہے۔ ایک وقت میں تم نمازیں پڑھتے ہو۔ عبادت کرتے ہو، پھر ڈھیلے ہو جاتے ہو۔ آرام طلبی اختیار کر لیتے ہو،۔ جھگڑا کرنے لگتے ہو۔ حتیٰ ہو جاتے ہو۔ پھر دینے لگتے ہو، لینا ترک کر دیتے ہو۔ جس طرح نیگیٹو اور پازیٹو دونوں تاریں مل کر بجلی کا بلب روشن کرتی ہیں ایسے ہی ایمان ہے۔ اسی طاقت سے کے رخ موڑے جاتے ہیں۔ پہاڑ کاٹے جاتے ہیں۔ جب تم رکوع میں جاتے ہو اور سبحان ربی یا اعلیٰ کہتے ہو اور خدا سے اس علم کی بھیک مانگتے ہو کہ مجھے ایمان کے اندر رہ کر حرکت نصیب ہو تو پھر تمہارے سارے تضاد حق بن جاتے ہیں اور ساری تخریبیں تعمیری ہو جاتی ہیں۔

فرد

غم واندوہ۔ اضطراب Anguish

غم واندوہ ایک ذہنی ویڈیو کیسٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں جو دیکھنے والا مریض بے خیالی میں اور بے احتیاطی میں لا کر بیٹھ جاتا ہے اور تڑپتا رہتا ہے۔ جہاں ذہنی ویڈیو نہیں وہاں اضطراب نہیں۔ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اگلی مرتبہ جب اضطراب اور بے چینی کا وقت آئے زور لگا کر اس ویڈیو کو آف کر دو اور اس film کو بند کر دو اس میں چاہے آپ کو ایک سیکنڈ کی کامیابی ہو آپ دیکھیں گے کہ وہ سیکنڈ پرسکون گزر گیا اور فلم کے بند ہوتے ہی مسرت پھیل گئی۔ خوفناک فلم کے رے لوٹا بند کر دیں اور آپ ایک مختلف شخصیت بن جائیں گے۔

اچھائی اور خوبی

صحیح اچھائی اور خوبی کس طرح سے پیدا ہوتی ہے۔ اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ اچھائی اور خوبی باہر سے اچھا اور خوب بننے سے نہیں ہوتی کہ سوسائٹی اس کی تصدیق کرے۔ سوسائٹی تو صرف باہری چیزوں کو پسند کرتی ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سوسائٹی اصلیت سے نہیں لفظوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اصل خوبی ذہن کے صحیح استعمال سے حاصل ہوتی ہے اور وہ صحیح استعمال یہ ہے کہ اچھائی کے تصور کو اصل اچھائی نہ سمجھا جائے۔

جس شخص کے ذہن میں اچھے اچھے تصورات ٹھوس ٹھوس کر بھرے ہوں وہ اچھا انسان نہیں ہوتا اچھے خیالات کا خزانہ ہوتا ہے۔ جس طرح شہد سے بھری ہوئی بوتل کا کانچ میٹھا نہیں ہوتا' اسی طرح سے یہ شخص ہوتا ہے۔

اچھے خیالات کا حامل انسان اچھا نہیں ہوا کرتا کیونکہ انسان محض ایک خیالی نہیں ہے وہ تو ایک بھرپور اکائی ہے ایک کل ہے اور خیالات اس کے کل کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ صرف ایک بازو ہی پورا انسان نہیں ہے' ایک پہیہ ہی پوری موٹر نہیں ہے' اچھائی کا ٹیسٹ یہ ہے کہ پورے کا پورا انسان اچھا ہو۔ سارے کا سارا۔

خوشی

کچھ لوگ اپنی خوشی اور شادمانی کا اظہار مصنوعی قسم کے شکر سے کرتے ہیں کہ اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اچھا گھرانہ

ہے، کھانے پینے کو ہزار نعمتیں ہیں۔ مستقل آمدنی ہے۔ روشن مستقبل ہے۔ میں بڑا خوش ہوں۔

ان سے پوچھو اس نعمت اور فضل نے تمہاری ذات کو کس قدر خوشی عطا کر رکھی ہے تو وہ لاجواب ہو جائیں گے۔ جس خوشی کی بنیاد انسانی فتوحات پر ہو وہ خوشی نہیں ہوا کرتی۔

اگر یہ انسانی بنیاد کسی وجہ سے بیٹھ جائے تو ساری خوشی اور پرسنتا برباد ہو جاتی ہے۔ خوشی اور اصل خوشی کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی اور اصل خوشی کسی قسم کے حصول سے وابستہ نہیں ہوتی۔ سورج اور اس کی روشنی سورج کے حصول سے نہیں ہوتی۔ وہ تو بس ہوتا ہے اور ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔

''میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی راستہ ہے؟ اور کیا مجھے راستہ مل سکتا ہے؟''

''ضرور مل سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تلاش کرنے والے کے لیے راستہ موجود ہے۔ انسان اپنے بندی خانے کے اندر روتا اور آنسو بہاتا رہتا ہے اور اس کے پہلو میں قید کوٹھڑی کا دروازہ ہوتا ہے۔ اس کو بس اٹھ کر ذرا سا زور لگانا ہوتا ہے اور دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ آزاد ہو جاتا ہے۔

مایوسی کا خاتمہ

''میں جس شے کا خواہشمند ہوں وہ جب مجھے نہیں ملتی تو میں بڑا مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہوں۔ اس مایوسی کا کوئی علاج ہے؟''

''پہلے زندگی پر نظر کرو اور دیکھو کہ زندگی کس طرح عمل پیرا ہے۔ صرف اس کا مطالعہ کرنے سے تمہارا یہ دکھ دور ہو جائے گا کہ میری مطلوبہ شے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہ ملنے سے کیا گزرتی ہے۔''

''ذرا سوچو کہ وہ چیزیں اور وہ صورتیں اور وہ لوگ جن پر تم جان چھڑکتے تھے اور تمہارے لیے وہ بہت ہی قیمتی تھے اب وقت گزرنے پر وہ اس قدر کم قیمت کیوں ہو گئے' بے حقیقت کیوں ہو گئے۔ تمہاری نظروں سے کیوں گر گئے..... تم دیکھو گے کہ ان سب چیزوں کی قدر و قیمت صرف تمہارے ذہن میں تھی اصل میں یہ اس قدر قیمتی نہ تھے۔ اب تمہارا ذہن تبدیل ہو گیا اور یہ سب بھی ختم ہو گئے۔ اس طرح سے (تمہیں خیر یقین تو نہیں آئے گا لیکن یہ ہے حقیقت) تمہاری موجودہ خواہش ہے اس کی قدر و قیمت بھی صرف تمہارے ذہن میں ہے۔

اپنے آپ کو دیکھنے اور اپنا مطالعہ کرنے اور خودشناسی کے رویے میں تبدیلی پیدا کر لو تم زندگی کا مطالعہ کرنے میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ زندگی کا مطالعہ نئی تبدیلی سے کرو اور زندگی نئی ہو کر سامنے آئے گی۔ جب تم نئے ہو تو زندگی بھی نئی ہے دراصل تم ایک ہی ہو۔ جدا جدا نہیں ہو۔

''میں یہ مسئلہ کس طرح سے حل کروں؟''

''اس میں جانکاری پیدا کر کے۔''

''میں اپنے اندر جانکاری کیسے پیدا کروں؟''

''مسئلہ کا خوف دُور کر کے۔''

''خوف کو کس طرح سے دُور کیا جا سکتا ہے؟''

''اس کو اپنی طرف سے مصنوعی اور جھوٹی طاقت فراہم کرنا بند کر دو۔''

''میں اس کو مصنوعی اور جھوٹی قوت کیوں فراہم کرتا ہوں؟''

''وہ اس لیے کہ تم نے ابھی تک اپنی اصل قوت اور برتری کو جانا ہی نہیں ہے اسے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔''

''پھر تو مجھے خودشناسی کی ضرورت ہے۔''

''بالکل ہے..... کیونکہ تم ہی جواب ہو اور تم ہی سوال بن کر سامنے بیٹھے ہو۔''

رکاوٹ اور اس کا توڑ

مایوسی کو اپنے وجود میں کوئی مقام نہیں دینا چاہئے۔ ہم یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں اور حالات پر فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہماری پوشیدہ قوت ہماری ظاہری کمزوری سے کہیں زیادہ ہے۔ صرف ہمیں اس کا احساس نہیں ہے۔

جلدی سے متاثر ہو جانا زندگی کی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ ایک آزاد اور کھلا ذہن نہ اخباری سرخیوں سے متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی ان سے مجروح ہوتا ہے۔ ایک ظالم اور خوفناک چہرہ' منصوبے میں اچانک تبدیلی کوئی نقصان اور شامت ہمسایہ اور دھمکی دینے والا معاشرہ یہ سب بند ذہنوں پر کارگر ہوتے ہیں۔

عمل میں رُکنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان عوامی اعلان کے فریبوں اور واہموں کو حقیقت سمجھ لیتا ہے۔ سچ وہ ہے جو ''ہے'' وہ نہیں جو کروڑوں عوام سوچتے ہیں کہ یہ سچ ہے..... الفاظ اور لیبل اور سلوگن اڑ چنیں ضرور نظر آتے ہیں لیکن وہ بہت ہی کمزور ہوتے ہیں۔ اپنی ذات سے لیبلوں کو کھرچ کر پرے پھینکو پھر تم آزاد ہو۔

بنیادی اطلاع Basic information

ہر شخص اپنے پڑوسیوں سے اور اپنے اردگرد سے مختلف ہو کر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ وہ ان سے زیادہ دولتمند' زیادہ مقبول' زیادہ خوبصورت اور زیادہ پرسکون ہونا چاہتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ ان خصائص کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسی قدر وہ معمولی اور عام سا ہوتا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑوسی بھی عین یہی باتیں سوچ رہے ہیں اور اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ دنیا نقالوں کی دنیا ہے جہاں ہر شخص بے خیالی میں یہی سمجھے جاتا ہے کہ وہ دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ اس سے بہتر بھی ہے۔

اگر تم کو واقعی مختلف ہونے کا خیال ہے اور منفرد ہونے کی آرزو ہے تو ہرگز وہ نہ کرو جو تمہارے پڑوسی کر رہے

ہیں۔ ہماری بے عزتی اور شکست کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے کہ ہم ذہن کے اس خانے میں زندگی بسر کرتے ہیں جو دوسروں پر برتری حاصل کرنے کے لیے اکساتا ہے اور ہم کو کمتری کے خوف سے ڈراتا رہتا ہے۔

جب ہمارا تعلق سیدھا ''حق'' سے اور ''سچ'' سے ہے تو پھر زندگی میں ہر شے سے ہم اپنے تعلق کے حوالے سے ملیں گے۔ اس حوالے میں دوسروں سے برتر یا کمتر ہونے کی تحقیق ہی نہیں کرنا پڑتی بس اپنے حوالے سے جڑے رہنے کی بات ہوتی ہے۔

خوشی اور آنند

خوشی ایک خیال یا ایک تصور نہیں ہے۔ ایک خیال کے سامنے ہمیشہ ایک دوسرا خیال ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ناخوش اور مضمحل انسان ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف حرکت کرتا رہتا ہے۔ ایک تصور سے دوسرے تصور کی طرف بھاگتا رہتا ہے۔ خوشی صرف اسی وقت حاصل ہوگی جب وہ بھاگنا چھوڑ دے گا اور خیالوں کا پیچھا کرنا بند کردے گا۔ جب وہ اس فلسفے کو ترک کردے گا کہ خوشی کا تصور ہی خوشی ہے..... ایک آدمی جو سردیوں میں دھوپ سینک کر مزا لے رہا ہو، وہ دھوپ کی حدت کا تجزیہ نہیں کیا کرتا۔ نگھا ہو کر بیٹھا کرتا ہے۔

خالی خولی

خالی خولی زندگی اور بیکار دن اور بیکار راتیں بہت بڑی نعمت ہیں۔ یہ تم کو کسی اہم پیغام کی عبارت سنا رہی ہیں۔ اس عبارت کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ صرف تمہاری توجہ سے اس کا انعام مل سکے گا۔ بیکار زندگی کا احساس ایسے ہی ہے جیسے بدن کو سردی کا احساس ہونے لگے۔ تم فوراً گرم کپڑے پہننے کی طرف رجوع کرو گے اور اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاؤ گے۔ یہی حال بیکاری کے اور خلا کے احساس کا ہے۔ وہاں تو تم نے کپڑے پہن لیے تھے، یہاں تمہیں نفسیاتی لباس تبدیل کرنے کی ضرورت ہے اور اپنی روح کو بچانے کی ضرورت کا احساس دلایا جا رہا ہے۔ روح کا تحفظ بدن کے تحفظ سے بھی ضروری ہے۔

ندامت کا احساس

کچھ لوگ ندامت کا احساس بڑے نخرے سے کرتے ہیں۔ یہ بھی ان کی انا کا ایک مظہر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں توبہ توبہ جوانی میں بڑے گناہ کیے۔ اب بھی میں اپنے کرتوتوں سے باز نہیں آتا۔ بظاہر تو وہ افسوس کرتے نظر آئیں گے لیکن اندر سے وہ فخر کر رہے ہوں گے۔

جب انا کو سارے نپل چھڑوائے جاتے ہیں تو سب سے آخری نپل جو اس کے منہ میں رہ جاتا ہے وہ احساس ندامت کا ہوتا ہے۔ اس ندامت کے اظہار سے وہ لوگوں پر برتری کا رُعب جماتا ہے۔ جب اپنی منفی حرکتوں کا احساس

ہونے لگے تو ان کو ترک کرنا باطن کے سفر کا پہلا قدم ہے۔ ان کے اظہار کا نہیں۔

قدر و قیمت

کسی شخص سے پوچھو کہ تم زندگی میں کس چیز کو اہمیت دیتے ہو اور کس شے کی قدر و قیمت رکھتے ہو۔ اس شخص کی بھی گم ہو جائے گی اور وہ کوئی صحیح جواب نہ دے پائے گا۔ بس اسی قدر کہے گا کہ ''میں ایک اعلیٰ اور عمدہ زندگی کا خواہشمند ہوں''۔ ''میں ہنگامہ خیز اور روح پرور دنوں کا متلاشی ہوں''..... لیکن اس کا پتہ نہیں ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ہر وہ چیز جو چمکدار ہوگی ہنگامہ پرور ہوگی۔ اس کو اچھی لگے گی لیکن اس کا مطلب کچھ نہ ہوگا وجہ یہ ہے کہ اس نے جو اقدار سن سنا کر اکٹھی کر رکھی ہوں گی وہ بے قیمت ہوں گی۔ جو کچھ اس نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھا ہوگا وہ بے معنی ہوگا۔ زندگی ایک تغیر پذیر چیز ہے اور اس کا دھارا تیزی سے بہہ رہا ہے۔

جس شخص نے شہرت کا راستہ اختیار کر رکھا ہوگا وہ اس وقت بہت ہی مایوس ہوگا جب شہرت اس کی طرف رجوع نہ کرے یا پھر وہ بہت ہی نالاں ہوگا جب شہرت آ کر چلی جائے یا حسن آ کر واپس ہو جائے۔

جھوٹی اقدار کے اندر جھانک کر دیکھنا اور ان کی تلاوت کرنا بڑا ہی دلچسپ کھیل ہے۔ جو ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے وہ ان کا گہرا مطالعہ جاری رکھے۔

خوشی اور راحت

ہر اس شے پر تنقید کرنا کس قدر آسان ہے جو آپ کے تصورات اور نظریات کے خلاف ہے اور اس کو سمجھنا اور اس پر غور کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔

لفظ ''محبت'' کا ادا کرنا کس قدر آسان کام ہے اور اس کا اعلان کرنا کتنا سہل ہے لیکن یہ جاننا کتنا مشکل ہے کہ صرف لفظ ہی حقیقت نہیں صرف لفظ ہی خاصیت نہیں۔

صرف وہی کرو جو تمہیں کرنا چاہئے، وہ نہ کرو جو تمہاری خواہش ہے اور جس پر تمہارا جی راضی ہے۔ پہلے پہل اس میں دقت ہوگی اور بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن بعد میں ''جو تمہیں کرنا چاہئے'' تمہاری خواہش اور تمہاری مرضی بن جائے گا۔ بس یہی خوشی ہے اور یہی راحت کا سامان ہے۔

اگر آپ کو سچ اختیار کرنے کی خواہش ہے اور آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سچ نے آپ میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ آپ ایسے ''بھوندو'' بن گئے ہیں جو کچھ بھی ثابت کرنے کا خواہشمند نہیں ہے۔

تبدیلی

''میں اپنے آپ کو کس طرح تبدیل کر سکتا ہوں؟''

''وہ ہو کر رہو جو تم ہو۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا؟''

''بس اُسی طرح کے ہو کر رہو جس طرح کے تم بنے ہو کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ اپنے آپ کو مختلف بنا کر پیش کرنے سے آپ آزاد نہیں ہو سکیں گے بلکہ اور الجھ جائیں گے۔ جو بھیڑ بھیڑیے کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے وہ باہر سے کچھ بھی نظر آئے' اصل میں بھیڑ ہی رہتی ہے۔

''لیکن یہ جان کر کہ جو میں ہوں وہ ہوں پھر میں اپنے آپ میں انقلاب کس طرح برپا کر سکتا ہوں؟''

''اس بات پر غور کر کے کہ میں کیا ہوں اور پھر ان اختلاف پر نظر ڈال کے جو رول میں مختلف اوقات میں وقت کی سٹیج پر ادا کرتا ہوں۔ جب تم کو اس بات کا علم ہو جائے گا کہ تم کس مہنگے بھاؤ یہ بہروپ بدلتے ہو تو پھر یہ بہروپ آپ سے آپ ختم ہونے لگیں گے..... وہ سچ جو آپ کو ناگوار گزرتا ہے اس سچ کے ذریعے صحت ممکن ہے۔

ظاہر کی تبدیلی سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ آپ اپنے باہری وجود کو تبدیل کر لیں۔ لباس بدل لیں۔ ڈاڑھی رکھ لیں۔ شہر چھوڑ کر کسی اور شہر میں سکونت اختیار کر لیں۔ ملک سے چلے جائیں..... لیکن آپ کے ساتھ وہی واقعات پیش آتے رہیں گے جو اب تک آتے رہے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اندر کی تبدیلی نہیں ہو گی۔

ایک ہوائی جہاز کو جس کا انجن خراب ہو چکا ہو باہر سے پینٹ کر کے اور اس کا رنگ تبدیل کر کے آپ مائل بہ پرواز نہیں کر سکتے۔ روحانی اڑان کے لیے اندر کی تبدیلی اشد ضروری ہے۔

اگر آپ واقعی تبدیلی کے خواہاں ہیں اور اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان باتوں پر توجہ دیجیے:

1- اس نقطۂ نظر کا ہر وقت احتساب کیجیے جو آپ نے زندگی کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔
2- معاشرہ ایک آدمی کو 'دولتمند' کامیاب' اہم اور بڑا کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ سوسائٹی کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔
3- سچائی انسان کو ہمیشہ اس رُوپ میں دیکھتی ہے جس میں وہ اپنے پرائیویٹ ذہن کے اندر بسرام کرتا ہے۔
4- سچائی اس شخص کو ہمیشہ ایک خوفزدہ انسان کے رُوپ میں دیکھتی ہے جس کی شہرت اور دولتمندی اور مقبولیت اس کو اکلاپے اور وسوسے سے نہیں نکال سکتی۔

غصہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہم کوئی چیز چھپا رہے ہیں اور کسی حقیقت کو نمایاں ہونے سے روک رہے ہیں..... میں بپھر گیا اور میرے منہ سے جھاگ بہنے لگا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے ملمعے کا راز کھلنے والا ہے..... لیکن ملمعے کا ظاہر ہونا کوئی خرابی نہیں کہ اس سے خوف کو جنم دیا جائے بلکہ یہ تو ایک اعلیٰ درجے کا علاج ہے۔

صدمے سے بچاؤ

جو خرابی لوگوں میں ہے اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اگر وہ خرابی آپ میں نہیں جو بیماری ان کو لگی ہوئی ہے وہ کبھی بھی آپ کو نہیں لگ سکتی۔ اگر وہ بیماری آپ میں پہلے سے موجود نہیں..... یہاں ایک سرّی قانون عمل پیرا ہے۔ جب تک آپ جارح کی سطح پر نہیں ہوں گے آپ کو کوئی بھی مجروح نہیں کر سکتا۔ جونہی اس لیول پر آئیں گے آپ کو آسانی سے شوٹ کیا جا سکے گا..... اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو نیچے سے پتھر مارنے والے کبھی نہیں گرا سکتے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔

معصومیت

جب کوئی شخص آپ کو محکوم کرے۔ ضرب لگائے اور تحقیر کرے تو اس سے بڑی خاموشی کے ساتھ پوچھیں ''آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ آپ میری کارشناسی کریں اور میرے بارے میں کوئی فتوے دیں۔ میرے بارے میں فتوے دیتے ہوئے آپ اپنے آپ کو مجھ سے برتر سمجھنے لگے ہیں۔ آپ کو اپنی اس برتری کا وہم کہاں سے ملا؟ کس نے بتایا کہ آپ برتر ہیں۔ اب آپ اپنے بارے میں بھی بتائیں کہ آپ کون ہیں۔ کیا آپ نے اپنے بارے میں بھی ایسا کوئی حکم صادر فرمایا؟''

یہ ساری باتیں بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اور بڑے پرسکون طریق پر کہیں۔ یہ ایک اچھا سٹارٹ ہے لیکن آپ کو اس سے بھی آگے جانا ہے۔ یہاں تک تو آپ نے اپنے آپ کو آزاد کروا لیا اور یہ سمجھ لیا کہ ایک بیدار آدمی ایک خفتہ شخص سے بہتر ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ سارے خوابیدہ انسان ایسے ہی ناانصاف ہوتے ہیں' وہ دوسروں میں عیب نکال کر خود کو سربلند کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ذرا اپنا بھی اندازہ لگائیں کہ اگر آپ بھی نیند میں چل رہے ہوتے تو اس وقت کہاں ہوتے۔

جھوٹے الفاظ

الفاظ بڑے گمراہ کن ہوتے ہیں۔ ان کو سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے۔ جو شخص مریضانہ طور پر دوسروں پر حکم چلانا چاہتا ہے' دوسروں کو hurt کرنا چاہتا ہے اس کو لوگ بڑا دبنگ آدمی اور بڑا اکھڑ افسر کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ جو عورت اپنی تنہائی سے خوف کھاتی ہے اور اپنے آپ کے ساتھ رہنے سے ڈرتی ہے لوگ اس کو بڑی سوشل عورت کہہ کر پکارتے ہیں۔ اپنی ذات کے اندر گم رہنے والے آدمی کو ایک مضبوط ارادوں کا شخص تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو ذاتی فخر میں مبتلا رکھنے والی خواہش کو جرأت اور استقامت کا نام دیا جاتا ہے..... لیکن یہ سب راستے کی ٹھوکریں ہیں۔

جو شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جھوٹے الفاظ میری ترقی کی راہ میں حائل ہیں وہ آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہونے لگتا ہے اور بہت آگے نکل جاتا ہے۔

نئی زندگی

اس وقت آپ کی جو زندگی ہے یا زندگی کا ڈھانچہ ہے اسے آپ کو مکمل طور پر توڑنا پڑے گا' ختم کرنا پڑے گا کیونکہ ناکام ڈھانچہ توڑا ہی جا سکتا ہے اس کی مرمت نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس روز آپ اس ڈھانچے کو توڑنے کی کوشش کریں گے آپ کے اندر سے احتجاج اور مدافعت کی ایک لہر برآمد ہوگی اور آپ کے رگ و ریشہ میں جلوس نکالنے شروع کر دے گی۔ مخالف خیالات ہزار قسم کے بہروپ بھر کر سامنے آئیں گے کہ کیا کرتے ہو' کیوں اس بنے بنائے ڈھانچے کو تباہ کرتے ہو۔ وہ تمہارے کانوں میں سرگوشی کریں گے کہ بھائی! تم پہلے ہی ٹھیک راستے پر ہو اب کوئی نیا اور غلط راستہ اختیار کر کے کیا کرو گے۔

لیکن ڈھانچہ توڑنے سے پہلے آپ کو علم ہونا چاہئے کہ اس قسم کے protests ضرور ہوں گے۔ اپنے علم اپنی سوچ اور اپنے ارادے کے زور پر ان بے ایمانوں کے نعروں کا سدباب کرو اور اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاؤ۔

خوف اور نقصان

لوگ اکثر جو محسوس کرتے ہیں ہمیشہ اس سے الٹ بات کرتے ہیں۔ جو شخص لوگوں کو اپنے دن کی اہمیت جتا رہا ہوگا' اس کا دن بڑا پھوکا اور تھوتھا گزرا ہوگا۔

بہت سے لوگوں کے پاس دین کا اور نفسیات کا بڑا علم ہوتا ہے لیکن ان کی زندگیاں بڑی خالی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف باہر کا علم انسان کے اندر کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ظلم سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی ہر شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔ علم کے صحیح حصول کے لیے ان کو چھوڑنا ضروری ہے۔

خوف اور نقصان کے بارے میں اتنی بات سمجھ لیں کہ کسی شے کے یا شخص کے ضائع ہو جانے کے خوف کو اچھی طرح سے جانچیں۔ پھر اس پر علاج کا وہ عمل کریں جو آپ نے اب تک سیکھا ہے۔ جب نقصان ہوگا تو صرف نقصان ہوگا اس کے ساتھ خوف نہیں آئے گا۔

ذاتی تحقیق

جو شخص اپنی ذات کا کھوج لگانے کے لیے بہادری کے ساتھ اپنے اندر کود کر گہرا اُترتا ہے۔ اس کو بڑے بڑے خوفناک تجربات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ امر اس کے اندر منفی تصورات اور منفی اثرات پیدا ہونے کا ہے۔ یہ اثرات اس کو شدید جھٹکے بھی دیتے ہیں اور اسے قدم قدم پر مایوس بھی کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی میں پہلی بار دیکھتا ہے کہ کیسے کیسے اثرات نے اُسے پابند سلاسل کر رکھا تھا اور اس کا اُسے علم ہی نہیں تھا۔ یہ حیرانی اور پھر یہ مایوسی ہر اس خواص کا مقدر ہے جو اپنی تحقیق کے لیے اندر چھلانگ مارتا ہے اور تلاش میں مصروف ہوتا ہے۔

یہ بڑی اچھی خبر ہے۔ اس سے سفر طے ہونے کی نوید ملتی ہے۔ یہ ایک ایسی دوا ہے جو اپنے آپ کا سامنا کرتے وقت کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ بیماریاں کیسی بھی خوفناک کیوں نہ ہوں اپنے علاج ہی کے لیے اُبھرا اُبھر کر آگے آتی ہیں۔ یہ وہ کوتاہیاں ہوتی ہیں جو ہنر بننے کے لیے اپنے آپ کو آگے بڑھاتی ہیں..... جس طرح کسی نئے کھیل کو سیکھتے وقت بہت ہی بوجھل' بھدی اور ناقابل گرفت حرکات سرزد ہوتی ہیں جو آہستہ آہستہ پھرتی میں اور چابک دستی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

قدرتی اور نیچرل زندگی

آپ اپنی کار دس پندرہ میل پہاڑ کے اوپر لے جا سکتے ہیں لیکن آپ کو یقین ہوتا ہے کہ چوٹی پر پہنچنے کے بعد پھر اترائی ہی اترائی ہے۔ یہ یقین اس لیے ہوتا ہے کہ آپ قدرت کے رازوں سے واقف ہیں اور پہاڑ کے خراج کو سمجھتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ دنیا میں کوئی کار مسلسل اُوپر ہی اُوپر نہیں جا سکتی نہ ہی نیچے ہی نیچے جا سکتی ہے۔ یہ صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ چینی فلسفی والے اس کو yin اور yang کے نام سے پکارتا ہے۔ ہم لوگوں سے اپنی زندگی میں یہی غلطی ہوتی ہے کہ ہم alternative کے راز کو پکڑتے نہیں ہیں۔ جو شخص آگے پیچھے جاتی لہر پر سوار نہیں ہوتا وہ ایک ہی مقام پر رک کر رہ جاتا ہے (گلائیڈر جہازوں کے پائلٹ اس راز کو خوب سمجھتے ہیں) وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ پہاڑ پر اُوپر ہی اُوپر جانا زندگی ہے نیچے آنا موت ہے۔ وہ زندگی بھر ایک نفسیاتی لڑائی لڑتا رہتا ہے اور ساری زندگی مشکلات میں گزار دیتا ہے۔

ایک سمجھدار انسانی زندگی کے سفر پر نکلتا ہے تو آسان راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ بلندی پر جانے کا پروگرام بنا کر نہیں نکلتا کہ نشیب میں اترنے کے خوف سے کانپتا رہے وہ تو بس سفر پر نکلتا ہے اور راستے سے جھگڑا نہیں کرتا۔ جو جھگڑا نہیں کرتا وہ منزل پر جلد پہنچ جاتا ہے۔

"علم ہم کو آزادی کس طرح عطا کر سکتا ہے؟ علم ہمارے اندر قدرتی بہاؤ کیسے پیدا کر سکتا ہے؟"

"محض دیکھنے سے اور مشاہدہ کرنے سے!"

"کیا دیکھیں؟ کیا مشاہدہ کریں؟"

"یہ دیکھیں کہ آپ اُس شخص کے غلام ہیں جس سے آپ خوفزدہ ہیں۔"

"اُس سے آزادی حاصل ہو سکتی ہے؟"

"بالکل! کوئی شخص جب جان جائے اور اس میں جانکاری پیدا ہو جائے تو پھر وہ غلام نہیں رہتا۔"

''جو شخص بھی اپنے غلطی پر ہونے کے تکلیف وہ احساس کا انکار کرتا ہے وہ کبھی بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ جو اس تکلیف دہ احساس کو تسلیم کر لیتا ہے وہ راستی میں داخل ہو جاتا ہے۔''

عام سوچ

یہ ایک خیال خام ہے کہ ایک عمومی اور چالو سوچ کے ساتھ تم اپنے مسائل کا حل کر سکتے ہو ایک عام خیال۔ ایک پیش پا افتادہ خیال اور ایک سیکنڈ ہینڈ سوچ کے ساتھ تم کسی بھی مسئلے کا حل تلاش نہیں کر سکتے کیونکہ ایک سیکنڈ سوچ ہی خود مسئلہ ہوتی ہے۔ ایک تھکی ہوئی سوچ اور ایک ٹھنڈی سوچ سے تم کوئی بات نہیں سیکھ سکتے۔ جس طرح ایک برفانی اسکیمو آپ کو گرم ملتان کے آموں کے بارے میں کوئی علم عطا نہیں کر سکتا' اسی طرح چالو سوچ کچھ نیا اور کچھ اور نہیں بتا سکتی۔ سالہا سال تک ہم اپنے مسائل کی چار دیواری سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر نیا دن نئی دیواریں تعمیر کر کے اس چار دیواری کو اور بھی مضبوط بنا دیتا ہے۔

مسائل کے لیے بالکل نئی سوچ کی ضرورت ہے۔ ایک عادی یادداشت اور ایک عادی روّیہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے سوچ کی مہارانی کے علاوہ کسی اور شے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئی سوچ پیدا کر و اور حل ڈھونڈ لو۔

سوچ اور مسئلہ

کسی مسئلے کے بارے میں سوچنا اور کسی مسئلے کا کھلی نظروں اور واضح سوچ کے ساتھ مطالعہ کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کسی مشکل کے بارے میں سوچتے رہنے سے وہ مشکل کبھی بھی حل نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ سوچ اور مشکل دونوں ایک ہی نفسیاتی سطح کی پیداوار ہیں۔ ایک محبوس خیال اور Conditionial سوچ ہی اس مسئلے کی ماں ہے جس کے بطن سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ اسے حل کرنے کے لیے کسی اور سطح کی ضرورت ہے۔ ایک اونچی اور ارفع سطح کی! یہ اونچی اور ارفع سطح ایک کھلے ذہن میں پیدا ہوتی ہے اور کھلا ذہن وہ ہوتا ہے جو حملہ کرے اور نہ اس لیے مدافعت کرے۔

عزت نفس و توقیر ذات Self Esteem

1- عزت نفس اور توقیر ذات وہی عطا کر سکتا ہے جو فرد محترم ہستی ہے۔ ایک باعزت انسان ہے۔

2- ہم نے اپنے آپ کو باعزت نہیں بنایا۔ ہم نے اپنے آپ کو کامیاب ضرور بنایا ہے۔ کامیاب سیاستدان' کامیاب دانشور اور کامیاب وکیل صحافی وغیرہ وغیرہ۔

3- اپنی عزت نفس میں اضافہ کرنا آسان ہے۔ آپ اچھی چیزیں کریں اچھے فعل اپنائیں اچھے ارادے باندھیں اور ان کو یاد رکھیں کہ میں نے ایسے کیا تھا۔

ہم میں سے اکثر لوگ زندگی کو ریفریجریٹر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم بالکل ایسے ہی رہنا چاہتے ہیں جیسے کہ ہم ہیں۔ ہم اپنے آپ کو فریش تر و تازہ اور نو بہ نو رکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں کہ وقت گزرنے پر بھی ہماری شکل و صورت اور تازگی میں کمی نہ آنے پائے۔ ہم اپنے آپ کو ریفریجریٹر میں اس لیے رکھ کر چلتے ہیں کہ اندر سے چاہے ہم کتنے بھی پرانے اور پامال کیوں نہ ہو جائیں لیکن باہر سے ہمارا دم خم اور چمک دمک قائم رہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ زمانے کے پریشر اور اس کی چیرہ دستیاں ہم کو ناآسودہ کر دیں اور ہماری تر و تازگی نہ رہے۔ جس طرح فریج کے اندر ہر شے الگ الگ کر کے رکھی جاتی ہے اسی طرح ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہم اپنے وقت کے ریفریجریٹر میں ایک دوسرے سے دُور ہو کر رہیں تاکہ ہمارے وجود میں پامالی کے آثار پیدا نہ ہوں۔

لیکن یہ درست نہیں ہے۔ زندگی ریفریجریٹر نہیں ہے زندگی ایک ٹوسٹر کی مانند ہے۔ زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے باہر کے دباؤ کو اور بوجھ کو آپ کو ٹوسٹر کے اندر دھکیلنا چاہیئے تاکہ آپ زندگی کے تقاضے پورے کر کے چھلانگ مار کر اوپر اُبھر آئیں اور وہ سینک جس نے آپ کو توانائی بخشی ہے' آپ کے قدموں تلے سے ختم ہو جائیں۔

انسانی زندگی میں جب تک نیچے سے تھوڑی گرمی نہ ملے زندگی باسی ہو جاتی ہے۔ باسی شے کو قابل استعمال کرنے کے لیے اُسے سینک دیا جاتا ہے گرمی پہنچائی جاتی ہے اور اس کا باسی پن دُور ہو جاتا ہے۔ جب اشیاء بالکل منجمد ہو جائیں اور استعمال کے قابل نہ رہیں تو ان کو سینک دے کر گرم کیا جاتا ہے اور استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ایسے ہی انسان ہے جب تک وہ اپنے آپ کو حالات کے ٹوسٹر میں ڈال کر گرم نہیں کرے گا' وہ پھدک کر باہر نہیں آسکے گا۔ زندگی کی بھٹی سے بار بار پھدک کر باہر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ باسی نہیں رہے تر و تازہ ہیں۔ اپنے آپ کو ریفریجریٹر میں سنبھال سنبھال کر نہ رکھیں۔ زیادہ وقت گزرا تو آپ استعمال کے قابل نہیں رہیں گے۔

آپ اس گھر میں ایک مہمان کی طرح ہیں۔ زندگی نے آپ کو دعوت دے کر رقعہ بھیج کر کچھ اچھا وقت گزارنے کے لیے بلایا ہے۔ آپ کو پتہ نہیں آپ اس گھر میں کتنی دیر رہیں گے۔ لیکن جتنی دیر بھی رہیں ایک اچھے' مہذب اور شائستہ مہمان کی طرح رہیں۔ دھیرے سے چلیں۔ آہستگی سے بولیں تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔ آپ کے گھر کے ساتھ کے گھروں میں دوسرے مہمان بھی آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کا احترام بھی لازم ہے۔ جن کو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ آپ بھی یہاں قیام پذیر ہیں وہ خود آ کر معلوم کر لیں گے۔ آپ آگے بڑھ بڑھ کر ان کی ناک میں دم نہ کیے جائیں۔ جو چیز جہاں سے اٹھائی ہے وہیں واپس رکھ دیں۔ اس علاقے کو ایک ڈھیر کی صورت میں تبدیل نہ کریں' اس کی صفائی اور ستھرائی آپ کی ذمہ داری ہے۔

اگر آپ دیکھیں کہ کوئی چیز مرمت کی طلبگار ہے اس کی مرمت کروائیں۔ خواہ آپ کی ہو یا مشترکہ گروہ کی ہو۔ اس کی محبت سے دلجمعی سے مرمت کروائیں اور اس جگہ کو ایسے ہی چھوڑ کر جائیں جیسے آپ نے اس کو پایا تھا (ہمارے سمندر' پہاڑ' کھیت' جھیلیں' میدان اور ریگستان)۔

اور ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ زیادہ شکوہ و شکایت نہ کریں۔ زندگی کو احتجاجی نہ بنا لیں ہر وقت مسٹر اور مسز

شکایتی نہ بنے پھریں۔ جب آپ کو کسی مخصوص بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو اس وقت زبان کھولیں لیکن ادب کے ساتھ محبت کے ساتھ اخلاص کے ساتھ..... زندگی آپ کے لیے جو چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی کرتی ہے اس کے لیے اس کا شکریہ ضرور ادا کریں۔ دیکھئے زندگی کسی اور کو بھی اس گھر میں بلا کر مہمان رکھ سکتی تھی' مگر اس نے آپ کو اور صرف آپ کو بلا کر رکھا اور آپ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ اپنے میزبان کو مایوس نہ کریں اس کو بھی خوشیوں سے مالا مال کریں۔

اس زندگی میں کئی مرتبہ دوزخ میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ لمبا چوڑا وحشت ناک' دہکتا اور کھولتا ہوا دوزخ! تقریباً ہر شخص پر یہ وقت آ جاتا ہے۔ اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خدانخواستہ کسی پر یہ مصیبت آ جائے کہ وہ دوزخ میں پہنچ جائے تو سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ وہاں داخل ہوتے ہی وہاں سے بھاگ جائے۔ مشرق ہو یا مغرب شمال ہو یا جنوب جدھر بھی راستہ ملے سرپٹ دوڑ لگائے اور اس عذاب سے نکل جائے۔

لیکن میں نے تقریباً تمام لوگوں کی ایک عجیب عادت دیکھی ہے کہ جونہی وہ دوزخ میں داخل ہوتے ہیں وہ وہاں سے بھاگ نکلنے کے بجائے دوزخ کے فوٹو کھینچنے لگتے ہیں۔ جیسے سیاح لوگ اپنی سیاحت کے دوران نئے نئے مناظر کے فوٹو لیتے ہیں۔ اسی طرح دوزخ میں جانے والے اپنے اپنے کیمرے نکال کر دوزخ کے ''سنیپ شاٹ'' لینے لگتے ہیں اور اس تکلیف دہ ماحول میں ریلوں کی ریلیں ختم کر دیتے ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ اس عبرتناک جگہ سے بھاگیں وہاں گھوم پھر کر اس کی رنگین فوٹو گرافی شروع کر دیتے ہیں۔

پھر جب وہ واپس اپنی نارمل زندگی میں آتے ہیں تو ان کے پاس دوزخ کی ''وزٹ'' کے اتنے زیادہ البم ہوتے ہیں کہ ان سے اٹھائے نہیں جاتے اور وہ انہیں ایک ٹرالی میں ڈال کر چلتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے گھر پر آنے والے مہمانوں کو بھی دوزخ کی یہ تصویریں دکھاتے ہیں اور کسی کے ہاں مہمان جا کر بھی اپنے البموں کی ٹرالی ساتھ لے جاتے ہیں۔

تقریب چاہے کیسی ہو وہ اپنی دوزخی زندگی کا البم لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ترتیب سے بتانے لگتے ہیں کہ ان پر کیسا کیسا مشکل وقت آیا۔ زندگی نے ان پر کیسی کیسی زیادتیاں کیں۔ زمانے نے کس طرح سے بے رُخی کی۔ احباب اور رشتہ داروں نے کیسے کیسے مظالم ڈھائے۔

ہر وقت دولت کے بارے میں سوچتے رہنا: اپنی دولت کی کمی کے بارے میں دوسروں کی بڑھتی ہوئی دولت کے بارے میں۔ لٹتی ہوئی دولت کے بارے میں۔ لٹیروں کے بارے میں..... ایسی سوچ کی ساری لہریں ہم کو تخلیقی صلاحیتوں سے محروم کر دیتی ہیں اور ہماری روشن سوچ کے راستے میں اندھی چٹانیں کھڑی کر دیتی ہیں۔ دولت کے ذکر سے دولت کی گفتگو سے اور دولت سے مرعوب ہونے کے ضمن میں ہر شے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ زندگی ایک تحفہ ہے..... تم اس کے حقدار نہیں تھے اور نہ ہی یہ تمہاری وراثت تھی لیکن یہ تم کو دے دی گئی۔ عطا کر دی گئی..... تم نے زندگی حاصل کرنے کے لیے نہ تو کوئی کوشش کی نہ جدوجہد کی۔ نہ سفارش کی نہ رشوت دی لیکن یہ تم کو مل گئی۔ بے قیمت اور مفت مفت..... کوشش جتنی بھی ہے اس کا انا سے تعلق ہے۔ کوشش ہمیشہ دُکھ اور الم کو جنم دیتی ہے۔ ہر کوشش تمہارے خلاف جاتی ہے۔ ہر کوشش نے تم کو مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔ یہ تم سے

خودکشی کروا رہی ہے..... اگر اتنی بڑی' ایسی خوبصورت زندگی بغیر کوشش کے مل گئی' کسی دعوے کے بغیر مل گئی تو پھر خوشیاں بھی مل سکتی ہیں۔ محبت بھی مل سکتی ہے۔ آنند بھی مل سکتا ہے۔ ذات بھی مل سکتی ہے۔

ہماری زندگی مسلسل عذاب میں گزر رہی ہے۔ اس لیے نہیں کہ روپیہ پیسہ ہماری اہم ضرورت ہے' بلکہ ہماری زندگی اس لیے اجیرن ہو گئی ہے کہ روپیہ پیسہ اس قدر خاص اہم نہیں ہے۔ اگر دولت اور روپیہ پیسہ اس قدر اہم ہوتا تو ہماری زندگی کا ہر پہلو اس کے قبضے میں ہوتا۔ ہر زاویہ اس کے تصرف میں ہوتا لیکن یوں نہیں ہے۔ طلوعِ سحر' چاندنی رات' میٹھی نیند' ڈنٹھل پر جھومتا منڈا' اون کے گولے سے کھیلتا بلونگڑا' بیٹے کی گالوں پر لگی پھپھی' بیٹی کے کانوں میں پیتل بالیاں۔

خوف کا علاقہ

لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ''پجارو'' اور کلاشنکوف کو چہرہ کرانے کی رسم۔ امارت کا اظہار جس سے اپنے ہم وطنوں کو ڈرایا جاتا ہے۔ اس خوفزدہ اور سہمی ہوئی قوم کے اندر جب کوئی باہر کا حملہ آور داخل ہوتا ہے تو خوفزدہ قوم بالکل قدموں پر گر جاتی ہے کیونکہ حملہ آوروں کے پاس مقامی سرداروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہتھیار اور زیادہ بہتر پوزیشن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونی حملہ آوروں کا کبھی بھی پنجاب میں مقابلہ نہیں کیا گیا اور ان کو ہاتھ باندھ کر اور ہار ڈال کر آگے رخصت کر دیا گیا۔

اب بھی اگر روس افغانستان کے بجائے ہمارے یہاں آ جاتا تو ہم ہاتھ باندھ کر ماتھا ٹیک کر سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے۔

پاکستان کے لوگوں کو گھر کے لوگ ہی ڈرا کر اور دھمکا کر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی حملہ آور کو یہاں مشکل نہیں پڑ سکتی۔

میں نے اپنے آپ کو بڑے مہنگے بھاؤ خریدا ہے ڈاکٹر صاحب مجھے ذرا سنبھال کر اور ذرا سوچ کر ہاتھ لگانا۔ میری اس ذات کے پیچھے میری پوری زندگی صرف ہو گئی ہے۔ میں نے مسلسل محنت کی ہے لگاتار جدوجہد کی۔ چوبیس گھنٹے کام کیا ہے تب جا کر میں نے پینسٹھ برس کی عمر میں اپنے آپ کو پورے طور پر خریدا ہے' بلا شرکت غیرے۔ میرے پاس میری ذات کا بیع نامہ موجود ہے۔ یہ ذات کسی اور کو منتقل نہیں ہو سکتی۔ یہ میری ہے اور میری رہے گی۔ میرے بچے ہر وقت اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ میری ذات کا مختار نامہ حاصل کر لیں اور مجھے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کریں لیکن میں ایسا ہونے نہیں دیتا۔ میں کبھی بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میری اولاد نیک اور سعادت مند ہے لیکن میں اپنی ملکیت کو کسی بھی صورت میں ان کے حوالے نہیں کر سکتا۔ یہ میں نے بڑی محنت سے بنائی ہے۔ میں خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ ہوں اور اس وقت میں شخصیات کی منڈی میں اپنی ساکھ کی دکان پر بیٹھا ہوں۔ یہ سب میری محنت اور جان ماری کی وجہ سے ہے کہ دُور دراز کے لوگ' غیر ملکی تاجر' دوسرے صوبوں کے بیوپاری اور حکمران شخصیتیں میری دکان پر آتی ہیں اور مجھ سے میرا سودا کرتی ہیں کہ وہاں سوائے میری ذات کے اور کوئی سودا ہی نہیں کوئی سامان ہی نہیں۔ وہاں صرف میری ذات کی منڈی

چلتی ہے اور یہ منڈی جناب ایسے ہی نہیں بن گئی۔ اس کے لیے میں نے بڑی محنت کی ہے۔ بڑا زور لگایا ہے بڑا پسینہ بہایا ہے۔ یہ خودرو گھاس نہیں ہے۔ آسمانوں سے اترنے والی شبنم نہیں ہے اس پر بڑے سال لگے ہیں بڑے رتجگے صرف ہوئے ہیں۔ بڑے پسینے ٹپکے ہیں۔

.....لیکن جو شخص اپنی شخصیت کا مالک ہوتا ہے' جس کی ذات اس کی ملکیت ہوتی ہے وہ اپنی ذات اپنے ساتھ لے جاتا ہے اسی لیے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص اپنے پیچھے خلا چھوڑ گیا یعنی وہ اپنی ذات اپنے ساتھ لے گیا۔ ایسا شخص اس بات کا خواہشمند بھی نہیں ہوتا کہ اس کا چھوڑا ہوا خلا پُر ہو جائے۔ اس نے محنت کر کے اپنی ذات کو بنایا تھا۔ دوسرے بھی محنت کر کے اپنی ذات بنائیں۔ کوشش کریں جدوجہد کریں۔ اپنی ذات کو طاقتور بنائیں اور پھر جاتے ہوئے اپنی ذات کو ساتھ لے جائیں.....وہ بھی ایک خلا چھوڑ جائیں.....جن لوگوں نے اپنی ذات کو اپنی پراپرٹی نہیں سمجھا وہ اُسے یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ اپنی زندگی میں بھی اُن کی ذات ان کے مصرف کی نہیں ہوتی بعد میں بھی اُن کے کسی کام نہیں آتی۔ کیا وجہ؟ وجہ یہ کہ انہوں نے اپنی ذات محنت کوشش اور جدوجہد کر کے حاصل نہیں کی ہوتی بلکہ یہ ایک عطا کی صورت میں ایک گفٹ کی صورت میں انہیں ملی ہوتی ہے اور عطا کا بنیادی فریم ورک یہ ہے کہ اس سے معطی کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

جرأت (Courage)

جرأت بھی' دلسوزی شفقت اور رحم دلی کی طرح انسانی معراج کا ایک زینہ ہے۔ آج تک کوئی بھی جرأت اور بہادری کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکا۔

جرأت اُس تین منزلہ مکان گیٹ اور facade کا نام ہے جس کے اندر انسان بستا ہے۔ انسانی وجود کے مکان کے تین حصے ہیں: (1) ایک جسمانی حصہ (2) ایک ذہنی حصہ اور (3) ایک روحانی حصہ۔ ان تینوں حصوں یا منزلوں کا ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان کی زندگی کا آگے بڑھنا اور اس کا نشوونما پانا ناممکن ہے۔

جرأت آپ سے تقاضا کرتی ہے کہ آپ اپنے اور دوسروں کے حقوق کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ان حصوں کو منوانے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔

جرأت آپ کو مجبور کرتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو' اپنے معاشرے کو اور اپنے ملک کو تعمیر کرنے کے لیے سختی اور شقاوت کے بجائے محبت اور شفقت سے کام لیں۔ تشکیک کے بجائے ایمان اور اوسان کے اندر زندہ رہیں۔ مایوسی کے مقابلے میں امید کے سہارے۔ مشکلات کے نیچے دبنے کے بجائے ان پر حاوی ہو کر خود اعتمادی کی جرأت پیدا کریں۔ غلطیاں تسلیم کرنے کی جرأت اور اپنے آپ کو perfect نہ پا کر رونے بسورنے سے احتراز۔

یہ ہیں صحیح جرأت کے مظاہر..... باوجود اس کے کہ آپ اپنے اندر ایک جزیرہ ہیں لیکن یہ جزیرہ انسانوں کی دنیا میں آباد ہے اور انسانوں کے درمیان زندہ ہے۔

[خ]وشی

کوئی شخص جو خوشی اور مسرت کے حصول کے لیے ہر گھڑی کوشاں ہو اور جو ہر وقت اس خیال میں ڈوبا رہے کہ [خو]شی کس طرح سے حاصل کی جائے' خوشی سے دُور رہتا ہے.....اس کی خوشی کے حصول میں یہی فکر پیہم کہ خوشی کیسے حاصل کی [جا]ئے۔ یہی وسواس ہر دم حائل رہتا ہے۔

خوشی کوئی خالی خولی تصور نہیں ہے۔ کوئی آئیڈیا نہیں ہے..... آئیڈیا ہمیشہ دوسرے آئیڈیا کے مقابلے میں کھڑا [ہوتا] ہے یا وہ جیت رہا ہوتا ہے یا اس کے سامنے ہار رہا ہوتا ہے۔ انسان ایک خیال سے دوسرے خیال کی طرف منتقل ہوتا [رہتا] ہے.....اور خوشی صرف اسی صورت میں صحن خانہ میں اترتی ہے جب وہ شخص خیالوں کا اور آئیڈیوں کا تعاقب کرنا چھوڑ [دیت]ے۔ جب اُس کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ خوشی اور خوشی کا ذکر ایک ہی بات نہیں ہے۔ تو وہ شخص سردیوں میں [...] دھوپ کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ سورج کا تجزیہ کیے بغیر یوں کیا کرتا ہے۔

[آ]ج کا دن کمال کا دن ہے

ایمان اور یقین کیا بات ہے۔ ہر شخص کو آج کے اندر داخل ہونے کی دعوت ہے۔ ہم سب حال کے اندر بیٹھے [مز]ے لے رہے ہیں۔ نہ ماضی کی یاد ہے نہ مستقبل کا خوف۔ آج کے اندر رہنا اور آج میں داخل ہونا صاحب حال ہونا [ہے]۔ ماضی مستقبل کو چھوڑ کر عطا کردہ حال میں رہنا۔ کچھ لوگ مستقبل کے بارے میں فکر کر کر کے اپنے حال کو تباہ کر لیتے [ہیں]۔ کچھ ماضی کو یاد کر کر کے حال سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ پھر چند سال اسی حال کو یاد کرنے لگ جاتے ہیں۔

آج پھول کھلے ہیں اور بڑے کمال اور بڑے رنگ کے کھلے ہیں۔ ان کا نظارہ کریں، آپ کے نظارے کے [لیے] کھلائے گئے ہیں۔

آج پرندے چہچہا رہے ہیں۔ آپ کے لیے گیت گا رہے ہیں۔ آپ کو ان کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی کہ آپ [بڑ]ے شور کو سننے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

آج بہت سے لوگ مدد کے لیے پکار رہے ہیں، ان کی مدد نہ کریں۔ ان کی بات ہی نہ سنیں۔

کیا آپ کو پتہ ہے آج کا دن وہی دن ہے جس کا آپ کل خواب دیکھ رہے تھے۔ لو جناب آ گیا ہے۔ اس [کے] ساتھ کچھ اچھی بات کریں۔

(یاد رہے یہ میں اپنی نظم کھڑیا ونیا میں بھی آپ عرض کر چکا ہوں کہ حال میں رہنے والا ہی اس عمل سے گزر سکتا ہے۔)

[دو]ستی

اگر میں تمہارا دوست ہوں اور تم میرے دوست ہو تو یہ ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے کہ ہم نے دنیا کے بڑے

بڑے مشہور، لائق، فائق، اعلیٰ درجے کے لوگوں کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو پسند کیا! کیا پاکیزہ رشتہ باندھا، واہ واہ۔

دوستی کا رشتہ عمر بھر چلتا ہے۔ جوان ہوئے تو شادی ہو گئی۔ بہن بھائی، گھر محلہ شہر چھوٹ گیا۔ بوڑھے ہوئے تو اولاد چھوڑ گئی لیکن دوستی میں یہ تبدیلی نہیں آتی۔ (شاید اس وجہ سے کہ دوستی ایک ہی age bracket میں ہوتی ہے۔)

دوستی کا رشتہ بے لوث ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ روحانی ہوتا ہے اور رشتوں میں تو کچھ جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنا پڑتا ہے، کچھ پیٹ کی ضرورتوں کو مگر یہاں صرف روح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا تقاضا ہوتا ہے۔ روحیں ایک دوسری کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتی ہیں اور جسمانی یا بدنی تقاضا ایک بھی نہیں ہوتا۔

والدین بچپن کے وقت ملتے ہیں۔ بیوی یا شوہر جوانی کی عمر میں ملتے ہیں۔ بچے شادی کے بعد کی عمر میں نصیب ہوتے ہیں۔ بہن بھائی لڑکپن میں دستیاب ہوتے ہیں لیکن دوستی کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔ آپ آٹھ کے ہوں یا اسی کے۔ نو کے ہوں یا نوے کے۔ سولہ کے ہوں یا ساٹھ کے، آپ دوست بن سکتے ہیں، دوستی کر سکتے ہیں۔

دیکھو مجھے نظر تو نہیں آتا لیکن میرا ایمان ہے کہ اس کمرے میں ریڈیو کی لہریں بھری پڑی ہیں۔ ٹی وی کی لہریں ناچ رہی ہیں اور میں ریڈیو پر یا ٹی وی پر اپنی پسند کا سگنل پکڑ سکتا ہوں۔ اسی طرح سے میرا ایمان ہے کہ یہاں خدا کی آواز اور خدا کے احکام موجود ہیں اور میں اپنی ذات کے ریڈیو پر ان سگنلوں کو پکڑ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے مجھے اپنی ذات کو ٹیون کرنا پڑے گا اور ایمان کیا ہے؟ خدا کے خوابوں کو اپنے خواب میں دیکھنا۔

ایمان کیا ہے؟ ایک اختیار ہے choice ہے، کوئی مباحثہ یا مکالمہ نہیں۔ یہ ایک فیصلہ ہے، مباحثہ نہیں ہے۔ یہ ایک Committment ہے کوئی زبردستی نہیں ہے۔ یہ تمہارے دل کے خزانوں کو بھرتا ہے اور تمہاری ذات کو مالا مال کرتا رہتا ہے۔

خدشات + بے یقینی

1868ء میں دنیا کے تمام اخباروں نے بھر کے ایڈیٹوریل لکھے کہ یہ جو ''ٹیلی فون'' کی پر لطف اور مسحور کن خبر اڑی ہے، یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ کس طرح سے ممکن ہو سکتا ہے کہ آدمی گھر بیٹھے بٹھائے کسی دوسرے سے بات کر لے۔ خاص طور پر اس وقت جب دوسرا دو تین میل کی دوری پر موجود ہے۔ یہ سب چالاکی ہے اور Trick ہے اور قارئین کرام کو محتاط رہنا چاہیے کہ وہ ٹیلی فون لگوانے کے لیے نوسربازوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں جو انہیں ان کے پیاروں سے بات کرانے کا بہانہ کر کے ان سے رقم اینٹھ کر لے جائیں گے اور بات ساری زندگی نہیں ہو سکے گی کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں اور دنیا میں ایسا آلہ بن ہی نہیں سکتا۔

جب wright برادرز نے کامیابی کے ساتھ اپنا جہاز اڑا لیا اور پانچ برس تک بار بار اڑا کر دکھاتے رہے تو ہر وقیع پرچے نے ان کا احوال اور اس پرواز کی تفصیلات شائع کرنے سے انکار کر دیا کہ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا اور یہ سائنسی طور پر ممکن نہیں۔ اصل میں بات یہ تھی کہ ماہر سائنس دان نے ریاضیاتی عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہوا سے بھاری مشینیں

کسی بھی صورت میں ہوا میں پرواز نہیں کر سکتیں۔

اٹھارہویں صدی کے معروف فرانسیسی سائنسدان موسیو نے اعلان کیا کہ شہاب ثاقب کوئی شے نہیں ہیں اور کسی بھی صورت میں موجود نہیں۔ اس نے کہا آسمانوں سے پتھروں کا گرنا ایک انہونی اور ناممکن سی بات ہے کیونکہ آسمانوں میں کوئی چٹانیں نہیں ہیں جن سے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں۔

1914ء سے پہلے فرانسیسی فوج کے جرنیلوں نے طویل مطالعے کے بعد یہ قول فیصل دیا کہ ہوائی جہاز دشمن کی پوزیشنوں کا مطالعہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس سے ماورا اور کسی کام کے نہیں۔ انہیں کسی فوجی کام کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ جب پیرس کی اکیڈمی اور سائنس میں پہلی مرتبہ گراموفون کا توا بجا کر سنایا گیا تو اکیڈمی کے ڈائریکٹر نے ریکارڈ بجانے والے کا گلہ پکڑ کر گھونٹ دیا کہ تم مکاری کے ساتھ آواز نکال رہے ہو اور پتہ نہیں چلنے دیتے ہو۔ جیسے جیسے اس کا گلا گھٹتا گیا اور اس کی آنکھیں باہر ابلتی رہیں، ریکارڈ کا گانا اور اونچا ہو کر مزے سے چلتا رہا۔

فکر

کسی نے کہا ہے کہ اگر ہم فکرمند نہیں ہوں گے تو بھوکے مریں گے اور دارالامان میں جا کر زندگی بسر کریں گے اور اگر ہم فکر کرتے رہیں گے تو پاگل خانے میں جا کر فوت ہوں گے۔

زندگی ان دنوں اس قدر مشکل ہو گئی ہے کہ ہمیں ڈھنگ سے فکر کرنا بھی نہیں آتا۔

1۔ ہم بھارتی حملہ آوروں کی فکر کرتے رہیں گے اور اپنے پڑوسی کی کار کے نیچے آ کر دب کے مر جائیں گے۔

2۔ ہم ریڈیو ایکٹو فال آؤٹ کی فکر کرتے مر جائیں گے اور تمباکو کے زہر نکوٹین سے فوت ہو جائیں گے۔

3۔ ہم ہوائی جہاز کے کریش سے خوفزدہ رہیں گے اور سیڑھی سے گر کر فوت ہو جائیں گے۔

4۔ ہم ایکسرسائز کے نہ ہونے کی شکایت کرتے رہیں گے اور ڈاک کے ڈبے میں چٹھی ڈالنے کے لیے گیراج سے موٹر نکال لیں گے۔

تو عرض یہ ہے کہ ہم فکرمندی کے فن سے بھی ناآشنا ہو گئے ہیں اور ہم صحیح فکر کرنا بھول گئے ہیں۔ فکر کرنا ایک اچھی بات ہے اور اس سے بہت سے کام سنور جاتے ہیں۔ بچے پل جاتے ہیں، گھر چلتے ہیں، دفتر کا نظام قائم ہوتا ہے۔ بزرگوں کی نگہداشت ہوتی ہے۔ فکرمندی ایک صحت مندانہ اقدام ہے۔ یہ کام کرنے میں Motivate کرتی ہے۔

سب سے ضروری فکر اپنی روح کی ہونی چاہیے اور سب سے اہم فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنا ابد کہاں گزار رہے ہیں اور کیسا گزار رہے ہیں۔ یہ سوچنا ہے کہ اگر ہم کو ساری دنیا کی دولت مل جائے اور روح میں گھاٹا پڑ جائے تو پھر یہ کیسا سودا ہے!

بھلا انسان ضرورت سے زیادہ Worry کیوں کرتا ہے اور اس کے کیا نقصانات ہوتے ہیں تو عرض یہ ہے کہ:

1۔ فکرمندی اور اندیشہ ناکی اس وقت شروع ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ وہ سمجھتے

ہیں کہ اب ہر شے کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے اور ہم ہر فعل کے ذمہ دار ہیں۔ جب بھی انسان خدا کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے، وہ چبا ہو جاتا ہے۔

2- ضرورت سے زیادہ عمل دہریت کا نتیجہ ہے اور خدا سے دوری کی وجہ سے ہوئی ہے۔ جیسے کوئی خدا ہی نہ ہوا

ایک مرتبہ ایک صاحب بہت ہی پریشان تھے اور گھبراتے پھرتے تھے تو ان کی بیوی نے پوچھا "کیا بات ہے نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نصیب دشمناں فوت تو نہیں ہو گئے؟"

3- اس Worry کے وجود میں آنے کی وجہ ایک چھوٹا سا لفظ "اگر" ہوتی ہے۔ اگر یہ ہو گیا، اگر وہ ہو گیا، اگر میں مر گیا، اگر وہ نہ آیا، اگر وہ آ گیا وغیرہ وغیرہ۔

رومیوں نے یونانیوں کو لکھا کہ اگر ہم تمہارے علاقے میں آ گئے تو ہم تمہارے علاقے کو جلا کر خاکستر کر دیں گے اور سطح زمین سے ملا دیں گے۔ یونانیوں نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے لیکن...... اگر!"

ہمارے ڈاک خانے میں میر صاحب پوسٹ ماسٹر تھے جو ان اندیشوں اور فکر مندیوں کی ڈائری لکھتے رہتے تھے جن سے وہ خوفزدہ رہتے تھے۔ سال بعد جب وہ اپنی ڈائری دیکھتے تو ان ہزار ہا فکروں اور اندیشوں میں سے ایک آدھ ہی صورت پذیر ہوا کرتا۔

اس نے کہا، جب بادل اُمڈ گھمڈ کر آئیں اور تیز ہوائیں چلیں تو میں سوتا ہوں اور جی بھر کے سوتا ہوں۔ مجھے اپنے یہاں ملازمت دے دیجئے۔ زمیندار نے تجسس کے طور پر اسے نوکری دے دی اور ایک روز جب تیز ہوائیں چلیں اور ساون کی گھٹائیں آئیں تو زمیندار کو اپنا ملازم نظر نہ آیا۔ اس نے دیکھا، باڑے کا پھاٹک بند ہے اور اس کا ارل لگا ہے۔ بھوسے پر ترپال ڈال کر اس کے کنارے پتھروں سے دبائے ہوئے ہیں۔ مرغیوں کی ٹوٹی ہوئی چھت پر پرانا دروازہ ڈلا ہوا ہے اور ملازم اپنی کوٹھڑی میں گھوک سو رہا ہے۔ اس نے کہا، واہ بھئی شاباش سنت پوری کر دی اور اونٹ کا زانو احتیاط سے باندھ دیا۔

تائی پیدھو نے کہا، میں جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ چار بچوں کا بوجھ نہ کام نہ کار۔ میں نے دو روپے کے کاغذ پر اللہ سے شراکت نامہ کر لیا کہ کام میں کرتی جاؤں گی، فکر میری جگہ تو کرتے جانا۔ اس نے رضامندی کر لی۔ جب سے اب تک ہمارا شراکت کا کاروبار بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے میں ضرور یہ دعا کرتا ہوں "یا اللہ دن میں نے پورا زور لگا کر تیری مرضی کے مطابق گزار دیا۔ اب میں سونے لگا ہوں۔ رات کی شفٹ تو سنبھال لے۔"

جب ہم ایسا کچھ کرتے ہیں کہ ہمارا اندر بتاتا ہے کہ یہ گناہ ہے تو ہم اپنی عزت نفس سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پھر اپنے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ (رشوت، بددیانتی، حرص وغیرہ) پھر ہم ندامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ ضمیر ہر وقت ملامت کرتا ہے۔ بے خواب راتیں بستر ہوتی ہیں۔

اب ہم یا تو اس کو بھول جائیں یا ان کو دماغ سے نکال دیں لیکن دونوں ہی کام مشکل ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک فعل ندامت پشیمانی اور توبہ ہے۔ جب ہم اپنے خدا کے سامنے توبہ کرتے ہیں تو نہ صرف ہماری توبہ قبول ہو جاتی ہے بلکہ ہم بھی قبول ہو جاتے ہیں۔ پھر زندگی آسان ہو جاتی ہے۔

سوئی: عقلمندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ انسان خدا کے تصور کو شعوری طور پر ٹھیک طرح سے سمجھ لے ایسا نہ ہوا تو پھر کوئی اور شے خدا بن کر اپنی پوجا کروانے لگے گی۔

زندگی میں کبھی ہمدردی کے طلبگار نہ ہونا، خوش رہنا، کلیلیں بھرنا اور تم کو محبت ملے گی...... ہمدردی کے طالب کو کبھی بھی نہیں محبت نہیں ملتی۔ ہمدردی تمہارے خزانے کو کبھی بھی نہیں بھر سکتی۔

رواں دواں رو کے برخلاف جانے کا نام ہے۔ ہماری ہر قسم کی Conditionling کے خلاف جانے کا نام۔ ہم کیسے کھاتے ہیں، ہم کیسے کرتے ہیں، کیسے بولتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں؟

انسان کیا ہے۔ دیکھنے کو تو دوسرے جانوروں جیسا ایک جانور ہے لیکن اس کو ذہن اور شعور کی دولت عطا ہوئی ہے اور اس دولت نے اسے جانوروں سے الگ کر دیا ہے۔

اب اس کو سچ، حق، جمال اور خوب کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کا شعور ان کو Face کرتا ہے اور اپناتا ہے۔ وہ اخلاق کا اور اخلاقی اصولوں کا پابند ہو جاتا ہے اور جب تک انسان ان چیزوں کا پابند ہے، وہ انسان ہے۔ جب ان سے باہر نکل جاتا ہے تو پھر حیوان ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں لندن میں تھا اور وہاں Soccor کے دیوانہ وار مقابلے ہوتے تھے تو ایک جادو قدم کھلاڑی نارمن تھا جس کے آگے نہ بال رکتا تھا نہ کوئی کھلاڑی ٹھہرتا تھا۔

وہ جب بھی کھیلتا اس کا والد ضرور آ کر تماشائیوں میں بیٹھتا اور اپنے بیٹے کا کھیل دیکھتا اور بیٹا بھی اپنے باپ کو اپنا کھیل دکھانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا اور پھر یوں ہوا کہ اس کا باپ فوت ہو گیا اور نارمن بجھ گیا۔ اس کے کھیل میں وہ قوت اور تیزی نہ رہی۔

ایک روز اس نے کہا، کوچ باوجود اس کے کہ میرا باپ اس دنیا میں نہیں ہے، میں اس کے لیے کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ کوچ نے کہا، بہت خوب ہم اس کی مخصوص کرسی خالی رکھیں گے۔ بس پھر اس روز جو کھیل نارمن کھیلا، اس کی مثال سوکر کی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ پانچ ہزار تماشائیوں کی تالیوں کی گونج میں کھیل کا میدان لرزتا رہا، گونجتا رہا، پکارتا رہا، نعرے مارتا رہا۔

گیم جیت کر جب نارمن ڈریسنگ روم میں گیا تو اس نے کوچ کو بتایا کہ آج کا کھیل میں نے اپنے باپ کے لیے کھیلا۔ جب تک وہ زندہ رہا، اس نے عمر بھر ایک مرتبہ بھی میرے کھیل کو مِس نہیں کیا، باقاعدگی سے آتا رہا اور میرا کھیل ملاحظہ کرتا رہا لیکن اس نے عمر بھر مجھے ایک مرتبہ بھی کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ میرا والد اندھا تھا۔ آج مجھے یقین ہے کہ جب وہ اس دنیا میں نہیں ہے، اس نے میرا کھیل ضرور دیکھا ہوگا۔

میرا خیال ہے، ہم زندگی کی سٹیج پر جو پرفارمنس دیتے ہیں، اللہ اسے فرنٹ رو میں بیٹھ کر ملاحظہ فرماتا ہے۔ جب ہم سے کوئی کمال سرزد ہوتا ہے تو وہ فرماتا ہے، یہ ہے میرا بندہ جس پر شیطان کا اغوا ممکن نہیں۔

ایک بات یاد رکھو کہ امیر ہونا کوئی گناہ نہیں ہے۔ بالکل نہیں، ہرگز نہیں، البتہ کشادہ دل اور فیاض نہ ہونا گناہ ضرور ہے۔

فرد اور ارتقاء

زیرک اور سریع الانتقال ذہن

ایک زیرک اور چابک ذہن خودگر اور نامتحرک نہیں ہوتا۔ میرا مطلب ہے کہ متوجہ بہ نفس خود نہیں ہوتا۔ ایسا ذہن کسی نئی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے یہ سوچنے نہیں بیٹھ جاتا کہ پیش نظر احوال مفید ہیں یا مضر۔ وہ متفکر خیالات میں گھر گھومنے نہیں لگتا بلکہ عمل میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایک مایوس و پریشان و دردمند انسان سے ملتے وقت وہ عقلمندی سے اور زیرکی سے کام لیتا ہے اور اس غم میں اور اس کرب میں ڈوب کر مفلوج نہیں ہو جاتا۔ اسے اگر ایک کرسی کی ضرورت ہے تو وہ ضرورت کے مطابق ایک کرسی خرید لیتا ہے جس کی قیمت کا وہ آسانی کے ساتھ متحمل ہے' وہ کوئی اعلیٰ درجے کی نمائشی کرسی کے حصول میں مبتلا نہیں ہوتا اور اس کے نہ حاصل کرنے پر ملول نہیں ہوتا۔ جب اسے کسی نئے چیلنج کا سامنا ہوتا ہے تو وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس میں داخل ہوتا ہے اور اس کے محل وقوع کا جائزہ لیتا ہے اور پھر باہر نکل آتا ہے۔ صحیح سلامت' پرسکون' زخمی یا پھٹڑ ہو کر باہر نہیں نکلتا' زخمی اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ چیلنج سے خوفزدہ نہیں تھا۔ اس کو آزما کے دیکھ لیں سو فیصد درست ہوگا کیونکہ خود آزمائی سے بہتر اور کوئی آزمائش نہیں۔ جس نے خود انور رٹول کھا کر دیکھ لیا وہ کسی سے نہیں پوچھے گا کہ اس کا مزا کیسا تھا یا اس کی خوشبو کس قسم کی تھی۔

اچھے دن آئیں گے

کچھ لوگ اچھے دنوں کے انتظار میں ساری زندگی گزار دیتے ہیں لیکن ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ وقت کے ایک غلط حصے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ حال کو چھوڑ کر کسی اور وقت سے لگ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن خوشی اور آنند کا وقت سے کوئی تعلق نہیں۔ روح کی دنیا میں کوئی گھنٹہ گھر نہیں ہے۔ خجالت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آگے بڑھ کر لینے اور مانگنے میں ہی سارا راز پوشیدہ ہے۔ حق اور سچ کو ایک ذریعہ بنا کر کوئی معمولی شے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی عظیم مصور چغتائی سے یہ توقع کرنے لگے کہ وہ اس کا دروازہ پینٹ کر دے گا' ایسے نہیں ہے..... حق اور سچ کو ایک بڑا ذریعہ مان کر سارے معاملات کی جاگرتی کا سامان بہم کرو۔ اس کو ساری زندگی پر پھیلا دو تا کہ اندر کے چھوٹے چھوٹے سبب خود ہی معدوم ہو جائیں۔

ہشیار اور تیار

ہر دم حاضر اور ہشیار رہو اور اپنے آپ پر نگہ رکھو۔ آپ پر جو گزرتی ہے اس پر نگہ رکھو اور دیکھو کہ آپ کہاں تھے اور آپ کو کہاں ہونا چاہئے تھا جس وقت یہ بات گزری۔ سوسائٹی کی باتوں' اس کی شاباشیوں اور نکتہ چینیوں پر کڑی نظر رکھو۔ ذرا دیکھو کہ ایک نئے کھیل میں کود پڑنے کی دعوت پر تم نے کس گرمجوشی سے عمل کیا اور پھر کیا نتیجہ بھگتا..... گھر پر رہو اور اپنے ساتھ رہو!

دلچسپ لو

کبھی تم نے انہماک اور دلچسپی کا مطالعہ کیا۔ بڑی توجہ طلب چیز ہے یہ دلچسپ بھی۔ آپ کو سفر سے دلچسپی ہو تو کیا کیا پروگرام بناتے ہیں اور پھر کیسے کیسے عمل کرتے ہیں۔ نئی کار خریدنا ہو تو اپنا آپ بیچ کر اسے خرید کے رہتے ہیں..... اسی طرح روحانیت اور سرّی رمز میں بھی دلچسپی لیں اور جی بھر کے لیں۔ اس کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں۔ یہ خوب پھلے پھولے گا۔ اس سے صحت مندانہ خوشیوں کا نزول ہوگا۔ لیکن فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

Spinoza کو ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں ایک اونچے مرتبے کی آفر کی گئی۔ اس نے انکار کر دیا کہ ذاتی مطالعہ ذاتی انہماک پبلک توجہ سے زیادہ قیمتی ہے۔ شہرت اور ناموری سے تلاوت وجود زیادہ ضروری ہے۔

Spinoza جیسے لوگ ہی صحیح معنوں میں آزاد اور پرباش ہوتے ہیں۔ ذات کا سفر ہی ذاتی خوشیوں کا پیغامبر ہے۔

حق اور سچ کے علم کو زندہ علم بنا لو۔ اس کو اپنی ذات پر وارد کرو۔
مستعد' محرک اور انگیخت کا غور سے مطالعہ کرو۔

بے خوف رہو۔
اپنی نیچر کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔
کبھی کبھی تبدیلی کا رُخ بھی اختیار کرو۔
تعریف کرنے والوں کی غلامی ہرگز اختیار نہ کرو۔
کبھی نہ سمجھو کہ سارے جواب تمہارے پاس پہلے ہی سے موجود ہیں۔
تکلیف دہ حقائق کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرو۔
اپنے آپ سے کبھی بھی جدا نہ رہو۔
دیکھو! جب تک دیکھنے کے اندر ڈوب نہ جاؤ۔
بے عملی کے مستعد فعل کا راز تلاش کرو۔

ایک فرد ہی فردیت کو فروغ دے سکتا ہے۔
خود نگہداری ہی دوسروں کی مدد کر سکتی ہے۔
تمہارا مستقبل اس قدر آزاد ہے جس قدر تم خود آزاد ہو۔

خود فریبی

جب تک آپ خود فریبی میں مبتلا نہیں ہیں کوئی بھی آپ کو فریب نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کو ایک شیر کا سامنا ہو جائے تو کیا آپ اس کے ساتھ کنا منا کر کھیلنے لگ جائیں گے؟

انسانوں کے گروہ مشینی اخلاقیات کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ میکانکی طور پر ان پر عمل کرتے ہیں اور متوقع نفع کی صورت میں ایک رات میں بدل جاتے ہیں۔

بیرونی حالات کی تبدیلی انسان کی اندرونی اور روحانی خوشی کا باعث نہیں بن سکتی۔ اگر ایک بونے کو پہاڑ پر بھی کھڑا کر دیا جائے تو بھی وہ بونا ہی رہتا ہے۔

اس شخص سے زیادہ ناقابل برداشت انا پرست اور کوئی نہیں ہوتا جو اچانک امیر بن جائے اور قدرت اس کی مدد کرتی رہے۔

اگر کسی شخص کے ساتھ آپ کے تعلقات اس کی کج روی کی وجہ سے ہیں یا اس کی ذہنی ناہمواری کی بدولت ہیں تو پھر تعلقات خطرے میں ہیں۔

جب کوئی احمق شخص آپ سے کسی رائے کا طلبگار ہوتا ہے تو اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ آپ اس کو وہی رائے دیں جو اس کے ذہن میں ہے۔

خواہش

خواہش کا راستہ رُکنے سے کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ خودستائی اور خود پذیرائی کی کیفیت سمجھ میں آ جانے کے بعد اضطراب نہیں رہتا۔

اگلی بار جب آپ کی دنیا مسمار ہونے لگے تو چپ چاپ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جائیں اور اس کو گرتے ہوئے اور ڈھیتے ہوئے دیکھیں۔ کسی شور وغل یا واویلے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک ناظر کی طرح اس کا مطالعہ کریں..... اس کو تیزی سے گرنے دیں تباہ ہونے دیں پھر دوسرے روز اور بھی تیزی سے گرے گی۔ اسے روکنے کی کوشش نہ کریں اور جب یہ بالکل مسمار ہو جائے اور سارا عمل رُک جائے تو پھر اس پر ایک بورڈ لکھ کر لگا دیں "ملبہ برائے فروخت" اگلے روز تعمیر کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

ایک عام سوال

''اگر ہم میں جوش و خروش نہ رہے اور ہم دنیاوی ترقیوں پر تالی نہ بجا سکیں اور خوشی کا اظہار نہ کر سکیں تو کیا ہم میں لاتعلقی کی کیفیت نہیں پیدا ہو جائے گی۔ کیا ہم ڈل نہیں ہو جائیں گے؟''

یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر مبتدی کرتا ہے اور اگر اس کی طرف سے ایسا سوال نہ آئے تو شک سا پڑنے لگ جاتا ہے کہ وہ بات سمجھ بھی رہا ہے یا نہیں..... لیکن اگر ان سے یہ پوچھا جائے کہ کیا انہوں نے دریا کا دوسرا کنارہ دیکھا ہے یا کیا انہوں نے اس مفروضے سے علیحدہ ہو کر بھی کچھ تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

جب تم نے زندگی کا دوسرا کنارہ دیکھا ہی نہیں تو پھر تم اس کو ڈل اور بے روح کیوں کہہ رہے ہو۔ بے دیکھی چیز کو تم کس طرح سے واضح کر سکتے ہو اور کیسے اس کی تفصیلات بیان کر سکتے ہو۔ مفروضوں کو حقیقت کے ساتھ نہ ملاؤ بھائی اور دوسرے کنارے کا خوف تم کو اس لیے ہے کہ تم زندگی کی جھوٹی قدروں کو چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہو۔ اصل میں مبتدی لوگ اپنی الجھنوں اور مشقتوں کو چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہیں اور اس خوف کے مارے ایسی باتیں پوچھتے ہیں۔

حکیمانہ نکتہ

یہ ایک افلاکی اور سماوی قانون ہے کہ جس قسم کا رویہ انسان کا اپنی ذات سے ہوگا اسی طرح کا دوسرے لوگوں سے ہوگا۔ مطلب یہ کہ جیسے ایک شخص ترشی سے یا محبت سے اپنی ذات سے پیش آتا ہوگا اسی طرح دوسروں سے پیش آنے پر مجبور ہوگا۔ انسان کے اندر کا عمل دوئی کا شکار نہیں ہوتا' وہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور یہ ایک سا عمل ایک سا رویہ رکھتا ہے اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اپنے لیے ذرا اچھا سا میوزک بجاؤ اور مزا لو تو دوسرے بھی اس سے لطف لیں گے اور تمہارے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اس طرح سے جھومنے لگیں گے۔

اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے' جو کچھ اب تک حاصل کیا ہے اسے دوسروں کے درمیان تقسیم کرو۔ ان کو بھی سر بلندی اور رخصت عطا کرو۔ ایک پائلٹ جس قدر اونچا ہوا میں اڑے گا' اس کی سواریاں بھی اتنی ہی اونچی پرواز کریں گی..... میرا مطلب یہ نہیں کہ تم ماسٹر بن کر بیٹھ جاؤ یا لوگوں کو نصیحتیں کرنا شروع کر دو۔ میرا مطلب ہے کہ علم سے جس قدر لطف تم نے حاصل کیا ہے' اسے لوگوں تک بھی پہنچاؤ۔ جتنی روشنی تم نے حاصل کی ہے اس کی کرنیں دوسروں کو بھی دو۔ روشنی اسی آسانی سے عطا کرو جیسے سورج کرتا ہے۔

آج ایک نیا درس لو: سب سے پہلے تو ہر اس احساس کو جانو' پہچانو اور بھانو جو آپ کے اندر دباؤ' بے چینی اور تناؤ پیدا کرتا ہے۔ اس کو اچھی طرح سے ملاحظہ فرماؤ اور دیکھو کہ اس کی چال کس کس طرف کو ہے۔

پھر اس ظالم کی طاقت' رفتار اور دباؤ کا مطالعہ کرو کہ اس میں واقعی کس قدر شدت اور اس نے آپ کے سارے وجود کو کیسے کیسے لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

اب ایک حکیمانہ نکتہ یاد رکھو اور اس طاقت کو جس نے سارے وجود کو لپیٹ میں لے رکھا ہے' غور سے دیکھو یہ بڑی طاقت ہی ہے اور بہت زور کی طاقت ہے۔ اب اس طاقت سے ویسے ہی فائدہ اٹھاؤ جیسے بپھرے ہوئے دریاؤں پر بند باندھ کر ڈیم بناتے ہیں اور بجلی حاصل کرتے ہیں۔

انسان دکھی اور سوگی اس لیے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے اصل سے علیحدہ کر لیا ہوتا ہے۔ اپنے دکھوں اور غموں کا سامنا کرنے اور ان کو سمجھنے کے بجائے ان سے فرار کے نئے نئے رستے وضع کر رکھے ہوتے ہیں مثلاً اپنی تکلیف دہ صورتحال کی ذمہ داری لوگوں پر دشمنوں پر اور حالات پر ڈال رکھی ہوتی ہے..... اپنے آپ پر بوجھ ڈالنے اور اپنی ذات پر اعتماد کرنے سے انکار کر رکھا ہوتا ہے۔ محض خیالی اور تصوراتی خوشی میں مبتلا ہوتا ہے۔ کچھ بے معنی اور لایعنی قسم کے پیر پکڑے ہوتے ہیں۔ کچھ بے مقصد ملفوظات جمع کر لیے ہوتے ہیں۔ اصل حقیقت کے بجائے عادت سے چمٹ کر چھپکلی کی زندگی اختیار کر لی ہوتی ہے۔

دکھ کا اور سوگ کا علاج کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آفت کا اور کرب کا سائنسی طور پر جائزہ لیا جائے اور ان لوگوں کی مصنوعی تشفی اور دردمندی کا ساتھ چھوڑ دیا جائے جو اپنے فائدے کی خاطر آپ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں..... اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ آپ ہی اپنے ڈاکٹر ہیں۔ ایک غمگین اور غمناک صورت حال سے نہ تو نفرت کی جائے نہ ہی اس سے لڑائی کی جائے۔ سوگی ہونے اور بیمار رہنے کی لذت سے کنارہ کشی کی جائے۔ اپنا پورا ذہن اور پورا وجود مسئلے پر لگایا جائے۔ روحانیت اور سری رمز کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی جائے۔

لوگوں کے تمسخر اور استہزا سے بچنے کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنے آپ کو خوب سمجھا جائے کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں۔

یا تو آپ اپنے خیالات صحیح انداز میں استعمال کر سکتے ہیں یا پھر ان کو غلط طریق پر استعمال میں لا کر پورے کے پورے بھٹک سکتے ہیں۔

اپنی جھوٹی شخصیت کی شناخت کرتے رہیں نہ تو اس کو بولنے دیں اور نہ ہی اس کو آپ کا نمائندہ بن کر کوئی عمل کرنے دیں۔

کام کی باتیں

(1)۔ اپنے اوپر کے دماغ کی بات نہ ماننا کہ یہ اچھا ہے یا یہ برا ہے۔ اندر اتر کر اور غور کر کے دیکھنا وہاں اصل جواب ہوگا۔

(2)۔ سچائی کو اس لیے حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے کہ سچائی سچ ہوتی ہے۔

(3)۔ اندر' بالکل اندر ٹھیک' صحیح اور درد پیدا ہونا چاہئے۔ پھر آپ کو باہر کی کوئی پروا نہیں رہے گی۔

(4)۔ اگر تم لوگوں کے مزاج اور ان کے افعال کا تجزیہ کرنے کے خواہشمند ہو تو پہلے اپنا تجزیہ کر کے اپنے وجود

کی تلاوت کرو۔

(5)- اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے ناسازگار حالات کا مطالعہ کرو یا اپنی اُس عادت کا پوسٹ مارٹم کرو جسے تم بہت ہی ضروری خیال کرتے ہو۔ پوسٹ مارٹم کے بعد فیصلہ کرو کہ آیا اس عادت کا رہنا ایسا ہی ضروری ہے یا کیا وہ ایسی ہی اہم ہے۔

اپنی تلاش

میں کس طرح سے اپنے آپ کو تلاش کر سکتا ہوں اور کس طرح سے جان سکتا ہوں کہ میں کون ہوں۔

اپنی زندگی پر لٹکائے ہوئے مصنوعی چوکھٹوں اور رنگین تصویروں کے اندر سے باہر نکل آؤ اور پھر اس چوزے کو غور سے دیکھو جو اس رنگ دار ڈربے سے باہر نکلا ہے۔ اس طرح تم پہلی بار اپنی زندگی کو قریب سے دیکھ سکو گے۔

مائیکل اینجلو ویٹی کن گرجے کی چھت پینٹ کر رہا تھا تو ایک سایہ بار بار اس کو تنگ کرتا تھا اور اس کے نقوش کی راہ میں حائل ہوتا تھا۔ مائیکل اینجلو جھلاّ اُٹھا اور بڑبڑانے لگا۔ لیکن جب اس نے غور کیا تو وہ سایہ اسی کے وجود کا سایہ تھا جو اس کے اور تصویر کے درمیان حائل تھا۔ اس نے بتی کو ایک کٹورے میں اس انداز سے رکھا کہ وہ ایک Scoop سا بن جائے اور اس کی روشنی سیدھی تصویر پر پڑے۔ پھر اس نے تصویر کشی کا عمل سکون سے شروع کر دیا کیونکہ اس کا اپنا سایہ راہ میں حائل نہیں رہا تھا۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھو اور اس کو سونے کے حروف میں لکھ کر اپنے سامنے لٹکا لو کہ تم ان لوگوں کے غلام ہو جن کی تم تصدیق کے اور موافقت کے اور Approval کے خواہاں ہو۔ تم جلد ہی محسوس کر لوگے کہ تمہاری جنگ لوگوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ اپنے ذہن کی کج روی کے مابین ہے۔ ذہن کو درست کر لو، پھر سب ٹھیک ہے۔

کرب اور بلا

جب غم اور کرب شدت سے تجاوز کر جائے اس وقت تم ایک خوش قسمت ترین فرد ہوتے ہو۔ اپنی اس خوش قسمتی کے لمحے کو ہاتھ سے نہ جانے دو اس دُکھ کو ہلے گلے کے یا موج میلے کے حوالے کر کے اس پر مٹی نہ ڈالو۔ دُکھ کے ساتھ چمٹ کر رہو اس سے بھاگو مت!

وجہ یہ ہے کہ تم دُکھ سے اس لیے بھاگ نہیں سکتے کہ تمہارا اور کوئی وجود نہیں جو دُکھ سے علیحدہ ہو۔ تم خود ہی دکھ ہو۔ خود ہی سارے کے سارے کرب ہو۔ تم کرب سے اس لیے علیحدہ نہیں ہو سکتے کہ تم اور کرب ایک ہی شے ہو۔ جس طرح تم اپنے بدن کو چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے ہو کسی دوسرے ملک میں نہیں جا سکتے ہو اسی طرح سے دُکھ ہے!

جب ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دُکھ سے الگ ہو کر بھاگ جانا ناممکن ہے اس وقت آپ کے اندر ایک نئی تبدیلی کا امکان شروع ہوتا ہے۔ اس وقت روشنی ملتی ہے اور ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے۔

خود تبدیلی

خود تبدیلی (Self Infarmation) میں اور خود بہبودی (Self improvement) میں بڑا فرق ہے۔ ہر شخص خود بہبودی کا خواہاں ہے لیکن صرف بہادر اور جری انسان ہی خود تغیری اور دگر سازی کا متحمل ہو سکتا ہے۔

آدمی کو دن بھر ان افعال کا مطالعہ کرنا چاہیے اور کرتے رہنا چاہیے جو اس کی قدرتی اور جبلی فطرت کے مطابق ہیں اور جو اس کی فطرت کے مطابق نہیں ہیں۔ اس طرح اس کو اپنے خیالات پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ کون سے صحیح ہیں اور کون سے مصنوعی۔ یہ ہشیاری اور خودنگہداری اور دن بھر کی چوکسی اس کو بنیادی انسان یعنی اپنے اندر کے انسان سے متعارف کرا دے گی۔ جس طرح غلط سڑک پر جاتے ہوئے ایک مسافر کو اس کا احساس ہوتا ہے وہ ہینڈل گھما کر موٹر کو صحیح سڑک پر ڈال لیتا ہے اور مزے سے سیٹی بجاتا ہوا منزل کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے۔

اونچی منطق

کم از کم آپ لوگوں کو سوسائٹی کی چالو منطق کے مقابلے میں اونچی منطق اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً چالو سوسائٹی ایک اقتصادی مسئلے کے لیے ایک اقتصادی حل ڈھونڈ کر آپ کے سامنے پیش کرتی ہے لیکن یہ دونوں چیزیں یعنی مسئلہ اور اس کا حل انسانی کج روی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے کبھی بھی خیر برآمد نہیں ہو سکتی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک بیمار آدمی کا علاج کرنے کے لیے ایک اور بیمار آدمی کو لے آیا جائے۔

یاد رکھو! یہ ایک ذاتی اور پرائیویٹ کام ہے۔ اس میں دوسروں کی پروا نہیں کی جاتی کہ وہ کیا کہتے ہیں یا کیا کرتے ہیں۔ ہمیشہ اپنی سوچ کا درجہ اونچا رکھو پھر تم محسوس کرو گے کہ تم واقعی سوچ رہے ہو۔

آپ یقین کریں کہ زندگی کی گتھی کو سلجھانے کا اور حیات کے معمے کو حل کرنے کا ایک حتمی اور قابل اعتبار طریقہ موجود ہے۔ ایک شخص جس کی ذاتی الجھن کا کوئی حل نہیں جس کی مشکل ختم ہونے میں ہی نہیں آتی وہ ہمت کر کے اور بہادری کے ساتھ اس مشکل کی طرف رُخ کر سکتا ہے جس کی پیچیدگی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ دیکھے گا کہ ماہرین اور مصلحین بھی اتنے ہی شکوک چھپا رہے ہیں جس قدر وہ خود چھپا رہا ہے۔ یا وہ پھر دیکھے گا کہ اس کی ذہنی ورزش میں خیالی لہریں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کر رہی ہیں۔ وہ رُک کر ضرور محسوس کرے گا کہ باطل اور بیہودہ سب باطل ہی ہے۔ یہ اس کا بوجھ کم کر دے گا اور اس کو روشنی نظر آنے لگے گی۔

عقل اور جذبہ

انسانی زندگی میں عقل بھی ہے اور جذبہ بھی۔ دونوں کو تدریس کی ضرورت ہے۔ جاننے کے لیے عقل کی بھی ضرورت ہے اور جذبے کی بھی۔ دونوں کی ساتھ ساتھ تربیت ہونی چاہیے۔ جس طرح ہل کے دو بیل ہوتے ہیں کہ ساتھ

تمغے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی تھا جو اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا خواہشمند تھا۔ وہ اپنی ذات میں تبدیلی پیدا کر کے کچھ سے کچھ بن جانا چاہتا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ ایک تمغہ ساز کے پاس گیا اور وہاں جا کر اس نے ایک خوبصورت تمغہ بنوایا جس پر لکھا تھا ''ہیرو''۔ اس نے وہ تمغہ اپنے سینے پر سجا لیا اور باہر بازار میں نکل آیا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو کر تالیاں بجانے لگے اور ہیرو ہیرو کے نعرے مارنے لگے..... کچھ دیر تو یہ کیفیت رہی لیکن پھر اس کا دل اس تمغے سے بھر گیا اور تالیاں بجانے والوں کی تعداد بھی روز بروز کم ہونے لگی۔ اس کا دل بجھ گیا۔ وہ پھر تمغہ ساز کے پاس گیا اور اس سے ایک خوبصورت اور رنگدار تمغہ بنوایا' جس پر لکھا تھا ''دانشور''۔

دانشور کا تمغہ سجا کر جب وہ مارکیٹ میں گیا تو ایک ہجوم اس کے گرد جمع ہو گیا اور دُور دُور سے ''دانشور' دانشور'' کی صدائیں آنے لگیں۔ لیکن یہ کھیل بھی چند ہفتے سے زیادہ نہ چل سکا۔

اب کی بار اس نے ایک نئی ترکیب سوچی اور تمغہ ساز سے کانسی کا ایک انجرنواں تمغہ بنوا کر اس پر لکھوایا ''لیڈر''...... لیڈر کا تمغہ دیکھتے ہی اردگرد کے گاؤں میں بھی اطلاع پہنچ گئی اور لوگ بھنگڑا ڈالتے ہوئے لیڈر کے گرد جمع ہونے لگے..... لیکن یہ میلہ بھی چند روزہ تھا جو ایک دن ٹوٹ گیا۔

ایک دن اچانک اُس شخص کو خیال آیا کہ میں میڈل لگانے کے باوصف کسی وقت بھی اپنے سے مختلف نہیں ہوا۔ میڈل کسی کے خوف' قابوس انتشار کو بدل نہیں سکتے۔ مجھے کوئی ایسا نسخہ تلاش کرنا چاہئے جس سے میں سچ مچ تبدیل ہو جاؤں۔

توجہ

اگر آپ کو راہ چلتے ہوئے کوئی اداس' پریشان اور ملول چہرہ نظر آئے تو اس کے بارے میں گہرائی سے سوچنا۔ ایک ذہین اور بیدار انسان کو اس اندوہ کے ساتھ ہزاروں آنکڑے وابستہ نظر آئیں گے۔ اس کو پتہ چل جائے گا کہ غم اور اندوہ اکیلا نہیں ہوا کرتا۔ اس کے ساتھ بیشمار منفی نشانات ہوتے ہیں اور یہ غنڈے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔ صاحب نظر کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ملول و پریشان شخص دراصل ترش روش اور اتہامی رویوں کا میزبان ہوتا ہے۔ وہ اپنے سنہرے مستقبل کے لیے لوگوں کی مدد اور لوگوں کی توجہ کا سائل ہوتا ہے اور جب اس کے کاسۂ گدائی میں کچھ نہیں پڑتا تو ملول اور غم زدہ ہو جاتا ہے۔

فراریت

اکثر لوگ اپنے آپ کو اس لیے تبدیل نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی حقیقتوں کو جانچتے وقت بے عزتی محسوس کرتے

ہیں۔ ایک کمزور انسان کو یا نامکمل انسان کو جب اس کی حقیقتوں سے روشناس کرایا جاتا ہے تو وہ جھلاتا ہے اور لڑائی کرنے لگتا ہے۔ حقیقتوں سے روشناسی کو اپنا علاج نہیں سمجھتا۔

دکھ اور تکلیف کی بنیادی مصنوعی بنیاد ہے۔ آپ کو صرف اُس وقت تکلیف ہوتی ہے جب آپ کے مصنوعی اور آئیڈیل سیلف پر اصلی سیلف کے حقائق روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر آپ کی کوئی جھوٹی تصویر نہیں ہے تو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ یہ ایک سیدھا سا اصول کہ فراریت سے گریز کیا جائے۔

نفسیاتی خلجان

جب آپ اپنے آپ کو کسی نفسیاتی الجھن میں پائیں تو فوراً خود کو بتائیں کہ میرے اندر ضرور کوئی ایسی بات تھی جس سے یہ خلجان پیدا ہوا۔ کیا یہ اضطرار سے جلد بازی' کیا یہ اندیشنا کی (Insecurity) ہے۔ نا امنی ہے۔ کیا بے خیالی ہے؟ اگر ہے تو پھر یہ ساری تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ روشن دماغی سے' خود بصیرتی سے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

حصہ داری

ویسے غور سے دیکھا جائے تو حصہ داری میں بھی دینے کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ جب آپ حصہ داری کرتے ہیں بھائی داری کرتے ہیں تو اس میں بھی دینے کا عمل موجود ہوتا ہے۔ یعنی جو ہمارا حصہ ہوتا ہے اس میں سے دوسرے ساتھی کو دیا جاتا ہے جبھی وہ حصہ قائم رہتا ہے۔ اس سے اس عمل کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس سے حصہ دار' حصہ داری کی تقویت حاصل کرتا ہے۔

جب ہم حصہ داری سے اور شیئرنگ سے اپنی قوت اور اپنی محبت اور اپنے تشکر کو مضبوطی عطا کرتے ہیں تو گویا ہم زمین اور آسمان کے درمیان ایک گہرا تعلق ایک گہرا رشتہ قائم کرتے ہیں۔

انسان بھی عجیب ہے۔ اس کی حصہ داری اپنی جنس کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ وہ دوسری مخلوق سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس Sharing میں ایک اور طرح کی شیئرنگ ہوتی ہے۔ ہم آسمان سے چاند سے سورج سے ستاروں سے ہواؤں سے بادلوں سے بھی رشتہ رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی وابستہ ہیں۔

ہر شے حصہ داری میں مصروف ہے۔ زندگی ساری شیئرنگ کے ساتھ وابستہ ہے۔ تنفس بھی ایک دوسرے کا حصہ دار ہے۔ سانس کا آنا جانا ایک دوسرے سے بندھا ہے۔ میری سانس آسمانوں تک پہنچتی ہے۔ آسمان سے اترنے والی ہوا میری سانس بنتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ ایک دوسرے سے سانس بدلی کرنے والے ہم ایک دوسرے سے اس قدر بور کیوں ہیں۔

دل دُکھانا- رنجیدہ کرنا

جس شخص کا یہ ایمان ہے کہ دوسرے لوگ اس کی ذاتی اور شخصی خواہشوں کا احترام کریں اور ان کو اسی طرح سے پسند کریں جس طرح وہ پسند کرتا ہے تو اس شخص کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں سوائے اس کے تصور کے اور سوائے اس کی پسند کے اور کسی کو ٹھہرنے کا کوئی حق نہیں..... یہ ایک سیدھی سی اور موٹی سی انانیت ہے جو ایک اندھے کو بھی نظر آتی ہے..... لیکن اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس خود پسندی اور خود خواہی کی وجہ سے خود اذیتی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور وہ شخص اپنے آپ کو سزائیں دینے لگتا ہے۔

دل دُکھانے اور دوسروں کو رنجیدہ کرنے کی خرابی کی وضاحت بڑی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے۔ سیدھا سادا اصول ہے کہ:

1- ہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے ہیں اور رنجیدہ کرتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ ہم خوفزدہ ہیں۔
2- ہماری خوفزدگی کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں۔
3- ''ہم کون ہیں'' کا علم ہم کو اس وجہ سے حاصل نہیں ہوتا کہ ہم نے کبھی تحقیق ہی نہیں کی کہ ہم کون ہیں۔

تنہائی- اداسی- اکلاپا

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ تنہائی اور اکلاپا کس مقام پر اور کس موقع پر ہوتے ہیں۔ کہاں ہوتے ہیں۔

اداسی اور تنہائی انسان کے ذہن کے اُس حصے میں بسیرا کرتی ہے جس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے اور جس کے بارے میں اس نے نہایت ہی غلط اعلان کیا ہوتا ہے کہ میرا ایک سیلف ہے' ایک وجود ہے' ایک ذات ہے جو ساری کائنات سے الگ ہے اور ساری کائنات سے ہٹ کر ہے..... حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص کسی ایسے علیحدہ وجود کا مالک ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ اس کائنات کے رنگارنگ نظام اور اس کی بوقلمونیوں کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ یہ کوئی گہرے فلسفے کی بات نہیں ہے۔ سیدھی سی حقیقت ہے اس پر غور کریں اور غور کیا کریں اور کرتے رہا کریں' آپ کو آسانیاں عطا ہونے لگیں گی۔

حساسیت

جب کسی شخص کا دل ٹوٹ جائے یا کوئی اس کا دل توڑ دے تو اس شخص کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ سے سوال کرے کہ ''میں لوگوں کا اسیر کیوں ہوں اور میں اپنے آپ کو آزاد کیوں نہیں کرتا؟''
طنز کا خوف دُور کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کا تجزیہ کیا جائے کہ میں اصل میں کون ہوں اور میری حقیقت کیا ہے۔

آپ یا تو اپنے خیال کو ٹھیک انداز میں استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس پر آپ کو پورا قابو ہے یا پھر آپ کا خیال آپ کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر کے آپ کے سارے بل نکال دے گا۔
ایک کام ضرور کریں کہ اپنی مصنوعی شخصیت اور اپنی جھوٹی فردیت کو آپ کی نمائندہ بن کر بولنے کی اجازت بالکل نہ دیں۔
جب کوئی روحانی عقدہ نہ کھل رہا ہو اور بات سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو یہی مقام خوشی کا اور آسانی کا ہوتا ہے کہ ہم صحیح دروازے کی تلاش میں ہیں جس کو آسانی کے ساتھ کھولا جاسکے۔

فرد اور ارتقاء

مہا آتمتائی اور مہا پرشی کو کسی مقام سے ڈھونڈھ کر حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کو اپنے اندر پیدا کر کے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ انسان بننے کے لیے یہ جاننا بہت ہی ضروری ہے کہ نا جانور ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ تم انسان ہو۔

جس طرح مچھلی پکڑنے والے اپنے کانٹے کو طمعہ لگا کر مچھلی پکڑتے ہیں، اسی طرح ذہنی غلامی میں گرفتار کرنے والے اپنی کنڈی کو حفاظت، ضمانت اور کفالت کا طمعہ لگاتے ہیں۔ کفالت کے نام پر تقریباً سارے لوگ اپنی آزادی فروخت کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ انسان پکڑنے کا یہ ایک پرانا دھندہ ہے اور جو ذرا سا بھی غافل ہوتا ہے، وہ اس کڑکی میں فوراً پھنس جاتا ہے۔

کفالت اور حفاظت کا لالچ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ کفالت کی ضرورت سے زیادہ طلب روح کا قید خانہ بن جاتی ہے اور روح اس کے اندر پھڑ پھڑانے لگتی ہے۔ کفالت کی آرزو طرح طرح کے وسوسوں اور واہموں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ خوف اپنے سارے راستے ادھر ہی کھول دیتا ہے۔ اس خوف سے بہت سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیاسی لیڈر، مذہبی پیشوا، معاشرتی کارندے، یہ سب آپ کے خوفوں سے فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ یہ آپ کو خوف سے برآمد ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ جب تک آپ خوف میں مبتلا ہیں، یہ لوگ آپ کے حاکم ہیں۔ آپ کے مالک ہیں، آپ ان کے بردے ہیں۔

یہ صرف خوف ہی کا کمال ہے کہ لوگ خوفزدگی میں well اور معروف کی طرح دوڑتے ہیں اور اسی کے ساتھ جا کر تکیہ لگاتے ہیں، خواہ وہ well بالکل غلط، بے بنیاد اور حقیقت سے دور ہو۔

شیخ صاحب کہا کرتے ہیں کہ میں اکثر جاودانی اور لافنا ہی پر غور کیا کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں جاودانی پر غور نہ کیا کریں، فنا پر غور کیا کریں۔ موت کے ساتھ رشتہ استوار کریں، پھر آپ کو فنا اور لافنا کا مطلب معلوم ہوگا..... چونکہ ہم موت سے خوفزدہ ہیں، اس لیے ہم لافانی اور لافنا کا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں دوستو! موت میں کوئی خوف نہیں، موت سے کوئی خوف ہیں، خوف میں موت ہے اور خوف سے ہی موت ہے۔ موت تو ایک ان جانی، نہ پہچانی، نہ سمجھ میں آنے والی شے ہے، پھر اس سے خوف کیسا؟

ہمیشہ موت کی تحقیق کرو اور موت کا مراقبہ کرو۔ اس کا انجام آخر میں آپ کو لافانیت سے ہمکنار کر دے گا۔

میں نے ندی کنارے لڑکیوں کو پانی بھرتے دیکھا اور میں دیر تک کھڑا ان کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ پانی بھرنے کے لیے جھکنا پڑتا ہے اور رکوع میں جائے بغیر پانی نہیں بھرا جا سکتا۔ ہر شخص کو رکوع میں جانے کا فن اچھی طرح سے آنا چاہیے تاکہ وہ زندگی کی ندی سے پانی بھر سکے اور خوب سیر ہو سکے...... لیکن افسوس کی بات ہے کہ انسان جھکنے کا اور خم کھانے کا آرٹ آہستہ آہستہ بھول رہا ہے اور اس کی زبردست طاقتور انا اس کو یہ کام نہیں کرنے دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دعائیں اور ساری عبادات اکارت جا رہی ہے اور انسان اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا ہے۔

اصل میں زندگی ایک کشمکش اور جدوجہد بن کر رہ گئی ہے اور اس میں وہ مٹھاس، وہ ٹھنڈک اور شرینی باقی نہیں رہی جو حسن اور توازن اور ہارمنی کی جان تھی۔ اس وقت زندگی سے جھکنے اور رکوع کرنے کا پراسرار راز رخصت ہو چکا ہے اور اس کی جگہ محض جدوجہد باقی رہ گئی ہے۔ ایک کشمکش اور مسلسل تگ و تاز۔

لیکن ایک بات یاد رہے کہ یہ جھکنے اور رکوع میں جانے کا آرٹ بلا ارادہ ہو ورنہ یہ بھی تصنع اور ریاکاری بن جائے گا اور یہ جھکنا بھی انا کی ایک شان کہلانے لگے گا۔

اس زندگی میں ایک آزاد اور بے فکر اور منکر دماغ سے بڑھ کر اور کوئی بڑی نعمت نہیں۔ اس کے ذریعے حقیقی علم تلاش کیا جا سکتا ہے اور اس کی بدولت حقیقی علم سے آشنائی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی دماغ ہوتا ہی نہیں جو آزاد، بے فکر اور منکر المزاج ہو...... آئن سٹائن سے کسی نے پوچھا کہ وہ کونسا بنیادی اصول ہے جس کے بغیر سائنسی تحقیقات ہو ہی نہیں سکتیں اور جس کو اپنائے بنا سائنس دان تحقیق کی دنیا میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ آئن سٹائن نے بلا تامل جواب دیا "انا اور تکبر سے آزادی"

میں تم سے بار بار کہتا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ آزادی نہ مانگو، آزادی طلب نہ کرو۔ آزادی کی تلاش مت کرو، محبت کی تلاش کرو، محبت کو ڈھونڈو۔ وجہ صرف یہ ہے کہ آزادی کو ڈھونڈنے والے اور آزادی کے تذکرے کرنے والے اکثر انا کے چکروں میں پھنس جاتے ہیں اور تکبر کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انا پسند لوگ دنیا کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ موت سے ڈرتے ہیں۔ زندگی کو لافانی کرنے کی کوشش میں مبتلا ہوتے ہیں۔

خود پسندی کی اس سے بڑی اور کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ وہ خود کو آزاد کرانے کے پروگرام بناتی ہے اور آزادی

کے انداز میں سوچتی ہے۔

انانیت ایک ایسا جذبہ ہے، ایک ایسی لگن ہے کہ یہ سب کچھ چھوڑ دینے سے خوف نہیں کھاتی۔ زندگی چھوڑنے سے نہیں ڈرتی۔ دولت تقسیم کرنے سے نہیں ڈرتی۔ مذہب دین دھرم سب کو تج سکتی ہے۔ بڑے بڑے معرکے مار سکتی ہے لیکن اگر خوفزدہ ہے تو محض محبت سے، محبت کے قریب آنے سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر زندگی محال نظر آنے لگے اور عرصہ حیات تنگ ہو جائے تو اپنا زاویہ نگاہ تبدیل کرنے کی سوچو، زندگی بدلنے کا پروگرام نہ بناؤ۔

میری ایک بات توجہ سے سننا۔ کبھی کسی کو قائل کرنے کی کوشش نہ کرنا، دلائل نہ دینا، توجیہات نہ پیش کرنا۔ اس طرح سے تم صرف اپنی طاقت کو ضائع کرو گے اور پریشان رہو گے۔ البتہ ایک دلیل ایسی ضرور ہے جس سے تم ہر ایک کو قائل کر سکتے ہو اور وہ دلیل ہے تمہارا وجود۔ اگر تم نے اپنے آپ کو تبدیل کر لیا اور اپنی کایا کلپ کر لی پھر تم ایک بہت ہی طاقتور دلیل بن گئے لیکن اگر تم میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی اور تمہاری کایا کلپ نہ ہوئی تو پھر چاہے تم کتنی دلیل بازی کرو، کتنی ہی منطقیں نکالو کوئی بھی تم کو نہیں مانے گا۔ فلسفہ اور منطق اور دلیل بازی کسی کو قائل نہیں کر سکتی۔ ماسوائے تمہاری ذات کے...... تم کسی کو قائل نہ کر سکو گے اور اس کی کوشش بھی نہ کرنا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر تم کسی کو قائل نہ کر سکے تو پھر تم پر اور تمہاری روح پر اور مزاج پر اس کا شدید ردعمل ہو گا اور تم پریشان رہنا شروع کر دو گے۔

اس دنیا میں ایک بطل عظیم یا ایک جینئس بننا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ سیدھا سا نسخہ ہے کہ نہیں کہنا سیکھ لو۔ ہر بات کو NO کہو، ایک نکتہ چیں بن جاؤ۔ کبھی ہاں نہ کہو "جی" نہ کہو۔ حق نہ کہو، تم خود بخود ایک دانشور بن جاؤ گے۔

محبت ذہن سے ممکن نہیں ہو سکتی۔ ذہن سے تو جنسی فعل ہو سکتا ہے۔ ذہن سے تو عمل کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ جنسی فعل ایک عمل ہے، محبت کوئی فعل نہیں، کوئی کارکردگی نہیں، کوئی عمل نہیں۔ یہ تو ہونے کی ایک حالت ہے۔ Being کی ایک سٹیٹ ہے۔ جب آپ کوئی شخص دیکھتے ہیں اور کسی فیصلے کے بغیر کسی تنقید اور تبصرے کے بغیر کہ وہ اچھا ہے یا برا، خوبصورت ہے یا بدصورت، گنہگار ہے یا نیک۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں تو ایک نئی چنگاری پیدا ہوتی ہے۔ جب صفات سے نظر ہٹ کر ذات پر مرکوز ہوتی ہے تو ایک عجیب قسم کی برقی رو پیدا ہوتی ہے اور یہ رو محبت کی اساس بن جاتی ہے۔ جب آپ ایک پھول دیکھتے ہیں، بغیر کسی تنقید اور تبصرے کے کسی فیصلے کے تو وہ پھول اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ آپ سے اپنے دلی راز بیان کرنے لگتا ہے لیکن جب آپ اس پر تنقید کی نظر ڈالتے ہیں، اس کا مبصر، ناقد اور نکتہ چین بڑے ذہین لوگ ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہن میں ملامت اور سرزنش بڑی آسانی سے آ جاتی ہے۔ دنیا میں سب سے آسان بات اس کا اظہار ہے کہ فلاں شے غلط ہے اور فلاں فعل ٹھیک ہے۔ نہ کہنا اور نہ ماننا اس کائنات کا آسان ترین کام ہے۔ ہاں کہنا بہت ہی مشکل اور بے حد محال فعل ہے...... کبھی اپنے ذہن کی طرف توجہ کر کے دیکھیں کہ یہ ایک دن میں یا ایک گھنٹے میں یا ایک گھڑی میں کتنی مرتبہ نہیں کہتا ہے۔ اگر اس کو ہاں

بھی کہنا پڑے، کسی سخت دلی اور تنگ نظری کے ساتھ کہتا ہے۔ ذہن ہمیشہ نہیں کے ساتھ بہت خوش رہتا ہے۔ جب بھی آپ کسی کو No کہتے ہیں، اس کا بطلان کرتے ہیں تو آپ کو بڑی خوشی سے بڑی طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ No کہنے سے نفس اور انا مضبوط ہوتے ہیں۔ Yes کہنے سے انا جھکتی ہے، ملیامیٹ ہوتی ہے۔ No کہنے سے آپ مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں۔ چکنے پتھر کی چٹان بن جاتے ہیں۔ ایک سنگلاخ تودا جس میں نہ کوئی دروازہ ہوتا ہے، نہ کھڑکی، نہ روزن ۔ اپنی جگہ اٹل پڑا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو ٹھوکر عطا کرنے والا لیکن ایسی چٹان اور ایسے بند پتھر سے محبت، شفقت، رحمت، دعا، عبادت اور مراقبے کی ساری خوبیاں یک قلم موقوف ہو جاتی ہیں۔ نہ نہ نہ کہنے والا شخص کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ کوئی دستک اس کے دروازے نہیں کھول سکتی۔ کوئی ہوائیں، جھکڑ اور طوفان اس کے دریچے دھڑ دھڑا نہیں سکتا۔

اس کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ جو کوئی بھی تنقید کرتا ہے، فیصلہ دیتا ہے۔ وہ درست نہیں ہو سکتا۔ نقاد اور مبصر کا روپ دشمنی کا ہوتا ہے۔ فیصلے کے اندر ناقد موجود ہوتا ہے۔ محبت کرنے والا اور شفقت کرنے والا نہیں۔ قول فعل میں اور فتوے میں منطق ہوتی ہے، محبت نہیں۔

1- جو اپنی غرض کے لیے تمہارے ساتھ دوستی رکھے، اس کی دوستی سے ہٹ جاؤ۔

2- من مانی کبھی نہ کرو۔

3- جس کو اپنی زبان سے ایک بار اچھا کہہ دو، پھر اسے کبھی برا نہ کہو۔

4- اپنے ساتھیوں کو کبھی بھی اپنے علم سے خوفزدہ نہ کرو۔

5- کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہ دو۔

6- جو امین نہ ہو اس کو کبھی قائد نہ بناؤ۔

7- جس بات سے تم کو فائدہ پہنچ چکا ہو، وہی دوسروں کو بتاؤ (کتابی بات نہ کرو) اتنا کھاؤ جس سے پیٹ میں ہوا پیدا نہ ہو۔ اتنا سوؤ جس سے جسمانی اور ذہنی تازگی برقرار رہے۔ اتنا بولو کہ سامعین اس کو سنبھال سکیں اور گرانے نہ لگیں۔ کم علموں کے پاس اس قدر بیٹھو جس قدر وہ آپ کے ساتھ سنجیدہ رہ سکتے ہوں۔

8- مشکل مقام پر اپنے ساتھیوں سے آگے رہو۔ جب انعام تقسیم ہونے لگے تو ان سے پیچھے رہو۔

9- اصول پسندی راستہ ہے، مقصود نہیں۔ اصول بنانے والے سے محبت رکھو۔

10- دوست کے دوست کو دوست بناؤ۔

11- لوگوں کو ان کی امانتیں واپس کر دو اور کرا دو۔

12- بہتر جاننے والے کے سامنے بولنا ان کی اجازت سے ہو اور اپنے علم کی تصدیق کے لیے ہو۔

13- جس کو قابل تعظیم مانتے ہو، اس کی صفات کو اپنی ذات میں داخل ہونے دو۔ اس طرح کہ اس کے لیے سب دروازے کھلے رہیں۔

14- بڑوں سے اگر کسی بات کو بار بار سننے کا موقع ہو تو ہر مرتبہ اس یقین سے سنو کہ اس میں نیا سبق بھی ہوگا اور سابقہ کا اعادہ بھی ہوگا۔

امام مالک نے فرمایا، امت مرحومہ کے آخری دور کی کبھی اصلاح نہ ہو سکے گی تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی۔

اب نیکی بھی ترک کر دو

جو فرد اپنی زندگی کا کسی دوسرے کے ساتھ تقابل کرتا ہے اور اس جیسی زندگی بسر کرنے کا خواہشمند ہے، سمجھو کہ وہ اپنی زندگی بسر کرنے سے محروم ہو چکا ہے۔ زندگی تو اندر کا ایک مظہر ہے۔ اس کو اپنا آپ بھلا کر کس طرح سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ کس طرح دریافت کیا جا سکتا ہے۔ جب ایک شخص اپنی زندگی کا کسی اور ساتھ تقابل کرتا ہے تو رشک میں حسد میں غصے میں اور جارحیت اور پرخاش گری میں مبتلا ہوتا ہے لیکن یہ زندگی نہیں ہے یہ تو ایک زندہ موت ہے اور کوئی عجب نہیں کہ اس وقت یہ ساری دنیا ایسی ہی زندہ لاشوں سے آباد ہے اور آباد چلی آ رہی ہے۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ جو دنیا خواہش اور ہوس کی بنیادوں پر آباد ہو، وہ کبھی بھی بے قاہر اور ناجائز نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کی حرص میں مبتلا یا اگلی دنیا کے لوبھ میں مارا مارا پھرتا ہے، وہ دوسروں کو ایذا پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جہاں بھی خواہش اور غرض و غایت ہے، وہاں قہر اور جبر موجود ہے۔ خواہش بذات خود قہر ہے...... سائنس نے انسان کے دلوں کو خواہش سے اور لوبھ سے بھر دیا ہے۔ اب غارت گری اور ظلم لازمی ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں۔ تا آنکہ مذہب آگے بڑھ کر لوگوں کے دلوں سے خواہش اور حرص و ہوا کا خدا نکال دے اور اس کی جگہ اللہ کو بسا دے!

لیکن یہ خواہش، یہ لالچ اور لوبھ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یہ آتا کہاں سے ہے؟ لوبھ احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔ ہر شخص اپنے اندر کمزور، لاچار اور کمتر محسوس کرتا ہے۔ اپنے آپ کو خالی اور تھوتھا سمجھتا ہے۔ اس کو زندگی ملی ہی نہیں۔ اب وہ ہستی زندگی کی تلاش میں اور اپنا منہ بھرنے کے لیے لوبھ اور لالچ کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور اپنی زندگی کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر کسی کو اپنے اندر کے خلا کا احساس ہو جائے اور اپنے لوبھ اور لالچ کی سمجھ آ جائے کہ یہ سب اندر کے خلاء کو بھرنے کے لیے کیا جا رہا ہے اور میں خواہش کی تکمیل سے اس کو بھر نہیں سکتا تو یہ احساس اور یہ مشاہدہ اس کو دھرم کے اندر داخل کر دے گا۔ مذہب شناس بنا دے گا۔ اپنے اندر کے خلا سے اجتناب کرنا دھوکا ہے اور اپنے اندر کے خلاء کو سمجھ جانا مذہب ہے، گیان ہے، روحانیت ہے۔

اب کچھ باتیں سچ، سچائی اور راستی کے بارے میں ہو جائیں:

حق اور حقیقت کی وارپتا اور وزریدگی اور شے ہے اور اس کی تفسیر و تشریح بالکل ایک الگ بات ہے۔ دونوں کا

آپس میں کوئی تعلق نہیں کیونکہ جب تم سچ کی تشریح اور تفسیر کرتے ہو۔ اس وقت تم سچ سے باہر کھڑے ہوتے ہو۔ جب سچ تم پر سے گزر رہا ہوتا ہے تم پر وا ہو رہا ہوتا ہے، وارد ہو رہا ہوتا ہے۔ تم اس کے اندر ہوتے ہو۔ اس لیے جو لوگ حق کے اندر ہوتے ہیں، جن پر سچ وارد ہوتا ہے، وہ اس کی تفسیر کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ جو شخص آپ کو حق اور سچ کی تعریف بیان کر سکتا ہے اور اس کی باریکیاں سمجھ سکتا ہے، وہ وہ شخص ہے جس نے سچ کا کبھی تجربہ ہی نہیں کیا۔

تو پھر سچ ہے کیا؟

کیا سچ ایک عقیدہ، ایک مسلک، ایک سلسلہ، ایک انجمن، ایک صحیفہ ایک شاستر ہے؟

نہیں۔ بالکل نہیں۔

عقیدہ ہمیشہ ماضی ہوتا ہے اور سچ ماضی نہیں ہے۔

سچائی ایک مسلک بھی نہیں کیونکہ سچائی کی طرف کوئی راستہ ہی نہیں جاتا۔ ایک معلوم راستہ نامعلوم کی طرف جا بھی کیسے سکتا ہے۔

سچائی کوئی مذہبی سلسلہ بھی نہیں۔ یہ تو ایک واپرتا ہوتا ہے جو وقت سے آزاد اور فارغ البال ہے۔ یہ بہت ہی منفرد چیز ہے، بالکل واحد، اکیلی۔

سچائی کوئی صحیفہ بھی نہیں۔ صحیفے نازل ہونے والی شے ہیں۔ وہ مخصوص قوموں اور گروہوں کے لیے مختص ہیں لیکن سچ کسی خاص قوم یا خاص گروہ کے لیے نہیں۔

سچائی نہ تو لفظ ہے، نہ ہی موت ہے، الفاظ مٹ جاتے ہیں، موت ڈوب جاتی ہے لیکن سچائی قائم رہتی ہے۔

تو پھر یہ ہے کیا؟

سچائی تم کو کیوں، کیسے، کس لیے، کہاں اور کیوں کی زبان میں نہیں ملے گی۔ سچائی تو بس ہے اور ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں سوچا یا غور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو گزارا جا سکتا ہے۔ وارد کیا جا سکتا ہے۔ محبت کے اندر، موسیقی کے اندر، فطری مناظر کے اندر جب ذات گر جاتی ہے۔ صورت معدوم ہو جاتی ہے اور صرف فطرت باقی رہ جاتی ہے۔ اس وقت سچائی کا اور حق کا اور ٹروتھ کا ظہور ہوتا ہے۔

خود فرد ایک ناحقیقت ہے لیکن نافرد حقیقت ہے۔ میں ناحقیقت ہوں لیکن خدا حقیقت ہے۔

کسی نے آئن سٹائن سے پوچھا کہ سائنسی تحقیق میں کونسی چیز بنیادی درجہ رکھتی ہے؟ آئن سٹائن نے کہا "انا کی نفی"...... یہ بات ہے بھی حقیقت۔ انانیت اور خودنگاہی ہی جہل ہے جو دماغ میں سے اور انا سے بھرا ہو گا اس میں سچائی کے مہمان کے لیے ذرا سی جگہ بھی نہ نکل سکے گی۔

صبر اور تحمل

ہماری اندرونی سعیٔ مسلسل کے لیے صبر ایک نیکی ہے ایک virtue ہے۔ جب آپ کو یہ نہ پتہ چلے کہ اب کیا

کریں تو پھر کوئی مختلف کام کرنا شروع کر دیں۔ پریشان ہو کر کوئی پلاننگ شروع نہ کر دیجئے۔ کوئی سکیم نہ بنایئے۔ کوئی جواب تلاش نہ کیجئے۔ کہیں اور بھاگ کر نہ چلے جایئے۔ وہیں رُک جایئے جہاں آپ رُکے ہوئے ہیں۔ پرسکون ہو جایئے۔ انتظار کیجئے۔ لیکن فعلانا طور پر انتظار کیجئے۔ یہاں زمین پر اپنی زندگی کے بارے میں غور فرمایئے..... کوئی معلوماتی کتاب پڑھنا شروع کر دیجئے..... دوسروں کے ساتھ گفت وشنید کیجئے..... اپنے دماغ اور ذہن کی حرکتوں اور اس کے تقاضوں کا مطالعہ کیجئے۔

آپ کو خود ہی جواب مل جائے گا لیکن یہ وہ جواب نہیں ہو گا جس کی آپ کو توقع ہو گی۔ یہ آپ کی توقع سے مختلف ہو گا۔ آپ کو تو اپنا جواب "ہاں" یا "ناں" میں چاہئے ہو گا لیکن یہ ان دونوں سے مختلف ہو گا کیونکہ یہ متوقع جواب سے ماورا ہو گا۔ یہ "الجواب" ہو گا۔ لاشعوری خواہشوں کا متوقع جواب نہیں ہو گا۔

وہیں ٹھہرو اور وہیں رُکے رہو۔ یہ ٹھہرنا ہی تبدیلی پیدا کرے گا۔ آپ کی پوزیشن دیوار پر بیٹھے ہوئے انسان کی سی ہو جائے گی جو دیوار کے دونوں طرف دیکھ سکتا ہے۔ پھر آپ وہ نہیں رہیں گے جو یہ سوچتے ہیں کہ پتہ نہیں دیوار کے اُس طرف کیا ہے، پھر آپ دیکھیں گے۔ خود دیکھیں گے۔ جانیں گے اور سکون سے بیٹھے ہوں گے۔

آپ اپنی اندرونی طاقت سے بلاواسطہ طور پر تعلق پیدا کر سکتے ہیں اور کسی کی مدد کے بغیر اس سے گفت وشنید کر سکتے ہیں۔

سنوارنا

ایک دُکھی اور سوگی آدمی جب سوچتا ہے کہ اس کو دُکھوں سے اور مصیبتوں سے نجات حاصل کرنی چاہئے اور آنند میں رہنا چاہئے تو وہ ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے یعنی وہ ایسی چیزوں کی فہرست تیار کرنے لگ جاتا ہے جن سے اس کو بچنا چاہئے۔ اس فہرست کی تیاری میں وہ سب سے اہم چیز لکھنی بھول جاتا ہے کہ سب سے پہلے اُس کو اپنے آپ سے بچنا چاہئے مثلاً وہ پروگرام بناتا ہے کہ مجھے ان ان لوگوں سے تکلیف پہنچی ہے مجھے ان لوگوں کو چھوڑ دینا چاہئے اور ان کے بجائے کچھ دوسرے دوستوں کو اختیار کرنا چاہئے۔ لیکن وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ وہ نئے دوستوں کے پاس بھی اپنا پرانا آپ اور اپنے پرانے خیال لے کر جائے گا۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ جو شخص ذہنی ٹھوکریں کھاتا ہے وہ قدم کی ٹھوکر ضرور کھاتا ہے۔

ہر روز کا ایک وظیفہ یاد رکھیئے کہ مجھے اپنے آپ کو درست کرنا ہے اور اپنا آپ سنوارنا ہے۔

موتو قبل انتموتو!

ایسے مر جاؤ کہ وہ زندہ ہو جائے جو تمہاری اصل ہے۔ جو تمہارا جوہر ہے۔ انا کو مار دو کہ تمہارے اندر حق کا پودا پروان چڑھ سکے۔ اس کو جگہ مل سکے۔ اس کی نشوونما ہو سکے۔ ماضی کے لیے مر جاؤ کہ مستقبل کی طرف رجوع کر سکو۔ معلوم

اور علم کو ساتھ لے کر مر جاؤ تاکہ لامعلوم کا گیان حاصل ہو سکے۔ فرد کو ساتھ لے کر فوت ہو جاؤ تاکہ تمہارا دل زندہ ہو سکے۔ پھر سے دھڑ کنے کے قابل ہو جاؤ۔ تمہارا پھر اس سے تعارف ہو سکے۔ اپنے قریبی بلکہ قریب ترین دوست سے۔ جس کو تم نے ازل سے بھلا رکھا تھا اور فراموش کر دیا تھا۔

دل......اور......دماغ

اس کائنات میں دل بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ خطرناک اس لیے کہ یہ اکیلا رہتا ہے، اکیلا سوچتا ہے اور اکیلے ہی عمل کرتا ہے اور اکلاپے میں بڑا خوف، بڑا وہم، مسلسل ڈر ہوتا ہے۔ دماغ ہمیشہ عقلمندی کی اور حفاظت کی باتیں سوچتا ہے۔ اپنے آپ کو Cover کرنے کی اور محفوظ رہنے کی ترکیبیں وضع کرتا ہے۔ دماغ گروہ میں چلتا ہے اور اپنے اردگرد آدمیوں کا ہجوم رکھتا ہے۔ اسی جلوس سے اس کو تقویت ملتی ہے، سہارا ملتا ہے۔ سیاسی لیڈر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے رکھتا ہے۔

لیکن فقیر ہمیشہ اکیلا رہتا ہے۔ دل کے فیصلے کے مطابق خوفناک مقاموں میں، دل اور دماغ دونوں ہی سوچنے والے اعضاء ہیں۔ دونوں ہی پروگرام وضع کرتے ہیں۔ دماغ جب بھی سوچتا ہے اپنی لیڈری، اپنی برتری اپنی نمود کے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنی ذات کو مرکز بنا کر سوچتا ہے۔ دل جب بھی سوچتا ہے، محبوب کا گھر دکھاتا ہے، دل سے سوچنے والا ماریا تھریسا ہوتا ہے یا نشی ہسپتال کا خالق یا ایدھی......اس کی پہچان یہ ہے کہ یہ ہمیشہ اکیلا ہوتا ہے اور اکیلا ہی چلتا ہے۔

جو کوئی دل کی طرف مائل ہوا، وہ گرا، گرفتار ہوا، پکڑا گیا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں فلاں فلاں کی محبت میں گرفتار ہو گیا......گروہ میں بڑا مزا ہے۔ یہ آپ کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ آپ کے اردگرد لوگوں کا ہجوم جمع کر کے رکھتا ہے۔ جب آپ فوت ہو جاتے ہیں تو گروہ آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔ گروہ میں نئے لوگ آ کر شامل ہوتے رہتے ہیں اور پرانے چھوڑتے جاتے ہیں۔ گروہ کے لوگوں کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ حرکت میں ہیں، عمل میں ہیں لیکن ہجوم کہیں جا نہیں رہا ہوتا، کسی طرف کو بڑھتا نہیں۔ اس کی کوئی سمت نہیں ہوتی، یہ پابہ زنجیر فیل کی طرح ایک ہی جگہ پر جھومتا رہتا ہے اور گروہ کے شامل لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ وہ حرکت کر رہے ہیں۔

دماغ ہمیشہ اور اور اور کا طلبگار ہے۔ حل من مزید پکارتا رہتا ہے۔ یہ اس حقیقت کو بالکل نہیں جانتا کہ تمہارے پاس پہلے سے کیا ہے اور تمہارے قبضے میں کیا کچھ ہے۔ یہ تو بس اور اور اور مزید مزید کا شکار ہے......تم چاہے فقیر ہو، یہ اور مانگے گا، شہنشاہ ہو یہ اور مانگے گا۔ ایک دولت مند شخص ہمیشہ غریب رہتا ہے کیونکہ وہ اور کا طلبگار ہوتا ہے۔

انسانی فطرت

دوسروں کی مہر تصدیق

کبھی تم نے اپنے گلے کے پھندے کو دیکھا ہے۔ سانس گھٹی ہوئی آنکھیں باہر نکلی ہوئیں۔ یہ دوسروں سے تصدیق کا پھندا ہے۔ تم دوسروں کے سامنے خوش' کامیاب' مکمل اور پر باش رہنا چاہتے ہو ان کو خوب تر ہو کر دکھانا چاہتے ہو۔ اس پھانسی کو اتار پھینکو۔ اس طرّے کو دفع کرو۔ اس کی بدولت تم ایک جھوٹی خواہش میں مبتلا ہو۔ اس جھوٹی خواہش سے تم تقویت حاصل کرتے ہو لیکن یہی خواہش تمہاری ساری توڑ پھوڑ کی بنیاد ہے۔ آج ایک فیصلہ کر لو کہ تمہیں کیا چاہیے۔ اپنی زندگی یا دوسروں کی مہر تصدیق!!

تم پر کس کا تصرف ہے۔ ایک جابر شخص کا! جس سے تم ہر وقت خوفزدہ رہتے ہو کہ ایک دن تم کو چھوڑ دے گا۔

تم پر کس کا قبضہ ہے۔ ایک اعصابی تیزی کا۔ ایک جان لیوا خواہش کا کہ دوسرے کو منائے رکھو اسے لبھائے رکھو۔ دفع کرو۔ سب کا قبضہ چھڑوا دو اپنی ذات کا خود قبضہ لے لو۔

دیکھو! ساری زندگی ایک چیز بالکل برداشت نہ کرنا۔ یہ ہرگز برداشت نہ کرنا کہ تمہاری زندگی اس طرح کی رہے جیسی کہ اب ہے۔ اس کو ایسا رہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اٹھو اور اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ شاباش!

رائے عامہ

ایک مرتبہ کسی شخص کو چند آراء درکار تھیں اور وہ مارکیٹ میں انہیں خریدنے کے لیے جا پہنچا۔ جہاں طرح طرح کی رائیں فروخت ہو رہی تھیں۔ مارکیٹ نہ صرف مختلف راؤں سے بھری ہوئی تھی بلکہ وہ سستی بھی تھیں اور ارزاں بھی۔ اس نے اپنی پسند کی ڈھیر ساری رائیں خریدیں اور خوشی خوشی گھر واپس آ گیا......اب تو اس کے مزے ہو گئے۔ شام کے وقت وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ملتا اور اپنی نئی آراء ان کے ساتھ بھڑاتا۔ بڑی پر لطف محفل رہتی لیکن آخر وقت میں ان کے درمیان جھگڑا ضرور ہوتا اور معاملہ ہاتھا پائی تک پہنچ جاتا۔ کچھ زدوکوب بھی ہوتی۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ وہ آپس میں ناراض نہ ہوتے اور دوسری شام پھر اکٹھے بیٹھ کر آراء لڑانے لگتے۔ دراصل ان کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے اور جھگڑنے میں مزا آنے لگا تھا اور یہ ان کی زندگی کا ماحاصل بن گیا تھا۔

ایک روز اس شخص کو اس روز کی دانتا کلکل سے نفرت ہوگئی اور وہ یہ مسئلہ سلجھانے کے لیے ایک بابا کے پاس پہنچا۔ بابا نے کہا" سن بچے! ہر خریدی ہوئی اور مستعاری لی ہوئی رائے کے علی الرغم ایک اور رائے بھی ہوتی ہے۔ لوگ ان آراء کو حقیقت سمجھ کر سینے سے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کی حفاظت اور بقاء کے لیے جان لڑانا شروع کر دیتے ہیں..... لیکن میں تمھیں ایک بھید کی بات بتاتا ہوں کہ ایک "واحد رائے" کو پکڑ لو۔ اس کے اُلٹ اور کوئی رائے نہیں ہے۔ اس "واحد کلام" کو کچھ لوگ خدا کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔

شعور اور آزادی

اس دنیا میں ہر شخص کچھ میکانکی اصولوں کے تحت جنم لیتا ہے مثلاً منفی روّیے سارے کے سارے میکانکی ہوتے ہیں۔ جب ایک آدمی دوسرے آدمی پر ظلم کرتا ہے تو مظلوم اس سے بدلہ لیتا ہے اور اسی طرح کرتا ہے۔ دونوں ہی اپنی پیش قدمی میں میکانکی انداز اختیار کرتے ہیں۔ دونوں کو سزا ملتی ہے کہ دونوں ہی جہل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ موجودہ انسانیت کا یہی روّیہ ہے اور اس کی مثالیں جابجا پھیلی ہوئی ہیں۔

شعور سے ہم اصل بات کی طرف اور اصل معاملے کی طرف رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ میکانکی عمل نہیں ہوتا۔ ان چند باتوں پر توجہ رکھئے اور سوچتے رہیے:

تمھاری سوچ تمھاری زندگی متعین کرتی ہے۔

آپ کی اصل نیچر آپ کے مستقبل کو جنم دیتی ہے۔

تمھارا روّیہ تمھارے تجربات کو متوجہ کرتا ہے۔

اور تمھارے ارادے تمھاری منزل کا پتہ دیتے ہیں۔

تمھاری سوچ' تمھاری طبیعت' تمھارا روّیہ اور تمھارا ارادہ شعوری ہونا چاہیے میکانکی نہیں۔

غلط فہمی کا ازالہ

یاد رکھئے' کوئی دوست کوئی اجنبی کوئی راہگیر آپ کو ذہنی یا جذباتی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کسی میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکے۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ تم غلط قسم کے ردِعمل سے خود کو مجروح کر لیتے ہو اور شدید زخمی ہو کر بیٹھ جاتے ہو۔ کسی بے عزتی کی وجہ سے ناساز ہو جاتے ہو۔ اب آپ کی بے عزتی کیوں ہوتی ہے۔ بے عزتی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ تمھارے وجود کا ایک حصہ لوگوں سے ادب اور لحاظ ملاحظے کا متمنی ہوتا ہے۔ اب یہ تمنا کیوں ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتی ہے کہ آپ اپنی نام نہاد عزت کی توثیق چاہتے ہیں اور ہر کسی سے چاہتے ہیں۔ اس توثیق کی کیا ضرورت ہے اس توثیق کی یوں ضرورت پڑتی ہے کہ آپ ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا ایک اور وجود بھی ہے اور وہ الگ ہے۔ اور اس کا آپ کی ساری اکائی اور سارے وجود اور پورے Whole سے کوئی تعلق نہیں..... اس دردناک عذاب کی وجہ؟ وجہ

یہی کہ آپ سوچتے نہیں۔ اپنے آپ کو پورا وقت نہیں دیتے۔ اپنی توجہ سے باہر پھرتے رہتے ہیں۔ سوچئے اور ذرا اپنے آپ کو وقت دیجئے۔

کثیر المقاصد

اگر آپ کو لندن جانا ہے اور لندن آپ کی منزل ہے تو پھر آپ پیرس کو فراموش کر دیں۔ اگر آپ اپنے اندر کوئی نئی جگہ کوئی نیا وجود تلاش کرنا چاہتے ہیں تو پھر وہ سب کچھ بھلا دیں جس کا اس تلاش سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک نظر اٹھائیں اور فیصلہ کریں کہ آپ کو کہاں پہنچنا ہے۔ بہت ممکن ہے آپ کو ذہنی تبدیلی کی ضرورت زیادہ محسوس ہو اور اس کے لیے آپ جسمانی تبدیلی ترک کر دیں۔ ممکن ہے آپ ان تمام لوگوں کے مشورے پس پشت ڈال دیں جن کے کچھ مقصد آپ سے وابستہ ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ کو اس اصول سے بھی انحراف کرنا پڑے کہ عافیت مجلسی میل جول میں پوشیدہ ہے..... بس اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے ایک سیدھا راستہ اختیار کریں۔

آج آپ نے اپنی خوراک پر دھیان دیا

جی ہاں دیا اور بڑی اچھی' صاف ستھری اور صحت مند خوراک کھائی

کیا آپ نے اپنے کپڑوں کی طرف توجہ دی؟

جی جناب! کپڑے عین موسم کے مطابق اور رواج کے مطابق پہنے

کیا آپ نے ان خیالات پر توجہ دی جو آپ کے ذہن میں آئے؟

نہیں جناب! خیالات پر تو ہم نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ خیال آتے رہے اور جاتے رہے۔

ایک عام آدمی' اپنی خوراک پر توجہ دیتا ہے۔ کپڑوں پر دیتا ہے۔ میک اپ پر دیتا ہے لیکن اپنے خیالات کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا۔ نہ ہی ان پر کوئی توجہ دیتا ہے اور یہ خیالات ہی ہیں جو اچھے کپڑے پہننے اور اچھا کھانا کھانے کے باوصف ہم کو بے چین رکھتے ہیں۔ ہم کو بیزار رکھتے ہیں۔ ہمیں کنٹرول کرتے ہیں۔ انہی کے مطابق ہم اپنا روّیہ طے کرتے ہیں۔

خیالات کا تجزیہ اور ان کا انتخاب ہی آپ کی اندرونی اور بیرونی دنیا طے کرتا ہے اور خیالات ہی آپ کو استقامت عطا کرتے ہیں۔

زیادہ صفائی کے ساتھ سوچنا' توجہ کے ساتھ ایک تازہ بصیرت کو پکڑنا اور اپنے اندر سے خود اذیتی کے سارے سلسلے دفع کر دینا ہی سب سے بڑا عمل ہے اور روزمرہ زندگی میں یہی عمل قدم قدم پر کام دیتا ہے اور منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

گورو نے کہا" دوسروں پر حکم جتانا اور دوسروں پر رعب رکھنا سب سے بڑی بیماری ہے۔"

"لیکن گورو جی! اس دنیا کو چلانے کے لیے مضبوط اور تگڑے لیڈروں کی ضرورت ہے۔"

"اوپر سے اچھا اور تگڑا بننے کی آرزو ختم کر دو اور اپنے آپ سے لیبل اتار دو۔"

انسانی فطرت کی وضاحت کرتے جائیں اور اس کا تجزیہ کرتے جائیں آپ کے سامنے ساری صورت حال واضح ہو کر آ جائے گی۔ جس قدر کسی شخص نے اپنے اندر کم تبدیلی پیدا کی ہو گی اس قدر وہ دوسروں سے تبدیلی کا خواہاں ہو گا اور اس قدر وہ دوسروں کو تبدیل کرنے پر زور دے گا۔

''پھر اس زندگی میں عمل کا کیا مقام ہو گا؟''

عمل کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ اپنے اندر کی غلط فہمیوں کو ایک ایک کر کے پکڑا جائے اور ان کا ازالہ کیا جائے۔ علم بغیر عمل کے ایسے ہی ہے کہ بڑی محنت کے ساتھ ایک خط لکھا جائے اور اُسے پوسٹ کرنے کے لیے ڈاک خانے کی طرف چلا نہ جائے۔

جو شخص اس تصور کا حامل ہے کہ لوگ اس کے ذاتی خیالات اور اس کی ذاتی خواہشوں کی تصدیق کریں اور ان پر عمل کریں تو وہ ایک ایسا شخص ہو گا جس کا یقین ہو گا کہ سوائے اس کے اور کسی کا ذہن ہے ہی نہیں اور صرف اسی کے ذہن کو زندہ رہنے کا حق ہے..... لیکن احتیاط کرنا خود نگری کا یہ عمل ہی خود شکستگی کا باعث بنتا ہے اور اس سے خود آزاری کا عمل پیدا ہوتا ہے۔

اس دنیا کے جھگڑے، لڑائیاں اور دردمندیاں کوئی بھید نہیں۔ اس کی چند وجہیں ہیں کہ:

ہم ایک دوسرے کو اس لیے آزار پہنچاتے ہیں کہ ہم خوفزدہ ہیں۔

ہم اس لیے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کون ہیں۔

ہمیں اس لیے پتہ نہیں چلتا کہ ہم کون ہیں کہ ہم نے کبھی اس کی تحقیق ہی نہیں کی۔

لوگوں کی ناراضگی

افریقہ کے جنگلوں میں ایک مہم جو کسی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس کو وحشیوں نے گھیر کر ختم کرنا چاہا تو اس نے وحشی قبیلے کو چند چھوٹے چھوٹے تحفے اور بیکار سی چیزیں دے کر انہیں رام کر لیا اور آگے نکل گیا۔ آگے پھر وہ پکڑا گیا۔ یہاں بھی اُس نے قلم، چاقو اور سگریٹ لائٹر وغیرہ دے کر انہیں راضی کر لیا اور آگے بڑھ گیا..... یہی حال باطن کے سفر کا ہے۔ اس میں بھی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں دے کر اور کچھ چھوڑ کر آگے کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔

مجمع میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا میں اپنے باطن کے سفر کے لیے ایک چیز چھوڑتا ہوں اور وہ ہے لوگوں کو ہر حال میں خوش رکھنے کی آرزو..... آج کے بعد سے میری یہ آرزو نہیں رہے گی۔ اب تک میں ہر شخص کو خوش کرنے کی تمنا کا ایک قیدی تھا۔ اب میں اس قید سے آزاد ہوتا ہوں اور فارغ البال اور خوش باش انسان کی زندگی بسر کرتا ہوں۔

معافی

انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں اور نظریوں سے معافی حاصل نہ کرو اور نہ کسی سے معافی چاہو۔ اس ضمن میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ پہلے خود اپنے آپ کو معاف کرو۔ جب شعور بیدار ہوتا ہے اور میکانکی فعل اور ردِ عمل ختم

ہونے لگتا ہے تو اپنے آپ کو معاف کرنے کا عمل سمجھ میں آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ جب ماضی کو بھلا دینے کا اور ختم کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے اور ''حال'' میں زندگی بسر کرنے کی آگہی عطا ہوتی ہے تو پھر یہ روشنی نمودار ہوتی ہے۔ ''حال'' ایک طویل زمانہ ہے اس کا کوئی ماضی نہیں، جب ماضی نہیں تو کوئی پشیمانی بھی نہیں۔

آزادی اور آزادی کے اصول

1- آزاد رہنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ آپ کو دوسروں کے سامنے وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس نہ رہے۔

2- کوئی شخص اپنی زندگی کو مجروح کرنے کا حق طلب نہیں کر سکتا اور ساتھ ہی اس سے الٹ حق کا طلبگار نہیں ہو سکتا کہ میں نے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے اب تم اس کو ٹھیک کر کے دو۔

3- سرّی علم دوسرے تمام علوم سے مختلف ہے۔ اس کی تربیت مختلف طور پر ہوتی ہے۔ جونہی آپ نے تسلیم کر لیا کہ آپ غلطی پر ہیں آپ راستی کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

4- پورے ذوق اور تندہی کے ساتھ حقیقت کو تلاش کرنے کے لیے ویسی زندگی بسر کرنے کی خواہش بھی لازمی ہے جس کا آپ نے علم حاصل کر لیا ہے۔ ایک نے نواز اس لیے اچھا نے نواز نہیں ہے کہ اُس نے کتنی دیر تک بانسری بجائی بلکہ یہ ہے کہ اس نے کیسی بانسری بجائی۔

رہنما اصول

1- درد کا طلبگار شخص سینکڑوں غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک درس سے دوسرے درس کی طرف بڑھتا ہے اور ایک پیر کو چھوڑ کر دوسرا پیر پکڑتا ہے۔

2- کامیابی کا دارومدار جرأت پر ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس نے سچ کی تلاش میں تن آسانی کو ترک کیا یا نہیں۔ جذباتیت سے منہ موڑا یا نہیں۔

3- کسی تعلیم کو اس لیے تو اختیار نہیں کر لیا کہ اس میں حفاظت کا اور Security کا سامان بہم ہے۔

4- راستی اور ناراستی کو سمجھنے کے لیے اپنی عقل استعمال کی یا نہیں۔

دوسروں کا رویّہ

جس شخص کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں اٹھتا کہ دوسروں کو کس طرح اس کے ساتھ پیش آنا چاہئے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے اس نے زندگی کا راز معلوم کر لیا۔

''چاہئے'' کے اندر ایسا تقاضا موجود ہوتا ہے جو متقاضی کو اور اس کے تقاضے کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اس کو مسمار کر دیتا ہے۔ اصل میں تقاضا ہی متقاضی کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ متقاضی وہ شخص ہوتا ہے جو اب تک یہ سمجھ رہا ہوتا ہے

کہ اس کی اپنی علیحدہ ایک دنیا ہے علیحدہ ایک شخصیت ہے جس کی دوسروں کو عزت کرنی چاہیئے اور اُسے تسلیم کرنا چاہیئے۔
اپنی حقیقت سے انحراف کرنے اور اپنے وہم اور خیال باطل کو سچ مان لینے ہی سے ساری تباہی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے غصہ اور گرج پیدا ہوتی ہے اور جب دو اسی قسم کے لوگ ملتے ہیں تو ایک دھما کا پیدا ہوتا ہے۔ اس زمین پر ہر سیکنڈ کے اندر کروڑوں اس قسم کے انسان ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اخبار میں ٹکراؤ کی سرخیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں اور اخبار والے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شائع کرتے ہیں۔ تقاضے سے انحراف اور ''چاہیئے'' سے آزادی حاصل کرنے کے بعد آپ میں بے پناہ روحانی قوت پیدا ہونے لگ جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کی Tension اور آپ کا تناؤ ختم ہوتا ہے۔ پھر جب اپنی خیالی شخصیت کی جگہ حقیقی شخصیت آموجود ہوتی ہے تو کشمکش اور جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک تکلیف دہ سفر کے بعد واپس اپنے گھر پہنچ گئے ہیں اور پر سکون ہو گئے ہیں۔

تحقیر اور افتادگی مدد کرتی ہے

اپنے اندر کی کشمکش کو ختم کرنے کا ایک فیصلہ کرو پھر اس فیصلے کے نتائج پر کوئی تبصرہ کرو نہ تجزیہ..... آپ حیران ہوں گے کہ سچ کی طرف رجوع کرنے سے آپ کے اندر بے پناہ قسم کی بے یقینی پیدا ہو گی۔ اصل میں ہم اپنی آزادی سے خوفزدہ ہونے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ خوف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہم اپنے نام اور اپنی شان کے مجروح ہونے کی تاب نہیں رکھتے۔ لیکن نام اور شان کے معدوم ہونے سے ہی آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ نام اور شان انسانی زندگی کی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ہیں۔ تحقیر کو یا ''ادئے ادئے'' کو آپ ایسے سمجھیں جیسے کوئی تاریخی ایکٹرا اپنے کاسٹیوم کے بغیر سٹیج پر آ جائے اور سیٹیاں بجنے لگیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس ایکٹر کو بڑی خفت ہو گی لیکن جلد ہی اس کو اس شخص کا خیال آ جائے گا جو اس کاسٹیوم کے اندر تھا' پھر وہ آسان ہو جائے گا اور پرسن ہو جائے گا۔

اصل میں مکمل خفت اور مکمل شرمندگی اور پوری پوری افتادگی ہی وہم' وسواس اور fantasy کے تصور کو ختم کرتی ہے۔ اس کے بعد آزادی ہی آزادی ہے۔

عادت

کسی عادت کو ختم کرنے کے لیے ہمارے خیالات اس کو اور مضبوط کر دیتے ہیں کیونکہ خیال خود ایک عادت ہے۔ میکانکی خیال کسی بھی عادت کا خاتمہ نہیں کر سکتا' کیونکہ خیال خیال کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھ سکتا۔ ایک گڑھے میں گرا ہوا انسان اپنے آپ کو استعمال کر کے اور خود کو بروئے کار لا کر گھڑے میں سے نہیں نکل سکتا۔ اس کو ماورائے گڑھا یا گڑھے سے الگ کسی چیز کا سہارا لینا ہو گا۔ اب یہ کون سی طاقت ہے جو اس کو گھڑے سے نکالے۔ یہ خاموشی ہے۔ وہ خاموشی جو دو خیالوں کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ آرام سے اپنے ذہن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دو خیالوں کے درمیان واقعی ایک چھوٹا سا وقفہ ہے۔ اب یہ وقفہ اور یہ خاموشی میکانکی نہیں ہے' کیونکہ یہ خیال نہیں ہے اور جب خیال نہیں ہے تو

عادت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ یہ عادت کو توڑ بھی سکتا ہے اور آپ کو گڑھے سے نکال بھی سکتا ہے۔

طعن اغیار

مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اپنے طعنوں کی بوچھاڑ مجھ پر کر رہے ہیں۔ مجھ پر تنقید کر رہے ہیں۔ مجھ پر ہر وقت نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے۔ گویا میں ایک ٹارگٹ ہوں۔ ایک ہدف ہوں جس پر ہر کوئی تیر چلا رہا ہے۔

ٹارگٹ بننے کے خیال سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ تیر بننا چھوڑ دیں۔ ٹارگٹ اور ایرو۔ ہدف اور تیر ہمیشہ ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور یہ دونوں ہی آپ کے اندر موجود رہتے ہیں ہر وقت اور ہر گھڑی۔ جونہی آپ تیر چلانا چاہتے ہیں یا کوئی تیر چلاتے ہیں تو اپنے اندر ایک ٹارگٹ فٹ کر کے چلاتے ہیں۔ تیر اندازی کے کھیل میں یہ دونوں ہی ضروری سامان کی حیثیت رکھتے ہیں..... جب آپ کسی پر اپنے غصے کا تیر چلاتے ہیں تو اس کے جوابی تیر کے لیے فوراً ایک ہدف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب یہاں ایمانداری کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ ایک بے ایمان اور بے انصاف شخص یہی سوچے گا کہ وہ صرف ہدف ہی ہدف ہے' تیر نہیں ہے۔ لیکن جب اس کو آسانی عطا ہو گی تو وہ بڑی ایمانداری سے کہے گا کہ میں ہر ایک کا نشانہ ہی نہیں' ہر ایک کے لیے تیر بھی ہوں۔

''یہ جو ہر وقت ذہنی سحر کے اندر رہتے ہو اور خیالی دنیا کو ہی اصل سمجھتے ہو تو اس کا مقابلہ حقیقت کی دنیا سے بھی کیا کرو۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ پابندی کے ساتھ اپنے آپ سے باہر نکل کر دیکھو اور اپنے دن بھر کے معاملات پر منشی بن کر نظر کرو۔ جب آپ ایک دیانتدار منشی بن کر معاملات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ دوسروں سے برتر ہو کر زندگی گزارنے کے خواہشمند ہیں۔ آپ اپنی مرضی اور پروگرام کے اندر ذرا سا خلل بھی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ اپنے بارے میں کس قدر کم جانتے ہیں اور آپ نے اپنے اردگرد کتنے خوابوں کو لپیٹ رکھا ہے۔''

شناخت اور تشخص

آج ذرا اپنی شناخت تو کروائیں۔ بتائیں تو کہ آپ کون ہیں اور کس طرح کے ہیں؟

اپنا تشخص اُس اعتقاد کا نام ہے کہ فلاں شے نے مجھے یہ شناخت عطا کر رکھی ہے: مثلاً دولت' حسن' جوانی' اقتدار' طاقت..... مقبولیت۔ آپ ان میں سے کسی کے ساتھ وابستہ ہو کر اپنی شناخت کرتے ہیں اور کرواتے ہیں۔

مثلاً آپ کہتے ہیں کہ میں نے اس معرکے میں کامیابی حاصل کر لی اس لیے میں ایک کامیاب انسان ہوں اور یہی میری شناخت ہے..... لیکن یہ ایک بہت بھاری غلطی ہے کیونکہ آپ نے محض ایک تصور کو ایک خیال کو اپنا وجود اور اپنی شناخت بنا لیا ہے۔ اب اس ایک غلطی سے اور بہت سی غلطیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ آگے ہی آگے پھیلتا جاتا ہے۔

عام طور پر انسان اپنی شناخت اپنی باہر کی مصروفیت اور باہر کے تعلقات سے کراتا ہے کسی شے کے پیچھے بھاگنے

اورکسی چیز میں گرفتار رہنے کو اپنے اعزاز کی وجہ سمجھتا ہے اور وہ اس دھوکے میں بتلا رہتا ہے کہ وہ اپنی اس Activity کی وجہ سے معتبر ہے۔

نقالی

ایک بات پکی کر کے یاد رکھیں کہ جب آپ کسی اور شخص کی نقالی کرتے ہیں کسی اور طرح کا بننا اور ڈھلنا چاہتے ہیں' کسی اور کے عادات اور اطوار اختیار کرنا چاہتے ہیں تو پھر لازماً آپ اس شخص کے مسائل اور اس کی بے چینی بھی اختیار کرلیں گے کیونکہ اس سے فرار ممکن نہیں۔

جب آپ کسی شخص کو کوئی اچھا سا جملہ استعمال کرتے سنیں گے تو آپ اس فقرے کی حقیقت میں اترے بغیر اُسے فوراً ہی استعمال کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور لوگوں کو اسی طرح متاثر کریں گے جس طرح آپ اس شخص سے متاثر ہوئے تھے۔لیکن اس سے خیر نہیں پڑے گی اور یہ فقرہ فقرہ ہی رہے گا۔

حقیقی زندگی کی طرف رجوع کرنے کے لیے سب سے پہلے نقلی اور نقالی کی بود و باش کا گہرا مطالعہ کر کے اس احساس کو جنم دینا ہوگا کہ میں نقالی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

ایک ہی دنیا

آپ نے ابھی کہا کہ اندر کی اور باہر کی دنیا دو نہیں ہوتیں' ایک ہی ہوتی ہے' یہ ایک ہی دنیا کیا ہے؟

آج ذرا دیر بیٹھ کر اور اپنے آپ پر توجہ دے کر یہ تو معلوم کریں کہ آپ کے اپنے ساتھ کیسے تعلقات ہیں۔آپ اپنے آپ سے لڑائی تو نہیں کیے بیٹھے۔آپ نے خود سے بول چال تو بند نہیں کر دی۔اندر کوئی جھگڑا تو نہیں ہو رہا۔کوئی گھبراہٹ تو نہیں۔اب ذرا باہر کی دنیا دیکھیں اس کا معائنہ فرمائیں۔آپ حیران ہوں گے کہ لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلقات عین عین اسی طرح کے ہیں جس طرح کے آپ کے اپنے ساتھ ہیں۔

دیکھیے ایک بھیڑیا بھیڑیا ہی ہوتا ہے' اندر رہے یا باہر' اس کو اون کا کوٹ پہنا دینے سے وہ لیلا نہیں بن جاتا۔

اب ایک خوشی کا پیغام سنئے اور وہ یہ کہ جونہی آپ خودنگری سے اپنے اندر کا مطالعہ کر کے اُسے ٹھیک کر لیتے ہیں آپ کے باہر کے سارے معاملات خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں اور ساری دنیا خوشگوار موڈ میں داخل ہو جاتی ہے۔

ہم آہنگی

انسان کو ازل سے ''زندگی کا مسئلہ'' درپیش ہے۔اس کے بڑے اور سیانے یقین دلاتے ہیں اگر وہ یہ مسئلہ حل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور اس پر غور کر کے اور محبت کر کے اس کا حل تلاش کر سکتا ہے۔لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اس مسئلے کا کوئی حل ملتا نہیں اور جب حل نہیں ملتا تو بیزاری بڑھتی ہے اور جب بیزاری بڑھتی ہے تو اس سے مزید تناؤ پیدا ہوتا ہے

بے چینی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں پہنچ کر انسان کو غور کرنا چاہیے۔اصل میں یہ مسئلہ ہی غلط ہے اور اس پر غلط انداز میں ہی سوچا جا رہا ہے۔ ان کو شہرت کی مقبولیت کی اور پیسے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی صحیح انسانی اور Real person ہونے کی ہے۔ہم سے یہ نہیں کی جاتی کہ ہم جوان رہیں' خوبصورت رہیں' توجہ کا مرکز رہیں.....ہم سے یہ امید البتہ کی جاتی ہے اور ہم کو اس کی دعوت ضرور دی جاتی ہے کہ ہم اپنی ذات اپنی طبیعت اور اپنی نیچر کے مطابق ایک ہم آہنگی کے اندر بہتے چلے یں اور تالیاں بجاتے جائیں۔

نکتہ چینی

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ کسی کی تھوڑی سی نکتہ چینی بھی آپ کو اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔آپ جل بھن اتے ہیں اور بس کھولنے لگتے ہیں کہ میرے نام اور میرے کام پر ایسی نکتہ چینی! اگر آپ ایک غبارے پر پاؤں رکھ دیں تو ہوتا ہے۔ایک زور کا دھماکا ہوتا ہے اور بیلون پھٹ جاتا ہے۔یہی حال خالی خالی اور تھوتھے انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔اصل میں وہ اپنے تھوتھے پن کی مدافعت کر رہے ہوتے ہیں اور ہر وقت اُسی کو بچانے میں مصروف ہوتے ہیں۔

خودشناسی

خودشناسی کے لیے اپنے وجود کے دروازے پر دستک دو اور بڑے زور سے دو۔اس میں شرمندہ ہونے کی کوئی ت نہیں۔تم پر نہ نکتہ چینی ہوگی اور نہ ہی دروازہ کھولنے سے انکار کیا جائے گا۔جو شخص نیک نیتی سے اور سچائی سے دروازے ستک دیتا ہے اس کے لیے دروازہ ضرور کھلتا ہے۔اس وقت تک دستک دیئے جاؤ جب تک دروازہ کھل نہیں جاتا۔

پتہ ہے ہم دروازے پر' اپنے ہی دروازے پر' دستک دینے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی ذات کے لیے دوسروں کو نمائندہ بنا کر رکھا ہوتا ہے۔کسی شخص کو' کسی بڑے کو' کسی انجمن کو کسی تحریک کو.....انسان گو اپنے آپ کو آزاد کہتا ہے اور آزاد سمجھتا ہے لیکن اُس نے اپنی ذات اور اپنے آپ کی نمائندگی کا فریضہ ترک کر رکھا ہوتا ہے۔وہ لوگوں کو ہی اپنا نمائندہ بنا کر اپنا بیان دیتا ہے۔وہ خود بھی بیان دے سکتا ہے اور کبھی کبھی دیتا بھی ہے لیکن انسان بہ یک وقت دو جگہوں پر کھڑا نہیں ہو سکتا اور یہ راز اپنی ذات کی خود نمائندگی کرنے والے کو اچھی طرح سے معلوم ہے۔

خلا

آپ کو ہر شخص یہ شکایت کرتا ہوا ملے گا کہ زندگی میں کچھ کمی سی ہے۔کچھ خلا سا ہے لیکن کوئی بھی یہ نہیں بتا سکے گا کہ وہ کمی کیا ہے.....میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ کمی کیا ہے۔وہ ہے ایکتائی کا فقدان۔Want of Oneness.....اصل میں ہمارے اندر ایکتائی کا فقدان نہیں ہے کیونکہ ہم ہیں ہی ایکتا۔ ہیں ہی Oneness.....لیکن اس ایکتائی کا بظاہر فقدان ہمیں

احساس اور Realization نہ ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ اس وقت دنیا بھر کے لوگ دیوانوں کی طرح کشتی کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے پر بھاگ رہے ہیں اور کشتی میں سوار نہیں ہوتے..... کشتی میں سوار ہونے کا راز ہی Oneness کا راز ہے۔

شخصیت کا ٹکراؤ

ہم نے اکثر سنا ہے اور دیکھا بھی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ شخصیتوں کا ٹکراؤ کیوں ہوتا ہے۔ اصل میں یہ دو الجھی ہوئے شخصوں کے درمیان کا قصہ ہے جو اپنے دلائل باطل ہو جانے کے خوف سے انہیں جتوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بحث میں وہ جیتنا اس لیے چاہتے ہیں تاکہ اپنی جو تصویر انہوں نے اپنے ذہن میں بنا رکھی ہے اس کو تقویت پہنچائی جا سکے۔ لیکن خیالوں کو اور سایوں کو کوئی بھی تقویت نہیں پہنچا سکتا اس لیے وہ سارا جھگڑا اور بحث مباحثہ اکارت جاتا ہے..... ایک آزاد انسان کبھی بھی ایسے ٹکراؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ الجھتا ہی نہیں اور کسی سے لڑتا ہی نہیں کیونکہ اُسے کوئی بات پایہ ثبوت کو پہنچانی ہی نہیں ہوتی۔ یہ اس کی ذمہ داری ہی نہیں ہوتی' وہ اپنے خود ساختہ فوٹو گرافوں سے بہت اونچا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص غصے سے اس پر چڑھائی بھی کرتا ہے تو بھی وہ خاموش رہتا ہے۔ اس کو کچھ ہوتا ہی نہیں۔

لیکن اُس کو کچھ کیوں نہیں ہوتا؟

غصہ صرف اس وقت حملہ کرتا ہے اور اس وقت تکلیف دیتا ہے جب یہ انسان کی جھوٹی شخصیت اور جھوٹے وجود کو سٹرائیک کرتا ہے۔ ایک آزاد انسان کا جھوٹا سیلف ہوتا ہی نہیں۔

ایک غلط فہمی

آپ کو کئی مرتبہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک خاص شخص آپ پر بڑی توجہ دیتا ہے۔ آپ سے بڑا پیار کرتا ہے آپ کے بغیر رہ نہیں سکتا..... لیکن جیسا کہ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے ایک روز آپ پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اس نے تو کبھی بھی آپ کی پروا نہیں کی۔ کبھی بھی آپ پر توجہ نہیں دی۔ وہ تو اب تک آپ کو اپنی ذاتی غرض کے لیے استعمال کرتا رہا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا رہا ہے۔ اس احساس سے آپ کا خوبصورت اور سہانا سپنا ٹوٹ جاتا ہے۔ اس وقت آپ کو شدید غصہ آتا ہے ساتھ ہی ندامت بھی ہوتی ہے کہ میں اب تک اُلو ہی بنتا رہا..... لیکن اب ضرورت اس امر کی ہے کہ آپ فوراً اس جذباتی گڑھے سے نکلیں اور اپنے ٹوٹے ہوئے خواب کی کرچیاں ایک ایک کر کے ملاحظہ کریں۔ یہ ساری کی ساری کرچیاں سونے کی ہیں۔ ان کو ملاحظہ کیجئے اور جان جائیے کہ آپ اب تک سو رہے تھے۔ اگر آپ سو نہ رہے ہوتے تو نہ یہ خواب آتا اور نہ ہی سہانا سپنا اس طرح سے ٹوٹتا۔ اب آپ جاگ گئے ہیں اور خواب کی حقیقت سمجھ گئے ہیں۔ اب مہربانی کر کے جاگتے ہی رہیے اور آئندہ کسی ایسے خواب کی توقع نہ کیجئے۔ کیسی اچھی بات ہے کہ آپ جاگ گئے ہیں اور آپ نے خواب کی دنیا میں جانا چھوڑ دیا ہے۔

کامیابی کے گُر، ترقی

ترقی Progress

آپ اس قدر سمجھ پائیں گے جس قدر سمجھنے کی آپ میں خواہش ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اگر آپ میں ترقی کی رفتار کم ہے تو اپنی آرزو کا جائزہ لیں۔

روحانی درجات میں بڑھوتری کی بس ایک ہی پڑتال ہے جب سالک کسی تحریک کسی واپرتا اور کسی القا سے بے نیاز ہو جائے۔

اصل میں انسان تضاد کی پڑیا ہے۔ اس کے اندر رسہ کشی کا عمل جاری ہے۔ انسان کا ایک حصہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کا گرو ہو، صاحب ہو، اتھارٹی ہو جو اس کو مخصوص کام کرنے کے حکم صادر کرے۔ اس کے لیے راہ متعین کرے اور اس کو آزادروی سے اور شتر بے مہاری سے روکے۔ دوسری طرف اس کا ذہن جبلی طور پر اسے کسی کا محکوم ہونے سے منع کرتا ہے اور اس کو بغاوت پر اکساتا ہے۔ جو لوگ اپنی ذات پر سری رمز وارد کرتے ہیں وہ اس الجھن سے نکل کر صاف ستھرے ہو جاتے ہیں اور سوکھے سوکھے رہتے ہیں۔

کامیابی کے گر

کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک کامیاب انسان نے مسکرا کر کہا کہ تاریکی ٹھنڈی ہوا کو چلنے سے نہیں روک سکتی نہ ہی بداندیش سوسائٹی ایک مخلص روح کے عمل میں رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔

آدمی کتنا بھی زور لگا لے کوئی شخص اپنے عمل بد کو چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن اگر اُس میں بصیرت پیدا ہو جائے اور وہ اس عمل کے تجزیے پر اتر آئے اور اس کو اچھی طرح سے سمجھ جائے تو پھر وہ عمل بد خود اس کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

ایک بڑی کتاب یا ایک عمدہ لیکچر اُسی شخص کو متاثر کر سکتا ہے جو روحانی طور پر کھیت کی طرح تیار ہو۔

روحانی اصولوں اور سائنسی دریافتوں میں پوری پوری مطابقت ہے۔ اس مطابقت کے بغیر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر کمزور ہوں گے۔

جس طرح شہر کی روشنیاں دور تک پھیلے کھمبوں سے وابستہ ہوتی ہیں عین اسی طرح انسان بھی ایک ہی بجلی گھر سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان کی طاقت کے حصول کا ذریعہ بھی ایک ہی ہوتا ہے۔

عمل کو اپنے شعور سے اور ”سمجھ میں آجانے والی بات“ سے علیحدہ نہ کریں۔ پھر تمہارا راستہ، راستی کا راستہ ہوگا۔

روحانی کامیابی

روحانی کامیابی کے لیے سب سے پہلے جھوٹی خوشی کو قربان کردیں اور مصنوعی مسرت کا راستہ بند کردیں۔ فرض کیجیے آپ کے پاس کچھ معلومات ہیں جن کی کسی دوسرے شخص کو ضرورت ہے۔ ان معلومات کو ضرورت مند سے چھپا کر رکھنے اور اس سے روک کر رکھنے میں آپ کو اپنے پاورفل ہونے کا احساس ہوگا اور آپ کو اپنی بڑائی کا احساس ہوگا اور اس احساس سے آپ کو خوشی ملے گی.....لیکن یاد رکھیے یہ نقصان دہ خوشی ہوگی۔ اس خوشی سے اور اس کے نقصان دہ اثرات سے بچنے کے لیے آپ وہ معلومات اس شخص کو عطا کردیں اور اپنی انا کی قربانی دے دیں اس سے آپ کی کامیابی کا راستہ ہموار ہوجائے گا اور ترقی کا راستہ کھل جائے گا۔

تو پھر اصلی خوشی کیا ہے؟

اصلی خوشی وہ ہے جو تمہاری طبیعت اور نیچر اور تمہارا اصل پیدائشی وجود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جس میں کسی قسم کا تفاخر نہ ہو، شیخی نہ ہو، برتری نہ ہو اور دکھلاوا نہ ہو اور مصنوعی خوشی کا اظہار نہ ہو۔ موجودہ خوشیاں اور ان کا اختیار اور ان کا اظہار آپ نے سوسائٹی سے سیکھا ہے۔

اصل خوشی کیسے اختیار کی جائے؟

جب آپ مصنوعی خوشی چھوڑ دیں گے تو اصل اپنے آپ لپک کر آپ کی گود میں آجائے گی۔ وہ بڑی دیر سے آپ کا انتظار کررہی ہے۔ جب آپ طوائف کے ڈیرے کو چھوڑ دیں گے، انتظار کرنے والی بیوی لپک کر آپ کے وجود سے چمٹ جائے گی۔

سیدھا راستہ

ایک بوڑھا آدمی ایک اندھی سڑک پر ٹھوکریں کھاتا جارہا تھا۔ جب اُس کے گھٹنے زخمی ہوگئے تو اس نے ایک راہ چلتے فقیر سے پوچھا ”بابا! میں اس راہ پر کس طرح سے چلوں کہ مزید ٹھوکریں نہ کھاؤں؟“

فقیر نے اُسے غور سے دیکھ کر پوچھا ”بابا لوکا! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

اس نے کہا ”پتہ نہیں کیا ہے لیکن میں اسے پکڑے رکھنے پر مجبور ہوں۔“

فقیر نے کہا ”بابا لوکا! یہ ٹارچ ہے۔ اس کی روشنی تمہیں بتائے گی کہ راستہ کیا ہے اور کیسے چلنا ہے۔“

”لیکن اس کی تو کوئی روشنی ہی نہیں!“ اُس آدمی نے کہا۔

فقیر نے کہا ”جب تک تم اس کا بٹن نہیں دباؤ گے یہ روشن نہیں ہوگی۔ اس کا بٹن تم کو خود دبانا ہوگا۔“

”لیکن میں خود کیسے دباؤں؟“

”اندھیری راہ سے محبت کرنا چھوڑ کر، ٹھوکریں کھانے کی لذت ترک کرکے، جوں جوں تم اس خواہش کو ترک کرتے جاؤ گے تمہارا راستہ روشن ہوتا جائے گا۔“

سادہ روی

اپنی زندگی کو سادہ بنانے ہی سے آپ آزادی حاصل کرسکتے ہیں اور آزاد ہوسکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوگا تو اردگرد کے لوگ آپ پر جال پھینک کر آپ کو قید کیے رکھیں گے۔ جن لوگوں نے ابھی تک اپنے مسائل ہی حل نہیں کیے، ان کے ساتھ رابطہ رکھنے سے کیا فائدہ!

ذرا ایک مشکل اور تکلیف دہ مسئلے کو سامنے رکھ کر اُس کا مطالعہ کیجیے مثلاً یہ سوچیے کہ دوسرے لوگوں کے خیالات آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ دوسروں کی بولی یا طعنہ آپ کو عذاب میں ڈال سکتا ہے۔ اب یہ ایک غلط خیال ہے۔ دوسروں کا خیال آپ کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ دوسروں کے خیال کے بارے میں آپ کا اپنا خیال آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اپنے آپ کو درست کرنا ہی پوری درستگی ہے.....دوسروں کی بولی اور طعنہ بھلے نقصان دہ ہو لیکن آپ کی ذہنی صحت ہی اس طعنے کو مائی سین عطا کرسکتی ہے۔ ایک لومڑی خطرناک ہوسکتی ہے لیکن ایک شیر کے لیے نہیں!

فرق صاف ظاہر ہے

میکانکی مذہب اور اس کے میکانکی لوازمات آسانی بھی عطا کرتے ہیں اور حفاظت سے رکھنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں، لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ اندر بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ رسومات، بدعات، اجتماعات اور تقریری جلسے زندگی کے بندی خانے کی موٹی موٹی سلاخیں ہیں۔ ان کے اندر بسرام کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی برف کے اوپر زندگی بسر کرکے سوچے کہ کافی اچھا موسم ہے اور حیات افزا گرمی ہے کیونکہ موسمی چھان بین والوں نے کل ہی بتایا تھا کہ آج موسم خوشگوار رہے گا اور فضا میں زندگی بخش حدت موجود ہوگی۔

چند باتوں میں فرق کرنا ہمیشہ یاد رکھیے!

1- میکانکی پیش قدمی میں اور شعوری پیش قدمی میں
2- ڈرامے میں اور زندگی میں
3- زبردستی میں اور بے اختیاری میں
4- یادداشت میں اور جدید میں
5- اعصابیت میں اور سکون میں
6- بے کار میں اور کارآمد میں

''اگر آپ کا ذہن دُکھ اور درد سے ٹریجڈی اور کرب سے بھر جائے تو کیا اپنے پڑوسی کو تبدیل کر دینا چاہیے؟''

''نہیں سر! اپنے ذہن کو تبدیل کرنا چاہیے۔''

''اگر تمہارے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے اور گھبراہٹ چاروں طرف سے گھیر لے تو سوشل سسٹم تبدیل کرنا چاہیے؟''

''نو سر! جذبات کو تبدیل کرنا چاہیے۔''

''لیکن کیوں؟''

''اس لیے کہ صحیح مقام پر تبدیلی لانی چاہیے۔''

''شاباش!.....ایک بیمار آدمی کو اس کی بیماری سے بالکل افاقہ نہیں ہوگا اگر وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو تبدیل کرنا شروع کر دے اس کو اپنی بیماری کی طرف توجہ دینا ہوگی.....اپنے دکھ اور اپنی مصیبتوں کے لیے دوسروں کو الزام دینا ایک ایسی عادت ہے جو ہمارے اندر بری طرح پختہ ہو چکی ہے۔ اس عادت کا قلع قمع کرنا چاہیے۔ صرف اپنے وجود پر کام کرنے سے آپ کا اندر تبدیل ہو سکتا ہے۔

نیا سبق

ہر ناخوشگوار واقعہ میں ایک سبق تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ سبق موجود ہوتا ہے۔ ہر واقعہ سبق عطا کرنے کے لیے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب تک آپ کو سبق دلانا مقصود نہ ہو آپ کو کسی واقعہ سے گزارا ہی نہیں جاتا۔

جب ایک سبق سیکھ لیا جاتا ہے تو وہ راستے سے الگ ہو جاتا ہے۔ پھر ناخوشگوار کیفیت باقی نہیں رہتی۔ پھر انسان اگلے صفحے پر پہنچ جاتا ہے۔

سبق سیکھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس سے انکار نہ کیا جائے۔ انکار بڑا چالاک ہے وہ سو سو بھیس بدل کر سامنے آتا ہے۔ کچھ ظاہرا بھیس کچھ پوشیدہ۔

ایک جھوٹی صورت حال کی مدافعت انکار کا ایک رُوپ ہے۔ اپنا قصور دوسروں کے سر تھوپنا بھی انکار ہی کی ایک صورت ہے۔

جو لوگ اپنی ذات پر ذرا سی نکتہ چینی سے منہ سجا لیتے ہیں وہ اپنے قیمتی سبق کو رد کر دیتے ہیں۔ اس کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

قصد اور آہنگ

آپ کو اپنی زندگی ایک ارادے ایک آہنگ اور ایک مقصد کے ساتھ گزارنی چاہیے۔ ایسے ہی بے مقصد نہیں۔ مثلاً آپ ایک قصد کرتے ہیں کہ بے ضرورت نہیں بولیں گے یا اضطراری طور پر گفتگو نہیں کریں گے لیکن جب آپ ٹی

ہاؤس جاتے ہیں اور بے تحاشا بحث مباحثہ کرتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ میرا مقصد تو ٹوٹ گیا۔ بس یہ احساس ہی سونا ہے اس کو سنبھال کر رکھو.....لیکن اگر آپ نے کوئی قصد ہی نہ کیا ہو کوئی ارادہ ہی نہ باندھا ہو تو پھر ٹوٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

اپنے ارادے کو ناکام یا کامیاب بنانا آپ کا کام نہیں۔ یہ آپ کی ڈیوٹی نہیں یہ اتنا اہم نہیں البتہ اپنے عمل پر شعور کی نگہ رکھنا آپ کی ذمہ داری ہے.....زندگی میں آپ کا مقصد جیتنا نہیں ہے بلکہ یاد رکھنا ہے اور یہ یاد رکھنا ہی سب سے بڑی جیت ہے۔

ایکتائی کا راز

اس دنیا میں بہت سے لوگ دُکھوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور دُکھوں کو چھوڑنا گوارا بھی نہیں کرتے کیونکہ دُکھوں سے الگ ہو کر وہ لوگوں کی نگہ کا مرکز نہیں رہیں گے۔ کچھ لوگ مشکل سے نکلنے کے لیے دوسروں کی مدد کے طلبگار ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس مدد کو دھتکارتے جاتے ہیں کیونکہ ان کی خودی یہ گوارا نہیں کرتی کہ کوئی ان کی مدد کرے.......

یہ تکلیف وہ تضادات دوہرے پن کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں جس نے انسان کو چیر کے رکھا ہوتا ہے۔ اس کے اندر دو طاقتیں کام کر رہی ہوتی ہیں ایک لحہ ایک اثر پذیر ہوتی ہے دوسرے لمحے دوسری! ان متضاد طاقتوں کا عمل فوراً ختم ہو جاتا ہے اگر متعلقہ شخص ایک سائیڈ کو دوسری سائیڈ کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اختیار نہ کرے......مثلاً جب وہ خوشامد کو ناپسند کرتا ہے اور منہ کی تعریف کو برا سمجھتا ہے اور جب اس پر یہ وقت آئے کہ کوئی اس کی خوشامد کرے یا منہ پر اس کی تعریف کرے تو وہ اس پر توجہ نہیں دیتا اور اس کو خاطر میں نہیں لاتا تو وہ دوئی سے نکل جاتا ہے اور ایک اکائی بن جاتا ہے۔ دوئی سے اوپر کا درجہ اکائی کا ہے۔ بس یہ اکائی ہی اس کا مقصد ہونی چاہیے۔

ترقی کا زینہ

لو جناب! آج ہم کو ترقی کا راز بتا ہی دیتے ہیں اور وہ راستہ بتا ہی دیتے ہیں جسے اختیار کر کے آپ مہینوں کی منزلیں دنوں میں طے کر سکتے ہیں۔

یہ بڑا ہی آسان اور طاقتور طریقہ ہے۔ اس سے کوئی بھی اپنی منزل تک منٹوں میں پہنچ جاتا ہے۔ سنئے.....جب آپ کو پتہ چل جائے کہ آپ کچھ صحیح اور راست اور اچھا کر رہے ہیں تو اس کو پوری طاقت' توجہ اور تیزی سے کرنا شروع کر دیں۔

آج اگر آپ کے سامنے کوئی مشکل یا اڑچن ہے یا کوئی مسئلہ ہے تو پوری کوشش اور توجہ کے ساتھ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ جھگڑا نہ شروع کر دیں۔

آرام سے دیکھیں کہ آپ کے ذہنی عمل نے خود اس مسئلے کو کس قدر پیچیدہ بنا دیا ہے اور اس میں کتنا اضافہ کر دیا ہے۔ اس مشق کے بعد اگلے روز بھی یہ مشق کریں۔ لیکن کل کے مقابلے میں زیادہ توجہ دے کر زیادہ زور لگا کر۔ خدا نے آپ کو بے پناہ قوت دی ہے اس قوت کی ایک چھوٹی سی دھارا استعمال کریں اور پھر دیکھیں کہ یہ دھار کس طرح سے ایک ڈیم کی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اپنے لیے ایک میدان چن لیں۔ کسی اچھی کتاب کا بغور مطالعہ یا اپنے خالص اور طبعزاد ذہن کا استعمال۔ اس کو آہستہ آہستہ بڑھاتے جائیں۔

چند اصول

1- جس چیز کو آپ سمجھنا چاہیں اس کے سمجھنے کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔
2- ایک آزاد روح اور بے فکر وقت کو اپنانے میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔
3- اپنی غلطی کو تسلیم کرنے اور اپنی غلطی کا ازالہ کرنے سے کوئی بھی آپ کو روک نہیں سکتا۔
4- ایک پرسکون اعتماد میں داخل ہونے کے لیے کوئی بھی آپ کی راہ روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

روحانی جدوجہد

اور باتوں کے متعلق تو میں کچھ عرض نہیں کر سکتا البتہ روحانی یدھ کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس محاربے میں کوئی منفی پیش قدمی نہیں ہوتی۔ نہ ہی کوئی منفی روّیہ ہوتا ہے۔ مثلاً اس جدوجہد میں دوسروں کی توجہ اپنے پر مرکوز کرانے یا دوسروں سے برتر ہونے کی سعی کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ اس قسم کے ارادے ساری بازی مکمل طور پر ہار دینے کے ارادے ہوتے ہیں۔ یہ میڈل روحانی وجود پر ٹک ہی نہیں سکتے۔ روحانی وجود میں الگ سے کوئی اور وجود نہیں ہوتا جو لوگوں کی توجہ بٹورتا پھرے اور خیالی دشمنوں سے برتری کے دعوے کرتا رہے۔

روحانی سپاہی کا صرف ایک ہی محاذ ہوتا ہے اور وہ اس کی اپنی ذات کے اندر حملہ آوری کی سرشت کا محاذ ہوتا ہے۔ اس کی سرکوبی روحانی سپاہی کا کام ہے۔ دراصل اُسے اپنے آپ کا بدترین دشمن ہونے سے روکنے کا کام سونپا ہوا ہوتا ہے۔

نفسیاتی صحت

1- ایک شخص کی نفسیاتی صحت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کن اقدار میں رہ رہا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ کن اقدار کا تذکرہ کر رہا ہے۔
2- ایک پابہ جولاں شخص جو زنجیروں میں جکڑا ہوتا ہے دوسروں کو بھی زنجیریں پہنانا چاہتا ہے۔ ایک آزاد

انسان دوسروں کو بھی آزاد دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔
3- خواب کے اندر زندگی بسر کرنے والا یہ کبھی نہیں سوچتا کہ وہ خواب میں ہے اور یہی اس کی بے چینیوں اور خرابیوں کا باعث ہوتا ہے۔
4- سچ کے اندر زندگی بسر کرنے والا کبھی بھی سچ کی مدافعت نہیں کرتا۔ جو شخص سچ کے اندر نہیں ہوتا اس کو سچ کی مدافعت کرنے کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔
5- جب کسی مشکل کے وقت اور خلجان کے وقت اس کا کوئی حل نہ سوجھے تو بالکل خاموش ہو جائیں اور ساکت ہو جائیں۔ جواب خود بخود اُتر کر سامنے آ جائے گا۔ ایک پرسکون ذہن پر ہی حل لینڈ کر سکتا ہے۔
6- اگلی مرتبہ جب آپ کو کسی شکست کا سامنا ہو تو چپ چاپ کھڑے ہو جائیں اور شکست کو پورے طور پر تسلیم کر کے شکست خوردہ ہو جائیں..... پھر دیکھیں کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔

PATH IN THE VALLY

اگر تم کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ زندگی ایک سفر ہے۔ باہر کا سفر۔ اندر کا سفر۔ روح کا سفر۔ باطن کا سفر۔ آگے کا سفر تو پھر تم کو یہ طے کر کے چلنا ہوگا کہ سفر کرنا ہے تو بوجھ اٹھا کر نہیں چلنا۔ ہلکے ہلکے۔ سہندے سہندے۔ لطف اٹھاتے چلنا ہے۔

ان سب لوگوں کے بتائے ہوئے بوجھ پھینک کر چلنا ہے جو سفر کے تجربہ کار ہیں اور اکثر بتایا کرتے ہیں کہ وہاں جا رہے ہو تو یہ لے چلو۔ اس علاقے کا سفر درپیش ہے تو اس شے کو ساتھ لے جانا نہیں بھولنا۔ چھوڑو ان کو۔ کوئی بات نہ مانو اور زیادہ بوجھ نہ اٹھاؤ۔

ان نکتہ چینوں کی گفتگو سے بھی اجتناب کرو جنہوں نے ساری زندگی خود کچھ بھی نہیں کیا لیکن ہر شے پر بڑی اچھی جچی تلی تنقید کرتے رہے ہیں۔ ان کو بھی ریسٹ کرنے دو ان کی بات بھی نہ سنو۔

ان لوگوں کی رائے بھی نہ لینا جو بڑے بڑے پروگرام تو بناتے رہے ہیں لیکن ساری زندگی کچھ کر کے نہیں دکھایا۔

ایسا کرو کہ ریتی پھیر روّیے چھوڑ دو۔ نشیلی بھوک ترک کر دو۔ بھاری بوجھ اتار پھینکو۔ متضاد خیالیاں ترک کر دو اور بیکار خوف چھوڑ دو۔ جن کو تم نے اپنے دل کی تہوں میں اور دماغ کے نہاں خانوں میں چھپا رکھا ہے۔ وہاں سے نکال کر یہاں ڈال دو۔ سامنے فرش پر اور پھر سفر شروع کرو۔ یقین کے ساتھ۔ خوشی کے ساتھ۔ ہاؤ ہو نالہ و فریاد کے بغیر اور پھر دیکھو کس تیز رفتاری کے ساتھ سفر کی منازل طے ہوتی ہیں۔

دولت، پیسہ، خوش لباسی، شہرت، عزت، نیک نامی، محبت، عیش پسندی، یہ سب ''مقصد'' کا نعم البدل نہیں ہیں.....

جب آپ کو اپنا مقصد معلوم ہو جاتا ہے تو پھر یہ بات آپ پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ کا یہاں آنے کا مقصد کیا ہے اور اس بزنس میں آپ کس حد تک کامیاب جا رہے ہیں۔

''مقصد'' آپ کے اندر بصیرت پیدا کرتا ہے۔ ''مقصد'' آپ کو صفائی اور شفافی سے روشناس کراتا ہے۔

''مقصد'' کی موجودگی میں آپ کو ہر قسم کی سہائتا اور دنیا کی سپورٹ مل جاتی ہے۔ اس کی بدولت آپ کو کل کائنات کی دعائیں نیک تمنائیں مقامفت مل جاتی ہیں۔

انسانی روح اردگرد کے گرد و غبار سے اس قدر اَٹ گئی ہے کہ اب اس کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ یہ وہ بدقسمت میزبان ہے جو اپنے بیشمار مہمانوں میں گھر چکا ہے اور اب اس کی شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ میں بھی ایک ایسا ہی میزبان ہوں۔ مجھ میں اب اپنی شناخت بھی باقی نہیں رہی۔ مجھ پر گرد و غبار کا اور دھول کا ایسا لبادہ چڑھ گیا ہے کہ مجھے اپنا آپ بھی اصل شکل میں یاد نہیں رہا۔ جو کچھ میں ہوں وہ ہوں لیکن جو کچھ میں نے اپنے اعضائے شعور سے جمع کر لیا ہے وہ سب گرد و غبار ہے۔

ہم نے ایک بابے سے پوچھا کہ باباجی زندگی کیا ہے اور موت کیا؟ اس کا راز سمجھ میں نہیں آتا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا ''بھائی! یہ سوال کسی اور سے جا کر پوچھو۔ ہم تو اس وقت ایسے مقام پر ہیں جہاں زندگی ہے نہ موت!!''

ہم سکردو کا حسن دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ اس کے لیے بڑا لمبا سفر کیا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو تین دن اور تین رات تک سیاسیات اور حالاتِ حاضرہ پر بحث کرتے رہے اور ہم میں سے کسی نے بھی چڑھتے سورج، تیرتے بادل اور چمکتی ہوئی روشنی کو نہ دیکھا۔

ہر شخص خوفزدہ ہے۔ لرزاں ہے ترساں ہے۔ اندرونی طور پر اور بیرونی طور پر بھی ڈرے ہوئے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے ہر وقت خوف ہم پر مسلط رہتا ہے اور ہم اس کے چنگل سے رہائی نہیں پا سکتے۔ ہمیں محبت کے اندر خوف محسوس ہوتا ہے۔ نفرت میں خوف ہوتا ہے۔ کامیابی میں خوف۔ گناہ میں خوف۔ لطف میں خوف..... خوف کی کئی قسمیں ہیں لیکن اس کی جڑ ایک ہی ہے۔ موت کا خوف! ذرا اس بات کا لگا رہتا ہے کہ ہم ہوں گے نہیں۔ ہم مٹ جائیں گے۔ ہمارا ہونا ختم ہو جائے گا۔ ساری عمر یہی دیوگلا پکڑ کے رکھتا ہے..... لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ موت کا خوف بڑا ہی بے بنیاد ہے کیونکہ یہ ایک نامعلوم کا خوف ہے۔ ہم نے نہ موت کو دیکھا ہے نہ اس میں سے گزرے ہیں نہ یہ ہمارا حال رہی ہے نہ ہی اس سے تعارف ہوا ہے لیکن اس کا خوف طاری ہے۔ لیکن جب ہم موت کے خوف کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد موت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ ہم جو زندگی کو جان گئے ہیں پہچان گئے ہیں یہ آگہی ہم سے چھن جائے گی۔ جان کاری کے چھن جانے کا خوف، موت کا خوف ہے۔ اصل میں ہم نے اپنے آپ کو جانکاری سے موسوم کر لیا ہے اور یہ نسبت ہی ہمارا وجود بن گئی ہے۔ یہی ہماری زیست ٹھہری ہے۔ میرا جسم، میرا مال، میری عزت، میرے تعلقات، میری ثقافت، میرا ادب اور میرے خیالات میری شاعری میرے تصورات یہ سب میرے وجود کے سانس ہیں۔ ایک آتا ہے

ایک جاتا ہے۔ باری باری یہی کارنفس چل رہا ہے۔ اب خوف یہ ہے کہ موت ان پر چھاپہ مارے گی اور ان کو چھین کر چپت ہو گی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں اس خوف کو دُور کرنے کے لیے جمع کی جاتی ہیں۔ عزت، شہرت، دولت اور نیک نامی..... اور حیرانی یہ ہے کہ یہی ساری چیزیں خوف کا باعث بن جاتی ہیں۔ بے خوفی کی منزل تک جانے کا محتاط راستہ اختیار کیا جاتا ہے اور بالآخر یہ ہم کو خوف کی منزل پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے..... اگر انسان اس حقیقت کا سامنا کر لے اور اس کو اچھی طرح سے سمجھ لے کہ میں وہ نہیں ہوں جو اب تک اپنے آپ کو سمجھتا رہا ہوں اور یہ جو چیزیں میں نے اپنی ذات کے گرد جمع کی ہیں ان کا اجتماع میں نہیں بنتا تو یقین کیجیے خوف اُسی وقت دُور ہو جائے گا۔ جونہی آپ پر یہ حقیقت کھلے گی اور آپ بیدار ہو جائیں گے تو آپ کے سامنے اصل ''وجود'' ہو گا اور مجتمع چیزیں ہوں گی اور دونوں الگ الگ موجود ہوں گے۔

ایک ''خیر'' ہو گا اور دوسرا ''غیر'' ہو گا۔ ان دونوں کا امتزاج خوف پیدا کرتا ہے اور ان دونوں کا الگ ہو جانا بے خوفی!

ذات کی تلاش کے لیے ''میں'' کچھ کرنا نہیں ہے۔ بس دیکھنا ہے اور سارا عمل ترک کر دینا ہے۔ جب ذہن پرسکون ہو جائے اور معائنہ کرنے لگے۔ اس وقت راستہ کھل جاتا ہے۔ اصل میں پرسکون اور شانت ذہن ہی راستہ ہوتا ہے۔

دین کے اندر پورے کے پورے داخل ہونے کا مطلب ہے لفظوں کو چھوڑ کر بے لفظی میں اترنا بلکہ آنکھیں بند کر کے اس میں چھلانگ لگا جانا۔

راستے

اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ اپنے تک پہنچنے کے لیے کسی راستے کی ضرورت نہیں۔ راستے تو دوسروں تک پہنچنے کے لیے ہوتے ہیں۔ مسافت طے کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی مسافت ہی نہیں۔ وہ تو شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔ میری شاہ رگ سے! اس لیے کہیں جانا نہیں ہوتا۔ بس اُس کو یاد کرنا ہوتا ہے یا درکھنا ہوتا ہے اور کچھ کرنا ہی نہیں اس کو جاننا نہیں ہے۔ اس کو پانا ہے۔ اپنے آپ کو پانا ہے۔ ''میں کون ہوں'' بس یہ جاننا ہے۔

کوئی عمل کوئی کارکردگی کوئی فعالیت ہم کو ''خود'' تک نہیں لے جا سکتی کیونکہ ہر عمل ہمیں اندر سے بجائے باہر کی طرف لے جاتا ہے۔

کوئی عمل، ہم کو موجود کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ جہاں عمل ختم ہوتا ہے، وہیں وجود موجود ہوتا ہے۔

کوئی راستہ ہم کو وہاں نہیں لے جا سکتا کیونکہ وہ وہاں نہیں وہ تو یہاں ہے۔

جذباتی طور پر ہر شخص بے چین ہے اور جذباتی طور پر ہی ہر شخص پرسکون اور خاموش ہو سکتا ہے۔ سکون اور صبر کی ترکیب سے اور کسی مشق سے حاصل نہیں ہوتا۔ جذباتی اطوار کی تالیف کا نام ہی سکون ہے۔

جہاں کوئی اندیشہ، تامل، شور اور بے چینی نہیں۔ جہاں کوئی مناظرہ نہیں۔ جہاں کوئی جھگڑے والی بات نہیں۔ کوئی الفاظ نہیں۔ بس خلد ہے۔ (چیزوں کا مکمل فقدان ہے) وہیں نروانا ہے وہیں دھرم ہے۔

حق اور سچ ایک دھماکے کے ساتھ واضح ہوتا ہے۔ ہولے ہولے اور دھیرے دھیرے نہیں۔ یہ زور لگا کر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو بس واضح ہوتا ہے۔ اترتا ہے۔ خلد ہی اس کا جواب ہے الفاظ نہیں۔ بے جواب ہونا ہی جواب ہے۔

انسان جو جانتا نہ ہو اور وہ اس کو جاننے لگے۔ جس کی آگہی نہ ہو وہ آگاہ لگے۔ یہ روح کی تباہی کا باعث ہے..... مناظرے سے جہالت ختم نہیں ہوتی۔ یہ چھپ جاتی ہے۔ در پردہ ہو جاتی ہے۔ علم کو واضح کرنے کے لیے اس کا شعور حاصل کرنے کے لیے جہالت کو عین برہنہ صورت میں دیکھنا لازمی ہے..... پس ضروری ہے کہ اپنے آپ کو مناظرے اور الفاظ کی چادر میں نہ لپٹا جائے..... دیکھو یہ کتنا سستا سودا ہے کہ حقیقت کو جاننے کے لیے خود کو صرف خواب سے نکالنا ہے اور کچھ نہیں!!

پہیہ گھوم رہا ہے اور حرکت میں ہے اور جس پر وہ گھوم رہا ہے وہ دھرا ساکن ہے ساکت سے بے حرکت ہے۔ ہر فعالیت کے پیچھے ایک بے عملی ہے۔ جس طرح ہستی کے پیچھے خلد ہے۔

ایک ذہین جواب کی تلاش میں اصل جواب دھند اور دھوئیں میں کھو جاتا ہے۔ اگر فہم اور خرد خاموش رہے تو تجربہ بول اٹھتا ہے۔ اگر خیال چپ رہے تو تمیز بیدار ہو جاتی ہے۔ خرد صرف پوچھ سکتی ہے سوال کر سکتی ہے لیکن اس کے پاس جواب نہیں ہوتا۔ جواب صرف خلد سے آتا ہے۔ نیت سے ملتا ہے..... صحیح علم کی پیاس اپنی ذات کو جانے بغیر نہیں بجھتی۔

ذہنی اور سائنسی علم اصل علم نہیں ہے۔ یہ سچ کو جاننا نہیں ہے۔ سچ کی افادیت کو جاننے کا نام ہے۔ حقیقت تو صرف بلاواسطہ ادراک سے ملتی ہے۔ اسی طرح ذات کا علم ہے جو بلاواسطہ طور پر حاصل ہوتا ہے۔ شعور کسی جہت کے بغیر خدا میں مرکوز ہوتا ہے اور انسان کی آخری پیاس ہمیشہ خدا ہی کی حضوری میں بجھتی ہے۔

مکمل خاموشی ہی دراصل عبادت ہے۔ عبادت کسی عمل کے کرنے کا نام نہیں کسی کارکردگی کو نپٹانے کی بات نہیں۔ جب ذہن کسی عمل میں نہیں ہوتا اس وقت عبادت میں ہوتا ہے۔ عبادت دراصل کوئی عمل نہیں ایک کیفیت کا نام ہے۔

حصول کے لیے انسان میں جرأت ہونی چاہیے:

اپنے آپ کو حوالے کر دینے کی جرأت

اپنے آپ کو ملیامیٹ کر دینے کی جرأت

ایک خلد بن جانے کی جرأت......

جو شخص اپنے آپ کو مکمل طور پر ملیامیٹ کرنے کا تہیہ کر لیتا ہے وہی کچھ حاصل کرتا ہے جو مرنے کے لیے تیار ہے وہی زندگی کا سزاوار ہے۔

ساری تلاش چھوڑ دو اور خاموش ہو جاؤ۔ ذہن کو چپ کرا دو اور پھر سنو! آنکھوں کو مصروف نہ رکھو اور پھر دیکھو۔

انسان نے کئی قسم کی شرابیں تیار کی ہیں لیکن سب سے خطرناک شراب وہ ہے جو بوتلوں میں بند نہیں ہوتی۔

مذہب وہ ہے جو انسان کو حقیقت میں سربلند کر دے باقی سارے مذہب لایعنی ہیں۔ یاد رکھو کہ نفس کبھی بھی نفس کو بھلانے سے نہیں بنتا۔ اس کی نہر نیچے ہی نیچے رواں دواں رہتی ہے۔ نفس کو اس وقت قابو کیا جا سکتا ہے جب اس کو یاد رکھا جائے اور اس کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جائے۔ نفس کو بھلا کر یا نفس کو ملیامیٹ کر کے روحانیت کا راستہ نہیں ملتا بلکہ نفس کو سرنڈر کر کے اور نفس کو صحیح صورت منوا کر ملتا ہے۔ خدا خود فراموشی سے نہیں ملتا بلکہ ذات کو تابع کرنے سے ملتا ہے۔

انسان کا وجود مٹی کا دیا ہے۔ اس میں مٹی بھی ہے اور روشنی بھی۔ اگر توجہ صرف مٹی پر رہے گی تو زندگی بیکار ہو جائے گی۔ لازم ہے کہ روشنی پر بھی توجہ رہے۔ جونہی روشنی کی طرف توجہ ہوگی سب کچھ عیاں ہو جائے گا۔

کسی بھی چیز کی بہتات نفس پرستی ہے شہوت پرستی ہے لیکن میانہ داری اور میانہ روی پرہیزگاری ہے پارسائی ہے۔ بہتات ہلاکت ہے بربادی ہے۔ میانہ روی زندگی ہے۔ عیش پرستی اور یبوست دونوں ہی زندگی کو تباہ کر دیتے ہیں کیونکہ بہتات جہالت ہے۔ انا پرستی ہے۔ موت ہے۔

دیکھو! ذہن کے ساتھ کچھ نہ کرو۔ اس کو اکیلا چھوڑ دو اور اس کا نظارہ کرو۔ اس کی رو کو ایسے ہی دیکھو جیسے دریا کنارے بیٹھ کر اس کی لہریں دیکھتے ہو۔ ذہن کی رو سے لاتعلق ہو کر اور بے اثر اس کو دیکھو۔ دیکھتے رہو اور ہشیار رہو۔ اس کے دیکھنے اور نظارہ کرنے سے خیال آہستہ آہستہ خلد میں تحلیل ہو جائے گا اور ذہن پرسکون ہو جائے گا..... رضا اور رضامندی ہی آزادی عطا کرتی ہے۔ جو شخص راضی ہی نہیں وہ کس طرح سے آزاد ہو سکتا ہے۔ اور پھر..... اپنے آپ کو ڈھیلے چھوڑنے کا نام ہی محبت ہے۔ محبت میں موت قبول کرنا ہی روحانی زندگی بسر کرنا ہے۔ جو قطرہ آگے بڑھ کر دریا سے ہم آغوش ہو جاتا ہے وہی ابدی زندگی پاتا ہے جو راستے میں رہ جاتا ہے رُک جاتا ہے وہ مر جاتا ہے۔

زندگی کے اندر موت نہیں اور جو مردہ ہیں وہ کبھی بھی زندہ نہ تھے۔ جو لوگ زندگی کی فہم نہیں رکھتے وہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں۔ پیدائش زندگی کی ابتدا نہیں ہے۔ نہ ہی موت زندگی کا خاتمہ ہے۔ زندگی موت سے پہلے بھی موجود تھی اور موت کے بعد بھی ہوگی۔

کچھ لوگ دنیا سے اور دنیا کے کاموں سے اتنے بھرے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ترس آتا ہے۔ ان کے اندر کوئی خلد کوئی کونہ خالی ہی نہیں ہوتا۔ جو شخص اس قدر بھرا ہوا اتنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو وہ آزاد کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ جس کے اندر ذرا سی جگہ بھی موجود نہ ہو اس کے اندر خدا کہاں سے آ سکتا ہے اور کیسے سما سکتا ہے۔ دیکھو آزادی کے لیے اندر جگہ چاہیے باہر نہیں۔ میں تو اکثر یہ بھی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو خدا سے بھی نہ بھرو۔ بس خالی جگہ چھوڑ دو۔ وہ خود بخود سما جائے گا تمہیں کوشش نہیں کرنا پڑے گی..... جب بارش ہوتی ہے تو خالی گڑھے بارانِ رحمت سے خود بخود بھر جاتے ہیں اور موٹے موٹے اونچے ٹیلے ویسے کے ویسے سوکھے ہی رہ جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو خالی رکھو کیونکہ خالی جھولی ہی بھری جاتی ہے۔

ذہن بیرونی خیالات کے باریک ذرّوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ان ذرّوں کو ہی ہٹانا مقصود ہے۔ جب یہ ذرّے ہٹا دیے جاتے ہیں تو بے داغ شعور باقی رہ جاتا ہے اور یہ وہی بے داغ شعور ہے' خیالات اور نظریات سے آزاد جس کی

معرفت حق کا اور سچ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے ازلی حق کا اور ابدی سچ کا۔

میں نے تو اپنی ساری سیاحی میں بس ایک ہی راز پایا ہے کہ راستے تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن مسافر وہی رہتا ہے۔ سفر تو بیشک ایک تبدیلی ہے لیکن مسافر وہی ہے اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی.....کل میں کہاں تھا۔ آج کہاں ہوں۔ ابھی کیا تھا۔ ابھی کیا ہے۔ میں جو کل تھا وہی آج ہوں۔ جو آج ہوں وہی کل ہوں گا۔ ذہن بدل جاتا ہے۔ خیال تبدیل ہو جاتا ہے۔ نظریات بدل جاتے ہیں۔ جسم میں تبدیلیاں آ جاتی ہیں لیکن میں وہی رہتا ہوں۔ ہر شے تبدیل ہونے والی ہے۔ ہر شے میں انقلاب آتا ہے۔ ہر چیز بدلتی ہے لیکن یہ میں اس طرح برقرار رہتا ہے۔ یہ میں تبدیلیوں اور بدلتی ہوئی لہروں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ ہچکولے کھاتا ہے۔ لیکن اُسی طرح رہتا ہے جیسا کہ ازل میں تھا.....اس دنیا کا سب سے بڑا مسافر روح ہے۔ ہر وقت سفر ہر وقت حرکت مسافرت اور اس بدلتی ہوئی دنیا اور بدلتے ہوئے زمانے میں نہ بدلنے والی بے بدل روح پر نگاہ رکھنا اور اس سے رشتہ جوڑ کے رہنا ''آزادی'' ہے صحیح اور طاقتور آزادی۔

خود فراموشی اور خود فریبی اس دنیا کی زندگی ہے اور خود آگاہی آزادی ہے۔

اس دنیا میں مستقل مزاجی اور پائیداری سے قائم رہنے کے لیے ہمیں انسان کو اس کی جڑیں مہیا کر کے دینا ہوں گی۔ پھر اس کو اعلیٰ درجے کی زرخیز زمین بھی عطا کرنا ہوگی۔ جڑیں روح سے تعلق رکھتی ہیں اور زرخیز زمین دین سے۔ اگر ایسا ہو سکے تو انسانیت کی کیاری پھر سے پھل پھول سکتی ہے۔

جو پختہ ہو جاتا ہے وہ پکے ہوئے پھل کی طرح گر جاتا ہے۔ جب پھل پک کر گرتا ہے تو درخت کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ جو پھل ناپختہ ہے' کچا ہے جب اس کو ڈال سے توڑا جائے گا تو تکلیف ہوگی' رنج پہنچے گا۔ جب کوئی پھل پک گیا خود بخود نیچے اُتر آیا۔ ترک کوئی عمل نہیں علم پہلا زینہ ہے۔ جب علم حاصل ہو گیا تو ترک پیدا ہو گیا۔ ترک زبردستی وارد نہیں کیا جا سکتا۔

میں کے دو رُوپ ہیں: ایک انا اور دوسرا برہما۔ انا تو یہ ہے کہ میں جو نہیں ہوں وہ ''ہے'' نظر آتا ہے اور برہما یہ ہے کہ میں جو ہوں وہ سامنے ہے اور جو نہیں ہوں وہ مفقود ہے۔

آگہی اور معرفت مرکز ہے اور کردار محیط۔ وقوف ابتدا ہے اور کردار اس کا ثمر۔ معرفت اور آگہی بیج ہے اور کردار و اخلاق اس کا شجر۔ لیکن عام طور پر لوگ اُلٹے رُخ سے سفر شروع کرتے ہیں۔ وہ پہلے کردار تعمیر کر کے پھر علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کردار اور اخلاق کو معرفت میں ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں کیونکہ کردار اور اخلاق جہالت میں اور جہل میں پروان نہیں چڑھ سکتے۔ جو کردار تعمیر کیا جائے یا بنایا جائے وہ کردار نہیں ہوتا' ایک خول ہوتا ہے جس کے اندر بداخلاقی کا بھوت استراحت کرتا ہے۔ کوشش سے بنایا ہوا کردار ایک خود فریبی ہے' خوش فہمی ہے۔

ہم بدبختی' بے چارگی اور نخرت میں گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن جو اس کے اندر گھرا ہوا ہے وہ منحوس اور بدبخت نہیں ہے۔ جب تک ہماری نگاہیں اردگرد پر اور گردوپیش پر رہیں گی' ہمیں بدبختی اور خرابی اور دُکھ ہی نظر آئیں گے۔ لیکن جونہی ہماری نظر ''گھرے ہوئے'' کا احاطہ کرنے لگے گی اس وقت بدبختی ختم ہو جائے گی اور خوش بختی' خوش فکری اور Bliss نظر

آنے لگے گی۔

خیال کا عمل شروع ہونے سے پہلے انسان کی کیفیت حیرانی ہوتی ہے۔ جب خیال کا عمل شروع ہو جائے اس وقت انسان اپنے انسان ہونے کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔

لیکن جب خیال کا عمل ختم ہو جائے اس وقت انسان معرفت میں داخل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم خیال کے عمل سے آگے گزر جائیں تو شعور معرفت کی حدوں کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔

رات کے وقت جب آسمان ستاروں سے بھر جائے تو ستاروں کو دیکھو ان کی بابت سوچو نہیں۔ ان میں شاعری نہ ڈھونڈو۔ جب لہریں اُبھریں' آئیں جائیں تو سمندر کنارے بیٹھ کر ان کا نظارہ کرو ان پر سوچ کا پہرا نہ بٹھاؤ۔ ان کو دیکھو۔ پھول کو دیکھو اس کو سوچو نہیں.....اگر ذہن میں خیال نہیں ہے اور دیکھنا ہی دیکھنا ہے تو پھر ایک نیا اور بھاری بھرکم اور بہت ہی نرالا راز تم پر کھلے گا۔ قدرت اپنا بڑا دروازہ تم پر کھول دے گی اور اس دروازے کے اندر خدا موجود ہوگا۔

دہریے اور ناستک لوگ کہتے ہیں ''میں خدا کو نہیں مانتا'' میں آزاد ہوں اور خود مختار ہوں۔ اس اعلان میں ایک بڑی تباہی پوشیدہ ہے کیونکہ جو قانون فلسفہ اور سوچ نفی سے شروع ہوگا وہ نیستی میں ختم ہوگا۔ یہ سوچ خودکشی کی سوچ ہے۔ کیوں ایسی ہے؟ وجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کا بطلان کیے بغیر اور اپنی نفی کیے بغیر خدا کی نفی کرنا ناممکن ہے۔ اصل میں خدا ہماری فطرت ہے۔ ہمارے اندر کا قانون ہے۔ اس سے دُور جانا ناممکن ہے اس سے الگ ہونا محال ہے۔ جیسے کوئی انسانی وجود اپنے قلب سے الگ نہیں ہو سکتا اسی طرح خدا سے الگ ہونا بھی ممکن نہیں۔ ہم کتنے بھی آزاد کیسے بھی خود مختار کیوں نہ ہو جائیں خدا سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ وہ ہماری شہ رگ ہے۔ حق تو یہ ہے کہ وہی حقیقت ہے اور ہم اس کا عکس ہیں۔ اس کا سایہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ خدا سے آزادی ممکن نہیں۔ خدا میں آزادی ممکن ہے۔

مذہب اپنے اندر اترنے کا ایک سائنٹفک طریقہ ہے۔ جب اندر اترتے وقت ایک ایک پرت کھلتی جاتی ہے حقیقت منکشف ہونے لگتی ہے۔

''کلچر کی بنیاد''

پتھر اور دھات کے زمانے کے ساتھ ہی جب انسان نے مربوط انداز میں سوچنا شروع کیا تو اس کے سامنے سب سے پہلے یہ سوال آئے:

1- میں کون ہوں؟

2- میں کہاں سے آیا ہوں؟

3- میری اس زندگی کا مقصد کیا ہے؟

4- ہم مر کیوں جاتے ہیں؟ مر جاتے ہیں تو کدھر جاتے ہیں؟

5- کیا مرنے کے بعد ایک اور زندگی ہے؟ اگر ہے تو کیا اُس میں اس زندگی کے بارے میں کچھ حساب کتاب

اور پوچھ گچھ ہوگی یا ہماری موجودہ زندگی بالکل فراموش کردی جائے گی؟

لیکن انسان میں سوال بنانے اور سوال پیدا کرنے کی صلاحیت جواب دینے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ یہی وہ شے ہے جواب تک علم ودانش کی راہ کا کانٹا بنی رہی ہے اور اب تک ہے..... انسان ابھی تک اپنے علم کی پیاس بجھا نہیں سکا اور آئندہ شاید کبھی بجھا نہیں سکے گا۔ یہ متعدی مرض اس کی جان کے ساتھ اسی طرح سے لگا رہے گا۔

اصل میں جب تک انسان یہ نہیں جان لیتا کہ اس کے سارے سوالوں کے جواب اس کے اپنے اندر گہرے اور بہت ہی گہرے موجود ہیں اور بڑے واضح انداز میں موجود ہیں۔

سینکڑوں ہزاروں سالوں سے انسان کی ابتدا کا مسئلہ انسان کے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے اور ہر صاحب فکر اور ہر دانشور نے اس کا جواب اپنے انداز میں دیا ہے اور اس پر سختی سے قائم رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی اپنی تھیوریوں کے محل اسارے ہیں اور کچھ نے پرانی منزلوں پر اپنی عمارتیں اٹھائی ہیں لیکن مسئلہ ویسے کا ویسا موجود ہے۔

چنانچہ فلسفے کے دو بنیادی سوال ہیں: انسان کی فطرت The nature of man اور دوسرا: کائنات کی ہیئت اور اس کی نیچر۔

1- کیا یہ کرۂ ارض خدا کی مرضی سے اور اس کے حکم سے وجود میں آئی..... یا

2- ارتقا کی تدریجی منزلوں میں طے ہو کر اپنے موجود مقام پر پہنچی ہے۔ اس میں اتنا متنوع کیوں ہے۔ یہ کون سے میٹریل سے بنی ہے۔

3- یا اچانک ایک پٹاخے سے پیدا ہوگئی۔

4- انسان اس کائنات میں "معلق" ہے یا ایسے ہی لایعنی مخلوق ہے یا پھر اس کائنات میں اس کا کوئی اہم قسم کا سلطانی اور بادشاہی کام ہے۔

Thales نے کہا یہ کائنات پانی سے معرض وجود میں آئی ہے۔

Anaximander نے کہا کہ یہ کائنات ایک زندہ man ہے جس نے سارے خلا کو بھر رکھا ہے۔

Atomists نے کہا ہم سے پہلے کے فلسفی بھی ٹھیک تھے لیکن اصل میں اس کائنات کے اندر جو حرکت اور تنوع ہے وہ چھوٹے چھوٹے یونٹوں کی وجہ سے ہے اور ان یونٹوں کا انحصار ایٹموں پر ہے۔

ہر ایٹم کے اندر ایک حرکت ہے اور حرکت کے اتحاد اور یونٹی کی بنا پر ان کا وجود قائم ہے۔

ایٹم خود کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ ازلی طور پر موجود ہیں اور بہت ہی چھوٹے ہیں ان کے اتحاد سے زندگی ہے اور ان کی علیحدگی اور ٹوٹ پھوٹ سے موت ہے۔

Pyrrho نے کہا یہ ساری سوچیں اور سارے دلائل تضیع اوقات ہیں۔ کائنات کی تشریح کرنا اور اس کی ساخت پر غور کرنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چل سکتا۔

سخاوت۔ داد و دہش۔ دینا دینا دینا

امیر آدمی کبھی سخی نہیں ہوسکتا۔ یہ اس کی مجبوری ہے۔ غریب شخص ہمیشہ سخی ہوگا، دیالو ہوگا، امیر سے یہ سب کچھ نہیں ہوسکتا۔ وہ نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امیر ہوتا ہے، اس کے پاس بہت کچھ جمع ہوتا ہے۔

اگر آپ جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے، اس میں سے حصہ بٹا سکیں تو آپ ایک دم سے نامعلوم اور عدم کی دنیا کے وی آئی پی ہو جاتے ہیں۔ وہاں آپ کا ایک مقام مقرر ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں چاہے آپ فقیر ہوں، گداگر ہوں، بےنوا ہوں، وہاں آپ کے سر پر تاج شاہانہ رکھ دیا جاتا ہے۔

جونہی آپ حصہ بٹانے لگتے ہیں، آپ بڑے ہونے لگتے ہیں، جوان ہونے لگتے ہیں۔ جو شخص اپنی چیزوں میں حصہ نہیں بٹا سکتا، وہ ابھی تک بچہ ہی ہے۔ وہ جوان نہیں ہوا، آگے نہیں بڑھا۔ جو چیز آپ کسی کو دے نہیں سکتے، اس نے ابھی تک آپ کو پکڑا ہوا ہے، جکڑا ہوا ہے۔ وہ آپ سے بڑی طاقتور ہے، آپ پر حاوی ہے۔ وہ آپ سے ارفع ہے، اعلیٰ ہے، برتر ہے، آپ کی محبت سے زیادہ بڑی ہے۔ آپ کی شفقت سے زیادہ ہے۔ آپ پر مکمل طور پر حاوی ہے اور یاد رکھئے حصہ بٹانے کے لیے آپ کو زیادہ چیزوں کی یا ان کے انبار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سخی ہونے کے لیے دینا ضروری ہے، چاہے وہ دینا ایک تنکا توڑ کے دینا ہو۔ اس لیے گھنے سرمائے کی یا دولت کی یا بڑی جائیداد کی احتیاج نہیں ہوتی۔

حضورؐ نے فرمایا کہ مسکراہٹ بھی ایک صدقہ جاریہ ہے۔ اس کو گاہے بگاہے جاری کرتے رہا کرو۔ یہ بھی ایک خیرات ہی ہے۔ کوئی غمگین ہو تو اس کو گانا سنا دو، کسی کے سامنے تھیا تھیا ناچ ہی دو لیکن تم تو ایسے بند ہو اور گیت ہو کہ یہ کچھ بھی Share نہیں کر سکتے۔

اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں ہے تو اپنے وجود کو اپنے آپ کو ہی Share کر لو۔ یہ چیز تو کم از کم ہر ایک کے پاس ہوتی ہے۔ یہ تو کہیں سے جا کر نہیں لانی پڑتی۔ اسی میں حصہ بٹا لو۔ اپنا ہاتھ لمبا کرو، آگے بڑھاؤ۔ دل کو محبت سے بھرو اور ہاتھ ملاؤ۔ یہ مت سوچو کہ وہ اجنبی ہے، ناشناسا ہے، جونہی تم اس سے حصہ بٹاتے ہو، اس سے ہاتھ ملاتے ہو، وہ اجنبی نہیں رہتا۔

ایک خسیس آدمی خوفزدہ آدمی ہوتا ہے۔ وہ ڈر کے مارے کبھی بھی آگے نہیں بڑھتا۔ اس کو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر ہاتھ ملا لیا۔ اپنے آپ کو Share کر لیا تو پھر تعلقات بڑھ جائیں گے اور تعلقات بڑھنے سے کچھ دینا پڑ جائے گا اور دینے میں میری موت پوشیدہ ہے، اس لیے یونہی اچھا ہے۔

سوکھا کنواں

یہ کبھی نہ سوچنا کہ سخی ہونے کے لیے تم کو دولت کی اور چیزوں کی اور ثروت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ

معاملے اس کے برعکس ہے۔ اگر تم دولت مند ہونا چاہتے ہو تو سخی ہو جاؤ اور دینا شروع کر دو۔ سوکھا کنواں اس لیے سوکھ جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو پانی نہیں دیتا۔ جب وہ پانی نہیں دیتا تو اس کے اندر پھوٹنے والے سوتے سوکھ جاتے ہیں کہ یہ پانی آگے تو دیتا نہیں، اس کو پانی کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے اندر سوکھا پڑ جاتا ہے اور کنواں اندھا اور گندا ہو جاتا ہے..... لوگو کو بلاؤ، ان کو دو۔ ان کو اپنی ذات کا کنواں پیش کرو کہ تم میں سے ڈول بھر بھر کر لے جائیں اور تمہیں پینا شروع کر دیں۔

پانی کہاں مر رہا ہے؟

1-اس ملک میں ہر نظام Mistrust پر قائم ہے۔ چنانچہ بیشتر قوت، وقت اور سرمایہ trustworthy ہونے کا ثبوت فراہم کرنے پر صرف ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کو قابل اعتماد مان لیا جائے۔ جب تک وہ نا قابل اعتماد ثابت نہ ہو جائے۔ اس طرح سے برائی کی بہت ساری جڑیں کٹ جائیں گی۔

2-لائق احترام قیادت کا فقدان ہے۔ لائق احترام قیادت ہر سطح پر ضروری ہے۔ مخلص ہی قیادت کا حق ادا کر سکتے ہیں کہ مدح و فرحت سے ان کا رخ متاثر نہیں ہوتا۔

3-لوگ اپنے آپ کو باعزت اور قیادت کا اہل ثابت کرنے کے لیے وسعت مال کو مقصود بنا رہے ہیں۔ مال کے پیمانے سے عزت کی پیمائش ختم ہو جائے اور ہر پیشے کو اس طرح واضح کیا کیا جائے کہ لوگ اس کی قدر و منزلت کو جان لیں اور اس کے عاملین سے مودب رہیں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ''غرور'' قابل تعزیر جرم ہو۔

4-جب تک ہم پورے پورے اسلام میں داخل ہونے کی جرأت نہیں رکھتے، اسلام کی باتوں کا تکرار اچھا نہیں ہوگا۔ اس سے تضاد ہی نمایاں ہوگا۔ یہ قانون بنا دیا جائے کہ کوئی کسی کو ایذا نہ دے۔

5-لباس کا معیار پاکیزگی اور آسودگی ہو۔ خوراک کی افادیت ملحوظ ہو، ذائقہ مقصود نہ ہو۔ رہائش ستھری ہو اور ساتھیوں کو مرعوب نہ کرے۔

6-لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف آنے کے لیے قوت فیصلہ درکار ہوتی ہے جو یہاں ممنوع رہی ہے۔ ذرائع ابلاغ قومی تشخص ابھارنے کا کام کریں اور ماہر نفسیات لوگوں کو خیر اور غیر کے مابین امتیاز کرنے کی تعلیم دیں۔

7-ترقی کی باگ دوڑ بہی خواہوں کے ہاتھ میں نہیں رہی۔

سائنسی ترقی کی ذمہ داری ملکی اور مخلص سائنس دانوں اور علم والوں پر ہو۔ وہ اپنے کام سے آگے بڑھیں۔ قومی ضروریات کا تعین کیا جائے۔ اپنے ذرائع اور وسائل کو اچھی طرح سے جانچا جائے اور انہی ذرائع سے مقاصد کے حصول کی سعی ہو۔

غرور قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے

غرور خفی بھی ہوتا ہے اور جلی بھی ہوتا ہے۔

خفی کی حد تک قابل گرفت نہیں ہوتا۔

غرور خفی کیا ہے؟ جب نگاہ نفس کے تابع ہوگی تو دوسروں میں اچھائی نظر نہیں آئے گی۔ یہ غرور خفی ہے۔

غرور جلی کیا ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کو جان لینے کے بعد من مانی کی جائے تو یہ غرور جلی ہے۔

معافی! نہ نہ!! ہرگز نہیں۔ اگر غرور جلی کو معاف کیا جائے تو یہ مسلمین اور مجرمین کو مساوی قرار دینے کے مترادف ہوگا۔ (ہمارے ملک کے جملہ مسائل اسی کے سہارے قائم ہیں)

اصلاح کی صورت: اصلاح کی صورت یہ ہے کہ بات کرتے وقت یہ دیکھا جائے کہ جو بات کی جا رہی ہے، بات کرنے والے کا عمل اس کا شاہد ہے؟ اگر عمل شاہد ہے تو بات کی جائے ورنہ نہیں کیونکہ بے مقصد بات منع ہے اور کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے تو بولنے کا حکم ہی نہیں۔ یہ ہے قول سدید اور صالح عمل کی راہ۔

جب تک اللہ کے نزدیک پسندیدہ معیار ہمارے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوتا اس وقت تک علم حقیقی سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔

کامیابی

یوں تو انسان میلاد آدم سے لے کر اب تک بہت سی گنی اور کئی ان گنی صدیوں میں سے بخیر و خوبی گزرتا رہا ہے لیکن اب جب اس کے ادراک اور آگہی میں بہت سے نئے موڑ اور متعدد انوکھے زاویے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ آنے والی ہر صدی کے دہانے پر رک کر سوچنے لگا ہے کہ اس کے ٹائم ٹیبل میں کیسی وضع اختیار کر کے داخلہ لوں۔

گزشتہ صدیوں کی تاریخ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ آپ کے سامنے ہیں۔ اس فاصلے کو حضرت انسان نے کس انداز سے طے کیا ہے اور پہلی صدی سے لے کر اب تک کہاں تک پہنچا ہے اس سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں۔ ترقی کے بے شمار آثار کچھ قریب سے سجے اور کچھ منتشر حالت میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ہم اپنی کارکردگی پر خوش بھی ہیں اور حضرت انسان کی کامیابی اور اس کے کارہائے نمایاں پر فخر بھی کرتے ہیں لیکن کچھ سوچنے والے (جن میں مغرب کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے) اکیسویں صدی کے دروازے پر آلتی پالتی مارے، سر جھکائے اس سوچ میں مستغرق بیٹھے ہیں کہ حضرت انسان نے اب تک جتنی بھی ترقی کی ہے، اس کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے۔ اس نے اب تک جتنے بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں، وہ سب خارج سے متعلق ہیں اور اس کی شخصی اور ذاتی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان ویسا ہی ظالم، بے انصاف، مکار، خود غرض، منافق اور فریبی ہے جیسا کہ پتھر اور دھات کے زمانے میں تھا۔ وہ ابھی تک اپنے اندر خونیں پنجے نکالے، طمع کی زبان لٹکائے اور حرص کے دانت تیز کیے سکائی سکریپر کی اٹھائیسویں منزل پر بیٹھا ہے جیسے وہ اپنی غار یا اپنے درخت کی کھوہ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب اس کے گھر کے سامنے ایک بوئنگ جہاز کھڑا ہے۔ اس کی چھت پر سنٹرل ایئر کنڈیشنگ کے آلات لگے ہیں۔ نگاہوں کے سامنے سیٹلائٹ کی تصویریں آ رہی ہیں۔ دور دراز پیغام بھجوانے کو فیکس مشینیں چل رہی ہیں۔ خون کی سپلائی بہتر طور پر

برقرار رکھنے کے لیے بائی پاس ہو چکا ہے۔ پرانے پھوسڑے دار پمپس دل کی جگہ ایک نیا اور صحت مند اور چاق و چوبند براق دل فٹ کر دیا گیا ہے لیکن اندر بدستور تاریک ہے بلکہ پہلے کے مقابلے میں اور بھی تاریک ہو گیا ہے۔

چنانچہ اس وقت کرہ ارض کے دانشمند جن میں اٹھانوے فیصد لوگ مغرب کے ہیں، اس آس پر دھیرج باندھ کر بیٹھے ہیں کہ اکیسویں صدی میں داخل ہونے سے پہلے ان لوگوں سے اسرار کے صیغے حاصل کیے جائیں جن کے پاس نبیوں کا علم ہے اور جو بنی نوع انسان کی پریشان نظری کا دارد بتا سکتے ہیں، جنہیں انسان کو اندر سے بدلنے کا گر معلوم ہے اور جو باطن کے سفر کی رہنمائی کا سر جانتے ہیں۔

اس وقت دنیا کے سب پسماندہ ملک جن میں جرمنی، فرانس، سکینڈے نیویا، ہالینڈ اور امریکہ پیش پیش ہیں، اکیسویں صدی کے گیٹ پر اپنی اپنی جھولیاں پھیلائے ان داتاؤں کے منتظر کھڑے ہیں جن کے پاس زندگی کا مکمل ضابطہ حیات موجود ہے اور مکمل ضابطہ حیات کے حامل آئیں بائیں شائیں بغلیں جھانک رہے ہیں کہ ان کے پاس سوائے اعلان کے اور اطلاع کے اور کچھ بھی نہیں۔ مغرب کے ضرورت مند ممالک پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ دینوی ترقی میں ہم نے تمہاری مدد کی ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہم آپ کی دستگیری کرتے رہے ہیں۔ روپے پیسے اور مالی مدد کے سلسلے مں ہم نے کبھی گریز نہیں کیا۔ اب روحانی اقدار جاننے اور باطن کو سمجھنے کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے تو آپ ہم سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔ ہم سے بے نیاز ہو کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ لاتعلقی کا اظہار فرما رہے ہیں!

لیکن حقی اور سچی بات کہ جسے مغرب نہیں جانتا، یہ ہے کہ ہمارے پاس انبیاء کے عطا کردہ علوم میں سے کچھ بھی باقی نہیں۔ بس ایک دعویٰ ہے جس کا ہم اعلان بھی کرتے ہیں اور جس پر اصرار بھی کرتے ہیں کہ انسان کے جملہ روحانی اور مصنوعی عوارض کا علاج صرف ہمارے پاس ہے۔ ہم کسی کونے کھدرے سے فلاں نسل انسانی کا نسخہ ڈھونڈ کر فراہم بھی کر سکتے ہیں لیکن اس پر وقت صرف کرنا اور انسان کو اس کے اندر کے بگاڑ سے نکالنا اور اسے انسانیت کی معراج سے روشناس کرانا اس وقت ہمارا منصب نہیں۔ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو کر صرف وہی کچھ کرنے کے آرزو مند ہیں جواب تک مغرب نے کیا ہے کیونکہ اس کے علاوہ ہمارا کوئی اور مطمع نظر ہی نہیں۔ ہم اسی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کو اپنانا چاہتے ہیں جو اب تک یورپ کا طرہ امتیاز رہی ہے کیونکہ ہمارے پاس اپنا کوئی طرہ ہی نہیں۔ ہم اب تک کی خارجی ترقی میں کوئی ترمیم بھی نہیں کر سکتے کہ ہم ترمیم کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور مغرب پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جس انسان کی خاطر ہم نے ایٹم کا جگر چیرا تھا، وہ ابھی تک ویسا ہی بیٹھا ہے۔ ننگا، بھولا خوفزدہ اور مایوس۔ جس انسان کے لیے ہم نے ستاروں پر کمندیں ڈالی تھیں، وہ انسان ابھی تک ویسے ہی زمانوں کی جھوبل میں زل رہا ہے۔ ہمیں اجازت دو کہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہی آپ کے انبیاء کی عطا کردہ لیبارٹریوں میں کام کر سکیں اور ان کے نظریات پر اپنے عمل کا ڈول ڈال سکیں لیکن ہم ان احمقوں کو کس طرح بتائیں کہ ایک لمبا عرصہ ہوا ہم ان لیبارٹریوں کو بند کر چکے، ان کے دروازوں کو مقفل کر چکے۔ اب ان کے در و دیوار پر جالے تنے ہیں اور اندر سب کچھ گرد آلود ہے۔ ان آسیب زدہ لیبارٹریوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا۔ تم اگر چاہو تو از خود انہیں کھول سکتے ہو۔ کھول کر ان میں تجربات شروع کر سکتے ہو۔ کامیاب ہونے لگو تو ہمیں اطلاع بھجوا

سکتے ہو۔ اطلاع مل گئی تو ہم اپنے بڑوں اور پرکھوں کی لیبارٹریوں کے قریب بھی آ جائیں گے۔ قریب آ گئے تو کھڑکیوں کے اندر جھانک کر دیکھ بھی سکیں گے۔ دیکھ لیا تو ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتبار بھی آ جائے گا۔ اندر آنا ہوا تو ہم اندر بھی جائیں گے لیکن ابھی نہیں۔ اس وقت نہیں۔ اس حال میں نہیں۔ مستقبل میں جب بائیسویں صدی کا پھاٹک کھلے گا اور ہمیں ایک اور چانس ملے گا۔ فی الحال تو ہم آپ کے پیچھے پیچھے رہیں گے اور اسی لکیر کو پیٹتے رہیں گے جسے پیٹ کر آپ اپنا رستہ تبدیل کر چکے ہوں گے اور تین سو ساٹھ ڈگری پر آپ نے ایک نئی ٹرن لے لی ہوگی۔ گو ہمارے پاس ہمارے انبیاء کا علم تھا اور وافر مقدار میں تھا مگر ہم کبھی Giving end پر نہیں رہے۔ Receiving End پر رہے۔ اس لیے یہی ہمارا مقدر بن گیا اور اس کے ساتھ ہم نے سمجھوتہ کر لیا۔

ترقی

موجود سے مقصود کی طرف سلامتی سے بڑھتے رہنے کا نام ترقی ہے۔ (ٹیکنالوجی ترقی کے حصول کے لیے ہر زمانے میں اوزار کا درجہ رکھتی ہے) مقصود کا تعین کرنا اس کا حق ہے جو لوگوں کی بھلائی کو اپنی خوشی پر قربان نہ کر دے۔ لوگوں کا ڈر رکھنا بھی حق ہو سکتا ہے مگر اللہ کا ڈر رکھنا سب سے بڑا حق ہے۔ مقصود کا تعین ہو جائے اور تعین کرنے والا جو کام کسی کو سپرد کر دے تو پھر اسے خدائی ڈیوٹی سمجھ کر ادا کیا جانا چاہیے۔ کسی کو مقصد کے تعین کرنے والے سے تقدم نہیں کرنا چاہیے۔ Technology جو موجود ہو، پہلے اس کو متحرک کرنا چاہیے۔ پھر یہ روشن ہوتا جائے گا کس جگہ کیا درکار ہے۔ جو درکار ہوگا، وہ ایسے آئے گا جیسے پہلے کبھی نہیں آیا۔

انسان کے اندر کی آگ اسی طرح سے بھڑک رہی ہے بلکہ ساری ایجادات، ساری طاقت اور ساری تحقیق نے اس جلتی پر اور تیل ڈال دیا ہے۔ پوری انسانیت تباہی کے گڑھے پر کھڑی ہے اور ہر وقت خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہے لیکن خود فناہی کا یہ جذبہ کسی وجہ کے بغیر نہیں ہے۔ انسان کی باہر کی دریافت اور باہر کی اختراعات اور معلومات نے انسان کو سکون تو نہیں دیا البتہ گھبرا سا دیا ہے اور یہ وہ گھبراہٹ ہی ہے جس نے اس کے اندر خودکشی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ جب انسان کا دل خوشی سے خالی ہو، روح بے لطف ہو اور جاتے وقت ہاتھ بھی خالی ہو تو پھر زندگی میں اس کا حصول اور ان سائنسی دریافتوں سے کیا ملا؟

اگر انسان زندگی بھر اپنے اندر سے اور اپنے مرکز سے بے نیاز رہے اور اپنی مشکلات کا حل باہر سے تلاش کرتا رہے اور اپنا سکون باہر کی چیزوں میں ڈھونڈتا رہے تو وہ یقیناً ایک بے مراد شخص ہوگا۔ اگر انسان اپنے اندر کی تقویت کے مقابلے میں باہر کی چیزوں اور باہر کے سہاروں میں امان ڈھونڈتا رہے تو اس کا انجام ایک تنگ دل مریض اور ایک ہارے ہوئے جواری کا سا ہوگا۔

ترقی کی بنیاد محبت پر استوار ہوتی ہے۔ محبت دونوں طرف سے جب ہی ہو سکتی ہے کہ تساوی ہو اور ہماری تساوی

یا تو اس طرح ہو سکتی ہے کہ سب امیر ہو جائیں اور یا اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ سب غریب ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ سب کا امیر بننا تو اختیاری نہیں، ہاں غریب بننا اختیاری ہے۔ پس باہم محبت کی صورت یہی ہے کہ سب غریب بن کر رہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اپنے احوال جمع جتھہ کو پھینک کر محتاج بن جائیں بلکہ غریب بننے سے مراد عادات و معاشرات میں غریب بن جانا ہے۔ اسی کو دوسرے لفظ میں کہا جا سکتا ہے کہ سادہ زندگی میں ہی محبت ہو سکتی ہے اور سادہ زندگی ہی محبت کی اساس ہے۔ جب معاشرے میں محبت باہم ہوگی تو معاشرہ ترقی کی طرف گامزن ہوگا۔ کوئی کوئی نخلستان قائم ہونے سے سارا علاقہ سرسبز نہیں کہلا سکتا۔

دولت

جب تک آپ دولت کی کہنہ کو نہیں سمجھیں گے، یہ بات آپ کے دھیان میں نہیں آئے گی کہ دولت ہے کیا؟

دولت ہمارے عہد کا دھرم اور ہمارے دور کی فقہ ہے۔ دولت سے چیزیں رونما ہوتی ہیں۔ اس سے عمل کی چکی چلتی ہے۔ علم کی شمع روشن ہوتی ہے۔ زندگی کا سارا دارومدار اس پر ہے۔ آپ کتنا بھی کہیں کہ مادہ پرستی گھٹیا رویہ ہے۔ ڈالر مہاراج اس کا فوراً بطلان کر دے گا۔

علم الاقتصاد دولت کا حاکم اعلیٰ نہیں ہے کہ اسے حکم دے کہ آئندہ سے میری مرضی کے مطابق اور میری منصوبہ بندی کے مطابق چلا کرو۔ دولت ہنس پڑے گی اور کہے گی، اے اقتصادیات کے علم تو ہندسوں کے زور پر اعداد و شمار کا سانٹا بجا کر درندوں کو کرتب دکھانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم بس ایک علم کی حد تک رہو، میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرو۔

کہنے لگا یہ جو ماہرین اقتصادیات، بروکر، بینکر، اکاؤنٹینٹ، سی اے، ایم بی اے ہوتے ہیں، یہ دولت کے عبادت کدے کے پجاری ہوتے ہیں۔ ان کا روپ پادریوں کا سا ہوتا ہے۔ یہ دولت کی شان میں بھجن گاتے اور قصیدے پڑھتے ہیں اور اس کی شان سے لوگوں کو مرعوب کرتے ہیں لیکن ان کا دولت پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ یہ جو دولت ہے نا یہ دنیا کی روح ہے۔ دنیا ایک جسم ہے اور دولت اس کے اندر جان ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں حرکت اور کائنات میں ارتعاش ہے۔ دولت پر تحکم جتانے کی کوشش نہ کرو۔ اس کی پوجا میں مصروف ہو جاؤ، اس کی عبادت کرو، اس کے گن گاؤ۔

جتنے بھی بھگت، اولیاء اللہ، شہید، سورمے اس دنیا کو اعلیٰ اقدار عطا کرنے کے لیے دولت ان کو اور ان کی یادوں کو سہارا دیتی ہے، ان کے لیے برسیاں کرتی ہے۔ دن مناتی ہے، بگر کرتی ہے، یدھ کرتی ہے۔ دولت نہ ہو تو ان بزرگوں کے مزاروں کی تزئین و آرائش نہ ہو سکے۔ ان کے مرقدوں کے گرد گلستان نہ بن سکیں۔ ان تک پہنچنے والے راستے کشادہ نہ ہو سکیں۔ اس کے ذریعے قدیم ہیروں کی سلامی اتاری جا سکتی ہے اور انہیں نئے سرے سے زندہ کیا جا سکتا ہے۔

قائداعظم سے ملنے اور ان کی تصویر کو ہر روز اور ہر وقت دیکھنے کا واحد سہارا کرنسی نوٹ ہیں۔ ڈالروں پر بھی امریکی مشاہیر کی تصویریں ان کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔ پانچ ڈالر پر بھی اگر ابراہم لنکن کی تصویر نہ ہو تو لوگ اسے بھول بھال جائیں اور اس کی شکل و صورت ان کے ذہن سے محو ہو جائے۔ ڈالر پر لکھا ہوتا ہے کہ ہم ذات خداوندی پر ایمان رکھتے

ہیں۔ یہ پرانے مسیحی مذہب کا تقاضا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی عین اس سیدھ میں ہر ڈالر پر لکھتا ہوتا ہے "NOVUS ORDO SECLORUM." یعنی نئے سیکولر نظام کے تحت۔

میں چاہے ایک معروف وکیل بننے کا خواب دیکھوں یا ایف سکسٹین کا پائلٹ بننے کا یا ایک اعلیٰ درجے کا جدید قسم کا سکول چلانے کا تو ہر حال میں ان خوابوں کو انسانی دنیا سے وقت لینے کے لیے مجھے پیسے کی ضرورت ہوگی۔ اصل میں دولت ہی ٹائم ہے۔ یہی ٹائم کی کہانی کی اصل ہیرو ہے۔ انسانی ذہن گھوم پھر کر، کھود کھود کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر تصوراتی خواب بُنتا ہے اور پھر ان خوابوں کو انسان کے وقت کی زمین میں بوتا ہے تو ان خوابوں کو وقت انسانی کی سرزمین میں بونے کے لیے پیسہ ہی اس کا واحد سہارا اور ذریعہ بنتا ہے۔

اب روپیہ غلاظت بھی ہے، یہ اجابت ہے۔ جس طرح انسانی بدن میں غذا کی گردش بتدریج متعلقہ خانوں میں ہوتی رہے، اس وقت تک تو صحت کا سلسلہ قائم ہے لیکن اگر یہ گردش رک جائے، قبض کی صورت اختیار کر لے تو پھر جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

س: قبض کیوں ہوتی ہے؟

ج: جب دولت پر دولت ٹھونسی جائے۔ نکاس کے راستے بند کر دیئے جائیں تو جان لیوا قبض ہو جاتی ہے۔ دولت کو جمع کرتے جائیں تو بدبودار روڑی بن جاتی ہے۔ اسی اور ڑی کو بکھیر دیں تو اعلیٰ درجے کی کھاد بن جاتی ہے۔ اسی طرح دولت بکھرتی رہے تو اچھا ہے لیکن دولت میں اور شٹ میں ایک ہی قدر مشترک ہے کہ دونوں خوشحالی کے ضامن ہوتے ہیں۔ ایک معاشرے میں اور ایک کھیت میں!

دولت کوئی چیز نہیں ہے، کوئی شے نہیں ہے۔ یہ ایک عمل ہے۔ یوں سمجھو یہ زندگی کی عبارت میں ایک فعل کے طور پر ایک تحریک کے طور پر کام کرتی ہے۔ دولت ایک اسم نہیں ہے، یہ فعل ہے۔

حقیقت اور سچ

ایک حقیقت اور اس کا اختیار

جب ایک حقیقت کو سمجھ کر ذہن میں اتار لیا اور جذب کر لیا تو پھر روزمرہ کے کاموں میں ضرور کوئی ایسا مقام تلاش کریں جہاں اس حقیقت کو روز آزمایا جا سکے۔ جب حقیقت' تجربے سے ملتی ہے تو جانکاری کا دھماکہ ہوتا ہے۔

ایک حقیقت پر توجہ فرمائیں: ایک آدمی دوسرے شخص پر جتنا بھی بوجھ ڈالتا ہے اور اس کو دباتا ہے (جان بوجھ کر یا بے خیالی میں) وہ اسی بوجھ سے خود کو بھی اتنا ہی پیڑ رہا ہوتا ہے اسی قدر دبا رہا ہوتا ہے..... ایک روز مجھے ایک دکاندار پر بڑا ہی غصہ آیا۔ میں کیا پوچھ رہا تھا اور وہ کیا جواب دے رہا تھا۔ جو میں نے مانگا تھا وہ اس کے برعکس کچھ اور ہی نکال رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے ایک چانٹا رسید کروں۔ اچانک مجھے اس ''حقیقت'' کا خیال آ گیا کہ جتنا زور اس پر صرف کروں گا اسی قدر زور مجھے بھی دھکیلے گا مجھے بھی Push back کرے گا۔ میں نے چانٹا مارنے کا خیال چھوڑ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا دکان سے نکل آیا۔ اب میں ایک آزاد انسان تھا۔

مشکل پڑنے پر آپ اکیلے ہی اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ آپ کے پاس سارا حفاظتی سامان پہلے ہی سے موجود ہے۔ یہ آپ کو کامیابی عطا کر سکتا ہے۔ دنیا آپ کو کتنی شدت سے کیوں نہ دبائے آپ اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں..... جب آپ کسی وجہ سے نالاں ہوں' ناراض ہوں up set ہوں تو ایک لحہ رُک کر' آرام سے بیٹھ جایئے اور سوچئے کہ اس صورت حال پر میں اپنی ذاتی عقل کس طرح سے استعمال کر سکتا ہوں اور خود اس کا کیا حل ڈھونڈ سکتا ہوں۔ پھر جو بھی ترکیب آپ کے ذہن میں آئے گی بالکل ٹھیک ہوگی..... میکانکی عمل سے گریز کریں!

اداسی اور اکلاپا انسان کے ذہن کے اندر رہتا ہے۔ خاص طور پر ذہن کے اس حصے میں جس کو یہ وہم ہے کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ایک اکائی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ عالمی کائنات کا ایک حصہ ہے' ایک جزو ہے۔ اس کائنات کے راگ کا ایک سُر ہے۔ جب یہ بات آپ کو سمجھ آ گئی تو اکلاپے کا دُکھ دُور ہو جائے گا۔

بہت سے لوگ زندگی کی حقیقتوں سے آشنائی حاصل کرنے میں کیوں ناکام رہتے ہیں اس لیے کہ وہ اصل آدمی سے بات کرنے اور اس کی بات سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ ایک کامیاب انسان سے بات کرتے ہیں یا ایک مصروف ماں سے گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب لیبل ہیں ''کامیاب انسان'' ۔ ''مصروف ماں'' ۔ ''خوبصورت محبوبہ''

لیبلوں میں سننے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہ حقیقتوں سے آشنائی حاصل نہیں کر سکتے۔

سلوک کا رستہ اختیار کرنے سے کیا ملتا ہے۔ اس کا انعام کیا ہے؟

اس کا انعام یہ ہے کہ آپ کے وجود میں دوئی نہ رہے اور آپ ایک اکائی ہو جائیں۔

باطن کے سفر کا رستہ کس طرح سے مل سکتا ہے؟

انا کی مقابلے بازی ترک کرنے سے! جب آپ دوسرے لوگوں کی انا کے ساتھ اپنی انا نہیں بھڑائیں گے تو آپ کو باطن کے سفر کا راستہ نظر آنے لگے گا۔

خودشناسی کے عمل میں مصروف رہنے سے زیادہ بڑی اور کوئی دریافت نہیں۔ اس عمل سے آپ کو ہر روز ایک نیا ہیرا مل سکتا ہے۔

خود آزادی ایک فل ٹائم مصروفیت ہے۔ اس کو آپ گھر پر بھی کر سکتے ہیں اور دفتر کے اوقات میں۔ جب راستے میں اندھیرا زیادہ ہو تو آپ کو اور زیادہ روشنی کی ضرورت ہے۔ ایک کے بجائے دو ٹارچ جلا کر دیکھ لیں۔

عام نفسیات کا علم آپ کو یہ سکھاتا ہے کہ مطابقت کس طرح سے کی جائے اور مفاہمت کیسے ڈھونڈی جائے۔ یہ آپ کو خودشناسی کا علم عطا نہیں کرتا۔ یہ مناظر تبدیل کرنے کی رائے دیتا ہے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا گر نہیں سکھاتا۔

اگر آپ اپنی زندگی میں تبدیلی کے خواہاں ہیں تو آپ کو زندگی سے بیزار ہونا ضروری ہے۔ ایک حال مست اور خوابیدہ انسان اپنے میں تبدیلی کا آرزومند نہیں ہو سکتا۔

جب بیزاری کا پارہ چڑھا ہوا ہو تو آرام سے کرسی پر بیٹھ جائیں۔ کچھ نہ کریں' اپنی بیزاری دُور کرنے کے لیے کوئی ترکیب نہ لڑائیں۔ بس اس کا مطالعہ کریں اور پرسکون روح اور پرسکون ذہن کے ساتھ بیزاری کا ویڈیو کیسٹ ملاحظہ کریں۔

ان باتوں سے کبھی خوف نہ کرو کہ:

تم اصل میں کون ہو اور کیا ہو!

ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہونا اور مستقبل سے خائف نہ ہونا

اگر آج کوئی تھرل نہیں یا کوئی ہیجان نہیں' کوئی ہلا گلا نہیں۔

غلطی کرنے' غلطی کھانے اور غلط ہونے سے!

اگر کسی کی توجہ نہ مل سکے۔

اپنے منفی روّیے سے بھی خوف نہ کھانا

گر کر اٹھنے سے بھی خوف نہ کرنا

اور اس کا تو بالکل ہی خوف نہ کرنا کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔

خودشناسی' خودفریبی اور خودستائی دونوں کا علاج ہے۔ اس تھرمامیٹر کو ہر وقت لگا کر دیکھتے رہیں' بڑا فائدہ ہوگا۔

لوگوں کو بچانے سے پہلے اپنے آپ کو ضرور بچا کر رکھو اور اپنی حفاظت کرو۔
کسی شے کے گم ہو جانے پر اتنا واویلا نہیں کرنا چاہیے' جو چیز گم ہو سکتی ہے وہ مل بھی سکتی ہے۔

سچ اور حقیقت

(1)- ''ہم کو یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم سچ کے اندر داخل ہو گئے یا ہم صرف سچ کا تذکرہ کر رہے ہیں؟''
''آپ سچ کے اندر اس وقت سانس لینا شروع کرتے ہیں جب سچ کے تذکرے اور سچ کی وادی میں سیر و سیاحت کرنے کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔''

(2)- ''ہم برائی کی پیروی کیوں کرتے ہیں' جب ہم کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ برائی ایک خطرناک شے ہے؟''

''وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر کچھ حصے ایسے بھی موجود ہیں جو برے کو اچھا سمجھتے ہیں۔''

(3)- ''خودنگری کا عمل اس قدر تکلیف دہ اور بیزار کن کیوں ہے؟''
''عام طور پر تو ہم یہی کہیں گے کہ سچائی کا سامنا کرنا بڑا تکلیف دہ عمل ہے اور اس کی کڑواہٹ برداشت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سچ کے خلاف مدافعت اور اس کے ساتھ لڑائی ہم کو اذیت پہنچاتی ہے اور بیزار کرتی ہے۔''

(4)- ''ہم اپنی آزادی کی راہ میں کس طرح سے حائل ہیں؟''
''جس قدر تیزی سے اور سرعت سے ایک آدمی اپنی غلط بات کی مدافعت کرے گا اور اس کا پالن کرے گا اسی قدر سستی سے اور کاہلی سے وہ اس پہاڑی پر چڑھ سکے گا جو اس کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرے گی۔''

اگر آپ اپنے دُکھ اور کرب کے اندر جھانک کر دیکھیں اور اس کا گہرا مطالعہ کریں تو آپ کو اس کے اندر کئی غلط قسم کی پیش قدمیاں نظر آئیں گی۔ دکھ ایک شخص کو توجہ کا مرکز بنا دیتا ہے' وہ خود بھی اس توجہ کا طالب ہو جاتا ہے۔ وہ شخص اجتماعی سٹیج کا ایک کامیاب کردار بن جاتا ہے اور ہر وقت ڈرامے میں مصروف رہتا ہے۔ دُکھ اور ابتلا بڑی خطرناک چیز ہے۔ یہ انسان میں انانیت کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہے..... جب بصیرت بڑھتی ہے اور نگہداری کا عمل وجود میں آتا ہے تو دُکھی اور سوگی اس ڈرامے کو ترک کرنے لگتا ہے۔ بیماری کے مقام پر صحت کا سیلاب پھیلنے لگتا ہے۔

حقیقت اور پرچھائیں

اس نے کہا مجھ پر اچھائی کا اور نیکی کا اور بھلا کا غلبہ طاری تھا اور میں بھلے افعال میں بیماری کی حد تک مبتلا تھا' پھر مجھے صحت ہو گئی اور میں صحت مندوں میں سے ہو گیا۔ میں نے پوچھا یہ کیسے ممکن ہوا تو اس نے بتایا کہ میں بڑا مخیّر تھا اور سخاوت میں مشہور تھا۔ لوگ میری سخاوت کے پرستار تھے۔ اچانک ایک روز میں نے محسوس کیا کہ اس سخاوت کے عوض تو میں ان سے انعام کی توقع رکھتا ہوں اور ان کی داد کا متلاشی ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں تو ایک غلط راستے پر چل

رہا ہوں اور میں اپنی ایک اور ہی تصویر کا پھٹا اٹھائے پھرتا ہوں اور لوگ اس تصویر کی داد دیئے چلے جاتے ہیں۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کہ میرے بجائے میری تصویر کی اور میرے امیج کی پوجا ہو رہی ہے۔ میں نے وہ پھٹا اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے وجود سے پہلی مرتبہ ملاقات کی۔ پھر مجھے ان دونوں میں فرق معلوم ہوا اور میرا دل خوشی سے اور لذت سے اور آنند سے بھر گیا۔

ناممکنات

آدمی کی مشکلات اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کرتا ہے اور وہم کو حقیقت سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔
وہ زندگی کی کامیابیوں پر پھولا نہیں سماتا اور ہر ایک کو ٹھونگے مارتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ کامیابی کے ساتھ ناکامی بھی وابستہ ہے۔ زندگی بڑی عجیب شے ہے یہ لیتی بھی ہے اور دیتی بھی ہے۔ سمندروں کو دریا بھی دیتی ہے اور سمندروں سے بادل بھی لیتی ہے۔
انسان دوسروں کے ساتھ بقائے باہمی کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی زندگی کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے قاصر ہے۔ دوسروں کے ساتھ مل کر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ساتھ مل کر چلا جائے۔ آدمی کو یہ وہم ہے کہ وہ اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا کو الگ الگ لے کر سفر کر سکتا ہے..... ناممکن!! دنیا تو ایک ہی ہے۔
وہ حقیقت کو توڑ مروڑ کر اپنی منفعت کے مطابق کرنا چاہتا ہے..... ناممکن! حقیقت توڑی مروڑی نہیں جا سکتی نہ ہی ڈھالی جا سکتی ہے۔ البتہ خود کو اس کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے اور یہی زندگی کا راز ہے۔

سچ

سچ ایک آدمی کے لیے بڑا ہی سخت' بڑا ہی ظالم اور بہت ہی سنگدل مخالف ہے۔ وہ ہمیشہ ہی نقصان پہنچاتا ہے..... وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ شخص سچ کو اپنی عطا کردہ صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ سچ کو اس کے اصل رُوپ میں نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرے اور سچ کو اُس کے حال پر رہنے دے وہ جس شکل میں بھی نمودار ہوتا ہے' وہی اس کی اصل صورت ہے۔
ایک شخص دوسرے انسان کو صرف ایک ہی شے عطا کر سکتا ہے اور وہ ہے اس کی بالغ نظری کی سطح یا کم نظری کی سطح۔ بس یہی ساری کہانی ہے اور یہی سارا قصہ ہے۔ چنانچہ سری رمز کی دنیا میں سخی وہ ہے جو اپنی بالغ نظری میں اضافہ کر کے اپنی سطح بلند کرے۔
اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے آپ کو سچا ثابت نہ کیا جائے۔ سچائی کو اپنا آپ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جس طرح عقاب کو اپنا آپ ثابت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ عقاب ہے۔

پارٹی بازی

جو شخص کسی ایک سائیڈ کو اختیار کرتا ہے وہ سچ سے آشنا نہیں ہو سکتا کیونکہ سچائی انسان کی بنائی ہوئی پارٹیوں سے ماورا ہے۔ جہاں پر سائیڈ A ہوگی وہاں پر سائیڈ B ضرور ہوگی۔ یہ دونوں ٹکرا کر بحران پیدا کریں گی۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب تک سائیڈ اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک کشمکش کیسے ہوگی جدوجہد کس طرح ہو سکے گی۔ زندگی کا قافلہ کیسے رواں ہوگا؟ یہ ایک ازلی احمقانہ سوال ہے۔ جو عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ''خدا'' ''سچائی'' اور ''حقیقت'' کو کچھ تسلیم کرنے کی احتیاج نہیں ہے۔ ''حقیقت جانتی ہے'' .....اور پھر ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس دنیا کو سائیڈیں لینے سے اب تک کیا ملا؟

سائیڈ کو اور پارٹی کو چھوڑنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کوئی شخص ہی اس طرح سے کر سکا ہے کہ اپنے آپ سے لیبل اتار کر زندگی بسر کرنا شروع کر دے۔ لیبل آپ کو تحفظ اور طمانیت کا احساس فراہم کرتے ہیں۔ ان کا اتارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

مخالف سائیڈوں سے نبرد آزمائی بڑا خوب کام ہے لیکن اس کا سچ سے کوئی تعلق نہیں سچ ہمیشہ مخالفت سے اوپر ہوتا ہے۔

رہنمائی

حوصلہ کر کے اور کوشش کر کے ان راہوں کو اپنائیں۔

1- سری رمز کے قوانین کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں۔
2- مانگنے کے خیال سے خود کو بچائیں۔
3- دل ٹوٹنے کی حالت میں سبق ضرور سیکھیں۔
4- شادمانی کے فریب نظر تصور پر گہری نظر رکھیں۔
5- دوسرے لوگوں کے اثر سے آزاد رہیں۔
6- خود اذیتی کی وجہ ڈھونڈیں اور اس کا خاتمہ کریں۔
7- بے حقیقت منزلوں کا کھوج لگائیں اور ان کی راہ چھوڑ دیں۔
8- اپنے آپ میں تبدیلی کے لیے خوش باشی کی قوت کام میں لائیں۔

علم اور بصیرت

سری رمز اور تصوف کا علم پورے کا پورا منطقی علم ہے مثلاً اگر آپ وہ شخص نہیں ہیں جو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ ہیں پھر وہ مسائل بھی آپ کے نہیں ہیں جو اُس شخص کے ہیں۔ آپ وہ آدمی نہیں ہیں جو آپ اپنے آپ کو سمجھ رہے ہیں لامحالہ

وہ پھر وہ مسئلے بھی آپ کے نہ ہوئے جو آپ اپنائے پھرتے ہیں۔

یاد رکھئے کہ علم ایک ضروری شے ہے اور اس کو ضرور ہی حاصل کرنا ہے لیکن یہ ادراک نہیں ہے۔ ہم لعل و جواہر پر سینکڑوں ہزاروں کتابیں پڑھ کر انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کر سکتے ہیں لیکن یہ لعل و جواہر کا ادراک نہیں ہے۔ علم ہم پر اس وقت بصیرت بن کر وارد ہوتا ہے جب ہم حقائق کو اپنے پر عمل کرنے کی اجازت دیتے ہیں اور وہ ہمارے روّیے میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔

''ہماری قسمت میں یہی کچھ کیوں لکھا ہے یہ بدل نہیں سکتا؟''

''آپ کو جو ملتا ہے آپ کی طبیعت کے مطابق ملتا ہے۔ جس طرح کے آپ آج ہیں اسی طرح کا کل آپ کو مل جائے گا۔ اگر آپ یہ سب کچھ جو مل رہا ہے' پسند نہیں ہے تو اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کر لیں۔ آسان سی بات ہے۔''

واعظوں کے پاس بڑے بڑے جواب ہوتے ہیں لیکن اب میں ان کو اہمیت نہیں دیتا بالکل ٹھیک کرتے ہو۔ جس طرح ہوٹل کے مالک عام طور پر دوسری جگہوں پر کھانا پسند کرتے ہیں' اسی طرح اگر واعظوں کو بھی اپنے کہے پر اور اپنے سودے پر عمل کرنا پڑ جائے تو ان کی زندگیاں اجیرن ہو جائیں۔

ایک قیمتی سبق یہ یاد رکھو کہ جب آپ ہر شخص کے اور ہر شے کے رحم و کرم پر ہیں اور آپ لڑائی نہیں کرتے' جھگڑا نہیں کرتے تو آپ فتح یاب ہیں۔

اصل حقیقت

ذات کی حقیقت اور اس کی کہنہ جاننے کے لیے ایک اور نقطۂ نظر سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ کبھی آپ نے دیکھا اور محسوس کیا کہ آپ ایک وجود رکھنے کے باوصف اس وجود میں بہت سے آدمی ہیں۔ یعنی ایک صورت حال میں آپ ایک طرح کے شخص ہوتے ہیں اور دوسری صورت حال میں بالکل دوسری طرح کے..... اگر کسی شخص پر اپنی علمیت اور فضیلت کا رُعب جمانا ہو تو آپ کچھ اور ہیں اور جب اپنے افراد خانہ سے معاملہ کرتے ہیں تو بالکل ہی ایک دوسری شخصیت کے حامل ہیں۔

جب آپ اپنے اندر کے کرداروں کو اپنے وجود کی سٹیج پر آتے جاتے اور سوانگ بھرتے دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ان میں یکتائی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں تو پھر سٹیج پر ایک سناٹا چھا جاتا ہے اور اصل شخصیت ایک بادشاہ کی طرح آ کر تخت پر متمکن ہو جاتی ہے۔

سچ اور سچائی

ایک روز ایسے ہوا کہ ہمارے درمیان سچائی پر بحث ہونے لگی۔

سچائی کی پہچان یہ ہے کہ دوسروں کو گزند نہ پہنچائے۔ جو سچائی دوسروں کو تکلیف دیتی ہے وہ سچائی نہیں لادینی ہے۔

کچھ لوگ سچ کو دبا کر اور چھپا کر بیٹھے رہتے ہیں کہ باہر نکلا تو اس کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔

سچ بھی دریا کی مانند ہے جس کے کسی مقام پر دو دھارے ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں دھاروں کے درمیان جو بریتی پیدا ہو جاتی ہے اس پر بسنے والے لوگ عمر بھر ایک ہی جھگڑے میں مصروف رہتے ہیں کہ ہماری طرف کا دھارا ہی اصل دریا ہے۔

سچائی کو اپنی چکاچوند ذرا ڈھانپ کے کرنی چاہئے ورنہ لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور انہیں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ غلط راستہ اختیار کر لیں گے۔

سچ کہنے سے سچ ختم ہو جاتا ہے' سچ کرنے سے سچ قائم رہتا ہے۔

کوئی سچ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی سچ حاصل نہیں ہو سکا۔ کوئی سچ دلیل و برہان پر قائم نہیں رہ سکتا۔

وہ جو بنا بنایا اور ریڈی میڈ سچ آپ کو دیا جاتا ہے وہ آسانی کے لیے ہوتا ہے۔ اُسے ایک طرح کی خواب آور گولی سمجھئے۔

میرے خیال میں کسی بھی فانی انسان سے ایک خوشگوار ماحول اور سازگار حالات میں اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ سچ کو پورے کا پورا پکڑے یا کم از کم اس کے مرکز میں ہی ہاتھ ڈال دے۔

وہ شوخ و شنگ سچ جو ہر ایک کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے پر مصر ہو ایک طوائف کا سا مزاج رکھتا ہے کہ سبھی رُک کر اُس پر ٹھرک جھاڑنے لگتے ہیں۔

کچھ لوگ ہر وقت اور ہر گھڑی سچ بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور سچ کو ریزگاری کے طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں' ایسے لوگ لپاٹئے ہوتے ہیں۔ سچ تو ایک بہت ہی بڑا دھن ہے۔ چھپا کے رکھنے والا یہ دولت تو سنبھال کے رکھی جاتی ہے اور اشد ضرورت کے وقت استعمال میں لائی جاتی ہے۔

تعریف

تعریف کیا ہے۔ دوستی کا اور محبت کا اظہار ہے اور ہمیں اس اظہار کو اکثر و بیشتر عمل میں لاتے رہنا چاہئے۔ کسی نے کوئی اچھا کام کیا۔ کسی نے کوئی اچھی بات کی۔ بھلے شبد کا اچارن کیا۔ اس کو فوراً تعریف ملنی چاہئے۔

جب آدمی کو قبر کے اندر لٹا دیا اور اس پر مٹی ڈال دی تو اس وقت اس کی تعریف و توصیف سے کیا فائدہ! تعریف کی تو ہم سب کو ابھی اور اسی وقت ضرورت ہے۔ ہماری زندگی میں ہمارے ہوتے ہوئے۔ مرے پر کسی نے منہ چوما تو کیا فائدہ!

آدمی چاہے بادشاہ ہو چاہے فقیر' استاد ہو شاگرد' گرو ہو چیلا' شادی شدہ ہو یا کنوارا' دہقان یا فلسفی۔ اس کو تو تعریف کی اب اور اس وقت ضرورت ہوتی ہے اور سب کو ہوتی ہے۔

اس تعریف کا کوئی مزا نہیں جو ڈھونڈ کر کوشش کر کے اور گھیر گھار کے حاصل کی جائے (جیسے کتابوں کی رونمائی

وغیرہ میں ہوا کرتی ہے) بلکہ تعریف تو Effort-less ہوتی ہے۔ جب یہ ہم کو قدرتی طور پر ملے جب ہم کسی کے لیے کچھ کر رہے ہوں اپنے لیے کچھ کیا ہو کوئی کارنامہ کر کے دکھایا ہو۔

ہم سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے اور ہمیں موقع بہ موقع ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہنا چاہئے۔ محبت اور دوستی کی ہر عمر میں ضرورت ہوتی ہے (ریٹائرڈ بوڑھے جو مسجد جانا شروع کر دیتے ہیں)

If you think that praise is due to him.

Now is the time to slip it to him

For he can not read his tombstone

When he is dead.

ہمارے یہاں ایک مسئلہ محبت اور اتفاق باہمی ہے کہ مسلمان اس نعمت سے محروم ہیں اور ان میں یکجہتی مفقود ہے: چنانچہ مولوی صاحب نے جواب بھجوایا کہ:

''محبت دونوں طرف سے جب ہی ہوتی ہے کہ تساوی ہو اور مسلمانوں میں تساوی اسی طرح سے ہو سکتی ہے کہ سب امیر ہو جائیں۔ یا اس طرح ہو سکتی ہے کہ سب غریب ہو جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ سب کا امیر بننا تو اختیاری نہیں البتہ غریب بننا اختیاری ہے..... بس باہم محبت کی صورت یہی ہے کہ سب غریب بن کر رہیں اور آپس میں گہرا اتفاق رکھیں۔ اس غریبی سے یہ مراد نہیں کہ اپنے مال و دولت کو اٹھا کر پھینک دیں اور محتاج ہو کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ غریب بننے سے یہ مراد ہے کہ عادات اور معاشرت میں غریب بن جائیں اسی کو دوسرے لفظ میں کہا جاتا ہے کہ سادہ زندگی ہی میں محبت ہو سکتی ہے۔

آج کل کے جو فلسفی اور ہیومن رائٹس کے علمبردار جو ہمدردی ہمدردی پکارتے پھرتے ہیں اور امیری میں اور تکلف میں اعلیٰ درجے کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کو کون سمجھائے کہ دولتمندی اور امارت میں ہمدردی اور محبت جمع نہیں ہو سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ باہم محبت کے لیے ہم خیال ہونا ہی ضروری نہیں' ہم حال ہونا بھی لازمی ہے۔

ماوراء

ایک عام خیال جسے آپ نے بارہا سنا ہے اور بار بار دہرایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مجھے اپنے مقابلے میں دوسروں سے زیادہ محبت کرنا ہے دوسروں کا زیادہ خیال رکھنا ہے۔ لیکن یہ تصور کتنا ہی ارفع کیوں نہ نظر آئے' حقیقت میں بہت ہی غلط ہے۔ اپنے آپ کو چھوڑ کر دوسروں سے محبت کرنے میں شخصیت دونیم ہو جاتی ہے۔ دو حصوں میں بٹ جاتی ہے اور روح کے خلاف جنگ شروع ہو جاتی ہے اور جہاں جنگ ہوتی ہے وہاں ہر شے مکروہ اور بدصورت ہو جاتی ہے۔ جنگ کا رستہ کبھی بھی نیکی کی طرف نہیں جاتا..... انسان کو اپنے خلاف جنگ نہیں کرنا ہے۔ اُسے اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ واقفیت میں

اور حقیقت میں اترنا ہے۔ انسان کو اپنے آپ سے محبت کرنا ہے اپنے آپ سے پیار کرنا ہے۔ جو شخص اپنے نفس کی پکار پر ہر تقاضے کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔ وہ بھی اپنا دشمن ہے اور جو اس پکار کے خلاف تلوار اٹھا لیتا ہے وہ بھی اپنا دشمن ہے۔ دونوں ہی اپنی ذات کے خلاف نفرت میں اترنے والے ہیں۔ اپنے آپ کو تباہ کرنے والے ہیں لیکن اپنے آپ سے صحیح انداز میں محبت کرنے والا ہی علم حاصل کرسکتا ہے۔

جو لوگ حق کی اور سچ کی باتیں کیا کرتے ہیں ان کی باتیں غور سے سنا کرو۔ وہ سچ کا بیان نہیں کرتے نہ ہی وہ سچ سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ عام طور پر اس سچ کا تذکرہ کیا کرتے ہیں جس کے بارے میں انہوں نے کسی اور سے سن رکھا ہے کہ سچ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سچ ایک نظریہ ہے۔ ایک خیال ہے۔ ایک مقولہ ہے یا ایک ضرب المثل قسم کی شے ہے۔ اس لیے سچ کے بارے میں بول بول کر وہ لفظوں کے ہاتھوں ہلکان ہوتے رہتے ہیں..... لیکن میری نظر میں سچ تسلیم سے اور انکار سے ماورا ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں کبھی بھی وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "یہ ہے" اور اس کے بارے میں کبھی بھی وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ "یہ نہیں ہے"...... دراصل سچائی اندر کی نظر ہے جب یہ حاصل ہو جاتی ہے تو پھر ضائع نہیں ہوتی۔

حقیقت اور واقفیت

جب کوئی حقیقت ذہنی طور پر گرفت میں آجائے تو پھر اس کو روزمرہ زندگی میں عمل کی منڈی میں بھی لایئے۔ جب کوئی حقیقت عمل میں آتی ہے تو اس کو گویا خلیفہ لگ جاتا ہے۔ اس سے دانش کی توپ چلتی ہے اور کئی مشاہدے حاصل ہوتے ہیں۔

جاوید کے سامنے ایک حقیقت تھی جو اس کے ذہن نے قبول کر رکھی تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر دباؤ ڈالتا ہے اور جان بوجھ کر یا انجانے میں اس کو رگڑتا ہے تو اتنا ہی پریشر اس پر بھی پڑتا ہے اور تقریباً اتنا ہی رگڑا اس کو چڑھتا ہے۔

جاوید کو علمی طور پر تو یہ تسلیم تھا لیکن یہ حقیقت اس کے وجود کا حصہ نہیں بنی تھی..... پھر ایک روز اس نے فرنیچر سپلائی کرنے والے بابو کو تاڑا جس نے سپلائی کے معاملے میں بڑی احمقانہ حرکت کی تھی اور اس سے کافی نقصان پہنچا تھا..... سرزنش کرتے وقت جاوید نے محسوس کیا کہ اس واقعہ کا اس پر بھی اتنا ہی بوجھ پڑ رہا ہے جتنا کہ فرنیچر کلرک پر۔

اس نے فوراً اپنی غلطی کا احساس کیا اور دباؤ چھوڑ دیا۔ عین اسی وقت وہ آزاد ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر ادھر اُدھر دیکھا اور ہولے سے سلاما علیکم کہہ کر دکان سے باہر نکل گیا۔

Yes+No

تمام انسانی زبانیں ہاں اور ناں میں منقسم ہیں۔ سیاہ اور سفید میں بٹی ہوئی ہیں لیکن زندگی نہ سیاہ ہے نہ سفید، یہ

سرمئی ہے..... دوسرے کے بغیر پہلا نامکمل ہے کیونکہ زندگی دونوں کے تال میل کا نام ہے۔ رات اور دن، گرمی اور سردی، سمندر اور پہاڑ، خدا اور ابلیس۔

اگر تم کو سچ سے اور حق سے روشناس کرایا جائے تو وہ حق ایک اعتقاد بن جائے گا اور اعتقاد زندگی کی راہ کا پتھر ہے۔

جو ذہن جتنا بند ہوتا ہے اسی قدر منطقی، استدلالی اور بحثیا ہوتا ہے۔ وہ اس قدر بند ہوتا ہے کہ اس نے منطق، فلسفے اور دلیل بازی کے سوا اور کچھ سیکھا ہی نہیں ہوتا۔

تم آزادی کی اور خوشی کی اور محبت کی زبان کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ تم صرف خوف کی اور اندوہ کی زبان سمجھ سکتے ہو۔ آزادی تم سے کہی نہیں جاسکتی لیکن خوف تم سمجھ سکتے ہو۔ یہ تم پر طاری کیا جاسکتا ہے۔ موت تم اچھی طرح سے جانتے ہو لیکن زندگی سے ناواقف ہو۔

علم کا معاملہ بڑا ہی پیچیدہ ہے۔ سچ ہر مرتبہ دانش نہیں ہوتا اور نا سچ ہر وقت احمقانہ نہیں ہوتا۔

سچ اور حقیقت

اگر زندگی سے یہ پوچھا جائے اور ہزار برس تک پوچھا جائے کہ تم زندگی کیوں ہو اور زندہ کیوں ہو تو وہ یہی جواب دے گی کہ میں صرف زندہ رہنے کے لیے زندہ ہوں۔ اس کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں۔

نامرئی، نامعلوم، مخفی، غیر محسوس

آپ کے اندر بھی ایک نامعلوم اور ایک مخفی قانون کام کر رہا ہے۔ یہ مخفی قانون آپ اپنی بزنس اپنی گھریلو زندگی، اپنی ملازمت اور اپنے معاشرتی تعلقات پر وارد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ کی زندگی کے جتنے بھی مظاہر ہیں اور جتنی بھی واردات نہیں وہ ساری کی ساری اس غیر محسوس قانون کے تابع ہیں۔

اگر آپ آرام سے اور چپ کر کے دیوار سے ڈھولگا کر بیٹھ جائیں کہ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دیں، وہ تو پھر یقیناً کئی واقعات رونما ہوں گے اور جو ہونا ہے وہ ہوتا بھی رہے گا لیکن ایسا کر کے آپ اپنے آپ کو ایک منفی قانون کے تحت ڈھال رہے ہیں لیکن اس کے برعکس جب آپ "خود" کو اور اپنے آپ کو اور اپنی ذات کی نیچر کو سمجھنے میں لگ جاتے ہیں اور آپ کے بارے میں احسن التقویم کا جو اعلان کیا گیا ہے، اس کی تفصیلات میں اتر جاتے ہیں۔ پھر آپ اس مخفی قانون کے مثبت انداز کو اور مثبت پیش قدمی کو جاننے لگ جاتے ہیں۔

وقت کی اہمیت

دنیا میں سب سے مشکل کام وقت کو define کرنا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وقت ایک گز ہے، ایک فیتہ ہے، ایک پیمانہ ہے جس سے زندگی کو ناپا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا زمان کی پابندی سے ماورا ہے۔ وہ ازل سے ہے اور

ابد تک رہے گا اور ابد ٹائم کی زد میں نہیں ہوگا اور وہاں کوئی خستگی کوئی خرابی نہیں ہوگی اور جہاں کوئی خستگی خرابی نہیں ہوگی، وہاں جانچنے کا کوئی آلہ درکار نہیں ہوگا، چنانچہ وقت نہیں ہوگا۔

میں تم کو جو سب سے عمدہ تحفہ دے سکتا ہوں، وہ میرا وقت ہے بلکہ یہ واحد تحفہ ہے جو میں کسی کو دے سکتا ہوں۔
اگر میں تم کو کچھ رقم تحفے کے طور پر دوں تو میں اصل میں تمہیں اپنا وقت ہی دے رہا ہوں۔ وہ وقت جس میں لگ لپٹ کر یہ روپیہ کمایا تھا، کوئی تحفہ دوں تو وقت ہی دیا جس سے میں نے روپیہ کمایا، روپے سے تحفہ خریدا...... لا کر تمہیں دیا۔

اچھا جب میں تمہیں اپنا وقت دیتا ہوں تو گویا تمہیں اپنی زندگی عطا کرتا ہوں۔ دیکھو نا جب کوئی شخص کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ اس سے اس کا ٹائم ہی لیتا ہے ناں۔ وہ سال وہ مہینے جو اس نے بسر کرنے تھے، وہ چھین لیتا ہے۔ وہ اٹھائیس سال تیس سال...... پچاس سال...... تو جب میں تم کو اپنا وقت دیتا ہوں تو گویا اپنی جان تم پر نچھاور کرتا ہوں۔

میرا وقت تمہارے ساتھ ایک Investment ہے۔ تمہارا وقت میرے ساتھ ایک Investment ہے۔
آئیے ہم ایک دوسرے کی Investment کا دھیان رکھیں اور اسے عقلمندی سے صرف کریں۔

جب میں تم کو اپنا وقت دیتا ہوں تو ہر لمحہ، ہر ثانیہ اور ہر منٹ تمہارا ہو کر دیتا ہوں کہ وہ لمحہ پھر واپس نہیں آتا۔ نہ ہی لیا جا سکتا ہے اور تم کو دیا گیا لمحہ کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ جس نے مجھے اپنا وقت دیا، اس نے نہ صرف اپنی زندگی مجھے دی بلکہ ایسی چیزیں جو کسی اور کو دی ہی نہیں جا سکتی اور جو دوبارہ بھی نہیں دی جا سکتی (تم لڑکیاں قمیضوں کے ٹوٹے ادلتی بدلتی رہتی ہو ناں) لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ محمودہ کو دیا گیا ایک لمحہ محمودہ آگے صالحہ کو نہیں دے سکتی!

خدا نے ہم کو لاکھوں کروڑوں نعمتیں عطا فرمائی ہیں لیکن وہ بھی ہم کو وقت کا تحفہ نہیں دے سکتا کہ اس کے یہاں وقت ہے ہی نہیں۔ (وہ ازل ہے، وہ ابد ہے۔ سب چیزیں فنا ہو جائیں گی، صرف تیرے رب کا چہرہ رہ جائے گا)

میرا عطا کردہ ایک منٹ تمہارے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے کہ جب ہم اکٹھے مل کر ایک لمحے کا تبادلہ کرتے ہیں تو اس وقت ہم دونوں نے اپنا اپنا لمحہ ساری دنیا سے لیا ہوا ہوتا ہے۔

''ساری دنیا سے کیا مراد ہوتا ہے!''

ساری دنیا سے Sorry مانگ کر لیا ہوتا ہے کہ سوری دینا! اس وقت میں یہ منٹ سلمیٰ کو دے رہا ہوں، تمہاری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ تم بھی کہتی ہو، سوری دینا اس وقت میں اپنا منٹ سر کو دے رہی ہوں۔ تمہاری طرف توجہ نہیں دے سکتی!...... چنانچہ ہر ایک سے معافی مانگ کر ہم اپنا اپنا لمحہ، منٹ یا ثانیہ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔

ملفوظات، ارشادات

ملفوظات:

(1) نامعلوم اور ناشناختہ کو جاننے کے لیے آسان ترین عمل یہ ہے کہ اس میں داخل ہو کر اس کا تجربہ اور مشاہدہ کیا جائے نہ کہ اس سے خوفزدہ ہوا جائے۔
(2) ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ اپنے ذہن کے ایک حصے کے زور پر جسے حافظہ یا یادداشت کہتے ہیں، زندگی بسر کی جائے یا ذہن کے پورے استعمال کے ساتھ۔
(3) کچھ بالکل مختلف اور بہت ہی مختلف کرنے سے ہم مختلف نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔
(4) زندگی کے بنیادی حقوق کو اور عام سچائیوں کو بار بار پرکھنے اور ان کی روزمرہ زیارت کے عمل کو ترک کر دیں اور یہ بہانہ نہ کیا کریں کہ میں ان کے گہرے معانی تلاش کر رہا ہوں اور حقیقتوں کی تہہ میں اتر رہا ہوں۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہیں، اس لیے اس خود خوشنودی کو ختم کر دیں۔

تجربہ

اس وقت ہم عذاب میں ہیں۔ کیا ساری دنیا عذاب میں ہے لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟ کارن کیا ہے؟ مگر اس وجہ کو ڈھونڈنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ دماغ بالکل ٹھیک ہے اور اپنی جگہ چوکس ہے۔ فقط دل گھاٹے میں آ گیا ہے اور اپنے مقام سے ہل گیا ہے...... آگہی اور جانکاری کسی علم سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ تجربے سے ملتی ہے۔ وہ آنکھیں جو زندگی کی راہوں کو روشن کرتی ہیں، وہ دماغ کی آنکھیں نہیں ہوتیں بلکہ دل کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اگر دل اندھا ہے تو زندگی کی راہ تاریک ہی رہے گی اور ساری عمر اندھیرے میں گزر جائے گی۔

حضرت شیخ اکبر کے ارشادات

شیخ اکبر کا ارشاد ہے کہ چونکہ ہم نبی نہیں، اس لیے انبیاء کے مذاق کا ادراک ہم نہیں کر سکتے۔
تہجد کے وقت آنکھ تو کھل جاتی ہے مگر کاہلی کے مارے اٹھا نہیں جاتا۔ فرمایا کہ اس وقت جس دم کیا کرو کاہلی

جاتی رہے گی۔ کثرت ذکر شدت ضرب کے ساتھ مفید ہوگی مگر اس کا خیال رہے کہ ضرب اسی قدر ہو جس کا متحمل ہو سکے۔

صحابہ کے کمال عقل کی ایک یہ بات ملاحظے کے قابل ہے کہ انہوں نے مختلف مقامات پر جتنی بھی مسجدیں بنائیں، سب کا قبلہ درست ہے۔ حالانکہ اس وقت نہ ان کے پاس قطب نما تھا، نہ جغرافیہ، نہ وہ مہندس تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی نقشہ موجود ہوتا تھا۔ بڑے بڑے عقلدار، ماہر انجینئر بعد کو پیدا ہوئے جن کا مشغلہ اور انتہائے سعی یہی ہے کہ اسلام میں نقص پیدا کریں اور اس کی کوئی خامی ڈھونڈیں۔

حضرت شیخ اکبر کا ارشاد ہے کہ قبول توبہ کی علامت گناہ کا بھول جانا ہے۔

فرمایا کہ اعمال اور اشغال اور نوافل تو لوگ کثرت سے اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ایک وجودی شے ہے۔ دوسرے بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس لیے نفس کو اس میں بڑا مزا ملتا ہے۔ اس میں طلب جاہ کے مواقع بھی ملتے ہیں لیکن ایسے گناہ جس میں گناہوں سے رک جانا ہوتا ہے، وہ نفس پر بڑے گراں گزرتے ہیں۔ مثلاً جھوٹ ترک کرنا یا غیبت سے باز رہنا چونکہ ایسے گناہوں کو ترک کرنے میں شہرت اور ناموری نہیں ہوتی، اس لیے ان کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا۔ احادیث میں اس کا اہتمام زیادہ آیا ہے اور اس کو ورع کہتے ہیں۔

پوچھا کوئی ایسا فارمولا بتایئے جس سے خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔ فرمایا دونوں ہاتھ آپس میں رگڑو۔ میں نے ایسا ہی کیا تو پوچھنے لگے، کچھ گرمی پیدا ہوئی۔ میں نے عرض کیا، جی ہاں ہوئی۔ فرمایا بس اسی طرح رگڑتے رگڑتے گرمی محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

فرمایا، خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر بغیر شریعت تقرب حاصل کرنا چاہے تو ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔ امت محمدیہ کا ادنیٰ شخص جوان پڑھ ہے، جاہل ہے وہ ثواب اور جزا عطا میں ایک بڑے کامل عارف کے برابر ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ پلاؤ دو شخصوں کے سامنے موجود ہے۔ ایک تو اس کے اجزاء اور اس کو پکانے کی ترکیب کے واقف ہے اور دوسرے کو کچھ علم نہیں لیکن استعمال کے وقت جو قوت جاننے والے کو دی ہے، وہی دوسرے کو ہے۔

فرمایا کہ دراصل دنیا نام مال و دولت اور زن فرزند کا نہیں بلکہ دنیا کسی ذی اختیار کے ایسے مذموم فعل یا بدحالت کا نام ہے جو اللہ سے اعتراض کرا دے خواہ کچھ ہو، اب اس شعر کا مطلب واضح ہو گیا کہ

حب دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

فرمایا کہ ایک عالم بادشاہ شاہجہاں کے ساتھ کسی کامل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ کامل جس طرح پاؤں پھیلائے تھے، پھیلائے رہے۔ عالم ظاہر بیں نے کہا کہ اتنا بڑا سلطان حاضر خدمت ہوا اور آپ نے کچھ بھی اس کی تعظیم نہ کی۔ فرمایا کہ میاں جب تک ہاتھ پھیلائے تھے، پاؤں سمیٹے رہے۔ جب ہاتھ سمیٹ لیے تو پاؤں خود بخود پھیل گئے۔

فرمایا سالک کو کسی چیز کی ہوس نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی ذوق وشوق کا متمنی ہے، کوئی رقت قلب کی خواہش کرتا

ہے۔ کسی کو کشف و کرامت کی آرزو ہے۔ کوئی جنت کا طالب بنا ہوا ہے۔ حالانکہ کسی چیز کی بھی ہوس اور طلب نہیں چاہیے۔ عبد کے معنی ہیں مالک کے سامنے سر جھکا دینے کے اور حکم کو بسر و چشم قبول کر لینے کے۔ عبد ہو کر کسی چیز کی ہوس کرنا دراصل فرمائش ہے اور وہ بھی مالک پر۔ پھر یہ کیونکر جائز ہوگا۔

فرمایا، دعا کے قبول ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو کچھ مانگا جائے اور جس کی طلب کی جائے، وہ من وعن مل جائے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بلا آنے والی ہو، وہ ٹل جائے، خواہ دعا مانگنے والے کو شبہ ہی رہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی اور تیسری صورت یہ ہے کہ چاہی جانے والے شے کا ذخیرہ جمع کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی لڑکا نادان اشرفی پاؤنڈ یا ڈالر مانگے تو اس کے نام کے یا تو تجارت میں لگا دیے جاتے ہیں یا جمع کروا دیے جاتے ہیں کہ جب ہوشیار ہوگا، لے لے گا۔ حق تعالیٰ بھی اسی طرح کرتے ہیں کہ سوالی کے اچھی نعمت آخرت میں ذخیرہ فرما دیتے ہیں۔

فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ خود کو مستقل نہ سمجھے بلکہ یہ خیال کرے کہ میں دیار غیر میں ہوں اور یہ بھی بات دل میں نہ لائے کہ فلاں حالت میں ہوتا تو بہتر تھا۔ اس کے برعکس رضا و تسلیم اختیار کرنا چاہیے ورنہ پریشانی بڑھتی ہے جیسے بیل بندھا ہوا ہو، وہ اپنے آپ کو جس قدر کھینچے گا اور زور لگائے گا، گلا اور پھنسے گا اور جس قدر کھونٹے کے قریب ہوگا، راحت پائے گا۔ انسان کو بھی یہی خیال کرنا چاہیے۔

فرمایا کسی کام کو سہل سمجھ کر ترک نہ کرے بلکہ ہمیشہ کرتا رہے۔ اس کا نفع بعد کو معلوم ہوگا اور اس کا احساس بھی بعد ہی میں ہوگا۔

فرمایا خلاصہ دستور العمل کا یہ ہے کہ اول اسم ذات کا ذکر لسانی کرے۔ پھر قلبی یعنی شغل، پھر مراقبہ اور یہ سب اس کثرت سے کرے کہ مال ہو جاوے۔ ہمارے حاجی صاحب قبلہ کے یہاں قلب پر زیادہ توجہ مقصود ہے۔

فرمایا حق العباد کا ادا کرنا اور وظائف سے بدرجہا بہتر اور ضروری ہے۔ اس کے ترک سے مواخذ ہوگا اور ترک وظائف سے کچھ مواخذہ نہیں۔

فرمایا کہ سر میں تیل ڈالنا اس نیت سے کہ یہ سرکار کل پرزہ ہے۔ اس کو تیل دے کر اسی سے کام لیا جائے، موجب اجر ہے۔ امید ہے حق تعالیٰ اس پر اجر عنایت فرمائیں گے۔

فرمایا کہ نئے خیال کے لوگ اسباب پر کچھ اس طرح سے تکیہ کر کے بیٹھ گئے ہیں کہ انہوں نے مسبب کو چھوڑ ہی دیا ہے۔ فزکس کے اصولوں اور آثار کو لازم سمجھ کر تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب آگ کا کام جلانا ہے تو پھر وہ حضرت ابراہیم کے لیے کس طرح سے گلزار ہو سکتی تھی۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے، گاڑی روکنے کے لیے سرخ جھنڈی دکھلائی جاتی ہے۔ ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر اگر یہ سمجھنے لگے کہ اس جھنڈی ہی میں ایسا کوئی کمال ہے جس سے گاڑی رک جاتی ہے تو اس سے زیادہ احمق اور کوئی نہیں ہے۔ اس بگلے کو کون سمجھائے کہ اصل روکنے والا ڈرائیور ہے، سرخ جھنڈی نہیں۔ یہ جھنڈی تو محض علامت ہے۔ اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں، افسوس کہ منکرین نے repetitions سے ہونا ضروری اعتقاد کر لیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے۔

فرمایا کہ ذکر کرنے والے پر لازم ہے کہ کھانے پینے میں کمی نہ کرے کیونکہ یہ امر طبعی ہے کہ اگر کام اپنے نزدیک زیادہ کیا اور ثمرہ بزعم خود کم ملا تو وجدانا یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ منعم حقیقی کی طرف سے احسان کم ہوا اور میری جانب سے کام زیادہ ہوا۔ اگر خوب کھایا پیا ہو تو اس طرف کا خوب احسان مند ہوتا ہے اور کمی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور یہی شان عبدیت ہے۔

فرمایا کہ بعض لوگ یہ سوچتے ہیں اور اسی کو کمال سمجھتے ہیں کہ انسان میں کوئی رذیلہ باقی ہی نہ رہے۔ نہ اس کو شہوت ہو نہ غضب۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کمال یہ ہے کہ شہوت اور غضب کا استعمال بے موقع نہ ہو۔ شہوت اپنی بیوی کے لیے محفوظ ہو اور غضب دین کی حفاظت کے لیے۔ بہت سے لوگ اکثر سوچتے ہیں کہ چونکہ ہمارے اندر ابھی شہوت باقی ہے، اس لیے اپنے شیخ سے اور اس کی تعلیم سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ذکر سے ہم کو کوئی فائدہ تو ہوا نہیں، اس لیے ذکر چھوڑ دیتے ہیں۔

ایک صاحب کے پوچھنے پر کہ آیا اب مسلمانوں پر تبلیغ اسلام کی ضرورت ہے یا نہیں، فرمایا کہ جہاں اسلام پہنچ چکا ہو، وہاں تبلیغ اسلام واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ بلوغ اسلام اکثر جگہ ہو چکا ہے۔ تبلیغ سے متعدد بلوغ اسلام ہے۔ اگر خود بلوغ ہو جائے تو فرضیت تبلیغ کی ساقط ہو جائے گی۔

فرمایا کہ بعض اوقات سالک کی طبیعت میں معیت کا تقاضا پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے نفس کو روکتا ہے اور روکنے سے نفس کو تقاضا اور بڑھتا ہے۔ اس وقت نفس اور شیطان مل کر یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر اس وقت تم یہ کام جی بھر کے کر لو گے تو نفس تقاضے سے خالی ہو جائے گا اور پھر یہ معصیت صادر نہیں ہوگی۔ یہ سخت غلطی ہے بلکہ الحاد ہے۔ غلطی تو اس لیے کہ اس ارتکاب سے وہ رذیلہ جڑ پکڑ لیتا ہے اور الحاد اس لیے کہ معصیت کو ذریعہ طاقت کا سمجھتا ہے۔ اس موقع پر نفس کو ہرگز اجازت ارتکاب نہیں دینی چاہیے اور کامل ہمت سے روکنا چاہیے۔ باوجود روکنے کے بھی اگر تقاضائے نفس نہ بجھے تو اس کی کچھ پروا نہ کرے کیونکہ محض تقاضائے نفس پر مواخذہ نہیں ہوتا۔ مواخذہ ارتکاب جرم پر ہے۔ اس کے چند بار روکنے سے ہمیشہ کے لیے یہ عادت دب جاتی ہے۔

فرمایا کہ لوگ آج کل ان علوم کو زیادہ حق سمجھتے ہیں جو بذریعہ کشف اور الہام کے صادر ہوتے ہیں۔ اس لیے وظائف اور اشغال کا سلسلہ زیادہ جاری رکھتے ہیں اور اس کی طرف کم التفات رکھتے ہیں جو بذریعہ وحی وارد ہو چکی ہیں۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ کشف اور الہام سے وارد ہونے والی چیزوں میں کبھی تو رحمت ہے اور کبھی ابتلا لیکن جو چیزیں بذریعہ وحی نازل ہو چکی ہیں اور ہمارے حضور پرانور رحمت العالمین کے وسیلے سے نازل ہوئی ہیں، وہ ہمیشہ رحمت محض ہیں۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات لاتعداد اور بے حساب ہیں۔ مثلاً صحت ایک ایسی چیز ہے کہ ساری سلطنت اس کی برابری نہیں کر سکتی۔ کھانے پینے کی سب چیزیں ایسی عام ہیں کہ ہر شخص استعمال کر رہا ہے۔ اگر کسی کو شدت کی پیاس لگی ہو اور پانی نہ ملتا ہو تو ساری دولت اور جمع جتھہ خرچ کر کے انسان ایک گلاس پانی خریدے گا۔

فرمایا کہ خطرہ شیطانی اور خطرہ نفسانی میں فرق ڈھونڈنے کا یہ فارمولا ہے کہ اگر بری چیز کا خیال آیا، پھر اس کو دفع

کیا۔ پھر ایک اور بری چیز کا خیال آ گیا۔ اس کو بھی مارے باندھے دفع کیا تو ایک نئی مصیبت اور نئی معصیت کا خیال آ گیا، یہ خطرہ شیطانی ہے اور اگر بار بار ایک ہی بری چیز کا خیال ستاتا رہے تو وہ خطرہ نفسانی ہے کیونکہ نفس کو اصرار میں لذت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر خیر محض کا غلبہ کے بغیر خیال آیا تو وہ خطرہ ملکی ہے اور اگر خیر میں ایسا غلبہ ہو جائے کہ وہ اسے کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ الہامی ہے یعنی الہام حق ہے۔

فرمایا کہ صوفیا جو عمدہ لباس پہننے سے منع کرتے ہیں تو اس سے عمدہ لباس کو بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں کیونکہ لباس پہننے کی کئی غرضیں ہوتی ہیں۔ (1) کبھی تو دفع ضرورت کے لیے لباس پہنا جاتا ہے۔ (2) کبھی اس کے ساتھ آسائش بھی مطلوب ہوتی ہے۔ (3) کبھی ان دونوں کے ساتھ آرائش بھی مطلوب ہوتی ہے۔ (4) کبھی ان تینوں کے ساتھ نمائش بھی منظور ہوتی ہے۔ پھر نمائش کبھی عزت کے حصول کے لیے کی جاتی ہے اور کبھی ذلت کو رفع کرنے کے لیے۔ اس طرح عزت کبھی تو اپنی ذات اور اپنے نفس کے لیے مطلوب ہوتی ہے اور کبھی دوسرے کا اکرام مقصود ہوتا ہے۔ پس ناپسندیدہ لباس وہ ہے جو اپنی ذات میں عزت اور گھمنڈ پیدا کرنے کے لیے پہنا جائے اور اس سے دوسروں کو مرعوب کیا جائے۔

فرمایا کہ اکثر لوگوں میں تکبر ہوتا ہے مگر ان کا نفس ان کو پتہ نہیں چلنے دیتا۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان کی مرضی کے مطابق نہ کرے اور اس پر ان کو غصہ آئے تو وہ اس کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اس شخص پر میرا حق ہے اور اس نے حق ادا نہیں کیا اس لیے مجھے غصہ آ گیا۔ اب کوئی ان سے یہ پوچھے کہ جن لوگوں کا آپ پر حق ہے اور آپ ان کے حقوق ادا نہیں کرتے تو پھر آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ حق تعالیٰ جن کا ایک ایک سانس میں آپ پر حق ہے، ان کے حقوق ادا کرتے وقت آپ کیا کرتے ہیں؟

فرمایا کہ انسان کوشش کرتا ہے کہ اس کے دل میں سوائے خیال محبوب کے یعنی خیال باری تعالیٰ کے اور کوئی خیال نہ آئے لیکن خیال آتا رہتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ روتا ہے، دعائیں مانگتا ہے اور پھر گھبرا جاتا ہے لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ قلب کی حالت شارع عام کی سی ہے کہ اس پر سے بادشاہ بھی گزرتے ہیں اور چوہڑے چمار بھی بلکہ بعض اوقات تو ایسے ہوتا ہے کہ کسی کم ذات اور میلے ٹھیلے کے گزرنے کی وجہ سے بادشاہ کی سواری روک لی جاتی ہے۔ اسی طرح قلب کی شاہراہ پر شاہی سواری کے ساتھ ساتھ ایرے غیرے بھی چلتے ہیں۔ ہجوم وساوس سے گھبرانا نہیں چاہئے بلکہ ذکر کو جاری رکھنا چاہیے۔ اس سے خیالات از خود رفع ہو جاتے ہیں۔

فرمایا کہ طلب انسان کے اختیار میں ہے اور وصول انسان طاقت سے باہر کی چیز ہے۔ اس لیے ثمرات پر ہر وقت نظر رکھنا تشویش کا باعث رہتا ہے۔ اس سے احتراز لازمی ہے۔

فرمایا کہ اگر کسی کے پاس جا کر بیٹھو تو اس کی تحریرات کو نہ دیکھو بلکہ اس کے پاس اگر کوئی مطبوعہ کتاب بھی رکھی ہو اس کو بھی نہ دیکھو کیونکہ بعض اوقات انسان اس کی کوشش کرتا ہے کہ اس کتاب کا میرے پاس ہونا دوسروں کو معلوم نہ ہو۔ چنانچہ اس کی اس آرزو کا اہتمام ہونا چاہیے۔

فرمایا کہ اگر کوئی شخص کام میں مشغول ہو اور تم کو اس کا انتظار کرنا مقصود ہو تو اس کے سامنے بیٹھ کر انتظار نہ کرو بلکہ

دور بیٹھ کر اس کو بتائے بغیر انتظار کرو، جب وہ فارغ ہو جائے تو اس کے پاس جا کر جو کچھ بھی کہنا ہو کہو۔

فرمایا کہ امام غزالی نے لکھا ہے کہ مبتدی سلوک کو وعظ وغیرہ نہیں کہنا چاہیے کیونکہ تہذیب نفس ابتداء میں کامل نہیں ہوتی۔ اس سے نفس کے خراب ہونے کا احتمال ہوتا ہے اور اس سے حب وشہرت اور عجب پیدا ہونے کا اندیشہ لاحق ہوتا ہے۔

فرمایا کہ بعض مرتبہ منتہی اپنے لیے گوشہ عافیت تجویز کرتا ہے تاکہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ رہے لیکن اس کو اس عافیت میں یا تو کوئی آفاقی آفت پیش آجاتی ہے یا وہ کسی ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنا گوشہ عافیت ترک کرنا پڑتا ہے۔ پھر وہ اپنے لیے کچھ تجویز نہیں کرتا اور عوام سے جو کلفتیں پیش آتی ہیں، ان کو برداشت کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو اچھی طرح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر برداشت نہ کروں گا اور عوام سے الگ ہو کر عافیت کو اختیار کروں گا تو اس سے زیادہ آفات میں مبتلا ہو سکتا ہوں۔

فرمایا کہ طلب مطلوب ہے نہ کہ وصول کیونکہ مطلوب وہ چیز ہو سکتی ہے جو اس کے اختیار میں ہے اور طلب اختیار عبد میں ہے اور وصول اس کے اختیار سے خارج ہے۔ مطلب یہ کہ ثمرات پر ہر وقت نظر رکھنا وقت کا زیاں ہے اور اس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

فرمایا کہ روشن خیال لوگ مولویوں پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیاوی ضرورتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ اول تو یہ درست نہیں۔ اگر مان بھی لیا جائے تو اس بے خبری کی زندگی اور وقفہ بہت قلیل ہے لیکن اعتراض کرنے والے جن ضرورتوں سے لاعلم ہیں، یعنی دین کی ضرورتیں، ان کی لاعلمی سے جو تکالیف ہوں گی، وہ بہت شدید اور طویل ہیں۔ پس روشن خیال لوگوں کو پہلے اپنی خبر لینی چاہیے۔

فرمایا کہ انسان کے اعمال صالحہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا ثمرہ اس دنیا میں مرتب ہوتا ہے اور اس سے لطف بھی خوب ملتا ہے جیسا کہ جہاد میں ہوتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جن کا ثمرہ غائب ہوتا ہے اور خود اس کی ہیئت بھی کچھ لطف افروز نہیں ہوتی...... پہلی قسم کے اعمال نفس پر بہت آسان ہوتے ہیں لیکن دوسری قسم کے اعمال بہت کٹھن ہیں۔ ان میں نفس پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ ان کے آسان کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ذکر سے کسی فوری ثمر کی توقع نہ رکھے اور نہ ہی اس کا قصد کرے بلکہ ذکر اس خیال سے کرے کہ وعدہ فرمایا گیا ہے کہ تم میرا ذکر کرو، میں تمہارا کروں گا، اس کا ذکر کرنا سب سے عظیم طلب ہے۔ چنانچہ اگر دوسری لذت حاصل نہ بھی ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

فرمایا کہ کافروں کو بعض اوقات جو نعمتیں عطا فرمائی جاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار نے جو نیکیاں، عدل اور رحم اور سخاوت کی ہوتی ہے، یہ ان کی جزا ہوتی ہے۔ مومن کو بعض گناہوں کی وجہ سے تکلیف دی جاتی ہے، کافر اللہ کے باغی ہیں۔ ایسے نیک کاموں کا صدور غنیمت سمجھا جاتا ہے لیکن مومنوں پر کہ اطاعت کا اعلان کر چکنے کے بعد اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے سختی کا سلوک کیا جاتا ہے اور ان پر تنگی کی جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کافروں کو صورت نعمت عطا فرمائی گئی ہے اور مومنوں کو حقیقت نعمت۔ اگر کسی کے پاس کروڑوں نعمتیں ہوں اور اس کو جیل کا حکم سنا دیا جائے تو سب ہیچ ہیں بمقابلہ اس

مزدور کے کہ رزق میں تو کمی ہے مگر چونکہ جیل خانے کا حکم نہیں ہوا، اس لیے وہ کس قدر راحت اور چین میں ہے۔

فرمایا کہ مظہر جان جاناں کا جو یہ قول مشہور ہے کہ ''عقیدہ تناسخ مستلزم کفر نیست'' اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ قرآن کی دلالت اس پر مثل دوسرے عقائد کے مشہور نہیں لیکن جس شخص کو اس کا قرآن میں داخل ہونا نہ پہنچا ہو اور محض عقل کی راہبری اس کی سمجھ میں یہ آئے تو محض اس عقیدے کی بنا پر اس کو کافر نہیں کہیں گے۔

کسی کے درخواست کرنے پر کہ حضور کچھ ایسا کر دیجیے کہ قلب میں گناہ کا خیال ہی نہ آئے۔ فرمایا کہ دیوار ہونا کس کام کا۔ یہ بیچاری دیوار کھڑی ہے۔ برسوں ہو گئے، چوری یہ نہیں کرتی، زنا اس نے نہیں کیا، حق اس نے کسی کا مارا نہیں لیکن ثواب کوئی نہیں مل سکا۔ ویسے کی ویسی ہی کھڑی ہے۔ انسان کا کمال تو یہی ہے کہ قلب میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو اور گناہ نہ کرے۔ ان صاحب نے عرض کیا کہ بعض اوقات تو رکا نہیں جاتا اور گناہ ہو ہی جاتا ہے۔ فرمایا خیر اگر گناہ ہو ہی جائے تو توبہ کر لے!

فرمایا کہ عیش روپے پیسے کا نام نہیں ہے گو دولت عیش کا ذریعہ ضرور بن جاتی ہے۔ اگر کوئی امیر کبیر شخص ہو، کوٹھی، کاریں، بنگلے دولت کی فراوانی اور کوئی فوجداری مقدمہ اس پر پڑ جائے (بھٹو مرحوم کا واقعہ) تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ کسی پل آرام نہیں ملتا، پتہ یہ چلا کہ عیش دولت کا نام نہیں بلکہ وہ قلب سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کا قلب مطمئن نہیں، وہ عیش سے محروم ہے۔ ایک شخص کو دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کا حقدار ہے تو وہ ہر وقت بے چین اور بے مراد رہتا ہے۔ بمقابلہ اس شخص کے جس کو آٹھ سو روپے ملتے ہیں اور وہ خود کو اس کا حقدار بھی نہیں سمجھتا اور اس پر خوش رہتا ہے۔ اب اصلی عیش یعنی غنائے قلبی آٹھ سو والے کو حاصل ہے اور دو ہزار والے کو نہیں۔

بدعت کے بارے میں فرمایا کہ اگر ظہر میں کوئی چار رکعت کے بجائے پانچ پڑھ لے تو یہ بدعت ہوگی۔ حالانکہ وہ شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے کوئی برا کام تو نہیں کیا، نماز ہی پڑھی ہے اور وہ رکعتوں میں اضافے کے ساتھ۔ بات یہ ہے کہ اس نے خلاف ضابطہ کام کیا ہے۔ جیسے کوئی لفافہ پر اسی پیسے کے ٹکٹ کے بجائے کورٹ فیس کا چار روپے کا ٹکٹ لگا دے تو خط بیرنگ ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ چونکہ اس نے ٹکٹ کا استعمال بے محل اور خلاف ضابطہ کیا، اس لیے چار روپے کا ٹکٹ ضائع ہو گیا۔ اسی ٹکٹ کو موقع محل کے مطابق عدالت میں لگاتا تو کام کا ہوتا۔

فرمایا کہ بعض لوگوں میں قابلیت باطنی تو ہوتی ہے مگر تربیت کرنے والے نہ ملنے کی وجہ سے وہ فاسد ہو جاتی ہے جس طرح انڈے کو اگر مرغی سینے والی نہ ملے تو وہ گندہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض مرید پیر سے بڑھ جاتے ہیں جیسے مرغی کے نیچے اگر بطخ کا انڈا رکھا جائے تو وہ بطخ کا بچہ نکالے گی، جو مرغی سے قوی تر ہوگا۔

فرمایا کہ بعض کفار کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف اعلیٰ سے قلب میں کچھ گنجائش ہوتی ہے تو اس کی تعریف کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ مودت نہیں چاہیے۔

فرمایا کہ آج کل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت اور نااہل کہنا شروع کر دیا ہے اور ان کے عجیب عجیب نام دھرتے ہیں۔ حالانکہ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص جلاء ہو جاتی ہے۔ جو شخص عربی بھی

پڑھا ہوا ہو اور وہ صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر میں اور تحریر میں مقابلتاً ضرور زیادہ ہوگا۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ کم ہمت لوگ ہیں اور بہت روپے نہیں کماتے، قلیل پر گزاران کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ جان لیجیے کہ اگر کوئی شخص آپ کے یہاں ملازم ہو اور صرف پانچ روپے ماہوار پاتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کو بیس روپے دے لیکن وہ کہے کہ مجھے تو یہ پانچ ہی اچھے ہیں۔ میں اپنے آقا کو نہیں چھوڑوں گا تو کیا آپ اس کو کم ہمت اور بے کار کا خطاب دیں گے...... جن مولویوں نے دین چھوڑ کر دنیا کمائی شروع کی، وہ بڑے بڑے دنیاداروں سے بھی آگے نکل گئے۔

کسی نے عرض کیا کہ جی چاہتا ہے جلد ہی مقصود حاصل ہو جائے تو فرمایا کہ اگر کوئی یوں چاہے کہ آج ہی میرا بچہ دس برس کا ہو جائے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ دس برس کا تو دس برس کے بعد ہی ہوگا...... لیکن فرمایا کہ مرید کو فائدہ تو شروع ہی سے ہونے لگتا ہے گو محسوس نہ ہو، جس طرح بچہ روز کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے مگر اندازہ نہیں ہوتا۔

عرض کیا کہ کثرت تصور سے اللہ تعالیٰ کی حضوری اور اللہ تعالیٰ کا قرب کفار کو اور جوگی کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا، ہاں یہ درست ہے لیکن اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص تو بادشاہ کا مقرب ہے اور دائیں ہاتھ بیٹھا ہے اور ایک مجرم ہے جو بادشاہ کے سامنے حاضر ہے۔ اب حضوری تو دونوں ہی کی ہے اور قرب دونوں کو حاصل ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے...... پھر عرض کیا کہ جوگی وغیرہ کو بھی ایسی حضوری اور قرب میں ویسا ہی لطف آتا ہوگا جیسا کہ صوفی کو...... فرمایا ایک شخص کے پاس پیتل کا ڈلا ہے اور وہ اس کو سونا سمجھ رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔ دوسرے کے پاس واقعی سونے کا ڈلا ہے اور وہ بھی خوش ہو رہا ہے۔ دونوں کی خوشی برابر ہے لیکن حقیقت اس وقت کھلے گی جب پیتل والے کی خوشی خاک میں مل جائے گی۔

فرمایا کہ عقیدت کے لیے محبت طبعی لازم نہیں البتہ محبت عقلی لازم ہے۔ محبت طبعی میں دل کھنچتا ہے مگر محبت عقلی میں ضروری نہیں۔ اپنے بچے کو گود میں لیتے ہیں، چومتے ہیں، خوش ہوتے ہیں مگر عالم کے ساتھ یا پیر کے ساتھ یوں نہیں کرتے...... لیکن محبت عقلی میں اگر غور سے دیکھا جائے تو محبت طبعی بھی ہوتی ہے۔ ظاہر میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمؐ سے طبعی محبت نہیں جیسے اپنے لڑکے سے لیکن اگر نعوذ باللہ وہی لڑکا حضور کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو طبعیات میں اتنا جوش ہوگا کہ وہی باپ اپنے بچے کا سر تن سے جدا کر سکتا ہے۔ یہاں اس کی محبت طبعی رکھی رہ گئی اور حقیقت یہ ہے کہ محبت طبعی مقبول نہیں۔ ابوطالب کو محض محبت طبعی تھی اور حضرت اویس قرنیؓ کو محبت طبعی و محبت عقلی دونوں حاصل تھیں۔

کسی نے اثنائے گفتگو میں عرض کیا کہ یہ آریہ بڑے دشمن ہیں۔ فرمایا کہ دوست کا ذکر کیجیے، دشمن کا نہ کیجیے۔ جس طرح صالحین کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے، اسی طرح بروں کے ذکر سے قلب میں ظلمت پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی خاص فائدہ مقصود نہ ہو تو بے ضرورت ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

فرمایا کہ بزرگوں کے ساتھ لگے لپٹے رہنا چاہیے گو خود کچھ بھی نہ ہو کیونکہ یہ تو ممکن نہیں کہ انجن تو کراچی پہنچ جائے اور بوگیاں ادھر ہی کھڑی رہ جائیں۔

فرمایا کہ ممکن نہیں کہ بزرگ کے پاس بیٹھے اور اثر نہ ہو۔ ممکن نہیں کہ تنور کے پاس بیٹھے اور آنچ محسوس نہ ہو۔

فرمایا تھوڑی دیر صرف پندرہ منٹ کی تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر لیا کیجیے۔ دیکھیے تو سہی کیسی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ کھٹائی کا نام لینے منہ میں پانی بھر آئے اور اللہ کا نام لینے سے قلب پر اثر نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔

فرمایا علم زیادہ مقصود نہیں البتہ اثر علم مقصود ہے اور یہ بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔ صحابہ کرام سب پڑھے لکھے نہ تھے لیکن ان کو حضور کی محبت نے اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچا دیا تھا۔

فرمایا کہ لوگوں نے کثرت نوافل کو تصوف سمجھ رکھا ہے حالانکہ اصل چیز تصوف میں اخلاق ہے۔

فرمایا ایک مرتبہ مولانا یعقوب کے استاد ریلوے پلیٹ فارم پر کسی بنچ پر جا بیٹھے اور بیٹھتے ہی لطائف ستہ جاری ہو گئے۔ حیرت ہوئی کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ فلاں بزرگ ریل کے انتظار میں اسی جگہ بیٹھے تھے۔ یہ اس کا اثر تھا۔ بزرگوں کی برکت سے جگہ بھی با اثر ہو جاتی ہے۔

تحقیقات جدیدہ کے ذکر پر فرمایا کہ یہ کچھ کام نہ آئے گا۔ کچہری میں کوئی منصف اپنے منصبی کام کو چھوڑ کر اگر اس تحقیقات میں لگا رہے کہ یہ عمارت کب بنی، اس کا انداز تعمیر کونسا ہے۔ اس پر کتنا خرچ اٹھا ہوگا۔ اس کی گارنٹی کب تک کی دی جا سکتی ہے۔ تو جب حکومت اس کے کام کی جانچ کر کے اس کے خلاف رپورٹ لکھے گی تو اس کا یہ رد یہ دینا اس کی برات کا باعث نہ ہوگا کہ جناب میں تو اس بلڈنگ کی تحقیقات میں لگا رہا۔ اس کو اس قصے سے کیا بحث! اس کو تو اپنے کام میں لگنا چاہیے تھا۔

فرمایا کہ ہم لوگوں کی اوروں کے چھوٹے چھوٹے عیوب پر نظر ہے اور اپنے بڑے بڑے عیوب دکھائی نہیں دیتے۔ اپنے بدن پر سانپ پھولنک رہے ہیں، ان کی پروا نہیں اور ہم دوسروں کی مکھیاں اڑانے کی فکر میں ہیں۔

فرمایا کہ زمانے نے عجب پلٹا کھایا ہے۔ پچھلے لوگ عبادت چھپ کر اس لیے کرتے تھے کہ کہیں شہرت نہ ہو جائے اور اب اس لیے چھپا کر کرتے ہیں کہ کہیں لوگ مذاق نہ اڑائیں۔

فرمایا کہ مجھ کو بہ نسبت عقیدت کے محبت زیادہ پسند ہے کیونکہ عقیدت خیالی چیز ہے اور راہ میں زائل ہو جاتی ہے اور محبت زائل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک بزرگ کسی نصرانی کی لڑکی پر عاشق ہو کر نصرانی ہو گئے۔ ان کے عقیدت مندوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوسرے مرید جو ان سے محبت کرتے تھے، یہ خبر پا کر بہت سے لوگوں کو لے کر ان کے پاس پہنچے اور رات بھر اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کی اور شیخ کی حالت درست ہو گئی۔ دیکھیے باوجود نصرانی ہونے کے اپنے شیخ کا ساتھ نہ چھوڑا اور ان کو نفع پہنچایا۔

فرمایا اغیرہ سے ملنا سنت ہے کیونکہ صلہ رحمی ہے۔ اگر وہ بداعمال ہوں تو بھی اپنی جانب سے بغرض صلہ رحمی ملنے میں کوئی حرج نہیں۔ قطع تعلق اور اپنے آپ کو کھنچا ہوا رکھنا اچھا نہیں خواہ وہ امراء ہی کیوں نہ ہوں، ترک تعلق مناسب نہیں۔ اگر وہ اغیرہ تمسخر دین کا کریں تو چاہیے کہ ان کو سمجھائے اور بتلا دے کہ آپ صاحبوں کے پاس بہ سلسلہ رشتہ داری آتا ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں ورنہ میں نہیں آنے کا...... باقی اجنبی امراء سے ترک تعلق اچھا ہے۔ ہاں اگر وہ خود بلائیں تو چلا جائے یا وہ خود اپنے یہاں آئے تو ان کا اکرام کرے۔

فرمایا کہ لیلۃ القدر کی تمام رات میں فضیلت ہے اور اکثر حصہ شب میں عبادت کرنے سے کل رات کا ثواب ملتا ہے۔

فرمایا بہت سے فقرا صوفیوں کی صورت بنائے پھرتے ہیں میلے کچیلے اور نشہ کے شوقین ہیں اور گالیاں بکتے ہیں۔لوگ ان کو پہنچا ہوا خیال کرتے ہیں حالانکہ اگر یہ وضع قطع اللہ کو پسند ہوتی تو انبیاء کو ایسی ہی وضع میں بھیجتے اور ان کے لیے ایسے ہی حالات رکھتے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ جس وضع قطع میں انبیاءآئے ہیں وہی مطلوب ہے۔

فرمایا کہ انسان حقیقت میں روح ہے نہ جسم۔ جسم روح کو اٹھائے ہوئے ہے جیسے پالکی گاڑی میں کوئی سوار ہو۔ اسی طرح جسم حامل روح ہے۔ جس چیز کو انسان انا کہتا ہے، وہ نہ روح ہے نہ جسم۔

فرمایا کہ بعض اصول ''فطرت پرستاں'' پر ہیں:

حب جاہ ومال، دین کو ضائع کرکے (2) متمدن قوتوں کی باتوں کو تعلیم کرنا بہ مقابلہ شریعت کے۔(3) سائنس پرایمان اور اس کی وقعت اور احکام الہٰی کی بے وقعتی۔

احکام میں توجیہات اور دلائل پیش کرنے کے بارے میں فرمایا، کہ دین کو لوگوں نے تختہ مشق بنالیا ہے اور علماء سے طرح طرح کے سوال کرتے ہیں کہ سود لینا کیوں حرام ہے۔ فلاں بات کس لیے منع ہے۔اس سلسلے میں فرمایا کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجینئر صاحب آ کر کہیں کہ فوراً اٹھو یہ مکان گرنے والا ہے تو سب بھاگ اٹھیں گے اور ایک بھی دلیل یا توجیہہ نہیں مانگے گا۔اگر ڈاکٹر یا سول سرجن کوئی دوا تجویز کرے یا آپریشن کا بتائے تو بلا چون وچرا مان لیں گے کہ یہ اس علم کا ماہر ہے لیکن دین کے عالموں کی بات میں پس وپیش سے کام لیتے ہیں۔اس پر ایک طالب علم نے عرض کیا کہ جناب لوگ کہتے ہیں کہ علماء کی بات میں اختلاف ہے، اب کس کی مانیں۔فرمایا کہ خلاف کہاں نہیں اور کس میں نہیں۔ وکلاء حضرات ایک ہی واقعہ میں ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں۔ڈاکٹروں میں اختلاف ہوتا ہے۔مگر وہاں کوئی نہیں کہتا کہ ان میں اختلاف ہے، ہم کس کا علاج کریں۔سو وجہ اس کی یہ ہے کہ جو امر کسی کو کرنا ہوتا ہے اور اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے اس میں خلاف کی پروانہیں کرتے۔صحت جسمانی کی چونکہ قدر ہے۔اس میں کسی کے خلاف کی پروا نہیں۔ دین کی پروانہیں اور قدر نہیں، اس لیے حیلے تلاش کرتے ہیں۔بات یہ ہے کہ جان جیسی عزیز ہے، اگر ایمان بھی ایسا ہی عزیز ہو تو علاج کی فکر کی جائے اور اس میں کسی قسم کی بہانہ سازی نہ ہو......اب مثال کے طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کا اور یار قدیم کوئی حکم کرے تو اس کی وجہ پوچھتے ہیں اور اگر حاکم کوئی حکم کرے تو ہرگز وجہ دریافت نہیں کرتے، من وعن تسلیم کرلیتے ہیں۔ چنانچہ جب خدا تعالیٰ کے احکام کی وجہ دریافت کی جاتی ہے تو شبہ یہ پڑتا ہے کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے اور وہ (نعوذ باللہ) خدا کو برابر کا جانتے ہیں...... ہاں طالب علمی کی حیثیت سے بہ غرض تحقیق و فن دریافت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے۔شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی حجتیں کرتے ہیں سو اس کے لیے تعلیم فن کی ضرورت ہے......اگر انکم ٹیکس کا معمولی سا نوٹس لانے والا چپڑاسی آ کر سمن دے تو اس کے ساتھ بحث نہیں کرتے مگر علماء کے ساتھ پیغام حق کی منادی کرتے ہیں۔ بحث کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں...... پھر آپ لوگوں کو سمجھانا بھی تو ایسے ہی ہوگا جیسے ایک سائیس کو اقلیدس کی شکل سمجھانے لگیں تو وہ کیا سمجھے گا۔اس کی تدبیر یہی ہے کہ پہلے اس کو اقلیدس سمجھائے، اس کے مبادیات بتلائے جائیں، پھر بات کرے۔

فرمایا کہ سہارنپور کے ایک صاحب جو مولانا خلیل احمد صاحب سے بہشتی زیور کے ایک مسئلہ پر جھگڑا کر چکے تھے، مجھ سے سہارنپور میں ملے اور بولے کہ اس مسئلہ کی وجہ بتائیے۔میں نے کہا کہ کیا آپ اور سارے مسائل کی وجہ سمجھے ہوئے ہیں؟ اور اگر سمجھے ہوئے ہیں تو مجھ سے فرمائیں تاکہ میں آپ سے پوچھوں کہ یہ وجہ کیوں ہے؟ یہ حضرت تو اٹھ کر چلے گئے اور ایک دوسرے جنٹلمین ان کی طرفداری کے لیے آئے اور بولے کہ بعض لوگ مسائل میں علماء کو برا کہتے ہیں اور ہم کو دکھ ہوتا ہے۔آپ مہربانی فرما کر ایک جلسہ کریں اور اس میں ان مسائل کو اچھی طرح سے سمجھائیں۔میں نے عرض کیا کہ جناب ہمارے برا کہنے کو تو آپ جانے دیں اور ان لوگوں کو معاف کردیں کیونکہ بہت سے لوگ صحابہؓ کو برا کہتے ہیں۔ ان کا بندوبست آپ نے ضرور کچھ کیا ہوگا اور بہت سے لوگ رسول کو اور بہت سے اللہ میاں کو برا کہتے ہیں۔ان کا کیا تدارک کیا آپ نے؟ پہلے ان کا بندوبست کریں، بعد میں ہم آتے ہیں جو ان کی جوتیوں میں بیٹھنے کے قابل بھی نہیں......
فرمانے لگے کہ وہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن اگر آپ ایسا کردیں جیسا کہ میں نے کہا ہے تو حرج ہی کیا ہے؟
میں نے کہا کہ اگر آپ بطور حکم کے فرماتے ہیں تو آپ کو حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے اور اگر بطور مشورے کے فرماتے ہیں تو بس آپ مشورہ دے کر سبکدوش ہوئے، ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور آپ کے ممنون احسان ہیں۔ ماننا نہ ماننا ہمارا فعل ہے۔آپ بے فکر رہیے اور اپنا کام کرتے جائیے۔ وہ اٹھ کر چپ چاپ چلے گئے۔اصل میں ہم علماء بوجہ اخلاق کے ان کا جواب ترکی بہ ترکی نہیں دیتے ورنہ ایسی چالوں کو تو ہم خوب سمجھتے ہیں کہ محض الجھنے کے لیے ایسی تاویلیں نکالتے ہیں۔

فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر سید احمد خاں نہ ہوتے تو مسلمانوں کا اب تک نام بھی نہ ملتا۔ میں کہتا ہوں کہ ہم ناانصاف نہیں ہیں، واقعی اُن کی وجہ سے دینوی ترقی اعلیٰ درجہ کی ہوئی، اس کا انکار ممکن نہیں مگر دین کو ضائع کرکے ایسا کیا اور دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص ان میں رہتا ہے، اس میں یہودی کا مضمون پیدا ہوتا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ قوم ہے کون سی؟ سو وہ ان کے نزدیک امراء ہیں اور وہ بھی انہیں کے جرگے کے امراء اور غرباء کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں جو کہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باعث اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کو قوم کہنا چاہیے۔

سوال کیا گیا کہ اللہ میاں نے سلطنت مسلمانوں سے چھین کر کفار کو کس لیے دے دی حالانکہ مسلمان کچھ نہ کچھ اصول دین کے پابند ہیں۔فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف اور شفاف ہو، اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود میلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا جیسے ٹوپی پر چھینٹ لگ جانے سے یا گندگی آلود ہو جانے سے اس کو اتار کر پھینک دیتے ہیں مگر جوتے پر لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مسلمان دعویٰ محبت کرتے ہیں، ان سے ذرا سی بے احتیاطی ناگوار گزرتی ہے۔ بخلاف دشمنوں اور غیر مسلموں کے کہ وہ جب بھی اصول پر عمل کرلیں تو اللہ میاں ان کو دے دیتے ہیں، اگرچہ وہ اللہ کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔

فرمایا کہ حرص کے ساتھ مال حرام کبھی جمع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر جمع کر بھی لیا تو ممکن ہے کہ اتفاقاً بیمار ہوگیا کہ کھانے سے بھی معذور ہوگیا یا اس مال کو چور لے گئے فائدہ اتنا ہی ملا جتنا تقدیر میں تھا۔افسوس یہ کہ کچھ لوگ اپنے ورثاء کے لیے حرام مال جمع کرتے ہیں۔ وہ خود تو دوزخ میں گئے اور آرام حاصل کیا دوسروں نے۔

فرمایا کہ میں نے جہاں تک غور کیا ہے، یہی پایا ہے کہ دنیا میں امراء اور دولت مند لوگ زیادہ پریشان رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات کوشش بھی کرتے ہیں کہ ہمیں اس مصیبت سے برائے چند نجات ملے لیکن ان کو نجات میسر نہیں ہوتی۔

فرمایا کہ صرف خدا تعالیٰ کے نزدیک ہی دنیادار لوگ غضب کے مارے ہوئے نہیں بلکہ دنیا دار لوگوں کے نزدیک بھی دوسرے دنیادار قابل نفرت اور قابل مذمت ہوتے ہیں کیونکہ دنیاداروں میں جب بھی دشمنی ہوتی ہے تو اسی دنیا کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن اہل اللہ اور تارکین دنیا کے ساتھ کسی کو دشمنی نہیں ہوتی۔ پھر فرمایا کہ دنیا دار جس طرح دین کے معاملات میں تارکین دنیا کے محتاج ہیں، اسی طرح دنیا کمانے میں بھی دیندار لوگوں کے محتاج ہیں۔ اکثر ان کے پاس تعویذ اور وظائف سیکھنے اور رد بلا کا عمل کرانے کے لیے حاضر ہوتے رہتے ہیں اور یہ سب تعویذ اور عملیات مزید دنیا کمانے کے واسطے ہوتے ہیں۔

فرمایا کہ مال و دولت اور جاہ اور برتری سے محبت کی وجہ سے بعض اوقات دین میں بھی رخنہ پڑ جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مال کو فائدے کی خاطر بنایا ہے، اس لیے مناسب حد تک اس کے حصول کی کوشش جائز ہے لیکن جب ضرورت کے مطابق حاصل ہو جائے تو پھر زیادہ کوشش کرنا چھوڑ دے۔ اس طرح اللہ نے رتبے کو اور جاہ کو نقصان سے بچنے اور استہزاء سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنایا ہے لیکن ایسا رتبہ حاصل کرنا جس سے دونوں کو نقصان پہنچے یا ان کی زندگیاں خوف میں کٹیں یہ حرام ہے۔ جاہ اور رتبہ صرف اسی قدر درکار ہے کہ فسادیوں سے محفوظ رہے۔

فرمایا کہ اگر انسان تین کام کر لے تو انشاء اللہ محروم نہیں ہوگا۔ خواہ جنید بغدادی نہ بن سکے۔ اول یہ کہ گناہ کا ارتکاب ترک کر دے کیونکہ گنہگار اگر عبادت بھی کرتا رہے تو بھی اس کا نور تاریکی کے ساتھ گندھا ہوا ہوگا اور اس کو روشنی نہ مل سکے۔ دوسرے خلق خدا پر بدگمان نہ ہو کیونکہ یہ بدگمانی ہمیشہ کبر اور نخوت سے پیدا ہوتی ہے (اور کبر اور نخوت شیطان اور فرعون کی خصوصیت ہے) اور تیسرے جب بھی فرصت ملے تھوڑا بہت ذکر ضرور کر لیا کرے اور حضرات صوفیا کرام سے ملتا رہے۔

فرمایا کہ بزرگوں کے پاس صرف طلب دین کی غرض سے جانا چاہیے۔

فرمایا کہ اپنے حالات اور اسرار اور یافت دوسروں پر ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ اسرار ایسا ہے جیسا کوئی اپنے محبوب کو دوسروں سے چھپانا چاہیے۔ ایسا کون ہوگا جو اپنی بیوی کو دوسروں کی بغل میں دینا چاہیے۔

فرمایا کہ تمام اشغال و اذکار کا مقصد یہی ہے کہ پابندی شرع نصیب ہو اور ان اذکار سے قلب میں گداختگی پیدا ہو۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لا اللہ الا اللہ کا ذکر کرنے سے سارے مرحلے طے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ بیچارے معاملات اور اخلاق کی درستگی کو کوئی چیز نہیں سمجھتے، اس لیے محروم رہتے ہیں۔

فرمایا ایسے شخص کی حالت پر نہایت افسوس ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث پڑھ کر بھی جان اور مال کی محبت رکھے۔

فرمایا کہ اگر وعظ میں مضمون خشک ہو اور رنگین اور لذیذ نہ ہو، پھر بھی اس میں دلچسپی ہونی چاہیے۔ اس کی حالت ایسی ہے جیسے حکیم اجمل کا نسخہ ہو کہ جس کو پڑھ کر نہ تو لذت ملتی ہے اور نہ ہی وجد طاری ہوتا ہے مگر اس کے استعمال سے فائدہ ضرور ہوتا ہے، ایسا فائدہ کہ اس پر ہزاروں وجد قربان کیے جا سکتے ہیں۔

فرمایا کہ حدیث شریف ہے کہ ایک آدمی میں دو خوف جمع نہ ہوں گے یعنی جو شخص دنیا میں خائف رہے گا اور اللہ

سے ڈرتا رہے گا وہ قیامت میں بے خوف ہوگا اور جو دنیا میں بے باک اور بے خوف ہوگا، وہ آخرت میں خوفزدہ ہوگا۔ انسان کو چاہیے کہ وہ خائف اور امیدوار رہے۔

فرمایا کہ حضرت صوفیا کرام کے تذکرے میں لذت آتی ہے۔ بخلاف تذکرہ علماء کے کہ ان کے تذکرے میں لذت نہیں آتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت صوفیا اہل محبت میں ان کے تذکرے میں بھی محبت کا اثر ہوتا ہے اور اس سے روح لذت یاب ہوتی ہے۔

فرمایا کہ حضرت مولانا یعقوب صاحب کی جب کوئی تعریف کرتا تو آپ خاموش رہتے اور یوں فرمایا کرتے کہ اگر منع کیا جائے تو وہ اور زیادہ تعریف کرے گا اور اگر خاموش رہو تو تعریف کرنے والا یہ سمجھے گا کہ میری تعریف کی قدر نہیں کی۔ اس واسطے وہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور آسانی رہتی ہے۔

فرمایا کہ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سکوت سے قلب میں جو بات پیدا ہوتی ہے، وہ گفتگو کے بعد باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ وہ گفتگو مفید اور محمود ہی کیوں نہ ہو۔

قلندر اس کو کہتے ہیں جو ظاہری عبادت میں تقلیل کرے یعنی جس پر ذکر و فکر نوافل و مستحاب سے زیادہ غالب ہوں۔ ملامتی وہ ہے جو اعمال میں تکثیر تو کرتا ہے مگر ان کے اخفا کا اہتمام کرتا ہے جس سے عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دوسروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں کرتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے خضر علیہ السلام کا علم ایسا ہے جیسا وائسرائے کے علم کے سامنے کوتوال کا علم کہ جزئیات وقائع کا علم تو کوتوال کو زیادہ ہوتا ہے مگر اصول سلطنت اور کلیات قانون کے علم میں وائسرائے کے برابر کوئی حاکم نہیں ہو سکتا۔

ملفوظات

سر کچھ ایسا کر دیجئے کہ دل میں گناہ کا خیال ہی نہ آئے۔

دیکھو بھائی، یہ دیوار ہے۔ کتنے سال سے یہاں موجود ہے۔ برسوں ہو گئے، چوری یہ نہیں کرتی، حق اس نے کسی کا نہیں مارا۔ جھوٹ غیبت، بے ایمانی، رشوت ستانی سے عاری ہے لیکن ثواب کوئی نہیں مل سکا۔ ویسے کی ویسے کھڑی ہے۔ انسان کا کمال تو یہی ہے کہ دل میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو اور گناہ نہ کرے۔

لیکن سر کبھی کبھی تو ایسا بھوت چڑھتا ہے کہ انسان گناہ کا مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔

خیر اگر گناہ ہو ہی جائے تو توبہ کر لے، آخر توبہ ہے کس لیے بھائی۔

کوئی اچھا سا وظیفہ بتا دیجئے۔

حقوق العباد کا ادا کرنا سب وظیفوں سے افضل ہے اور ضروری ہے۔ حقوق العباد کے ترک کرنے پر پکڑ ہوگی

لیکن وظیفہ نہ کرنے پر کوئی پوچھ گچھ نہیں۔

ارشاد صاحب کا آخری وقت

جب شہلا ارشاد کے پاس ان کا احوال پوچھنے جاتی ہے تو پلنگ سے ڈھولگا کر وہ ذرا اوپر ہو جاتے ہیں اور شہلا سے کہتے ہیں: ''میں نے زندگی میں کافی سفر کیے ہیں، لمبے لمبے چھوٹے چھوٹے۔ ملک کے اندر، ملک سے باہر۔ بوئنگ کے اور Concord کے سفر لیکن اس سفر کا جھونٹا میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں لیا۔''

''کس قسم کا جھونٹا سر؟''

''یہی جو میں اب لینے والا ہوں...... میرا خیال ہے یہ اپنی طرز کا ایک بڑا Adventure سفر ہوگا، پرلطف، مسحور کن اور معلومات افزا۔ اس سے میرے علم میں اضافہ ہوگا۔ اس سفر سے میری زندگی مالا مال ہو جائے گی، پر باش ہو جائے گی۔ یہ سفر Dive ضرور ہوگا، Life چاہے ہو نہ ہو۔''

''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں سر؟''

''دیکھو شہلا میرا سوٹ کیس پیک ہو چکا ہے۔ میرے سارے بل ادا ہو چکے ہیں۔ زندگی کا ایک ایک پیسہ اتر چکا ہے۔ میں کسی کا مقروض نہیں ہوں۔ میرا پاسپورٹ تیار ہے۔ اس پر ویزا لگ چکا ہے۔ ٹکٹیں میری جیب میں ہیں اور میں اس سفر پر روانہ ہونے والا ہوں جس کے انتظار میں آج تک زندہ رہا اور جس کی میں اس وقت تک راہ تکتا رہا۔''

رمضان موچی

کوئی راہ بھی بس ایک راہ ہی ہے اور اس میں کوئی توہین نہیں، کوئی ہتک نہیں۔ نہ تمہاری نہ دوسروں کی۔ اگر تم نے اس راہ کو چھوڑ دیا۔ چھوڑ اس لیے دیا کہ تمہارے دل نے کہا چھوڑ دو۔ ہر راستے کو غور سے دیکھو۔ دھیان سے دیکھو اور اس کی جانچ کرو۔ اس کو آزماؤ۔ چلو، گزرو، پرتیاؤ۔ پھر اپنے آپ سے پوچھو۔ صرف اپنے آپ سے کسی اور سے نہیں۔ کسی اخبار رسالے یا کالم سے نہیں۔ بس ایک ہی سوال پوچھو کہ آیا اس راستے کا کوئی دل بھی ہے یا نہیں۔ اس کا قلب چالو ہے کہ نہیں (راہ تو چالو ہے) اگر اس راستے کا قلب ہے دل ہے تو پھر اسے فوراً اختیار کر لو۔ اگر نہیں ہے تو اسے چھوڑ دو، الگ ہو جاؤ۔

اب کوانٹم تھیوری کو جانے بغیر اور فوٹان کی کیفیت سمجھے بغیر یہ کیونکر جانو گے کہ حضرت غوث الاعظم نے فرمایا کہ جب موحد مقامِ توحید میں پہنچتا ہے تو وہاں نہ موحد رہتا ہے ناں توحید، نہ واحد نہ بسیار۔ نہ خودی نہ خدا، نہ عابد نہ معبود، نہ ذات نہ صفات، نہ ولی نہ ولایت، نہ صفت نہ موصوف نہ اسم نا مسمیٰ نہ ظاہر نہ باطن۔ نہ بہشت نہ دوزخ۔ نہ روشنی نہ تاریکی، نہ زمین نہ آسمان، نہ منزل نہ مقام، نہ طلب نہ طالب نہ کفر نہ اسلام نہ کافر نہ مسلمان......

ہر انسان اپنے تجربات سے اور اپنی Genetic Coding سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ اُسے زندگی بسر کرنے کا طریقہ، سلیقہ، وطیرہ ان ہی دو مکتبوں سے حاصل ہوتا ہے۔ میں نے بھی جو کچھ سیکھا ہے وہ فقط اتنا ہے کہ چونکہ ہر انسان زندگی گزارنے کے لیے خاص قسم کے اوصاف سے متصف ہے اس لیے کوئی شخص کسی دوسرے فرد کے فیصلوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اسی لیے روزِ قیامت کی شرط ہے۔ اُس روز اللہ تعالیٰ خود یہ بات طے فرمائیں گے کہ کس شخص کے اعمال کیسے ہیں؟ لیکن عجیب سی بات ہے کہ ہم پھر بھی اپنی Judgement کو اللہ پر نہیں چھوڑتے اور دائیں بائیں ملنے والوں کو اپنے ترازو پر تولتے رہتے ہیں۔ یہ بھی غیبت کی ایک شکل ہے۔

مشکل یہ آن پڑی کہ خاں صاحب اپنی کتاب ''بابا صاحبا'' ختم کیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کتاب کے ساتھ اُن کے کچھ نوٹس بکھرے بکھرے، غیر مرتب شکل میں موجود تھے۔ نہ جانے وہ یہ مواد کس طرح استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ پہیلی اب طے نہیں ہو سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ اس مواد کو بھی کتاب کے ضمیمے کے طور پر آپ کو پیش کر دوں تاکہ آپ اپنا فیصلہ خود کر لیں۔ خاں صاحب کے جو قارئین انہیں صوفی سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایسا صوفی پھر گرہست میں کیسے کامیاب ہو گیا۔ صوفی تو سب سے پہلے شادی کے جھمیلوں سے نکل جاتا ہے۔ صوفی اگر دنیاوی طور پر خوشحال ہے تو یہ صوفی کے شایانِ شان نہیں کیونکہ دنیا چھوڑ کر اس کے جھنجھٹوں سے فراغت پا کر ہی تو مابعد کا راستہ ملتا ہے۔ دوسری جانب وہ محبتی قارئین ہیں، جن کا خیال ہے کہ خاں صاحب پیدائشی افسانہ نویس تھے۔ وہ سوچتے ہیں پھر انہوں نے ڈرامے کی لائن کیوں اختیار کی اور زاویے کی طرف کیوں مڑ گئے۔ ایسے ہی ایک چاہنے والے نے خاں صاحب سے ٹیلیفون پر بات کی اور اپنی طرز کی بیزاری کو طنز میں بڑے سلیقے سے پیش کیا۔ میں وہ فون کی گفتگو آپ کو دکھاتی ہوں۔ فیصلہ آپ کا اپنا ہے۔ بڑے لوگوں کو پورے طور پر سمجھنا کچھ ایسا آسان عمل بھی نہیں۔ یہاں پہنچ کر جس طرح زندگی حیران کر دیتی ہے ایسے ہی ہر بڑا آدمی بھی ہمیں محجوب چھوڑ جاتا ہے۔

''بھئی اشفاق صاحب ہیں؟''

''جی آپ کون بول رہے ہیں؟''

''میں انتظار حسین بول رہا ہوں۔''

''چلے گئے؟ اچھا کیا پہن رکھا تھا انہوں نے آج۔''

''جی؟''

''میرا مطلب ہے آج وہ پتلون میں تھے یا کھدر کا کُرتا پہن رکھا تھا۔''

بتانے والے نے بتایا کہ اشفاق صاحب نے جوگیا رنگ کا کھدر کا کُرتا پہن رکھا تھا۔ تب میں نے ٹیلیفون بند کردیا اور سوچا کہ اچھا ہی ہوا آج ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسرے دن ٹیلیفون کیا تو پتہ چلا کہ اشفاق صاحب آج کھدر کا نیلا کُرتا پہن کر آئے تھے' چلے گئے۔ میں نے پھر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تیسرے دن ٹیلیفون کیا تو پتہ چلا کہ اشفاق صاحب آج سوٹ پہنے ہوئے ہیں اور نیچے سکوٹر پہ آدھے بیٹھے آدھے کھڑے ایک گورے سے اطالوی لہجہ میں انگریزی بول رہے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا کہ آج اشفاق صاحب اپنے اصل روپ میں ہیں۔ میں نے مخاطب سے کہا کہ جھپٹ کے جاؤ اور ٹیلیفون پر بلالاؤ۔

اشفاق صاحب آدمی مصروف ہیں اور ادبی معاملات پر قلم اٹھانے کی فرصت نہیں رکھتے۔ یوں بھی ان کی گفتگو گرم ہوتی ہے چنانچہ چھوٹتے ہی انہوں نے جواب دیا ''میرے ہم عصر تم نہیں ہو۔ میں تو اے حمید کو اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں۔''

''صحیح سمجھتے ہو مگر کیوں۔''

''یار! اے حمید کی تحریر میں ایک تازگی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کی فکر میں تازگی نہیں۔''

''اور اس بنا پر تم اپنے آپ کو اے حمید کا ہم عصر سمجھتے ہو؟''

ٹیلیفون پر آواز گڑبڑ ہوگئی۔ کئی فقرے میں سن نہ سکا۔ جب آواز صاف آنی شروع ہوئی تو میں نے سنا کہ اشفاق صاحب بہت گرم ہیں اور پاکستان کے ادیبوں کو ڈانٹ رہے ہیں' صاحب! پاکستان میں تو ادیب اب پیدا ہوگا۔ ابھی تو ایسے ادیب ہیں جو جمیلہ الجزائری پر لکھتے ہیں۔ پاکستان کی کسی شخصیت پر لکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں شہید ملت لیاقت علی خان ہی پر لکھیں' لکھیں تو سہی۔''

میں ان کی تقریر سن کر سہم گیا اور مجھے اپنا چار سال پہلے کا ایک گناہ یاد آ گیا۔ میں نے اشفاق صاحب سے صرف اتنا کہا تھا کہ ''یار! کچھ ادیب یوم الجزائر منا رہے ہیں۔ آؤ ہم تم بھی کچھ لکھیں اور اس میں شریک ہو جائیں۔'' اور یہ وہ زمانہ تھا جب الجزائر کے مجاہدوں اور مصر کے انقلابیوں کو یار لوگ کمیونسٹ کہا کرتے تھے۔ تو اشفاق صاحب نے مجھے جھڑک دیا۔ میں چپ ہوگیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن اشفاق صاحب نے مجھے معاف نہیں کیا۔ خیر اس وقت تو مجھے ان سے شکایت تھی۔ اب کوئی شکایت نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں ان کی پیاری پیاری کہانیاں پڑھتا تھا اور سوچتا تھا کہ کاش اشفاق احمد کبھی کسی قومی مسئلہ پر بھی سوچیں۔ اب وہ پچھلے برسوں سے قومی مسائل ہی پر سوچ رہے ہیں اور اپنی سوچ میں اتنے تعمیری ہوگئے ہیں کہ الجزائری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے ذکر کو تخریبی حرکت سمجھتے ہیں اور پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پینے کو قومی عزائم سے بیزاری اور قنوطیت کا اعلان جانتے ہیں۔

میں آپ کو واضح طور پر نہیں بتا سکی کہ اُن کی کس تلاش نے انہیں کئی بابوں کا دروازہ کھٹکھٹانے پر آمادہ کیا؟ غالباً وہ زندگی کا اصلی مفہوم سمجھنا چاہتے تھے۔ کیا بنانے والے نے ہمیں کسی خاص مقصد کے لیے تخلیق کیا ہے؟ کیا محض اپنی تفریح طبع کے لیے انسان کا کھلونا بنا کر اس کی اچھل کود قلابازیاں' چھلانگیں دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے؟ کیا اُسے رتی بھر پرواہ نہیں کہ جس کھلونے کو اس نے کھنکھاتی مٹی سے ٹھیکرے کے مانند بنایا ہے اس پھاند پھلانگ سے اس پر کیا بیتتی ہے۔؟

اشفاق صاحب زندگی کے مفہوم کی تلاش میں اپنے تخلیقی عمل میں بھی کئی مقامات سے گزرے۔ کہانی.... کہانی سے ڈرامہ اور بالآخر ڈرامہ۔

ایسے ہی کبھی ایک بابا کبھی دوسرا.... کبھی ایک روحانی علم کبھی دوسرا۔ حجاب کے پردے...لیکن اتنی بات طے ہے کہ انہیں سب سے پہلے دھرم پورے میں ڈیرہ چلانے والے باباجی کے دروازے پر صدا دینی پڑی۔ باباجی فضل شاہ اتنی تھے۔ کئی سال جنگلوں میں مستی پہرہ کاٹ چکے تھے۔ کچھ مل گیا تو کھالیا نہ ملا تو جنگلی روئیدگی پر بسر کی۔ لوگوں سے کٹ کر جانوروں' پرندوں' نباتات و جمادات کے قریب رہ کر انہیں عرفان ذات حاصل ہوگیا۔ جب وہ واپس بشری زندگی میں لوگوں کے درمیان آئے تو انہیں علم ہو چکا تھا۔ اللہ سے اصل وابستگی خلق کی خدمت میں پنہاں ہے۔ ڈیرے پر روٹی کھلانے کی روایت اسی علم پر منحصر ہے۔ خان صاحب ڈیرے پر جاتے۔ شاہ صاحب سے ملتے۔ وہ لمبی بات کرنے کے عادی نہ تھے۔ بہت کہتے ''نوٹ'' اور پھر کوئی ملفوظات میں سے ایک تحفے کے طور پر پیش کر دیتے۔ میں یہاں باباجی نور والے کے وہ حالات اور فرمودات لکھ رہی ہوں جنہیں خاں صاحب آٹوگراف دیتے وقت استعمال کر لیتے تھے لیکن پتہ نہیں وہ اس مواد کو اپنے بابا صاحبا میں کیسے مربوط کرتے؟

تعارف حضور فضل شاہ رحمتہ اللہ علیہ قطب عالم' نور والے

ادارۂ قادریہ نوروالوں کا ڈیرہ' انفینٹری روڈ' مصطفیٰ آباد لاہور طالبانِ ہدایت کی جانی پہچانی جگہ ہے۔ حضور فضل شاہ قطب عالم کے مبارک قدموں نے اس جگہ کو ڈیرہ پاک بنایا۔ رحمت' برکت اور شفاء کو حضور نے ایسے تقسیم کیا کہ عام' خاص اور خاص الخاص سب فیضیاب ہوتے رہے۔ حضور سے میل جول کی بدولت ملنے والوں کا قول پاک ہو جاتا ہے۔ لغو گوئی اور کذب سے انہیں کراہت ہونے لگتی۔ پھر خالص محبت کی بدولت وہ اپنے اعمال کی صحت کو اپنے محبوب کے اعمال کی روشنی میں دیکھنے لگتے۔ اس طرح محبین کو یکسوئی کی عظیم نعمت عطا ہوتی۔ پھر محبت تامہ سے یہ مقام بھی آتا کہ محب محبوب کی خلوت اور محبوب محب کی جلوت ہو جاتا۔ مقام دو ہوتے حقیقت ایک ہوتی۔ محب ہر مقام پر اپنی خواہشات نفس کے خلاف

رہ کر اس مقام پر صبر کا ثبوت دیتا۔ ان تینوں مقامات پر پورا رہنے والوں پر اخلاص' حسن کی صورت سے' برسنے لگتا۔ فلاح پانے والے یہ لوگ مطابق کے بھی مطابق رہتے' مخالف کے بھی مطابق رہتے۔ یہ نور والے حضرات یہ نہیں دیکھتے کہ لوگ ان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں' یہی دیکھتے ہیں کہ انہیں لوگوں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ اس پاک اور روشن جماعت کے معمار کو ہدیہ عقیدت پیش کرنے کے لیے عاشق صادق بدھ 30 اگست 78ء کو آپ کے آستانہ عالیہ پر نماز عصر کے وقت جمع ہو رہے ہیں۔ جس ذات بابرکات کا قول' عمل' علم سب معیار حق ہوں اور جو عباد مخلصین میں سے ہو اس کا ماضی اور حال صراط مستقیم کی جستجو کرنے والوں کو ظلمات سے نور کی طرف آنے میں سہارا دیتا ہے۔

آپ کے آباؤ اجداد مکیریاں ضلع ہوشیار پور میں قیام پذیر تھے۔ بعد میں جالندھر تشریف لے آئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت نبی بخش صاحب بڑے غریب نواز تھے۔ مساکین کی دل نوازی سے بڑھ کر کسی کام میں آپ کو دلچسپی نہ تھی۔ اس وقت سو روپیہ روز آمدنی تھی آپ کی۔ جب گندم ایک روپے کی تقریباً ایک من ہوتی تھی اور حال یہ تھا کہ گھر والوں کو صرف ان کے گزارے کے لیے ہی دیتے تھے' باقی پیسے اپنے ہاتھ سے مستحقین کو عطا کر کے سوتے تھے۔ حضرت نبی بخش صاحب' حضرت شاہ محمد غوث رحمتہ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ جب حضرت نبی بخش صاحب اپنے مرشد صاحب کی خدمت عالیہ میں اپنے بچے کو لے کر حاضر ہوتے تو آپ فرمایا کرتے کہ یہ بچہ اپنے وقت پر بڑے فیض کا قاسم ہوگا۔ عام خاص اور خاص الخاص سب اس چشمہ فیض سے سیراب ہوں گے۔ آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو نوازنے کے لیے کبھی آپ کو دوستوں سے الگ نہیں کیا۔ بچپن سے لے کر آخر وقت تک آپ کے ساتھ مستانوں دیوانوں کا میلہ ہی لگا رہا۔ دیکھنے والے اس بات کی شہادت دیں گے کہ خلوت نشینی کی طلب آپ کو ہوئی ہی نہیں۔

بچپن میں بھی آپ کی حرکات وسکنات سے آپ کی شان واضح تھی۔ دوست پیار سے آپ کو دور اندیش کہا کرتے تھے۔

چودہ سال کی عمر میں مستانی کیفیت وارد ہوئی۔ بارہ سال اسی حالت میں رہے۔ کئی لوگ اس حال میں آپ سے ملے۔ جو زبان پاک سے نکلتا تھا قطعاً پورا ہوتا تھا۔ اللہ کے فضل سے حضرت میاں خدا بخش صاحب سرتاج اولیاء کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضرت میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ آباد پورہ جالندھر میں قیام پذیر تھے۔ میاں صاحب نے پوچھا: عزیزم! تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کیا' حضور جس نام سے مجھے پکاریں میرا وہی نام ہے۔ فرمایا: کیا کھایا کرو گے؟ عرض کیا' جو حضور کھلائیں گے میرے لیے وہی سب سے اچھا کھانا ہوگا۔ فرمایا: کیا پہنو گے؟ عرض کیا' جو لباس حضور میرے لیے پسند فرمائیں گے وہی بہترین لباس ہوگا۔ فرمایا: رہو گے کہاں؟ عرض کیا' جہاں حضور رکھیں گے وہی میرے لیے بہترین جگہ ہوگی۔ حضرت میاں صاحب نے خوشی سے فرمایا "عزیزم! طالب علم کی پوری شان تم میں جلوہ گری کر رہی ہے۔ معلم سے محبت ہو تو اس سے نور معرفت عطا ہوتا ہے۔" آپ نے دعا فرمائی۔ "اللہ تعالیٰ اس فیض کو ابدالآباد تک جاری رکھے۔" حضرت فضل شاہ چودہ برس تک اپنے مرشد کامل کی خدمت اقدس میں رہے۔ آپ نے کبھی خواہش کے تحت زبان نہیں کھولی۔ لوگ میاں صاحب سے کہتے' یہ بچہ خاموش ہی رہتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے: "یہ بچہ اپنے وقت پر بولے گا۔

اس وقت اس کا بولنا سند کا درجہ رکھے گا۔" حضور کو حضرت میاں صاحب سے چاروں مدارج عطا ہوئے۔ قول' عمل' علم اور اخلاص اور پھر حضرت میاں صاحب کے امر کے مطابق آپ نے دعوت فلاح دینی شروع کی۔ آپ روحانی امراض کے بھی طبیب تھے۔ جسمانی امراض کے بھی۔ جو آپ کی متعین کردہ حدود کا احترام کرتا۔ اسے یقیناً شفاء ملتی تھی۔ فرمایا کرتے تھے "جسمانی امراض پرہیز سے جاتے ہیں' روحانی امراض پرہیزگاری سے جاتے ہیں۔"

آپ نے قرآن پاک کی تفسیر فرمائی ہے۔ نمونے کے طور پر سورۃ فاتحہ کی تفسیر پیش خدمت ہے۔ یہ تفسیر طباعت کے مراحل طے کر رہی ہے۔ آپ مشاہدہ فرمائیں گے کہ یہ ترجمہ اپنے اندر بڑا حسن رکھتا ہے۔ تقابل سے اس کی تصدیق ہوگی۔ تفسیر انعام یافتہ حضرات کے حال کو منور کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ حاصل کے عنوان سے اس حق کو بیان فرمایا گیا ہے' جو قارئین اور سامعین حضرات پر عائد ہوتا ہے۔ یہ حاصل جس کا بھی حال ہوگا وہ اللہ کے فضل سے انعام یافتہ حضرات میں شمار ہوگا۔ آپ کو اس تفسیر میں نہ تضاد نظر آئے گا نہ اختلاف۔

سورۃ الفاتحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بڑے رحم والا ہے

فرمایا: صاحبو! اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ پاک ہی اسے پا سکتا ہے۔ یہ پاکی اللہ کے محبوب سے عطا ہوتی ہے اور اس کی بدولت مخلوق کے ساتھ پورا رہنے کا ذاتی اور صفاتی علم عطا ہوتا ہے۔ الرحمٰن کی شان یہ ہے کہ وہ رحم کرتا ہے اور جب کوئی مقصود سے دور ہو رہا ہو' تو اسے قریب کرنے کے لیے سختی بھی کرتا ہے۔ مگر یہ وقتی ہوتی ہے۔ پھر اس کا رحم ہی ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ جس پر اللہ کا کرم ہو اس کے قریب کر دے۔ اس طرح بسم اللہ عمل سے ہو جاتی ہے۔ ورنہ قول کی تکرار سچا ثابت ہونے کے لیے درکار نہیں ہے۔ جس قول کا عمل شاہد نہ ہو وہ قول سچا ثابت نہیں ہوتا۔

حاصل: ہر کام میں بسم اللہ قول سے ادا کرنا حق ہے۔ عملاً یہ دیکھنا لازم ہے کہ ہم عباد مخلصین کی اتباع میں تجویز سے پاک رہیں۔

الحمدللہ رب العلمین: حمد اللہ ہی کی ہے جو عالمین کا رب ہے۔

تعریف کا تعلق تعین سے ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہے۔ حمد کی حقیقت شان ہے اور شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو پالتا ہے اور علم سے پالتا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک ہر حال میں اس کے پالنے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پالنے میں کسی کی تجویز کا دخل نہیں ہوتا۔

شہادت: اللہ تعالیٰ نے سورۃ النحل میں فرمایا ہے۔

ان الذین لا یؤ منون بایت اللہ لایھدیھم اللہ ولھم عذاب الیم:16-104

بے شک جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے' اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے المناک عذاب ہے۔

آپ فرمایا کرتے تھے۔ دین کی' دنیا کی' کوئی پوچھو سب کو اجازت ہے۔ جو ہماری سن لے گا۔ اس کی اللہ سن لے گا۔ چند سوالات ملاحظہ فرمایئے۔ ان اہم سوالات کے جو جوابات آپ نے عطا فرمائے ہیں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔

سوال: قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے۔ ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون۔ (اور جو نفس کی حرص سے بچایا گیا تو وہی فلاح پانے والے ہیں۔ 9:59) نفس کی حرص سے کیا مراد ہے؟ اور اس سے کیسے بچنا چاہیے؟

جواب: حال پر اللہ تعالیٰ کی عطا کو ناکافی جاننا اور مزید کی خواہش رکھنا حرص ہے۔ حرص جہاں ہوگی وہاں ہوئی (خواہش) کے جھونکے چلتے رہیں گے۔ حرص خلوت ہے ہوئی اس کی جلوت ہے۔ حرص سے بچنے کی صرف اور صرف ایک ہی صورت ہے کہ اللہ کے محبوب کو اپنا محبوب بنالیا جائے۔

سوال: ناصحین سے محبت کا ثبوت کیسے ملتا ہے؟

جواب: محب کا قول اس کے محبوب کا قول ہوتا ہے' اس کا عمل اس کے محبوب کا عمل ہوتا ہے' اس کا علم بھی اس کے محبوب کا علم ہوتا ہے۔ محب اپنے محبوب کو ہر مقام پر سند جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب کے حوالے سے مانتا ہے۔

سوال: بیعت کی افادیت کیا ہے؟

جواب: بیعت کی حقیقت شہادت ہے اور دعویٰ بغیر شہادت قابل سماعت ہی نہیں ہوتا۔

سوال: مردان حق (عباد مخلصین) کی پہچان بتادیجیے!

جواب: ان کا بولنا بھی علم سے ہوتا ہے' خاموشی بھی۔ دونوں مقامات پر ماننے والوں کے لیے فلاح موجود ہوتی ہے۔ وہ تزکیہ عطا کرنے کا شرف رکھتے ہیں۔ ان کی اتباع میں خوف وحزن سے نجات کی ضمانت موجود ہوتی ہے اور وہ اجر کے سوال سے پاک ہوتے ہیں۔

سوال: درویش' فقیر اور صوفی میں کیسے امتیاز کیا جائے؟

جواب: جس کا لباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہو درویش ہے۔ جسے فاقہ' قناعت اور ریاضت کا شرف ہو وہ فقیر ہے اور جو خلوت وجلوت میں صاف ہو' اپنے ساتھ بھی اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ بھی' وہ صوفی ہے۔ یہ سب پاک جماعت کے افراد کے نام اور مقام ہیں۔

سوال: اصول تبلیغ کیا ہے؟

جواب: تبلیغ اس پر حق ہے جو کچھ دینے کا شرف رکھتا ہو۔ تبلیغ کرنے والے کی صداقت وامانت کا اعتراف ہو سامعین کو تو اس کی تبلیغ موثر ہوتی ہے ورنہ نہیں۔

سوال: غیر کے راستے پر بڑھنے والے شخص کو خیر کی طرف لانے کے لیے کیا کیا جائے؟

جواب: اس کی برائی کو قول سے' عمل سے' علم سے اور اخلاص سے بطریق احسن دفع کیا جائے۔ ماننے سے میل ہوتا ہے اور میل سے غیر کو خیر کی طرف آنے کا شرف ہوتا ہے۔

سوال: عشق کا مقام کیسے حاصل ہوتا ہے؟

جواب: عشق کی حقیقت پاکی ہے۔ ہر آواز کو اپنے لیے آواز حق ماننا اور اپنی صورت سے گزر جانا حصول عشق کا راستہ ہے۔

ملفوظات حضرت فضل شاہ قطب عالم

کامیابی کی حقیقت صبر اور رضاء الٰہی ہے۔
تسکین صاحب تسکین سے ہی عطا ہوتی ہے۔
دائمی حسن اور علم حقیقی لازم وملزوم ہیں۔
جو خیر کو قبول نہ کرے غیر اس کے گلے پڑ جاتا ہے۔
شرافت موجود ہو تو شرف عطا ہوگا اور شرف ہو تو بلندی ہوگی۔
جہاں مقصود دولت ہو جائے' شجاعت وہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔
اللہ تعالیٰ سب حضرات کو خیر و برکت عطا فرمائے۔

اللہ

☆ وہ سامان نہیں رکھنا چاہیے جو کام نہ آئے اور جسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جاسکے۔
☆ اللہ کے پیارو! اللہ کا قرب چاہتے ہو تو اپنے اخلاق سنوار لو۔
☆ تم اللہ کے ہو جاؤ۔ اللہ تمہارا ہو جائے گا۔
☆ جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔

احسان

☆ مطابق کے مطابق رہنا احسان کا بدلہ احسان ہے۔ مخالف کے مطابق رہنا مروت ہے۔

اولیاء

☆ اولیاء کا کوئی کام عادتاً نہیں ہوتا۔

بزرگان دین

☆ حق کو پانے کا طریقہ یہ ہے کہ بزرگان دین سے میل جول ہو' ان سے محبت خالص ہو اور ان کی معیت مقصود ہو۔ ہر مقام پر میل جول سے قول پاک ہو جاتا ہے۔ محبت ہو تو اعمال کی شرح شروع ہوتی ہے۔
☆ بزرگان دین محبت کے بیوپاری ہوتے ہیں۔ وہ نفرت کا کھوٹا سکہ لے کر محبت اور خلوص کا کھرا مال دیتے ہیں۔

مخالف کے مطابق رہنے کا علم صرف اس طرح عطا ہو سکتا ہے۔

☆ بزرگان دین کے ساتھ نماز ادا کرنی اولیٰ عمل ہے۔

☆ جو سبب اور تعین سے پاک ہے' وہی شرک سے پاک ہے۔

☆ بزرگان دین سبب نہیں ہیں' وسیلہ ہیں اور وصال کا دروازہ ہیں۔

☆ بزرگان دین کتاب و شنید سے نہیں ہیں۔ کتاب اور شنید بزرگان دین سے ہے۔ عام شنید کے ساتھ ہے۔ خاص کتاب کے ساتھ ہے اور خاص الخاص ام الکتاب کے ساتھ ہے اور ام الکتاب اللہ تعالیٰ اُمّی کو عطا فرماتا ہے تاکہ مخلوق یہ نہ کہہ سکے کہ اللہ تعالیٰ کا پیارا کتاب و شنید سے بول رہا ہے۔ عام اور خاص لوگ پڑھی ہوئی اور سنی ہوئی بتاتے ہیں۔ بزرگان دین اس لیے آئے ہوئے ہیں کہ جو ان پر عطا ہو رہی ہے حال پر' وہ عطا کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اس عطا سے پورا پورا فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔

☆ زاہد مبتدی لوگوں سے بھاگتا ہے اور زاہد منتہی لوگوں کو طلب کرتا ہے' کیوں نہ کرے کہ اس کے پاس ان کی دوا موجود ہے۔

☆ لوگ ایک دوسرے سے میل جول اپنے فائدے اور بھلائی کے لیے رکھتے ہیں لیکن بزرگان دین مخلوق سے میل جول ان کے فائدے اور بھلائی کے لیے رکھتے ہیں۔

☆ نجات شاہدین کی معیت کی بدولت ہوتی ہے۔

☆ جیسے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رکھنا چاہتا ہے' ہر مقام پر' چاہے رخ دنیا کا ہو یا دین کا ہو۔ جو اللہ تعالیٰ ان کے لیے چاہتا ہے وہ وہی چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ چاہے جاتے ہیں۔

پرہیزگاری

☆ ساری کائنات راحت کی خواہاں ہے۔ راحت سوائے زُہد کے کسی مقام پر نہیں ہے۔ نہ ساری کائنات میں کوئی صاحب ثابت کر سکتا ہے کہ راحت سوائے زُہد کے کسی مقام پر ہو۔

☆ جس کا ہاتھ پاک ہو جائے گا' اس کی نیت درست ہو جائے گی۔ جس کی نیت درست ہو جائے گی اس کا عقیدہ درست ہو جائے گا۔ جس کا عقیدہ درست ہو جائے گا اس کے اعمال درست ہو جائیں گے۔

☆ برے کی بری صفت سے بچنا ضروری ہے۔ اسے اس کی بری صفت سے بچانا بھی ضروری ہے۔ یہ علم صاحبان حال ہی سے سیکھا جا سکتا ہے۔

☆ ''پورا'' ہاتھ سے تعلق رکھتا ہے اور ''سچا'' زبان سے۔ دونوں جہان کی رحمتیں پورے اور سچے کے لیے ہیں۔

☆ برے کی برائی سے دور رہنا پرہیزگاری ہے۔

☆ صالح وہ ہے جس کا حال برے کے عمل سے متاثر نہ ہو۔

توفیق

☆ جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اقرار نہیں کرنا چاہیے۔

تزکیہ

☆ خلوت کے تزکیے سے اپنے آپ کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جلوت کے تزکیے سے مخلوق اللہ کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

جمال

☆ حقیقی حسن مخلص کو عطا ہوتا ہے اور سب بہاروں میں خزاں آتی ہے۔

☆ حقیقی حسن کی بہار قدیم ہے اور دائمی ہے۔

☆ حسن کیا ہے؟ گمان نیک رکھو۔

حق

☆ جو ذاتی تضاد سے پاک نہ ہو' لطافت کا مشاہدہ اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

☆ جس کی فضیلت شاہد کی معیت کی بدولت ہے' وہ راہ حق پر ہے۔ جس کو اپنی فضیلت اپنے اعمال پر مبنی نظر آئے' وہ گمراہ ہے۔

☆ مال اہل توکل کی نذر کرو۔ اس سے تمہیں راہ حق پر خرچ کرنے کا علم بھی حاصل ہو گا اور انفاق فی سبیل اللہ پر شہادت بھی ہو جائے گی۔

☆ اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کو معاف کرنے کا حق ہمیں دیا گیا ہے۔ دوسروں کے ساتھ زیادتی کو معاف کرنے کا حق ہمیں نہیں۔

☆ چھوٹوں کو صلاحیت عطا کرنا اور بڑوں سے صلاحیت لینا حق ہے۔

☆ جام تب پاک ہو جاتا ہے جب کسی حق دار کو جام دیا جائے۔

☆ حق کو پانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ درود پاک پڑھا جائے۔ یہ حق کا منشا ہے۔

حقیقت' طریقت' شریعت' معرفت

☆ طریقت کی بسم اللہ مادی غرض و غایت سے پاک ہونا ہے۔ پہلا درجہ شریعت ہے۔ دوسرا طریقت ہے۔ تیسرا حقیقت ہے۔ چوتھا معرفت ہے۔

شریعت‘ طریقت‘ حقیقت‘ معرفت

☆ شریعت دودھ ہے۔ طریقت دہی ہے۔ حقیقت مکھن ہے۔ معرفت گھی ہے۔ اگر دودھ نہ ہو تو نہ کچھ بن سکتا ہے۔ نہ کوئی بنا سکتا ہے۔

حکم

☆ پیارو! حکم کو جاننے کی کوشش نہ کرو‘ مشقت میں پڑ جاؤ گے۔

☆ قرآن پاک حکم ہے اللہ تعالیٰ کا۔ حکم ماننا ضروری ہے جاننا ضروری نہیں۔

☆ تسلیم کیا ہے؟ بغیر جانے کے ماننا۔ حکم میں اللہ تعالیٰ نے جاننے کی شرط ہی نہیں رکھی۔

حکمت

☆ حشر میں ہر شخص کا پہلا گواہ اس کا ہمسایہ ہوگا اور دوسرا اس کا ہاتھ۔

☆ لڑکے کے کام اکثر اعمال نفس ہوتے ہیں اور لڑکی کے اعمال دین‘ اس لیے کہ لڑکی امانت ہوتی ہے۔

☆ جاری کا لفظ جن مقامات پر استعمال ہوتا ہے‘ ان میں فیض سب سے افضل ہے۔

☆ توبہ کے چار مقام ہیں۔ نام سے توبہ‘ جسم سے توبہ‘ قلب سے توبہ اور روح سے توبہ۔

☆ پیارو! سوال مت بنو‘ جواب بنو۔

☆ زیادہ کھانے سے جسم اور روح دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔

☆ بلند مرتبہ والے کے ساتھ رہنا اپنی مرضی سے وقت کو ضائع کرنا ہے۔

☆ عورت عارف دنیا ہے۔ اگر مرد عارف مولا نہ ہو تو عورت کی غلامی سے بچ نہیں سکتا۔

حقیقت

☆ جس عقل کی صداقت شاہد ہو‘ وہ کامل ہے۔ عقل نہیں‘ صداقت چراغ راہ ہے۔

☆ مشاہدہ کامل ہوتا ہے‘ قیاس ناقص ہوتا ہے۔

☆ نور کی حقیقت ہدایت ہے۔

☆ جس وجود سے خیرات جاتی رہے وہ وجود بے حقیقت ہو جاتا ہے۔

☆ جب تم کسی میں کوئی عیب دیکھو تو اس کو اپنے اندر تلاش کرو۔ اگر اس کو اپنے اندر پاؤ تو اسے نکال دو۔ یہ حقیقی تبلیغ ہے۔ اسے بزرگانِ دین تلاوت الوجود کہتے ہیں۔

حفاظت

☆ جو حکم میں رہتا ہے‘ وہ حفاظت میں رہتا ہے۔ حکم کی حقیقت ہی حفاظت ہے۔ اس لیے حکم ہے کہ امر کے کوٹ میں رہو۔

☆ جو آپ اپنی حفاظت نہیں کرتا‘ اس کو کسی کا ماننا فائدہ نہیں دے گا۔

☆ جو لوگ فلاح چاہتے ہیں‘ انہیں چاہیے کہ مخلصین کے ساتھ مل جائیں کہ ان پر شیطان کا اغوا ممکن نہیں ہوتا۔

☆ دل کو حاضر اور خیر کے لیے آمادہ رکھو تا کہ اس میں غیر کا دخل نہ ہو۔

خیر اور غیر

☆ مومن کی بسم اللہ‘ اللہ سے اور کافر کی ابتداء غرور سے ہوتی ہے۔ جس کا آغاز اللہ سے ہو وہ پاک ہے اور جس کی ابتداء غرور سے ہو‘ وہ غیر ہے۔

☆ جو خیر کو قبول نہیں کرے گا‘ غیر اس کے گلے پڑ جائے گا۔

☆ قرآن پاک کا علم مخلصین سے پاؤ گے تو رخ خیر ہوگا۔ ورنہ اپنی چاہت کے معنوں سے بچ نہیں سکو گے۔

☆ غیر ایک طرف کا نام ہے اور خیر دوسری طرف کا۔ جو انسان جس طرف کو تسلیم کرلے گا وہی اس کی طرف ہوگی۔

☆ خیر حال پر موجود ہوتا ہے۔ غیر کو دعوت دی جائے تو آتا ہے۔

☆ جن جن چیزوں سے منع کیا ہے ان ان چیزوں سے منع نہ رہنا‘ اس کے معنی غضب ہیں۔

دعا

☆ دعا قلندری یہ ہے یا اللہ! شیطان اور شرارت سے محفوظ رکھیو۔ رحمت سے محروم نہ رکھیو۔

سائل اور سوال

☆ پیارو جان لو۔ سائل کے آنے سے پہلے اس کا مقصود موجود ہوتا ہے۔ جلوت میں نہ ہو تو خلوت میں ہوتا ہے۔ اگر دونوں جگہ نظر نہ آئے تو سائل کے پلّے میں بندھا ہوتا ہے۔ کھول کر اس کے ہاتھ میں دے دو۔ جان لو بھیجنے والا علیم مطلق ہے۔

☆ سائل کا سوال حتی المقدور پورا کرو اور ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کرو۔

عقل

☆ جو یائے حق کو عقل کے احاطہ سے شاید حق ہی نکال سکتا ہے‘ اور کوئی نہیں۔

☆ عقل جب دکھاتی ہے اپنا گھر دکھاتی ہے اور عشق جب دکھاتا ہے محبوب کا گھر دکھاتا ہے۔

عطا

☆ جو بندہ اللہ کا مقبول ہو جاتا ہے اس کی زبان کو گویائی اور دل کو شگفتگی کا انعام عطا ہو جاتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کا فضل لامحدود ہے ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔

☆ بغیر دیکھے تسلیم نہ کرنے والا صدیق نہیں ہو سکتا اور جب تک صدیق نہ ہوا سے طالب کا درجہ عطا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے طالب ہی کو مطلوب مل سکتا ہے۔

☆ ہر صورت کا احترام واجب ہے۔ سب صورتیں ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔

☆ جس کی اپنی کوئی بات نہ رہے اللہ تعالیٰ اسے اپنی بات عطا کر دیتا ہے۔ وہی معنوں کے اعتبار سے بادشاہ ہو جاتا ہے۔

☆ مقام صاحب مقام سے عطا ہوتا ہے اور حال پر عطا ہوتا ہے۔

☆ عطا کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو اس کی برکت برقرار نہیں رہتی۔

☆ کرم عمل کو نہیں دیکھتا احترام کو دیکھتا ہے۔ احترام خلوت میں ہو تو اسے نہیں دیکھتا۔ وہی خلوت جلوت کی صورت میں پذیر ہو تو اسے دیکھتا ہے۔

علم

☆ اللہ رب العالمین ہے۔ وہ پالتا ہے اور علم سے پالتا ہے۔

☆ معاف کیا جائے تو معاف کرنے کا علم عطا ہوتا ہے۔ سزا دی جائے تو سزا دینے کا علم عطا ہوتا ہے۔

☆ علم الٰہی ہی بندے کو ہر مقام پر پورا رکھ سکتا ہے اور پورا رکھتا ہے۔

☆ حجاب جہاں بھی آ جائے ہوتا علم کی کمی ہی سے ہے۔

☆ جو صاحب علم کسب جانتا ہوا سے صرف مشاہدہ ہوتا ہے۔ جو علم کسب نہ رکھتا ہو اسے مشاہدہ بھی ہوتا ہے اور اس کے لیے عبارت بھی اترتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اُمّی کے لیے۔ مشاہدہ اور عبارت دو مقام ہیں۔

☆ جہاں کا اثر جاہل پر ہی ہوتا ہے۔ عالم کا اثر اپنی ذات پر بھی ہوتا ہے۔ مخلوق اللہ پر بھی۔

☆ بولنے کے تین مقام ہیں۔ جب بھی سامعین کے فائدے کے لیے کلام ہوگا تو علم و حکمت سے ہوگا۔ بے فائدہ بولنا بے فائدہ ہے۔ نقصان کے لیے بولنے کا حکم ہی نہیں۔

☆ قرآن پاک کو جاننا ہو تو بزرگان دین کو جانو۔ اگر بزرگان دین کو نہ جانو گے تو قرآن پاک کا جاننا تمہارا اپنے علم سے ہوگا۔ انسان حادث ہے۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور قدیم ہے۔ قدیم قدم سے بنتا ہے۔ قدم

بزرگان دین کا نقش قدم جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم۔

☆ علم وہ ہے جو حقیقت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔

علم اور عمل

☆ باحقیقت زندہ ہے اور بے حقیقت مردہ ہے۔ باحقیقت اللہ تعالیٰ پر انحصار کرتا ہے اور بزرگان دین کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور بے حقیقت اپنے عمل پر انحصار کرتا ہے۔

☆ عمل کو فضیلت نہیں ہے رخ کو فضیلت ہے۔ عمل اور فرقوں میں بھی ہو رہا ہے اور دین کی بنیاد محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نقشہ کھینچ کے دکھایا ہے۔ ابلیس اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہلے بھی مانوس تھا اس وقت بھی مانوس تھا اور اب بھی مانوس ہے۔ راندہ کس لیے گیا؟ محبوب کے رخ کی تعظیم نہیں کی۔

مومن

☆ مومن کا حال حضوری اور کافر کا حال دوری ہوتا ہے۔

عبد اور معبود

☆ انسان کے وجود میں دو مقام ہیں داتا اور منگتا۔ جو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہو جاتا ہے وہ صورت کے اعتبار سے بھی داتا ہو جاتا ہے اور معنوں کے اعتبار سے بھی داتا ہو جاتا ہے۔ اس لیے بزرگان دین فرماتے ہیں صاحبو! سوال مت بنو جواب بنو۔

☆ جس طرح اللہ تعالیٰ رحیم ہے اپنی مخلوق کے ساتھ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بندے کو بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے رحیم رہنا چاہیے۔ جو صاحب رحیم رہے گا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے فائدہ اٹھا جائے گا۔

☆ بندگی کی شرط یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا ہو جائے پھر اللہ تعالیٰ بندے کا ہو جاتا ہے۔

☆ بندگی کی شرط یہ ہے کہ جس کی بندگی کرنا چاہتا ہے اس کا بندہ ہو جائے تو بندگی ہے ورنہ نیک عادت ہے۔ نیک عادت کو خطرہ ہر مقام پر موجود رہتا ہے۔ جس طرح بکرا حلال ہے۔ تکبیر ہو جائے تو طیب ہو جاتا ہے۔ جھٹکا ہو جائے تو ناپاک ہو جاتا ہے۔

☆ عبودیت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کیا جائے۔

غرض و غایت

☆ جو انسان غرض و غایت سے پاک ہو جاتا ہے وہ شرک سے پاک ہو جاتا ہے۔

☆ جھوٹ وہ ہے جس میں بولنے والی کی خواہش شامل ہو۔ سچ یہ ہے کہ اس میں بولنے والے کی خواہش داخل نہ ہو۔

☆ کسی بھائی کے بے غرض کام آنا مقام ولایت ہے۔

☆ مومن اس لیے پاک ہے کہ وہ کوئی ذاتی غرض وغایت نہیں رکھتا۔ وہ عطاء خداوندی کو رضا خداوندی پر لگاتا ہے۔

☆ غیر کا حاصل غرور ہے اور غرور کا حاصل خواہش اور غرض وغایت۔ خواہش اور غرض وغایت کا حجاب اٹھ جائے تو ہر جدوجہد عین دین بن جاتی ہے۔

☆ عقل وہوش غرض وغایت کے اور غرض وغایت عورت کے ماتحت ہے اور عورت مونث ہے۔ بندہ مقصود کو پالے تو مرد ہے اور غرض وغایت کو پالے تو مونث ہے اور اگر اس کا عمل خطا چلا جائے تو مخنث ہے۔

قوم/معاشرہ

☆ جس قوم کا شعار سادگی نہ رہے، شجاعت اس سے دُور بھاگتی ہے۔

☆ جس معاشرے میں وعدے کو پورا نہ کیا جاتا ہو وہ معاشرہ بے جان ہوتا ہے۔

☆ جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے ورنہ محض قول کے ایک ہونے سے حق نہیں ادا ہو جاتا۔

☆ اپنی ذات کے لیے صبر اور مخلوق کے لیے بھلائی ہے۔

قول اور عمل

☆ جس قول کا عمل شاہد نہ ہو، سچا ثابت نہیں ہوتا۔

☆ جس عمل کی بنیاد محبت پر ہوگی، وہ دائمی ہوگا اور جو کتاب وشنید پر مبنی ہوگا، وہ عارضی اور وقتی ہوگا۔ جو عمل محبت سے ہوگا، اس سے تھکن نہیں ہوگی۔

☆ قول کی حد تک نفس راضی رہتا ہے۔ جب عمل کی حد شروع ہو جاتی ہے تو نفس بھاگتا ہے۔ کیونکہ نفس خدمت کو قبول نہیں کرتا۔

☆ راستے کی باتیں کرتے رہنے سے راستہ طے نہیں ہوتا۔

☆ باحقیقت زندہ ہے۔ بے حقیقت مردہ ہے۔ عمل کی کوئی صورت ہو۔

☆ مبارک ہو ان لوگوں کو جنہیں یہ چار مقامات عطا ہوں، قول، اعمال، علم اور اخلاص۔ جب تک چاروں موجود نہ ہوں، تبلیغ شوکت نفس کے لیے ہوگی۔

☆ قول عمل کے لیے دعوت ہے، بذات خود علم نہیں۔ علم تو عمل کا حاصل ہوتا ہے۔

☆ قول، عمل اور علم، یہ تین مقامات ہیں۔ اخلاص انعام ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

☆ توبہ قول سے ہوتی ہے۔ عمل اس کا شاہد ہو تو سچی ثابت ہوتی ہے۔

☆ بھیجنے والے نے انسان کو کس عمل کے لیے بھیجا ہے۔ صرف پڑھنے پڑھانے کے لیے نہیں۔ جو لوگ پڑھنے پڑھانے کو عمل سمجھتے ہیں وہ عمل کے لیے دیا گیا وقت بھی قول ہی میں ضائع کر لیتے ہیں۔

☆ مجاز کی کھیتی کو چشمے کا پانی دیا جائے تو بارآور ہوتی ہے۔ اعمال کی کھیتی کو چشم کا پانی دیا جائے تو بارآور ہوتی ہے۔

☆ ساری کائنات کی ابتدا قول سے اور بزرگان دین کی بسم اللہ عشق سے ہوتی ہے۔

☆ جان لینا چاہیے عمل کو فضیلت نہیں ہے۔ رُخ کو فضیلت ہے۔ حکم کو جاننے میں فضیلت نہیں ہے، ماننے میں فضیلت ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخ کو فضیلت ہے۔

☆ قول سواری ہے جو حال تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عنایت کی ہے۔

☆ صاحبو! قال کے دور دورے میں نہ رہو۔ قالی کا ہمیشہ ہاتھ خالی رہتا ہے۔

کتاب وشنید

☆ اہل کتاب وشنید کے پاس بیٹھو گے تو مخلوق میں کیڑے دکھائی دیں گے اور اگر اہل حق کے پاس بیٹھو گے تو اپنا حال روشن ہوگا۔

☆ کتاب ماضی ہے جو اسے مقصود بنا لیتا ہے، وہ بھی ماضی ہو جاتا ہے۔

مومن

☆ قوم غرض وغایت کے انبوہ سے بنتی ہے۔ قرآن اور سنت سے قوم نہیں بنتی۔ قرآن اور سنت سے مومن بنتا ہے اور مومن ملت بناتا ہے۔ ملت سے وحدت تشکیل پاتی ہے۔

☆ مومن جہاں رہے، خوشنودی اس کا مقام ہے اور خدمت اس کی شان ہے۔

☆ ساری کائنات کی ابتدا طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔ مومن کی ابتدا نماز فجر سے ہوتی ہے۔

☆ مسلمان کی زبان پاک ہوتی ہے۔ ہاتھ امین ہوتا ہے۔ ہاتھ امین ہو تو دل پاک ہوتا ہے اور دل پاک ہو تو سارا جسم پاک ہو جاتا ہے۔

☆ مومن جو بھی کام کرتا ہے، اللہ ہی کے لیے کرتا ہے۔

☆ مومن دنیا میں دکاندار کی طرح رہتا ہے۔ ملک بھی سب اشیاء کا ہوتا ہے اور منتظر بھی رہتا ہے کہ طالب آئیں اور اپنا حق لے جائیں۔

☆ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ اللہ کے ہو کر رہنا، یہ مومن کی شان ہے۔

محبت اور چاہت

☆ محبت ہر مقام پر ایسے تعین سے پاک رکھتی ہے جیسے مہندی کے پتے میں۔ رنگ رنگ پتے پتے میں موجود رہتا ہے۔ پتا تعین رکھتا ہے لیکن رنگ جو اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہیں، تعین سے پاک ہے۔

☆ مشرک کو اپنی جان سے بڑھ کر کسی سے محبت نہیں ہوتی۔

☆ چاہت کے ساتھ خوشامد اور ندامت لازم ہے۔

☆ محبت وہ ہے جو حق کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔

محبّ اور محبوب

☆ محبّ کو ہر مقام پر پورا رہنا چاہیے۔ پورا رہنے ہی سے نعمت کا شکریہ ادا ہوتا ہے۔

☆ محبوب کے ساتھ لگنے کا مطلب لگن ہے اور لگن کا نتیجہ اگن ہے۔ اگن سے آگیا پیدا ہوتی ہے۔ آگیا کی حقیقت ہے آگہی۔

☆ محبّ محبوب کی خلوت ہے۔ محبوب محبّ کی جلوت ہے۔ محبّ محبوب سے خلوت و جلوت میں اپنی کوئی صورت نہیں رکھتا۔ مقام دو ہیں، حقیقت ایک ہے۔

☆ محبوب سے جو عطا ہو رہی ہے اس میں کوئی خطا نہیں ہے۔ اگر اس میں خطا نظر آئے تو یہ اپنی نظر کا قصور ہوتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ تعین سے پاک ہے لہٰذا اس کا کوئی رُخ نہیں ہے۔ محبوب کا جس طرف رُخ ہو اسی رخ کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔

☆ جس کی پریت ہے اس کی جیت ہے۔ جس کا پیا اس کا جیا اور وہی جیا۔

☆ اللہ تعالیٰ نے جو بھی بنایا ہے، محبوب سے محبت کو روشن کرنے کے لیے۔ محبوب کے صدقے بٹتے رہے ہیں اور قیامت تک بٹتے رہیں گے۔

☆ محبّ ہر مقام پر محبوب کو دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ رہتا ہے۔

☆ غوث، قطب اور ابدال سب درجات سے تعلق رکھتے ہیں۔ عاشق درجات والے سے تعلق رکھتے ہیں۔

☆ محبّ کسی عمل سے نہیں بنتا محبت سے بنتا ہے۔ جو لوگ اربعہ عناصر سے تعلق رکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب کو بھی اربعہ عناصر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور جو صاحب محبوب کی عطا کی ہوئی صفت سے دیکھتے ہیں انہیں عشق کی آنکھ عطا ہو جاتی ہے۔ وہ نظر بصیرت سے دیکھتے ہیں۔ جو صاحب نظر بصیرت سے دیکھتے ہیں انہیں اولیٰ صفتیں عطا ہو جاتی ہیں۔

☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو میرا گنہگار ہوگا اسے بخشوں نہ بخشوں یہ میری مرضی ہے اور جو منافق ہے اس کو نہیں بخشوں گا۔ کیونکہ کافر میرا گنہگار ہے اور منافق میرا بھی گنہگار ہے اور میرے محبوب کا بھی گنہگار ہے۔

☆ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے محبوب کو ہمیں بھی چاہنا چاہیے تاکہ ہم بھی چاہے جائیں۔

محبت

☆ عقیدہ ایک مقام کا نام ہے جو ناصحین کی حب سے عطا ہوتا ہے۔

☆ محبّ صرف محبت سے بنتا ہے اور کسی عمل سے نہیں بنتا۔

ماضی، حال اور مستقبل

☆ متوکل حال پر حاوی ہوتا ہے۔ غیر متوکل پر حال حاوی ہوتا ہے۔

☆ جس ماضی کا حال شاہد نہ ہو، اس کی نفی ہو جاتی ہے۔

☆ جو حال پر جنتی ہے، مستقبل میں بھی وہی جنتی ہوگا کیونکہ اس حال کا مستقبل بننے والا ہے۔

☆ بے خبر ماضی کی یاد میں رہتے ہیں اور مستقبل کی تلاش میں رہتے ہیں۔

☆ جو حال پر راضی نہیں ہے، وہ ماضی کی یاد اور مستقبل کی تلاش میں بے چین رہے گا۔

☆ جس کا ماضی پاک ہے، وہ انسان ہے۔ جس کا حال محبت ہے، وہ صاحب ایقان ہے اور جس کا مستقبل شریعت ہے، وہ اہل ایمان ہے۔

☆ اللہ کے پیارو! وہ کہتے کیوں ہو جو ابھی تمہارا حال نہیں۔

مشقت

☆ اللہ کے حضور سے جو چیز مانگ کر لی جائے اس میں مشقت ہوتی ہے اور جو بن مانگے ملے، اس میں مشقت نہیں ہوتی۔

☆ مومن کا مستقبل بنا بنایا آتا ہے۔ کافر کا مستقبل تجویزی ہوتا ہے لہٰذا مومن مشقت سے پاک ہے اور کافر مشقت کو دعوت دیتا ہے۔

پہلے تو خاں صاحب اکیلے باباجی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے لیکن مجھے حیرت میں ڈالنے کے لیے لنگر کے جلوے دکھانے کے لیے ساتھ لے جانے لگے۔ مغرب میں مستعمل ڈچ سسٹم کو تو میں سمجھتی تھی کہ دوست کھانے کے بعد اپنا اپنا بل خود ادا کرتے تھے لیکن یہ طریقہ کہ جو آئے وہی پائے میرے لیے مسلک ابراہیمی کا یہ نظام عجیب تھا۔ میں نے خاموشی سے اس کا معائنہ ضرور کیا اور جب خاں صاحب بچوں کو .P.W.R کے سوئمنگ پول میں سوئمنگ کے بعد لنگر کھلانے کبھی کبھی لے جاتے تو مجھے تعجب نہ ہوتا!

سوال:۔ اکثر بزرگانِ دین حاضری دینے والوں کے لیے کھانے پینے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ یہ شاہدین کی طریقت ہے۔

سوال:۔ وہ کونسی بات یا حکمت ہے جو کھائے پلائے بغیر لوگوں تک نہیں پہنچ سکتی؟

جواب:۔ حاضر ہونے والے کو جسمانی خوراک حاصل ہو تو اس کے اندر روحانی خوراک کے حصول کی طلب پیدا ہوتی ہے۔

سوال:۔ کھلانے پلانے کے اہتمام کا ماخذ کیا ہے؟

جواب:۔ حکم خداوندی۔

سوال:۔ کھلانے پلانے کے لیے روپیہ پیسہ کہاں سے آتا ہے؟

جواب:۔ مخلصین متوکل ہوتے ہیں اور اللہ کے محبوب ہوتے ہیں۔ خزانے اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ قاسم اس کے محبوب ہیں۔

سوال:۔ عموماً کس قسم کا کھانا تقسیم کرنے کا بزرگانِ دین اہتمام کرتے ہیں؟

جواب:۔ بزرگانِ دین کے ہاں ہر کھانا تقسیم کے لیے ہوتا ہے۔ قاسم چکھتا بھی اس لیے ہے کہ وہ کسی شے کی فی سبیل اللہ Presentation کا شاہد ہو۔

سوال:۔ بزرگانِ دین بیک وقت لوگوں کی ضرورت کے مطابق کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اتنا بڑا اہتمام کس طرح ممکن ہے؟

جواب:۔ بھیجنے والا علیم مطلق ہو تو اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ آنے والے کا مقصود اس کی آمد سے پہلے پہنچ چکا ہے۔

سوال:۔ بعض اوقات کئی دن بزرگانِ دین ایک ہی قسم کا کھانا پکا کر تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کیا حکمت ہوتی ہے؟

جواب:۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عطا ہو اس کی قدر کرنا بزرگانِ دین کی شان ہے۔ مخلصین کی اپنی کوئی پسند نہیں ہوتی

اس لیے اپنی تجویز ہی نہیں ہوتی۔ جو عطا ہو اُس کی تقسیم میں تساہل نہ کرنا بزرگانِ دین کی شان ہے۔

سوال:۔ کیا کبھی بزرگانِ دین پر ایسا مقام بھی آتا ہے جب مخلوقِ خدا کو کھانا پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ کیا کرتے ہیں؟

جواب:۔ مقصود ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ اگر جلوت میں نہ نظر آئے تو خلوت میں ہوتا ہے۔ وہاں بھی سائل کا مقصود نہ ہو تو سائل کے پلّے میں بندھا ہوتا ہے۔ کھول کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے۔

سوال:۔ کھانے کا اہتمام کرتے وقت بزرگانِ دین کی نیت کیا ہوتی ہے؟

جواب:۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مقصود ہوتی ہے۔

سوال:۔ بزرگانِ دین خود تو دوسروں کے لیے کھانے پینے کا اہتمام بڑے ذوق شوق سے کرتے ہیں لیکن دوسروں کو اس ضمن میں کہتے بڑا کم سنا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ اہتمام کرنا حکم خداوندی ہے۔ اپنے لیے اہتمام کرنے کا حکم نافذ کرنا خواہش کی اتباع ہے اور یہ منع ہے۔

سوال:۔ بزرگانِ دین کے نزدیک کھانے پینے کی تعریف کیا ہے؟

جواب:۔ بزرگانِ دین کے نزدیک وہی کھانا پینا حلال ہے جو شاہدین کے قرب کا باعث ہو۔

سوال:۔ کھلانے پلانے کی صفت کا درجہ و مقام کیا ہے اور نیکی کی کن کن صفات پر اسے فوقیت حاصل ہے؟

جواب:۔ یہ درجہ ربوبیت ہے۔ تمام نیکیاں اسی چشمے سے سیراب ہوں تو زندہ رہتی ہیں۔

سوال:۔ اکثر بزرگانِ دین کا زیادہ تر وقت کھانے پینے کے اہتمام پر گزرتا ہے اور باقی امور پر کم وقت دیا جاتا ہے۔ اُس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ سب سے بڑے کام کے لیے سب سے زیادہ وقت ہونا چاہیے۔ یہ دائمی کام ہے باقی وقتی کام ہیں۔

سوال:۔ اگر بیک وقت دو شخص کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ایک کھانے کی دعوت دے اور دوسرا دعا کے لیے چلنے کو کہے تو وہ کس شخص کے ساتھ جانا پسند کریں گے اور کیوں؟

جواب:۔ بزرگانِ دین کی دعا کی حقیقت کسی کا راستہ آسان کرنا ہے۔ کھانے کی دعوت دینے والے کو ساتھ لے کر دعا کرنے کے لیے چلے جائیں گے۔ دعا کر کے دعا کرانے والے کو ساتھ لے کر دعوت دینے والے کے گھر آ جائیں گے۔

سوال:۔ قرآنِ پاک میں چند ایک مقامات پر کھانے پینے کے بارے میں حکم دیا ہے اور باقی چیزوں کے بارے میں متعدد بار ارشاد فرمایا ہے مثلاً نماز، زکوٰۃ وغیرہ لیکن بزرگانِ دین ان کے بارے میں تو لوگوں کو کہتے نہیں اور کھانے پینے پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ آخر کیوں؟

جواب:۔ کھانا پینا نفس کو پسند ہوتا ہے کھلانا پلانا ناپسند ہوتا ہے کہ یہ خدمت ہے اور خدمت سے نفس بہت بھاگتا ہے۔ اس لیے نفس پر حاکم ہونے کے لیے کھلانا پلانا ضروری ہے۔ عبادت کو نفس قبول کر لیتا ہے۔ عبودیت سے گریز

کرتا ہے۔

سوال:۔ کھانا تقسیم کرتے وقت بعض لوگوں کو دال' بعض کو گوشت اور بعض کو چینی سے روٹی کھانے کو دی جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ اس تقسیم پر بعض لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ کیا اس سے بزرگانِ دین اور لوگوں کے درمیان دوری کی دیوار کھڑی نہیں ہو جاتی؟

جواب:۔ طبیب جسمانی کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ کسی کے لیے اس کی بھلائی کی خاطر کسی شے کو منع کر دے۔ اس کی مقرر کردہ حد کا احترام بھی حکم خداوندی ہے۔ بزرگانِ دین کسی کو اس کی خواہشات کے مطابق نہیں کھلاتے۔ اس کی فلاح کے لیے کھلاتے ہیں اور علم سے کھلاتے ہیں۔ چہ میگوئیاں کی علم کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ جس کو قاسم کے اخلاص اور حسن رفاقت کا علم ہو وہ شک میں کیسے مبتلا ہو سکتا ہے۔ مبتدی کو نفس کی شہ سے بچنے کے لیے اپنے مشاہدے کو کسی محب کے مشاہدے کے تابع رکھنا چاہیے ورنہ پھسلنا یقینی ہو جاتا ہے۔

سوال:۔ کیا بزرگانِ دین بعض مقربین و محبین کے لیے کھانے کا خاص اہتمام بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر کرتے ہیں تو کیوں؟

جواب:۔ جو اپنا اہتمام نہیں کرتے ان کے لیے خاص اہتمام ہوتا ہے۔

سوال:۔ اکثر بزرگانِ دین کھانا کھلاتے وقت خود کھانا نہیں کھاتے۔ کیوں؟

جواب:۔ کسی ایک کے ساتھ ہی کھانا ممکن ہوتا ہے اور پھر کھانے کے بعد اس کے ہضم کے لیے وقفہ بھی علم سے ہوتا ہے۔

سوال:۔ بزرگانِ دین کی اپنی خوراک کیا ہے اور وہ کیا کھانا پسند کرتے ہیں؟

جواب:۔ بزرگانِ دین کی خوراک تجویز سے پاک ہوتی ہے اس لیے اس میں ان کی پسند کو دخل نہیں ہوتا۔ جو عطا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی پسند کرتے ہیں اور وہی کھاتے ہیں اور کھلاتے ہیں۔

سوال:۔ کیا بزرگانِ دین کے دربار میں آنے والے غیر مسلموں' چرند پرند اور حیوانات کے لیے کھانے کا علیحدہ اہتمام کیا جاتا ہے یا نہیں؟ ہاں یا نہ دونوں صورتوں میں حکمت عطا فرما دیں۔

جواب:۔ ہر آنے والے کو سیراب کیا جاتا ہے اور راضی کیا جاتا ہے۔ باسی روٹی کے بھورے کر کے پرندوں کو ڈالے جاتے ہیں۔ غیر مسلموں کے لیے علیحدہ اہتمام نہیں کیا جاتا کہ اہتمام کا منشا بہر حال ایک ہوتا ہے۔

سوال:۔ غیر مسلموں کو کھلانے کے لیے کون سے برتن استعمال کیے جاتے ہیں؟

جواب:۔ برتن مخصوص کر لینا کسی مخصوص مریض کے لیے ہو تو جائز ہے۔

سوال:۔ عموماً کس قسم کے برتنوں میں بزرگانِ دین کھانا کھلانا پسند کرتے ہیں؟

جواب:۔ جن کا بدل سہل الحصول اور سستا ہو۔

سوال:۔ بزرگانِ دین کو کھانا کھلانے کے لیے کس قسم کا اہتمام کرنا پڑتا ہے؟

جواب:۔ ایسا اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی پسند رضاالٰہی کا رخ کرے۔

سوال:۔ اکثر بزرگانِ دین خود کھانا تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں کیا حکمت ہے؟

جواب:۔ جس کا علم پورا ہو اس کی تقسیم پوری ہوتی ہے۔ جو اپنی ذات سے فارغ نہ ہو اس کو قاسم بنانے کے معنی لوگوں کو اذیت دینے کے ہوتے ہیں۔

سوال:۔ اکثر بزرگانِ دین خود کھانا پکاتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ کھانا پکانا یا پکوانا بڑا علم ہے۔ سہج پکا کھانا جسم کو تقویت دیتا ہے۔ جلدی میں پکایا گیا کھانا جسم کو کمزور کرتا ہے۔

سوال:۔ بزرگانِ دین کے دربار میں پکے ہوئے کھانے اور عام شخص کے گھر میں پکے ہوئے کھانے کی لذت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ پکانے والے کو کھانے والے سے جو تعلق ہو گا اسی سے کھانے کے مرتبے کا تعین ہو گا۔

سوال:۔ جو راحت بزرگانِ دین کے دربار میں یا قریب بیٹھ کر کھانے میں ملتی ہے وہ گھر میں نہیں ملتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ راحت پاک لوگوں کے قدم سے لگی ہوتی ہے۔ جو قدم بہ قدم ہو جائے اسے ہی حاصل ہوتی ہے۔ دستر خوان خدائی ہو میزبان مخلصین ہوں تو خدائی مہمان کو جو عافیت اور قدر و منزلت ملتی ہے اس کا بدل کہیں بھی نہیں ہو سکتا۔

سوال:۔ بزرگانِ دین کھانے پکانے کا علم کہاں سے سیکھتے ہیں؟

جواب:۔ حال پر نظر رکھنے سے سیکھتے ہیں۔

سوال:۔ بزرگانِ دین دوسروں کو کھانے پینے کا علم کس طرح سکھاتے ہیں؟

جواب:۔ اشیاء کے جسم پر اثرات بتاتے ہیں۔ حصول صحت کے لیے مقدارِ خوراک بتاتے ہیں۔ ترکیب تیاری بتاتے ہیں۔ پرہیز بتاتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو اپنی خواہشات پر حاوی ہونے میں مدد دیتے ہیں۔

سوال:۔ بزرگانِ دین کے نزدیک کھانے پینے اور کھلانے پلانے کے آداب کیا ہیں؟

جواب:۔ کھانے پینے کے آداب یہ ہیں کہ جو شاہدین سے عطا ہو اُس کی قدر کی جائے۔ اس کو باعث شفا جانا جائے۔ میزبان کی پسند کا احترام کیا جائے اور تقدیم و تاخیر اسی کی روشنی میں ہو۔

کھلانے پلانے کے آداب یہ ہیں کہ لوگوں کو خواہشات پر حاوی ہونے میں مدد دی جائے۔ ان کے لیے بندوبست فی سبیل اللہ ہو اور ان کے ساتھ نرمی روا رکھی جائے اور انہیں خوفزدہ ہونے سے بچایا جائے۔

پتہ نہیں کیوں باباجی کے ڈیرے پر خاں صاحب کی گاڑی کا نٹا بدل گئی اور انہوں نے سخی رازی صاحب کو بھی اپنی تلاش میں شامل کرلیا۔ سخی رازی صاحب سندھ سے آئے تھے اور نہر کے پار ایک چھوٹا سا ڈیرہ انہوں نے بنا رکھا تھا۔ ان کے ڈیرے کی شکل باباجی کے ڈیرے سے مختلف تھی۔ لنگر یہاں بھی کھلاتے تھے لیکن جو کچھ ان کے مرید گاؤں سے پکا کر لے آتے وہی پیش کر دیتے۔ کچھ نہ ہوتا تو لسی' چائے مل جاتی۔ یہاں سوال جواب بھی کم کم پوچھے جاتے۔ بس سخی رازی صاحب اپنی سادگی اور ضرورتوں کی کمی سے زندگی کے سفر کو گزارنے کا سبق سکھاتے۔ جس قدر ضرورت کم ہوگی.... خواہش کم جائے گی اور خواہش کم ہوگی تو نہ پورا ہونے کے مقام پر مایوسی بھی تھوڑا ستائے گی۔ آدمی اللہ کا شاکی اور گلہ گزار نہ رہے گا۔ پہلے وہ سخی رازی صاحب کے مزار پر تنہا جاتے رہے۔ پھر کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جانے لگے۔ وہ یقیناً رازی صاحب کے خاموش فلسفے سے کسی بدھ بھکشو کی طرح متاثر تھے۔

باباجی کے وصال کے بعد یکدم خاں صاحب کی زندگی میں واصف علی واصف آ گئے۔ وہ ایک سکول میں عشاء کی نماز کے بعد لیکچر دیا کرتے تھے۔ بنیادی طور پر شاعر' مقرر اور مفکر تھے۔ خاں صاحب اور انیق بیٹا اُن کے پاس قریباً ایک ہزار راتیں روحانی سمت نمائی اور رہنمائی کے لیے جاتے رہے۔ ان کے کئی ٹیپ بھی ریکارڈ کیے۔ بہت سارے نوٹ بھی لیے۔ چونکہ اب واصف صاحب کی بہت سی کتابیں شائع ہوگئی ہیں اس لیے ان کی بصیرت اور بصارت کے کوئی اقتباسات پیش نہیں کر رہی۔

چلتے چلاتے ہوتے ہواتے خاں صاحب بابا عرفان الحق سے ملے۔ یہ بینک سے گولڈن ہینڈ شیک لے کر جہلم میں ڈیرہ کھولے ہوئے تھے۔ یہاں ان سے ملنے کے لیے اُن کے سیکرٹری ظفر صاحب سے وقت مقرر کرنا پڑتا۔ ڈیرہ گھر سے علیحدہ اور تعلیم یافتہ بینکر کی طرح بڑا منظّم تھا۔ لنگر کی روایت یہاں بھی موجود تھی۔ دوسرے شہر سے آئے مسافروں کے طعام کے علاوہ قیام کا انتظام بھی تھا۔ خاں صاحب اثیر کے ہمراہ جہلم جایا کرتے تھے جہاں خاں صاحب کے سوالات پھر کنارہ تلاش کرتے رہے۔

ان کا نام خاں صاحب بہت احترام سے لیتے تھے اور جب عرفان صاحب لاہور میں لیکچر دیتے تو خاں صاحب یہ لیکچر سننے جاتے۔ یہ عہد میری بیماریوں کا دور تھا۔ اس لیے نہ تو مجھے جہلم جانے کا اتفاق ہوا نہ لاہور میں ان کے روحانی لیکچروں کا۔ ان ہی دنوں پروفیسر رفیق اختر کا چرچا گھر میں ہونے لگا۔ وہ بنیادی طور پر پروفیسر تھے اس لیے لیکچر دینا اُن کا بائیں ہاتھ کا فن تھا۔ ان سے میری ملاقات صرف ایک بار اسلام آباد میں مفتی جی کی بیٹی سویرا کے گھر پر ہوئی۔ لنگر کا انتظام سویرا نے کر رکھا تھا اور اس کا شوہر مقبول جو ایکویٹی بینک میں اچھے اونچے عہدے پر تھا' خدمت گزار کی ڈیوٹی بجالا رہا تھا۔

ان دنوں شاید خاں صاحب عورت کے متعلق کچھ تصور پال چکے تھے۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ عورت اللہ کے راستے پر نہیں جاسکتی اس کے لیے چادر اور چار دیواری اصل قلعہ ہے۔ مجھے کبھی انہوں نے یہ بات اعلانیہ نہ کہی لیکن اب مجھے وہ گھر سے باہر زیادہ رابطے بنانے پر بھی نہ اکساتے تھے اس لیے رفیق اختر صاحب سے میری ملاقات نہ ہوسکی۔

ان گھمن گھیریوں میں وہ رنگ رنگ کے صوفیوں کے تعاقب میں بھی رہے۔ وہ مجھ سے بابا رتن بٹھنڈا کے فقیر کی باتیں بڑی دلچسپی سے بتایا کرتے تھے۔ حاجی رتن کا مزار تحصیل پٹیالہ میں بٹھنڈا کے اسٹیشن سے تین میل دور گوودنگڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے تین میل دُور ہے۔ اس فقیر کے ساتھ کئی معجزے وابستہ ہیں۔ انہیں جب کشف ہوا کہ عرب میں وہ نبی آچکا ہے جس کا نام محمدؐ ہے اور جس کا معجزہ شق القمر ہے' وہ فوراً بٹھنڈا سے چل پڑے اور مکہ شریف پہنچے اور نبی کی خدمت میں پورے تیس سال رہے اور وہیں مسلمان ہوئے۔ ہندو تو اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ رتن ناتھ چوہان راجپوت تھے اور وہ آخری وقت تک ہندو رہے اسی لیے انہوں نے بابا رتن ناتھ کے قریب ہی اُن کی سمادھی تیار کرلی۔

روایت یہ بھی کہتی ہے کہ بابا رتن نے سات سو سال عمر پائی اور اپنا فیض بانٹتے رہے۔ جب شہاب الدین غوری نے ان کے معجزات کے متعلق سنا تو دنیاوی بادشاہ کشاں کشاں روحانی تاجدار کے ہاں پہنچا۔ بابا رتن کے ہاتھ میں پانی کا آخری گلاس تھا۔ پیاسے بادشاہ نے پانی کا سوال کیا۔ سنا جاتا ہے کہ اس گلاس کے اندر بابا رتن نے اپنا ہاتھ ڈالا اور شہاب الدین غوری کو پیش کردیا۔ بادشاہ نے پہلے اپنی پیاس بجھائی پھر اُس کے سارے پیاسے لشکر نے اسی گلاس سے پانی پیا اور خوب سیر ہوکر پیا۔ بادشاہ نے عرض کی کہ ''میں آپ سے فتح کی استدعا کرنے آیا ہوں۔ دعا فرمائیے میں پرتھوی راج کو ہرا سکوں۔''

حاجی رتن نے کہا ''ایسا ہی ہوگا لیکن تمہیں اپنے لشکر میں ایسے دو سیّد تلاش کرنے ہیں جن کی نظر کرم سے دشمن کے تمام خیمے گر جائیں گے لیکن تمہاری فوج کے خیموں کو کچھ نہیں ہوگا۔'' جب بادشاہ نے سیّد تلاش کر لیے تو اُن کو حاجی رتن کی بات بتائی۔ سیّد حضرات بولے ہوجائے گا لیکن ہم دونوں زندہ نہیں بچیں گے۔ عین جنگ کے روز پانسہ پلٹا۔ دشمن کے تمام خیمے ڈھے گئے لیکن دونوں سیّد بادشاہ بھی حاجی رتن کی پیش گوئی کے مطابق ختم ہوگئے۔

جس طرح حیرت سے خاں صاحب مجھے بابا رتن ناتھ کی باتیں بیان کرتے تھے میں اُس طرح تو ان کا ذکر پیش نہیں کرسکتی اس لیے میں وہ لٹریچر آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ اب آپ اسے صوفی رتن سمجھیں یا سادھو رتن یہ آپ کی مرضی ہے۔

حاجی رتن کی روایت برصغیر میں کچھ نئی نہیں۔ یہ اس وقت سے موجود ہے جب محمد بن قاسم نے دہلی میں قدم رکھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے متصادم بھی تھے اور ایک دوسرے کے معترف بھی۔ دو اتنے مختلف النوع گروہ جن کی اپنی اپنی روایات اس قدر مضبوط تھیں ان کے لیے مشکل تھا کہ وہ ایک دوسرے میں ضم ہوجائیں اور جداگانہ حیثیت کو بھول جائیں۔ اس مقام پر صوفیاء نے سادھو سنتوں نے فقیروں نے برصغیر کو لبرل ہونے کی جو تعلیم دی اس کا لب لباب مولانا اشرف نے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ''اپنا مسلک چھوڑو نہیں کسی کا مسلک چھیڑو نہیں۔'' بابا رتن ناتھ کی روایت

سارے صوفیا کے مزاروں پر پائی جاتی ہے۔ ڈیروں پر ہندو ماننے والے' سادھوؤں کے حضور مسلمان عقیدت مند ہمیشہ نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی خاں صاحب کی کرید انہیں جگہ جگہ جھانکنے پر اُکساتی۔ ایک خط جوان کے کاغذات سے برآمد ہوا ہے' کرپال سنگھ نارنگ کا امرتسر سے آیا تھا۔ رادھا سوامی سنگ کا ایک خاص طریق نام کی بخشش تھی اور مرشد کا ست سنگ بھنڈارہ سے تین دن پہلے شروع ہو جاتا تھا۔ جو لوگ نام دان کے خواہشمند ہوتے تھے عموماً بھنڈارہ سے تین دن پہلے سے حاضری دینا شروع کر دیتے۔ اس خط کی زبان و بیان آپ پر یہ بات واضح کرے گی کہ برصغیر کی صلح جو فضا کو کن حضرات نے پروان چڑھایا۔ کرپال سنگھ کا خط ملاحظہ کیجئے۔

پیارے بھائی اشفاق احمد صاحب

تسلیمات! آپ کا خط مورخہ 3 اپریل موصول ہوا۔ ہمارے لیے جائے مسرت ہے کہ ہماری ارسال کردہ کتب کے مطالعہ سے آپ کو بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے ہیں اور کافی حد تک آپ کے شکوک رفع ہو گئے ہیں۔

نام دان کے لیے ایسے اشخاص درخواست کر سکتے ہیں جنہوں نے اس سے پیشتر کم از کم چھ ماہ تک شراب نوشی سے پرہیز کے علاوہ سبزیاتی خوراک پر زندگی بسر کی ہو۔ سبزیاتی خوراک میں گوشت' مچھلی' انڈے سے قطعی پرہیز لازم مانا جاتا ہے۔ بیعت ہو چکے شخص کے لیے تمام زندگی یہ پرہیز لازمی ہے۔ دیگر ضروری شرائط یہ ہیں کہ وہ پاک ازدواجی زندگی بسر کرے اور حق حلال کی کمائی پر گزارہ کرے۔ کلمہ یا نام کی عبادت و ریاضت کے لیے عموماً دن رات کا دسواں حصہ (اڑھائی گھنٹے) روزانہ وقت دینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس سے زیادہ وقت دینا ممکن ہو سکے تو اور بھی اچھا ہے۔

نام کی بخشش کے لیے دوران سال سات روحانی اجتماع ہوتے ہیں جن کو بھنڈارے کہا جاتا ہے۔ ان کی مخصوص تاریخیں یا دن یہ ہیں:

الف:۔ فروری' مئی' جولائی' ستمبر اور اکتوبر مہینوں کے آخری اتوار

ب:۔ 2 اپریل اور 29 دسمبر (مستقل تاریخیں)

نام کی بخشش بھنڈارہ کے اگلے دن سے شروع ہوتی ہے اور اس کا حصول کل مالک کے مہر و کرم پر مبنی ہے' جو مرشد کی معرفت عمل پذیر ہوتا ہے۔ مرشد عالی کا ست سنگ عموماً بھنڈارہ سے تین روز پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ نام دان کے خواہشمند کے لیے یہ فائدہ مند رہتا ہے کہ وہ مرشد عالی کے چاروں ست سنگ سنے تاکہ یہ روحانی فلسفہ جسے اُس نے زندگی میں اپنانا ہے' اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے اور شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔

یہ سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ درویشوں یا سنتوں کا یہ طریق جسے رادھا سوامی طریق کہا جاتا ہے' کوئی الگ مذہب یا فرقہ نہیں ہے۔ یہ ایک طریق عبادت ہے جو خود آگاہی اور خدا آگاہی کے لیے محض ایک فلسفہ ہی نہیں' عملی سائنس بھی ہے لیکن یہ انسانی نسل کی مجبوری سمجھیں یا بدقسمتی کہ ہم ہر اچھے فلسفہ پر لیبل چسپاں کرنے کے عادی ہو گئے ہیں' جس کے نتیجہ کے طور پر اسے تنگ دائرہ میں محدود کر دیتے ہیں اور اِن دائروں کی قید و بند میں پڑ کر' محض ناموں کی آڑ لے کر تنگ نظری اور باہمی دُشمنی کا شکار ہو جاتے ہیں' ناموں کی تہ میں چھپی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ (جسے دکھانے کا مجاز

فقط مرشد کامل ہی ہوتا ہے)۔

یہ ہر ایک منظم و معین مذہبی جماعت (Organised and institutional religion) کا حال ہے' گو ابتدا میں ہر ایک مذہب اس نقص سے بری تھا اور ایک خالص طریق عبادت کی صورت میں رائج ہوا تھا۔

مندرجہ بالا حالات کے پیش نظر' بلاشک اس راہ پر چلنے والے کو کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اِس طریق میں عبادت سے متعلقہ شرعی رسموں' رواجوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ البتہ معاشرتی رواجوں (Social Customs) میں کوئی دخل نہیں دیا جاتا۔ یہ قطعی طور پر راہِ عشق ہے جس میں خدا اور اُس کے بندہ کا سیدھا تعلق ہے۔ عشق کوئی بندھن تسلیم نہیں کرتا۔ اِس نکتہ کو' جیسا کہ آپ کے خط سے ظاہر ہے' آپ نے بخوبی سمجھ لیا ہے۔ شریعت کے پہلو کو نظر انداز کرنے سے کئی اشخاص کو جھجک یا ڈر محسوس ہوتا ہے لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ جب معمولی دنیاوی چیزوں کے حصول کے لیے اُن کے مطابق کم و بیش قیمت ادا کرنی پڑتی ہے تو خیال کرنا چاہیے کہ جو خداوند کریم دنیا کے اِس بے بہا مال و متاع کا مالک ہے' اُسے پانے کے لیے کس قدر قیمت ادا کرنی ضروری ہے۔ زمانہ ماضی میں بادشاہوں نے اُسے پانے کے لیے اپنی سلطنتیں ترک کر دیں۔ اُس کے عشق میں متوالے لوگوں نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ سچا قدر دان اِس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت بھی ہیچ سمجھتا ہے اور بصد خوشی اِسے قابل ادائیگی سمجھتا ہے۔

آپ نے آخیر میں سوال کیا ہے کہ کیا باطن کا مسافر خوفناک شعلوں میں گھری اِس دنیا کی بھی کوئی مدد کر سکتا ہے؟ جواب بالکل عیاں ہے۔ اِس راہ کا ہر سنجیدہ پیروکار ایک بہتر انسان بن جاتا ہے جو بنیادی طور پر ایک بہتر دُنیا کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ جتنے بھی مذہب ہیں اُن کے عظیم راہبروں نے اپنی شخصی زندگی کی مثال پیش کر کے دُنیا کو بدل دیا اور اوہام و توہمات میں جکڑے لوگوں میں زندگی کی نئی لہر رواں کر دی لیکن اُن کے جانے کے بعد لوگوں نے اصلیت کو بھلا دیا اور پھر گمراہ ہو گئے۔ دِل و جان سے اِس راہ پر چل کر عملی زندگی بنانے والا شخص ایک مقناطیسی شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس کی صحبت کرنے والے شخص پر اُس کے باطن سے نکلنے والی روحانی رَوئیں (Spiritual Vibrations) اثر انداز ہوتی ہیں اور اُسے ایک نیا انسان بننے میں مدد دیتی ہیں۔ ایسا شخص بھلے ہی خاموش رہے' اُس کی محض موجودگی اثر پذیر ہوتی ہے' بمصداق فارسی کے اِس قول کے:

خاموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

ایسا شخص ہر فرد و بشر سے بے لوث پیار کرتا ہے اور عالمی یکسانیت کا علمبردار بن جاتا ہے۔ اس طرزِ زندگی میں اُس کے اخلاق میں سب سے پہلے سدھار ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی درویش اور فقرا ہمیں بتاتے ہیں کہ اِس دنیا کا مکمل سدھار کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ بنیادی طور پر اِس کی ہستی میں برائی کا خمیر گوندھا گیا ہے' جو نیکی اور بدی' سچ اور جھوٹ' پیار اور نفرت وغیرہ مثبت اور منفی کی دُوئی کی صورت میں کارگر ہو کر اِس کا وجود قائم رکھ رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً دُنیا میں بڑی بڑی روحانی شخصیتیں آتی رہی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی عظیم راہبر سوائے کچھ محدود لوگوں کے دنیا کو راہ راست پر نہیں لا سکا اسی لیے سب مذہبی کتب میں یہ بات کہی گئی ہے کہ وہی انسان حقیقت سے شناسا ہو سکتا ہے جس کا ایسا ہونا اللہ کے رحم و کرم

کے ذریعہ مقصود ہے۔اس لیے حقیقت کے متلاشی کو بغیر دنیا کی زیادہ پرواہ کیے اپنی نجات کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے بعد وہ دوسرے لوگوں کو بھی نجات کی راہ دکھانے میں اپنا رول ادا کرسکتا ہے اور اس طرح اپنے اس دائرہ میں ایک حد تک دنیا کی بھلائی کرسکتا ہے جیسے کہ دوسرے روحانی راہبر کرتے رہے ہیں۔خود آگاہی کے لیے کوشاں ہونا خود غرضی ہرگز نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی دنیا کی بھلائی کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کا خود بھلا بننا ضروری ہے۔اگر کوئی شخص بیماروں کا علاج کرنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ پہلے وہ خود ڈاکٹر بنے۔

آپ کا خط مرشد عالی کی خدمت میں پیش کردیا گیا تھا اور جواب بھی ان کی زیر ہدایت لکھا گیا ہے۔

پُرخلوص محبت اور نیک تمناؤں کے ساتھ۔

آپ کا بھائی
کرپال سنگھ نارنگ

Baba Ratan, the Saint of Bhatinda.

J. Horovitz, Ph.D.

[Paper read-October 5th, 1911].

There is no history without legend and particularly there .is no history of a saint without his legends. In so far as the psychological conditions are the same in men inhabiting the various parts of the globe, the data of hagiology are identical or similar in many respects, whatever their origin may be geographically ; but very frequently the similarity is due also to a survival of identical ancient traditions or borrowing from a neighbouring creed. Wherever rationalism has not as yet destroyed the creative power of primitive popular imagination, legends of saints are still springing into existence daily and growing ; but even where the creative power has been checked by destructive tendencies, the retentive organs of popular belief have at least very often successfully withstood these influences and been able to protect the creation of a former period from falling into oblivion or discredit. Willingly or unwillingly the great religious systems that inherited the realm of their more primitive predecessors have had to extend this protection to the legacy of heroic and mythological lore in not a few cases, however much it may have

been inconsistent with their theological teachings and conceptions. And if the new religion as preached by the theologians condemned it altogether, the masses of its professors at least did not part with this inheritance, that formed a strong connecting link with their past, although in the course of many centuries it very often shrank into a heap of now meaningless traditions and observances.

However hostile the official relations were between the various religious systems that shared between themselves the masses of the worshippers in the land, the worship of the saints formed a bond of union between the otherwise hostile groups. Partly because this worship was felt to have once been the common property of all, but also because those who acquired the reputation of a saint gained it through a mode of life-real or imaginary-that conformed with the moral ideals of each of the contending creeds and made them therefore likely in the eyes of all to be powerful intercessors at the throne of God, the saints found, followers in all the camps. Thus it is not rare in Western Asia or Northern Africa that the tomb of one saint is visited by Christians, Jews and Moslems, just as in India both Hindus and Moslems make pilgrimages to the same shrine. In India of course Islam having remained in the minority against the overwhelming majority of Hinduism, it does not stand in the same relation, that of the principal heir, to Hinduism, which it maintains in more western countries with regard to other creeds[1]. As Islam and Indian religions have been in existence side by side for centuries, the process, especially amongst the lower strata of society, was more one of mutual giving and taking. The number of saints, whose tombs attract both Hindu and Muhammadan pilgrims, is very large especially in the Punjab, and the saint to whom this paper is devoted is one of them ; he is an indigenous Indian saint, but one of the few whose fame has spread far beyond

the confines of India over almost the whole territory of Islam.

Hajji Ratan's shrine is situated three miles from Bhatinda railway station in the Govindgarh tahsil of Patiala State ; it is a large building in the Pathan style with a mosque and a gateway and surrounded by a wall on all sides. On the back wall of the shrine a few inscriptions are visible, which however are of no particular importance. The earliest of them is dated 1005 H. and they all refer to repairs made in the shrine. The annual fair *('urs)* is held from the 7th to the 10th Dhul-Hijja and is attended by both Hindus and Muhammadans from Firozpur, Alwar, Rawalpindi and Bikaner. Amongst the visitors there is also a large sprinkling of Sadhus. A number of documents are preserved at the shrine, which throw some light on its later history and will be dealt with further on. They do not teach us anything about Hajji Ratan himself, for whose legend we have to rely on the accounts that are still current with the people at Bhatinda and other places ; but apart from these there is also a literary tradition extant, that can be gathered from various Arabic, Persian and even Turkish sources. We have a Muhammadan as well as a Hindu version of his story, and both these are also represented in the literary tradition. The earliest version accessible to us of the legend as told locally is the one recorded by General Cunningham in 1883(2). According to this version Ratan's name was originally Chaukar, which he changed into the one by which he is now known at the time of his conversion to Islam. This happened at the time of Shihabuddin Ghori's invasion, at which he as the minister of Raja Vena Pal connived, rendering the Moslems every assistance in their entry into the fort and putting his master with his family to the sword. He afterwards performed the pilgrimage to Mecca and was henceforth called Hajji Ratan. The story as told by Cunningham does not include any miraculous element, and there is little in it which would justify calling Hajji

Ratan a saint. But it contains an unmistakable reference to an historical event, viz. the conquest of the Fort of Tabarhind by Muhammad Ibn Sam, better known as Shihabuddin Ghori, an event described by contemporary authors such as Minhajud-din in his *Tabaqat-i-Nasiri*(3) which took place in 587 H. Now Tabarhind is the ancient name of Bhatinda(4), and we shall see later on that according to other accounts also Baba Ratan lived at Tarbinda (Tabarhind). If Cunningham's short version is lacking in the miraculous,(5) this cannot be said of a more detailed form of the popular version of the legend still current at the shrine of Bhatinda, which came to my knowledge in 1911. Baba Ratan-so the story goes-belonged to the class of Chauhan Rajputs. His knowledge of astrology told him that a prophet called Muhammad would be born in Arabia, who would spread the religion of Islam. In order to be favoured with the sight of the Prophet he practised the art of restraining the breath, and after the Prophet had performed the miracle of splitting the moon in two, a miracle witnessed by Ratan,(6) he set out to Arabia in order to meet him. In Mecca he embraced Islam and lived with the Prophet for thirty years, so that he was numbered among his " ashab " or companions. Later on he returned to India by order of the Prophet and stayed at the place where his shrine is now and devoted himself further to the practice of restraining his breath. When Shihabuddin Ghori proceeded towards Bhatinda to fight Prithivi Raj , he went to pay a visit to the Hajji. During this visit the King asked for some water to drink ; the saint had only a jug of water with him, but by putting his hand into it, was able to quench the thirst of the King and all his followers, without the water in the jug diminishing.(7) When the King saw that he was endowed with the power of working miracles, he asked him to pray for the conquest of the fort of Bhatinda, whereupon the saint replied, tha the fort would be conquered by the help of two Sayyids, who belonged to his

army. The sign by which he would be able to recognize them would be that the storm that would throw down all the other tents in the camp would not hurt their tents, in which they would be found reading the Quran. When the King had found the two Sayyids, they declared themselves ready to undertake the task in which however, they foretold, they would lose their lives. The fort was conquered and the two Sayyids fell as martyrs ; their tombs are to be found to the north of Baba Ratan's shrine. Ratan himself died not much later at the age of seven hundred years.[8]

This version of the legend then agrees with the one quoted before, that Baba Ratan was instrumental in bringing about the fall of the fort. He is however not the minister of the King, but a Muhammadan saint and therefore a natural ally of the Muhammadan invader. The stain of treachery towards his master is thus removed from him, and if we could be sure about the chronological order of the two versions, we should be inclined to say that this change was due to a higher moral conception of sanctity. The episode of the two Sayyids looks very much like an etiological element, invented in order to explain the origin of the two tombs, of whose real history nothing was remembered.

A third version, also received from Bhatinda, looks in some respects like an attempt to reconcile the two versions quoted: according to it Baba Ratan " came from Medina to Bhatinda in 668 Samvat which corresponds to 24 A.H. and became the prime minister of Raja Vena Pal; later on he turned a Faqir and went to Mecca on pilgrimage." Here Raja Vena Pal, who in the first version is defeated by Shihabuddin Ghori, turns out to be a contemporary of the Prophet, or at least is supposed to have lived not much later than the Prophet.

Very different from this sounds the Hindu version, also still current at

Bhatinda. Hajji Rattan, it asserts, was really a Hindu whose name was Ratan Nath. He was a Sadhu of the Nath clan and the Darshana branch,[9] who had the power of performing miracles. He had travelled to many places and had even visited the Ka'ba where no Hindu is admitted. In Mecca Ratan Nath manifested his miraculous powers and thus gained the respect and confidence of the Muhammadans. He then came to Bhatinda and stayed at the place where his tomb is now, for the rest of his life. When Mahmud of Ghazna came to Bhatinda, he managed to provide drinking water for the whole of his army from his *tunbi*. As he was a Nath he was buried after he had died and his *samadh* was built. Both Hindus and Muhammadans had faith in his superhuman powers, and the latter replaced the *samadh* by a *khanqah* and instead of calling him Nath called him Hajji because he had been to Mecca.

This Hindu version agrees with the Muhammadan in so far as it makes the saint visit Mecca and also makes him perform the water-miracle, which however took place in Mahmud's, not in Shihabuddin's time. It maintains that he remained a Hindu and knows nothing of his meeting the Prophet.

All these versions, both Hindu and Muhammadan, come from Bhatinda, but Baba Ratan's fame is not confined to the place in which he is buried. That he is not a stranger in Punjabi folklore outside Bhatinda we see from the very remarkable part he plays in the legend of Guga, of which Sir Richard Temple has published a very interesting version.[10] The passage to which I refer occurs towards the end of the story. Two cousins of Guga try to kill him in the forest, but he is invulnerable and kills them both. He then brings the two heads to his mother Queen Bachhal, and here my quotation from the published text begins :

Guga :---" Look at it, recognize it, mother mine, and delay not ;
I stand before thee with joined hands, receive my greeting." She saw it

As I mourn for these twins so mayest thou know sorrow ? ' My mother cursed me, who shall put it aside ? "

Mother Earth:-" My son, go quickly : I have shown thee. Go now, my son, and worship in Ajmere. My son, go now and worship, make no delays. He (the saint) is as full of honour as Khwaja Khizar : go to him. Say nothing (false) with thy lips : tell him the whole tale. Thy hope will be fulfilled ; repeat the creed and come."

Guga :-" O mother, thy true words have entered into my heart. I will go now in a minute : the fears of my heart have departed. I will make ready to go at once. I will go onwards to Ajmere and my hope will be fulfilled."

When he saw Ratan Hajji and Khwaja Khizar he stood before them with joint hands and said :

" Hear ye my words. Many days have I waited to see you. Teach me the creed l Alas ! my mother's words have slain me."

Ratan Hajji ;-" My friend, who art thou ? Why is thy mind upset? What is thy name ? Tell me the truth."

Song :- Tell me the truth, friend;
Why dost make such delay ?
What is thy name and caste ?
What misfortune hath encompassed thee ?

NOTES

(1)Two very excellent monographs have lately been published on Christian hagiology, the one by Pére Delehaye, *Les légends hagiographiques*, 2nd edition, Brussels, 1906), the other by Professor Guenter (Die Christliche Legende des Abendlandes, Heidelberg, 1910) both of which contain also frequent references to legends of other religions, but curiously enough no reference has been made in any of them to Muhammadan hagiology, a subject which has received a masterly treatment at the hands of Professor Goldziher in the second volume of his *Muhammedanische Studien* (pp. 275-378).

and began to weep as soon as she recognized it.

In her grief she fell on the ground, nor did any life remain in her body.
Nor did any life remain in her body.

Queen Bachhal :---" Ah, my son , what wickedness have you done ?
Why did you stretch your hands to slay à wreched sinner ?
Such a crime as you have committed my eyes cannot bear !
See me no more, nor let me see you again."

Guga:-"O mother, I tell thee, know the truth in thy heart!

Thou spakest the word; it goes not back; we are the sport of the Guru. We are the sport of the Guru, mother; thou hast spoken the word.

Know me for a Rajput warrior, it is law to me. Bhagwan is my witness that I will never see thee again. May I live seven lives in hell if I disobey the command of my father- and mother !

With joined hands I pray thee, O mother Earth! Take me into thyself, or else I will kill myself now! Or else I will take my own life now. I have no friend in the world. I beseech thee, for death hath encompassed me. Delay not, but take me to-day. I have thrice vowed that I will see my mother no more. If thou will take the curse on thee, I will go whither thou sendest me. Tell it me and I will fetch and bring it thee."

Mother Earth:-" Ay, my son, I tell thee how is it that thou dost not know ? Musalmans are buried below, Hindus go to the pyre, my son, I tell thee. Go to Ratan Hajji and learn the Musalman's creed. When thou hast done this I will take thee to myself. Siriyal, Raja Sanja's child (the mother of the two killed) will curse me."

Guga : -" My mother spoke most wicked words to me! How can I tell them thee ? Hear, mother Earth! Hear, mother Earth, why dost thou always put me off! She said : The curse of Guru Gorak Nath be upon thee if thou return!

(2) *Archaeological Survey of India*, vol. xxii, p. 5 seq.

(3) Ed. Calcutta, p. 118; see Raverty's notes in his translation, pp. 457 seq. and 460 seq.

(4) See Raverty 1. c.

(5) See also the version given in the Patiala State Gazetteer.

(6) Similarly the King of Malabar embraced Islam when he heard of this miracle. See Arnold, Preaching of Islam, p. 217 ; and also the Raja of Kanauj's conversion, that forms the subject of a Mathnawi, formerly much recited, was brought about through the same miracle. This Raja must be identical with Sarbatak, the King of Kanauj, who accepted the Prophet's invitation to embrace Islam. Ibn Hajar, *Isaba*, ii, p. 354.

(7) This type of miracle, so common in Jewish and Christian legend, is also well represented in Islamic hagiology; the earliest biographies of the Prophet contain instances of it. See e.g. Ibn Hisham ed. Wuestenfeld, pp. 671-2.

(8) I am indebted for this version to Ghulam Qadir, photographer in the Archaeological Department, who visited Bhatinda in September 1911. Another account of the Muhammadan version was very kindly supplied through the Khan Zulfiqar 'Ali Khan of Maler Kotla. It agrees with the one quoted above in all the essential parts, although it adds some details. Thus e.g. we are told, that Hajji Ratan after having embraced Islam at Mecca, became minister of the King of Islambul (= Stambul), but later on left his post and returned to Bhatinda.

(9) See Ibbetson, *Census Report*, 1883, p. 286 ; Maclagan, *Census Report*, 1891, p. 115.

(10) Vol. I, p. 203 seq. On Guga see also Maclagan, *Census Report*, p. 104;

خاں صاحب حق کی تلاش میں بڑی تحقیق کرنے والے تھے۔ یہ تو نہیں بتایا جاسکتا کہ اس تحقیق کے نتائج میں وہ کسی حتمی فیصلے پر پہنچے کہ نہیں لیکن اتنی بات ضرور ان کے رویے سے نظر آتی تھی کہ وہ سوئی کو ریت میں سے تلاش کر رہے ہیں۔

اس کارگذاری کے دوران ان کی نظر دُور دُور کے ممالک اور رنگ رنگ کے مسلکوں کی چھان بین میں لگی رہی۔ امریکہ نیا ملک ہے اور سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ خاں صاحب کو بڑی حیرت ہوئی جب انہیں باوا محی الدین کا سراغ لگ گیا لیکن ان کے مزار تک رسائی انیق بیٹے کی وساطت سے ہوئی۔ دوسری مرتبہ جب ہم نوکی اور غزل سے ملنے امریکہ گئے تو ایئرپورٹ پر انیق نے ہم سے کہا "ابو! میں آپ کو میری لینڈ بعد میں لے جاؤں گا پہلے باوا محی الدین کے مزار پر حاضری دیں گے۔ نیویارک سے ہٹ باوا کے مزار پر پہنچے تو یہاں عجب سماں دیکھا۔ امریکی مرد عورتیں باورچی خانے میں لنگر کے برتن دھو رہے تھے۔ کچھ ڈیرے پر جھاڑو پھیرنے میں مشغول تھے۔ کچھ سنگ مرمر کے مزار کو چمکانے' صیقل کرنے میں مشغول تھے۔

"بابا جی سری لنکا سے آئے تھے۔ ابو انہیں انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا تھا۔ وہ کیا کرتے تھے کہ اگر "میں" کے حوالے سے بات نہ کی جائے تو اللہ کی بات کسی زبان میں کی جائے دل تک پہنچ جاتی ہے۔ مزار ان کے مریدین نے بنایا۔ دُور دُور سے لوگ یہاں حاضری دینے آتے تھے۔ بابا جی ہمیشہ تامل میں بات کرتے اور سننے والوں تک یہ بات پہنچ جاتی۔"

ہم نے مزار کو تحیر سے دیکھا۔ انیق نے ہمارے لیے جو لٹریچر جمع کیا وہ حاضر خدمت ہے۔ آپ میں سے جو کبھی امریکہ جائے اور باوا محی الدین سے مزید واقفیت کرنا چاہے اُسے اس مزار کا راستہ مل جائے گا۔

Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen was a revered Sufi saint from the island of Sri Lanka who for more than fifty years selflessly shared his knowledge and experience with people of every race and religion and from all parts of the world. He first came to the United States in 1971 and established the Bawa Muhaiyaddeen Fellowship of North America in Philadelphia. Since

then branches have spread throughout the United States and Canada, as well as in Sri Lanka, Australia and the U.K.

Further Information:

- What is the Purpose of the Fellowship?
- History
- The Founder
- Come for a Visit
- Branches Around the World
- Schedule of Activities
- Fellowship Calendar of Events
- Online Membership Form
- Fellowship Website E-mail Newsletter
- Fellowship Guestbook

The Fellowship serves as a "pond" where individuals can gather to contemplate the truth and unity of God. Outwardly, this is done by studying the teachings and example of M. R. Bawa Muhaiyaddeen through the countless hours of audio and video cassettes of his discourses, many of which have also been compiled into books. Inwardly, this is done by slowly cleansing oneself through prayer and by bringing these teachings into one's daily actions.

For more information about these and other activities email, write or call:

The Bawa Muhaiyaddeen Fellowship

5820 Overbrook Avenue Philadelphia, PA 19131-1221, USA

Phone: 215-879-6300 (24 hour answering machine)

Fax: 215-879-6307

THE PURPOSE OF THE FELLOWSHIP

When asked What is this Fellowship, Bawa Muhaiyaddeen answered:

"God has given His kingdom to all His creations, so that each can live in freedom. All the animals in the jungle, all the creations in the ocean, and all the birds in the sky live in freedom. The sun, the moon, and the stars live in freedom where they are positioned. Man alone lives having lost his freedom because of his selfishness, his desires, his greed; his arrogance, and his pride; because of his trickery and treachery; and because of the separation of 'you' and 'I'.

To man who has lost his freedom the Fellowship says, "All other lives live in freedom. O man, why not you? Why do you seize the freedom of other lives? God has given you a kingdom of freedom. Realize this, O man. Give up your selfishness. Give up your jealousy. Give up your ignorance. Imbibe wisdom and live like a true human being so that all mankind can live as one life. Then this place in which we live can be changed into heaven, into the kingdom of God. Mankind should resolve to live in this state."

The Fellowship says,

"Act with the qualities of God, and live in the state of God's peacefulness. Show the compassion of God to all lives, so that all lives can live in freedom and unity. We must all live in the state of love, compassion, freedom and equality, regarding all lives as one life."

"O man, you have been born beautiful. God has given you a beautiful heart. God has given you a connection to Him. Your life is within Him, and He lives within you as your life. Your secret is within God and God's secret is within you, O man."

"To all lives you should be a representative, a king, and a friend. God has given you abilities by which you can protect others. O man, having

received this power, you have left your beauty and your true state, and you have taken on the faces of animals and demons. You have lost the qualities of God and the qualities of man. You have completely uprooted the truth of God and the truth of man. You have lost your true abilities."

"O man, try to understand this. Try to change into a true human being and live as a true human being. Try to perform duty toward all lives. Let your inner qualities match your outer behavior. Show the way to live in equality, peace, and tranquillity in the kingdom of God. That is a life of freedom. Know this, O man."

This Fellowship shows the way to realize and avoid the faults of man. This Fellowship explains what a life of human freedom truly is. Here, the qualities of God are taught and illustrated. That is the work of the Fellowship.

HISTORY

Little is known of the personal history of M. R. Bawa Muhaiyaddeen prior to his emergence from the jungles of Sri Lanka over fifty years ago at which time he was asked to teach. He rarely spoke of himself in any way, never deviating from his focus on the one God.

Since Truth has no limits or boundaries or compartments, it can never be confined to or owned by any religion. Thus, although totally unlettered, to a Hindu he would talk about God in detailed terms of Hinduism; to a Jew or Catholic he would talk about God in detailed terms of Judaism or Catholicism, to a Muslim in terms of Islam. But to an atheist who was a car mechanic, he might talk about God in terms of cars - in whatever terms the individual could best grasp the explanation. His actions were a living example of the Truth about which he spoke. He was the example of that Truth, in whatever form might be needed for the moment. He sometimes described himself as an "ant man," or as a being tinier than the tiniest ant.

M. R. Bawa Muhaiyaddeen is no longer physically with us. He passed away December 8, 1986. However, the real essence of M. R. Bawa Muhaiyaddeen is alive and very well. To find a teacher who is a true and absolutely pure guide is to find the rarest of the rare, one who is completely surrendered to God's qualities, one in whom there is no gap between what he is and what he says, one who is the truth about which he speaks. To find such a one is to find a pure mirror through whom we can see and be transformed into our true selves. Such a perfect Guide lives in his connection to God throughout all time. This connection is never born and can never die. This connection is the Sheikh and the teachings of God's Truth.

The living presence of M. R. Bawa Muhaiyaddeen is very much here and at his resting place at the Fellowship Cemetery which is about an hour outside the city. In Philadelphia there are thousands of video and audio tapes which can be helpful to one's growth. And also there is the loving support of the Fellowship family. The people who are here now had years of close personal access to M. R. Bawa Muhaiyaddeen--formally during the discourses which were open to the public, and informally during the numerous spontaneous song or question and answer sessions, during cooking, farming, construction, or just relaxed chatting of the "children" with the Father of their Wisdom.

ABOUT THE FELLOWSHIP > **VISITORS ARE WELCOME**

All who seek the Truth are welcome to come and drink from this pond of wisdom. There is no charge. Truth by its very nature can only be free. Students of M. R. Bawa Muhaiyaddeen are honored to serve all who come.

The Bawa Muhaiyaddeen Fellowship is a "Reservoir of Wisdom" for all who are seeking God's Truth. It is a place where individuals may gather to study the Truth of God -- outwardly through the teachings and example that His Holiness has given us and inwardly through listening with greater clarity

and determination, to that Truth within one's self which exists as the conscience of man.

Vegetarian meals are served here, and you are welcome to share this food during any visit. The Fellowship is run purely on a donation basis.

ABOUT THE FELLOWSHIP > **SCHEDULE**

Public meetings are held at the central meeting house in Philadelphia throughout the week and weekends. The Sunday morning meeting starts at 10:00 a.m. Other meetings are scheduled around the five times prayer. Please call to obtain exact starting times. All meetings are free of charge. Morning Dhikr is held every day in the Mosque starting at 4:30 a.m.

General Weekly Schedule

- Sunday - 10:00 a.m.
  General Meeting
- Monday - Evening
  Dhikr
- Tuesday - Evening
  Readings from Unpublished Material
- Wednesday - Evening
  Video Tape
- Thursday - Evening
  General Meeting
- Friday - 1:30 p.m.
  Jum'ah in the Mosque
- Friday - Evening
  Dhikr
- Saturday - 10:00 a.m.
  Children's Meeting

- Saturday - Evening
  General Meeting

M. R. Bawa Muhaiyaddeen *(Ral.)*

Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen, a Sufi mystic, can best be remembered for his efforts to bring unity through understanding to the faithful of all religions.

Little is known of his early personal history. Records of his life began in the early 1900's when religious pilgrims traveling through the jungles of Sri Lanka first caught glimpse of a holy man. They were overwhelmed by the depth of divine knowledge that he imparted. Sometime later a pilgrim invited him to a nearby village, and with that began his public life as a teacher of wisdom.

Throughout Sri Lanka, people from all religious and ethnic traditions would listen to his public discourses. Many consulted him on how to conduct life's affairs, including public figures, politicians, the poor, and the learned.

In 1971 Bawa Muhaiyaddeen accepted an invitation to visit the United States. Here, once again, people from all religious, social and ethnic backgrounds would join to hear him speak. Across the United States, Canada and England, he won recognition from religious scholars, journalists, educators and world leaders. The United Nation's Assistant Secretary General, Robert Muller, asked for Bawa Muhaiyaddeen's guidance on behalf of all mankind. Time Magazine turned to him for clarification during the hostage crisis in 1980. Thousands more were touched by his wise words when interviewed in Psychology Today, the Harvard Divinity Bulletin, the Philadelphia Inquirer, and the Pittsburgh Press. Wherever he went, he tirelessly answered the many personal and mystical questions that people brought to him until his death on December 8th, 1986.

For fifteen years, M. R. Bawa Muhaiyaddeen authored over twenty books and the Fellowship he founded recorded thousands of hours of audio and video discourses. The Bawa Muhaiyaddeen Fellowship now serves as a thriving community dedicated to studying and disseminating the vast treasury of his teachings. You are warmly invited to attend meetings at the central branch in Philadelphia on Sundays at 10 a. m. , or call 215-879-6300 for details on branch meetings nearest you.

The name Muhaiyaddeen literally means 'the giver of life to the true belief.' And indeed Bawa Muhaiyaddeen did spend his life awakening and strengthening faith in God within people's hearts. Though he was an unlettered man, he was able to guide and inspire people from all walks of life. Many scholars and leaders from the Islamic, Judaic, Christian, Hindu and communities considered him to be a true saint.

FELLOWSHIP BRANCHES

Established by the Sufi Saint Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen in 1971, the Bawa Muhaiyaddeen Fellowship Center is located at 5820 Overbrook Avenue in Philadelphia, Pennsylvania. The Mosque which was built in 1984 is also located on the property.

- Public meetings, study sessions, classes, five-times prayer *(salat)* and Remembrance of God *(dhikr)* are conducted on a regular schedule here throughout each week.
- The resting place of M. R. Bawa Muhaiyaddeen, may God be pleased with him, is located in the countryside near Philadelphia. It is enclosed in a *Mazar* or shrine which receives thousands of pilgrims from all over the world each year.

Branches of the Bawa Muhaiyaddeen Fellowship are located throughout the United States and Canada, as well as in Sri Lanka, Australia,

New Zealand and the U.K. Please call (1-888-786-1786) or e-mail info@bmf.org for specific addresses and meeting schedule information.

Weekly Fellowship and Sufi Study Circle meetings are held in:

- Boston, MA
- Des Moines, IA
- Detroit, MI
- Toronto, Canada
- New York City, NY
- Stamford, CT
- Unionville, PA
- Washington, DC

Monthly meetings are held in:

- Berkeley, CA
- Sacramento, CA
- Madison, WI
- London, England
- Colombo, Sri Lanka

Other meetings and events are conducted periodically in various locations.

Editor's Introduction

Muhammad Raheem Bawa Muhaiyaddeen, may Allah be pleased with him, was an Islamic Sufi from Sri Lanka who dedicated much of his lifetime to instructing people on the true meaning of Islam and the path of Sufism. Though he himself was unlettered, the depth of his understanding of the Qur'an and the traditional stories of Islam has been recognized by Muslim scholars throughout the world.

Foreword

Among the great religions of the world, Islam is no doubt the one that is least known and least appreciated by the non-Muslim world. The recent resurgence of military and militant groups inside Islam has caused a renewal of feelings and sentiments that have been harbored for centuries and a new spirit of crusade against the only major religion that appeared in history after Christianity. This has caused many Western laymen and intellectuals to ask, "What do 'the Islams' have in mind now?" (A horrible form used by many instead of the correct term, *Muslims.)*

Real Islam is a deep and unquestioning trust in God, the realization of the truth that "There is no deity save God" and of the threefold aspect of religious life: that of islam, complete surrender to God; iman, unquestioning faith in Him and His wisdom; and ihsan, to do right and to act beautifully, because one knows that God is always watching man's actions and thoughts. For fourteen hundred years the Muslims have practiced these virtues, and the great mystics of Islam have taught them to millions of faithful who have survived the most difficult times, the greatest hardships because of their unshakable faith in the loving kindness of God, the creator, sustainer and judge of everything created.

Sufism, the mystical current inside Islam, developed logically out of the serious study of the Qur'an, according to Muslim belief the uncreated word of God, and of the constant direction of all faculties toward God. The Sufi masters taught their disciples that their duty is the fulfillment of God's will, not out of a feeling of duty but rather out of love - for could there be anything greater than the unconditional love which man offers his Lord? And in order to be able to love God and, through Him, His creatures, the heart has to be purified by constant remembrance of God and by constant struggle against

It is appropriate that Islam and World Peace: Explanations of a Sufi' should be his first book published posthumously, for during the last decade of his life, Bawa Muhaiyaddeen repeatedly expressed concern about the unfavorable image of Islam in the world today. He proclaimed an Islam of mercy and compassion, an Islam of peace and unity.

Opening with a plea that we must do more than just talk about peace, the book follows with a letter to world leaders, boldly calling upon them to unite. From there, the reader is guided to a view of the present day political crisis, then on to a Sufi application of the traditions of Islam, and finally to an esoteric understanding of the path of the innermost heart. Out of every page there emerges the wisdom of a contemporary mystic, blending the ancient oral tradition of Sufism with modern-day issues.

These talks, originally spoken in a mixture of Tamil and Arabic, were simultaneously translated into English, and later edited into a written format.

For the benefit of the Western reader, the customary honorific phrases have not been used following the names of prophets and angels. For example, the phrase Salla Allah 'alayhi wa-sallam, God bless him and grant him peace, is traditionally spoken after mentioning the name of Prophet Muhammad. Since the reverence inherent in this phrase is evident within every page of the book, we hope that this omission will not offend anyone. For the reader familiar with Arabic, the translated Islamic terms have been footnoted. And finally, since there is no single accepted system for transliterating Arabic into English, we have selected the one recommended by the Library of Congress, which can be found in the glossary.

This book is a unique plea for peace and unity, and if God so wills, perhaps those who read it will find some guidance in the timeless wisdom of Bawa Muhaiyaddeen.

one's lower qualities, the so-called *nafs*, which are, according to the word of the Prophet of Islam, "the greatest enemy of man." This struggle against one's lowly and base qualities is indeed the "greater Holy War," for outward enemies can disappear and are not as dangerous as the inner, satanic forces, which try to incite man into evil, disobedience, and forgetfulness. It is this "Holy War" which in the following pages forms the center of the teaching of one of the masters of Sufism in our day, Bawa Muhaiyaddeen, who hails from Sri Lanka and stands in the age-old tradition of wisdom and love.

The reader will learn from these pages, which are written, or rather recited, in a simple, almost childlike style, that the inner dimensions of Islam are very different from those which he usually associates with this religion; that there is a wealth of love, of patience, of trust in God, and, last but not least, of gratitude; for the qualities of patience in affliction and gratitude belong together. The true lover of God knows that even in affliction it is the hand of the Divine Beloved that he feels, and he trusts that whatever befalls him is for his best, for God knows what is good for the soul's growth and for the spirit's purification.

I hope that many people read the warm, loving words of Bawa Muhaiyaddeen and understand that indeed the words *islam* and *salam*-peace-belong to the same root and that a true understanding of the inner dimensions of Islam will help them to find peace for themselves, insha'Allah, God willing.

Annemarie Schimmel

Professor of Indo-Muslim Culture

Harvard University

Cambridge, Massachusetts

Many people go to Mecca to receive titles, but a man of wisdom will be different. For him the *hajj* is a journey to meet God, and when he goes the world will have died within him. He is not dead. The world is dead, his base desires *(nafs)* are dead, and his attachments are dead. He will make all the sins he has committed die by making supplication *(du'a')* to Allah.

To Die Before Death: The Sufi Way of Life

Even if I am not here, the statements that I have made or what I have taught could come from the mouths or the hearts of the children. If those words are uttered with the 'I', they will be of no benefit. But if the listeners listen to them without the 'I', then those words will be of great use. From wherever those words come, the ones who strive should extract the inner meaning.

God, His Prophets, and His Children

My younger brother, you must love all lives as your own. You must show compassion, pity, charity, kindness, and amiability toward all lives. If you shine with these qualities, your inner heart and your body will become resplendent like gold and the whole world will be yours. You will become the friend of the recluse who lives without any attachments. The Primal One will be yours. You will glitter everywhere with your resplendence. You will become the brother of all lives on earth. Realize this, my son, clarify and redeem yourself, gem of my eyes.

The Pearl of Wisdom (Guru Mani)

There is so much to learn, so many hidden meanings, and mere book learning is inadequate. The clarity, the understanding we must attain is not to be found in books, it is not something we can read about. To understand we

بابا جی فضل شاہ رح
قطب عالم، نوروالے

must go beyond words into our hearts where He has revealed everything. We must live within Him and discover the tongue that reveals Him. If we are proud and think, "I know so much already I am indeed learned," nothing will be revealed. We can only attain wisdocm if we reach out for God and hold on and hold on saying, "I surrender, I surrender, I surrender."

Muhammad Raheem

Bawa Muhaiyaddeen